جانور
اسد محمد خان
1

میرے ساتھ عجیب واقعات ہوئے ہیں' برابر ہو رہے ہیں' اسی لیے میں اپنی روداد سنانا چاہتا ہوں۔ کسی کو سنا لو تو تسلی سی ہو جاتی ہے۔ نہیں تو الجھن رہتی ہے۔

میرا نام شیر علی ہے۔ ہم لوگ صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد صمد خان بنگش انگریزوں کے زمانے سے محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ کچھ دن ان کی تعیناتی ادھر ہمارے آبائی علاقے مالاکنڈ میں بھی رہی مگر وہ ان کی نوجوانی کے دن تھے۔ ملازمت کے شروع میں نئی نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ہو گا اس لیے وہ اپنے تبادلے کراتے رہے۔ وہ یو پی' سی پی' بہار' آسام' بنگال سب جگہ رہ چکے تھے۔ پارٹیشن سے چند ماہ پہلے جب شادی ہوئی تو اس وقت ان کی تعیناتی مشرقی بنگال یعنی پاکستان میں تھی۔ پارٹیشن سے ان کی سروس میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نئے انتظام کے تحت ترقی ہو گئی اس لیے وہ مشرقی پاکستان ہی میں رہ پڑے۔

والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر مشرقی بنگال کے سب سے گھنے جنگلاتی علاقے سندر بن میں تھا۔ میری پیدائش وہیں کی ہے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ انگریزی' اردو' پشتو' پنجابی اور بنگلا تو خیر آتی ہی تھی۔ لڑکپن ہی سے مجھے برمی زبان میں بھی خاصی شدبد ہو گئی۔

پڑھائی لکھائی سے جو وقت بچتا وہ میں رینج پوسٹ کے اہل کاروں' مقامی شکاریوں اور مسافروں کے ساتھ گزارتا تھا۔ والد صاحب کے دوستوں' جاننے والوں میں انہی کی طرح کے مہم جو سیلانی لوگ شامل تھے۔ جب بھی موقع ملتا میں والد صاحب کی اجازت سے بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑوں میں بیٹھنے سے مجھے جو فائدہ یا نقصان ہوا اس کا تو اب اندازہ نہیں' ہاں اتنا ضرور ہوا کہ مجھے جنگلوں اور جنگل والوں کو سمجھنے کا موقع مل گیا۔

کسے معلوم تھا کہ یہ معلومات بلکہ علم ساری زندگی میرے کام آتا رہے گا۔

کسے معلوم تھا کہ بھرپور شہری زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ وقت پڑنے پر مجھے جنگلی جانور کی طرح کبھی شہر، کبھی ویرانے میں رہنا ہوگا۔

کسے معلوم تھا کہ جب تک زندہ ہوں یہی سلسلہ رہے گا۔ بچپن، لڑکپن اعتبار کا زمانہ ہوتا ہے۔ آدمی آسانی سے سنی سنائی پر یقین کر لیتا ہے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میری تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں وہم، ڈر اور خوف کی گنجائش نہیں تھی۔ توہم پرستی پھر کس بات کی؟ آدھی رات کو بھی اگر کوئی مجھے رینج پوسٹ کمپاؤنڈ کے باہر جنگل میں جانے کو کہتا تو میں ایک ٹارچ اور ایک لکڑی سنبھال کر نکل پڑتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جنگلی جانوروں سے اور کیڑے کانٹے سے کس طرح بچا جاتا ہے اور میں خوب جانتا تھا کہ بھوت پریت اور دوسری سب بلاؤں کا کوئی وجود نہیں، پھر ڈر کس بات کا؟

بنگال تو جادو کے لیے مشہور ہے۔ بہت سے بنگالی دوست والد صاحب کی یہ بات سن کر چپ ہو جاتے۔ کہتے "جو بھی ہو بنگش صاحب! ہم نے تو جیسا سنا تھا تمہیں سنا دیا۔ اب یہ ہمت کی بات ہے کہ بنگال میں بیٹھے ہو اور جادو سے انکار کرتے ہو۔"

میں بھی اپنے باپ کی طرح انکار کرتا تھا لیکن آگے چل کر میرے ساتھ جو ہوا اور جب تک زندہ ہوں، ہوتا رہے گا اس کے بعد میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں؟

مگر کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔ مجھے پہلے یہ بتانا ہوگا کہ کیا کچھ ہوا اور کس طرح ہوا؟

ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے ہی پاکستان اور انڈیا کے تعلقات میں سخت بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جسے عام طور پر مشرقی پاکستان کے سرکاری ملازمین محسوس کر رہے تھے۔ والد صاحب کا دل اس نوکری سے اچاٹ ہونے لگا۔ انہوں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ ریٹائرمنٹ کی منظوری آتے آتے اور کارروائی پوری ہوتے ہوئے 69ء کا سال آ گیا۔ والد صاحب اور والدہ کو اپنے آبائی علاقے میں پہنچنے، اپنے گاؤں لوٹنے کی خوشی تھی۔ میں بنگال میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں آنکھ کھولی تھی۔ اب جو روانگی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو میں ایک عجیب طرح کی اداسی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کوئی اپنے گھر اور گھر والوں سے بچھڑنے والا ہو۔

سولہ سترہ برس کی میری عمر تھی مگر بڑا بیٹا تھا والد صاحب نے مجھے دو

ملازموں کے ساتھ اپنے ایسٹ پاکستان کے معاملات سمیٹنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود باقی گھر والوں کو لے کر صوبہ سرحد روانہ ہو گئے۔ سوچا ہوگا کہ یہ بنگال میں اور کچھ رہ لے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ اداسی کم ہو جائے گی۔

سروس کے دوران والد صاحب نے کاکسیز بازار میں ایک چھوٹا سا خوش منظر مکان خرید کر اسے پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس بنا دیا تھا۔ اس علاقے میں ٹورسٹ بہت آتے تھے۔ یہ آمدنی کا اچھا ذریعہ تھا مگر نوکری سے فارغ ہونے اور گرہستی منتقل کر لینے کے بعد گیسٹ ہاؤس، فرنیچر اور پرانی جیپ کو، جو سودا سلف لاد کر لانے لے جانے میں کام آتی تھی پاس رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تینوں چیزوں کا سودا ایک ہی خریدار سے ہو گیا۔ خریدار سے بیشتر رقم وصول ہو گئی تھی۔ بس کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے باقی تھے جن کی ادائیگی تین مہینے میں ہونی تھی۔ میری اور ملازموں کی یہ ذمہ داری تھی کہ بقیہ رقم وصول کر کے گیسٹ ہاؤس کا چارج ہم نئے مالک کو دے دیں اور پی آئی اے کی پہلی فلائٹ پکڑ کر مغربی پاکستان پہنچ جائیں۔

گھر والوں کے جانے کے بعد کچھ دن تو بڑوں کی نگرانی سے آزاد ہو کر میں نے اپنی خودمختاری کے مزے لوٹے۔ چار چھ روز جیپ اڑائے اڑائے پھرا۔ خوب سیر سپاٹے کیے پھر والد صاحب کے بتائے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاموں کی فہرست یاد آ گئی تو اس میں لگ گیا۔

کام اتنے زیادہ نہیں تھے۔ والد صاحب کے دونوں کارندے میرباز اور خدا بخش رائیں میرے ساتھ دن دن بھر گھومتے تھے اور راتوں میں کھانے کے بعد محفل جماتے تھے۔ ہم لوگ چینگیں بھر بھر کے چائے بنواتے اور گیسٹ ہاؤس کے بنگالی ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر قصے کہانیاں سنتے یا ویسے ہی گپ مارتے۔ میرباز کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہو گی اور خدا بخش رائیں کی چوالیس پینتالیس سال مگر وہ بھی لڑکوں میں لڑکا بنا رہتا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ہم سے دگنی تگنی عمر کا آدمی ہے۔ والد صاحب نے خدا بخش کو بندوق کا لائسنس بنوا دیا تھا اور بارہ بور کی ایک دو نالی شاٹ گن خرید دی تھی جو خدا بخش سے زیادہ میرے قبضے میں رہتی تھی۔ اب جب کہ ہمیں فرصت بھی تھی ہم نے دکان سے اپنے لیے گوشت منگوانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن شکار کو نکل جاتے تھے۔

انہی دنوں کاکسیز بازار میں برمی قبائلیوں کا کوئی میلہ شروع ہو گیا، ہم تینوں کے مزے آ گئے۔ دس روز کا میلہ تھا۔ یہ دن ہم نے خوب کھیل تماشوں میں گزارے۔

اگلے آٹھ' دس دن تک میلے والے اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ تھوڑی چہل پہل جو باقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ گیسٹ ہاؤس کے آس پاس پھر وہی سناٹا چھا گیا جس کی تلاش میں دولت مند لوگ اپنے اپنے شہروں سے کاکسیز بازار کے ڈاک بنگلوں اور گیسٹ ہاؤسوں کا رخ کرتے تھے۔

میرباز کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک روز شام کے وقت میں نے دیکھا کہ گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے' جہاں برمی قبائیلیوں نے بانس' چٹائیاں اور ٹاٹ کے پردے کھینچ کر اپنا عارضی کیمپ سا بنایا تھا ایک جھونپڑی اب بھی کھڑی ہے اور آباد ہے۔ ایک بہت بوڑھا آدمی چولہے کے پاس بیٹھا آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارہ تیرہ برس کی بھک مری سی ایک لڑکی برتن دھو رہی تھی اور سات آٹھ برس کا ننگ دھڑنگ لڑکا جھونپڑی میں بیٹھا ریں ریں کرتا بے دلی سے رو رہا تھا۔

یہ لوگ مزدور' دست کار' دکان دار کچھ بھی نہیں لگتے تھے۔ نہ ہی ان کی جھونپڑی میں کوئی زیادہ سامان نظر آتا تھا۔ شاید گا بجا کے' مانگ تانگ کے گزارہ کرتے ہوں گے۔ ہم دونوں کچھ دیر جھونپڑی کے سامنے کھڑے رہے پھر لوٹ آئے۔

اندھیرا ہو چلا تھا میں نے گیسٹ ہاؤس کے مہمانوں' گاہکوں سے بچے ہوئے کچھ پھل' آدھی پوری ڈبل روٹیاں' تھوڑی سی مٹھائی کاغذ کے تھیلے میں ڈالی اور ٹارچ سنبھال کر میرباز کے ساتھ ان بے آسرا لوگوں کے پاس جا پہنچا۔

چولہے پر ہانڈی چڑھا دی گئی تھی۔ جھونپڑی میں دیا جل رہا تھا اور چھوٹے لڑکے نے رونا بند کر دیا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر بوڑھا چولہے کے پاس سے اٹھا' آگے آیا۔ میں نے تھیلا بڑھا دیا اور اس کی اپنی زبان میں کہا۔ "لو' یہ ہم تمہارے لیے لائے ہیں۔"

مجھ سے اپنی زبان سن کر بوڑھا حیران ہوا' مسکرا کر پوچھنے لگا۔ "کیا ہے؟"

"مٹھائی' پھل ہیں بچوں کو دے دینا' ڈبل روٹی بھی ہے۔"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر دعا دی۔ "خوش رہو' ہمارا اتنا خیال کیا' اچھے رہو مگر کسی سے لے نہیں سکتے کچھ بھی۔ اپنا خود پکاتے کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہ تم نے مانگا ہے' نہ ہم بھیک دے رہے ہیں۔ ایک طرح سے تم ہمارے پڑوسی ہو۔ چھوٹے بچے کے لیے یہ پھل لے لو۔"

کہنے لگا۔ "اچھا لاؤ پھل دے دو۔"

میں نے تھیلے سے سب پھل نکال کر اسے دے دیے۔

اب جو وہ جھونپڑی سے باہر آیا تو تین' چار ہاتھ لمبا لکڑی کا ایک کندا گھسیٹتا لایا بولا۔ "بیٹھ جاؤ دونوں۔ میں چائے بنا رہا ہوں پی کر جانا۔"

چائے کیا تھی' پانی میں گڑ پتی ڈال کر خوب پکا لیا گیا تھا اوپر سے تھوڑا نمک ڈال دیا تھا۔ مٹی کے پیالوں میں ہمیں چائے دے کر بوڑھا اندر بچوں کے پاس جا بیٹھا اور شاید چاول کی روٹیاں اس چائے میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔ میں اور میرباز چائے پی کر بوڑھے سے سلام دعا کر کے واپس آ گئے۔

غربت اور بے سروسامانی تو میں نے اپنے آس پاس بہت دیکھی تھی مگر اتنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اسے بسر کرتے ہوئے پہلی بار کسی کو دیکھا تھا۔ میں بہت متاثر ہوا۔

میں دو تین دن بعد بچے ہوئے پھل اور سبزیاں پہنچاتا رہا۔ ایک دو بار میں نے اسے چاول دال نمک بھی دیا۔ بوڑھے سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ وہ لوگ مداری تھے' میلے ٹھیلے گھوم کر گزر اوقات کرتے تھے۔

چوتھے پانچویں دن بوڑھا پوچھنے لگا۔ "تم یہ پھل' سبزی روز روز کیوں لاتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تمہارے بچے کھا لیتے ہیں۔ دوسرے تیسرے دن یہ سبزی' پھل ہمارے مہمانوں کے کام کے نہیں رہتے۔ کچھ ہمارے نوکروں کے اور ہمارے کام آ جاتے ہیں' کچھ تمہیں دے دیتے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

کہنے لگا۔ "نہیں حرج کوئی نہیں۔ بس مجھے پریشانی' دکھ یہ ہے کہ بدلے میں ہم لوگ تمہیں کچھ دے نہیں سکتے۔"

میں اس کی بات پر ہنسنے لگا تو بولا۔ "کیا کریں' ہم ایسے ہی ہیں۔ بھوک سہہ لی جاتی ہے۔ پر یہ دکھ پریشانی کہ ہم تمہارے کام نہیں آ سکتے' تم سے برابر کچھ نہ کچھ لیے جاتے ہیں۔ دیتے کچھ نہیں۔ یہ دکھ بہت بھاری ہے کیا کریں۔"

میں نے کہا۔ "تم لوگ یہاں میلے میں کھیل تماشا کرنے آئے تھے' اگر باسی سبزی پھلوں کے بدلے میں یا اناج' دال نمک کے بدلے میں ہمیں کبھی کھیل دکھا دیا کرو تو تمہاری بھی تسلی ہو جائے گی۔ ہم بھی خوش ہو لیں گے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں کھیل دکھایا کریں گے۔ اچھا کل آ جانا۔"

اگلے دن مغرب کے بعد ہم لوگ گیسٹ ہاؤس کے بنگالی نوکروں کے ساتھ

بوڑھے کی جھونپڑی کے پاس آ بیٹھے۔ الاؤ کی روشنی میں بوڑھے اور اس کی پوتی نے ہمیں بچے جمورے والا' گولے نگلنے کا اور اسٹیل کے چھلے الجھانے' سلجھانے کا کھیل دکھایا۔ عام سے تماشے تھے مگر میں نے' میر باز اور خدا بخش رائیں نے ہر ہر آئیٹم پر خوب تالیاں بجائیں۔ بنگالی بیٹھے جماہیاں لیتے رہے ظاہر ہے ان کے لیے بھی نیا کچھ نہیں تھا۔ ہم تو خیر بوڑھے کا دل رکھنے کو تالیاں بجا رہے تھے۔ بنگالیوں نے ہزار بار کے دیکھے ہوئے ان بے رنگ تماشے کا اور بوڑھے کی پرانی دھرانی نقلوں کا سرگوشیوں میں مذاق اڑایا۔ کچھ دیر تماشا دکھا کر بوڑھا تھک کر بیٹھ گیا۔ لڑکی ڈھولک پر بنگلا زبان کے مداریوں والے گیت سنانے لگی۔ اس کی آواز میں دم ہی نہیں تھا جو ہمارے ساتھیوں کو کچھ پسند آتا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مجھ سے آہستہ سے برمی میں کہا۔ "کسی کو اچھا نہیں لگ رہا۔ بس اب رہنے دو' آپ لوگ جاؤ۔" ہم آ گئے گیسٹ ہاؤس آتے ہوئے ہمارے نوکروں نے خوب ٹھٹھے لگائے اور اونچی آواز میں بوڑھے پر فقرے کسے۔

دوسرے دن میں پھل' سبزیاں لے کر گیا تو اپنے آدمیوں کی طرف سے میں نے بوڑھے مداری سے معافی مانگی۔ اس سے کہا کہ مہمانوں' مالکوں کے منہ چڑھے نوکر ہیں انہیں بڑے بوڑھوں کی عزت کرنا نہیں آتی۔ مداری ہنسنے لگا۔ بولا۔ "وہ لڑکے ٹھیک ہیں' بوڑھے ہی کو کچھ نہیں آتا۔"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ "میرا بیٹا' ان بچوں کا باپ بہت اچھا مداری تھا۔ کچھ نہ کچھ نیا بنانے کی فکر میں رہتا تھا۔ کل رات وہ ہوتا تو تمہارے نوکروں کا جی خوش کر دیتا۔"

میں نے پوچھا۔ "بیٹا تمہارا کہاں ہے؟"

بولا۔ "مر گیا۔"

میں نے افسوس میں سر ہلایا تو دھیرے سے ہنسا۔ کہنے لگا۔ "تم اچھے ماں باپ کے بیٹے ہو۔ مٹی میں ملے آدمیوں سے پیار کرتے ہو۔"

میں کیا کہتا' آہستہ سے بولا۔ "ہاں ہمارے والد اور والدہ بہت اچھے ہیں۔"

بوڑھا اب آواز سے ہنسنے لگا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ انگلیوں سے آنکھیں صاف کر کے بولا۔ "میرا لڑکا بھی ایسا ہی بولتا تھا۔ کہتا تھا میرا باپ اچھا ہے۔ ماں کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ چھ مہینے کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔"

وہ اپنی زندگی' اپنے غموں کے بارے میں زیادہ ہی بول گیا تھا تو شاید شرمندہ ہو

کر اس نے جلدی سے اور بات چھیڑ دی۔ بولا۔ "تم سب کل دوپہر بعد آ جانا۔ ہمارا ریچھ آنے والا ہے۔ کل تمہیں' تمہارے آدمیوں کو ریچھ کا تماشا دکھائیں گے مگر رات مت کر دینا' شام سے پہلے آ جانا۔" میں کہنا چاہتا تھا کہ رہنے دو اس کی کیا ضرورت ہے مگر بوڑھا بڑے شوق سے بلا رہا تھا۔ سوچتا ہوگا ریچھ کا تماشا اچھا ہو گیا تو شاید ہم لوگ پچھلے دن کی بے کیفی بھول جائیں گے۔

میں نے گیسٹ ہاؤس والوں سے ریچھ کے تماشے کا کہہ دیا۔ مہمانوں کو دوپہر کا کھانا کھلا کر خود کھا کر سب جمع ہو گئے اور بوڑھے کی جھونپڑی کے پاس آ بیٹھے۔

جھونپڑی کے دروازے سے آج دہرے ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اندر باہر سناٹا تھا لگتا تھا مداری اور اس کے پوتا پوتی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم شاید جلدی آ گئے تھے لیکن خیر' اپنے شوق میں آئے تھے۔ خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ہمیشہ بک بک کرنے والے نوکروں پر ہر طرف پھیلے سناٹے کا اثر ہوا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ پانچ' سات منٹ بالکل سناٹا رہا تو خدا بخش رائیں جماہی لینے لگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اسے سونے کی عادت تھی۔ میں سوچ رہا تھا اب یہ اٹھ کر چل دے گا تو دوسرے بھی اس کے پیچھے ہو لیں گے مگر خدا بخش نے بیٹھے بیٹھے ایک بار انگڑائی لی تھی کہ اندر جھونپڑی میں ہلکے' بہت ہلکے سے ڈگڈگی بجنے لگی۔ میں سمجھا شاید یہ میرا وہم ہے۔ کان بجتے ہیں مگر رفتہ رفتہ ڈگڈگی کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ خدا بخش کی جماہیاں اور انگڑائیاں رک گئیں۔

کچھ ہو رہا تھا۔ تماشا شروع ہونے والا تھا۔

منٹ دو منٹ میں ڈگڈگی کی ہلکی آواز رفتہ رفتہ بڑھ کر اتنی گونجنے لگی کہ گیسٹ ہاؤس کا پچھواڑا' ٹیلے' درخت سب اس کی آواز سے جیسے جھنجھنا اٹھے۔ جھونپڑی کا پردہ لرز رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ آواز کی لہروں سے لرزتے لرزتے یہ پھٹ پڑے گا اور تار تار ہو کر بکھر جائے گا۔

اچانک ہی جھونپڑی کا پردہ چابک کے کڑکے کی طرح چٹخا اور باہر آن گرا۔ جھونپڑی کے دروازے جتنا اونچا ایک سر تا سر سیاہ ریچھ اچھل کر باہر آیا اور اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ڈگڈگی کی تال پر جھومنے لگا۔

ہمارے چھوٹے سے مجمعے نے۔ "ہا آ آ" کی آواز نکالی۔ یہ حیرت اور مرعوبیت کی آواز تھی۔ اتنا شاندار قد آور ریچھ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔ خدا بخش رائیں نے بھی نہیں' حالانکہ اس کی عمر جنگلوں میں گزری تھی۔

ریچھ کی رسی اور ڈگڈگی لڑکی کے ہاتھ میں تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈگڈگی کی تیز تال پر ناچتا ہوا سات آٹھ برس کا اس کا بھائی جھونپڑی سے باہر آ رہا تھا۔

دیو کی طرح دو ٹانگوں پر جھومتا ہوا ایک ریچھ تھا اور وہ دونوں پوتا پوتی تھے اور بس ان کے ساتھ ان کا دادا مداری نہیں تھا۔

ہم میں سے ہر ایک نے گردن بڑھا کر، بعض نے جگہ بدل کر جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا۔ ٹاٹ، گدڑیوں، ایک ڈھولک، مٹی اور المونیم کے چھ آٹھ برتنوں اور مٹ میلے رنگ کی ٹین کی پیٹی کے سوا جھونپڑی خالی تھی۔

میں نے حیرت سے اپنے ساتھیوں کو اور انہوں نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ اتنے بڑے ریچھ کو یہ بارہ تیرہ برس کی لڑکی نچا رہی تھی۔ تو کیا یہ دو بچونگڑے تماشا دکھائیں گے؟

لڑکی نے جنونیوں کی طرح ڈگڈگی بجاتے ہوئے مختصر سی اس بھیڑ کے گھیرے میں چکر لگایا پھر وہ بیچوں بیچ کھلے میں سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور ریچھ کی رسی سر پر سے گزارتے ہوئے اپنے سے چوگنے بلکہ چھ گنے ڈیل ڈول کے اس جانور کو چکر کھلانے لگی۔ اس کی ڈگڈگی جمے ہوئے تال پر بجے جا رہی تھی۔ بسورتی شکل کی اس دبلی پتلی لڑکی میں اس وقت کچھ ایسی خود اعتمادی، ایسا تیج دکھائی دے رہا تھا کہ ہم جو ریچھ کا ڈیل ڈول، اس کا وحشی انداز دیکھ کر ہی مرعوب ہو گئے تھے اب اس عجوبہ لڑکی کو تکے جا رہے تھے۔

جس طرح اچانک پردہ باہر پھینکتا ہوا ریچھ کھلے میں آیا تھا اسی طرح ایک دم اس کا کھیل شروع ہو گیا۔ ریچھ ناچ نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی ماہر بازی گر اپنا کرتب دکھا رہا ہے۔

لڑکی نے ڈگڈگی کی تال بدلی اور آہستہ سے کچھ کہا جو نہ برمی میں تھا نہ بنگلا میں۔ نہ ریچھ سے کہا گیا تھا نہ چھوٹے لڑکے سے، مگر جو دونوں کے لیے کوئی اشارہ تھا۔ لڑکا قلابازیاں لگا کر ریچھ کے سامنے آیا اور ریچھ نے اسے نرمی کے ساتھ مگر پھرتی سے اچھال دیا اور اپنا دیو کا پنجا بڑھا کر کپڑے کی گڑیا کی طرح اسے ہتھیلی پر لے لیا اور پھر ایک ہتھیلی سے دوسری پر وہ اسے اچھالتا سنبھالتا رہا۔ مجال تھی جو دیکھنے والے پلک بھی جھپکا سکتے۔ ایک آدھ منٹ اس زندہ گیند سے کھیلنے کے بعد ریچھ نے ایک بار گونج دار آواز نکالی اور لڑکی نے تال بدل دی۔ ریچھ نے نرمی سے لڑکے کو اپنے سامنے اتار دیا تھا۔

ریچھ اب تال کے ساتھ ساتھ قدم رکھتا پھرکی کی طرح گھومتا ہوا چکر لگا رہا

تھا، چکر پورا کر چکا تو لڑکی کو آواز کا اشارہ دے کر وہ خود بیٹھ گیا۔ لڑکی ریچھ کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھی اس کے بیٹھتے ہی لڑکا دوڑتا ہوا آیا، آہستہ سے اپنی بہن کے گھٹنوں پر پیر رکھا، اس کے شانوں پر سے پنجے چھوا تا کہ جیسے سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہو، وہ ریچھ کے کندھوں پر جا کھڑا ہوا۔ دونوں پیر ریچھ پر جمائے، ہاتھوں سے اس کے سر کے بال تھامے وہ جما کھڑا تھا۔ ریچھ اٹھا اور اپنی پچھلی ٹانگوں پر تقریباً اچھلتے ہوئے اس نے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا چکر لگایا۔ زمین سے اتنی اونچائی پر چھوٹا لڑکا اچھلتے ہوئے ریچھ پر پیر جمائے کھڑا رہا۔ ذرا بھی جو وہ ڈرا ہو یا جھجکا ہو۔

لڑکا، لڑکی، ریچھ تینوں ایسے کرتب دکھا رہے تھے جو کہیں کسی نے نہ دکھائے ہوں گے۔ کبھی کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔

بہت دیر تک وہ تینوں کھیل دکھاتے بلکہ آپس میں کھیلتے رہے، کیا کوئی آدمی نٹ کا تماشا دکھاتا جو وہ ریچھ ان دونوں کے ساتھ مل کر دکھا رہا تھا۔ وقت گزرتا معلوم نہ ہوا بوڑھا مداری آخر تک آیا ہی نہیں۔ دونوں بہن بھائی اور ریچھ نے یہ حیرت ناک تماشا پورا کیا، ایک منٹ کے لیے بھی مداری کی کمی محسوس نہ ہوئی۔

جیسا کہ دستور ہے ہر تماشا دیکھنے والے نے خوش ہو کر کچھ نہ کچھ دیا، مگر یہ سکے، نوٹ لینے کے لیے کھیل دکھانے والے رکے نہیں۔ تماشا ختم کرتے ہی مداری کی پوتی، پوتا اور ریچھ جھونپڑی میں چلے گئے۔ اندر جاتے ہوئے لڑکی نے زمین پر پڑا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر پھر سے ٹانگ دیا تھا۔

ہم نے چولہے کے پاس پڑے مسالا پیسنے والے پتھر پر سب سکے اور نوٹ رکھ دیے اور مست مگن جیسے خواب کے عالم میں چلتے ہوئے واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے۔

رات بہت دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ مداری کے پاس جب ایسا سدھایا ہوا ریچھ تھا اور بچے اتنے ماہر تھے تو اس نے پہلے دن گولوں چھلوں والا اتنا پھسپسا کھیل کیوں دکھایا؟ ریچھ نہیں آیا تھا تو ایک دن رک جاتا۔

جیسے تیسے کام نمٹا کر میں سویرے ہی مداری کی جھونپڑی پر پہنچ گیا۔ وہ دھوپ میں گدڑی بچھائے، چادر اوڑھے پڑا تھا۔ میری آواز پر اس نے چادر سے منہ باہر نکالا تو لگا جیسے وہ بیمار ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا۔ "کل تم کہاں تھے؟ واہ واہ واہ ایسا بڑھیا کھیل دکھایا ہے تمہارے ریچھ نے اور لڑکا لڑکی نے ہمیں ذرا بھی اگر معلوم ہوتا تو ہم تو آس پاس کے ڈاک بنگلوں، ریسٹ ہاؤس کے نوکروں بلکہ مہمانوں تک کو خبر کر دیتے۔"

وہ بولا۔ "خبر؟ کس بات کی خبر؟"
"یہی کہ آجاؤ دنیا کا سب سے اچھا تماشا ہو رہا ہے۔"
مداری دھیرے سے مسکرایا۔ "اچھا؟ تمہیں پسند آیا کھیل؟"
"پسند کیا مطلب۔" میں نے جوش سے کہا۔ "میرے آدمی تو پاگل ہو گئے اور میں نے......؟ میں نے ایسا تماشا کبھی آج تک نہیں دیکھا۔"
وہ دھیرے سے بولا۔ "چلو اچھا ہوا پسند آگیا۔"
"واہ واہ...... کیا سکھایا ہے تم نے ریچھ کو اور بچے کو لگتا تھا یہ وہ بچے ہی نہیں ہیں۔"
بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تعریف قبول کی پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا بولا۔
"ہاں۔ یہ لو۔" اور صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹ اور ریزگاری نکالی اور میری طرف بڑھادی۔
"یہ کیا؟"
"یہ تم لوگ ادھر چھوڑ گئے تھے۔"
"واہ! یہ تو ہم سب نے خوش ہو کر دیے ہیں۔ کھیل دکھانے والوں کو دیے ہیں واپس کیوں کرتے ہو؟"
مداری نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں ہم نہیں لے سکتے۔"
"کیوں نہیں لے سکتے۔"
"بس بتا جو رہے ہیں نہیں لے سکتے۔" اس نے سامنے زمین پر سب نوٹ اور ریزگاری رکھ دی۔
میں وہ ریزگاری کیسے لے لیتا۔ ہم تو دے چکے تھے۔ واپس کیوں لیتے' پھر کس کو کتنا واپس کرتے۔ اب تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ کس نے کیا دیا ہے۔ میں نے ایک دوبار اصرار کیا پھر کہا۔ "اچھا' ریچھ پہ خرچ کر دینا یہ پیسے اس کے لیے شہد لے لینا۔"
بوڑھا حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ "ایک ہی بات ہے۔ ریچھ کو بھی نہیں دے سکتے۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "یہ تم کسی کو خیرات کر دینا۔"
"خیرات؟"
"چلو ہماری طرف سے دے دینا۔"
میں نے پیسے اٹھا کر الگ جیب میں ڈال لیے۔ اس وقت جھونپڑی کے دروازے

پر پردہ نہیں پڑا تھا۔ مداری کے پوتا پوتی اندر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ریچھ اندر باہر کہیں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ریچھ کہاں ہے؟"
مداری نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھا اس نے سنا نہیں۔ اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا۔ "یہیں ہے' ادھر ہی۔"
"یہاں ادھر۔" سے اس کا کیا مطلب تھا؟ میں نہیں سمجھا۔ خیر میں نے سوچا یہ نہیں بتانا چاہتا۔ نہ سہی۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔
دن میں چٹاگانگ سے ٹورسٹوں کی ایک بڑی پارٹی ہمارے گیسٹ ہاؤس میں آکر اتری۔ "ہمارا" گیسٹ ہاؤس میں نے غلط کہا۔ اب تو وہ امانت تھا۔
شام کو نیا مالک بھی اپنے رشتے داروں کے ساتھ آیا۔ وہ لوگ دو گاڑیوں میں آئے تھے۔ دو تین گھنٹے رہے۔ سب طرف گھومتے پھرے۔ ہم نے ان کی اچھی خاطر مدارت کی۔ نئے مالک نے پچاس ہزار کی رقم اور میرے والد صاحب کے بینک اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔ وہ بینک رسید کی فوٹو کاپی میرے حوالے کرنے آیا تھا۔
اچھا آدمی تھا۔ اس نے ہنسی مذاق کے دو ایک فقرے بھی کہے۔ کہنے لگا۔ "اب گیسٹ ہاؤس کے تالے کی چابی میرے ہاتھ آنے میں صرف ایک لاکھ ٹاکا کی دوری رہ گئی ہے۔"
میں نے کہا۔ "انکل! گیسٹ ہاؤس آپ کا ہے۔ میں اور یہ نوکر آپ کی امانت کی نگرانی کے لیے بیٹھے ہیں۔ آپ آئیے۔ مالک کی سیٹ پر بیٹھیے۔ آپ کی چیز ہے۔"
نیا مالک ہنسنے لگا بولا۔ "مذاق کر رہا ہوں بیٹا تمہارے باپ بخش صاحب ہمارے مہربان ہیں۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ کیری آن۔ بہت اچھی طرح چلا رہے ہو گیسٹ ہاؤس۔ میں بھی آؤں گا لیکن پہلے یہ سب تم سے سیکھنا پڑے گا۔"
ہمارا اسٹاف رات میں دیر تک مصروف رہا تھا مجھے بھی جاگنا پڑا تھا۔ تھک کر سو رہا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلی۔ کہیں کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی۔
پہلے تو کچھ پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے پھر غور کیا تو لگا کہ شاید کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرباز' برآمدے میں سو رہا تھا وہ مجھ سے پہلے جاگ گیا تھا۔ اس نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ "شیر خانا' شیر بھائی! اٹھو خانا اٹھو' ادھر کوئی گڑبڑ ہے۔"
میں نے بستر سے اٹھ کر تیزی سے شال لپیٹی اور جوتے پہن کر باہر بھاگا پھر رکا

واپس کمرے میں آیا۔ خدا معلوم کیا ہو رہا ہے۔ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں۔ میں نے کونے میں ٹکی شاٹ گن اٹھالی۔ کارتوسوں کی پیٹی کندھے پر ڈالی اور میر باز کو آنے کا کہتا ہوا گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے کی طرف چلا۔ جس طرف مداری کی جھونپڑی تھی۔ رونے چیخنے کی آوازیں ادھر ہی سے آرہی تھیں۔ مداری کا پوتا اور پوتی شور کر رہے تھے۔ قریب پہنچا تو سنا لڑکی برمی زبان میں بچاؤ بچاؤ چلا رہی تھی۔ جھونپڑی تک پہنچنے میں مجھے مشکل ہو رہی تھی۔ اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ مجھے ٹارچ لے کر آنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے ہم لوگوں نے گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے ایک ٹیوب لائٹ لگوادی تھی جس سے دور تک علاقہ روشن ہو جاتا تھا۔ وہ لائٹ یا تو اس وقت بند تھی یا خراب ہو گئی تھی۔

جھونپڑی کے دیے کی کمزور روشنی میں سب سے پہلے مجھے لڑکے کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ جھونپڑی کے کونے میں کھڑا ہاتھ پھینک پھینک کر روئے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو لمبے' تڑنگے سائے کسی کو دبوچ کر اٹھاتے ہوئے جھونپڑی سے نکلے اور گکروندے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ جسے وہ اٹھا کر لے جا رہے تھے اسے رسیوں سے باندھا گیا تھا' وہ خود کو آزاد کرنے کی کوشش میں مچلے جا رہا تھا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔ شاید انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔

جھونپڑی سے اب لڑکی کے چیخنے کی آواز آئی' وہ برمی زبان میں پکار رہی تھی۔

"بچاؤ میرے دادا کو لے گئے۔ بچاؤ۔" اور لڑکی کی آواز یک دم بند ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔

جھونپڑی میں گھسنے سے پہلے میں نے بندوق کی دونوں نالوں میں کارتوس ڈال لیے اور سیفٹی اتار دی۔ "خبردار! کا نعرہ مارتا ہوا میں جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

اندر ایک آدمی تو لڑکی پر جھکا ہوا تھا' دوسرا اس کے برابر ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

پستول والے نے میری للکار کے جواب میں ہتھیار سیدھا کیا۔ میری تو اب تک کی عمر ہی جنگلوں میں اور ہتھیاروں سے کھیلتے گزری تھی۔ اسے موقع نہ دیا۔ میں نے بنگلا میں کہا۔ "ہتھیار پھینک دو!" اور ڈرانے کو ایک نال میں بھرا چھرا کارتوس جھونپڑی کی چھت کی طرف چلا دیا۔

اتنے قریب سے شاٹ گن کا فائر کسی کو بھی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

بہت آواز ہوئی تھی مگر سب چھرے چھت سے باہر نکل گئے تھے۔ کسی کے لگے نہیں تھے۔ پستول والے نے ہتھیار سمیت ہاتھ اٹھا دیے۔ لڑکی پر جھکا ہوا آدمی جو بھی کر رہا تھا اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی پھر چیخنے لگی تھی۔

میں نے دیکھا دونوں آدمی مقامی تھے۔ دیے کی کمزور روشنی میں بھی دونوں کو پہچان گیا۔ پستول والا نوجوان گیسٹ ہاؤس کے نئے مالک کے ساتھ دن میں آیا تھا۔ وہ اس کا رشتے دار تھا۔ نئے مالک نے اپنا بھتیجا کہہ کر اس کا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ مقامی سیاسی جماعت کا چھوٹا موٹا عہدے دار یا کچھ ہے۔ دوسرا جو لڑکی کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا اس کا ڈرائیور تھا۔

میں نے بھتیجے سے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

بھتیجا بھی مجھے پہچان گیا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "کچھ نہیں تمہیں کیا؟ یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

ادھر جھونپڑی کے دروازے پر میر باز پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔

"شیر علی خان! میں آگیا ہوں۔ پرواہ نہیں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر بھتیجے سے پستول لینا چاہا۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور بنگلا میں گالی دی۔ بندوق کی نال سے میں نے اس کے پیٹ پر کچوکا دیا اور طیش میں کہا۔ "ہتھیار دے دے نہیں تو پیٹ پھاڑ دوں گا۔" بھتیجے نے پستول میرے حوالے کر دیا۔

عقب سے بہت پریشانی میں میز باز کی آواز آئی۔ "ارے باپ رے" مڑ کر دیکھا تو میز باز جو واقعی دلیر لڑکا تھا' گھبراہٹ میں الٹے پیروں جھونپڑی میں اندر آچکا تھا' اگر باہر جانے کا رستہ کھلا ہوتا تو میر باز اتنی دہشت میں تھا کہ جھونپڑی سے باہر نکل جاتا مگر سامنے کالے گھنگور بادل کی طرح امڈتا ہوا ایک سایہ چلا آرہا تھا۔

خدا کی پناہ! یہ کیا ہے؟ کوئی بلا؟ شیطان؟ مگر نہیں۔ جھونپڑی کے دروازے میں اپنے سینے سے گھٹی گھٹی سی گونج دار آوازیں نکالتا ہوا مداری کا ریچھ کھڑا تھا۔

لڑکی نے پہلی بار حلق سے خوشی کی آواز نکالی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریچھ جس کا سر جھونپڑی کی چھت کو چھو رہا تھا اپنے بھاری بھرکم پنجے پھیلا کر میر باز کی طرف بڑھا۔ میں نے بندوق سیدھی کر لی۔ لڑکی نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "ناں! ناں۔" اور ریچھ میز باز کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

اس کے آگے میں کھڑا تھا۔ ریچھ نے اپنی چھوٹی چھوٹی روشن آنکھوں سے

مجھے دیکھا سر ہلایا۔ یوں لگا جیسے وہ انکار میں سر ہلا رہا ہو پھر اس نے میری طرف سے توجہ ہٹالی۔ اب وہ حملہ آوروں کی طرف پنجے کھولے بڑھ رہا تھا۔

لڑکی نے جیسے ریچھ کو بڑھاوا دیا۔ "ہا' ہا' ہا۔ و' ریچھ جس نے اپنے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس رکھا تھا' گونجتا ہوا بدمعاش بھتیجے اور اس کے ڈرائیور کی طرف چلا۔ وہ دونوں ریچھ کو دیکھے جا رہے تھے۔ میں یا میری بندوق اب ان کے لیے موجود نہ تھی۔ اچانک ڈرائیور نے اپنی کمر میں ہاتھ ڈالا پستول نکال لیا۔ لڑکی نے پریشانی میں چیخ ماری۔ "ناں' ناں' ناں۔ و' ریچھ ٹھہر گیا۔ ڈرائیور نے پستول فائر کے لیے تیار کیا ہی تھا کہ میں نے کڑک کر کہا۔ "ٹھہر جا! ورنہ گولی مار دوں گا۔" اور میں نے ڈرائیور پر بندوق سیدھی کرلی۔ فائر کے لیے گھوڑا چڑھالیا اگر وہ ریچھ پر فائر کرے گا تو میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے گولی مار دوں گا۔ شاٹ گن کی اس دوسری نال میں گولی کا کارتوس بھرا تھا۔ گھوڑا چڑھانے کی کڑک' ڈرائیور نے بھی سن لی ہو گی۔ ڈر گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے اپنا پستول زمین پر رکھ دیا۔

مگر وہ اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ ریچھ نے اپنا صندوق جیسا بازو گھما کر اس پر پنجا چلا دیا۔

میرا خیال ہے پنجا چھلاتا ہوا لگا ہو گا پھر بھی دیے کی کمزور روشنی میں' میں نے دیکھا کہ کھلے پنجے کے وار نے ڈرائیور کے شانے اور بازو کو کھول کے رکھ دیا تھا۔ سمجھو پکا تربوز ٹوٹ گیا تھا۔ دو تین کلہاڑوں سے بہ یک وقت وار کیا گیا ہے۔ ڈرائیور لڑھکتا ہوا جھونپڑی کے باہر جا گرا تھا۔

چیخ مار کر بھتیجا بھی بھاگا۔ جھونپڑی کے باہر کھڑے کیم شیم بدمعاش نے زخمی ڈرائیور کو اٹھالیا اور وہ بھتیجے کے پیچھے ایک طرف اندھیرے میں دوڑتے ہوئے چلے گئے۔

میر باز اور میں بدمعاشوں کا پیچھا کرتے جھونپڑی سے باہر نکلے آئے۔ بس ایک خدا بخش رائیں نیند کا پکا تھا' وہ ابھی تک سو رہا ہو گا۔

میں جھونپڑی کی طرف مڑا' ریچھ نے خیر سے حملہ آوروں کو تو دوڑا دیا تھا' ہمیں بوڑھے مداری کی خیر خبر لینی تھی جسے بھتیجے کے کارندے جھاڑیوں میں باندھ کر پھینک آئے تھے۔

جتنی دیر میں ہم بھاگتے ہوئے بدمعاشوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر مداری کی جھونپڑی پر توجہ کرتے اتنی دیر میں وہاں ٹاٹ کا پردہ لگا دیا گیا تھا۔ حیرت ہوئی لڑکی نے

بہت تیزی دکھائی تھی۔

میں نے پردے کے پاس جا کر آواز دی۔ "سنو! ادھر آؤ۔" ایک ہی آواز پر لڑکی نکل آئی اور دروازہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک پریشان تھی' اس کے کپڑے بے ترتیب اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ "گھبراؤ مت۔ ابھی تمہارے دادا کو لاتے ہیں۔"

لڑکی ہکلاتے ہوئے بولی۔ "ایں۔" وہ اسی طرح دروازے کے [illegible] پردہ تھامے کھڑی تھی۔ میں نے پھر تسلی دی اور کہا کہ میں اس کے دادا کو لے کر آ رہا ہوں وہ پریشان نہ ہو۔"

لڑکی نے انکار میں سر ہلایا۔ "مت جاؤ۔" پھر رک کر بولی۔ "دادا اندر ہے۔"

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ "اندر؟ مگر میں نے تو دیکھا تھا بدمعاش اسے ککروندوں کی جھاڑیوں کی طرف لے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' پوچھتا' جھونپڑی کے اندر سے بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس نے کمزور آواز میں مجھے پکارا تھا۔ "بابو!"

میں لڑکی کو ہٹاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر بوڑھا مداری موجود تھا۔ ریچھ نہیں تھا۔

"وہ تو تمہیں جھاڑیوں میں ڈال آئے تھے؟" حیرت سے زیادہ میں نے یہ سوال غصے میں کیا تھا۔

وہ بولا۔ "ہاں۔"

"یہاں کس پل میں آ گئے تم؟ ہم نے تمہیں ادھر آتے نہیں دیکھا اور ریچھ کہاں ہے؟"

بوڑھا چادر لپیٹے ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر لیٹا دھاریوں والے چیتھڑے سے اپنا ہاتھ خوب رگڑ رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ پر خون لگا تھا مگر وہ زخمی نہیں تھا۔ دھاریوں والے اس چیتھڑے کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے یہ کپڑا ریچھ کے منہ میں ٹھنسا دیکھا تھا۔ کپڑا تو تھا ریچھ نہیں تھا۔ اس کی بجائے کہیں سے بوڑھا مداری آ گیا تھا۔

اور بوڑھا بہت نڈھال' بہت تھکا ہوا تھا۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے پھر پوچھا۔ "تم جھونپڑی میں کیسے' کس وقت آئے؟ ہم تو سامنے

کھڑے تھے۔ ہم نے تمہیں آتے نہیں دیکھا۔"

بوڑھے مداری نے کمزور آواز میں کہا۔ "بابو! اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دو۔ سب کو بھیج دو۔"

"میں کسی کو نہیں بھیجوں گا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کون لوگ تھے وہ؟ اور تم کون؟ کون ہو تم؟"

وہ بولا۔ "بتا دوں گا۔ سب بتا دوں گا۔ ادھر پنچایت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دوسروں کو ہٹا دو۔ بات ایسی ہے۔"

بوڑھے کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ میرا غصہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے باہر جا کر اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا اور واپس بھیج دیا۔ میر باز البتہ میری بندوق اور بدمعاشوں سے چھینے ہوئے پستول سنبھالے جھونپڑی سے کچھ دور بیٹھا رہا۔

میں واپس آیا تو دیکھا لڑکی نے بوڑھے کی بچھات کے قریب میرے بیٹھنے کو لکڑی کا ایک کندا ڈال دیا ہے۔

"ہاں کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اب بتاؤ۔"

بوڑھا کہنے لگا۔ "بابو! بات کچھ لمبی نہیں ہے۔ یہ ڈرائیور بھی برما سے آیا ہے ہمارے علاقے کا ہے۔ مشکل کے دنوں میں کبھی میرے بیٹے نے اس سے دو ہزار کا ادھار لیا تھا۔ ادھار لوٹانے کا موقع نہ ملا' بیٹا گزر گیا۔ یہ ادھر بنگال میں الٹے سیدھے دھندوں سے کماتا رہا۔ ہم اس سے ادھار لے لے کے کھاتے رہے۔ میں بڈھا آدمی کوئی کام ہی نہیں ملتا تھا۔ ادھار کے پیسے زیادہ ہو گئے تو اس کے گھر والے بولے ڈرائیور کو اپنی پوتی بیاہ دے۔ ادھار کا بوجھ بھی اترے گا لڑکی بھی بس جائے گی۔ میں نے کہا پہلے دیکھوں گا کیسا آدمی ہے؟ لڑکی کو بیچنا تو نہیں ہے۔"

ٹھیک بات تھی۔ میں نے سر ہلا کر بوڑھے سے اتفاق کیا۔

وہ بولا۔ "تو بابو! میں نے اس کا پتا کرایا' معلوم ہوا یہ نشے باز ہے اور بھی سب برے دھندے کرتا ہے۔ ادھر یہ گھر کے چکر لگانے لگا۔ میں نے سختی سے روکا تو پھر بک بک کرنے لگا کہ میری رقم واپس کرو نہیں تو لڑکی سے میرا بیاہ کر دو۔ آگے بھی تمہارے خرچے اٹھاؤں گا۔ بس اسی سب جھگڑے کی وجہ سے یہ ادھر نکل آیا۔ آج یہ بدمعاشوں کو اور اپنے سیٹھ کو لے کے لڑکی چھیننے آیا تھا۔ پہلے بھی ہم تینوں جنے جب چاٹگام میں تھے' اس نے ایسے ہی ایک بار حملہ کیا تھا۔ خبر نہیں کیسے ہماری کھوج نکال لیتا ہے سور؟"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "اب نہیں آئے گا۔ تمہارے ریچھ نے کافی زخمی کر دیا ہے۔" "مگر یہ ریچھ کیا ہے؟" میں نے سر جھٹک دیا۔ ذرا سختی سے مداری سے پوچھا۔ "ہاں' یہ بتاؤ یہ ریچھ کا کیا ہے؟"

"ریچھ کا۔" بوڑھے نے سر اٹھایا میری صورت دیکھی مگر وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

"ہاں ریچھ کا۔ جب تم ہوتے ہو تو ریچھ نہیں ہوتا۔ وہ آتا ہے تو تم نظر نہیں آتے۔ یہ کیا قصہ ہے۔ اور اس ڈرائیور کو ریچھ نے پنجا مارا تھا یا تم نے مارا تھا؟ تمہارے ہاتھ پر خون کیسے لگا؟" میں نے تابڑ توڑ سوال کرنا شروع کر دیے اور اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مداری نے تکلیف کی آواز نکالی مگر میں جانتا تھا وہ مکر کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ کپڑے سے صاف ہو چکا تھا۔ کہیں کوئی چوٹ کوئی گھاؤ کچھ نہیں تھا۔

اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور دھیرے سے بولا۔ "بتا دوں گا خان صاحب! بتا دوں گا۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ارے ہم لوگ مداری ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں معلوم ہے مداری ہو۔ تو اس سے کیا؟"

کہنے لگا۔ "ایسی کچھ باتیں ہم نے سیکھی ہوتی ہیں۔"

"کیسی باتیں؟"

"یہی شعبدے۔ تماشے۔"

میں نے جھنجھلا کر سر جھٹکا۔ "یہ 'شعبدہ' تماشا نہیں تھا۔ پہلی بار جب ریچھ سامنے آیا تھا تو ہم بالکل نہیں سمجھ پائے تھے کہ کیا قصہ ہے؟"

"قصہ؟" اس نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اب برف ہو گیا تھا۔

"ہاں۔" میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر نہ کھینچ سکا۔ "ہاں ہم میں سے کوئی سمجھ نہیں پایا کہ کیا قصہ ہے ہمیں کیا ہو گیا۔ وہ ہنسا۔ "ارے ہو کیا گیا تھا بابو! بس ریچھ کا تماشا تھا۔ ریچھ تم لوگوں کو کھیل دکھاتا ہے۔ سنو خان صاحب! ادھر میری طرف دیکھو۔ بات سنو میری۔ ابھی ابھی تم نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ہماری جان بچائی ہے اگر تم بندوق نہیں داغتے تو وہ سور گولی چلا دیتا۔ کوئی مارا جاتا۔ ہم لوگ پہلے ہی تمہارے احسان کے بوجھ میں دبے تھے۔ تم نے آج ہماری جان بچا لی۔ مالک تمہیں جیتا رکھے' خوش رکھے' پھلتے پھولتے رہو تم شیر علی! سلامت رہو۔" مداری' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے برابر بولے جا رہا تھا۔

مجھے اس وقت بھی معلوم تھا کہ وہ ٹالنے کے لیے یہ سب باتیں کر رہا ہے مگر کیا کرتا اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی روشنی اور اس کی آواز میں جیسے نیند لانے والی کوئی کیفیت تھی جو مجھے نہ سلاتی تھی نہ بیدار رکھتی تھی۔ اس سے آنکھ بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسے ٹوک نہیں سکتا تھا' برابر اس کی طرف دیکھے جانے' اس کی بات سنتے رہنے پر مجبور تھا۔

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ "اچھا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ سو جاؤ تم بھی سو جاؤ میں جا رہا ہوں۔"

اور میں اٹھ کر سیدھا گیسٹ ہاؤس چلا آیا۔

گیسٹ ہاؤس کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ دو تین مہمان بھی اٹھ بیٹھے تھے۔ خدا بخش رائیں جاگ اٹھا تھا۔ میں نے خدا بخش اور میر باز سے کہا۔ "سب سے کہو لالٹینیں بجھادیں اور سو جائیں۔ سب ٹھیک ہے۔"

خدا بخش بولا۔ "وہ تو ہم کہہ دیں گے پر قصہ کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں ان کا آپس کا معاملہ تھا۔ رشتے دار ہیں۔ شادی بیاہ کا کوئی جھگڑا تھا۔"

خدا بخش بہت زبردست آدمی تھا۔ اس نے اٹھتے ہی شاٹ گن اور پستولوں کا چارج سنبھال لیا تھا۔ میر باز اس سے کہہ چکا تھا کہ میں نے شاٹ گن سے ایک فائر کیا ہے۔

میں سب کو جانے کا کہہ کر بستر پر جا لیٹا اور خود ایسی گہری نیند سویا کہ صبح ساڑھے دس' گیارہ بجے جب پولیس نے گیسٹ ہاؤس کا گھیرا ڈالا اور ہر طرف شور شرابا کیا تو میری آنکھ کھلی۔

میں نے کھڑکی سے دیکھا گیسٹ ہاؤس کے نئے مالک کی کار لے کر اس کا بھتیجا اپنے دو تین گرگوں کے ساتھ پولیس والوں کے پیچھے آیا تھا۔

والد صاحب کے یہاں' مشرقی پاکستان میں ہوتے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ہمارے گیسٹ ہاؤس پر پولیس آئی ہو حالانکہ اونچ' نیچ' چوری چکاری دو چار مرتبہ ہو بھی چکی تھی۔ یہاں پہلی بار پولیس آئی تھی۔ مجھے بس یہ فکر تھی کہ والد جب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

خیر' میں منہ ہاتھ دھو کر' کپڑے بدل کر دو ایک فون کر کے باہر آیا' تو دیکھا کہ

ایک پولیس انسپکٹر اور تین چار ماتحت بیٹھے میر باز سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اور وہ خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ نئے مالک کا بدمعاش بھتیجا اور اس کے ساتھی کچھ دور کرسیاں کھینچے بیٹھے تھے۔

میں کاکسیز بازار کے نامی گرامی' وکیل مزمل صاحب کو فون کرتا ہوا پولیس والوں کے پاس آیا تھا۔ وکیل مزمل صاحب' نے پولیس کا سن کر فون پر پہلی بات یہ کی تھی کہ میں پولیس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ دوں۔ بس یہی کہتا رہوں کہ وکیل صاحب کے آنے پر جو پوچھیں گے بتادوں گا۔ اس لیے میں پولیس والوں کو سلام کر کے جا بیٹھا تھا۔ ان کے ٹوکتے ٹوکتے بھی میں نے میر باز سے پشتو میں دو باتیں پوچھ لی تھیں جس سے میری تسلی ہو گئی تھی۔

پہلی بات یہ کہ میر باز نے پولیس کو کچھ بتایا تو نہیں؟ دوسری یہ کہ خدا بخش رائیں کہاں ہے؟

میر باز نے پولیس والوں کے ہر سوال کے جواب میں کہا تھا کہ صاحب میں سو رہا تھا۔ آپ نے آکر جگایا ہے تو جاگا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم دوسری بات میر باز نے مجھے یہ بتائی کہ خدا بخش رائیں پولیس کے آنے سے بہت پہلے اپنی لائسنس والی بندوق اور بدمعاشوں سے چھینے ہوئے پستول لے کر جا چکا ہے اس وقت خدا معلوم کہاں ہے؟

ظاہر ہے دونوں باتیں اطمینان بخش تھیں۔ میں نے کک سے پولیس والوں کے لیے چائے' کافی کچھ بنانے کا کہہ دیا۔ پولیس والے گیسٹ ہاؤس کے نوکروں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے مگر ہمارے گونگے کک کے سوا سبھی نوکر سبزی' گوشت' جنس وغیرہ خریدنے نکل گئے تھے۔ مطلب یہ کہ گھیرا پڑتے وقت میر باز پولیس والوں سے جھک جھک کرنے لگا تھا اور کک کو اس نے اشارہ کر دیا تھا۔ جو ابھی تک گونگا نہیں ہوا تھا' چنانچہ کک نے بغلی دروازے سے سب کو چلتا کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر دھمکیاں دے رہا تھا۔ غرا رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ اسے وکیل مزمل نے فون کر دیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں گیسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے پھر جیسی چاہے' پولیس تفتیش کر لے۔

جی ہاں مجبوری تھی۔ کیوں کہ مزمل وکیل بہت مضبوط اور بہت مہنگے وکیل تھے۔

وکیل مزمل آئے تو انہوں نے انسپکٹر سے پوچھا کہ کس کے خلاف کیا چارج

ہے اور انسپکٹر صاحب سرچ اور گرفتاری کے کون کون سے وارنٹ لائے ہیں؟

وارنٹ وغیرہ تو خیر اس وقت نہیں ہیں۔ انسپکٹر نے بتایا کہ گیسٹ ہاؤس کے نئے مالک کے سیاست داں بھتیجے نے جس کا نام معلوم ہوا کہ بزل الرحمٰن ہے' میرے خلاف اپنے ڈرائیور مونگو کو زخمی کرنے اور خود اس پر شاٹ گن سے فائر کرنے کی رپورٹ لکھائی ہے۔ ایک اور رپورٹ اس کے ڈرائیور نے جو فی الحال اسپتال میں ہے' یہ درج کرائی ہے کہ میں نے' یعنی شیر علی نے نہ صرف کلہاڑی مار کر اسے زخمی کر دیا ہے بلکہ اپنے نوکر میرباز کی مدد سے اس کی بیوی سومی کو اغوا بھی کر لیا ہے۔

میں نے سوچا۔ لڑکی کے اغوا کی رپورٹ لکھانے کا مطلب یہ ہے کہ مداری اور اس کے پوتا پوتی اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ جا چکے ہیں یا ہو سکتا ہے وہ لوگ اس بزل الرحمٰن کے چنگل میں ہوں۔ گیسٹ ہاؤس کی تلاشی لینے کا مقصد مجھے پریشان کرنا یا شاید شاٹ گن برآمد کرنا تھا۔

وکیل مزمل' ایسے ہی تو نامی گرامی وکیل نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اپنے دفتر ہی سے میرا پیدائش کا سرٹیفکیٹ لے کر چلے تھے جس کے مطابق میں قانونی اعتبار سے نابالغ تھا اور وکیل صاحب خود ایک اور سرٹیفکیٹ کی رو سے مشرقی پاکستان میں میرے گارجین یعنی سرپرست تھے۔ انہوں نے احتیاطاً کورٹ سے میرباز کی اور میری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کرالی تھی۔

مزمل صاحب نے انسپکٹر کو اپنے چھوٹے کی طرح سمجھایا۔ "کہنے لگے کہ ان چھوٹے موٹے نقلی سیاسی ورکروں کے جھانسے میں آ کر تم کیوں اپنا سروس ریکارڈ خراب کر رہے ہو۔ ایک نابالغ لڑکے پر کسی کی بیوی اغوا کرنے اور گولی اور کلہاڑی چلانے کا مقدمہ قائم بھی کر دیا تو پیروی کس طرح کر سکو گے؟ ڈرائیور مونگو عرف موجدار عرف مجید عرف منگل' پرانا وارداتی اور اسمگلر ہے۔ یہ بات تمہیں دو دن کی چھان بین سے ہی معلوم ہو جائے گی۔ اب جاؤ' معلوم کرو کہ یہ کس چکر میں زخمی ہوا ہے اور شادی کے جھوٹے سرٹیفکیٹوں کا تو سبھی کو پتا ہے کہ کاکسیز بازار میں کہاں تیار ہوتے ہیں۔ مونگو جیسوں کی بیویاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ اس لیے جاؤ' میرا اور اپنا وقت خراب مت کرو۔ ڈرائیور مونگو اسپتال سے فارغ ہو کر آ جائے تو اسے الٹا لٹکا کر پوچھ لینا کہ کلہاڑی کی چوٹیں کہاں کھائی تھیں۔ وہ بتا دے گا۔"

ایسے چاروں کھونٹ تیار وکیل کی موجودگی میں بس یہی ہونا تھا۔ بھتیجا بزل

الرحمٰن بلبلاتا ہوا اور پولیس والے کھسیاتے ہوئے چلے گئے۔

یہ سب تو خیر ٹھیک تھا۔ مشرقی پاکستان سے میرے جاتے جاتے ایک دشمن کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔

وکیل صاحب نے مجھ سے پورا قصہ سنا' کچھ ہدایات دیں پھر وہ چلے گئے۔ میں نے انہیں ریچھ اور مداری والی الجھن نہیں بتائی۔ بات ایسی تھی کہ کسی کو بھی یقین نہ آتا۔ بھلا ایسا کہیں ہوا ہے کہ جھونپڑی سے چھ فٹا ریچھ غائب ہو جائے' اس کی جگہ ایک بڈھا آ موجود ہو۔ مداری کا خون آلود پنجا بھی صرف میری الجھن تھی جس میں وکیل صاحب کو یا کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وکیل صاحب کے جانے کے بعد میں گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے گیا۔ مداری کی جھونپڑی گری پڑی تھی۔ اس کی کچھ چٹائیوں بانسوں کو بھی آگ لگا دی گئی تھی۔ یہ کام رات ہی میں ہو گیا تھا۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ یہ کس کا کام ہے بھتیجے بزل الرحمٰن کا یا خود بوڑھے مداری کا؟

بس ایک بات میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر پھنسا ہوا نہیں ہے تو مداری مجھے بھی غچہ دے گیا ہے۔

شام کو گیسٹ ہاؤس کا نیا مالک مجھ سے ملنے اور افسوس کرنے آ گیا۔ وہ اپنے بھتیجے بزل الرحمٰن کی حرکتوں سے نالاں اور مجھ سے شرمندہ تھا۔ کہنے لگا۔ "تم سے تو بیٹا اس نے جو کیا' سو کیا۔ میرے ساتھ دیکھو کب کی دشمنی نکالی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسے؟"

بولا۔ "ابھی گیسٹ ہاؤس کو میں' اس کا سگا چچا اسٹارٹ کرنے والا ہوں اور شروع میں ہی اس گدھے نے اس جگہ کی بدنامی کرا دی۔ پولیس لے کے آ گیا یہاں۔ میں جانتا ہوں رات میں گولی وولی بھی اسی نے چلائی ہو گی۔"

میں سوکھا سا منہ بنائے افسوس میں سر ہلاتا رہا۔

کہنے لگا۔ "تمہارے والد نے ایک عزت بنائی تھی اس جگہ کی' جس کے لیے میں نے ڈھیر سے پیسے دیے ہیں اور اب دیکھو بازلر نے ساری عزت خاک میں ملا دی۔ اب کون آئے گا یہاں؟" وہ بزل الرحمٰن کو بازلر کہہ رہا تھا جو اس کے نام کے ساتھ صحیح سلوک تھا۔

"توبہ توبہ۔" میں نے ہمدردی کی اور دبے لفظوں میں مشورہ دیا کہ وہ لوگ۔

"بازلر" کو گیسٹ ہاؤس سے دور رکھیں گے تو بے شک کاروبار کر لیں گے۔

رات میں چپکے سے خدا بخش رائیں لوٹ آیا۔ یہ تمام وقت اس نے جنگل گھومنے میں اور شکار میں گزارا تھا۔ وہ اپنی شاٹ گن کسی ٹھکانے کی جگہ رکھ آیا تھا اور شکار کا گوشت اور کھال گیسٹ ہاؤس والوں کے لیے لیتا آیا تھا۔

دن کے واقعات سن کر خدا بخش کہنے لگا۔ "شیر علی باؤ! میں آپ کا خادم ان بزل الرحمٰن جیسوں کو خوب سمجھتا ہوں' علاج بھی کرنا جانتا ہوں۔ باؤ! تم ادھر گیسٹ ہاؤس میں جم کے بیٹھو۔ جب تک میں نہیں آ جاؤں نکلنا مت۔ دو' تین گھنٹے ادھر گزار کے میں جا رہا ہوں۔ کل کسی ویلے رات میں آؤں گا۔"

میں نے پوچھا "کیا کرنے جا رہے ہو؟"

کہنے لگا۔ "ادھر بھی ہر ٹائپ کے آدمی سے سلام دعا ہے میری' میں پتا کر کے آتا ہوں کہ وہ آگے کیا سکیم بنا رہا ہے۔ سمجھے آپ۔ یہ ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا کوئی اور نہیں جا سکتا؟ ابھی آئے ہو تم ہی کیوں جا رہے ہو؟"

خدا بخش بولا۔ "مجھے اس بازلر نے' اس کے بندوں نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ میر باز کو یا دوسرے آدمیوں کو وہ لوگ پہچان لیں گے۔ سمجھے آپ؟"

ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا جب دشمنیاں چل پڑی ہیں تو آگے کا کوئی بندوبست کرنا ہی ہو گا۔"

وکیل صاحب اپنی قانونی کارروائیاں کر کے چلے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ پولیس سے کسی بھلائی کی امید مت رکھنا۔ وہ خوار ہو کے گئے ہیں گیسٹ ہاؤس والوں کی مدد کو آگے نہیں آئیں گے۔

میں اگلے دن گیسٹ ہاؤس ہی میں مصروف رہا۔ نکلا نہیں۔ میر باز نے بتایا کہ نئے نئے لوگ پیدل بھی اسکوٹروں' سائیکلوں پر بھی گیسٹ ہاؤس کے آس پاس چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ میں نے میر باز سے کہہ دیا کہ خود سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر وہ لوگ جھگڑا' توڑ پھوڑ کچھ شروع کریں گے تو پھر دیکھ لیں گے۔

ہمت اور جرات اپنی جگہ مگر ہمارے پاس معمولی لاٹھی' خنجر کے سوا باقاعدہ کوئی ہتھیار' پستول' بندوق کچھ نہیں تھا۔ اور سمجھو ہم تین ہی لڑنے والے تھے۔ خدا بخش کو ملا کے۔ گیسٹ ہاؤس کے بیرے' بٹلر' کک لڑنے جھگڑنے والے لوگ نہیں تھے۔

انہیں زیادہ کچھ بتانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو جاتے۔

آدھی رات کے بعد جنگل کی طرف سے چھپتا چھپاتا خدا بخش رائیں آیا۔ وہ شہر کے موالیوں' وارداتیوں سے بازلر' کے چھینے ہوئے پستولوں کے لیے کارتوس میگزین خرید لایا تھا۔ اس نے بہت قیمتی معلومات بھی حاصل کی تھیں۔

سب سے اہم خبر یہ تھی کہ بازلر غائب ہے اور یہاں کی سب کارروائی اس نے سلہٹ کے ایک غنڈے' جو بور دادا کے سپرد کی ہوئی ہے۔ اسی نے ہمارے محاصرے پر چھ آدمی لگائے ہیں۔ آدمیوں کو کسی طرح کے جھگڑے بلوے کا آرڈر نہیں ہے۔ وہ صرف جو بور دادا کو خبریں پہنچائیں گے اور ہمیں دہشت زدہ رکھیں گے۔ اسی لیے وہ چھپتے نہیں چکر لگاتے نظر بھی آ رہے ہیں۔

میں نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ "بزل الرحمٰن کہاں ہے؟"

خدا بخش کہنے لگا۔ "بازلر کو تو باؤ! کاکسیز بازار میں ہر طرف پوچھ لیا۔ وہ نہیں ہے شہر سے نکلا ہوا ہے۔"

"مداری اور اس کے پوتا پوتی کی کوئی خبر؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "خبر یہ ہے اور بری خبر ہے کہ وہ لوگ بازلر کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس نے مداری کو بچوں سے الگ کر دیا ہے بلکہ شاید تینوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔ لڑکی اور مداری کا تو پتا ابھی نہیں چلا۔ میں نے لوگوں کو لگا دیا ہے۔ ہاں لڑکے کا معلوم ہو گیا ہے۔ وہ یہیں شہر میں ہے۔"

"اچھا؟ کہاں ہے؟"

"نیو ساناگاچھی میں۔"

میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟

خدا بخش ذرا سا مسکرایا۔ اس نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا پھر بولا۔ "وہ ناجدھر وہ گانے بجانے والے اور کنجریاں شنجریاں رہتی ہیں۔ کاکسیز بازار میں بھی اس کو سوناگاچھی کہتے ہیں۔ نیو سوناگاچھی۔"

"ہوں!" میں سوچ میں پڑ گیا۔ سچ بات ہے' مجھے مداریوں کے اس کھانے سے اب کیا تعلق۔ جب تک وہ یہاں پڑوس میں تھے ہم ان کے لیے کچھ کر دیتے ہے۔ خدائی فوج دار تو نہیں ہیں ہم۔ وہ کہیں بھی رہیں' کچھ بھی کریں' اب جو بھی اس بے چارے لڑکے کے نصیب میں ہو گا' جو بھی لڑکی کی تقدیر میں ہو گا غریب بھگت لیں گے۔

خدا بخش نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگے باؤ؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر لڑکا ادھر۔ کیا نام بتایا۔ گانے بجانے والوں کے محلے میں ہے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ وکیل صاحب کے ذریعے پولیس کو خبر کرا دیں۔ وہ آپ ہی چھڑا لائیں گے۔“

خدا بخش نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کہنے لگا۔ ”باؤ! ہم پر حملہ ضرور کرے گا بازلر۔ جے آج نہیں تو کل ضرور کرے گا۔ ہمیں اپنا بچاؤ کرنا ہے۔ سب سے اچھا بچاؤ باؤ شیر علی! یہ ہے کہ ہم اٹیک کر دیں۔ اس لڑکے کو حاصل کر کے ہم اپنے پاس رکھیں۔“

”کیوں بھلا؟“

”او جناب! تاکہ آگے دباؤ ڈالنا ہووے‘ سودے بازی کرنی پڑے تو ہماری پو.جی شن مضبوط ہووے۔“

بات سمجھ میں آ رہی تھی مگر کود پڑنے سے پہلے احتیاط ضروری تھی۔

میں نے کہا۔ ”ہاں ں ں۔ اگر آسانی سے لڑکے کو لا سکیں تو ہم اسے یہاں گیسٹ ہاؤس میں رکھ لیں گے۔ جب تک اس کے لوگ نہیں ملتے۔ کیوں نا؟“

خدا بخش بولا۔ ”یہی سوچ رہا ہوں۔ پر اسے ادھر سے نکالنا اوکھا کام ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ میں نے ہمت بڑھائی۔ چلو کب چلنا ہے۔“

”باؤ صاحب‘ جناب! جانا تو صرف میں نے اور میر باز نے ہے۔“

میں بھنا اٹھا۔ ”تمہارا مطلب ہے میں یہاں عورت کی طرح چھپا بیٹھا رہوں۔

خدا بخش رائیں! سنو۔ یہ میر باز کا یا تمہارا جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا یہ میرا ہے اگر میں نہیں جا رہا تو کوئی نہیں جا رہا۔ ہم سب اس تمام قصے سے دور رہیں گے۔“

خدا بخش سوچ میں پڑ گیا۔ ”پر باؤ! اپنے بنگش صاب کو خبر لگ گئی تو؟“

”کیسے خبر لگے گی۔ بنگش صاحب ہزاروں میل دور ہیں۔ ہم دو تین گھنٹے میں سب کچھ کر کے ادھر آ کے آرام سے بیٹھ جائیں گے۔“

خدا بخش میرے والد کے پرانے اسٹاف میں تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا تھا جس سے اس کے اصل باس کا کوئی نقصان ہو یا وہ خفا ہوں مگر خدا بخش سمجھ گیا تھا کہ اگر اسے یہ نوکری کرنی ہے تو فی الحال بھی اور آگے بھی میں اس کا باس رہوں گا۔ وہ مجھے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے مشورے سے ہم نے چلنے سے پہلے کک کے پاس ایک پرچار کھوا دیا جس میں بعد سلام وکیل کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ میں یعنی شیر علی بنگش

خدا بخش رائیں اور میر باز کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ کک کو ہم نے ہدایت دے دی تھی کہ اگر چوبیں گھنٹے کے اندر اندر ہم گیسٹ ہاؤس نہ واپس پہنچیں تو وہ یہ پرچا وکیل صاحب کو پہنچا دے۔

بازلر اور اس کے گرگے سے چھینے ہوئے دو پستولوں کی وجہ سے ہمارا آپس میں جھگڑا سا شروع ہو گیا۔ خدا بخش کہنے لگا۔ ”ایک پستول تو جناب! میں رکھوں گا اور دوسرا‘ میرا خیال ہے‘ میر باز عمر میں بڑا ہے وہ رکھ لیوے تو اچھا ہے۔“

”اور میں؟ میں ایسا ہی نہتا چلوں گا؟“ میں نے چڑ کر سوال کیا۔

”دیکھیں ناجی‘ اصل میں تو مجھے اور میر باز کو جانا تھا۔ وہ جگہ اس لائق نہیں ہے کہ جی آپ جیسے شریف نوجوان ادھر جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”خدا بخش! یہ شریف نوجوان والی لائن مجھے مت دو۔ میر باز بھی شریف نوجوان ہے تو وہ کیوں جا رہا ہے ایسی جگہ؟“

خیر کچھ دیر جھک جھک کے بعد پستول مجھے مل گیا مگر خدا بخش نے اللہ رسول کے واسطے دے کر مجھے پابند کیا کہ میں کسی بندے پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ ڈرانے یا زیادہ سے زیادہ ہوائی فائر کرنے میں کام آئے گا یہ پستول۔

گھنٹے دو گھنٹے سو لینے کے بعد جس حد تک ممکنہ احتیاط سے یعنی لائٹ جلائے بغیر اور خاموشی سے تیاریاں کر کے ہم گیسٹ ہاؤس سے رخصت ہو کر پچھواڑے کے جنگل میں غائب ہو سکتے تھے‘ ہم غائب ہو گئے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا جو ریسٹ ہاؤسوں‘ ڈاک بنگلوں کے علاقوں سے نکل کر ہم شہر جانے والی بڑی سڑک پر آ گئے۔ اتنی صبح دودھ‘ سبزیاں لے جانے والے اور شہر میں اپنی نوکریوں پر پہنچنے والوں سے بسیں بھرتی جا رہی تھیں۔ ہم تینوں موسم کے حساب سے چادریں اور کمبل لپیٹے‘ مضافات کے لوگوں کا سوانگ بھرے ایک دوسرے سے بے تعلق بس میں بیٹھ گئے۔

دن نکل رہا تھا جب کاکسیز بازار کے مرکزی علاقے میں جہاں سبزی‘ گوشت‘ مچھلی‘ دودھ کی مارکیٹیں کھلتی جا رہی تھیں ہم پہنچ گئے۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بس سے اتر کر الگ الگ سمتوں میں چل پڑے تھے۔ چھوٹی بڑی سڑکوں اور گلیوں سے ہو کر ہم موجمدار ہوٹل پہنچ گئے جو کم خرچ میں صاف ستھرا ناشتا کرا دیتا تھا۔ الگ الگ میزوں پر بیٹھ کر ہم تینوں نے ناشتا کیا۔ پیسے

دیے اور ایک ہی وقت میں ہوٹل سے نکل کر ٹہلتے ہوئے بغلی گلی میں ایک دوسرے سے آن ملے۔

اب ہم ایک ٹیم تھے اور ہماری منزل شہر کا وہ بدنام علاقہ تھا جہاں گانے بجانے والے اور خدا بخش کے کہنے کے مطابق کنجریاں شنخبریاں رہتی تھیں۔

نیو سوناگاچھی جیسے علاقے میں کسی چھاپہ مار کارروائی کے لیے داخل ہونے کا یہ بہترین وقت تھا۔ شام سے رات گئے تک اس محلے میں گانا بجانا اور تماش بینی ہوتی تھی۔ دو تین بجے رات کو یہ بازار ٹھنڈا ہوتا ہوگا۔ اس وقت دن چڑھے بھی سمجھو اس محلے کے لیے آدھی رات تھی۔ چائے خانے اور ہوٹل جو سارے شہر میں منہ اندھیرے ہی کھل جاتے تھے یہاں بند پڑے تھے۔ راہ گیر بھی کم کم ہی تھے۔ انتہائی ضروری چیزوں کے اسٹال یا انڈے ڈبل روٹی کی کوئی کوئی دکان کھلی ہوئی تھی یا پھر سرکاری کارخانے یعنی پولیس چوکی وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ گلیوں میں سناٹا تھا۔

خدا بخش نے ہمیں ایک بیکری کے پچھلے دروازے پر جا کھڑا کیا اور خود اندر چلا گیا۔ بیکری کے پچھلے دروازے پر بھی کچھ لوگ کھڑے تھے۔ کام والے بھی آ جا رہے تھے۔ خدا بخش پہلے بتا چکا تھا کہ یہ بیکری' سائڈ میں افیم چرس وغیرہ فروخت کرتی ہے۔ پچھلے دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں میں وہ نشے باز شامل تھے جو سویرے ہی سویرے نشہ ٹوٹنے پر نئے ڈوز کے لیے بے تاب ہو کر نکل پڑے تھے۔ بیکری کے نوکروں اور نشے بازوں نے جو اپنے چکروں میں پڑے تھے۔ مجھے اور میر باز کو وہاں منڈلاتے دیکھا بھی ہوگا تو غور نہیں کیا۔ ہم جیسے چادروں میں لپٹے اور بھی مشکوک سے لوگ گلی میں اور سڑک پر اپنے صبح کے ڈوز کا انتظار کر رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں خدا بخش ایک ادھیڑ عمر کے برمی نوکر کے ساتھ باہر آیا۔ یہ برمی بیکری کے نوکروں کی طرح تہمد پر آستینوں والی بنیان پہنے تھا اوپر سے پرانا ڈبل بریسٹ کوٹ چڑھائے تھا۔ مجھے پہلی نظر میں یہ برمی کچھ اچکا سا لگا مگر خدا بخش اس سے گھٹ گھٹ کر باتیں کر رہا تھا تو میں نے اس کی شکل ناپسند ہونے کے باوجود اسے گوارا کر لیا۔ ہم تینوں برمی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ ہمیں سوناگاچھی کے سستے ہوٹلوں چائے خانوں کی لائن میں لے گیا۔ ایک ہوٹل کے پچھلے دروازے پر رک کر اس نے جیب سے چابی نکالی اور خدا بخش کو ہنستے ہوئے بتانے لگا کہ جب ہوٹل کے کسی "پاسنجر" کے لیے چوری چھپے "سپلائی" لاتا ہے تو یہی قفل کھول کر ہوٹل میں داخل ہوتا ہے۔ کسی کو کانوں

کان خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کیا لایا۔

خدا بخش ظاہر یہ کر رہا تھا کہ صرف وہی برمی زبان جانتا ہے۔ اس نے بیکری کے نوکر سے پوچھا۔ "کیسی سپلائی؟" نوکر ہنس کر بولا۔ "سب طرح کی۔ باٹلی میں اور پڑیا میں لپٹی بھی اور چادر میں لپٹی بھی۔"

وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس پڑے۔ مجھے یہ اچکا برمی اور بھی گندا لگا مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے ان کی بات میں سمجھ نہیں سکتا۔

پچھلے دروازے سے ہم اس ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ان تنگ و تاریک گندی سیڑھیوں سے چڑھ کر ہم تیسری منزل پر ہوٹل کے ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں اندھیرا تو تھا ہی غسل خانوں' پیشاب خانوں کی سخت ناگوار بو بھی تھی۔ کچھ دیر بعد وجہ سمجھ میں آ گئی۔ یہ کمرہ یا کوٹھری ہوٹل کے مشترکہ باتھ رومز کے نگراں جمادار کی کوٹھری تھی۔ جمادار یا شاید وہ جمادارنی تھی جو ٹوٹے اسپرنگوں والی چارپائی پر دراز تھی۔ برمی نے بہت مشکل سے اسے بیدار کیا۔ اس نے چارپائی سے اٹھ کر کوٹھی کی لائٹ جلائی پیلا سا بلب روشن ہو گیا۔ روشنی میں پتا چلا کہ باتھ رومز نگراں نہ جمادار ہے نہ جمادارنی ہے۔ کھسرا یعنی زنخا ہے اور دیہاتی عورتوں کے کپڑے پہنے ہے۔

زنخے نے ہاتھ چلاتے' تالی پھٹکارتے ہوئے پہلے تو برمی پھر اس کی زبان میں غصہ کیا کہ اس نے سوتے سے اٹھا دیا۔ کہنے لگا۔ "بھلا یہ کوئی وقت ہے کسی کو اٹھانے کا؟" پھر جب برمی نے دھیرے سے کچھ کہا۔ کوئی نام لیا تو زنخے نے غصہ ختم کر کے خوشامد میں تالی پھٹکارنا شروع کر دی۔ بنگلا میں بولا۔ "ایسے بھدر' بڑے لوگوں کو کوٹھریا میں کیوں لے آیا۔ چل بالکونی میں لے جا کر بٹھا میں آتی ہوں۔"

خدا بخش نے کہا۔ "ہم بیٹھنے نہیں آئے ہیں جہاں لے جانا ہے لے چل۔"

بیکری کا نوکر ہمیں غسل خانوں کے پاس کھڑا چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ یہاں کے بعد زنخے کو ہماری رہبری کرنا تھی۔

ہوٹل سے ہمیں لے کر نکلا تو وہ سڑک پر بالکل خاموش اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اچانک وہ مڑا اور پیچ دار گلیوں کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے اپنی رفتار کم کر لی تھی۔ ہم چاروں ایک چھوٹے گروہ کی صورت میں تنگ گلیوں سے گزرے تو اکا دکا راہ گیر ہمیں دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ یہ زنخے کی وجہ سے تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔

اچانک وہ ایک جگہ رک گیا۔ سرگوشی میں کہنے لگا۔ "میں دور سے وہ گودام بتا دیتی ہوں جس میں انہوں نے لڑکے کو بند رکھا ہے۔ گودام میں گھسنا آسان نہیں ہے۔ میں پھر کہے دیتی ہوں ہوشیاری سے جانا' مگر پہلے مجھے نکل جانے دو۔ کسی نے تم لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھ لیا تو بعد میں میرا___ " اس نے اپنے حلق پر دو انگلیاں چلا کر قتل کا اشارہ کیا۔

خدا بخش نے جیب سے پچاس روپے نکال کر زنخے کو دیے۔ وہ خوش ہو کر دعائیں دیتا ہوا جانے لگا پھر رک کر بولا۔ "پانچ منٹ رکو مجھے نکل جانے دو۔ ابھی ایک دم مت گھس پڑنا۔"

خدا بخش نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ویسے بھی دیر لگے گی ہمیں۔" اور ہم لوگ سنسان گلی میں ایک طرف کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔

زنخا مڑ کر پلک جھپکتے میں گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ خدا بخش نے ادھر ادھر دیکھ کر مجھے اشارہ کیا اور خود بھی اپنا پستول فائر کے لیے تیار کر لیا۔ ہیجڑے نے جو گودام بتایا تھا اس کے دو رخ' دو گلیوں میں کھلتے تھے۔ یقیناً دونوں طرف دروازے ہوں گے۔ جس رخ پر ہم کھڑے تھے اس طرف بڑے پھاٹک میں تالا پڑا تھا۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے دوسرا رخ دیکھ لینا ضروری تھا۔

تینوں خاموشی اور احتیاط سے تیز تیز چلتے ہوئے گلی میں گھومے تاکہ گودام کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں مگر ہم ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ یہ ٹرک ایک دم کونے پر بہت غلط طریقے سے پارک کیا گیا تھا۔ ہم تینوں نے ذرا گھوم کر ٹرک سے آگے گلی میں نکل جانا چاہا پھر ہم حیرت میں رکے اور جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔

چھ آدمی اپنی رائفلیں چھتیائے ہم تینوں کو نشانے پر لیے سکون سے ٹرک کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ساتویں آدمی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا اور یہ آدمی بزل الرحمٰن بازلر خود تھا۔

بازلر نے اپنی بنگالی اردو میں کہا۔ "آجاؤ آجاؤ پٹھان بھائی! اب دفے کوئی گوڑ بوڑ نہیں کرنا۔ یہ گیسٹ ہاؤس کا ایریا نہیں ہے' رونڈی بزار ہے۔ ادھر ہم کو مار کے فیک دے گا کوئی نہیں پوسے گا۔ گولی مولی برابر چولتی ہے ادھر۔ کوئی نہیں پوستا۔ ہاں۔"

خدا بخش کے اور میرے ہاتھ میں بے شک بھرے ہوئے پستول تھے لیکن ہماری ناکوں سے دو' دو ڈھائی ڈھائی فٹ دور تیار رائفلوں کی نالیں تھیں۔

بازلر کے آدمیوں نے خاموشی سے اپنے مالک کے پستول ہمارے ہاتھوں سے لے لیے۔ ہم تینوں کی تلاشی لی' سب پیسے ہتھیا لیے' میرباز کے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور خاموشی سے ہم تینوں کو ٹرک میں بٹھا دیا۔ وہ لوگ منظم انداز میں ایک ایک کر کے ٹرک میں آبیٹھے۔ ایک کے سوا سب نے اپنی رائفلیں ٹاٹ کے ٹکڑوں میں لپیٹ کر سیٹوں کے نیچے رکھ دیں پھر سب اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھ ہاتھ بھر کے بھاری پائپوں سے انہوں نے ہمیں مارنا بلکہ کوٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے زیادہ حملے سروں پر کیے۔ چھ آٹھ منٹ بھی نہ لگے ہوں گے جو میں بے ہوش ہو گیا۔ کسی قسم کی تکلیف یا چوٹ کا احساس نہ رہا۔

آخری آواز جو میں نے سنی میرباز یا خدا بخش رائیں کی کراہیں تھیں۔ کسی نے بنگلا میں کوئی حکم دیا تھا اور ٹرک تھرتھرا کر اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

میں کتنی دیر بے ہوش رہا اس کا تو اندازہ نہیں۔ جب ہوش آیا تو یکساں رفتار سے گاڑی کا انجن چلنے اور مردوں کے سر ملا کر گانے کی آواز آرہی تھی' میری آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ میں سر اور گردن کی تکلیف کی وجہ سے گھوم نہیں سکتا تھا۔ ایک ہی رخ سے پڑا رہا اور اپنے اغوا کرنے والوں سے بنگلا زبان کے گیت سنتا رہا۔ زیادہ تر کھیتوں کھلیانوں میں گائے جانے والے گیت تھے۔

خدا معلوم ڈھائی' تین گھنٹے یا چار گھنٹے یہ گاڑی چلتی رہی۔ بدن کی تکلیف' بھوک اور پیاس سے میں بے حال ہو رہا تھا۔ فطری ضرورت بھی ستا رہی تھی مگر انہوں نے منہ پر کسی قسم کا ٹیپ چپکا دیا تھا۔ بس "اوں اوں غوں غوں" کی آوازیں نکال سکتا تھا جن پر وہ توجہ نہیں کر رہے تھے۔ آخر کو ٹرک روک دیا گیا۔ دو' دو تین تین آدمیوں نے کھینچتے ہوئے اور لاتیں گھونسے مارتے' گالیاں دیتے ہوئے ہمیں ٹرک سے اتار کر کھیتوں جھاڑیوں میں رو کے رکھا۔ مٹی کے برتنوں میں پانی پینے کو دیا اور ابلی ہوئی شکر قندی اور کچے سنگھاڑے کھانے کو دیے اس تمام عرصے میں کہ ہم کھیتوں میں خلا بھریں تھے نہ تو انہوں نے ہماری آنکھوں سے پٹیاں کھولی تھیں نہ ایک کو دوسرے سے بات کرنے دی تھی۔ آدھے پون گھنٹے بعد انہوں نے ہمیں پھر کھینچتے اور گالی گلوچ کرتے ہوئے ٹرک پر چڑھا دیا۔ ٹرک چل پڑا تو انہوں نے ہمارے بارے میں باتیں اور مذاق کرنا شروع کر دیا' باتوں میں زیادہ تر دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ ہم نے بازلر صاحب کو بہت خفا کر دیا ہے کہ اب وہ شاید ہی ہمیں معاف کرے گا۔ تینوں کو شوٹ کرا دے گا۔ سب

سے زیادہ بکواس وہ میرے بارے میں کر رہے تھے کہ اسے دیکھ پٹھان بھائی کو عمر ہی کیا ہے اس کی' زمین سے اگا ہے ابھی اور بد معاشی کرنے "رونڈی پاڑے" میں آگیا ہے۔

اور دو گھنٹے یہ ہمارا قیدیوں والا ٹرک چلتا رہا پھر شاید ہماری منزل آگئی۔ ہم کسی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تھے۔ ٹرک روک دیا گیا تھا۔ ہمیں اتارا گیا۔ بندشیں' پٹیاں کھول دی گئیں۔ خدا بخش کی حالت سب سے ابتر تھی اسے انہوں نے بہت مارا پیٹا تھا۔ سر پھاڑ دیا تھا۔ میر باز بھی زخمی ہوا تھا۔ جہاں ہم اترے تھے اونچی دیواروں والے اس احاطے میں ایک طرف کسی قسم کا کارخانہ قائم تھا۔ کئی چھوٹے بڑے اسٹور ہاؤس اور ایک انتظامی بلڈنگ نظر آ رہی تھی۔

ہمیں انتظامی بلڈنگ کے کمروں میں الگ الگ بند کر دیا گیا۔ لگتا تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے کمروں کو ہمارے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کرسیاں' میزیں' دیواروں پر لگے کسی قسم کے چارٹ یا نقشے' تصویریں وغیرہ سب ہٹا دیا گیا تھا۔ بس دیواروں اور فرش پر ان کے نشان نظر آ رہے تھے۔ بیچوں بیچ فرش پر ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالا رکھا تھا۔

یہ تھا میرا قید خانہ۔ میں نے سوچا خدا بخش اور میر باز کو بھی اسی طرح رکھا گیا ہو گا۔ یا ہو سکتا ہے بے چارے ملازم ہیں انہیں اور تکلیف میں رکھا ہو۔

بے آرام' لمبے سفر کی تھکن اور چوٹوں سے میں بے حال تھا۔ کچھ دیر تکلیف سے کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ خدا معلوم تین' چار کہ چھ گھنٹے بعد آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر سلاخوں لگی کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کچھ اجالا سا آ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیا۔ پانی پی کر آیا۔ بھوک کا احساس بڑھ گیا تھا۔ میں پھر گدے پر آلیٹا۔

والد صاحب نے ہمیں' اپنے بچوں کو آرام میں رکھا تھا مگر آرام و آسائش میں ہمیں نرم نہیں بننے دیا تھا۔ سختیاں جھیلنے کی عادت بھی ڈالی تھی۔ میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بھوک سے بدن کی دکھن سے جتنی دیر بچت ہو سکے اچھا ہے۔ نیند اچھی پناہ ہوتی ہے۔

مگر نیند نہ آئی۔ اسی سیاسی کارکن بزل الرحمٰن کی مجرمانہ حرکتیں ایک ترتیب سے یاد آنے لگیں۔ بوڑھا مداری یاد آیا اور وہ ریچھ۔ ریچھ جس کا آنا اور جانا میں سمجھ نہیں پایا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر سمجھنا چاہتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ مداری اور اس کے پوتا پوتی سے پھر ملوں گا اور یہ مسئلہ حل کروں گا۔ چند گھنٹوں کی بات ہے ہم لوگوں

نے گیسٹ ہاؤس سے چلتے وقت کک کے سپرد جو پرچا کیا تھا۔ چوبیس گھنٹے پورے ہونے پر وہ اسے وکیل صاحب کے حوالے کر دے گا۔ وکیل نیو سوناگاچھی کے اس پہلے رابطے یعنی بیکری کے برمی ملازم سے معلوم کریں گے پھر اس کھسرے جمادار کو پکڑیں گے۔ ممکن ہے کل دوپہر تک یا زیادہ سے زیادہ شام تک اس بدمعاش بازلر کو دھر لیا جائے گا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تو میں اور میرے دونوں وفادار ساتھی گیسٹ ہاؤس میں ہوں گے۔

یہی سب پر امید باتیں سوچتا ہوا میں پھر سو گیا۔ اب جو آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ باہر کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آ رہی تھی۔ انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا بیٹری کمزور تھی۔

میں یہ غیر متعلق بات سوچ رہا تھا کہ بڑی آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا اور تیزی سے بازلر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا دوسرے میں اخبار۔ ایک نوکر کرسی اٹھائے بازلر کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ نوکر کے شانے پر بیلٹ پڑی تھی جس کے ہولسٹر میں پستول تھا۔ اس نے میرے گدے کے سامنے کرسی بچھا دی۔ بازلر بیٹھ گیا۔ گارڈ کرسی کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا۔

بازلر نے بیٹھتے ہی پرچا میری طرف بڑھا دیا۔ "لے اس کو پڑھ لے۔" وہ نہ معلوم کیوں مجھ سے اپنی فضول اردو میں بات کر رہا تھا جب کہ اسے معلوم تھا کہ میں بہت اچھی بنگلا بولتا ہوں۔

میں نے پرچا ہاتھ میں لیا اور سناٹے میں بیٹھا رہ گیا۔

یہ میرا وہ رقعہ تھا جو میں وکیل صاحب کے نام کک کے پاس ان ہدایات کے ساتھ چھوڑ آیا تھا کہ چوبیس گھنٹے تک ہم نہ آئیں تو رقعہ وکیل کو پہنچا دینا۔

بازلر بولا۔ "یہ سومز تا ہوں تمی بانگلا اچھا پوڑھ سکتا ہے۔ ابھی یہ بھی پوڑھو۔" اور اس نے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا بنگلا کا اخبار میرے سامنے گدے پر ڈال دیا۔

اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر کو بازلر نے سرخ روشنائی کا حاشیہ لگا کر نمایاں کیا ہوا تھا۔ میں نے پڑھا۔ یہ خبر تھی کہ مقامی مسلم لیگی رہنما مزمل حسین ایڈووکیٹ کے آفس پر حریف سیاسی جماعت کے پرجوش کارکنوں نے ہلا بول دیا اور دفتر میں توڑ پھوڑ مچائی۔ ایڈووکیٹ مزمل کو اس ہنگامے میں سر پر چوٹیں آئی ہیں۔ انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

خبر پڑھ کر میں بازلر کی طرف دیکھنے لگا۔ کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بازلر مجھے دیکھ کر

مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ "پیپر لکھتا ہے اس کا حالت خوطرے سے باہر ہے۔ صئی بات
اس کا جان کو کوئی خوطرہ نہیں ہے ایڈووکیٹ موجومل حسین مرے گا نہیں۔ دس
سال ایسائی جندہ رہے گا۔ نہ کچھ بول سکے گا نہ لکھ پوڑھ سکے گا۔ بس کھانا کھائے گا،
گا، جاگے گا جندہ رہے گا۔ اس کا سر میں چوٹ لگا ہے۔ ربڑ کے ڈونڈے سے بہت چوٹ
ہے سیاسی حریف لوگ نے چچ چچ چچ۔ ابھی تمہارا معاملہ بھی فش ہے۔ ایک دم کھوتم
ادھر سو آرام سے ناشتا کھاؤ، کھانا کھاؤ اور بس خلاص ایک دم کھوتم۔"

یہ کہہ کر بازلر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے باڈی گارڈ نے اخبار، رقعہ اور کرسی
اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔ باہر سے کنڈا چڑھانے اور تالا ڈالنے کی
آئی۔ ان دونوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر گاڑی نے سلف اٹھایا ایک بار
کرنے کے بعد انجن اسٹارٹ ہو گیا اور گاڑی چلی گئی۔ فش! ختم! ایک دم ختم!۔

میں جسے معمولی جھگڑا سمجھ رہا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑی بات بن چکا ہے۔ میں
بے آسرا بوڑھے مداری کی مدد کی اور ایسے خطرناک آدمی کی دشمنی مول لے لی۔
مزمل نے مجھے بچانے کے لیے پولیس کو اور اس سیاسی کارکن نہیں، بدمعاش بزل الر
کو قانونی گرفت سے بے اثر کر دیا اور دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے ذلیل کیا۔ یہ
بازلر کو کھا گئی۔ وہ خود کو بڑا لیڈر سمجھتا ہے، ایک خاص انداز سے طاقت ور تودہ ہے
کیوں کہ اس نے کامیابی سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اغوا کیا ہے اور مزمل ایڈو
کو بے کار کر دیا ہے۔ شاید ہمیشہ کے لیے مگر کیا اتنی چھوٹی بات کے لیے بازلر نے
پوری طاقت استعمال کی ہو گی۔ صرف توہین کا بدلہ لینے کو یہ سب کیا ہو گا؟

اور یہاں میں نے سوچتے سوچتے انکار میں سر جھٹکا۔ بات کوئی بہت بڑی
مجھے سکون سے اس قید خانے میں بیٹھ کر انکشاف کی اگلی حیرت ناک قسط کا انتظار
چاہیے اور یہ اگلی قسط بھی خود بزل الرحمٰن لے کر آئے گا۔ اسے ہر چیز کو ڈرامے
ساتھ پیش کرنا آتا ہے۔

میرے کرنے کو فی الحال کچھ نہیں تھا۔ میں پھر ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔
صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہو گئی۔ کوئی نہیں آیا۔ بہت بھوک ستاتی تو
اٹھ کر پانی پی لیتا مگر خالی پیٹ پانی بھی اب معدے کو تکلیف پہنچانے لگا تھا کہ مجھے
پیاس پر قابو پانا بھی سکھایا تھا۔ والد صاحب نے۔ کہتے تھے جنگل ہماری زندگی ہے
بھول جائیں۔ زخمی یا بے کار ہو جائیں تو یہ جنگل ہماری موت بھی بن سکتا ہے۔

نے کم سے کم خوراک پر زیادہ دیر زندہ رہنے کے کچھ گر بتائے تھے مگر یہاں تو کچھ بھی
نہیں تھا جس کو بنیاد بنا کر زندگی کو طول دینے کا، کوئی گر استعمال کیا جاتا۔ مجھے تو کچھ کھائے
بھی چوبیں گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ کیا بازلر کمزور کرنا چاہتا ہے مجھے؟ جب بھوک اور
تنہائی سے میں نرم پڑ جاؤں گا تو وہ چوٹ لگائے گا اور اپنا مقصد حاصل کر لے گا۔ کیا یہ
چاہتا تھا بزل الرحمٰن؟

مگر مقصد کیا ہے اس کا؟ اس سوال کا جواب مجھے ابھی نہیں ملے گا۔ ابھی انتظار
کرنا ہوگا۔

میرے سرہانے کوئی چیز آ کر گری۔ میں نے پہلے توجہ نہ دی۔ پڑا رہا پھر کچھ اور
گرا شیشے کی سی آواز تھی۔ بہت ہلکی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ سرخ شیشے کے دو ٹکڑے
پڑے تھے میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیے، دیہاتی چوڑی کے ٹکڑے تھے۔ یہ کہاں سے
گرے ہیں؟ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سرہانے ایک روشن دان تھا۔ روشن دان سے
میرے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا آ کر گرا۔ ادھر کوئی ہے شاید میرے ساتھیوں
میں سے کوئی جو اشارے دے رہا ہے۔ میں نے آہستہ سے اٹھ کر دیوار سے کان لگا دیا۔
میرے کمرے میں شیشے کا ایک اور ٹکڑا آ گرا۔ میں نے دیوار پر تھپکی دی۔ جواب میں
ادھر سے کسی نے دیوار پر ہاتھ مارا۔

میں نے کھڑے ہو کر روشن دان کی طرف منہ کر کے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"ادھر سے کوئی جواب نہ آیا، کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ میں نے پھر دیوار پر ہاتھ
مارا۔ جواب میں ادھر سے دیوار تھپکی گئی۔

میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"سور نہیں کرو۔ آہستے بات کرو۔" کسی لڑکی کی آواز تھی۔ روشن دان کے
دوسری طرف لڑکی تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا۔ "پھر کہو، کیا کہہ رہی
ہو؟"

"میں ہوں ان کا کھانا پکاتی ہوں۔"

کھانے کا نام سن کر جیسے میں نہال ہو گیا۔ "میں بھوکا ہوں۔"

"مجھے کھبر ہے۔"

"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" میں نے جیسے التجا کی۔

"بہت مشکل ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں وہ۔ جب کھانا پا
ہوتا ہے یا میری جرورت ہوتی ہے تو لے جاتے ہیں۔"

"اوہ!" میں اور کیا کہتا۔

"وہ بولی۔ "کچھ کھائے تمہیں ایک دن ایک رات گجر گئی ہوگی؟"

"ہاں۔"

"دیکھو وعدہ تو نہیں کرتی۔ صبو تمہارے لیے کچھ لاؤں گی کوسس کروں گی۔"

"صبح؟ یعنی کل؟"

"ہاں۔"

"یہ کیا جگہ ہے؟"

"کارکھانہ ہے کوئی۔"

"نہیں شہر کون سا گاؤں بتاؤ کون سا ہے؟"

"باگھیر پوڑی۔"

"کون سا ضلع لگتا ہے؟ قریب کا شہر کون سا ہے؟"

بولی۔ "یہ نہیں مالم۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟"

"چاٹوگرام سے۔" خوب' تو وہ چٹاگانگ کی رہنے والی تھی۔

"کیوں پکڑا ہے تمہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ الگ ہی ایک بات شروع کر دی' بولی۔ "تم تین ا
لائے تھے' وہ تین میں سے تم کون ہو؟ بڑی عمر کے مرد؟ اچھے کپڑے والے' یا چوکی دا
جیسے؟" اس نے ہمیں ٹرک سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

میں ہنس پڑا۔ "اسے بتایا کہ چوکیدار جیسا جو ہے وہ چوکیدار ہی ہے اور بڑی ع
والا مرد' میرے باپ کا ڈرائیور ہے۔ ابھی چھٹی پر ہے۔" میں تین میں سے وہ ہوں جے
تم اچھے کپڑے والا کہہ رہی ہو۔"

وہ بھی ہنسنے لگی۔ "تو تم صاحب ہو؟ بند کرنے والوں کو اصل کام تمہی سے
ہے؟"

میں چوکنا ہو گیا۔ 'کام؟ تمہیں پتا ہے مجھے کیوں لائے ہیں؟"

"نا۔ یہ تو نہیں مالم۔ بس یہ سنا تھا تم سے کوئی کام ہے ان لوگ کو۔"

"وہ لوگ' تم سے بات کرتے ہیں؟"

"ہاں' پر کم کم۔"

"ان سے پوچھنا مجھے کیوں لائے ہیں؟"

"نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔"

"تمہیں مارتے ہیں؟"

"چپ! کوئی آرہا ہے۔"

دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سنائی دی۔ کسی نے بہت دھیرے سے کچھ کہا تھا۔ کوئی مرد تھا۔ لڑکی نے بلند آواز میں پوچھا۔ "کیوں؟" جس پر آنے والے نے "شش" کہہ کر اسے چپ کرایا' پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے ہاتھاپائی ہو رہی ہو۔ شاید اسے کھینچ کر کہیں لے جایا جا رہا تھا پھر دروازہ بند ہو گیا اس کے بعد سناٹا۔

اتنی دیر تک روشن دان کی طرف منہ اٹھائے لڑکی سے باتیں کرتے میں تھک گیا تھا۔ بھوک نے واقعی کمزور کر دیا تھا۔ میں آ کر لیٹ گیا۔

سوچنے لگا لڑکی نے وعدہ کیا ہے۔ وہ صبح ضرور میرے لیے کھانے کو کچھ لائے گی۔ ہو سکتا ہے قید کرنے والے رات ہونے سے پہلے مجھے کھانے کو کچھ دے دیں۔ صبح تو بہت دیر میں ہوگی۔ اگلا روز بہت دور ہے۔ میں لیٹا رہا' سوتا' جاگتا اور کھانوں کے خواب دیکھتا رہا۔

کتنی بار سویا' جاگ اٹھا۔ صبح ہو چکی تھی جب کوئی چیز گرم اور نرم سی مجھ پر آ کر گری۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے سمجھا کوئی چھوٹا جانور گرا ہے پھر دوسری طرف سے کمرے کی دیوار تھپتھپائی گئی۔ لڑکی کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "مل گیا؟" اوہ! میں نے ہلکے اجالے میں سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ابلا ہوا آلو تھا۔ ابھی تک گرم تھا۔ میں نے آلو کو چھیلنے کا بھی تکلف نہ کیا۔ شروع ہو گیا۔ منہ چلاتے ہوئے میں نے بے ڈھنگے پن سے جواب دیا۔ "ہاں مل گیا۔ مہربانی تمہاری۔"

لڑکی کی آواز آئی۔ "اچھا یہ اور لو۔" اس نے کھانے کو پھر کچھ پھینکا ہوگا جو واپس ادھر ہی جا گرا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ "ٹھہر جاؤ پھر پھینکتی ہوں۔" اس نے پھر پھینکا یہ

فروٹ بن تھا' باسی تھا مگر گیہوں' دودھ' چینی' کشمکش۔ ان سب نعمتوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ لڑکی نے ایک اور ابلا ہوا آلو پھینکا۔ میں نے اسے چھیل کر کھایا۔ پانی پیا۔ اس نے افسردہ آواز میں کہا۔ "اور کچھ نہیں ہے۔ پیٹ تو نہیں بھرا ہو گا تمہارا؟"

"پرواہ نہیں۔" میں نے پانی پی لیا تھا تو پیٹ بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ "مہربانی تمہاری۔ ارے ہاں تم نے نام تو بتایا نہیں اپنا۔"

"روپالی۔"

"خوبصورت نام ہے اتی شوندر' بہت سندر۔"

"بس نام ہی سندر ہے۔"

میں نے چہکتی آواز میں کہا۔ "یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ میں تمہیں دیکھوں گا تو بتاؤں گا۔"

"کھوب صورت تم ہو۔ میں نے دیکھا ہے تم کو۔ گورے' سفید' لمبے اونچے۔"

میں نے کہا۔ "گورا' پیلا' نیلا' لمبو' چھوٹو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اصل خوبصورتی کچھ اور ہوتی ہے۔ تم بہت اچھی ہو گی مجھے معلوم ہے۔ جو لڑکی بھوکے کا پیٹ بھرے بہت حسین ہوتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ ٹھہر ٹھہر کر ہنستی رہی پھر آہستہ سے کہ میں بہ مشکل سن سکا کہنے لگی۔

"میں آؤں گی۔ تمہارے پاس اس کمرے میں آؤں گی۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔ یہ خیال کہ جس نامعلوم لڑکی کی میں آواز سنتا ہوں' اس وقت سن رہا ہوں وہ کسی طرح یہاں' میرے پاس آسکتی ہے' آئے گی۔ یہ خیال مجھے مست اور سرشار کر گیا۔

وہ آہستہ سے بولی۔ "اب جا رہی ہوں بہت کام پڑا ہے۔"

"اچھا جاؤ۔ تم بہت اچھی ہو۔"

وہ جواب میں ہنس دی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

پیٹ بھر گیا تو مجھے اپنی فکر نہ رہی۔ میں خدا بخش اور میرباز کے بارے میں سوچتا رہا۔ خدا معلوم کس حال میں رکھا ہو گا انہیں میرباز بھوک کا کچا ہے۔ وہ تو بہت پریشان ہو گا۔

میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں گزارا ہوا اپنا اچھا وقت یاد آ رہا تھا۔

کچھ دیر ٹہل کر گدے پر جا بیٹھا پھر لیٹ گیا اور سو گیا۔

میں دروازہ کھلنے کی آواز سے اٹھا تھا۔ دو آدمی کمرے میں آئے تھے۔ ایک تو ہی ہتھیار بند بدمعاش تھا جو بازلر کے ساتھ اس کی کرسی اٹھائے پہلے آ چکا تھا۔ دوسرا بھی مسلح تھا۔ وہ ناشتے دان لے کر آ رہا تھا۔

بغیر کچھ کہے انہوں نے ناشتے دان میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اری باری دونوں کی صورتیں دیکھتا گیا۔ نئے آدمی نے کچی اردو میں کہا۔ "تمی کاؤا سے۔"

میں نے مسکرا کر دیکھا بنگلا میں اس کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے دان کھینچ لیا۔

مجھے بنگالی بولتے سن کر نیا آدمی مسکرایا' بولا۔ "توم تو بہت اچھی بنگلا بولتے ہو۔"

پرانے آدمی نے منہ بنایا اسے ڈانٹ دیا۔ کہا۔ "چپ کرو۔ قیدی سے بات رنے کا آڈر نہیں ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ نیا آدمی اپنے ساتھی کے دھونس جمانے پر اسے گھور کر دیکھنے لگا تھا۔

مجھے مزا آ رہا تھا میں نے پرانے آدمی کا لفظ دہرایا۔ "آڈر؟ واہ بیٹا!"

پرانے نے ہتھیار میری طرف سیدھا کر لیا۔ "چپ بیٹھ کر کھا لے نہیں تو یرے دانت توڑ دوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ناشتے دان کھولنے لگا۔ ناشتے ان میں چاول' دال اور سبزی تھی۔ میں نے تھوڑا کھانا بچا دیا۔

پرانے والے گرگے نے حیرت سے دیکھا۔ اسے یہ توقع ہو گی کہ میں اور کھانا انگوں گا۔

ناشتے دان اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں مسکرا کر یکھا اور کہا۔ "لے' باقی تو کھا لے۔"

پرانے نے گالی بکی اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے ناشتے دان اٹھا لیا۔ ونوں چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

پتا نہیں دال یا سبزی باسی تھی جو تھوڑی دیر میں مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے وچا۔ "لڑکی کے آلو اور بن کھا لیا تھا وہی ٹھیک تھا۔ مجھے ان بدمعاشوں کا لایا ہوا کچرا نہیں ھانا چاہیے تھا۔" مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے پانی پیا۔ لڑکھڑاتا ہوا بستر تک پہنچا اور بے سدھ ہو کر گر گیا۔ سر

گھومے جارہا تھا ایسا لگتا تھا' جیسے دھیرے دھیرے گدا فرش پر ڈوبتا جارہا ہے۔ میں نے گ
کر اٹھنا چاہا۔ اٹھ نہ سکا لیٹ گیا۔

کب آنکھ کھلی' نہیں معلوم۔ آنکھ پوری طرح کھلی بھی نہیں تھی پھر بھی
چھت نظر آئی کپڑے کی چھت اس پر شوخ رنگوں کے پھول چھپے ہوئے تھے۔ چڑیاں
تھیں۔ چھت مجھے اچھی لگی۔ جی چاہا کہ ہنسوں' ہنستا رہوں۔

پھر دیواروں پر نظر پڑی۔ طرح طرح کے کیلنڈر' تصویریں' جاپانی عورتوں
تصویریں دگلے پہنے ہوئے' چھتری لیے ہوئے عورتیں' شیشے جڑے فریم میں ہیٹ لگا
ہوئے انگریز' جن کی میمیں' پروں والی ٹوپیاں پہنے' شکار کرتے ہوئے گورے'
چلاتے حبشی' ایک حبشی پر حملہ کرتا ہوا ببر شیر' کالے حبشی کا بہتا ہوا سرخ خون۔ میں
پریشان ہو کر تصویروں سے نظر ہٹالی پھر دیکھا تو بڑی بے شرمی کی ایک تصویر نظر آ
عورت کچھ نہیں پہنے ہوئے۔ کالی سینڈلیں اور گلے میں موتیوں کی مالا' بس اور ا
عورت کی تصویر دانتوں سے پھول پکڑے ہوئے اور بس سینڈلیں بھی نہیں یہ کیا
ہے؟

ریڈیو سیٹ پر' دیواروں پر' یہی تصویریں۔ کونے میں گراموفون باجا اد
پھول کی شکل کا بڑا سا بھونپو۔ سامنے کتا بیٹھا ہوا۔

میں نے کروٹ بدل لی۔ بستر پر پھول' پھولوں کی تیز خوشبو سے چھینک آگئ
کوئی پاس بیٹھا تھا۔ جس نے میرے ہاتھ میں ایک پھول پکڑا دیا۔ شیشے کا لہ
پھول چھت کے کپڑے کی چڑیوں پر میری نظر پڑی' بہت ہنسی آئی میں نے پھول
چڑیوں کی طرف بڑھادیا۔ تیز روشنی ہوئی پھول میں شبنم ہو گی جو مجھ پر اور برابر میں
اس لڑکی پر گری مگر شبنم میں بہت تیز بو تھی پھر زبردست روشنی کا ایک اور جھماکا ہوا
اس سے بھی شبنم کی بو دور نہ ہوئی کوئی ہنس رہا تھا۔ شاید وہی لڑکی ہو گی۔

اس کے بعد اور کتنی دیر سوتا رہا نہیں معلوم۔ کروٹ بدلی تو لگا جیسے کہیں
سر پر' دماغ میں ہتھوڑے برس رہے ہیں۔

ایک لمبے سفید کوٹ والا آگے آیا۔ اس نے آلہ لگا کے دیکھا' آنکھیں چیر
دیکھیں۔ کہنے لگا۔ "آپریشن ہو گا۔"

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا' مگر میری زبان موٹی ہو رہی تھی۔ خود اپنی آ
عجب لگی۔

"زہر پھیل گیا ہے اور کس بات کا؟ باسی سالن کھایا تھا تم نے آپریشن ہو گا۔"

مجھے اس وقت کوئی فکر نہیں تھی۔ "ٹھیک ہے کرلو آپ رے شن۔"

"اس کاغذ پر دستخط کرو۔" کوٹ والا بولا۔

میں نے موٹی زبان میں پوچھا۔ "قاغذ قس...... کس بات کا؟"

"تمہاری اجازت سے آپریشن کریں گے۔ اسپتال ذمے داری نہیں لیتا اگر کچھ
ہو گیا تو۔"

میری سمجھ میں یہ بات آگئی۔ "اسپتال کہاں ہے؟"

سفید کوٹ والے نے دیواروں کی طرف ' چھت اور فرش کی طرف ہاتھ
پھیلایا۔ "یہ ہے نا۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی' مگر سر بہت درد کرتا تھا۔ "کرلو آپریشن' مگر
میرے والد صاحب کہاں ہیں؟"

"باہر برآمدے میں۔"

"انہیں بلاؤ' پھر کرنا آپ رے شن۔" ہاں یہ بات میں نے ٹھیک کہی۔

سفید کوٹ والا خفا ہو گیا۔ "دستخط نہیں کرو گے تو ہم آپریشن نہیں کریں
گے۔ مر جاؤ گے۔"

"اچھا۔"

"اٹھو۔" کوٹ والے نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ "اٹھو' یہاں دستخط کرو۔
جلدی' نہیں تو وہ لوگ برآمدے سے چلے جائیں گے۔"

"کون؟ میرے والد صاحب؟"

"ہاں۔" کوٹ والے نے میرے ہاتھ میں قلم دے دیا اور سامنے بہت سے کاغذ
رکھ دیے وہ کہتا۔ "یہاں" اور میں دستخط کر دیتا۔ ایک بار کہنے لگا۔ "ہاتھ سنبھال کے۔ کیا
کرتے ہو ہاں خوب سنبھال کے۔"

"اور کتنے کاغذ ہیں؟" مجھے فکر تھی کہ والد صاحب باہر سے کہیں چلے نہ
جائیں۔

"تنے قاغذ" کتنے کاغذ اور ہیں۔" یہ تو بہت ہو گئے۔ "یہاں' یہاں اور یہاں۔
شاباش!"

وہ بولا۔ "ریکارڈ کے لیے بھی ہے۔ پولیس کو کاپی جاتی ہے نا بھائی۔"

"اچھا۔"

"بس لیٹ جاؤ اب۔" کوٹ والے نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ سر میں اندر ایسے لگا جیسے بھیجا شیشے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے مگر میں لیٹ چکا تھا۔

سفید کوٹ والے نے جاتے جاتے بازو میں سوئی چبھو دی میں چیخا۔ "کیا کرتے ہو؟"

کہنے لگا۔ "آپریشن کر رہا ہوں۔ چپ چاپ لیٹے رہو۔"

بستر نیچے' نیچے اور نیچے فرش میں گرتا جا رہا تھا۔ گرتا جا رہا تھا۔ پسینے میں تر' کمزوری میں لرزتا ہوا اٹھا تو اپنے اسی خالی کمرے میں آکر گدے پر پڑا تھا۔ مجھے قید کرنے والوں نے رحم کھا کر کمبل اوڑھا دیا تھا جو میں نے لاتیں مار مار کے گدے سے نیچے ننگے فرش پر سرکا دیا تھا۔

آدھے گھنٹے یا اس سے زیادہ پڑا' اٹھنے کی ہمت کرتا رہا۔ آخر کوشش کر کے اٹھا۔ پانی تک پہنچنا پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ یہ پہاڑ بھی سر کیا۔ پانی پی کر طبیعت کو قرار آیا۔

توبہ توبہ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کیسے برے' بھیانک بے عقلی کے خواب تھے خدا معاف کرے۔ بخار اتر گیا تو اب بھوک لگ رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ میرے جیلر تو سویرے ہی آئیں گے جبھی کچھ کھانے کو دیں گے۔

ہاں! وہ لڑکی! روپالی کے پاس اگر کچھ کھانے کو ہوا تو شاید۔ میں نے ایک بار دیوار تھپتھپائی۔ سناٹا تھا میں نے اسے پکارا۔ پہلے گدے پر سے آواز لگائی پھر ہمت کر کے روشن دان کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی کا نام لے کر آواز دی۔

ہلکے سے جواب آیا۔ "ہاں۔"

"روپالی! کچھ کھانے کو ہوگا تیرے پاس؟"

اس نے جواب نہیں دیا' پوچھا۔ "آ گئے؟"

"میں کہاں گیا تھا' بخار میں تھا۔"

"اس وقت بخار ہے تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "تم پانچ دن پیچھے واپس آئے ہو۔"

"پانچ دن!" میں پریشان ہو گیا۔

"ہاں۔ وہ تمہیں سوموار کو لے گئے تھے' سویرے آج سنی وار ہے۔ مطلب ابھی تو رات ہے۔ دن میں سنی وار تھا۔ سنیچر ہو گئے نا پانچ دن سے اوپر؟"

"میرا سر چکرا گیا۔ غضب خدا کا۔ روپالی مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"سوچو' کچھ کھمر ہے کہاں لے گئے تھے؟ مگر تمہیں تو یہ بھی مالم نہیں کہ کہاں لے گئے تھے۔" اس نے یہ بات بہت دکھ سے کہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے؟ کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "بس اتنا مالم ہے موٹر میں لے گئے تھے۔ چارپائی جیسی کوئی سکڑی چیج پہ ڈال کے۔"

"اچھا خبر ہے کب لائے؟"

کہنے لگی۔ "ابھی رات میں لائے ہوں گے۔ میں نے موٹر کی آواز سنی تھی۔ کیسے ہو تم؟"

"میں؟"

"ہاں تم۔ اب کیسے ہو؟"

"ویسے تو ٹھیک ہوں۔ پر روپالی! سمجھ میں نہیں آتا عجیب باتیں ہوئی ہیں۔"

"کیسی؟"

"میں سمجھتا تھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب نہیں تھے وہ۔"

"مطلب؟"

"مطلب' وہ باتیں اصل میں ہوئی ہوں گی۔ انہوں نے نشے کی دواؤں' انجکشنوں پر رکھا ہوگا مجھے۔"

"ہاں اور کیا' پر کیسی باتیں ہوئیں۔"

"اتنا یاد ہے بہت سے کاغذوں پر دستخط کرائے تھے۔"

"دسکھط؟ کیوں؟"

"کیا معلوم۔"

"خبر نہیں کس چکر میں ہیں بدمعاش۔ ہاں تم بولتے تھے بھوک لگی ہے۔ ہاں؟"

"بہت بھوکا ہوں روپا۔ میں تمہیں روپا کہوں؟"

"روپا بھی اچھا ہے ٹھہرو کچھ کرتی ہوں۔ ادھر تالا نہیں ڈالا انہوں نے تم نہیں

تھے اس لیے۔ اچھا رسوئی جاتی ہوں۔ کوئی سادھن کوئی طریقا کرتی ہوں۔" اور پھر خاموشی۔ وہ چلی گئی ہو گی۔

اس نے بہت دیر انتظار کرایا۔ میں تو بستر پر آ کے پڑ گیا تھا۔ آخر وہ آئی۔ دیوار تھپتھپائی اس نے۔

"ہاں۔" میں روشن دان کے نیچے پہنچ گیا۔

"لو۔" اس نے ڈوری میں بندھا پیکٹ اچھالا جو ادھر کمرے میں لٹک آیا۔ پیکٹ گرم تھا' وہ میٹھا ڈال کے روٹی بنا لائی تھی۔ اچار کا ایک ٹکڑا ساتھ تھا۔

میں نے کہا۔ "واہ! یہ میرے مطلب کی چیز لائی ہو۔"

وہ بولی۔ "دل بہلانے کو کہہ رہے ہو۔ جو ملا بنا لائی۔ جتنا پکتا ہے سب کھا جاتے ہیں کچھ نہیں چھوڑتے۔ مرے مردار!"

مگر سچ بات تھی مجھے تو اچار سے میٹھی روٹی کھانا اچھا لگ رہا تھا۔ کھا کر میں روشن دان کے نیچے جا بیٹھا۔ دیوار سے ٹیک لگالی۔ "روپا! مجھ سے باتیں کرو۔"

"باتیں؟ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

میں نے اپنا نام بتا دیا۔ گیسٹ ہاؤس کا اور گھر والوں کا مغربی پاکستان جانے کا بھی بتا دیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ "جو اگر وہ مکان...... تمہارا ہوٹل ابھی تمہارے پاس ہوتا تو میں یہاں سے بھاگ جاتی۔ ادھر تمہارے پاس کھانا پکانے کی نوکری کر لیتی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تک میرے ہی پاس ہے ہوٹل...... مطلب پکڑے جانے تک میرے ہی پاس تھا۔ چلو میرے ساتھ نکل بھاگو۔ میں تمہیں کچن کا انچارج...... مطلب رسوئی کا پورا اگوا بنا دوں گا۔ کھانے پکوانا' حکم چلانا۔"

"حکم!" وہ پھیکے پن سے ہنسی۔ "کس پہ حکم چلاؤں؟"

میں نے کہا۔ "سب پر۔"

وہ اب کے شاید کڑوے پن سے ہنسی تھی یا اس نے سسکی لی تھی۔

"ایسے کیوں ہنستی ہو؟"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"اٹھارہ کا ہوں۔" میں نے زیادہ ہی عمر بتائی۔

"چھوٹے ہو نا ابھی۔"

"چھوٹا؟ تم کتنے برس بڑی ہو مجھ سے؟"

وہ بولی۔ "میں سترہ کی ہوں لیکن......"

"لیکن کیا؟ مجھ سے چھوٹی ہو تم۔ الٹا مجھے چھوٹا کہتی ہو۔ واہ وا!" "ہاں نا۔ چھوٹے ہو۔ کچھ دیکھا ہی نہیں تم نے۔"

"دیکھنا کیا تھا۔ میں گیسٹ ہاؤس چلا رہا ہوں۔ میرے باپ تو اپنی نوکری کرتے تھے۔ شروع سے ہی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ کہتی ہو کچھ نہیں دیکھا۔"

وہ جیسے اصرار کرتی ہوئی بولی۔ "نہیں دیکھا۔ لڑکے ہو' بڑے آدمی کے بیٹے ہو۔ ماں ہیں' نوکر ہیں اور پیسا۔ کچھ بھی پھکر نہیں ہے۔"

"ماں' نوکر' پیسا اس سے کیا ہے؟"

"ہے! تبھی کہہ رہی ہوں۔ جو تم لڑکی ہوتے' باپ بھائی نہیں ہوتے' پیسا نہیں ہوتا۔ چودہ برس کی عمر میں ماں مر گئی ہوتی تو چودہ برس کی عمر میں تم ایک دم بڑھ جاتے۔ ایک رات میں...... تم بڑے ہو جاتے۔" وہ بہت جوش میں بولتی گئی۔

"ایک رات میں......" میں سمجھ گیا اور اس کے لیے دکھی ہو گیا۔ کہنا کیا تھا مگر پھر بھی میں نے کہا۔ "ہاں بے سہارا ہو' لڑکی ہو تو مشکل...... بہت مشکل۔"

"مسکل؟ بہت مسکل؟ تم نہیں سمجھتے۔ انہوں نے' یہ جو ہیں' انہوں نے مجھے میرے محلے میں اٹھایا' کوئی کچھ نہیں بولا۔ نو دس آدمی ہیں۔ اب سب کا کھانا پکاتی' کپڑے دھوتی ہوں۔ روز رات میں' دن میں جب مرجی ہو کھینچ کے لے جاتے ہیں اور یہ پہلی بار نہیں ہے۔ تین سال سے ایسا ہی ہے۔ ان سے پہلے دوسرے لوگ ان سے پہلے دوسرے ادھری بھی' شہر' گاؤں میں بھی سب سکتی مان' طاقت ور ہیں۔ پکڑ لے جاتے ہیں۔ جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے دوسرے کے ساتھ کر دیتے ہیں۔" وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

خدایا! یہ کیا ذکر چھیڑ دیا تھا میں نے؟ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ کیسے چپ کراؤں؟ کیا تسلی دوں؟

مگر وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "دکھ ہوا یہ سب سن کے۔"

"ارے سب چلتا ہے۔ تم دکھی مت ہو۔ سال پیچھے کسی کو سنا کے روئی ہوں۔ ٹھیک ہوں۔"

"سنو روپا! میرا نہیں معلوم کیا ہونا ہے آگے لیکن اگر زندہ رہا تو
بھولوں گا نہیں۔"

"کون بات؟"

"یہ بات کہ روپالی بہت مصیبت میں ہے۔"

"ناں ناں۔ مصیبت تو سیر کھاں! اتنی دیر کی تھی جتنی دیر تمہیں سنا
ٹھیک ہوں۔ پرواہ نہیں۔ پکی ہو گئی ہوں۔ ان حرامیوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں
تو۔"

"بدلہ چکا لیتی ہو؟ کیسے؟"

"ادھر ابھی دو کو لڑوا دیا نا۔ ایک نے ایک کے چھری مار دی۔ موٹر ادھر
لے کر آئی ادھر اس کو لے کے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی نس کٹ گئی ہے۔"

"کس طرح لڑوایا؟"

"بس لڑوا دیا۔"

"بتانا' کیسے لڑوایا۔ کیا کیا؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"روپا! یہ کیا بات ہے! دوست نہیں ہیں ہم۔"

"دوس کا تو پتا نہیں پر بتاؤں گی نہیں۔ بے سری کی بات ہے تجھے تو
نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا رہنے دے پھر۔"

"برا کیوں مانتا ہے بس ختم کر۔"

"اچھا ختم۔ وہ جس نے چھری ماری تھی کہاں ہے؟"

"ادھر ہی۔ اسے بند کر دیا ہے۔ اگوے کا رستا دیکھ رہے ہیں۔"

"کس کا۔"

"وہ جو' ان کا بڑا ہے وہ آگے پھیسلہ کرے گا۔"

"اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ روپالی کی وجہ سے جھگڑا ہوا ہے تو برا حال کر
تیرا۔"

وہ ہنسی۔ "اور کیا برا کریں گے حرامی۔ ویسے کسی کو نہیں مالم ہو گا کہ
مطلب جھگڑا۔ کس وجے سے ہوا۔"

"وہ اس سالے سے مار پیٹ کر کے جو پوچھ لیں گے۔"

"نہیں بتائے گا۔ کوئی مرد ایسا بات نہیں بتا سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بات وہ کہی کی دونوں لڑ پڑے۔ پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں۔
چپ کھاموسی کی بات ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا۔ "خبر کیا کہہ رہی ہے۔"

"اسی لیے کہا تھا سیر کھان بابو' ابھی چھوٹے ہو۔"

"چل پھر وہی سب مت شروع کر۔ جا سو جا۔"

"کھفا ہو گیا؟"

"نہیں نہیں...... خفا' ناراض کچھ نہیں ہوں۔ سوچتا ہوں تو پھر نہ روکنے لگے۔
اس لیے یہ وہ سب باتیں چھوڑ۔ اب سو جا۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔"

وہ بڑبڑائی۔ "دوائی کا چکر ہوئے گا۔ پتا نہیں کیسی کیسی دوائیں دی ہوں گی۔ جا'
سو جا' سیر کھان' دوس!"

میں ہنس پڑا۔ "دیکھا آخر تو نے دوست کہا نا۔ ابھی کہہ رہی تھی دوست کا پتا
نہیں۔"

"وہ بھی ہنسی۔" وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی___ جوٹھ۔"

صبح دن چڑھے جب خوب دھوپ نکل آئی' دو آدمی' دو نئے آدمی ناشتا لائے۔
آج نہ معلوم کیوں انہوں نے ناشتے میں مجھے انڈے دیے تھے۔ موٹی گھی لگی روٹی تھی۔
مگ بھر کے چائے بھی لائے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا۔ "اس میں بے ہوشی کی دوا ملا
کے لایا ہے' کیوں رے؟"

وہ مسکرایا۔ "نہیں رے؟"

"اچھا؟ تو اب کیا ہے؟"

دوسرے نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "اب کچھ نہیں دس منٹ کا ٹائم ہے
تمہارے پاس۔ کھانا ہے تو کھالو۔ نہیں تو ہم ٹائم سے واپس لے جائیں گے۔"

میں نے پہلے والے سے جیسے رازداری سے کہا۔ "یہ بڑا کڑک ہے بھائی۔"

میں ناشتا کرتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور کھڑے رہے یوں جیسے ان کا
آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

میں نے اچانک پوچھا۔ "بازلر آیا ہے؟"

کلائی کی گھڑی والے نے پوچھا۔ "کون بازلر؟"

"بزل الرحمٰن۔"

وہ منہ سکیڑ کر بولا۔ "ادھر بازلر' بزل الرحمٰن کوئی نہیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک! اس سے کہہ دینا' بازلر سے کہ اب تو نہیں ہے۔ فش۔ ختم!"

دو دن انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا۔ ٹھیک ٹھاک کھانے پینے کو لاتے۔ رات میں باہر ٹہلانے لے جاتے۔ کمرے میں روشنی بھی کرنے لگے۔ ایک چادر تکیہ دے دیا۔ دن میں کمرے میں ایک کرسی بھی ڈالنے لگے اور تو اور ایک مرتبہ آئے تو میرے لیے صاف کیا ہوا اناس چھوڑ گئے۔

حیرت ہوئی مگر میں نے زیادہ کچھ پروا نہیں کی۔

ان دو دنوں میں روپالی سے بس ایک دفعہ میں کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ باقی کبھی وہ نہ ہوتی' کبھی میں سو رہا ہوتا یا پھر باہر ہوتا۔

میں نے محسوس کیا روپالی میں غصہ اور کڑوا پن کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک گیت سنایا۔ دھیرے دھیرے لوری کی طرح گا رہی تھی۔ سریلی تھی اس کی آواز۔ میں نے تعریف کی تو بولی۔ "ماں زندہ تھی جب گاتی تھی۔ پھر اب گایا ہے اتنے دن بعد۔"

یہ دو دن میرے لیے آسان تھے۔ شاید روپالی کے لیے بھی آسان ہوں گے۔ مگر وہ بتا رہی تھی کہ کام بہت ہے یہ لوگ کمروں کی صفائی کرا رہے ہیں۔ مجھے جو ٹہلانے لے گئے تھے اس کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔ روپالی نے میرا کمرہ صاف کیا تھا۔ گدے کے نیچے ایک پھول رکھ گئی تھی۔ وہ گیندے کا پیلا پھول۔ عجیب بات کہتی تھی۔ خیر میں چھوٹی تھی تو ایسے پیلے پھول درگے پہ چڑھاتی تھی۔ میں نے کہا درگے کیا ہے؟ تو بولی۔ تم فدرگے نہیں سمجھتے؟ میں سمجھا درگا مائی کا کہہ رہی ہے۔

کہنے لگی۔ "نہیں درگے ہے درگے۔ آس تانہ فکیر کا۔" اوہ۔ کوئی درگاہ ہو گی۔

میں نے کہا زندہ رہا تو تیرے ساتھ دیکھنے جاؤں گا کہ کس کا آستانہ' کیسی درگاہ ہے۔ لے جاؤں گا تجھے وچن رہا میرا۔

زندہ رہا تو.......... آدمی کی سبھی چیزیں زندگی سے مشروط ہیں۔ کیسی سبک کم پائیدار چیز سے ہم اپنی ہر امنگ' ہر خوشی' اپنا ہر خواب الجھا لیتے ہیں۔ اس بے چاری لڑکی

سے کیے ہوئے ایک ہلکے پھلکے وعدے کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں۔ مجھے تو گھر والوں سے ملنے کا' گیسٹ ہاؤس پہنچنے کا بھی انتظار تھا اور امید تھی۔

ملوں گا سب سے اگر زندہ رہا تو گیسٹ ہاؤس بھی دیکھوں گا.......... اگر زندہ رہا تو۔

دو دن بعد شام کو بازلر آ گیا۔

وہ آتے ہی کرسی پر ایسے بیٹھ گیا جیسے بہت تھکا ہوا ہو لیکن کامیاب و کامران آیا تھا۔ کہنے لگا۔ "جان بچ گئی تمہاری۔"

"کس طرح؟"

بولا۔ "سب کام میری مرضی کے ہو گئے۔"

"اگر مرضی کے نہ ہوتے سب کام تب؟"

"تب تمہارا مرڈر کرنا پڑتا____ سمجھتے ہو؟ قتل۔"

میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کاہلی سے آدھی آنکھیں کھولے اس کی صورت تکا کیا۔

"مذاق سمجھ رہے ہو میری بات؟" اس نے یہ جملہ دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

"مذاق کیوں سمجھوں گا۔ تمہارے میرے بیچ ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں ہے۔"

بولا۔ "ہو بھی نہیں سکتا۔"

"ہاں سچ کہہ رہے ہو۔"

"مرڈر تو تمہارا دس بار ہو چکا ہوتا مگر میں نے معافی دے دی۔ تم نے ابھی تک ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ نہ یہ سوال تھا' نہ بیان بس ایک لفظ تھا۔

بازلر کا چہرہ غصے سے ست سا گیا۔ اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ وہ جس طرح ڈراما تیار کر کے لایا تھا سب کچھ اس طرح نہیں ہو رہا تھا اس لیے مایوسی میں وہ چڑچڑانے لگا تھا' بولا۔ "تجھے ابھی خبر نہیں ہے کہ تو کتنے بڑے خطرے میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تجھے تو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ بیر کا پچھایا کدھر ہوتا ہے۔"

وہ منہ بگاڑ کر چیخا۔ "حرام زادے میں تجھے____"

میں نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔ پشتو میں اسے بڑی بھاری گالی دی پھر اس کا بنگلا زبان میں ترجمہ کر دیا۔ بازلر تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بیلٹ میں ہاتھ ڈال

کر اپنا پستول نکال لیا۔ "ابھی گولی مار کر ختم کر دوں گا۔"

میں ہنسنے لگا۔

بازلر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنا اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا نہ وہ فائر کرے گا نہ اتنی جلدی اپنے غصے کو ٹھنڈا ہونے دے گا۔ کچھ دیر یہ سین اسی طرح آگے گھسیٹے گا۔

مگر ابھی مجھے زندگی سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بے بسی کی ایک لہر سی آئی۔ میں اگر اسی وقت ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیتا تو وہ نہ ہوتا جو ہوا۔

بازلر کی آنکھوں میں بے بسی کی لہر جو آئی تو یہ اس آدمی کی حد تھی یعنی وہ پوائنٹ جہاں وہ ٹوٹ سکتا تھا۔ میں ایک چھوٹی عمر کا قابو کیا ہوا نوجوان اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا اور طنز کرتا رہا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بازلر نے ہاتھ میں لیے ہوئے پستول کو ایک جنبش میں فائر کے لیے تیار کیا اور فائر کر دیا۔

ہتھیاروں کی اتنی سمجھ نہ ہوتی مجھے تو میں ختم ہو گیا ہوتا۔ اس کی پہلی جنبش سے میرے بدن نے غیر ارادی طور پر ایک طرف رول کرنے کی پوزیشن بنائی اور جس وقت فائر ہوا میں رول کر چکا تھا۔ ایک فٹ ادھر دیوار میں گولی لگی' پلستر اکھڑ گیا۔ خود بازلر کا منہ حیرت میں آدھا کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے عمل یا میرے ردعمل دونوں میں سے کسی ایک پر حیرت تھی۔

دروازہ جیسے ٹوٹ کر اندر گرا اور بھاری بدن والا ایک آدمی بنگالی میں یہ کہتا ہوا کہ "کیا کرتا ہے۔" کمرے میں گھس آیا۔

کمرے میں گھس آنے والا موٹا آدمی بازلر کا چچا تھا۔ وہی جس سے والد صاحب نے گیسٹ ہاؤس کا سودا کیا تھا۔ جو گیسٹ ہاؤس میں پولیس آنے کے دوسرے دن میرے پاس آیا تھا اور بڑی نیکی سے معذرت اور بھتیجے بازلر کی شکایت کر رہا تھا۔

چچا نے آتے ہی مجھے دیکھا۔ میں زندہ تھا۔ پھر اس نے بھتیجے کو گالی دی اور حکم دیا کہ وہ پستول لے اور دفع ہو جائے۔

بازلر چچا کے آنے سے کھسیا گیا تھا۔ اس نے پستول دوبارہ بیلٹ میں لگا لیا اور سر جھکا کر فرش پر جیسے چلے ہوئے کارتوس کا خول تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھ سے دور چلا گیا تھا۔

چچا میرے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا مگر اب جو آ گیا تھا تو بار بار ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے کی ہتھیلی میں مار مار کر اپنا غصہ خرچ کر رہا تھا۔

میں نے اس موٹے منافق کو پہلے سلام کیا۔ "السلام علیکم انکل۔" وہ مجھے گھور کے دیکھے جا رہا تھا۔

"انکل' یہ بازلر بالکل بے وقوف ہے۔ پہلے گیسٹ ہاؤس پر پولیس لے کے آیا۔ اب یہاں آپ کے "مہمان" پر گولی چلا رہا ہے۔ گدھا کہیں کا۔"

نیا مالک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پورے ایک منٹ مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "دیکھو جی۔ بچوں کا کھیل نہیں ہو رہا۔ بہت سی چیزیں داؤ پر لگی ہیں۔ سب سے پہلے تو تمہاری جان ہی ہے۔ دیکھا تم نے؟ چھ انچ قریب سے موت گزری ہے۔ اب تمہیں یہ سب بکواس اور یہ لونڈا پن بند کر دینا چاہیے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ غور سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔ شیر علی۔ تم پڑھے لکھے لڑکے ہو۔ صوبہ سرحد سے ویسے ہی چادر لپیٹے نہیں نکل پڑے۔ عمر کم ہے مگر دنیا کی سمجھ ہے تمہیں۔ اب سنو۔ تم سے جو ہمیں کام لینا تھا وہ لیا جا چکا۔ ہم خاموشی سے تمہیں مار کے اور یہیں گاڑ داب کے چلے جاتے یا لاش کو آگ لگا دیتے یہ زیادہ آسان اور محفوظ طریقہ تھا مگر بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ میں ذاتی طور پر کچھ انسان بھی ہوں۔"

"یقیناً انکل۔ کچھ نہیں کافی زیادہ انسان ہیں آپ' اگر آپ نہ آتے تو بازلر دوسری گولی چلا دیتا۔ مشکل تھا میرا بچنا۔"

اس نے رسان سے کہا۔ "پہلی بات' مجھے انکل کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سچ بولتے رہو گے اور لہجہ طنز کا رکھو گے تو میں خفا نہیں ہوں گا۔ تمہارا راشن آدھا کر دوں گا۔ مہینہ بھر میں یہ چمک دمک جو ہے نا سب____" اس نے ایک بے ہودہ بات کہی۔ "سب____ کے رستے سے نکل جائے گی۔"

یہ سیریس آدمی تھا۔ میں نے خود سے کہا شیر علی خان' دھیما بدمعاش جذباتی بدمعاش سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زبان کو اب قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس حقیقی خطرے کا احساس تھا جس میں پہلے ہی دن سے میں گرفتار تھا۔ واقعی مقدر اچھا تھا جو میں بچتا رہا ورنہ مجھے تو کبھی کا ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

زمانہ شناس چچا نے میرے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے' وہ سمجھ گیا کہ خطرہ مجھے نظر آنے لگا ہے۔ اس کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔ توانائی ضائع کرنے کی اب ضرورت کیا

تھی؟

بولا۔ "شیر علی اصل مشکل کام ہم نے کر لیا ہے یعنی تمہارے باپ صد بگش کے سامنے ہم تصویری، تحریری اور زبانی شہادتیں ثبوت پیش کر کے انہیں قائل کر سکتے ہیں کہ ان کا بیٹا شیر علی نالائق نکل گیا۔ اس نے گیسٹ ہاؤس کی بقیہ رقم یعنی وہ ڈیڑھ لاکھ مجھ سے تھوڑے تھوڑے کر کے نقد وصول کر لیے۔ جی ہاں، رسیدیں ہیں میرے پاس____ لڑکے۔ تمہارے باپ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ایک طرح دوستی سی ہے تم دونوں میں اور وہ مزاج پہچانتے ہیں تمہارا۔ سوچیں گے اور ظاہر ہے مجھ سے رائے لیں گے، پوچھیں گے کہ سلسیل چوہدری صاحب____ میرا اصل نام سلسیل چوہدری ہے، تو وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ یار، سترہ برس کے ایک لڑکے کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ کہاں خرچ کر دیے اس نے یہ پیسے؟ قدرتی بات ہے۔

میں کہوں گا۔ "میں خود چکرا رہا ہوں۔" اس لیے تو بلایا ہے آپ کو اور میں حل سوچوں گا تو یہ دکھاؤں گا کہ جیسے بہت بھاگ دوڑ اور محنت کر رہا ہوں۔ اپنی رقم خرچ کر رہا ہوں۔ پھر دس بیس روز کی محنت کے بعد میں یہ تصویریں پیدا کروں گا اور تمہارے باپ صد بگش کو دکھاؤں گا کہ ڈیڑھ لاکھ روپے صاحب زادے نے یہاں خرچ کیے ہیں۔

یہ کہہ کر چوہدری نے کرسی کے پاس پڑا براؤن لفافہ اٹھایا اور بہت سے تصویروں کے انلارجمنٹ گدے پر میرے سامنے ڈال دیے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تصویریں اٹھالیں اور پھر میں جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا گھبرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"غضب خدا کا۔ کیا ہے یہ؟" او میں نے پشتو میں جو گل افشانیاں کیں وہ اب دہرا نہیں سکتا۔ موٹا سلسیل چوہدری چہرہ سخت کیے خاموش بیٹھا رہا۔

میں نے تصویروں پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کیا ہے یہ؟"

کہنے لگا۔ "جو تمہیں نظر آ رہا ہے ایسی اور بھی تصویریں ہیں لڑکے۔ پھر گواہی دینے والے موجود ہیں جنھوں نے تم دونوں لڑکا لڑکی کو____ ظاہر ہے پورے کپڑے پہنے____ بازاروں، ہوٹلوں میں ساتھ دیکھا ہے۔ یہ کمرہ تمہیں کرائے پر دینے والا موجود ہے۔ رسیدیں کرایہ نامہ سب ہے۔"

کمرہ جس کا وہ ذکر کر رہا تھا میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے خواب میں نہیں دیکھا تھا وہ کمرہ۔ میں خود اس کمرے میں موجود تھا۔ تصویریں بتا رہی تھیں میں اس بستر پر تھا، ہنستا

قہقہے لگاتا ہوا، میں اور لڑکی جسے میں اب پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

ہم دونوں کم سے کم لباس میں تھے۔ بعض تصویروں میں تو وہ کم سے کم لباس بھی نہیں تھا۔ کہیں میرے ہاتھ میں شیشے کا لمبا سا جام تھا، شراب سی چھلکاتا ہوا۔ ہم دونوں پر چھلکتا ہوا۔ میں اور وہ اجنبی لڑکی، عورت وہ جو بھی تھی ایک ایسے بستر پر موجود تھے جس پر پھول بکھیرے گئے تھے۔ یاد آیا____ پھولوں کی تیز خوشبو سے چھینک آ گئی تھی۔

میں روہانسا ہو گیا۔ یہ پھولوں کا ڈھیر۔ میرے عالی ظرف خاندان کی عزت اور نیک نامی کی قبر پر پڑا تھا یہ ڈھیر۔

یہ کمرہ____ ان تصویروں کی مدد سے، نشہ آور دواؤں سے دھندلائی ہوئی میری یادداشت کے پارے سے دھیرے دھیرے برآمد ہو رہا تھا۔

ہاں ٹھیک تو ہے____ دیواروں پر گوروں اور میموں کی تصویروں کے ساتھ وہ تصویریں بھی تھیں جن میں کچھ نہ پہنے ہوئے عورتیں کہیں دانتوں میں پھول دبائے تھیں اور کہیں موتیوں کی مالائیں اور وہ سیاہ سینڈل والی عورت۔ کہیں مرد کے ساتھ بھی عورت تھی۔

یہ وہ کمرہ تھا جہاں دھندلی یادداشت میں ایک سفید لمبے سے کوٹ والا آدمی آیا تھا، مجھ سے دستخط لے رہا تھا۔ کہتا تھا "ہم تیرا آپریشن کریں گے۔" اور کہتا تھا۔ "باہر برآمدے میں تیرے والد صاحب بیٹھے ہیں۔"

خدایا۔ یہ کون سا شیطانی جال بچھایا گیا ہے؟

میں گلوگیر آواز میں پکار اٹھا۔ "بابا۔ بابا۔ ہاتھ تھامنا میرا، پھنس گیا ہوں بابا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" سلسیل چوہدری تعریفی انداز میں بڑبڑایا، پھر بولا۔ "اپنی عمر جتنا رہنا چاہیے آدمی کو۔ ضرورت سے زیادہ چالاک بننا یا دلیری دکھانا، جو اب تک تم دکھاتے رہے وہ بے وقوفی ہے۔ سترہ برس کے لڑکے ہو۔ کھاؤ، پیو، کھیلو ہمارے پاس رہو۔ تم سے کوئی کام نہیں لیں گے۔ یہ تصویریں دیکھ لیں____ کہو گے تو اسی لڑکی کو یہاں بلوالیں گے، تمہارے لیے۔"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، دل میں صرف ایک لفظ کہا "ولا" اور اپنا سر جھکائے رکھا۔ اگر اس سے آنکھ مل جاتی تو وہ دیکھ لیتا کہ میں آنکھوں سے بھی لفظ اس تک پہنچا سکتا ہوں۔

مجھے سر جھکا کے بیٹھے دیکھ کر وہ بولا۔ "تم سوچتے ہو گے کہ کیا ہم نے یہ سارا پاکھنڈ صرف ڈیڑھ لاکھ روپے کے لیے رچایا ہے؟ یعنی تمہارے فرار کی خبر سن کر تمہارا باپ یہاں آئے گا اور ہم اس سے کہیں گے کہ حساب صاف ہو گیا۔ بیٹا ڈیڑھ لاکھ لے چکا۔ گیسٹ ہاؤس اب ہمارے حوالے کرو اور چلتے بنو۔ نہیں شیر علی۔ ڈیڑھ لاکھ کوئی رقم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کوئی اتنا لمبا چکر نہیں ڈالتا۔ اصل میں ہم تمہارے باپ کو ادھر بلا رہے ہیں۔ بہت کام ہے ان سے۔"

میں نے سادگی سے سوال کیا' "اگر کام تھا تو جانے کیوں دیا۔ یہیں روک لیتے۔"

وہ ہنسا۔ "کام کا ایک حصہ یہ تھا کہ وہ وہاں جائیں۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ وہاں سے اب لوٹ کے آجائیں۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

بولا۔ "تمہیں سمجھانا بھی نہیں ہے۔ جتنا بتا دیا اتنا کافی ہے۔ تمہارے باپ آ جائیں گے تو ہم تمہیں خبر کر دیں گے اور جو' جو ہوتا رہے گا' بتاتے رہیں گے۔ تم یہاں ٹھیک سے رہو۔ چارپائی ڈلوا دیں گے' پڑھنے کو کچھ پہنچ جایا کرے گا___ اردو انگریزی کا تو مشکل ہے بنگلا ہی پڑھنے کو ملے گی' خیر یہ تمہارے لیے پرابلم نہیں ہے___ کھانے میں کوئی خاص چیز مانگو گے یہ لوگ دیں گے۔ ان سے کوئی شکایت ہو تو اگلی بار جب میں آؤں کہہ دینا۔ شکایت دور ہو جائے گی اور یہ بزل الرحمٰن یہ اب ادھر نہیں آئے گا۔ ٹھیک۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ سلسیل چوہدری نے گدے پر سے تصویریں اٹھائیں' لفافے میں ڈالیں اور میری طرف دیکھے بغیر وہ بھی نکل گیا۔ باہر سے بولٹ لگانے۔ تالا ڈالنے کی آواز آئی اور دور ہوتے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر سناٹا ہو گیا۔

میرے بابا نے سکھایا تھا کہ ہر معاملے میں پرامید رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی برے سے برے حالات کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے پھر اگر ان حالات کا سامنا کرنا پڑے ہکام سدھر جائیں تو شکر واجب ہے۔ وہ شروع ہی سے کہتے رہے تھے کہ بیٹے اگر اس سادہ دیہاتی ترکیب سے دن گزارو گے تو دل طاقتور رہے گا' جو بڑی بات ہے۔

دونوں چچا بھتیجے چلے گئے تو میں نے بوڑھے مداری کی جھونپڑی پر بازلر کے حملے

سے لے کر ابھی اس کے چچا کے ظاہر ہونے تک جو بھی ہو چکا تھا اپنے ذہن میں دہرا لیا۔ کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔

حالات بے شک خراب ہیں مگر بہت زیادہ خراب نہیں ہیں۔

رات میں ادھر سلسیل چوہدری کے آدمی کھانا کھلا کے نکلے ہوں گے کہ روپالی نے دیوار تھپتھپا کے اشارہ دیا۔ میں تیزی سے روشن دان کے نیچے پہنچا۔ "شش" میں نے سرگوشی کی۔

"شور نہیں۔" ابھی وہ لوگ برآمدے میں ہوں گے۔ ڈر تھا کہیں یہ آوازیں نہ سن لیں۔

وہ بولی۔ "پرسان مت ہو آج ان لوگوں سے کھطرہ نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

روپالی ہنسی۔ "دارو پی ہے سب حرامیوں نے۔"

"اچھا؟ روز نہیں پیتے؟"

"روج کسے ملتی ہے وہ آیا تھا نا موٹا___ وہ دے گیا ہے۔" روپالی شاید منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی ہو گی۔ "کھکھ کھی___ ایک عورت بھی لایا ہے ادھر کے لیے۔"

"کیسی عورت؟"

"جیسی ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

ہنس کر بولی۔ "کھوب تیار عورت ہے___ ہاتھ پیروں کی اچھی۔"

میں نے لاعلمی کی سادگی میں کہا۔ "چل تیرا کام ہلکا ہو جائے گا۔"

وہ بولی۔ "ہاں ابھی اس کی ڈبل روٹی لگ رہی ہے۔ سارے سور پی پی کے ادھر جا رہے ہیں۔"

اوہ۔ میں نے سوچا' اس چوہدری کو میں نے اپنے دل میں جو کہا' سمجھا وہ وہی ہے۔ نوکروں تک کے لیے شراب اور عورت لاتا ہے___ دلال نہیں تو___ یہ گیسٹ ہاؤس نہیں چکا چلائے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"آج مجھے پتا چل گیا انہوں نے کیوں پکڑا ہے اور کس بات کے دستخط کرائے ہیں۔"

"کس بات کے؟"

"میرے بابا کو بلوانے کے لیے جعل سازی کی ہے۔"

"کیوں بلوائے گا؟"

"معلوم نہیں مگر موٹا کہہ رہا تھا انہیں ادھر سے صوبہ سرحد بھیجنا تھا اس لیے انہیں جانے دیا پھر واپس بلانا ہے۔ میری خبر سن کر وہ آ جائیں گے۔"

"کیا پتا کیا کر رہے ہیں کتے___ اب سیر کھان۔"

"ہوں۔"

"کل سبیرے یہ لوگ میرے کو بجار ساتھ لے جان گے۔"

"بازار؟ تجھے بازار نہیں لے جاتے تھے؟"

"ناں۔ ابھی سب سودا ختم ہو گیا۔ میرے سے بولے کیا لانا ہے بتا؟ میں نے کہا لو سنو، میں بولتی ہوں تم یاد کرو بجار تک یاد کرتے جانا ڈھائی سو چیجیں بنتی ہیں، لے آنا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ "ان لوگ کو پڑھنا آتا، نہیں مجھے لکھنا آتا۔"

میں نے ایسے ہی پوچھا۔ "روپا بازار جا رہی ہے، کیا لائے گی میرے لیے؟"

کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "سارنگ۔"

"سارنگ کیا؟"

بولی۔ "چیج۔"

"کیا سب چیز؟"

"سنو___ سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دینا ہووے اور سمجھ نہیں آوے کی کیا دے۔ جی کرے اس دنیا، سنسار کی، ملک کی، سبھی چیج دے دیو۔ تبھی بولتے ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گا۔"

"اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟"

بولی۔ "نا۔ سب چیج۔ کمل کا پھول سارنگ، کاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ دیوا، سب سارنگ باج، ہنس مور، گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تو ہے نہیں باگھ سیر وہ بھی سارنگ تال، سنکھ، پپیہا، ہرنی، کوئل۔ اے تمہارے کو کوئل لاؤں؟ کو او کو او، ہاں؟"

"پاگل ہے تو تو۔"

"ابھی سن نا، سارنگ بولتے ہیں رات، چاند کو، سورج کو، جمین کو، بھونرے کو اور جی اسمان کو، کبوتر کو، بمل کو، راجے کو سر کے چھتر کو اور تیرے پاؤں کو لگانے کے چندل

کو___"

"چندل؟"

"ارے ہاں نا جسے صندل بولتے ہیں___ اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت___ 'عورت جیسے تیرے کو؟"

"بالکل ہی کھوپڑی الٹی ہوئی ہے تیری۔"

آہستہ سے بولی۔ "سیر کھان۔ کھوپڑی پھرا دی میری___ سچ بولتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے ذرا تیز آواز میں پوچھا۔

بولی۔ "کچھ نہیں___ سو جا۔"

میں نے کتنی بار آواز دی، اس نے جواب نہیں دیا۔ بہت دیر بعد شاید گھنٹہ بھر بعد مجھے وہم سا ہوا کہ دیوار کے اس طرف کوئی سسکیاں لے رہا ہے۔

مگر وہم ہی تھا۔ میں نے سوچا سو گئی یا سونے کی کوشش کرتی ہو گی۔

وہ لوگ اسے لے کے سویرے ہی نکل گئے۔ میں دن بھر آہٹ لیتا رہا۔ دیوار کے ادھر کوئی نہیں تھا۔

سورج ڈوبے پر اس نے دیوار تھپتھپائی۔ میں نے پوچھا۔ "ہاں؟ ہو آئی بازار؟"

بولی۔ "ہو آئی۔"

پوچھا۔ "اچھی لگی ہو گی آزادی؟"

"آجادی؟"

خیال ہی نہیں کیا تھا، غلط لفظ کہہ گیا تھا۔ جلدی سے بولا۔ "ہاں، باہر نکلنا___ کیسا لگا؟"

"اچھا بھی لگا___ رونا بھی آیا۔"

"کیوں؟ رونا کیوں؟"

"سبھی ہنستے بولتے، روتے گاتے، باتیں کرتے لوگ ادھر اپنی مرجی سے آئے تھے، مرجی سے جا رہے تھے۔ پوری بھیڑ میں ایک میں ہی سمجھو ہاتھ پیر بندھی چل رہی تھی۔ میرے ساتھ ادھر ادھر ٹانگ سے ٹانگ بھڑائے سر پے سوار وہ چار حرام کے جنے بات بات پر کمر میں ٹھونگا مارتے تھے۔ یہ کیا لے رہی ہے۔ ادھر کیا دیکھ رہی ہے۔ تو چپ رہ ہم بات کریں گے۔ کتے نہیں تو۔ پر میں نے بھی سیر کھان۔ کچھ کر ہی لیا۔"

"کیا؟"

"آنکھ منک کا۔"

میں ہنسا۔ "آنکھ منک کا کیسا؟"

بولی۔ "ان لوگ کا فورمین ہے کہ کون ہے' وہ بکرے کا گوس پکانے کا بولا تھا۔ گوس کی دکان آئی۔ تینوں کتے جو کبر پر سوار پھر رہے تھے بولے' ہم گوس کی دکان میں نہیں جان گے۔ کھمرے جینی لوگ تھے' کون تھے۔ فورمین ساتھ نہیں تھا۔ کوئی جھاڑی ٹٹی تلاش کر کے بیٹھا ہوئے گا' انیمی۔ میں تتے سور کیا ٹیم کھراب نہیں کرو۔ چلو ساتھ یا میں آپی جاتی ہوں اور میں کھٹاک سے جالی لگی دکان میں گھس گئی۔ کسائی دکان والا جوان لڑکا تھا۔ ایسا میلا کچیلا پر کھوب تگڑا۔ مونچھیں منہ میں گھسی جاتی تھیں' دانتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے کہا' ٹیم نہیں ہے جلدی کر۔ دھیرے سے بولا۔ تیرے کو تو جی کرتا ہے سبھی کے آکھر میں چھٹی کروں۔

میں دل میں بولی روپالی۔ باہر کا آدمی مل راہے' جی دار ہے۔ گھیر لے کوئی باہر کا ساتھ دے گا۔ سبھی باگھیر بوڑی سے نکلنے کا سادھن بنے گا۔

میں نے ہونٹ دبا کے' آنکھ چلا کے' ہنس کے اسے کچھ بول دیا۔ کسائی کا پوت گھسن گھیری کھا گیا۔ بگدا ہاتھ میں لرجنے لگا اس کے۔ میں نے بولا۔ "مالک لوگ ہمیں تالے میں رکھتے ہیں۔" کہنے لگا۔ "تالے کی تو ____" میں نے کہا۔ "اچھا پیچھے پیچھے آ با گھیر بوڑی میں جسگے پچھان لے ہماری۔ لال رنگ کی جیپ گاڑی میں لائے ہیں میرے کو' جانے ہی والے ہیں۔ پر چار بندے ہیں حرام کے جنے' گولی بندوک سے تیار تو جھگڑا نہیں کرنا۔ رات میں آ کے لے جانا میرے کو۔" بولا "ٹھیک ہے تو منے کر رہی ہے' نہیں چار لاسیں ادھر بجار میں گرا دیتا ہوں۔ ایمان سے۔" میں بولی۔ "رستی رہنے دے۔ لال جیپ کے پیچھے پیچھے چپکا چلا آ۔ جسگے دیکھ لے۔ سسرے سے دو گھڑی پہلے بالکل نئی ٹائم ہوئے گا۔ میرے کو کارکھانے میں رکھا ہے۔ دو تین بڑے بڑے بائیلر دور سے نجر آتے ہیں۔ چار دیواری الانگ کے بائیلروں کے کریب آ جانا۔ کوئی ہوئے گا نہیں۔ بائیلروں کے برابر دوئی کمرے ہیں۔ بس جس بھی کمرے تو کھٹکا کرے گا' میرے کو کھمر لگ جائے گی۔"

پھر مجھ سے روپا کہنے لگی۔ "دیکھ لینا' وہ آئے گا جرور' تیار رہنا۔ چٹکی بجا کر بولوں گی' یوں کر کے نکل چلیں گے۔"

کیا طوفان لڑکی تھی ____ پھر کہیں کوئی کھٹکا ہوا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "چار ہی

ہوں۔ آجا دی میں ملاں گے۔"

یہ سب تو ہوا مگر ایک بات میری سمجھ نہیں آئی۔ یا تو اتنے برس سے وہ سب کی زیادتیاں سہہ رہی تھی۔ بکری کی طرح گردن ڈالے ہوئے یا اب ایک دم نکل بھاگنے کی تیاری کرنے لگی۔

خیر' عورتوں کا یہی ہے۔

میں نے سوچا' تیر اگر نشانے پر بیٹھا ہے' دکان والے کے دل کو لگ گئی ہے تو قسائی برادری کا پٹھا ہے' کچھ کر گزرے گا۔

مگر تین راتوں تک میں آہٹیں لیتا رہا۔ کوئی نہ آیا۔ ان تین دنوں میں روپالی سے صرف دو بار بات ہوئی' وہ بھی سرسری سی۔ کچھ بتایا ہی نہیں۔ قسائی کا بس اتنا کہنے لگی۔ "آئے گا' وہ کسی جوڑ جگاڑ میں لگائے ہوگا۔"

مجھے اب امید نہیں رہی تھی۔ یہاں ایک الجھن یہ بھی ہو گئی تھی کہ ایک رات انہوں نے اس دوسری عورت کو روپالی کے ساتھ رکھا۔ میرا بہت جی کرتا تھا مگر بات کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ دوسری رات انہوں نے روپالی کو کسی اور کمرے میں پہنچا دیا۔ ادھر دیوار کے پار وہ سب بدمعاش نئی عورت کو گھیرے ہوئے تھے سب تاش کھیلتے تھے' شراب پیتے تھے' سویرے تک اودھم کرتے رہے۔ حرام خور۔

چوتھے دن' کوئی تین ساڑھے تین بجے جب آس پاس سناٹا سا تھا' چوہدری کے کارخانے میں اس کے تین چار ہی گرگے موجود تھے اور وہ بھی کھانا کھانے کے بعد کی آلکس اور سہ پہر کے بوجھل وقت کی مار کھائے سایہ میں اینڈ رہے تھے۔ باگھیر بوڑی کے کارخانے میں جیسے بھونچال آ گیا۔

پہلے تو ایسی آوازیں آئیں جیسے جانوروں کا ریوڑ بدک کر بھاگا ہو۔ پھر کارخانے کے بڑے پھاٹک پر دھماکا ہوا۔ بھاری گاڑی کے انجن کی آواز آئی' کوئی دیوانوں کی طرح ریس دے رہا تھا۔ پھر بہت سے آدمی گالیاں بکتے ہوئے فائر کرتے ہوئے کمپاؤنڈ میں ہر طرف بھاگے بھاگے پھرنے لگے۔ دو تین فائر کمرے کے قریب سے ہوئے یہ چوہدری کے آدمیوں نے کیے ہوں گے۔ آٹومیٹک رائفل کے فائر تھے۔

ان پہلی آواز کو دو تین منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ میرے والے کمرے کے دروازے پر زبردست دھماکے ہونے لگے۔ لگتا تھا کنڈی تالے پر گھن مارا جا رہا ہے۔ گھن کے تین چار ہاتھ ہی چلے ہوں گے کہ کنڈی' تالا سب فرش پر جا گرا۔ کمرے

کے دروازے کو زوردار آواز سے اندر کھولتے بلکہ پھینکتے ہوئے دو مرد اور ایک عورت ___ نہیں لڑکی کمرے میں گھس آئے۔ مردوں کے ہاتھوں میں دیسی ساخت کے بھدے پستول تھے۔ خود مرد بھی دیسی ساخت کے تھے۔ تگڑے' کھردرے' تہمد پوش' لڑکی گھن اٹھائے ہوئے تھی اور بھگوا رنگ کی ساڑھی پہنے تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ہاتھ سے گھن پھینک دیا۔ پھر بڑی بڑی آنکھوں والی یہ لڑکی جھپٹ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ ''سیر کھان۔ چل۔''

یہ روپالی کی آواز تھی۔ یہ روپالی تھی۔ میری دوست روپا ___ روپ۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا' مجھے کھینچتے ہوئے گھومی اور کمرے کی دہلیز پار کر گئی۔

باہر سو ڈیڑھ سو گائیں' بیل' بکریاں کارخانے کے احاطے میں بھاگتی پھر رہی تھیں شور کر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے چوخانے کے تہبند اور بڑی بڑی جیبوں والے شلوکے پہنے قسائی اور مویشی کے آڑھتیوں' بیوپاریوں جیسے لوگ ہاتھ میں لوہا چڑھی لاٹھیاں' بھرتل بندوقیں اور دیسی ساخت کے پستول لہراتے اور گالیاں بکتے بھاگے پھر رہے تھے۔

میں نے دیکھا نیکر جرسیوں والے دو تین آدمی' ادھر سے ادھر دوڑ کر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بھاگتے ہوئے اپنی آٹومیٹک رائفل سے ہماری طرف فائر کیا جو کسی کو نہیں لگا۔

لڑکی نے' جو میرا ہاتھ پکڑے تھی' اس روپالی نے دوسرے ہاتھ سے ریشمی کرتے' تہبند والے لڑکے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ یہ روپالی کا قسائی دوست ہوگا۔ ہمارا نجات دہندہ۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے گلے لگے برآمدے میں آئے پھر جب آٹومیٹک رائفل کا ایک اور فائر ہوا' تینوں بوائیلروں کی اوٹ میں چلے گئے۔ میں نے دیکھا کارخانے کا پھاٹک ٹوٹا پڑا تھا۔ اڑتی دھول اور دھوئیں کے بادل چیرتا اور مویشی کے سروں سینگوں کے ہجوم میں راستہ بناتا ایک پھٹا' ٹوٹا' بدہیئت ٹرک زبردست شور اور دھواں پھینکتا' دیوانوں کی طرح ریس کرتا بوائیلروں کی طرف آ رہا تھا۔ روپا کے دوست نے ٹرک کی طرف چلا کر کچھ کہا' ٹرک رک گیا۔ روپالی کے دوست نے زور سے اس کا ہاتھ کھینچا۔ روپا نے میرا ہاتھ کھینچا اور ہم تینوں کھلے ڈالے پر چڑھ کر ٹرک میں بچھی تازہ گھاس پر جا گرے۔

قسائی نے ٹرک ڈرائیور سے چلا کر کہا۔ ''چل بے۔'' اور کارخانے کے ٹوٹے پڑے دروازے پر ڈگمگاتا دھچکے کھاتا' پاگل اژدہے کی طرح غراتا' دھواں اڑاتا ٹرک

کارخانے سے باہر نکل گیا۔

مویشی کی آوازیں' آدمیوں کے چلا چلا کر گالی بکنے اور تکلیف سے ڈکرانے' پکارنے کا شور ___ ان سب آوازوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ہمارا ٹرک کارخانے کی کچی سڑک گزار کر باگھیر بوڑی مین روڈ پر آ گیا تھا۔

قسائی دوست نے خوش مزاجی سے ہلکی پھلکی گالی بکی اور بولا۔ ''لے ری نکل آئے۔'' اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اب تک روپا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ روپالی اب تک میرا ہاتھ پکڑے تھی۔ قسائی نے دیکھا اور جھکی ہوئی مونچھوں کے پیچھے سے دانت چمکا کر بولا۔ ''اب چھوڑنا باؤ صاحب کا ہاتھ۔ چل ٹھیک سے بیٹھ۔''

روپالی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اٹھی اور ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ ''آ گئے رے' آ گئے آجادی میں آ گئے۔'' اس نے مجھ سے کہا اور رو پڑی۔

پھر بڑی آنکھوں والی اس چھوٹی سی سانولی لڑکی نے جس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے' میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ دونوں ہاتھوں سے میرے سر کو چھوا پھر اس نے پنجے پھیلا کر اپنے چمکیلے گنجان بالوں پر انگلیاں چٹخالیں۔ اس نے بلائیں لی تھیں میری۔ اس پاگل نے' عجیب لڑکی تھی ___ میری دوست روپالی' روپا' روپ۔

اس قسائی عاشق نے کھسیا کر ہنستے ہوئے اسے ڈانٹ دیا۔ ''چل بس کر سیدھی بیٹھ۔''

روپالی مڑی اور اپنے قسائی سے لپٹ گئی۔ ''اری ہٹ۔ سیدھی طریوں بیٹھ تیری تو۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ رہا تھا مگر خوشی اس کی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔

اچھلتے کودتے' ہلتے جلتے ٹرک میں دھچکے کھاتے ہوئے میں نے سوچا فوری مصیبت سے نکل آئے ہیں شکر واجب ہے۔

میں نے ٹرک کی دیوار سے ٹکے ٹکے ہی والد صاحب کی طرح پشتو میں شکر واجب گزاری کی دعا پڑھی کہ ''اگر تو کہیں ہے اور بچوں نے خبر دی ہے کہ تو ہے۔ تو میرا عاجزانہ شکریہ قبول کر۔ میں جانتا ہوں کہ تو جو اتنے بہت سوں پر اتنا کرم کرتا ہے اور اس لیے کرتا ہے کہ کرم کرنا تیری عادت ہے اور تیرے سوا ایسا کریم کہیں کوئی اور نہیں تو تجھ کی کسی چیز کی طرح شکریے کی بھی حاجت نہ ہوگی میں تو شکر اس لیے ادا کرتا ہوں کہ

میری اپنی جان کو اس سے ٹھنڈک ملتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے میرا اپنا چھوٹا سا دل بے حساب مسرت سے بھر جاتا ہے۔"

یہ دعا داتا دربار کے کسی فقیر نے میرے بابا کو سکھائی تھی اور انہوں نے مجھے یاد کرا دی تھی۔

دعا پڑھ کر میں نے روپالی سے اور اس کے قسائی دوست سے پوچھا۔ "خدا بخش اور میر باز کہاں ہیں؟"

قسائی بولا۔ "کون خدا بخش، میر باز؟"

میں نے روپالی سے پھر پوچھا۔ "بولو نا تمہیں نہیں معلوم؟"

وہ بولی۔ "ابھی تو نہیں مالم۔"

"کیا مطلب، ابھی تو نہیں معلوم؟"

اس نے باری باری قسائی کی اور میری طرف دیکھا۔ "دیکھ سیر کھان! میں نے ادھر کار کھانے میں نہیں بتائی تھی۔ تو ویسے ہی پریسان ہو را تھا۔"

"کیا نہیں بتایا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

قسائی نے پہلو بدلا، روکھے پن سے مجھ سے کہنے لگا۔ "او بھائی صاحب! آرام سے ذرا آرام سے۔"

روپا نے سر گھمایا، تیکھے پن سے اسے دیکھا۔ "تو چپکا بیٹھا رہ۔ تیرے کو جرورت نہیں آرام ورام بولنے کی ___ سن او سیر کھان! ادھر جب وہ تجھے کھاٹ پر ڈال کر ٹرک میں لے گئے تھے اس ٹیم کو تیرے ڈریور، چوکی دار کو وہ لوگ نے ادھری بند رکھا تھا۔ ڈریور نے جھگڑا کیا۔ اسے کھبر لگ گئی تھی کہ تیرے کو کھاٹ پہ ڈال کے لے گئے ہیں وہ سمجھا تجھے کھتم کر دیا ہے تو اس نے بڑا بلوا کیا، ڈریور نے، دو تین حرامیوں کو جکھمی کیا۔ وہ لوگ نے اسے اتی مار لگائی، اتی لگائی، سمجھو مارنے میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی، پھر باگھیر بوڑی کے کوتوال کو بلا کے پولیس کے حوالے کر دیا اسے۔ بولے یہ ادھر کار کھانے میں ڈکیتی کرنے گھسا تھا۔ تیرے کو تو سیر کھان! پتا ہے، پولیس وہ لوگ سے مال کھاتی ہے۔ تھانے میں آنکھ کھلی، ہوس آئی تو تیرا ڈریور ایسا الٹی سیدھی بکتا تھا، بولتے ہیں اسے سر میں چوٹ پڑی تھی۔ "پولیس والے موٹے مالک سے پیسے لے کے ڈریور کو پاگل کھانے میں بند کرائی آئے۔"

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "یہ سب کس نے بتایا؟"

بولی۔ "ادھر کے آدمیوں سے میں نے پوچھ لی تھی۔ تبھی اس کر کے نہیں بتائی کی تو پریسان ہے اور پھکر کر لے گا۔"

"اس میر باج کو مار لگائی تھی، پر وہ تگڑا جوان ہے سہہ گیا۔ جبی موٹا مالک آیا وہ اسے ایسے ساتھ باندھ کے لے گیا۔ بیمار تھا پر صئی تھا وہ میر باج۔"

خدایا! میرے وفادار ساتھیوں پر کیا مصیبت آئی ہے۔ خدا بخش رائیں اور میر باز میرے والد کے رکھے ہوئے ملازم ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دونوں کے بارے میں کہا ہے کہ یہ نوکر نہیں بھائی بند ہیں ہمارے۔ ہیرا ہیں دونوں۔

والد صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہیں آدمیوں کی پہچان ہے۔ بے شک وطن جاتے ہوئے انہوں نے ہیرے جیسے پکے، خالص آدمیوں کو میرے ساتھ چھوڑا تھا مگر اب یہ کیا ہو گیا!"

ٹرک مین روڈ چھوڑ کے اپنی بے ڈھنگی رفتار سے تین گھنٹے اسی طرح چلتا رہا۔ ڈرائیور بھی بکر قصاب برادری کا تھا اور بہت ہشیار بندہ تھا۔ اسے بار بار رک کر ٹرک کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنا پڑتا تھا۔ شروع میں تو یہ کام اس نے خود کیا پھر پانی ڈالنے کے لیے وہ روپالی کے دوست کو پکارنے لگا، جس کا نام قادر تھا۔ وہ ٹرک روک کر آواز لگاتا تھا۔ "چل وئی کادرے!" اور قادر ٹرک پہ رکھی پانی کی ٹنکی سے ڈبا بھر کے پانی لے جاتا اور گاڑی میں ڈالتا تھا۔

قادر کے اترنے، پانی ڈالنے، واپس آنے یعنی اس کے ہم دونوں کے پاس سے ہٹنے کا وقفہ اتنا ہوتا تھا کہ روپالی ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ قبضے میں کر لیتی اور مجھ سے جلدی، جلدی باتیں کرنے لگتی۔ قادر کے آنے پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دیتی، دور سرک کے بیٹھ جاتی یا ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کے اونگھنے لگتی۔

اپنے عاشق قادر قصائی سے چراتے ہوئے خلوت کے ان چھوٹے چھوٹے وقفوں میں روپالی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ حیرت ہوئی جب اس نے بتایا کہ کارخانے پر حملہ کرنے سے پہلے قادر دو بار آ کر روپا سے مل چکا تھا۔ دونوں مرتبہ وہ رات کے پچھلے پہر میں آیا تھا اور روپالی کے پاس ایک، ایک ڈیڑھ، ڈیڑھ گھنٹے ٹھہرا تھا۔ اس نے چوہدری کے نوکروں کی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تھا۔ میرے بارے میں سوال کیے تھے کہ تجھے روپالی کیوں یہاں سے نکلوانا چاہتی ہے؟ میں اس کا کون ہوں؟ اگر کوئی نہیں، تو اسے میری اتنی فکر کیوں ہے؟ قادر نے تیور بدل کے پوچھا تھا کہ 'کہیں

مجھ سے روپا کی یاری‘ عاشقی تو نہیں چل رہی؟ اگر چل رہی ہے تو اس نے لڑکی سے کہہ دیا
تھا کہ وہ کسی بھی وقت پانچ سات منٹ میں مجھے آدمی سے لاٹھی بنا دے گا بلکہ کہنے لگا اس
سے بھی کم ٹائم لگے گا۔ ہاتھ اس کا بہت تیز چلتا ہے۔

روپالی نے اس بات پر قادر کو اپنی کھاٹ سے لات مار کے اتار دیا تھا اور صاف
کہہ دیا تھا کہ وہ اب اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی کارخانے کی حدود میں نہیں دیکھنا چاہتی
اور قادر قصائی کو اب بھول جانا چاہیے کہ روپالی نام کی کوئی لڑکی کہیں پیدا بھی ہوئی تھی۔

قادر بھائی کے لیے یہ نیا تجربہ تھا کہ کسی چھٹنکی برابر لڑکی نے انہیں اس طرح
دھتکارا ہو۔ وہ غصے‘ شرمندگی اور روپالی کے پیار میں باؤلے ہو کے کمرے میں ٹہلنے لگے‘
گالیاں بکنے لگے۔ آخر کچھ ان کی کھوپڑی میں آیا تو بولے کہ کوئی لڑکی اپنے کسی عاشق کے
سامنے کسی دوسرے عاشق کے لیے اتنا پھڈا نہیں کر سکتی۔ ہو نہ ہو‘ یہ شیر خان روپالی کا
بھائی ہے۔ روپا ہنس پڑی بولی کہ پاگل! وہ نہ بھائی ہے نہ عاشق‘ شیر خان تو روپالی کا گرو
ہے ___ مرشد ہے اس کا۔

قادر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر روپالی ہنسی تھی اور قادر قصائی کو ایک اطمینان
سا ہو گیا تھا کہ میں جو کوئی بھی ہوں‘ روپا کا یار بہرحال نہیں ہوں۔ اس نے مجھے فرار
کرانے کی حامی بھر لی۔

اس نے اپنی برادری اور پولیس والوں کی مدد سے کارخانے پر یلغار کا منصوبہ تیار
کیا۔ اس میں دو‘ چار‘ دس بکریوں‘ گایوں کے ضائع ہونے یا قصابوں‘ آڑھتیوں کے کچھ
زخمی ہونے کے سوا کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ پولیس والوں نے اتنا تعاون اور کیا تھا کہ
کارخانے کے چار پانچ آدمیوں کو اپنی کسی بیگار میں الجھا کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ تو بس
مویشی کے ریوڑ کو ہنکا کے‘ پرانے پھاٹک پر اپنے پرانے جان دار ٹرک سے ٹکر مار کے وہ
پوری قصاب منڈی کے ساتھ کارخانے میں گھس پڑے تھے اور سیدھی کچی توڑ پھوڑ کر
کے ہم دونوں کو نکال لائے تھے۔

یلغار سے دو گھنٹے پہلے قصائیوں‘ آڑھتیوں نے تھانے میں رپٹ لکھوا دی تھی
کہ ہمارے ریوڑ کے چار چھے جانور کل سے کارخانے والوں نے کمپاؤنڈ میں بند کر رکھے
ہیں‘ ہم مانگنے گئے تو انہوں نے گولی چلا کر ہمیں دوڑا دیا‘ دہائی ہے پولیس کی۔

قادر قصائی اور اس کے بھائیوں نے اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کا ٹھیکہ
پولیس کو پورے دس ہزار روپے میں دیا تھا۔ اوپر سے تین بکرے بھی دیے تھے۔ پولیس

والوں کو‘ مجموعی طور پر یہ کوئی بارہ تیرہ ہزار کا کھیل‘ کھیلا تھا قادر نے۔

روپالی یہ سب سنا کر اور ذرا شرما کر بتانے لگی کہ آج تو ٹائم نہیں ملا مگر کل شام
مغرب کی نماز سے پہلے اس کا قادر سے نکاح ہو جائے گا۔ بولی۔ ”کل تک تو سیر کھان!
میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔“

”ماشاء اللہ!“ میں نے روپالی کو۔ اپنی دوست روپا۔ روپ کو پیشگی مبارک باد
دی۔

قادر اور اس کے بھائی بند خبر نہیں کب سے اس علاقے میں آباد تھے۔ ان
لوگوں کی دوستیاں‘ مروتیں ادھر بھی تھیں‘ دریا پار بھی تھیں پھر کاروباری رابطے تھے۔
دنیا کو گوشت کھلا رہے تھے یہ لوگ۔ ہم اجنبی علاقے میں بڑھتے جا رہے تھے لیکن ہر جگہ
جان پہچان کے لوگ بھی مل رہے تھے۔

میل بھر دور سے دریا کی مہک آ رہی تھی۔ ہمارا ٹرک کشتی گھاٹ پر لگا تو معلوم
ہوا ایک اچھی جان دار موٹر بوٹ قادر ٹھیکے دار اور ان کے ”گھر والوں“ کے لیے پہلے سے
تیار ہے۔

یہاں ٹرک والا اترا تھا‘ قادر کی طرف سے ہاتھ اٹھا کے وہ ”اچھا وئی کادر‘
جاراؤں“ کر کے پھر ٹرک میں بیٹھ گیا تھا اور کھڑکھڑاتا‘ پھٹ پھٹاتا‘ ہمیں گھاٹ پر کھڑا
چھوڑ کر چل دیا تھا۔ یہ قادر قصائی کا بہترین دوست تھا اور اس معرکے میں معمولی زخمی
بھی ہوا تھا مگر جاتے ہوئے نہ سلام دعا ہوئی نہ شکریہ نوازش۔ بس ڈرائیور بھائی نے کچھ
کھسیاتے شرماتے ہوئے ”اچھا بے!“ کہہ کر ہاتھ اٹھا دیا تھا اور وہ رخصت ہو گیا تھا۔

خوب لوگ تھے یہ بھی۔

موٹر بوٹ ہم تینوں کو لے کر تیس پینتیس منٹ میں دریا پار کسی دوسرے
گھاٹ پر پہنچ گئی۔ یہاں ایک پرائیویٹ ٹیکسی میں قادر کے دو دوست ہمارے منتظر تھے‘ وہ
کچھ کھانے کا بھی لائے تھے۔ کھا پی کر‘ ٹیکسی میں سوار ہو کر ہم دو گھنٹے بعد کسی گاؤں میں
پہنچ گئے۔

ٹیکسی جس مکان کے سامنے جا کر رکی وہاں پیٹرومیکس جلتے تھے اور سامنے گلی
میں چھے سات بوڑھے‘ ادھیڑ عمر کے آدمی تہبند باندھے‘ شلوکے پہنے‘ جمے بیٹھے تھے۔
ٹیکسی رکی تو اس وقت تک کوئی نہ اٹھا جب تک کہ مکان سے عورتیں نکل کے نہ آ گئیں
اور روپا کو چادر اڑھا کر گھر میں نہ لے گئیں۔ ”جنانیوں“ کے جانے کے بعد مونڈھوں پر

بیٹھے ہوئے لوگ کھانستے' کھنکھارتے ہوئے آئے اور ''کیوں بے!'' ''ہاں بے'' کہتے ہوئے قادر کے شانے یا بازو کو چھو کر تھپکی دینے کے بعد مسکراتے یا پسندیدگی میں سر ہلاتے واپس مونڈھوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

قادر نے مونڈھے والوں کی طرف دیکھ کر میری جانب ہاتھ اٹھایا اور اکھڑے اکھڑے انداز میں میرا تعارف کرایا' ''یہ اس کے بھائی بند ہیں۔''

مونڈھے والوں نے اس کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا' کسی نے ایک مونڈھا میری طرف بھی سرکا دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ آدھی رات کے قریب مکان کے سامنے ہی چارپائیوں' مونڈھوں پر بیٹھ کے سب نے کھانا کھایا پھر مجھے گلی کے کسی مکان میں لے گئے۔ صاف ستھرا بستر دیا۔ ایک لالٹین جلا کر فرش پر رکھ دی اور چلے گئے۔

میں وہاں دو روز رہا۔ قادر بھائی ویسے کی دعوت سے پہلے مجھے جانے ہی نہیں دیتا تھا۔

جانے سے آدھے گھنٹے پہلے قادر مجھے اس گھر میں لے گیا جس میں اس کے رشتے کی عورتیں' روپالی کو چادر اڑھا کر لے گئی تھیں۔ جس کمرے میں مجھے انتظار کرنے کو بٹھایا گیا تھا عام سا غریب آدمیوں کا کمرا تھا' مگر صاف ستھرا۔ نیچے دری بچھی تھی اور دور' دور صرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔ یہاں میری اور روپالی کی الوداعی ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔

کوئی دس منٹ کے انتظار کے بعد چوڑیوں اور زیوروں کے بجنے کی آواز کے ساتھ وہ کمرے میں آئی۔

اتنی عمر ہو گئی زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا ہے' خوشیاں' مایوسیاں' امیدیں' غم میں رویا بھی ہوں' اپنوں کے ملنے' اپنوں سے بچھڑنے پر مگر اس روز ایک اجنبی گھر کے بے رنگ کمرے میں جب میں کرسی سے دلہن کی پیشوائی کے لیے اٹھا اور اسے ___ روپالی کو دیکھا تو لگا کوئی چیز' کوئی بہت عزیز شے۔ میری جان' شاید میرے وجود سے چیخ مارتی ہوئی نکلی ہے اور اس چھوئی موئی کی گٹھری' اس چھوٹی سی دو دن کی دلہن' کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے لگی ہے۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ ''قربانت شوم! تم پر قربان جاؤں۔''

وہ تنہا کمرے میں آئی تھی اور دروازے سے ہو کر کمرے کے وسط تک میری آنکھوں پر پاؤں رکھتی پہنچی تھی۔

میں کوئی عام سی فضول' بے اثر' عامیانہ سی بات نہیں کہوں گا۔ وہ کھلی پڑ رہی

تھی' اپنی طرح' روپالی کی طرح۔

مسرت اور اندوہ کی اس گھڑی میں ایک عجیب سی حسرت' ایک بے نام' فضول سے دکھ نے میرے دل کو جکڑ لیا۔ یہ خوش بختی' یہ خوب صورتی یہ سارنگا۔ عورت۔ یہ دوسرے کے نصیب میں آئی ہے اور میری اس کی یہ آخری ملاقات ہے۔

اس نے مسکراتے' روشنی بکھراتے دھیرے سے پوچھا' ''سیر کھان! کیسا ہے؟''

شاید اس وقت تک میری آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں' تو اس نے جھپٹ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور یوں جیسے کوئی ماں' بچے کو تسلی دیتی ہے' ناتا۔ نا کر کے سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگی۔

کچھ بہلاوے دیے ہوں گے اس نے۔ کچھ اچھی باتیں' کچھ وعدے کیے ہوں گے اس نے مجھ سے ___ اب یاد نہیں۔

میں جب اس کے قرب سے محروم ہوا' اس سے ہٹ کر کچھ دور جا کھڑا ہوا تو وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کے رخسار چھو لیے۔ ''روؤ مت دوست روپالی' روپا' روپ۔ اب خوش رہو۔''

وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہنس پڑی' بولی' ''میرا نام رکیہ ہے۔ روپالی تو بس میں تیرے لیے رہ گئی ہوں۔ برسوں سے لے کے اب تک سب نے رکیہ بول' بول کے میرا اپنا جنم کا نام ہی مجھے بھلا دیا۔''

''میں یاد رکھوں گا۔''

''ہاں تو یاد رکھنا سیر کھان ___! دوس!'' اور ہاتھ پھیلا کر اس نے میری بلائیں لے لیں پھر تیزی سے وہ مڑی اور روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

چلتے ہوئے قادر نے دو ہزار روپے میری جیب میں ڈال دیے۔ میں نے واپس کرنے کی کوشش کی تو ناراض ہونے لگا۔ میں نے کہا۔ ''یہ بہت ہیں۔''

اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال لیا۔ ''یہ لو کم ہو گئے۔'' اور وہ مونچھوں میں ہنسا۔

قادر بھائی پہلی بار میرے سامنے ہنس رہے تھے لگتا تھا ان کی' ہماری دوستی' آخر کار پکی ہو گئی ہے۔

اس گاؤں سے مجھے مضافاتی بس میں بیٹھ کر کشتی گھاٹ تک جانا تھا' پھر دریا پار کرنا تھا۔ آگے میں نے سیدھے کاکسیز بازار جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وکیل مزمل' بے بس

پڑے ہیں تو کیا ہوا۔ والد صاحب کے تعلقات سرکاری افسروں' پرائیویٹ فرموں کے
اہم لوگوں میں اتنے ہیں کہ گھنٹا بھر بھی نہیں لگے گا اور سلسبیل چوہدری اور اس کا ذلیل
بھتیجا سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ کوئی اندھیر تو نہیں ہے۔ حکومت کی پوری مشینری بے
جو رشوت اور بدعنوانی سے ممکن ہے زنگ آلود ہو گئی ہو مگر ٹھپ تو نہیں ہوئی ہے۔ اس
کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مجھے خدا بخش اور میرباز کا پتا اٹھانا ہے۔ سلسبیل چوہدری کا
ہیڈکوارٹر بھی کاکسیز بازار ہی ہے۔ اصولی طور پر مجھے یہاں سے وہیں جانا چاہیے۔ گیسٹ
ہاؤس کا بھی پتا کروں گا' وہاں کیا ہو چکا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟

کشتی گھاٹ پر پہنچا۔ بازار میں قادر کے ان دو دوستوں صدیق اور سلیم سے ملا'
جنہوں نے آتے ہوئے موٹر بوٹ پر ہمارا استقبال کیا تھا' کھانا کھلایا تھا۔ دونوں بہت مزے
کے آدمی نکلے۔ دونوں کپڑے کی دکان میں ساجھے دار تھے۔ بڑی دکان تھی' پانچ چھ ملازم
کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو فون کر دیا کہ کھانا بھیج دو' یہیں مہمان کے
ساتھ کھائیں گے۔ مجھ سے قادر کی شادی کا حال احوال پوچھتے رہے۔

ایک بولا۔ "وہ ادھر آئے گا تو دعوت کریں گے' آدھی مارکیٹ کو بلائیں گے
اور شکوہ بھی کریں گے قادر نے اتنا کم وقت دیا تھا۔ ہم دونوں ادھر کام میں پھنسے ہوئے
تھے شریک نہ ہو سکے۔ پہلے سے بتا دیتا تو ہم بھی ارمان نکالتے کچھ دھوم دھام کرتے۔"

دوسرا کہنے لگا "شکوے کا حق قادر بھائی کا ہے۔ وہ ہم کو دن ٹائم سب بتا کر گیا
تھا۔ ہمیں کام پڑ گیا تھا تو یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ غرض دونوں ہی سب محبت کی باتیں
کرتے رہے۔

میں نے پوچھا۔ "یہاں سے کاکسیز بازار فون ہو سکتا ہے؟"

بولے "ضرور ہو سکتا ہے بتاؤ کیا نمبر ملانا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا ہمارے گیسٹ ہاؤس کا پرانا کک سمجھ دار آدمی ہے اس سے
وہاں کا کچھ معلوم کروں۔ آخر کیا ہو رہا ہے؟ چوہدری کی جعل سازی اور وارداتیں اپنی
جگہ' اصل میں تو گیسٹ ہاؤس ہی میرا گھر تھا۔ ابھی تو بابا ہی کی پراپرٹی تھی۔ گیسٹ ہاؤس
اور میں ان کی نمائندگی کر رہا تھا۔

میں نے گیسٹ ہاؤس کا نمبر دے دیا۔

کافی دیر بعد کاکسیز بازار ملا۔ آپریٹر سے گیسٹ ہاؤس کا نمبر مانگا۔ مل گیا۔ کسی
پرانے بیرے نے فون اٹھایا۔ میں نے اسے اپنا نام نہیں بتایا۔ کک کا نام لیا کہ اس سے بات

کرنی ہے۔ وہ فون رکھ کر بلانے چلا گیا۔ گیسٹ ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کے لیے
مہمان' ہال میں جمع ہو رہے تھے۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا۔

اس مانوس شور کو دباتی ہوئی کسی کی بھدی آواز سنائی دی' "یہ فون کیوں ہولڈ
کیا ہے بھئی؟" میرے لیے یہ نئی آواز تھی۔

ایک بیرے نے' جس کی آواز میں پہچان رہا تھا' کہا' "کک کا فون ہے
صاحب۔"

نئے آدمی نے فون اٹھا لیا اور بگڑ کر بولا۔ "یہ ہمارے کام کا ٹائم ہے بھئی۔ کک
سے کیا کام ہے آپ کو؟ کون ہیں آپ؟"

میں نے نزلے جیسی آواز بنا لی۔ جمی ہوئی بنگلا میں بگڑ کر بولا' کاکسیز بازار'
ٹریفک پولیس سینٹرل ڈویژن سے ہیڈ کلرک نازرل اسلام میاں بول رہا ہوں۔ یہ ہمارے
بھی کام کا ٹائم ہے بھئی سمجھے؟ بلاؤ اس کو' دن بھر ہولڈ نہیں رکھیں گے۔ سمجھے؟"

میں نے ہیڈ کلرک نذر السلام میاں کا نام لیا تھا' یہ کک کا سسرالی رشتے دار تھا
اکثر فون کرتا رہتا تھا۔

"اچھا صاحب! اچھا۔" کہہ کر نئے آدمی نے فون رکھ دیا مگر اس کی آواز صاف
سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہیڈ کلرک کی خوشامد میں کک کو جھاڑ پلا رہا تھا۔ "کہاں رہ گئے تھے
بھئی؟ کب سے ہولڈ کرایا ہوا ہے۔"

کک نے ریسیور اٹھایا' کہا۔ ہیلو!"

میں نے کہا آہستہ "سنو میں شیر خان ہوں۔ میرا نام مت دہرانا۔ فون لے کے
برابر کیبن میں چلے جاؤ۔ میں جو پوچھ رہا ہوں ہلکی آواز میں اس کا جواب دینا۔ دروازہ بند
کر لینا جاتے ہی ___ اور یاد رکھنا نام کوئی بھی مت لینا۔ جاؤ۔"

"ہاں صاحب" کہہ کے کک نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا۔ لمحے بھر بعد اس
کی آواز آئی۔ "ہیلو سر!"

"سر' ور مت کہو! تم کیبن میں ہو؟"

"ہاں صاحب۔"

"یہ کاؤنٹر پر کون ہے؟"

کک نے بتایا "دتہ صاحب ہے۔" پھر اس نے تشویش سے پوچھا۔ "صاحب
آپ خیریت سے ہو؟"

"ہاں' ہاں سب صحیح ہے۔ یہ دتہ صاحب کون ہے؟"

"بازلر صاحب بیٹھا کے گیا ہے ___ صاحب! صاحب آپ کہاں سے بو
رہے ہو؟ کیا ادھر ہی کاکسیز بازار سے؟" بے چارہ کک میرے لیے پریشان ہو گا۔ ب
آدمی تھا۔

میں جہاں تھا' میں نے اس قصبے کا نام لیا اور کشتی گھاٹ کا بتایا۔

"ادھر کہاں ٹھہرے ہو آپ؟"

میں نے کہا۔ "یہ سب چھوڑو۔ اس نے خبیث بازلر نے میرا' خدا بخش ا
میرباز کا تم سے کیا کہا ہے؟"

کک نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "وہ بدمعاش آدمی ہے کچھ بھی بولتا ر
صاحب۔ ہم لوگ ادھر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ کدھر سے فون کر رہے ہو آپ؟
میں نے کہا۔ "نمبر تو نہیں معلوم کپڑے کی دکان ہے صدیق سلیم کلا
مرچنٹ۔"

"صدیق سلیم کلاتھ مرچنٹ۔ ہاں صاحب؟ صدیق سلیم؟ اس نے جس ط
احتیاط سے دکان کا نام دہرایا' تصدیق کی اس سے مجھے فکر ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ دہرا ک
نام یاد کر لینا چاہتا ہے۔ مجھے یہ غیر متعلق بات لگی۔ آخر کیوں؟ وہ نام کیوں یاد کر رہا تھا؟
خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے کہا۔ "اچھا پھر فون کروں گا۔"

بولا۔ "ٹھہرو صاحب اور سب ٹھیک ہے؟ خدا بخش کہاں ہے؟"

خدا بخش؟ خدا بخش سے تو اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ اس کا کیوں پوچھ رہا ہے؟ اس
نے میرباز کا نام نہیں لیا تھا جس سے اس کی دوستی تھی۔ کیوں؟ کیا اسے معلوم ہ
میرباز میرے پاس نہیں ہو سکتا؟

میں نے جلدی' جلدی کہنا شروع کیا۔ "ہاں خدا بخش بھی ٹھیک ہے' م
بھی۔ ادھر ہی ہیں دونوں۔"

"دونوں ہیں؟ اچ اچھا۔ اچھا میرا اسلام کہنا' صاحب آپ کب آ رہے ہو؟"

یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ کک نے حیران ہو کر پوچھا تھا کہ کیا دونوں ہیں؟ اس
لہجے میں بے اعتباری تھی۔

بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ کک میرا آدمی نہیں ہے۔ وہی گیسٹ
میں بازلر کا' سلسیل چوہدری کا مخبر ہو سکتا ہے۔ اسے معلوم ہو گا کہ میرباز میرے

نہیں ہے۔ غضب کیا میں نے اسے پتا نشان بتا کے' بہت بڑی غلطی کی۔
مجھے اس وقت ہوش کیوں نہیں آیا' جس وقت وہ جگہ کا نام اور فون نمبر پوچھ رہا
تھا۔

ایک لمحے کا بھی انتظار کیے بغیر میں نے فون بند کر دیا ___ مجھے یہاں سے فوراً
چل دینا چاہیے۔

قادر کے کلاتھ مرچنٹ دوستوں سے میں نے پوچھا۔ "اس پار جانے والی پبلک
لانچ یہاں سے کتنی دیر بعد چھوٹے گی؟"

کہنے لگے۔ "کمال کرتے ہو آپ؟ گھر سے کھانا آ رہا ہے۔ کھانا کھائے بغیر تو
آپ جانے وانے کا سوچو بھی مت۔"

میں گھبرایا ہوا تھا' وہ پوچھنے لگے۔ "ادھر خیر تو ہے؟ کیا بات ہے؟ پریشان دکھتے
ہو۔"

میں نے کہا۔ "خیر نہیں ہے اسی لیے تو لانچ کا پوچھ رہا ہوں۔ فوراً جانا چاہتا
ہوں۔"

بولے۔ "نہیں بھئی' کھانا آتا ہو گا ہم تینوں بھائی کھانا کھائیں گے۔ پبلک لانچ
کو جانے دو۔ جیسے ہی کھانے سے فراغت ہو گی کوئی پرائیویٹ لانچ کر کے تمہیں تمہارے
گھاٹ پر اس پار اتروا دیں گے۔"

پرائیویٹ لانچ؟ میں نے سوچا' میرا پیچھا کرتے ہوئے بازلر کے بدمعاش یہاں
کپڑے کی دکان تک تو آ ہی جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں یہاں کے بعد انہیں کوئی سراغ نہ
ملے کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ ذہن میں فرار کا جو منصوبہ تیار ہو رہا تھا پرائیویٹ لانچ
کرنے سے اس میں گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ تیس چالیس مسافروں کے ساتھ پبلک لانچ میں بیٹھ کر آخری
گھاٹ تک کا ٹکٹ لے کے میں خاموشی سے بیچ کے کسی گھاٹ اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ میں
یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی ___ اب تو کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں
اترا ہوں۔

میرے دونوں میزبان بہت مشکل سے پبلک لانچ پر بٹھانے کو راضی ہوئے۔
چلتے ہوئے وہیں بازار سے مٹھائی کا ایک ڈبا لے کر میرے حوالے کیا کہنے لگے کہ "کھانا
ہمارے ساتھ نہیں کھا رہے تو اسے لانچ میں بیٹھ کر کھاتے چلے جانا۔"

پبلک لانچ کے چلنے ٹھہرنے کا نظام بہت ناقص تھا۔ انہوں نے چلنے میں اتنا وقت لگا دیا کہ اس عرصے میں دو پرائیویٹ لانچیں گھاٹ سے فرار ہو گئیں۔ میرا کم سے کم آدھا گھنٹا خراب کیا اس پبلک ٹرانسپورٹ نے۔

لانچ آخر چل پڑی۔ میں انجن روم کے سائے میں لوگوں میں گھل مل کے اس طرح جا بیٹھا کہ رستے کے کسی بھی اسٹاپ میں اترنے میں آسانی ہو۔ الگ تھلگ بیٹھنا۔ مصلحت کے خلاف تھا۔ یہ لوگ چلتے چلتے بھی مسافر چڑھا رہے تھے۔ آخری آدمی ایک بھاری بدن کا گجراتی بنیا تھا جسے مشکل سے خلاصیوں نے پیر سے کھینچ کے اندر لا پٹکا تھا۔ وہ غصے میں بکتا' جھکتا اور پریشان حال میرے برابر آ بیٹھا۔

کہنے لگا۔ "یہ پبلک لانچ والے بہت بے لحاظ' بد تمیز ہیں۔ ذرا پرائیویٹ لانچ پر نوکری کرتے اور پاسنجروں سے بد تمیزی کر کے دیکھتے۔ مالک گھنٹے بھر میں حساب صاف کر دیتا۔"

وہ مجھ سے کسی جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا پھر بھی میں نے آہستہ سے کہا۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ بنچ پر مشکل سے میں بیٹھا تھا میں نے ذرا سرک کے جگہ دے دی۔

بولا۔ "میں تو دس' بیس منٹ پہلے چل پڑا تھا۔ آرام سے جگہ مل جاتی۔ دوڑنا بھاگنا نہیں پڑتا۔"

میں اس کی فضول بات چیت میں نہ معلوم کیوں حصہ لینے لگا۔ میں نے کہا۔

"ہاں' جلدی چل پڑنا اچھا رہتا ہے۔"

"میں تو چل پڑا تھا جلدی۔ بازار میں بلوہ ہو گیا۔ میں گلی میں چھپا کھڑا رہا۔ میرا پاؤ گھنٹا خراب کیا۔ ان بنگلا دوست والوں نے۔"

"بنگلہ دوست۔" انتہا پسند سیاسی لوگ تھے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے وکیل مزمل حسین مسلم لیگی کو مارا پیٹا تھا۔ ان کا دفتر برباد کر دیا تھا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے' پوچھا۔ "'بنگلہ دوست' والے کیا کر رہے تھے؟"

"خبر نہیں کیا کر رہے تھے اصل بات کچھ اور ہی ہو گی۔ ادھر مارکیٹ میں گجراتی بھائیوں کی ایک دکان ہے کپڑے کی بد معاشوں نے آگ لگا دی دکان کو' بھگدڑ مچ گئی۔"

آواز تو آئی تھی۔ مجھے یاد آیا' دور کی بھنبھناہٹ سنی تھی۔ جیسے کچھ گڑبڑ ہو رہی

ہے۔

"گجراتی؟ کپڑے کی دکان؟"

ایک دم جیسے بجلی کا زندہ تار چھو لیا ہو۔ میں بنئے کی طرف گھوم گیا۔

"گجراتیوں کی کون سی دکان؟"

بولا۔ "بڑی دکان ہے۔ صدیق سلیم کلاتھ مرچنٹ۔"

میرا گلا خشک ہو گیا' او خدا! "آگ لگا دی؟ کیوں؟"

"اصل بات تو معلوم نہیں۔ میں نے بلوے سے پہلے دکان کے سامنے سے گزرتے سنا تھا۔ وہ صدیق اور سلیم سے____ دونوں مالکوں سے کسی مہمان کا پوچھ رہے تھے۔"

"مہمان؟" کہہ رہے تھے۔ "اس کا بتاؤ کدھر گیا نہیں تو ہم تمہارے کو جان سے مار دے گا؟"

"ہاں۔ ادھر کوئی مہمان آیا ہو گا کپڑے والوں سے اس کا پوچھ رہے تھے۔"

موت میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی پھر بھی میں نے رواروی میں کہا۔ "ان لوگوں کا یہی ہے۔" وہ بولا "ہاں' جھگڑا بلوہ کرنے کو کوئی بہانہ بنا لیتے ہیں۔ دونوں دکاندار قسمیں کھا رہے تھے کہ نہیں ادھر کوئی مہمان نہیں آیا۔ پر وہ کہہ رہے تھے نہیں تم بھی اس کے ساتھ مٹھائی کی دکان پہ کھڑے تھے۔"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے بے دھیانی میں پوچھا۔ "مٹھائی کی دکان؟ کیسی؟" ڈبا جو صدیق اور سلیم نے ساتھ کر دیا تھا اخبار میں لپٹا میرے ہاتھ کے تھیلے میں رکھا تھا۔

بنیا بولا۔ "ارے! مہمان اور مٹھائی کی دکان یہ سب بہانے بازی ہے۔ کوئی پرانی دشمنی نکالنے آئے ہوں گے بدمعاش۔"

میں نے آہستہ سے "ہاں" میں سر ہلایا۔

لگتا تھا جیسے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی ہے۔ میں خوفزدہ نہیں تھا۔ موت تو ایک بار آنی ہے وہ کبھی بھی آ جائے۔ مجھے تو اپنے بے قصور میزبانوں کی تباہی کا صدمہ تھا۔ ان کا گناہ بس یہ تھا کہ اپنے کسی دوست کے ملاقاتی کو مجھے کچھ دیر کے لیے دکان پر روک کر انہوں نے کھانے کو پوچھ لیا تھا اور بس۔ سب اثاثہ' زندگی بھر کی محنت' ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو گیا تھا۔ میری وجہ سے۔ جی چاہا چلتی لانچ سے دریا میں کود پڑوں' لوٹ کے جاؤں اور خود کو ان بنگلا دوست' دشمنوں کے حوالے کر دوں۔ میری وجہ سے اور کس' کس کو ستائیں گے اور کسے برباد کریں گے بدمعاش۔

مگر کچھ دیر میں خاموش بیٹھا رہا۔ بنیا اونگھ رہا تھا۔ لانچ اپنے پہلے گھاٹ اسٹیشن پر رکی تھی۔ ابھی ہم دریا کے دوسرے کنارے پر نہیں لگے تھے۔ ادھر ہی تھے جس کنارے پر کپڑے والوں کی تباہی ہوئی تھی۔ بارہ پندرہ میل دور ہم دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکل آئے تھے۔ لانچ کا اگلا سٹیشن دریا پار تھا۔ لانچ کو بہاؤ کے ساتھ پانچ میل ادھر چل کر تھا پھر دریا پار کرنا تھا۔

میں بنیے کے پاس سے اٹھ آیا۔ لانچ اپنے دوسرے اسٹاپ پر کنارے لگی۔

کوئی بڑا گھاٹ تھا۔ بارہ پندرہ مسافر اترنے کے لیے قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی شامل ہو گیا۔ قادر قصائی کا تحفہ حاجیوں والا پیلا رومال میں نے سر سے باندھ لیا تھا جس سے ایک نظر میں میری عمر اور شکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اترنے والے دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔

آخر میری بھی باری آئی۔ میں اترا اور بارہ پندرہ مسافروں کے ٹولے کے ساتھ سامنے کے چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ بیٹھنے کے بجائے میں پچھلے برآمدے سے باہر نکل کر سامنے کی تنگ گلی سے گزرتا گھاٹ بازار کی چھوٹی مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ سوچا پانی پی لوں گا۔ اچانک شور سنائی دیا اور میں نے دیکھا کہ ایک پرانی جیپ پر سوار آٹھ دس لڑکے ہاہا' ہو ہو کا سا شور کرتے گھاٹ پر رکے ہیں۔ انہوں نے بریک لگاتے ہوئے تیز آواز کی تھی۔ وہ جیپ سے کود کر اترے اور ڈرائیور سمیت جس کے گلے میں ہتھیار لگی بیلٹ پڑی تھی۔ جھپٹ کر لانچ کے تختے پر چڑھتے چلے گئے۔ وہ سوار ہوتے مسافروں کو دھکا دیتے' شور شرابا کرتے چڑھے تھے۔

میں تیزی سے مسجد میں داخل ہو کر وضو خانے میں جا کھڑا ہوا اور ستون کی اوٹ میں رومال سے چہرہ پونچھنے لگا۔ گھاٹ پر جو کچھ ہو رہا تھا مجھے یہاں سے بہ خوبی نظر آ رہا تھا۔

لانچ پر چڑھنے والے غنڈا ٹائپ لڑکے اس علاقے کے لگتے تھے۔ ہر شخص ان سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لانچ سے دھڑ دھڑاتے ہوئے اترے تو وہ سب کے سب چائے خانے میں گھس پڑے۔ لانچ والوں نے انہیں بتایا ہو گا کہ اترنے والے ایک ہی جماعت کے تھے اور وہ سیدھے چائے خانے میں گئے ہیں۔

میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کیں۔

جیپ پر آنے والے کافی دیر چائے خانے میں رہے۔ دور کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ ان کی اور چائے خانے میں موجود لوگوں کی لّم لّشا ہو رہی ہے۔ پھر وہ چائے خانے سے نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے سوچا اس پورے علاقے میں سلیل چوہدری کے کارندوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ شخص اپنی مجرمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے' انہیں منظم انداز میں جاری رکھنے کے لیے اس پارٹی بنگلا دوست میں شامل ہو گیا ہے۔ حیرت ہوئی اس کے گرگے کتنی تیز رفتاری سے کارروائی کرتے ہیں۔ میں اگر لانچ ہی میں رہتا یا ان کی جیپ دو منٹ پہلے گھاٹ پر پہنچ گئی ہوتی یا میں چائے پینے کو چائے

خانے میں ٹھہر جاتا تو بس دھر لیا گیا تھا۔

اس علاقے کی نوے فیصد سے زیادہ بنگالی آبادی میں لمبے قد، گوری رنگت کے ایک پٹھان لڑکے کو تلاش کر لینا کسی کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ چوہدری کے کارندے ہ لانچ کے مسافروں کو چیک کر رہے ہیں۔ وہ پرائیویٹ لانچیں جو اس پبلک لانچ سے پہلے چل پڑی تھیں انہیں بھی چیک کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے جیپ والے اس گھاٹ اسٹیشن پر بھی آئیں۔ یہاں ٹھہرے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔

میں مسجد سے نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ لانچ سے اترنے والے مسافروں کی جماعت جو چائے پینے گھسی تھی اب ادھر ہی آ رہی تھی۔ نماز کا وقت نہیں تھا مگر ان میں سے دو آدمی وضو خانے کی طرف آ گئے۔ باقی لوگ جن میں کچھ سگریٹ بھی جلائے ہوئے تھے مسجد کے باہر ٹھہرے رہے۔ وہ اونچی آواز میں جیپ والوں کے رویے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ انہیں غصہ تھا کہ جیپ والوں نے ان پر دھونس جمانے کی کوشش کی تھی اور دھمکیاں دی تھیں۔

میں نے وضو کے لیے آنے والوں کی طرف پشت کر لی اور خود وضو شروع کر دیا۔ چاہتا تھا وہ دونوں فارغ ہو کر وضو خانے سے نکل جائیں تا کہ میرا راستہ صاف ہو۔ اب جب کہ جیپ والوں نے ان سے پوچھ گچھ کی ہے تو ان کے ذہن میں ہے وہ مجھے آسانی سے پہچان لیں گے۔

میں جانتا تھا یہ دشمن نہیں ہیں پھر بھی ضروری تھا کہ میں کسی کے سامنے نہ آؤں۔ کیا خبر وہ بدمعاش میرے بارے میں عام لوگوں سے کیا کہتے پھر رہے ہیں۔ ظاہر ہے میں ان میں سے نہیں ہوں۔ ماحول بگڑتا جا رہا ہے۔ احتیاط کرنی چاہیے۔

اچانک دونوں وضو کرنے والے اٹھے اور میرے دائیں بائیں کے نلکے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ عجیب بات ہے۔ ابھی وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں بھی خوب پانی آ رہا تھا پھر مجھے گھیر کے بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟

ان میں سے ایک جو میری عمر کا تھا بنگلا میں اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ "کیا وہی ہے جسے جیپ والے ڈھونڈ رہے تھے؟"

میرا دل دھک سے ہو گیا۔

دوسرا بڑی عمر کا آدمی بولا۔ "ہاں وہی لگتا ہے۔"

پہلے نے پوچھا۔ "کیا کریں؟"

بڑی عمر والا کہنے لگا۔ "کرنا کیا ہے۔ وہ جانیں، یہ جانے۔"

چھوٹا لڑکا بولا تو اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ "وہ سب ابھی ادھر ہی ہیں۔ آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

"آئیں، نہیں آئیں، ہماری بلا سے۔"

"اور جو وہ بکواس کر کے گئے ہیں؟ اس لڑکے کی وجہ سے ہمیں دھمکیاں دے گئے ہیں؟"

بڑے کے لہجے میں ذرا سی بے خوفی تھی جو عمر اور تجربے کی وجہ سے ہو گی۔ بولا۔ "ان بدمعاشوں کا کیا ہے سبھی سے بکواس کرتے ہیں۔"

"نہیں وہ شک کر رہے تھے کہ ہمیں پٹھان بھائی کا معلوم ہے مگر ہم چھپا رہے ہیں۔ اب جا کے بتاؤ ان سالوں کو کہ تمہارے جھگڑے سے ہمارا کیا لینا دینا۔ دیکھو یہ بیٹھا ہے تمہارا پٹھان۔"

بہت عجیب دلیل دے رہا تھا یہ لڑکا۔ یہ مروا دے گا مجھے۔

بڑے نے کہا۔ "نہیں جی ہمیں کیا ضرورت ہے۔" اور وہ اٹھنے کو ہوا۔

چھوٹے نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "ٹھہرو تو بھئی ان سے بلاوجہ دشمنی رکھنا اچھا نہیں ہے۔ ہم بھی ادھر ہی ہیں۔ وہ بھی ادھر ہی ہیں۔"

اب میرے لیے چپ بیٹھے سنتے رہنا ممکن نہیں رہا۔ میں نے اپنی بہترین بنگلا میں کہا۔ "اور میں بھی ادھر ہی ہوں، دوستو! ادھر ہی پیدا ہوا ہوں۔ پٹھان بھائی ہوں تو کیا ہوا؟"

میری آواز سن کر انہیں جھٹکا سا لگا۔ دونوں کھسیا گئے۔ بڑے نے کہا۔ "معاف کرنا ہم سمجھے تمہیں بنگلا نہیں آتی۔ تمہارا کیا جھگڑا ہے ان سے؟"

میرے ذہن میں ایک تصویر کی طرح وہ اخباری کالم آیا جس میں وکیل مزمل حسین پر حملے کی ہیڈنگ لگی تھی۔

میں نے مسمسی آواز میں پوچھا۔ "آپ لوگوں نے کاکسیز بازار کے مسلم لیگی لیڈر وکیل مزمل حسین صاحب کا نام سنا ہے؟"

"ہاں، ہاں جسے اس دوست پارٹی والوں نے ابھی دو چار دن پیچھے مار پیٹ کی ہے؟"

"ہاں وہی۔" میں نے کہا۔ "میں وکیل صاحب کے آفس میں کام کرتا ہوں۔"

ان کے دوست کا بیٹا ہوں۔" ظاہر ہے یہ آخری بات جھوٹ نہیں تھی۔

"ارے!"

میں نے دونوں کو زیادہ موقع نہیں دیا اور کہا۔ "انہوں نے وکیل صاحب کو میرے سامنے مارا پیٹا تھا۔ اس لیے اور میرے دشمن ہو گئے ہیں جبھی سے میرے پیچھے لگے ہیں۔"

"اوہو!" دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "جیپ والوں نے تم سے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟ آخر مجھے معلوم تو ہونا چاہیے۔"

"کچھ نہیں کہا بس وہ ہم پہ شبہ کر رہے تھے۔ کہتے تھے پٹھان کو لانچ سے تم لے کے نکلے ہو۔ تمہی نے اسے کہیں چھپایا ہے۔ ہمیں وہ چاہیے۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "وہ برے لوگ ہیں۔"

ایک بولا۔ "بہت برے یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ کوئی کسی بھی پارٹی میں کام کرے۔ ہیں تو سبھی اپنے ہی ملک کے۔"

دوسرا کہنے لگا۔ "ہاں سبھی مسلمان ہیں۔ دشمن تو نہیں ہیں۔"

پہلے والے نے آگہی میں سر ہلا کر کہا۔ "دشمنوں کے کہنے پر اچھل رہے ہیں سالے۔"

"اور کیا۔" میں نے لقمہ دیا۔

بڑے والے نے مجھے مشورہ دیا۔ بولا۔ "سنو تم ابھی ادھر ہی رہنا مسجد میں۔"

میں نے انہیں پکا کرنے کو کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو یا کسی کو میرا مت بتانا۔ میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کے نکل جاؤں گا۔"

نوعمر ساتھی اب شدومد سے میرا ہمدرد ہو گیا تھا۔ "نہیں نہیں۔ بے فکر رہو' ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

بڑے نے بھی مجھے تسلی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں بھئی' ہم تبلیغی پارٹی کے لوگ ہیں ہمیں سیاسی جھگڑوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ بے فکر رہو۔"

وہ لوگ چلے گئے۔ میں اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ سڑک اور بازار پر نظر رکھنا ضروری تھا جیسے ہی میدان صاف دکھا میں چل دوں گا۔

ابھی چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میں نے دیکھا تبلیغی پارٹی کا چھوٹا کارکن ادھر ادھر دیکھتا پھر مسجد میں آگیا ہے۔ میں اوٹ سے نکل آیا۔ قریب آکر وہ دبی آواز میں بولا۔

"وہ بازار میں پھیل گئے ہیں۔ اس لیے آیا ہوں کہ بتادوں۔"

"اوہ!" یہ پریشانی کی بات تھی۔

"نکلنے کے سب راستوں پر کھڑے ہیں وہ لوگ۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ دو لڑکے ہماری جماعت کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ کچھ کہہ نہیں رہے۔ بس جدھر ہم جا رہے ہیں۔ پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں ادھر آتے تو نہیں دیکھا؟"

"نا____ اچھا میں جا رہا ہوں۔ انہیں اگر شک بھی ہو گیا کہ ایک آدمی کم ہے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"اچھا بھائی شکریہ۔"

وہ بولا۔ "بس تمہیں بتانا تھا کہ خطرہ ہے' کہیں تم نکل نہ پڑنا۔"

"مہربانی تمہاری۔"

"کوئی بات نہیں۔" لڑکا جاتے جاتے رکا اور اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "اندر چلے جاؤ' یہاں مت کھڑے رہو۔"

میں نے خود کو اس جانور کی طرح محسوس کیا جس کا کھیدا کیا جا رہا ہو۔ ہر طرف سے جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو۔

مگر نہیں' گھرے ہونے کے باوجود یہ دو بنگالی نوجوان میری مدد کر رہے ہیں۔ گھرے ہوئے جانور کی سی بے بسی نہیں ہے۔ میں نے مسجد کے اندرونی حصے میں جا کر دو رکعت نفل پڑھے۔ خود کو پرسکون رکھنے کے لیے کلام مجید لے کر بیٹھا۔ ایک رکوع پڑھا۔

دو گھنٹے سے زیادہ گزر گئے۔ میں نے ایک بار باہر جھانک کر جائزہ لیا۔ مجھے تو کچھ بھی غیر معمولی نظر نہ آیا۔ نظر بھی کیسے آتا؟ شکاری تو چھپ کر گھات لگائے ہوں گے۔ شکار کو کیوں دکھائی دیں گے۔

نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مسجد میں لوگ آنا شروع ہو جائیں

گے۔ میں نے سوچا اس وقت میرے لیے یہ جاننا بہت مشکل ہو گا کہ ان میں ”بنگلا دوست“ کے کھوجی کون ہیں اور عام نمازی کون؟

اچانک گھنٹی بجاتی ہوئی ایک رکشا مسجد کے سامنے آکر رکی۔ رکشا میں پردے لگے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا پھر اوٹ میں ہو گیا۔ بہت سے مسلمان خاندان اپنی عورتوں کو پردہ لگی رکشاؤں میں لے جاتے تھے۔ یہ بات مغربی پاکستان میں عجیب لگتی ہو گی۔ ادھر ایسٹ پاکستان میں یہ عام سا منظر تھا۔

مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ پردے دار عورت نے مسجد کے سامنے کیوں رکشا رکوائی۔ خطرے کا احساس ہوا پھر اسی وقت پردہ سرکا کر کسی نے سر باہر نکالا اور کہا۔ ”شش!“ میں پیچھے ہٹا۔ پردے سے جھانکنے والے چہرے نے اب کے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”ارے! سنو! ادھر۔“

”اوہ!“ یہ تو وہی تبلیغی پارٹی کا لڑکا تھا۔ اس کے اس طرح آنے اور ششکارنے پر میں ہلکے سے مسکرایا۔

وہ بولا۔ ”آجاؤ۔ ٹائم نہیں ہے۔“

خوب‘ یہاں سے نکلنے کا اچھا طریقہ سوچا ہے۔

رکشا والے نے گھبرا کر مجھے جلدی کرنے کو کہا وہ سامنے گلی میں دیکھے جارہا تھا اور پریشان تھا۔

میں مسجد سے نکلا اور پردہ اٹھا کر غڑاپ سے رکشا میں جا گھسا۔ لڑکے نے خود بھی پوری طرح چھپا ہوا بیٹھا تھا مجھے اشارے سے بتایا کہ میں کس طرح بیٹھوں جو پ جوتے‘ لباس کا کوئی بھی حصہ باہر سے دکھائی نہ دے۔

میرے بیٹھتے ہی رکشا چل پڑی تھی۔ رکشا والا بہت تیزی اور ہوشیاری سے ا رکشا مسجد سے دور لے گیا اور بازار کی بھیڑ میں شامل ہو کر گھنٹی بجا بجا کر اب مزے۔ چلنے لگا۔

لڑکے نے بھرے بازار سے گزرتے ہوئے کان کے پاس منہ لے جا کر مجھ کہا۔ ”میں ابھی اتر جاؤں گا اپنی جماعت کے ساتھ مجھے کچھ ٹائم رہنا پڑے گا۔ رکشا وا معلوم ہے تمہیں کہاں اتارنا ہے۔ وہ تمہیں حفاظت کی جگہ پہنچا کر چلا جائے گا۔ ادھر نہیں ہو گا اگر کوئی آئے اور پوچھے تو بتا دینا تبلیغی پارٹی کے ساتھ جانے کے لیے ہوں۔“ لڑکے نے رکشا والے کو اشارہ کیا اور ”اچھا چلتا ہوں۔“ کہہ کر تیزی سے

کا کر اتر گیا۔

رکشا والا مجھے نامعلوم بازاروں اور گنجان آباد علاقوں سے گھنٹی بجاتا لے چلا۔ شے کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی مگر مجھے خطرے سے بچ نکلنے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے خود تسلی دی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور کیا؟ جب اتنا بھروسا کیا ہے تو پھر کسی شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تبلیغی پارٹی کے لوگ واقعی ہمدرد ہیں انہوں نے بہت خطرہ مول لے کر مجھے طرے سے نکال لیا ہے۔

رکشا ایک لکڑی کے گودام میں جا رکی۔ سب طرف اوپر تلے عمارتی لکڑی چنی ئی تھی۔ رکشا والے نے کہا۔ ”اتر جاؤ۔“ میں اپنی تھیلی سنبھالے پردے سے نکل رکشے ے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ رکشے والے نے کہا۔ ”ادھر ہی کہیں بیٹھ جاؤ وہ لوگ آتے ہوں ے۔“

وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”کتنے پیسے ہوئے؟“

بولا۔ ”پیسا مل گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

ٹین کے شیڈ تلے ایک لمبی چوڑی بنچ پڑی تھی میں جا بیٹھا۔ اب جو ذرا عافیت س ہوئی تو بھوک لگنا شروع ہو گئی۔ میرے پاس کھانے کو وہی مٹھائی تھی۔ تھیلی سے نکالا تو وہ دونوں دوست اور ان کی مصیبت یاد آئی۔ میں نے خود سے کہا۔ ”شیر خان! دہ رہا تو ان کپڑے والوں کے نقصان کی تلافی کروں گا۔“

بنچ کے پاس گلاس سے ڈھکی صراحی رکھی تھی۔ مٹھائی کھا کر‘ پانی پی کر شکر کیا تھیلی سرہانے رکھ کر بنچ پر لمبا‘ لمبا لیٹ گیا۔ سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر نیند بہر حال ئی۔ کافی دیر سویا۔ آنکھ کھلی تو سنا کوئی آواز دے رہا تھا۔ بڈھا سا چوکیدار تھا پوچھ رہا تھا۔ ون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے بتا دیا کہ تبلیغی پارٹی کے ساتھ جانے کو آیا ہوں۔ کہنے لگا۔ ”اچھا‘ اچھا۔ ام کرو۔ ابھی بس نہیں آئی ہے۔ آئے گی تو بتا دوں گا۔ تم آرام کرو۔“

کوئی ایک گھنٹے بعد بس آگئی۔ میرے وہ دونوں محسن گودام میں آکر مجھ سے لے۔ پوچھنے لگے۔ ”کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے میں بچ گیا۔ ورنہ ”بنگلا دوست“ لے خدا معلوم میرا کیا حشر کرتے۔ تبلیغی پارٹی والے اپنے اپنے خرچ پر چٹاگانگ جا رہے

تھے۔ انہیں دو دن کاکسیز بازار ٹھہر کر آگے چلا جانا تھا۔ کہنے لگے کہ فکر مت کر،
تمہیں کاکسیز بازار چھوڑتے ہوئے نکل جائیں گے۔

کاکسیز بازار پہنچ کر مجھے پہلے وکیل صاحب کو دیکھنا تھا پھر اور سب آ
کارروائی کرنی تھی۔

چند گھنٹے کا یہ سفر اچھی طرح کٹا۔ وہ مجھے خرچ ہی نہیں کرنے دیتے تھے۔
نے بہر حال اصرار کر کے کاکسیز بازار تک کا اپنا کرایہ ادا کیا۔ ہم رات میں وہاں پ
میرے دونوں محسنوں نے کہا کہ رات میں کہاں ٹھکانا ڈھونڈو گے۔ صبح تک ہمارے
ہی میں ٹھہرو۔ دن نکلتے چلے جانا۔

صبح میں نے ان کے ساتھ ہی ناشتا کیا اور شکریہ ادا کرتا' دعائیں دیتا
سیدھا وکیل مزمل حسین کے گھر پہنچا۔

وکیل مزمل گھر کی بیٹھک ہی میں دفتر کرتے تھے۔ ایک لمبے چوڑے کم
میں چاروں طرف کتابوں سے بھری الماریاں لگی رہتی تھیں۔ ایک طرف بڑی میز
باقی بیٹھک میں بہت سے صوفے' کرسیاں' تپائیاں' ڈیسک پڑے ہوتے تھے۔ ان کا
دفتر مجھے اس طرح یاد تھا۔

میں صبح دس بجے وہاں پہنچا تو دیکھا گھر کے سامنے ہمیشہ کی طرح سایہ
وکیل صاحب کے منشی مسعود علی کی اسکوٹر کھڑی تھی جسے میں پہچانتا تھا۔ اسکوٹر کے
وہاں اب کوئی اور چیز پہچان میں نہیں آئی تھی۔ توڑ پھوڑ کے علاوہ مکان کی بیرونی دیو
دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ سب شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تمام کھڑکیاں اور بہت
دروازے تختے ٹھونک کر بند کر دیے گئے تھے۔ سامنے کا باغیچہ اجڑ چکا تھا۔ وہاں بس پو
کے خالی تختے' جلی ہوئی جھاڑیاں اور کٹے ہوئے درخت رہ گئے تھے۔ صدر درواز
پاس ایک چھوٹا سفید خیمہ لگا تھا۔

میں صدر دروازے کے سامنے پہنچا تو خیمے سے میلی' مسلی ہوئی وردی پہنے
پولیس والا برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ پوچھنے لگا کہ "کیا بات ہے"
سے ملنا ہے؟" میں نے وکیل صاحب کے منشی کا نام لیا۔ پوچھنے لگا۔ "کوئی کام ہے؟"
نے کہا۔ "ہاں دوست ہے وہ میرا۔" اس نے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے جاؤ۔

میں نے بیل بجائی تو مسعود علی نے تختہ جڑی کھڑکی سے جھانک کر
دیکھا کہ کون ہے پھر کچھ دیر بعد اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر ہاتھ کے اشارے

ہ بلا لیا۔ سپاہی اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس نے دیکھ نہیں لیا کہ مسعود علی مجھے
جا ہے۔

میرے اندر پہنچتے ہی منشی مسعود علی نے جھٹ دروازہ بند کیا اور بولٹ لگا دیا۔
ھے بازو تھام کر کھڑکیوں' دروازوں سے دور لے گیا اور کرسیاں کھینچ کر بٹھا دیا۔

اس نے مجھے بازو سے تھاما تو محسوس ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ ہلکے ہلکے لرز رہا ہے۔
دد جوان آدمی تھا۔ اتنا گھبرایا ہوا میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اندر آفس میں کوئی الماری نہیں تھی۔ دھوئیں سے کالی جلی ہوئی دیواریں رہ
ئیں۔ تڑخے ہوئے فرش پر گھر کے اندر سے لائی ہوئی کرسیاں میزیں لگی تھیں۔

میں نے دل میں کہا۔ "بنگلا دوست" والوں نے مکمل تباہی کی ہے۔ فرنیچر'
' قالین' الماریاں' کتابیں' کاغذات گویا وکالت اور کاکسیز بازار سٹی مسلم لیگ کا پورا
ڈ جلا دیا گیا ہے۔ ہفتے بھر بعد بھی بیٹھک میں دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔

مسعود منشی نے ادھر ادھر پریشانی سے دیکھا پھر بولا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہیں سے۔"

کہنے لگا۔ "میں نے سنا تھا تم شہر میں نہیں تھے۔"

"چلا گیا تھا۔ اب آ گیا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

حالات جانے بغیر میں کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے گھبرا کر پھر ادھر ادھر دیکھا۔ "سنا تھا تم ____ میں نے اور بھی کچھ سنا
م ٹھیک تو رہے نا؟"

گویا کاکسیز بازار میں میرے بارے میں کچھ خبریں گشت کر رہی ہیں۔

میں نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ وکیل صاحب کیسے ہیں؟"

وہ بولا۔ "اسپتال میں ہیں۔"

"اور ان کے گھر والے؟"

"کچھ چلے گئے' کچھ بڑی بیٹی کے ہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مطلب یہ کہ یہاں بس تمہی ہو؟"

"ہاں اور چوکیدار ہے دوسرے۔ سب لوگ مالی' کک' ڈرائیور وہ بھاگ گئے۔"

"تم روز آتے ہو؟" میں نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلایا بولا۔ "صبح آتا
یک بجے چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں وکیل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"
دھیرے سے بولا۔ "ملنے کے لیے اب وہاں کون ہے۔"
"میں دیکھنا چاہتا ہوں انہیں۔"
منشی گھبرا کے بولا۔ "نہیں، نہیں۔ وہاں مت جانا۔"
"کیوں؟"
"وہاں___" وہ سوچ کر کہنے لگا۔ "وہاں پولیس لگی ہے حفاظت کے لیے۔"
"ٹھیک ہے لگی رہے پولیس۔ میں تو بس دیکھ کر آ جاؤں گا۔"
"دیکھنا کیا ہے۔ میں بتا رہا ہوں نا بس ٹھیک ہی ہیں۔ ٹھوس غذا دینا شر
دی ہے۔"
"لوگوں کو پہچانتے ہیں؟"
"نہیں۔"
"اور باتیں؟ مطلب زبان سے کچھ بھی کہتے ہیں یا نہیں؟"
"باتیں کیسی۔" وہ ذرا الجھ کر بولا۔ "پڑے چھت کو تکتے رہتے ہیں۔"
میں نے پوچھا۔ "تم وہاں کب جاتے ہو؟"
کہنے لگا۔ "روز۔"
"میں بھی چلوں گا۔ آج کب جاؤ گے۔"
وہ کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آج نہیں جاؤں گا۔"
مجھے اس کی یہ بات بری لگی۔ وہ کیوں چاہتا ہے کہ میں نہ جاؤں؟ وہ کیو
ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا۔ "تم کیوں روک رہے ہو مجھے؟"
وہ بولا۔ "ڈاکٹر تمہیں اجازت نہیں دیں گے۔"
"کیوں نہیں دیں گے؟"
"صرف فیملی کو جانے دیتے ہیں۔ اسٹاف میں بس مجھے اجازت ملی ہے۔"
مجھے غصہ آ گیا۔ "مگر میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر حال میں د
ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"
کہنے لگا۔ "خان! ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہیں وکیل ص
خیریت فون پر بتاتا رہوں گا۔"
میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں وہیں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں ڈاکٹر یا پو

مجھے کس طرح روکتے ہیں۔ میں وکیل صاحب کے رشتے داروں سے ملوں گا۔ وہ پہچانتے ہیں مجھے۔"

مسعود علی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا اسکے چہرے پر تذبذب اور پریشانی صاف پڑھی جاتی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر آخر بولا۔ "گارڈ کے ساتھ ایک اے ایس آئی کی بھی ڈیوٹی ہے وہاں۔ اس سے میری سلام دعا ہے۔ میں فون کر کے دیکھتا ہوں اگر وہ ہوا تو تمہیں ابھی لے جاؤں گا۔ بیٹھو' جانا مت' میں ابھی آتا ہوں۔" اور وہ اٹھ کر اندر وکیل صاحب کے گھر میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد آیا تو اتنا پریشان تھا مگر مجھے اطمینان دلانے لگا کہ اے ایس آئی سے بات ہو گئی ہے۔ وہ کہتا ہے آ جاؤ۔ ملاقات کرا دوں گا۔"

وکیل صاحب کی بیٹھک کو تالا لگا کر وہ اپنے اسکوٹر پر روانہ ہوا۔ مجھے اس نے پیچھے بٹھا لیا تھا۔

مسعود علی برسوں سے اسکوٹر چلا رہا تھا لیکن آج صاف ستھری ٹریفک میں بھی جس طرح گھبرا' گھبرا کر اس نے اسکوٹر چلائی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی اناڑی چلا رہا ہے۔ میں نے سوچا وکیل صاحب پر ہونے والے حملے کا اثر ہوا ہے منشی پر۔ بکھر سا گیا ہے یہ شخص۔

وہ اسکوٹر چلاتے ہوئے مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ میں نے اپنے والد صاحب کو خط یا تار کچھ بھیجا ہے؟ میں نے بتایا وکیل صاحب کو دیکھ لوں تو تار بھیجوں گا یا ٹرنک کال کرنے کی کوشش کروں گا۔

باتوں میں اندازہ نہیں ہوا۔ منشی شاید کسی لمبے راستے سے لے جا رہا تھا ورنہ اسپتال تو اتنی دور نہیں تھا۔ منشی جس گنجان علاقے میں اسکوٹر لے آیا تھا ادھر آئے بغیر بھی جلد اسپتال پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ تو پھیر کا راستہ ہے۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ وہ غلط رستے پر لے آیا ہے تو بولا کہ ہاں' باتوں میں خیال نہیں رہا۔ کہنے لگا۔ "یہ سامنے والی گلی شارٹ کٹ ہے ادھر سے نکل جاتے ہیں۔" اور اس نے اسکوٹر ایسی گلی میں گھما دی جو آگے سے بند تھی۔ لاحول پڑھتا ہوا وہ اپنی اسکوٹر واپس موڑنے لگا تو اچانک اس کا انجن بند ہو گیا۔ عجیب آدمی ہے؟ دیر کر رہا۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

بولا۔ "پٹرول ختم ہو گیا۔ اترو۔ ٹھہرو' ریزرو لگا کر دیکھتا ہوں۔" اس نے مجھے اتار دیا کچھ ادھر ادھر ہاتھ ڈالتا رہا بولا۔ "کوشش کرتا ہوں۔" اور وہ اسکوٹر پر سوار ہو

گیا۔ اب کے ایک ہی کک میں انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ بیٹھنے کے لیے میں نے ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ منشی نے مجھے دھکا دیا اور اسکوٹر بھگاتا گلی سے نکل گیا۔

"یہ کیا؟ منشی مجھے یہاں پھنسانے لایا تھا؟"

میں نے گلی سے نکلنے کے لیے دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا مگر دیر ہو چکی تھی۔

گلی کے دونوں طرف کے مکانوں سے بنگالی لڑکے نکل نکل کر آگئے تھے۔ انہوں نے راستہ روک دیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پولیس والوں جیسے ڈنڈے' چاقو' ربر کے بھاری پائپ اور لاٹھیاں تھیں اور وہ پوری طرح گھیرا ڈال چکے تھے۔

مسعود کے اسکوٹر کی آواز دور ہو کر ختم ہو گئی۔ میں نے سوچا یہاں تو میں خود آکر پھنسا ہوں۔ منشی ٹال رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

لڑکے ہر طرف سے بڑھتے آرہے تھے۔

میں نے ایک دیوانہ وار کوشش میں ان کے گھیرے سے نکل جانا چاہا اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر آپڑے۔

کبھی اتنی مار نہیں پڑی تھی جتنی اس روز بند گلی میں گھیر کے ان لڑکوں نے لگائی۔ وہ مجھ پر ڈنڈے اور ربر کے بھاری پائپ برساتے رہے۔ غنیمت تھا کہ چاقو والے مجھ سے دور رہے۔ ویسے ان کے للکارنے کی آوازیں اور دھمکیاں برابر سنائی دیتی رہیں۔

لڑتے ہوئے میری پوری کوشش یہ تھی کہ ان میں سے کسی کی لاٹھی چھین لوں۔ لکڑی یا پائپ چھیننے میں کامیاب نہ ہو سکا بے کار کوشش کی۔ بس جواب میں کچھ لڑکوں پر گھونسے برسائے خود کو بچانے پر توجہ دیتا تو اتنی مار نہ پڑتی۔ اپنے پیروں پر زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ میں گر گیا۔ گرنے پر بھی وہ لکڑیاں اور پائپ برساتے رہے۔

حلقے کے باہر شاید کوئی ان لڑکوں کی کمان کر رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "بس کرو رے۔ مارنے کا نہیں ہے۔"

دو تین لڑکوں نے مجھے گریبان اور بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے گلی کے مکانوں میں سے ایک میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے جانوروں کے باڑے میں گھاس کے گٹھوں سے بنے ایک چبوترے پر مجھے ڈال دیا۔ وہ جیسا پھینک کر گئے تھے میں اسی طرح پڑا رہا۔ پوری طرح ہوش میں تو تھا مگر سر کی اور بدن کی چوٹوں سے بے حال تھا۔ ایک آنکھ پر ورم آنا شروع ہو گیا تھا۔ دونوں آنکھیں کھول کر زیادہ دیر کچھ دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

گھنٹا دو گھنٹا گھاس کے گٹھوں پر پڑا رہا پھر کچھ کرنے' ہلنے جلنے کے قابل ہوا۔ ایک جگہ سے سر کی کھال پھٹ گئی تھی۔ خون بہتا رہا پھر جم کر خود ہی رک گیا۔ قمیص کا کالر خون سے تر تھا۔ سر میں دو تین جگہ گومڑ بن گئے تھے۔ آنکھ سوج کر تقریباً بند ہو گئی تھی۔ انہوں نے پنڈلیوں پر چوٹیں لگائی تھیں تو چلنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر اور فرش پر پیر ٹکا ٹکا کر اطمینان کر لیا۔ ہڈی نہیں ٹوٹی تھی مگر میں اس کوشش میں پسینے پسینے ہو گیا۔ بازوؤں میں سے ایک پر لاٹھی کی چوٹ بھی بہت تکلیف دے رہی تھی۔ میں نے رومال نکال کر گردن میں جھولی سی ڈالی اور سہارے کے لیے اپنا بازو اس سلینگ میں ڈال لیا۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا تھا؟ اتنی تھکن تھی کہ جی کرتا تھا وہیں ننگے فرش پر لیٹ جاؤں۔ خیر' بہت مشکل سے اور آہستہ آہستہ گھاس کے گٹھوں پر چڑھا اور لیٹ گیا۔

یہ تازہ پریشانی میری اپنی لائی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا۔ میں اگر ذرا سمجھ سے کام لیتا۔ منشی کی باتوں پر اس کے رویے پر ذرا توجہ دیتا تو سب کچھ سمجھ میں آجاتا اور مصیبت میں اس طرح نہ کود پڑتا۔

منشی چاہتا تھا میں وہاں سے چلا جاؤں۔ اسپتال جانے کا بھی خیال چھوڑ دوں۔ ایک طرح سے میرے بھلے کی سوچ رہا تھا وہ۔ یقیناً اسپتال پر بھی مسلسل چوہدری کے ٹھگوں کا پہرہ ہو گا۔ منشی بہت ڈرا ہوا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ چوہدری کے گرگوں نے اسے پوری طرح قابو کر لیا ہے۔ کیا کرتا وہ۔ اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ جیسا جیسا وہ لوگ کہتے جائیں کرتا چلا جائے نہیں تو نتائج کا سامنا کرے۔

سیدھی سی بات ہے یعنی اب یہ بات سیدھی لگتی ہے کہ چوہدری اور اس کے بھتیجے بازلر کو یقین تھا کہ کارخانے کی قید سے بھاگ کر میں زیادہ دن غائب نہیں رہوں گا۔ لوٹ کر کاکسیز بازار ہی آؤں گا۔ میں نے گیسٹ ہاؤس میں ان کے مخبر کک سے بات کی تھی۔ کاکسیز بازار آکر ہی مجھے اپنے وکیل اور سرپرست مزمل حسین کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ جانتے تھے وکیل مزمل ہی میرا نقطہ آغاز ہوں گے پہلے میں ان کا حال دیکھوں گا۔ پولیس کو رپورٹ بعد میں کروں گا۔ اس لیے مجھے کسی اور جگہ تلاش کرنے میں انہوں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ بس وکیل صاحب کے گھر اور اسپتال پر اوجم کر بیٹھ گئے اور مجھے پکڑ لیا۔

رات ہو گئی تو ٹارچ اور کھانا لے کر دو لڑکے آگئے۔ دونوں کے ہاتھ میں کھلے

چاقو تھے۔ انہوں نے ٹارچ جلا کر مجھے دیکھا اشارے سے مجھے قریب بلایا اور کھانے کے
برتنوں پر روشنی ڈال کر سخت لہجے میں کہنے لگے۔ "کھاؤ۔ جولدی۔" میں سمجھ گیا تھا کہ
اگر میں نے دیر کی یا کسی طرح تامل کیا تو وہ کھانا واپس لے جائیں گے۔

میں نے بہت مشکل سے گھاس کے گٹھوں سے اتر کر کھانا زہر مار کیا۔ پانی پیا۔
وہ وقفے وقفے سے مجھ پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے رہے تھے۔ کھا چکا تو کچھ کہے بغیر برتن اٹھا
کر چل دیے۔

وہی دونوں رات میں کسی وقت آئے اور ایک دری اور چادر پھینک گئے۔ بخار
اور تکلیف میں خود کو آرام پہنچانے کے لیے میں گھاس پر دری بچھا کر اوڑھ لپیٹ کر سو گیا
مگر نیند بار بار اچٹتی رہی۔ آنکھ لگ جاتی پھر سر' بازو یا پنڈلیوں کی تکلیف سے آنکھ کھل
جاتی۔

تین دن اسی طرح گزرتے کہ دو تین لڑکے لاٹھی' چاقو سنبھالے آتے۔ کھانا
دے جاتے۔ رات میں وہ ٹارچ دکھا کر کھانا کھلاتے پھر مجھے اندھیرے میں چھوڑ
جاتے۔ میری ذاتی ضروریات کے لیے وہ مجھے رات میں کسی وقت لے جاتے تھے۔ ویسے
میں چاہے کتنا شور کروں سنتے ہی نہیں تھے۔

ایک بار میرے شور مچانے پر انہوں نے اپنی اکھڑی اکھڑی سی اردو میں بتادیا تھا
کہ پہلے یہاں ایک پاگل آدمی کو بند رکھا جاتا تھا۔ محلے والوں کو اس کے شور کی عادت
ہے۔ جتنی مرضی ہو۔ "بوکواس" کرو' کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں بہت اچھی بنگلا بولتا ہوں ان
لڑکوں نے مجھ سے بنگلا میں بات نہیں کی تھی۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اپنی کمزور انگریزی میں
ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے تھے۔ شاید مجھے بنگلا زبان کے لائق نہیں سمجھتے ہوں گے۔

تین دن اسی طرح گزر گئے۔

چوتھے دن' رات کے آخری پہر تین چار ہتھیار بند لڑکوں کے ساتھ ایک
ڈرائیور جیسا آدمی آیا۔ ان سب نے میرے احتجاج کے باوجود خوب سختی سے میرے ہاتھ
پاؤں باندھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر ڈھاٹا کس دیا اور بنڈل کی طرح مجھے اٹھا کر گلی میں
کھڑے ٹرک میں ڈال دیا اوپر سے دری اڑھا دی۔ میرا دم گھٹا جاتا تھا مگر سہنے' صبر کرنے
کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ٹرک پر دودھ کے بڑے بڑے برتن
لدے ہوئے ہیں اور وہ خالی نہیں ہیں۔ یہ دودھ سپلائی کرنے والے لوگ تھے جو نہ معلوم

کیوں میرے دشمنوں کی مدد کر رہے تھے۔

کچھ لڑکے ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک چل پڑا۔ بہت دیر چلتے رہنے کے بعد
آخر کار اذانوں کے ہوتے' ٹرک رکا اور کسی احاطے میں داخل ہو گیا۔ مجھے بنڈل کی طرح
بندھا ہوا لے جا کر انہوں نے عمارت میں کہیں ٹاٹ بچھے فرش پر ڈال دیا پھر میرے ہاتھ
پاؤں کھول دیے۔ منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ ذرا جان میں جان آئی۔ اس کھینچ تان سے
سر کی چوٹ پھر سے رسنے لگی تھی۔ ہاتھ پیروں کے زخم پھر سے دھڑکنے لگے تھے مگر ان
بدمعاشوں کے سامنے میں نے اپنی تکلیف ظاہر نہ ہونے دی۔ بے بسی میں پڑا سب کچھ
سہتا رہا۔

کسی نے لائٹ جلا دی تو میں نے دیکھا میں کسی گیراج کے فرش پر پڑا ہوں اور
مجھے لانے والے دائرہ سا بنائے کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد میرے ہوش بحال ہوئے۔ ایک نوکر ٹرے اٹھائے ہوئے
گیراج میں آیا۔ وہ مجھ سمیت' سب کے لیے چائے لایا تھا۔ چائے بہت گرم' بہت میٹھی
تھی۔

چائے پی کر' سب لڑکے گیراج سے نکل گئے۔ ٹاٹ کے فرش پر اکیلا میں بیٹھا
رہ گیا۔

مگر زیادہ دیر میں اکیلا نہ رہا۔ میں نے ہنسی کی آواز سنی پھر دیکھا کہ سلیپنگ گاؤن
پہنے چوہدری بازلر یعنی بھتیجا بزل الرحمٰن گیرج میں چلا آرہا ہے۔ وہ فلمی ولنوں کی طرح
خود اپنی کمینگی پر خوش ہوتا آرہا تھا۔ گیراج میں آکر اس نے ویلوں ہی کی طرح مجھے دیکھ
کر چچ چچ کر کے افسوس ظاہر کیا بولا۔ "نیچے بٹھار کھا ہے ان لوگوں نے تمہیں؟ بہت برا
کیا ہے۔ آؤ ادھر کرسی پر آجاؤ' آؤ۔"

میں غصہ کر کے' جھنجھلا کر اسے خوش ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔
"شکریہ" کہہ کر ٹاٹ سے اٹھا اور قریب ترین کرسی پر جا بیٹھا۔

بازلر دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سر سے پیر تک مجھے ایک دو بار دیکھ کر اس
نے مایوسی میں سر ہلایا بولا۔ "شیر خان! یار ہم نے سوچ لیا تھا ادھر کارخانے میں تمہیں
بہت آرام سے رکھیں گے۔ یاد ہو گا چاچا بھی یہی کہہ رہے تھے؟ پھر ہم نے تمہیں وہاں
بستر بھی دے دیا تھا' بہت اچھا کھانا کھلا رہے تھے۔ آگے چل کر جب ہماری تمہاری دوستی
پکی ہو جاتی تو اور اچھا کھانا دیتے مگر تمہارے اندر بالکل سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ وہاں سے

فرار ہو گئے اور اپنا نقصان کر لیا۔ اب دیکھو بھینسوں والوں نے کس طرح رکھا ہوا ہے تمہیں۔ کیا معلوم کیا بدتر بلائیں کھلاتے ہوں گے۔ سنا ہے بے وقت ہاتھ روم کو بھی نہیں جانے دیتے۔ بڑے سور ہیں۔ چچ چچ چچ۔"

میں نے اس کی طرف صرف دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

بھتیجا کہنے لگا۔ "ہم نے اور چچا نے سوچا تھا ہم تمہیں ادھر کارخانے میں سال بھر رکھیں گے پھر رہا کر دیں گے یا کوئی اور اچھا بندوبست کر دیں گے۔ کہیں شادی کرا دیں گے تمہاری بابا‘ مگر تم نے کو آپریشن نہیں کیا ہمارے ساتھ مجبوری ہے۔ تمہاری سزا اب یہ ہے کہ وہیں بھینسوں والوں کے پاس رہو۔ کسی نے بتایا ہو گا کہ بہت دن تک ایک پاگل بند رہا تھا وہاں۔ بے چارہ مر گیا۔ اب تمہاری باری ہے سال بھر تم وہاں رہو گے سمجھے؟ ایک سال وہاں گزار لو پھر تمہارا سوچیں گے ہم لوگ کہ کیا‘ کیا جائے۔"

میں نے خوب منہ پھاڑ کر جماہی لی اور مسکرانے لگا۔ بازلر کو طیش آ چلا تھا۔ اس نے بنگلا میں مجھے گالی دی اور اردو میں بولا۔ "ابھی تمہی کو نیند آتا ہے؟ ٹھیک ہے! سالا ادھر سو جاؤ۔" اور وہ تیزی سے گراج سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہی نوکر جو چائے لایا تھا آیا اور دو تین پھیروں میں گیراج کی سب کرسیاں بلکہ ٹاٹ کا ٹکڑا تک اٹھا لے گیا۔ بازلر میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آئی تھی۔ پہلے وہ چڑچڑاتا تھا تو پستول نکال لیتا تھا‘ گولی چلاتا تھا اب صرف کرسیاں ہٹوا رہا ہے۔ میں ننگے فرش ہی پر لیٹ گیا اور نیند پوری کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

نو ساڑھے نو بجے کے قریب بازلر اپنے چچا کے ساتھ آ گیا۔ مجھے کھرے فرش پر پڑا دیکھ کر سلیل چوہدری اپنے بھتیجے کی طرف ایک بار گھوما۔ شاید اس چھوٹی حرکت پر اسے خاموش ملامت کرتا تھا۔ بازلر نے فوراً نوکر کو آواز دی پھر خود بھی گیراج سے نکل گیا۔ وہ آیا تو نوکر سے دو کرسیاں اٹھوا کر لایا تھا۔ ایک وہ خود اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے انتظار کیا۔ جب چچا چوہدری بیٹھ گیا اس کے بعد ہی یہ سعادت مند بھتیجا اپنی لائی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔

سلیل چوہدری نے ایک دم بات شروع کر دی بولا۔ شیر خان! یہ تو ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ ہمارے کارخانے سے تمہیں نکال لے جانے والے کون لوگ ہیں۔ اتنا تو پہلے ہی معلوم تھا کہ جانوروں کے اسمگلر‘ بیوپاری وَیوپاری قصائی وصائی ہیں۔ اس پندرہ روز میں ہم انہیں اور اپنی ملازمہ اس عورت روپالی کو بھی گھیر لائیں گے۔ کپڑے والوں

سے پہلے ہی حساب چکتا کر لیا ہے اب تو دونوں بڑی معافیاں مانگ رہے ہیں۔ دکان ہی جل گئی ان کی۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "جی ہاں چوہدری صاحب تمہاری کیا بات ہے۔ دور تک تمہارے جال پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ہمارے کک کو اپنے گینگ میں تم نے کب بھرتی کر لیا تھا؟ کیا ہمارے اور نوکر بھی تم سے مخبری کی تنخواہ لیتے ہیں؟"

"بہت سے لوگ ہیں مگر سب پر رقم نہیں خرچنی پڑتی۔ کچھ ویسے ہی دوستی میں ہماری مدد کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں جیسے وکیل مزمل صاحب کا منشی مسعود علی۔"

وہ بولا۔ "ہاں جیسے مسعود علی۔ تم نے دیکھا؟ وہ ہمارا بنگالی بھائی نہیں ہے پھر بھی یہ بات جانتا ہے کہ وقت کا کیا تقاضا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب! مجھے بھی تو بتائیے کہ وقت کا تقاضا آخر کیا ہے۔ اس مار پیٹ سے اور بار بار قید میں ڈالتے رہنے سے تو آپ مجھ کچھ بھی نہ سمجھا پائیں گے۔"

وہ رسانیت سے کہنے لگا۔ "شیر علی! تمہیں کچھ نہیں سمجھانا۔ سمجھانا اصل میں تمہارے باپ کو ہے۔ تم وسیلہ ہو ان تک پہنچنے‘ انہیں قابو کرنے کا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ کب تک قابو آ جائیں گے؟"

وہ بولا۔ "جیسے ہی تم نے بارڈر پار کیا انہیں خبر پہنچا دی جائے گی۔"

"بارڈر؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ "مجھے کون سا بارڈر پار کرنا ہے؟"

سلیل چوہدری کہنے لگا۔ "ایسٹ پاکستان اور برما کے بیچ کی سرحد۔"

"اور یہ سرحد مجھے کون پار کرائے گا؟"

وہ بڑی مستعدی سے بولا۔ "ہم پار کرائیں گے یہ سرحد۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"کہا نا‘ صمد بنگش‘ تمہارا بابا قابو میں رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تم سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ تم ادھر رہے تو جھوٹی سچی کہانیاں سناتے پھرو گے جو ہمارے لیے اچھی بات نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ کہانیاں تو میں وہاں بھی سنا سکوں گا۔"

"نا! بالکل نہیں!" وہ پہلی بار ہنسا۔ "برما کی سرحدی پولیس تمہیں‘ تمہارے

آدمی میر باز اور تمہاری داشتہ بولاری کو پکڑ لے گی۔"

"میری داشتہ کون؟"

"ارے وہی تصویر والی جسے ہم نے تمہارے لیے چنا ہے۔

جسے اغوا کر کے تم برما لے جاؤ گے۔ بولاری نام ہے اس کا' تو تم تین بندوں کو غیر قانونی طور پر ایسٹ پاکستان کی سرحد سے برما میں داخل ہوتے ہوئے پولیس پکڑ لے گی۔ میر باز امیگریشن پولیس کے آدمیوں پر اپنے پستول سے فائر کر دے گا۔ جس سے ان کا انچارج افسر بال بال بچ جائے گا۔ وہ بے چارہ اپنی جان بچانے کو جواب میں فائر کرے گا تو میر باز زخمی ہو جائے گا اور بعد میں اسپتال میں دم توڑ دے گا۔ تم اور تمہاری داشتہ زندہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔"

اوہ! ان شیطان حرام خوروں نے یہ تک طے کر لیا ہے کہ کس کو کب اور کس طرح ٹھکانے لگانا ہے۔ بے چارہ میر باز۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس چوہدری نے ابھی تک خدا بخش رائیں کا نام نہیں لیا ہے۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "پھر؟"

"پھر برما کے امیگریشن قوانین کے حساب سے تم پر مقدمہ چلے گا اور کم سے کم بارہ مہینے کی سزا سنائی جائے گی۔ یہ ایک برس تم برما کی کسی سینٹرل جیل میں گزارو گے۔"

"اچھا اور وہ عورت جسے تم میری داشتہ بتا رہے ہو؟ کیا نام تھا اس کا؟"

"بولاری۔"

"ہاں۔ اس بولاری کا کیا ہو گا؟"

"وہ بہت تیز عورت ہے۔ ہفتے دو ہفتے میں ہنستی بولتی' کھاتی پیتی رشوت میں کچھ لوگوں کی خدمتیں کرتی وہ پھر ادھر آ جائے گی۔ یا ہو سکتا ہے انڈیا کے علاقے آسام کی طرف نکل جائے۔ اس کی فکر مت کرو تم۔"

"اچھا۔ سال بھر بعد برما والے مجھے چھوڑ دیں گے؟ یا نہیں چھوڑیں گے؟"

"چھوڑیں گے کیوں نہیں بالکل چھوڑیں گے۔"

"پھر میرا کیا ہو گا چوہدری صاحب! یہ بھی بتا دو۔"

"چوہدری بولا۔ "تمہیں ملک بدر کر دیں گے وہ۔ وہاں بھیج دیں گے جہاں تمہارا باپ ہو گا۔"

میں اس کمینے موٹے کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیل رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا

کہ اس کا تاریک سازشی دماغ کس طرح کام کر رہا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے غصے میں سوال کیا۔ "مگر کیوں ہو گا" "یہ سب کیوں ہو گا؟" وہ بولا تو اس کے لہجے میں ایک طرح کی نرمی تھی۔ "یہ کیوں والی بات نہیں بتاؤں گا۔"

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

اس نے "ہاں" میں سر ہلایا۔ "اتنا بتا سکتا ہوں کہ طے شدہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ہم بھاری رقمیں خرچ کر رہے ہیں۔ انتظامات پر بھی اور تحفے دینے کے لیے بھی۔"

"تحفہ نہیں رشوت۔" میں نے کہا۔ "رشوت کہو' تحفہ کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے۔"

"جو جی چاہے کہو۔ دونوں طرف کی امیگریشن والے بہت زیادہ رقم کھینچ رہے ہیں۔"

میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ "دونوں طرف کے کیوں؟ ادھر ایسٹ پاکستان سرحد پر جو لگے ہیں انہیں کیوں رقم کھلا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ اگر تم کسی طرح برما کی سرحدی پولیس کے شکنجے سے چھوٹ کر ایسٹ پاکستان کی سرحد کی طرف چل پڑے تو ایسٹ پاکستان سرحدی پولیس کے وہ لوگ جو ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں تمہیں گھسنے نہیں دیں گے۔ مجبور ہو کر تمہیں گولی تک مار دیں گے۔"

"کیوں؟ مطلب اپنے گھر واپس آنے والے کو وہ گولی کیوں ماریں گے؟"

"ظاہر ہے ہمیں خوش کرنے کو اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرنے کو کہ ایک غیر ملکی جاسوس پاکستان کی سرحد میں گھستے ہوئے مار دیا گیا۔"

میں واقعی مرعوب ہو چکا تھا۔ "واہ! خوب پلان بنایا ہے اور خریدے ہوئے لوگوں کی بہت لمبی لسٹ ہے۔"

سلسیل چوہدری اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔ "ہاں بہت لوگ ہیں ___ اچھا' چلتا ہوں۔ میں نے ڈریسر کو بلایا ہے۔ وہ آئے گا مرہم پٹی کر دے گا۔ بازلر کا کوئی پرانا جوڑا میرا نوکر لا دے گا وہ پہن لینا۔ یہ تو سب برباد ہو گیا ہے۔ کچھ دیر ریسٹ کر لو گے تو تمہیں ہی فائدہ ہو گا۔ آج ساری رات سمجھو تمہاری سفر میں گزرے گی۔

میں نے روکھے پن سے سوال کیا اور میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر سلیل
چوہدری! یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

وہ کہنے لگا۔ ”اس لیے کہ پڑھے لکھے لڑکے ہو سمجھ جاؤ گے کہ ہماری پانچ
اور ہمارے ہاتھ کتنے مضبوط ہیں اور تم مزاحمت نہیں کرو گے۔ تم نے جھنجٹ کیا۔ لڑے
بھڑے' ہاتھ پیر چلائے تو اپاہج بھی ہو سکتے ہو۔ مثلاً تمہارا یہ ہاتھ جو سیلنگ میں پڑا ہے
اسے شانے سے اکھاڑ کر ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکا دیا جائے تو بے حد' بے حساب تکلیف
ہو گی۔ تم شاید یہ برداشت بھی نہ کر پاؤ۔ پھر یہ بھی ہے کہ شانے پر سے سونڈ کی طرح
جھولتا ہوا بازو کچھ اچھا بھی نظر نہیں آئے گا۔ مطلب یہ کہ دیکھنے والے کو بھی تو الجھن ہو
گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دھمکا رہے ہو؟“

”نا' نا' دھمکانا اسے کہتے ہیں جب صرف زبان سے کہا جائے۔ کیا نہ جائے
یہاں تو یہ حال ہے۔ بازلر!“ اس نے اپنے بھتیجے کو اشارہ کیا اور اس حرام زادے نے بیٹھے
بیٹھے اپنی کرسی پر ہی سے اپنا سیدھا پیر چلایا جو میرے چوٹ کھائے ہوئے بازو پر لگا۔ میں
کرسی سے گرا۔ ابھی اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بازلر سر پر آ پہنچا اس نے ایسے ہاتھ
بڑھایا گویا سہارا دے کر مجھے اٹھانا چاہتا ہو۔ میں تکلیف میں تھا اس لیے سنپولیے کو اچھی
طرح جانتے ہوئے بھی سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بہت آسانی سے دونوں
ہاتھوں میں میرا بازو تھام لیا اور خبر نہیں کون سا داؤ مارا' مجھے لگا آسمان سے بجلی گری۔
اور میرا بازو مونڈھے کے پاس سے اتر کر جھول گیا۔

زبردست تکلیف' مسلسل اذیت میں میرا رونگٹا رونگٹا لرز گیا۔ میں نے چیخ
ماری اور برابر چیختا رہا۔ اس غیر انسانی تکلیف کو جو ظاہر ہے انسان کی برداشت سے زیادہ
تھی کوئی مضبوط جانور بھی سہہ نہ پاتا' ڈکرانے لگتا۔ چوہدری نے درست کہا تھا مونڈھے
کے پاس سے میرا بازو ہاتھی کی سونڈ کی طرح جھول رہا تھا۔ اس کی معمولی سی لرزش
میرے بدن میں تکلیف نہیں عذاب کی میخیں سی ٹھونکے دیتی تھی۔

چوہدری کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ جھکا اور میری چیخوں پر اپنی آواز
بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے ساتھ چپ چاپ چلو گے؟ گڑبڑ تو نہیں کرو گے؟“

میں نے ڈکراتے ہوئے وعدہ کیا۔ ”نہیں۔ کچھ نہیں کروں گا۔ خدا کے لیے۔“

چوہدری منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تم لوگ ہر بات میں خدا کو ڈال دیتے ہو' خیر 'اپنا

طریقہ ہے۔“ وہ بازلر کی طرف گھوما بولا۔ ”بس!“

بازلر اپنی گھڑی دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے گھڑی پر سے نظریں ہٹائے بنا ہاتھ
بڑھا کر میرا جھولتا ہوا بازو کھینچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرے شانے پر تھپکی دی۔
کڑک کی سی آواز ہوئی اور میرا بازو شانے کے جوڑ پر سیٹ ہو گیا۔ تکلیف جس طرح
اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح یک لخت ختم ہو گئی۔ بازلر نے گھڑی پر آنکھیں گڑائے
گڑائے کہا۔ ”چالیس سیکنڈ۔“

میں نے دل میں جیسے چیخ کر کہا۔ ”سور کی اولاد! کتے!“ اور بلند آواز میں ان
دونوں کا شکریہ ادا کیا۔

یہ اذیت پورے پون منٹ بھی نہیں دی گئی تھی اور میں' بنگش۔ کسی بازاری
لونڈے کی طرح دل ہی دل میں سہی گالیوں پر اتر آیا تھا افسوس۔

اس لیے دوسرے لمحے میں نے دل میں یہ لفظ دہرائے۔ ”بابا! میں شرمندہ
ہوں خیال میں بھی مجھے بدکلامی نہیں سوچنا تھی مگر میں یاد رکھوں گا۔ اس بھتیجے کو اور اس
چچے کو یاد رکھوں گا۔ ساری ذلت ان کے صحیح منافع کے ساتھ انہیں لوٹاؤں گا۔ اللہ نے
چاہا تو۔ ضرور۔“

میں پسینے پسینے ہو گیا تھا اور فرش پر پڑا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بزل الرحمن
نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس بار واقعی مجھے سہارا دینے کے لیے مگر میں نے نفرت سے اسے
گھورتے ہوئے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ بازلر خوشی میں چہکنے لگا۔ ”ہو ہو ہو' واہ۔“

چوہدری نے سرزنش کے انداز میں اسے دیکھا اور بازلر کی چہکار بند ہو گئی۔

سلیل چوہدری۔ ”اچھا۔“ کہتا اور سر ہلاتا ہوا مطمئن گیراج سے نکل گیا۔

بازلر اپنے چچا کے پیچھے پیچھے کچھ دور چلا پھر چپکے سے لوٹ آیا۔ میرے پاس
آکر راز داری سے کہنے لگا۔ ”یہ میں نے ایک پہلوان سے سیکھا تھا۔ استاد بدیع الزماں
لاہوری سے۔ سب انہیں استاد بدے مولا کہتے تھے۔ اسی بیاسی سال کے ہوں گے جب
مجھے پگڑی باندھ کے مٹھائی کھلا کے شاگردی میں لیا تھا انہوں نے۔“

میں نے دل میں استاد بدے مولا کی مغفرت کی دعا کی۔ انہوں نے ایک نادہند
بدمعاش کو اپنے داؤ پیچ سکھا کر فن کی مٹی پلید کی ہے۔ خدا انہیں معاف کرے اور دو چار
برس اپنے سینے میں ہی دبا کے رکھتے یہ فن۔ اپنے ساتھ ہی لے جاتے تو اچھا تھا۔

بدمعاش چچا' بھتیجے کے دفع ہونے کے تھوڑی دیر بعد نوکر کے ساتھ ڈریسر

کمپاؤنڈر آ گیا۔

نوکر ایک اسٹوو اور میرے لیے پہننے کے کپڑے لے کر آیا تھا۔ ڈریسر نے پانی کھولا کر سوڈا بائی کارب سے میرے زخم دھوئے۔ اسپرٹ لگائی' کوئی انجکشن دیا اور سر اور بازو کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹی کر دی۔ شیشی میں بام جیسا کچھ دے کر کہہ گیا کہ بازوؤں اور پنڈلیوں پر ملتے رہو آرام ملے گا۔

نوکر اسے چھوڑ کر سامان اٹھانے آیا تو ہاتھ کا کام روک کر مجھے دیکھنے لگا۔ بنگلا میں بولا۔ "صاف کپڑے پہن لو تو اپنے کپڑے مجھے دے دینا۔ میں دھو سکھا کے' جدھر سے پھٹ گئے ہیں سوئی سے سی کر لے آؤں گا۔ ابھی تمہارے لیے دلیا اور مچھلی کا شوربا بنایا ہے۔ کپڑے بدل کے وہ کھا لینا۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں چائے دوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "بھائی! تم میری اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟"

کہنے لگا۔ "مجھے تمہاری فکر نہیں ہے۔ چوہدری صاحب کا آرڈر ہے کہتے ہیں۔ اسے کھلاؤ پلاؤ فٹ کر دو۔ میں سوچتا ہوں تم بھی انسان ہو اگر صاف ستھرے کپڑے پہن کے' کچھ ٹھیک ٹھاک کھا پی کے آرام کر لو گے تو مجھے ثواب ملے گا۔"

میں نے کہا۔ "خدا تمہارا بھلا کرے۔ اچھے آدمی ہو۔"

وہ بولا۔ "نہیں۔ اچھا برا کچھ نہیں۔ اپنی ڈیوٹی دیتا ہوں۔ بس مالک کو خوش رکھتا ہوں۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "ویسے ہم سب کو اپنے اصل مالک کی فکر کرنی چاہیے۔ وہ خوش رہے تو ٹھیک ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے سر ہلاتا ہوا بولا۔ "ابھی تم مجھے وعظ مت سناؤ۔ مجھے پتا ہے کہ میں صحیح ہوں کسی کو مار پیٹ نہیں کرتا' ستاتا نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ پکڑے گا تو بھدر لوگ کو پکڑے گا۔ سلیل چوہدری کو' بازلر کو پکڑے گا۔ میں نے انہیں پہلے بول دیا تھا کہ دیکھو میں نماز پڑھتا ہوں' روزے رکھتا ہوں' رونڈی' کھسرے کے چکر میں نہیں ہوں۔ کسی مسلمان کو ماروں گا پیٹوں گا نہیں' شراب کے برتن کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور جو ادھر ادھر کی بے شرم عورتیں تم لوگ یہاں منگاتے ہو ان کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلاؤں گا۔ بھلے وہ پیاس سے ہی مر جائیں۔ ہاں' میں نے کہہ دیا ہے میں حرامی نہیں ہوں' دلال نہیں ہوں۔ یہ لوگ بولے ٹھیک ہے منظور ہے۔ تو بس' مجھے صحیح تنخواہ مل جاتی ہے۔ یہ میری مرضی کے خلاف کام نہیں لیتے۔ میں خوش ہوں۔ مالک لوگ بھی خوش

ہیں اور تم مجھے وعظ مت سناؤ' سمجھے؟" وہ مجھے غصے سے گھورتا ہوا سامان سمیٹ کر چلا گیا۔

میں نے دل میں کہا کیا آدمی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جو وہ آیا تو نہ غصے میں تھا نہ خوش تھا۔ وہ دو جوڑی نئی ہتھکڑیاں' کچھ تالے اور بھینس باندھنے کی لمبی سی زنجیر لے کر آیا تھا۔ ایک جوڑی ہتھکڑی اس نے میرے دونوں پیروں میں ڈال دی۔ دوسری جوڑی کا ایک حصہ میرے بائیں ہاتھ میں پہنا کر دوسرے حصے میں اس نے بھینس کی طولانی زنجیر مقفل کر دی۔ یہ زنجیر وہ گیراج کے دروازے سے گزار کر کہیں باہر لے گیا اور اسے نصب کر آیا۔ میں نے اس کے کہنے پر خوب کھینچ کر دیکھا زنجیر ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔

وہ قفل بھی بہت مضبوط امریکن لایا تھا۔ ایک اس نے گیراج کے دروازے کے لیے رکھا' دوسرا قفل اس نے گیراج میں پڑے ٹول بکس میں ڈال دیا۔ کہنے لگا۔ "اس میں نوک دار' دھار والی چیزیں ہیں اس لیے تالا ڈال رہا ہوں۔"

سلیل چوہدری نے مجھ سے کہا تھا۔ اسی رات میں کسی وقت روانگی ہو گی مگر دن گزرا' رات آئی' دوسرا دن بھی آ گیا نہ تو چوہدری نے اپنی منحوس شکل دکھائی نہ اس کے حرام خور بھتیجے نے۔

پانچ دن گزر گئے۔ نوکر وقت سے کھانا' پانی' چائے' پھل سب لاتا رہا۔

خوب آدمی تھا۔ کھاتے وقت وہ مجھے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ پلاسٹک کا چھوٹا ٹب لے آتا اس میں میرا ہاتھ منہ دھلاتا' تولیہ دیتا۔ کوشش کرتا کہ کھانا کھاتے ہوئے ہتھکڑیوں' زنجیروں کا شور کم سے کم ہو۔ خود چیزیں اٹھا اٹھا کر دیتا جاتا۔

ایک بار کہنے لگا۔ "میں نے سلیل چوہدری سے پوچھا ہے کہ میں اگر کھاتے ہوئے لڑکے کے دونوں ہاتھ کھول دیا کروں تو اسے زنجیر کی چھن چھن نہیں سننی پڑے گی۔ کھانا کھاتے وقت یہ شور اچھا نہیں لگتا۔"

عجیب بات تھی مگر میری ہمدردی میں تھی اس لیے میں کچھ نہ بولا۔

اگلی دفعہ آیا تو کہنے لگا۔ "چوہدری منع کرتا ہے بولتا ہے جیسا ہے ٹھیک ہے۔" پھر کہنے لگا۔ "وہ مالک ہے اگر وہ بولتا ہے ٹھیک ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ایسے ہی کام چلاؤ۔"

اس سے اگلے روز میں نے نوکر سے کہا۔ "مجھے کچھ پڑھنے کو لا دو۔"

وہ بولا۔ "میرے پاس دو تین کتابیں اولیاء اللہ کے حالات والی ہیں کیا وہ لا

دوں؟"

میں نے کہا۔ "وہ سب میں پڑھ چکا ہوں' اولیا اللہ کے سب حالات معلوم ہیں مجھے۔"

سوچ کر بولا۔ "ایک اخبار فروش ہے سروش دہلوی اس سے کہتا ہوں وہ پہلے دہلی میں رہتا تھا۔"

سروش دہلوی؟ خوب! میرے ذہن میں جیسے ایک روشنی سی جھلملانا شروع ہوئی۔ دہلی والا اخبار فروش یہاں کا اخبار ایسٹ پاکستان کرانیکل۔ اس کے ایڈیٹر میرے بابا کو جاننے والے میری لائن مل سکتی تھی۔

نوکر اس سروش دہلوی کا بتا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "دوست آدمی ہے اردو میں گانے بناتا ہے۔ وہی مجھے کبھی کتاب لا دیتا ہے۔ کبھی بنگلا کا اخبار بالکل فری دے دیتا ہے۔ تم کسی کتاب کا نام لو۔ میں اس سے معلوم کروں گا۔"

میں نے جلدی سے کہا "چوہدری کو یا بازلر کو مت بتانا۔ وہ کتاب کو منع کر دیں گے۔"

کہنے لگا۔ "مالک لوگ ہیں چھپانا بری بات ہے مگر خیر تم کہتے ہو تو نہیں بتاؤں گا۔ ہاں بھلا کتاب میں کیا ہے۔"

میں نے ایک منصوبے کی شکل اپنے ذہن میں بنتے دیکھی۔

میں نے نوکر سے کہا۔ "بنگلا پڑھنے میں مجھے مشکل ہوتی ہے۔ ایک پرزے پہ اردو کی دو تین اچھی کتابوں کے نام لکھ دوں گا۔ اخبار فروش کے پاس ہوں گی تو وہ دے دے گا۔ نہیں تو کسی سے لے آئے گا۔ میں پڑھوں گا۔ ثواب اسے اور تمہیں سب کو ملے گا۔ کیا خیال ہے نام لکھ دوں؟" بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے لکھ دو۔"

میں نے قلم کاغذ منگوا کر ایک پرزے پر جیسے فہرست لکھی جاتی ہے اس طرح اردو میں سروش دہلوی کے نام یہ لکھا کہ خدارا میری مدد کرو۔ مجھے فلاں گھر میں اس طرح قید میں رکھا گیا ہے خدا رسول کا واسطہ یہ پرچہ ایسٹ پاکستان کرانیکل کے ایڈیٹر کو پہنچا دو۔ پولیس سے یا کسی سے بھی ذکر مت کرنا۔

نوکر پرچہ دیکھ کر کہنے لگا۔ "یہ تو بہت لمبی لسٹ ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایک بار میں جتنی کتابیں آ جائیں اچھا ہے تم بار بار کے جانے

سے بچ جاؤ گے۔"

سلیل چوہدری کا نوکر پرچہ لے گیا۔ ایک دن ایک رات گزر گئے۔ اگلے روز میں نے سرسری طور سے پوچھا کہ اخبار فروش کی طرف گئے تھے؟ کہنے لگا کاموں سے فرصت ہی نہ مل سکی۔ آج جاؤں گا۔"

شام میں آیا تو بولا۔ "اخبار فروش کو تمہارا پرچہ مل گیا ہے۔"

میرے اس بنگالی ہمدرد نے یہ پہلی خوش خبری سنائی تھی۔ ہیجان میں آدھی رات تک جاگتا رہا۔ قدرت نے یہاں سے رہائی کی سبیل کر دی ہے۔ ایک دو روز میں اس دجال چوہدری سے نجات مل جائے گی۔ میں نے طے کر لیا کہ رہا ہوتے ہی بابا کو مفصل تار بھیج دوں گا۔ یہ جو بھی سازش ہے بابا کو اس سے جلد از جلد آگاہ ہو جانا چاہیے۔

شام میں ایک مرتبہ بازلر بھی دو منٹ کے لیے آیا۔ گیراج میں پڑے ٹول بکس سے اسے کچھ نکالنا تھا۔ جتنی دیر وہ گیراج میں رہا۔ میں دیوار کی طرف کروٹ لیے چادر میں منہ دیے پڑ رہا۔ وہ سمجھا ہو گا سو رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا وہ مجھ سے بات کرے میرا چہرہ بھی دیکھے نہیں چاہتا تھا میرے چہرے کا اطمینان دیکھ کر اسے ذرا بھی کسی قسم کا شک ہو۔

رات کو میں اپنے آپ میں مگن سو گیا۔

خدا معلوم آدھی رات گزرنے پہ یا تین چار بجے کے قریب گیراج میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ میں نے بنگالی نوکر کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا پھر اس نے کندھا پکڑ کے ہلایا۔ میں اٹھ بیٹھا۔

گیراج میں سلیل چوہدری' بازلر اور ان کے تین غنڈے میرے بستر کے گرد اس طرح کھڑے تھے جیسے تابوت لے جانے والے کھڑے ہوتے ہیں بالکل مستعد۔

نوکر مجھے اٹھتا دیکھ کر سر جھکا کے چلا گیا۔

ہماری کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

سلیل چوہدری کے ہاتھ میں وہ رقعہ تھا جو میں نے اخبار فروش کو لکھا تھا۔

چوہدری ناراض نہیں تھا۔ اس نے طنز بھی نہیں کیا۔ رقعہ میری طرف بڑھا دیا بولا۔ "شیر علی! میرا نوکر بہت سیدھا آدمی ہے۔ یہ وفادار بھی بہت ہے۔ اس لیے میں اسے دوسروں سے دگنی تنخواہ دیتا ہوں۔ بہت خیال رکھتا ہوں اس کا۔ آج سویرے جب میں دفتر کے لیے نکل رہا تھا اس نے مجھے اپنے کام سے بازار جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے

کہا۔ آؤ میں جا رہا ہوں۔ تمہیں بازار چھوڑتا نکل جاؤں گا۔ کہنے لگا ٹھیک ہے۔ پھر گاڑی میں یہ کہنے لگا مجھے صدر بازار میں اخبار والے کے پاس اتار دینا۔ میں نے سوچا دہلی والے سے اپنے لیے کوئی کتاب لینے جا رہا ہو گا۔ ایسے ہی پوچھ لیا کہ کیا اپنے لیے کتاب لینے جا رہے ہو؟ بولا اپنے لیے نہیں شیر علی کے لیے۔ اسے اردو کی کتاب چاہیے وہ بنگلا نہیں پڑھ سکتا۔ بس میں سمجھ گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے نوکر کو کوئی کام بتا کے پہلے ہی اتار دیا۔ اس سے تمہارا یہ رقعہ لے لیا اور کہہ دیا کہ کتاب میں لیتا آؤں گا۔"

میں اپنے جیلر کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔

سلسیل چوہدری اب ہلکے سے مسکرایا۔ کہنے لگا۔ "شیر علی! میرا نوکر سچا آدمی ہے۔ بہت بھولا بھی ہے۔ وہ تمہیں، مجھے سب کو سچا سمجھتا ہے مگر یہ دنیا عجیب طرح بنی ہے۔ تم نے اس سے جھوٹ بولا اور کام نہ نکال سکے پکڑے گئے۔ میں نے جھوٹ بولا اور کام نکال لیا۔" وہ کچھ دیر چپ رہا پھر کہنے لگا۔ "اچھا چلو' چلتے ہیں' جانے کا وقت آ گیا ہے۔"

میں بستر چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چوہدری کے آدمیوں نے اس سے چابیاں لے کر میری زنجیریں اور ہتھکڑیاں کھول دیں۔ چوہدری نے بازلر کو اشارہ کیا وہ میرے بالکل قریب آ کھڑا ہوا۔

چوہدری بولا۔ "شیر علی! ابھی تو یاد ہو گا کہ بازلر کس طرح کندھے کے پاس سے بازو اتار دیتا ہے؟"

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

بازلر نے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپک دیا کہنے لگا۔ "جواب دو' سر کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کی بات کا جواب دو اگر یاد نہیں ہو تو یاد دلا دوں۔ ہاں؟"

میں نے چوہدری سے کہا۔ "مجھے خوب یاد ہے چوہدری! اپنے اس بدمعاش بھتیجے سے کہو بک بک بند کرے۔"

بازلر نے غصے میں کوئی آواز نکالی ہو گی کہ چوہدری نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مجھ سے کہا۔ "یاد ہے تو ٹھیک ہے مگر یہ بزل الرحمٰن اسی طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہے گا۔ سمجھے؟ تم نے اخبار والے کو پرچا لکھا وہ تو میں معاف کرتا ہوں مگر اب تم نے میرے حکم کے خلاف پلک بھی جھپکی تو شیر علی! میں تمہارا وہ حال کرواؤں گا کہ یہ بازو اترنے والی تکلیف تو اس کے مقابلے میں کوئی تکلیف ہی نہیں تھی۔ آئی سمجھ میں؟"

چوہدری کی دھمکیاں خالی خولی دھمکیاں نہیں تھیں۔ میں واقعی ڈر گیا تھا۔

ان لوگوں نے مجھے بند گاڑی میں بٹھا کر میرے منہ پر ٹیپ لگائی اور پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ جیسا کہ وعدہ کیا تھا' چوہدری نے بازلر کو میرے برابر بٹھا دیا۔ وہ خود آگے ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا۔ تینوں مسلح غنڈے میرے دائیں بائیں جم گئے اور پچھلی رات کے گھپ اندھیرے اور سناٹے میں گاڑی روانہ ہو گئی۔

سات آٹھ دن پہلے چوہدری نے سرحد پار کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا آج اس پر عمل کیا جا رہا تھا۔

گاڑی چھ سات گھنٹے برابر چلتی رہی۔ دن نکل آیا تھا اور دھوپ میں تیزی آ چلی تھی۔ مجھے گرمی سے پریشانی ہو رہی تھی۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی جنگل ویرانے سے گزر رہی ہے۔ آخر کسی نالے کی تلپٹی میں گاڑی روک دی گئی۔ چوہدری نے بھتیجے کو آواز دی اور مجھے زنجیر اور ٹیپ کے ساتھ اتار لیا گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ یہ ان کا جانا پہچانا علاقہ ہو گا کیوں کہ چوہدری اور اس کے کارندے بہت اطمینان سے چل پھر رہے تھے۔ پکانے کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کھانا کھا کر' مجھے کھلا کر کچھ دیر ستانے کے بعد وہ پھر چل پڑے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم ایک بار اور رکے ہوں گے۔ کچھ کھانے پینے کو' پھر جو چلے تو دس گیارہ بجے رات کو جنگل میں رکے۔ بازلر نے اترنے سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ میرے پاؤں کی زنجیر اور منہ پر لگا ٹیپ درست ہے۔ اترنے سے پہلے اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ ہم سرحد پر آ گئے ہیں بہت احتیاط سے اترنا گڑبڑ کی تو چوٹ کھا جاؤ گے۔

لمبے سفر میں ویسے ہی بے حال ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔

انہوں نے گاڑی سے اتار کر مجھے جس طرح بٹھا دیا تھا۔ میں بیٹھا رہا۔ تینوں غنڈے اور بازلر مجھے چھوڑ کر گاڑی میں خاموشی سے جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے دروازے بند کر لیے تھے۔ پردے گرا دیے تھے۔ چوہدری میری زنجیر تھامے ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ سامنے کوئی نہیں آیا۔ کسی نے بنگلا زبان میں پکار کر پوچھا۔ "یہاں کون بیٹھا ہے رے؟ کون ہو تم لوگ؟"

چوہدری نے اونچی آواز میں کہا۔ "انسپکٹر موجمدار کا مہمان آیا ہے۔ ہم موجمدار

کا انتظار کر رہے ہیں۔"

جھاڑی میں سے وہی آدمی ہنسا بولا۔ "ادھر سبھی موجمدار کے مہمان ہیں۔ بھلا اپنا نام تو بتا۔"

"سلیل چوہدری کہنے لگا۔ "شیر علی نام ہے میرا۔ آج سولہا تاریخ کو مجھے ادھر آنا تھا۔"

جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی اور تین مسلح وردی پوش کارندوں کے ساتھ ایک کالا بھجنگ آدمی بنگالی کرتے اور چوخانے والی تہمد میں کاندھے سے ہلکی مشین گن لٹکائے نکلا اور ہماری طرف آیا۔ اس نے چوہدری کو پہچان لیا تھا۔ اس کا حال چال پوچھا۔ بولا۔

"کیا حال ہیں شیر علی صاحب! خیریت تو ہے؟"

وہ چوہدری کو شیر علی کہہ رہا تھا۔ کسی قسم کے اشارے طے کیے گئے ہوں گے جن کے مطابق باتیں کی جا رہی تھیں۔

چوہدری نے اپنی جیب سے ایک پیکٹ نکال کر تہمد والے کی طرف بڑھا دیا۔ کہنے لگا۔ "یہ موجمدار صاحب کی چیز لے آیا ہوں۔ گن لو۔"

تہمد والے نے پیکٹ جیب میں ڈال لیا۔ "بولا شیر علی بھائی کا اور موجمدار کا حساب دوستوں جیسا ہے۔ ہم کیا گنیں۔"

چوہدری ہنسا۔ میری زنجیر تہمد والے کے حوالے کر کے بولا۔ "اچھا تو اسے سنبھالو۔"

تہمد والے نے زنجیر اپنے ساتھ والے ایک وردی پوش کو پکڑا دی پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ "ارے اس کی شکل پہ ذرا لائٹ تو دکھانا رے۔"

ایک نے ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر ڈالی تہمد والا بولا۔ "ابھی چھوٹی عمر کا ہے مگر دیکھو تو کیسے کیسے کاموں میں پڑ گیا ہے سالا۔"

چوہدری نے ہاتھ بڑھایا مصافحہ کیا۔ تہمد والا ہنسا بولا۔ "تھینک یو بھئی۔ اچھا شیر علی صاحب! موجمدار کو ہم آپ کا سلام بول دیں گے۔ کوآپریشن کا شکریہ۔"

سلیل چوہدری نے کہا۔ "شکریہ تو ہم آپ لوگوں کا ادا کریں گے بھائی بڑی مہربانی۔"

وہ ہنستا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا اور ڈرائیور نے لائٹ جلائے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی پھر وہ لوگ گاڑی گھما کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ کچھ دیر انجن کی آواز سنائی دیتی

رہی پھر جنگل کی آوازوں کے سوا سناٹا چھا گیا۔

معلوم نہیں یہ کس طرف کے بارڈر والے تھے۔ ان کی بنگلا میری طرح بے داغ تھی۔ یہ لوگ مشرقی پاکستان بارڈر پولیس کے کارندے بھی ہو سکتے تھے۔ برمی سرحدی پولیس کے بھی۔ مجھے معلوم تھا اس طرف بارڈر کے اہل کار دونوں زبانیں روانی سے بولتے تھے۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ برمی ہیں یا بنگالی۔

وردی والوں میں سے ایک ٹارچ دکھا رہا تھا۔ ایک میری زنجیر تھامے مویشی کی طرح مجھے ہنکائے لیے جاتا تھا۔ تہمد والا اور تیسرا آدمی خاموشی سے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ ہم جنگل جھاڑی میں چلتے رہے۔ آخر سامنے ہلکی روشنی نظر آئی۔ تہمد والے نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کسی جنگلی پرندے کی آواز نکالی۔ دو تین بار اس نے ایسا کیا تو سامنے سے بھی ویسی ہی آواز سنائی دی تہمد والے نے برمی میں پکار کر کہا۔ "ہم آ رہے ہیں رے۔"

آواز آئی "آ جاؤ سر۔"

پانی بھرے نالے سے گزر کر ہم اونچی جگہ پر پہنچے تو میں نے دیکھا یہ کسی قسم کی چیک پوسٹ تھی ہمارے پہنچتے ہی کہیں جنریٹر چلا دیا گیا۔ بہت سی ٹیوب لائٹیں روشن ہو گئیں۔ میں نے دیکھا ٹیلے پر چار چھ بیرکیں بنی تھیں۔ درمیان میں ایک چبوترے پر جھنڈا لگانے کا پول تھا۔ چبوترے کے سامنے ایک بڑا سا کمرہ اور برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ستون پر بورڈ نصب تھا جس پر برمی زبان میں چیک پوسٹ کا نام اور نمبر لکھا تھا۔

میں برما پہنچ گیا تھا۔ یعنی سلیل چوہدری نے مجھے مشرقی پاکستان سے نکال دیا تھا۔

تہمد والا افسر ایک بیرک میں چلا گیا۔ تینوں ہتھیار بند سپاہی مجھے ایک لاک اپ کے سامنے لے گئے۔ لاک اپ پر باہر کہیں سے تیز روشنی پھینکی گئی۔ ایک وردی پوش نے میری تلاشی لی۔ میرے پاؤں کی زنجیر کھول کر منہ کا ٹیپ ہٹا کر اس نے مجھے اندر دھکا دے دیا پھر لاک اپ کا آہنی دروازہ بڑی آواز سے بند کر دیا گیا۔ قفل لگا دیا گیا۔

روشنی بھی بند کر دی گئی۔ سپاہیوں میں سے ایک نے سلاخوں کے پار سے روکھے پن سے کہا۔ "تجھے پانی پینا ہے تو ابھی بتا دے میں ڈیوٹی سے اتر رہا ہوں۔ پلا دوں گا۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا تو وہ فرش پر تھوکتا‘ جماہی لیتا چلا گیا۔

میں نے تیز روشنی میں دیکھ لیا تھا کہ لاک اپ میں لوہے کا ایک ہی پلنگ بچھا ہے پلنگ پر دری بچھی تھی۔ ایک کمبل تہہ کر کے تکیے کی جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ پائینتی کی طرف ایک میلی سی چادر پڑی تھی۔ پلنگ کے سوا لاک اپ میں کچھ نہیں تھا۔

تھکن اور نیند سے لڑکھڑاتا میں بستر پر جا بیٹھا اور جوتے موزے اتار کر لیٹ گیا۔

یہ میرا قید خانہ تھا۔ میں اب تک چوہدری کے اور اس کے بدمعاشوں کے با ضابطہ قید میں رہا تھا۔ اب یہ لاک اپ ملی ہے غنیمت ہے اس پر کسی حکومت کا نام تو لکھا ہے۔

ہیجان سے نڈھال اور تھکے ہوئے میرے ذہن نے اگلے پچھلے مصائب پر سوچنے سے انکار کر دیا۔ میں نے خود سے کہا۔ ”شیر علی خان۔ نیند بہت ضروری ہے سو جاؤ‘ آگے جو ہو گی دیکھی جائے گی۔“

میں چار پانچ گھنٹے سے زیادہ سویا ہوں گا کہ کسی ان ہونی بات سے بیدار ہو گیا کوئی مجھے پلنگ سے گرائے دیتا تھا۔ میں نے گھبرا کر پلنگ کی پٹی تھامی اور اسے جو اپنے بدن سے ٹھیل کر مجھے گرا دینا چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر اور زور لگاتے ہوئے خود سے دور کرنے کی کوشش کی۔

میں ابھی نیند میں تھا۔ جھنجھلایا ہوا تھا۔ جھنجلاہٹ اور نیند کے خمار میں مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ کچھ نرم اور گرم سا اور یوں لگا کہ وہ دوسرا جو بھی ہے وہ نیند میں نہیں ہے۔ مجھ سے دور ہٹنے کے بجائے اس دوسرے نے ہاتھ بڑھا کر خود کو مجھ سے اور بھڑا لیا۔ اس طرح میں گرتے گرتے سنبھل گیا تھا۔

مگر وہ جو کوئی بھی تھا جس نے مجھ سے خود کو بھڑا رکھا تھا بہت عجیب سا تھا‘ نیا اور عجیب سا‘ اور وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے ادھ کچی نیند میں اسے ہنستے سنا اور میرے نیند بھرے دماغ نے جیسے چیک کر‘ ہاتھ پیروں کو حکم دیا۔ ”اٹھ جاؤ۔“

میں چونک پڑا اور اسے جو مجھ سے بھڑا ہوا تھا جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لاک اپ میں بتی نہیں تھی مگر برآمدے سے آتی روشنی میں وہ جگہ اتنی ضرور اجل گئی تھی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔

میں نے دیکھا وہ جو پلنگ پر تھا جو ہنس رہا تھا مرد نہیں کوئی لڑکی ہے لڑکی بھی کیا۔ اچھی خاصی کھائی پی عورت۔ اب وہ تقریباً پورے پلنگ پر قبضہ کیے لیٹی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔

میں نے گھبرا کر پلنگ سے اتر جانا چاہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک لیا۔

”ٹھہرو۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ”بولاری۔“

”بولاری؟ بولاری کون؟“

وہ ہنسی۔ ”تجھے یاد نہیں؟ میرے ساتھ کیسی کیسی تصویریں اتروائی تھیں۔ بے شرم! اور اب پوچھتا ہے بولاری کون؟“

خدایا! یہ کون عورت گھس آئی ہے؟ وہ لوگ لاک اپ میں بھی مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا بلا ہے یہ؟

مگر ہاں بولاری! اچھا یہ وہ عورت ہے جسے سلیل چوہدری نے میرے ساتھ فرار ہونے اور برما میں داخل ہونے والی کا پارٹ دیا ہے۔ چوہدری کے شیطانی منصوبے میں یہ میری ”داشتہ“ کا رول کر رہی ہے۔ میں زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہٹو! جاؤ نکلو یہاں سے۔ چلو۔“

جواب میں وہ پھر ہنسی۔ بولی۔ ”شیر علی! دونوں کو لڑنا نہیں چاہیے تو مجھے یہاں سے کیوں نکال رہا ہے؟ یہاں میں اپنی مرضی سے تو آئی نہیں۔ ان لوگوں نے ہم دونوں کو بارڈر پار کرتے پکڑا اور بند کر دیا۔ تیرے جاؤ جاؤ کہنے سے میں باہر تو نہیں جا سکتی۔ ناں۔ بالکل بھی نہیں۔“

یہ عورت کہتی ہے دونوں کو بارڈر پار کرتے پکڑا ہے۔ ظاہر ہے اپنے مالکوں کا بتایا ہوا مکالمہ دہرا رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ”سن۔ نہ میں نے بارڈر پار کیا ہے نہ تو نے۔ مجھے پکڑ کر لایا گیا ہے اور تو پیسے لے کر ناٹک کرنے آئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو پلنگ سے اتر جا۔ نہیں تو بہت بری ہو گی تیرے ساتھ۔“

وہ ہنسی پھر ایک آنکھ دبا کر کہنے لگی۔ ”سونے کیوں نہیں دیتا مجھے؟ سونے دے نا۔ تو بھی سو لے‘ بہت تھک گیا ہو گا۔“

جی چاہا منہ پر چانٹا رسید کر دوں مگر مجھے سکھایا گیا تھا کہ عورت پر ہاتھ نہ
اٹھایا جاتا۔ میں نے بہت غصے میں کہا۔ "اگر تو بستر سے نہیں اتری تو اٹھا کے پھینک دوں
تجھے۔"

وہ پھر بازاری انداز میں آنکھ دبا کر بولی۔ "اٹھا لے آ مجھے اٹھا کے دیکھ۔ اتنی
نہیں ہوں۔ آ کوشش کر لے۔"

یہ مجھے کس پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ پہلے سوچا اس تہد والے افسر موجدار
آواز دے کر کہوں کہ اس عورت کو یہاں سے نکالے مگر پھر خیال ہوا وہی لوگ تو ا
یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ یہ خود سے تو آئی نہیں ہو گی۔

میں نے جھنجھلاہٹ میں ہاتھ بڑھا کر عورت کا بازو پکڑا اور جھٹکے سے کھ
میں اسے پلنگ سے گرا دینا چاہتا تھا مگر وہ بھاری تھی پھر خود بھی زور لگا رہی تھی۔ ا
تھوڑا سا ہی کھینچ پایا۔ اتار نہیں سکا۔ عورت ایسے ہنسی جیسے ہم دونوں کوئی کھیل کھیل ر
ہوں۔ اس نے جھٹکا دے کر الٹا مجھے بستر پر کھینچ لینا چاہا۔ میں نے پٹی پر پیر اڑا لیا۔ عج
طرح کی کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے وہ عورت بولاری قہقہے مارے خو
ہنسی ٹھٹھول کرتی رہی۔

لاک اپ کے باہر اندھیرے میں کسی نے برمی میں پکار کر کہا۔ "ارے آ
سے۔ ارے آرام سے۔ ادھر مستی کیوں کر رہے ہو؟ یہ کوئی بد معاشی کا اڈا نہیں
لاک اپ ہے۔"

میں نے بھی غصے میں بری زبان میں کہا۔ "اس سے بڑا بد معاشی کا اڈا اور کیا
ہو گا۔ اس رنڈی کو میرے ساتھ کیوں بند کر دیا ہے؟"

پکارنے والے نے مزے سے کہا۔ "یہ تو پہلے سوچا ہوتا۔ اسے میں تو لے
نہیں بھاگا ہوں۔ تو ہی لایا ہے۔ رنڈی منڈی جو بھی ہے تیرے ہی پسند کی ہے۔
رے؟ اب شور نہیں کر۔ جیسا بھی ہے، جو بھی ہے ادھر آرام سے رہو دونوں۔"

میں نے غصے میں اسے گدھا کہہ دیا۔ وہ کوئی ڈھیٹ آدمی تھا بولا۔ "گدھا تو
رے۔ اپنے سے بڑی عورت کو دوڑائے لیے پھرتا ہے۔ ارے ادھر ایسٹ پاکستان میں
عمر کی کامنی ناریوں کی کمی ہے کیا جو تو یہ پکا ناریل توڑ لایا ہے۔"

عورت ٹھٹھا مار کے ہنسی اپنی کچی پکی برمی میں پکار کر اس نے اپنی تعر
کرتے ہوئے کوئی فضول سی بے ہودہ بات کہی جو اس کی جسمانی صلاحیتوں کے با

میں تھی۔

جواب میں لاک اپ کے سپاہی نے قہقہہ مارا اور اس بات کو اور زیادہ کھلے پن
سے آگے بڑھا کر کہہ دیا۔ عورت گالی دے کر ہنسنے لگی۔ عورت مرد کو اتنی کھلی ڈلی باتیں
کرتے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

دونوں کو اس طرح کی نامعقول باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں پلنگ پر نہیں بیٹھ
سکتا تھا۔ میں نے غصے میں چادر اور کمبل کھینچ لیا اور لاک اپ کے کونے میں کمبل، فرش پر
ڈال کر اپنے لیے بستر سا بنا لیا۔

ادھر میں بازو کا تکیہ بنا کر فرش پر لیٹا ادھر وہ پلنگ سے اتر کر آئی اور میرے
برابر کمبل پر پھیل کر لیٹ گئی۔ میں نے غصے میں ہاتھ چلا دیا جو اس نے بہت مہارت سے
اپنے کھلے پنجے پر روکا پھر آواز دبا کر بالکل میرے کان کے پاس منہ لے جا کر وہ بولی۔

"مار پیٹ نہیں کر ___ تیرے فائدے کی بات بتاؤں گی۔ میں یہی چاہتی تھی
ادھر لاک اپ کے کونے میں ہم لوگ ٹھیک ہیں۔ ادھر اسی لیے تجھے ستا رہی تھی۔ وہ
پلنگ تو پورا باہر سے نظر آتا ہے۔ فرش پر ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ بات کر سکتے ہیں۔ ابھی
تو ایسا کر جھنجٹ اور غصے کی آواز نکالتا رہ وہ سمجھے گا میں تیرے کو ستا رہی ہوں۔ شروع
شروع میں ایسا ہی شور کرنا۔ پیچھے راضی باضی بات کرنے لگنا۔ وہ سمجھے گا دوستی ہو گئی۔
یاری دلداری ہو گئی ہے۔ شک نہیں کرے گا وہ۔ ان سوروں کو ایسی باتوں میں مزا آتا
ہے۔ سن لے فائدے کی بات ہے۔ تو سمجھ گیا خان؟ سمجھ گیا نا؟"

عورت نے یہ باتیں بڑی سنجیدگی سے کہی تھیں۔ میں نے ہاں میں سر ہلا کر
اسے بتا دیا کہ اس کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔

وہ اس طرح لیٹ گئی تھی جیسے میری اور اس کی برسوں کی یاریاں دوستیاں ہیں۔
اس نے بازو پھیلا کر میری گردن گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ وہ کوئی تیز گرم خوشبو
لگائے ہوئے تھی۔ میرا جی الٹنے لگا۔ ویسے بھی میں ان سب باتوں کا عادی نہیں تھا۔ میں
نے آہستہ سے اس کا بازو ہٹا دیا۔ سرک کر ایک طرف ہو گیا۔

وہ ہنسی، دھیرے سے کہنے لگی۔ "تو میرا کوئی نہیں لگتا۔ سلیل چوہدری نے تو
مال خرچ کیا ہے؟ تجھے پھنسانے کے لیے میں نے اس سے ہزاروں ہزار لیے ہیں۔ ایک
حساب سے وہ میرا باس ہے تو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی خبر نہیں کیوں مجھے تیرے سے پیار
ہمدردی ہو گئی ہے۔ جب ادھر تھی پوربو پاکستان میں تو چوہدری کے آدمی برابر نظر رکھتے

تھے کہ کہیں میں ان کے خلاف تیری کوئی مدد نہ کر دوں۔ وہ سارے سور میری طبیعت جانتے ہیں۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا تیرے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گی۔ وہ حرام خور تیرے ساتھ جو کر رہے ہیں اچھا نہیں کر رہے۔"

اب جو وہ اتنے قریب سے بات کر رہی تھی۔ بالکل میرے چہرے کے سامنے سانس لے رہی تھی تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ نشہ کیے ہوئے ہے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ خواہ مخواہ میں اس نشے باز عورت کی باتوں میں آ گیا۔ یقیناً یہ فضول بکواس کرے گی۔

میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ وہ سمجھی میں اس کی ہدایات کے مطابق ڈیوٹی والے سپاہی کو سنانے کے لیے "جھنجٹ" کر رہا ہوں مگر جب میں نے شراب کی بو سے بچنے کے لیے ناک پر ہاتھ رکھا اور اس سے دور ہو گیا تو ہلکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "میرا قصور نہیں ہے وہ موجمدار کتا مجھے لے گیا تھا۔ اب خود بھی پی کے پڑا ہے۔ میں کیا کرتی۔ ان سب کا جی خوش کرنا ہے۔ سلیل چوہدری سے پیسے لیے ہیں لیکن خان! میں پوری ہوش میں ہوں۔ بے کار بکواس نہیں کر رہی۔ سن مجھے جو اندر کی باتیں معلوم ہیں۔ میں چاہتی ہوں تجھے بھی معلوم ہو جائیں۔ تو کچھ نہ کچھ بندوبست کر لے گا۔ یہ میں چاہتی ہوں۔ سمجھا کہیں بے خبری میں اندھیرے میں نہیں مارا جائے گا تو۔"

اس عورت بولاری نے اپنی بانہہ کا حلقہ تنگ کر دیا۔ میرے چہرے سے اپنا چہرہ بھڑا دیا۔ موجمدار سمجھا ہو گا "یاری دلداری" چل رہی ہے۔ ہنس کر لڑکھڑائی زبان سے بولا۔ "چل ری چل بس آ جا۔"

بولاری نے چہرہ گھما کر باہر دیکھا میں نے سکون کا سانس لیا۔ شراب کی بو سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اب اس نے زیادہ ہی نشے والی آواز بنا کر کہا۔ "جا جا۔ تیرے سے بات نہیں کرتی۔ جا اپنی بوتل بغل میں لے کے سو جا۔ اور تو تیرا کوئی کام ہی نہیں۔"

موجمدار لڑنا نہیں چاہتا تھا بولا۔ "چل بکواس نہیں کر۔ اٹھ۔ آ جا بس۔ میں کہہ رہا ہوں۔"

بولاری نے حقارت سے اس کے الفاظ دہرائے۔ "میں کہہ راؤں ____ بہ کہنے جو گا ہی ہے تو ____ زبان ہی چلتی ہے تیری۔ موجم دار ____ ہاہا سالا جبان دار' بہ جبان ____ زبان کا ہی رستم ہے ____ باقی 'ترت تو توں ____" بولاری نے منہ پر ہتھ رکھ کر ہاتھی کی چنگھاڑ جیسی آواز نکالی تھی۔

میں نے خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ موجمدار طیش میں آ کر پیچھے جھپٹ کر گیا تھا

[سنگ]ین چڑھی رائفل اٹھا لایا تھا۔ اس کے پیچھے وہ گارڈ "صاحب صاحب" کرتا آ گیا تھا۔ [ش]اید اسی کے ہاتھ سے موجمدار نے رائفل چھینی ہو گی۔

گارڈ نے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے اپنے افسر کے ہاتھ سے رائفل لے [لی] اور اس کے شانوں کو بازو کے گھیرے میں لے کر اسے مشکل سے چلاتا ہوا بلکہ گھسیٹتا [ہو]ا لاک اپ کے سامنے سے ہٹا لے گیا۔ گارڈ اور اس کا افسر دونوں برمی زبان میں عورت [کو] گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے ہٹے تھے۔

موجمدار کے جانے پر میں نے یوں محسوس کیا جیسے سامنے سے موت ٹل گئی ہے۔ میں نے عورت سے دھیرے سے کہا۔ "کیوں اپنی موت بلا رہی ہے خواہ مخواہ۔"

وہ ہنسی کہنے لگی۔ "تو ان سالوں کو نہیں سمجھتا۔ یہ سب اگر نہیں کرتی تو وہ شک [میں] پڑ جاتا کہ میں ضرور تجھ کو کچھ بول رہی ہوں۔ مجھے خبر ہے' چوہدری نے اس سالے [کو] اچھی طرح بھر دیا ہو گا۔ کھوپڑی گرم نہیں کرتی تو سوچ میں پڑ جاتا۔ موجمدار لے جاتا [مج]ھے۔ اب گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ٹل گیا ہے سالا پونا ____ چل چھوڑ ____ میری بات [س]نا ____ تیرے کو پتا ہوئے گا۔ یہ چوہدری ایسا کچھ کر رہا ہے کہ تیرا باپ فرنٹیر سے [آ] کے ادھر تیرے کو تلاش کرنے میں لگ جائے۔"

"ہاں یہ مجھے پتا ہے۔"

"چوہدری یہ بہانہ کرے گا جیسے وہ تیرے باپ کی مدد کر رہا ہے۔ تو نے [چو]ہدری سے ڈیڑھ لاکھ روپیا لے کے کھا لیا ہے نا؟"

میں نے گھبرا کر رہا۔ "نہیں نہیں ____ جھوٹ ہے یہ۔"

عورت بولی۔ "وہ تو خبر ہے مجھے کہ جھوٹ ہے پر تیرے بابا کو تو نہیں معلوم۔ [چو]ہدری اسکو بولے گا ڈیڑھ لاکھ کو چھوڑو۔ میں تو وہ بھول گیا۔ تم بھی بھول جاؤ۔ آؤ بیٹے [کو] چھڑا کے لاتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر برما' آسام' پوربو پاکستان میں اسے جگہ جگہ لیے [پھ]رے گا ایسا دکھائے گا جیسے تیرے چھڑانے میں بہت پیسہ بھی خرچ کر رہا ہے۔ احسان [رک]ھے گا تیرے باپ پر۔ چھڑانا کس نے ہے۔ ادھر تو اس نے بندوبست کیا ہے تجھے سال [تک] جیل میں رکھنے کا۔ بس اسے تیرے باپ پہ احسان جتانا ہے۔ جب وہ بے چارہ [ک]ی طرح لپٹ جائے گا اس جال میں تو چوہدری کہے گا۔ خان صاحب! میری اس [خد]مت کے بدلے میں ذرا سی آسانی کر دو میرے لیے کہ یہ ہوٹل ریسٹ ہاؤس جو بھی [ہ]ے تم اپنے ہی نام رہنے دو۔"

میں نے کہا۔ "اوہ! یہ تو حرام زدگی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں نا۔ چوہدری سالا خان صاحب کو بولے گا میں نے سرکاری سروس میں الٹے سیدھے طریقے سے کمائی کر کے پیسا جوڑا ہے اگر سامنے آ کے بزنس کروں گا تو سرکار انکوائری بٹھا دے گی پکڑا جاؤں گا۔ اسی لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ تیرا باپ بولے گا یہ کون بڑی بات ہے اور وہ چوہدری کے جال میں پھنس جائے گا۔"

میں اندھیرے میں اس کی چمک دار آنکھوں اور چمک دار باتوں پر دھیان دیے بیٹھا تھا۔ اس نے پھر دوستوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کہنے لگی۔ "ابھی اگر جاسوسی اڈے کا پول کھل جاتا ہے تو سلیل چوہدری خاموشی سے کھسک جائے گا۔ کلکتے بھاگ جائے گا۔ گورنمنٹ تیرے باپ کو دھر لے گی۔ وہ جدھر بھی ہوئے گا۔ فرنٹیر میں' پنجاب میں' ادھر پوربو پاکستان میں جدھر بھی اور جو کچھ نہیں ہوا تو ویسے کو شک شبہ بھی نہیں ہوئے گا۔ بھلا کون شک کرے گا کہ ایک پٹھان بھائی جس نے ع[مر] بھر ایمان داری سے افسری کی ہے ادھر انڈیا کا جاسوسی کا اڈا بنا کے بیٹھ سکتا ہے۔ اسی لیے چوہدری نے یہ جال ڈالا ہے کہ اس کا کام بے دھڑک چلتا رہے۔"

"اور میں؟ میرا کیا سوچا ہے ان لوگوں نے؟"

وہ بولی۔ "بتایا نا تو جیل کاٹے گا۔ سال بھر ادھر ہی برما میں رہے گا۔"

"سال بھر بعد تو چھوڑیں گے یہ لوگ۔ پھر چوہدری کیسے بچے گا؟"

"چوہدری سوچتا ہے سال بھر بعد کی خیر ہے جب تک کچھ بھی ہو جائے گا۔"

"مطلب؟"

"مطلب ___ جاسوسی کا اڈا وہ لوگ نے اپنے دل بہلانے کو تو نہیں کھولا سال بھر میں وہ ادھر پوربو پاکستان میں کچھ کر دیں گے۔"

"کیا کر دیں گے؟"

"کچھ بھی ___ کوئی گڑبڑ ___ حملہ ___ میرے کو کیا خبر۔"

"میں نہیں مانتا۔"

"تو کیا نہیں مانتا؟"

"اتنی ہمت نہیں ہے ان میں۔"

بولاری کہنے لگی۔ "ہاں' نہیں ہو گی پر ہمت آتے دیر کتنی لگتی ہے؟"

"اور میں یہ بھی نہیں مانتا کہ میرے بابا اتنی آسانی سے چوہدری کے جال[میں]

پھنستے جائیں گے۔"

"آسانی سے کیسے۔ نہیں رے' بہت تکلیف' بہت پریشانی اٹھا کے ہی تیرا باپ چوہدری کو اپنا ہمدرد' اپنا دوست سمجھے گا۔ ایسا کوئی مذاق تو نہیں ہے نا؟"

ہاں ایسا کوئی مذاق تو نہیں ہے لیکن میرا دل یہ بھی جانتا تھا کہ بابا مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے ناراض بے شک ہوں گے لیکن مجھ سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ وہ مجھ سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ میری خیر خبر ضرور لیں گے۔ ہاں پھر تو ہو سکتا ہے میری تلاش کے بہانے سے چوہدری ان کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لے۔

بولاری کا خیال غلط تھا کہ اس نے چال بازی سے جو موجمدار کو کھسکا دیا ہے تو اب اسے گھنٹے دو گھنٹے کی فرصت ہو گئی ہے۔

وہ مجھ سے گھٹ گھٹ کر باتیں کر رہی تھی۔ ابھی آدھا پون گھنٹا ہی ہوا ہو گا کہ موجمدار پوری وردی میں اپنے ہتھیار بند ماتحتوں کے ساتھ لاک اپ میں دھڑ دھڑاتا ہوا گھس آیا اور مجھ سے بھڑ کر بیٹھی ہوئی بے چاری بے خبر عورت کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے گیا۔ بولاری نے اسے گالی گلوچ سے قابو کرنا چاہا مگر شاید موجمدار کا نشہ اتر چکا تھا۔ اس نے جما جما کے اپنے وردی کے بوٹ سے اسے دو تین ٹھوکریں ماریں۔ اس کے ساتھ آنے والے سپاہی بولاری کو ٹانگوں بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں نے ایک بار احتجاج کیا تو موجمدار نے ایل ایم جی کا بٹ چلا کر مجھے زخمی کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو میں اچانک ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چھچھلتی ہوئی سی چوٹ لگی۔ میں خاموش ہو گیا تو وہ لوگ میری طرف سے جیسے بے تعلق ہو گئے۔ اصل میں تو وہ عورت کو لے جانے آئے تھے۔

بہت دیر تک بولاری کے چیخنے' گالیاں بکنے کی آوازیں آتی رہیں موجمدار عورت کو اس کی بدزبانی کی سزا دے رہا تھا۔ اپنی مردانگی دکھا رہا تھا۔

میں کچھ دیر کونے میں پڑے کمبل پر لیٹا بیٹھا رہا پھر پلنگ پر آ بیٹھتا۔ میں برابر بولاری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیسی بے خوف اور باؤلی عورت ہے وہ اگر سلیل چوہدری کا پورا منصوبہ مجھے نہ بتاتی تو میں اندھیرے میں رہتا۔ مطلب اندھیرے میں مارا جاتا۔ اب جو بھگتنا ہے لاعلمی میں نہیں بھگتوں گا اور کچھ نہیں ہو گا تو اس طرح میری ہمت ہی قائم رہے گی۔

یہی سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

دن نکلنے پر آنکھ کھلی تو لاک اپ کی سلاخوں کے پار مجھے بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ چیک پوسٹ کے سبھی اہلکار وردیوں میں تھے اور ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے۔ کسی بات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

وہ گارڈ جس نے رات کی ڈیوٹی ختم کرتے ہوئے میرے پاس آکر روکھے پن سے پانی لانے کی پیشکش کی تھی مجھے اٹھتا دیکھ کر گیا اور کاغذ کی تھیلی میں کٹی ہوئی ڈبل روٹی اور مٹی کے پیالے میں شکر پڑا دہی لے کر آگیا۔ بولا۔ "لے۔ کھالے تو آواز دے لینا پانی اور چائے لا دوں گا۔"

نہ معلوم کیوں یہ روکھے پن سے بات کرتا تھا۔ آدمی زبان کا کڑوا ہو گا مگر بہر حال ہمدرد تھا۔

میں ناشتا کر چکا تو گارڈ ایک صراحی اور مٹی کے پیالے میں چائے لے کر آگیا۔ چائے گرم تھی۔ میں نے اس کی تعریف کی اور گارڈ کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے منہ بگاڑ کر مجھے دیکھا جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خالی برتن اور کاغذ کی تھیلیاں سمیٹ کر چلتا بنا۔ ناشتے کے بعد میں پھر کچھ دیر لاک اپ میں ٹہلتا رہا۔ پلنگ پر آبیٹھا۔ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ رات کے بعد سے بولاری کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ نہ معلوم ان لوگوں نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔

دوپہر سے پہلے کہیں سے ہری وردیوں والے کوئی آٹھ دس فوجی آگئے۔ میں سلاخوں کے پار سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ مجھے دیکھتے رہے۔ شاید میرے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے چڑیا گھر میں لائے گئے کسی نئے جانور کو دیکھتے ہیں۔ میں کونے میں آکے بیٹھ گیا پھر بھی وہ لوگ نہیں ہٹے۔ شش شش کر کے مجھے متوجہ کرنا سامنے بلانا چاہتے تھے۔

اچانک موجمدار کے ساتھ ہری وردی والا ایک افسر اور اس کے گارڈ لاک اپ میں داخل ہوگئے۔ ہری وردی والے نے ہاتھ میں ایک چھوٹا چمک دار بید لے رکھا تھا۔ بید کے اشارے سے اس نے مجھے اٹھنے کو کہا۔ میں کھڑا ہو گیا تو اس نے آس پاس گھوم کر میرا جائزہ لیا۔ لاک اپ کے ایک گوشے سے دوسرے تک چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے روک کر مجھے حکم دیا کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر معائنہ کراؤں، جوتے موزے اتار کر پیروں کی انگلیاں گنواؤں۔

اس معائنے کے بعد ہری وردی والے افسر نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ

اس نے مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ افسر نے ایک کاغذ پر دستخط کر کے گویا میری رسید موجمدار کے حوالے کر دی۔ اس کے آدمیوں نے مجھے گہرے ہرے رنگ کے ایک ٹرک میں لے جا کے بٹھا دیا۔

ٹرک کی طرف جاتے ہوئے میں نے بیرکوں کی کھڑکیوں سے، کمروں کے کھلے دروازوں سے اندر دیکھنا چاہا۔ موجمدار ٹرک تک ساتھ آیا تھا۔ سمجھ گیا کہ مجھے بولاری کی تلاش ہے۔

وہ عورت مجھے نظر نہ آئی۔ عجیب سی مایوسی ہوئی۔ موجمدار میرا چہرہ دیکھ کر کمینگی سے مسکرا رہا تھا۔

ہری وردی والا افسر گاڑی میں بیٹھنے کو بڑھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ "سر! آپ برمیز آرمی کے ذمہ دار افسر ہیں۔ سنئے اس پولیس والے نے ایک انڈین ایجنٹ سے بہت بھاری رشوت لی ہے۔ سر! مجھے ایسٹ پاکستان سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ خدا جانتا ہے میں نے پاکستان برما سرحد خود سے پار نہیں کی۔ یہ بدمعاش موجمدار اور اس کے شریک جرم مجھے اغوا کر کے لائے ہیں۔"

میں نے یہ سب کچھ برمی زبان میں نہیں انگریزی میں کہا تھا۔ میں چاہتا تھا چیک پوسٹ کے گارڈ اور ہری وردی والے فوجی جوان میری باتیں سمجھ نہ سکیں۔

ہری وردی والے افسر نے غور سے میری پوری بات سنی۔ پھر سوکھے سے منہ سے انگریزی میں کہنے لگا۔ "بل شٹ! لڑکے تمہیں جو کہنا ہو کورٹ میں کہنا۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ تمہیں لے جا کے متعلقہ حکام کے حوالے کر دوں اور بس۔"

میں نے پھر کہا۔ "سر! سر! میری بات تو سنئے۔ یہ رشوت خور برمیز گورنمنٹ کو اور آپ کو سب کو دھوکا دے رہا ہے۔"

افسر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے آنکھیں نکال کر برمی زبان میں کہا۔ "بکواس بند کرو بالکل بند اور سمجھ لو تم ایسے بدمعاشوں کو سدھارنا آتا ہے مجھے۔"

موجمدار پیچھے کھڑا ہوا اطمانیت سے مسکرائے جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا ان سب کی ملی بھگت سے یہ کام ہو رہا ہے۔

میں نے خود سے کہا۔ "شیر علی! توانائی خرچ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیٹھو خاموش۔" اور میں سر جھکا کر چپ بیٹھ گیا۔

میرے اس طرح چیخنے پکارنے کا یہ اثر ہوا کہ ہری وردی والے افسر کے حکم

سے میری آنکھوں پر کس کے پٹی باندھ دی گئی۔

ٹرک نہ معلوم کس طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرک کئی گھنٹے چلتا رہا۔ ایک بار یہ لوگ رک کے بھی کھانا کھانے اور چائے پ
کو۔ مجھے انہوں نے پینے کا پانی بھی نہ دیا۔ میں اپنے اندھیرے اور اپنی مایوسی میں بیٹھا انہ
چپڑ چپڑ کھانا کھاتے' پانی اور چائے سڑ پتے سنتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے آرام کرنے کے ب
وہ چل پڑے۔

شام ہوتے ہوئے ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی کی لپ لپ سنائی دے رہی تھ
میں نے ہوا کو سونگھ کر معلوم کیا کہ دریا یا سمندر کا قرب ہے۔ یہاں ٹرک کافی دیر رکا ر
وہ لوگ زیادہ تر خاموش رہے مگر ادھر ادھر کے ایک جملے' لفظ یا آس پاس کی آوازوں۔
میں سمجھ گیا کہ آگے کا سفر کسی اسٹیمر یا کشتی پر ہو گا۔

آخر کنارے پر کشتی یا چھوٹے اسٹیمر کے لگنے کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ
بعد مجھے اسٹیمر پر سوار کرا دیا گیا۔ فوجیوں میں سے ایک میری ہتھکڑی کی زنجیر سنبھا
تھا۔ دوسرے نے اپنے سخت پنجے میں میرا بازو جکڑ رکھا تھا۔ مجھے لے جا کر انہوں
عرشے پر بٹھا دیا۔

میں نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ ہری وردی والا افسر کچھ لوگوں کو ٹرک
ساتھ واپس بھیج رہا ہے۔ کچھ اس کے ساتھ اسٹیمر پر رہیں گے۔

کسی خلاصی نے شاید خود ہی رحم کھا کے یا کسی اور کے اشارے پر چھ
کیلے میرے سامنے ڈال دیے اور میرا ہاتھ کیلوں سے مس کر کے دھیرے سے بولا۔
کھا لے۔"

مجھے علم نہیں تھا یہ کون سا دریا یا سمندر تھا۔ بس اتنا اندازہ لگا لیا کہ اسٹیم
مسافر نہیں لے رہی تھی۔ رکے بغیر چلی جا رہی تھی شاید یہ سرکاری بوٹ تھی۔

شروع رات میں بھاری بوٹوں کی دھمک اور دوسری آوازوں سے میں
بھی معلوم کر لیا کہ عرشے پر ایک طرف میز کرسی بچھا کر مجھے لانے والا افسر اور ا
ناخدا شراب پی رہے ہیں۔ وہ کبھی بنگلا کبھی برمی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ لفظ
نہیں دیتے تھے مگر ایک بار میں نے محسوس کیا کہ بوٹ کے کپتان نے آرمی افس
میرے بارے میں کچھ کہا ہے اور اس نے سختی سے انکار کر دیا ہے۔ کچھ دیر بعد بوٹ
نے شاید پھر وہی بات کی تو افسر نے نشے میں لڑکھڑاتی اونچی آواز میں اپنے آدمی

اور اس سے کہا۔ جا لڑکے کی آنکھوں سے پٹی کھول دے۔ اسے کچن میں لے جا کے کچھ کھلا بھی دینا۔

ایک ہری وردی والے نے آنکھوں کی پٹی کھول دی اور ہتھکڑی کی زنجیر سنبھال کر مجھے نیچے باورچی خانے کی طرف لے گیا۔

خلاصیوں کو میرے بارے میں علم تھا۔ انہوں نے پہلے سے کچھ دلیہ جیسا اور مچھلی تیار کر کے رکھی تھی۔ ساتھ میں چاول بھی تھے۔ مجھے انسانوں کی طرح بٹھا کر ان لوگوں نے کھانا کھلایا۔

میں نے کھانا ختم کیا تو اسٹیمر کے خلاصی کو لیے ہوئے ایک اور ہری وردی والا جوان آ گیا۔ اس نے پہلے والے گارڈ سے میری ہتھکڑی کی زنجیر لے لی اور یہ لوگ مجھے لے کر اسٹیمر بوٹ کے نچلے حصے میں ایک طرف چل پڑے۔ خلاصی رہنمائی کر رہا تھا۔

ہم جہاں رکے وہ ایک چھوٹا کیبن یا اسٹور سا تھا جس میں پرانی ترپالیں اوپر تلے تہہ کی ہوئی رکھی تھیں لیکن کیبن کی چھت سے موٹے تار کے پنجرے میں بند ایک پیلا بلب جل رہا تھا جس کی کمزور روشنی میں' میں نے دیکھا کہ کیبن میں دو آدمی پہلے سے موجود ہیں۔

ہری وردی والے گارڈ نے مجھے کیبن میں ٹھیل دیا اور بغیر کچھ کہے میری ہتھکڑی کھول دی۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے کیبن میں میرے آنے پر احتجاج سا کیا۔ اسے اعتراض تھا کہ یہاں جگہ نہیں ہے پھر کیوں وہ ایک اور قیدی کو لے آئے ہیں۔

یہ آدمی خواہ مخواہ جھنجھٹ کر رہا تھا۔ کیبن چھوٹا تھا مگر تین چار آدمی تو اس میں آرام سے آ سکتے تھے۔

گارڈ نے بڑی آواز کے ساتھ کیبن کا دروازہ بند کیا اور باہر سے بولٹ چڑھا کر تالا ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کیبن کے دروازے میں آدھے حصے میں موٹی موٹی سلاخیں جڑی تھیں۔ باہر سے ہوا اور آوازیں چلی آ رہی تھیں۔ قید خانہ برا نہیں تھا۔ میں فوراً سو جانا چاہتا تھا۔ دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا میں اپنی سونے کی جگہ بنانے کو بڑھ رہا تھا کہ اسی بڈھے نے جو ایک قیدی کے اضافے پر بڑبڑا رہا تھا چیخ کر مجھ سے کہا۔ "پرے ہٹ۔ ادھر کیوں جا رہا ہے؟" جس طرف سے وہ مجھے دور رکھنا چاہتا تھا' اس طرف اس کا ساتھی چادر لپیٹے بیٹھا تھا۔

مجھے بڈھے کی بات بری لگی میں نے چمک کر کہا۔ "او تو نے جگہ خریدی ہو
ہے؟ بولتا ہے کیوں جارہا ہے ادھر؟"
بڈھا میری طرف غصے سے مڑا۔ وہ کوئی بہت سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر اچان
رک گیا' بولا۔ "ارے! تم؟"
کیا مطلب؟ میں نے بلب کی پیلی کمزور روشنی میں اسے غور سے دیکھا' پ
کیسے جانتا ہے یہ آدمی؟
اوہ! کاکسیز بازار کے قبائلی میلے کا بوڑھا مداری۔ یہ وہی تھا۔ وہ ایک دم کمز
لگ رہا تھا۔ ڈاڑھی بھی بڑھ آئی تھی مگر میں اسے پہچان گیا۔ میں بوڑھے مداری' اس ک
پوتا پوتی اور ریچھ کے بارے میں برابر سوچتا رہا تھا۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر خو
ہوئی۔ میں نے کہا۔ "تم؟ اس طرح____ بچے کہاں ہیں؟ تمہارے پوتا پوتی؟"
اوہو! یہ بے چاری بھی قید میں ہے۔
مداری نے چادر میں لپٹے ہیولے کی طرف اشارہ کیا' بولا۔ "پوتی یہ ر
میری۔"
"اور لڑکا؟ تمہارا پوتا؟" لڑکی کے منہ سے سسکی کی آواز نکلی۔ میں نے ش
غلط سوال کر دیا تھا۔
مداری نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا' "پوتا؟____ وہ مارا گیا۔ حرام کے ب
نے مار دیا اس کو۔"
"مگر کیسے؟" یہ میرا سوال نہیں تکلیف کی چیخ تھی۔
"کیسے؟" بوڑھے نے سوال دہرایا۔ "ہم بھاگ رہے تھے' وہ گولی چلا رہے ت
بس۔ لڑکے کو گولی لگ گئی۔ مر گیا۔" چادر میں لپٹی اس کی پوتی نے اب آواز سے
شروع کر دیا تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا ان دونوں کو کیسے تسلی دوں۔ منہ سے افسو
بے معنی آواز نکال کر رہ گیا۔
مداری پھر کھنکارا۔ وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پوچھنے لگا۔ "تم
بدمعاشوں کے ہاتھ کیسے لگے؟ یہاں برما میں کیا کر رہے تھے؟"
میں نے مختصراً بتا دیا کہ سلسیل چوہدری نے کیا سازش کی ہے اور اس
کہاں کہاں مجھے بند رکھا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا تھا وہ دونوں کیسے گرفتار ہو گئے۔ میں اس عورت بولاری کی
بات کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑے میاں سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ چوہدری اور
اس کا بھتیجا۔ یہ لوگ تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"
مداری ایک منٹ تک چپ بیٹھا دیوار تکتا رہا پھر بولا۔ "اب تو دشمن دوست کی
پہچان صاف ہو گئی ہے۔ پہلے میں ہر ایک سے ڈرتا رہتا تھا۔ پھر بھی تم سے اس وقت
جھوٹ نہیں کہا تھا۔ بازلر کا ڈرائیور میری پوتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سچ ہے مگر وہ
لوگ بہت پہلے سے میرے پیچھے تھے۔ ڈرائیور کی شادی کی وجہ سے نہیں____ وجہ کچھ
اور تھی۔"
میں نے آہستہ سے کہا۔ "وجہ شاید مجھے معلوم ہے۔ یہ بتاؤ کیا دتہ نام کا کوئی
آدمی اصل وجہ ہے؟"
مداری میری صورت دیکھنے لگا۔ پھر دھیرے سے پوچھنے لگا۔ "کیا تمہیں خبر
ہے؟"
میں نے ہاں میں سر ہلایا۔
بوڑھا مداری بولا۔ "ہاں میں دتہ کو جانتا ہوں۔ وہ انڈیا کے لیے جاسوسی کرتا
ہے۔ پہلے یہاں تھا برما میں۔ اب پاکستان میں ہے۔ میں نے سوم ناتھ دتہ کو سلسیل
چوہدری اور بازلر کے ساتھ وہاں میلے میں دیکھا۔ اسے ایک ہی نظر میں پہچان گیا تھا میں۔
اپنے پوتا پوتی کی وجہ سے میں نے سوچا ان لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر چپکے سے نکل
جاؤں گا مگر وہ مجھے دیکھ چکے تھے۔ انہیں ڈر تھا اگر میں نے پاکستان کے افسروں کو دتہ کے
بارے میں بتا دیا تو جو کچھ وہ کرنے جا رہے ہیں نہیں ہو سکے گا۔ مجھے قابو کرنا ضروری تھا
اس لیے وہ میری نگرانی کرتے رہے۔ میں پھنس گیا۔ نکل نہ سکا۔ میلے میں آنے والے
قافلے سب چلے گئے۔ بس میں رہ گیا اور میرے دشمن رہ گئے۔ اتفاق دیکھو میں جہاں چٹائی
کی چھت ڈالے پڑا تھا۔ اسی جگہ کو انہوں نے اپنے اڈے کے لیے چنا تھا۔ تم نے رحم کھا
کے کچھ دینا دلانا آنا جانا شروع کیا تو ذرا ہمت ہوئی۔ سوچا نکل جاؤں گا تم سے مدد لے لوں
گا۔ اب یہ کیا معلوم تھا کہ تم بھی اس چکر میں پھنس جاؤ گے۔"
میں نے تسلی دی۔ "اب ہم دو ہیں۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"
وہ آہستہ سے بولا۔ "نہیں ہم تین ہیں۔ ایک لڑکی ہے۔ لڑکی ساتھ ہو تو دس
کی جماعت کی طاقت بھی گھٹ کے دو جتنی رہ جاتی ہے۔"

بوڑھا عجیب بات کر رہا تھا مگر جس حالات سے وہ گزرا تھا شاید ایسے حالات میں یہ بات سچ ہوتی ہو گی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ تمہیں کہاں سے لا رہے ہیں؟"

بولا۔ "بنگال سے۔ وہاں انہوں نے میرے پوتے کو مار دیا تھا۔ ہمیں پکڑ لیا تھا۔ بہت دن ادھر ہی دونوں کو قید رکھا۔ تمہارے نوکر' اس پٹھان لڑکے کو بھی وہیں ہمارے ساتھ رکھا تھا۔

اپنے وفادار ساتھی میرباز کے بارے میں پہلی بار میں کوئی ایسی خبر سن رہا تھا جس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔

مداری کہنے لگا۔ "تمہارے نوکر کی وجہ سے مجھے حوصلہ تھا مگر دو روز پہلے یہ لوگ ہمیں برما لے آئے۔ اسے شاید وہیں رکھا ہو گا۔"

میں نے سوچا مجھے تو یہ اس لیے لائے ہیں کہ برما میں غیر قانونی داخلے کے جرم میں سال بھر رو کے رکھیں گے۔ بوڑھا اور اس کی پوتی تو یہیں کے رہنے والے ہیں انہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟ خیر جو بھی ہو ممکن ہے' یہاں آنے سے ان کے لیے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

میں نے کہا۔ "سچ پوچھو تو تمہارا اپنے ملک میں آنا ادھر پھنسے رہنے سے تو اچھا ہے ادھر برما میں تمہارے اپنے لوگ ہیں' خبر لگے گی تو تمہارے لیے ضرور کچھ کریں گے۔"

وہ بجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہاں ___ اگر خبر لگے گی تو ___"

بہ مشکل آدھا گھنٹا ہمیں اس قید خانے میں آئے ہوا ہو گا کہ اسٹیمر کے انجن کی آواز بدلی اور پھر اچانک انجن بند ہو گیا۔ ہمارے مختصر قید خانے میں جلتی پیلی بتی بجھ گئی۔

اندھیرا ہوا تو بوڑھے مداری نے پوتی کو اپنی زبان میں تسلی دی' بولا: "فکر نہ کر ابھی آ جائے گی روشنی۔"

کچھ دیر گھپ اندھیرا رہا پھر بھاری بوٹوں کی آواز کے ساتھ ٹارچ کی روشنی پھراتا ہوا کوئی ہماری کوٹھری کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے ہم پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور بھاری آواز میں بولا۔ "کہاں ہے؟"

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ ہری وردی والا آرمی آفیسر تھا۔ اس نے پھر نشے سے بدلی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔ "ارے کہاں ہے وہ لڑکی کہاں ہے؟"

میرا دل ایک دم جیسے سرد ہو گیا۔ یہ حرام خور شراب کے نشے میں دیوانہ ہو کر عورت کی تلاش میں نکلا ہے مگر عورت کیسی؟ مداری کی پوتی تو غریب تیرہ برس کی لڑکی تھی۔

افسر کی بات سن کر لڑکی اپنی چادر میں سمٹ گئی۔ بوڑھے مداری نے ایک بازو بڑھا کر پوتی کو خود سے قریب کر لیا۔ اس نے دھیرے سے مجھے مخاطب کیا تھا۔ "خان!"

میں نے بھی اسے آہستہ سے آواز دی۔ "بابا۔ یہ تمہاری برمی فوج کا افسر ہے۔ یہی مجھے بارڈر سے لے کر آیا ہے۔"

اس اثنا میں برمی افسر نے ٹارچ کی روشنی پھراتے ہوئے لڑکی کا چہرہ تلاش کر لیا تھا۔

اس نے پھر اپنی مکروہ آواز میں کہا۔ "یہ ___ یہ! اے تم آؤ ___ چلو میرے ساتھ۔"

لڑکی نے گھٹی ہوئی سی چیخ ماری۔ میں نے ڈپٹ کر انگریزی میں کہا۔ "نہیں آفیسر۔"

اس کے اور میرے بڑوں کے پچھلے حاکم یہی زبان بولتے ہوئے اس کے ملک اور میرے ملک میں آگھسے تھے اور دو سو برس سے زیادہ ہم پر حکومت کرتے رہے تھے۔ میرے خیال میں یہ موثر زبان تھی۔"

میں نے کہا۔ "نہیں! یہ لڑکی برما کی شہری ہے۔ اپنے کمیشن کی رو سے تم اس کے محافظ ہو پیشہ ور سپاہی کا حلف اٹھایا ہے تم نے۔ اس جیسی تمام لڑکیوں کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے۔ اسے اپنے دادا کے ساتھ رہنے دو۔ جاؤ یہاں سے۔"

ہری وردی والے افسر نے تھوک اڑاتے ہوئے کہا۔ "بل شٹ! حلف کی اور اس کے دادا کی ایسی تیسی۔ تو کون ہے؟ اس کا دلال؟"

میرے بنگش خون نے ابل کے مجھے حکم دیا۔ چڑھ دوڑ اس بدزبان سور پر مگر مصلحت کا تقاضا تھا میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں پشتون ہوں۔ ہم لوگ اپنی اور سب انسانوں کی آبرو کی قیمت جانتے ہیں۔ شاید دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"دوسرے کون؟" اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی ہو گی۔ لہجے کی لاعلمی سے معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "دوسرے یعنی وہ بعض بے غیرت برمی افسر جو شراب پی کر سور

بن جاتے ہیں۔''

اس نے اپنی بھونڈی مکروہ آواز میں گالی بکی اور بیلٹ سے اپنا سروس ریوالور نکال کر اس کا سیفٹی کیچ اتار دیا۔ ''تو باہر آ چل۔'' اس نے مجھے حکم دیا اور نشے میں کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ میں نے سوچا ٹھیک ہے میں اسٹور کے دروازے سے باہر نکلتے ہی ریوالور پر ہاتھ ڈال دوں گا اور کچھ اور سوچے بنا میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ہری وردی والے افسر کے نشے میں بے حال دماغ نے خدا معلوم کیسے اسے خبردار کر دیا۔ اس نے نشانہ سادھے بغیر گولی چلا دی۔ میرے بائیں شانے پر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیوار آ گری ہے یا آواز اور ہوا مجسم ہو کر مجھ پر جھپٹ پڑے ہیں۔ انہوں نے مجھے الٹ دیا۔ لمحے بھر کے لیے میں جیسے بدحواس ہو گیا۔ سوچا کیا مجھے گولی لگی ہے؟ نہیں۔ گولی شاید ایک یا آدھے انچ دور سے گزری ہے اور گولی نے اسٹور کی دیوار کے ایک حصے کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ پلائی وڈ میں جان ہی کتنی ہوتی ہے۔

میں نے ترپالوں پر پڑے پڑے دیکھا کہ برمی افسر اسٹور میں گھسا اور اس نے منہ سے نجس جانور کی طرح تھوک اڑاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر مداری کی پوتی کو دبوچ لیا۔ لڑکی نے بھیانک چیخ ماری ہو گی مگر اتنے قریب سے چلائی ہوئی گولی نے میرے کان بند کر دیے تھے۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ ترپالوں پر پڑے پڑے میں ایک بے آواز منظر دیکھ رہا تھا۔ کان بس ایک شن شن جیسی آواز سن رہے تھے۔

وہ ٹارچ جلائے اسٹور کے دروازے سے لڑکی کو دبوچے ہوئے نکلنے کے لیے مڑا ہو گا کہ اس نے اسٹور میں لڑکی کے اور میرے علاوہ ایک اور وجود کی موجودگی محسوس کی۔ اس نے اور میں نے بہ یک وقت دیکھا کہ ادھر لڑکی نے چیخ ماری ادھر ترپالوں کے ڈھیر پر جہاں لڑکی کا دادا بوڑھا مداری بیٹھا تھا اندھیرے کا ایک دھبا سا غبار کی طرح بلند ہوا اور اسٹور کی تنگ جگہ میں میرے بند کانوں نے کسی کٹیلے جانور کو غصے کی آواز نکالتے سنا۔ بوڑھے مداری کو غبار نے ڈھک لیا۔ برمی افسر کے لیے یہ آواز اور یہ بات کہیں زیادہ دہشت پیدا کرنے والی ہو گی۔ میں نے دیکھا اس کے کانپتے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ نے اس کے بھیانک چہرے کو لمحے بھر کے لیے روشن کر گئی ہے۔ میں نے آج تک کسی انسان کے چہرے کو خوف سے اتنا مسخ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ گھبرا کر میں ترپالوں کے ڈھیر کی طرف گھوم گیا۔ میں نے دیکھا اندھیرے کا غبار ختم ہو چکا تھا اور ترپالوں کے ڈھیر سے ایک

سیاہ، سر تا سر سیاہ ریچھ اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔

بدحواسی یا واقعی بے ہوشی کے باوجود میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا مگر مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کم سے کم میں نے اپنے زور زور سے دھڑکتے دل میں محسوس کیا کہ میں ____ اور مداری کی پوتی۔ ہم دونوں اب بالکل محفوظ ہیں۔

ریچھ نے غصے سے بلبلاتے ہوئے برمی افسر کی طرف جست کی۔

میں اسے جست ہی کہوں گا اگرچہ ایسا دیو قامت بھاری بھرکم ریچھ اتنی محدود جگہ میں کیونکر جست کر سکتا تھا مگر ریچھ اچھلا اور اس سے پہلے کہ آرمی آفیسر اپنا ہتھیار والا ہاتھ سامنے لاتا بھیانک سیاہ ریچھ نے اسے جا دبوچا۔

بس ایک غیر انسانی گڑگڑاہٹ اور نرم لکڑی کی طرح ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور برمی فوج کی ہری وردی میں لپٹا انسانی جسم ____ مردہ جسم ادھڑی ہوئی چیتھڑا گڑیا کی طرح ریچھ کے بازوؤں سے نکل کر اسٹیمر کے عرشے پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ گرا نہیں پھینکا گیا۔ اسٹیل کے فرش پر کاسہ سر کے اخروٹ کی طرح ٹوٹنے کی آواز سنائی دی اور یہ ادھڑے ہوئے افسر کے جسم سے پیدا ہونے والی آخری آواز تھی۔

لمحے بھر سناٹا رہا۔ پھر لوگوں کے زور زور سے چیخنے، پکارنے اور دوڑتے ہوئے ادھر ادھر آنے کی آواز آنے لگیں۔

فوجی افسر کے ماتحتوں، اسٹیمر کے عملے اور کپتان کو کسی جبلی اشارے سے خبر مل گئی ہو گی کہ اور نشے اور ہوسناکی میں لتھڑے ان کے افسر کو کسی طرح کا پرتشدد خاتمہ نصیب ہو گیا ہے۔

لڑکی میری طرف گھومی اور اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کر کے کوئی فقرہ کہا۔

''ادھر چلو۔ ان لوگ کی چھوٹی کشتی پانی میں گرا دو۔ دونوں بیٹھ کے نکل چلیں گے۔''

میری سمجھ میں کچھ آ رہا تھا۔ کچھ نہیں مگر میں نے پوچھا۔ ''اور تمہارا دادا؟''

''وہ آ جائے گا۔ جلدی کرو چلو۔'' لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور عرشے پر جانے کے لیے اندھیرے میں بے خوفی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

میں بحری جہازوں، چھوٹے بڑے اسٹیمروں اور بوٹوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا مگر مداری کی پوتی شاید سب کچھ جانتی ہو گی۔ وہ اندھیرے میں تلاش کر کے

مجھے لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھالائی اور عرشے پر پہنچادیا۔

افسر کی پستول کی آواز ریچھ کی پر غضب گڑگڑاہٹ اور افسر کے مرنے کی آوازیں سبھی کو بوٹ کے نچلے حصے میں دوڑالے گئی تھیں۔ ویسے بھی گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی وہاں ہوتا بھی تو کیا دیکھتا۔ ہمیں عرشے پر نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

مداری کی پوتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر رسوں کے ایک گورکھ دھندے سے چھوادیا اور جلد جلد ہدایات دے کر اسے کھینچو' اسے ڈھیلا کرو' اب چھوڑ دو' سنبھال لو' کہہ کر اس نے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی چھوٹی کشتی اسٹیمر سے پانی میں اتروالی۔

اسٹیمر کے پہلو سے لگی کشتی چمک دار پانی میں صاف دکھائی بلکہ سجھائی دے رہی تھی۔ میں رسی تھامے' لڑکی کا ہاتھ پکڑے۔ جی کڑا کر کے کود پڑا اور سیدھا کشتی میں جاگرا۔ لڑکی نے خوف یا شاید تکلیف کی ہلکی آواز نکالی تھی مگر وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں تھی۔

اس نے کشتی کے تختے سے بندھا چپو کھول کر میرے حوالے کیا' بولی۔ "چلاؤ۔ جلدی۔ ان لوگ نے اگر دیکھ لیا تو گولی چلائیں گے۔"

میں نے دیوانہ وار چپو چلانا شروع کر دیا۔ کشتی تیزی کے ساتھ اسٹیمر سے دور ہوتی جارہی تھی۔

میں نے دیوانوں کی طرح چپو چلاتے ہوئے کشتی کو اسٹیمر سے دور پہنچا دیا تھا۔ سامنے ساحل کے قریب اگی آبی گھاس کی پناہ نظر آرہی تھی۔ میرا ارادہ آبی گھاس کی اوٹ میں کشتی لے جانے کا تھا۔ اگر اسٹیمر سے طاقت ور سرچ لائٹ بھی ڈالی جاتی تو چہار طرف اگی گھاس میں ہماری ننھی کشتی کو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

میں کشتی کھیتا ہوا آبی گھاس کے اس وسیع و عریض جنگل میں داخل ہو گیا۔

مداری کی پوتی یہاں تک تو ہمت سے کام لے کر خود کو اور مجھے نکال لائی تھی اب وہ خوف سے کانپ رہی تھی یا شاید یہ کپکپی سردی کی تھی۔ یہاں کھلی ہواؤں میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کوٹ اتار کر اسے دینا چاہا' لڑکی نے انکار کر دیا۔

مجھے بھی پچھلے چند منٹوں میں ہونے والے واقعات نے لرزا دیا تھا۔ کاکسیز

بازار کی اس جھونپڑی میں ریچھ کے آنے مداری کے غائب ہو جانے اور مداری کے آنے ریچھ کے غائب ہو جانے کے جو خوفناک واقعات دو مرتبہ پیش آئے تھے انہوں نے مجھے پہلے ہی عجیب طرح کے ہول میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ خلاف فطرت تھا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ آدمی اپنا قالب بدل کر ریچھ کی شکل کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ مگر ابھی ابھی چند منٹ پہلے مجھ سے تین ساڑھے تین فٹ کے فاصلے پر جو کچھ ظہور میں آیا اس کے بارے میں سوچ کر ہی بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی ہے۔ کیا یہ جادوگری ہے؟ نظر کا دھوکا ہرگز نہیں' یہ تو صاف جادوگری ہے۔ دھوکا تو سایہ اور وہم ہوتا ہے۔ یہ فرش و دیوار پر پڑنے والا سایہ نہیں تھا۔ بوڑھے مداری کی جگہ ہڈی گوشت پوست و خون سے بنا ایک قوی جانور ظاہر ہوا تھا جس نے بے پناہ حیوانی طاقت سے فوجی افسر کو اپنی بھیانک گرفت میں لے کر توڑ موڑ دیا تھا۔ پلک جھپکتے ہی جان نکال دی تھی اس کی' پھر چوزے کی طرح اسے فولادی ڈیک پر دے پٹکا تھا۔ فوجی افسر کا کاسہ سر آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا تھا۔ تربوز کی طرح چھار چھار ہو گیا تھا۔ میں نے کاکسیز بازار میں ریچھ کو اس بوڑھے مداری کو بھاری حیوانی پنجا چلا کر بازلر کے ڈرائیور کو زخمی کرتے دیکھا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ مگر کون بتاتا؟ میں کس سے پوچھتا؟ خاموش بیٹھا رہا۔

آبی کیڑوں کے شور کے سوا ہر طرف سناٹا تھا۔ سناٹے میں اچانک گولی چلنے کی آواز آئی۔ کشتی میں میرے برابر بیٹھی لڑکی اچھل پڑی۔ دوبارہ پھر کسی نے گولی چلائی۔ یہ فوجی رائفل کی آواز تھی۔

لڑکی نے منہ ہی منہ میں بدبدانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق شاید کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا وہ ابھی تک کپکپاہٹ پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ اب اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپکا آہستہ سے کہا۔ "ہمت کرو ان کے گولی چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے میرے رخ اپنا چہرہ گھمایا۔ "ہاں۔" کہہ کر سر ہلایا۔

میرے حوصلہ دلانے سے اس کا لرزہ کچھ کم ہوا تھا۔

ہم کوئی دس منٹ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے سنا اسٹیمر کا انجن چلنے کی بہت ہلکی مگر صاف آواز آنے لگی تھی۔ میں نے کچھ اور بھی سنا' کوئی چیز' آدمی یا

جانور تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ پانی کے ہلکے چھپاکے سنائی دے رہے تھے۔ کشتی سے کچھ دور آبی گھاس ہلی تھی۔ کوئی کمزور مگر مہارت سے ہاتھ مارتا کشتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر دشمن ہوا تو میں تیار تھا۔ کشتی کا مضبوط چپو میری گرفت میں فوری بچاؤ کا ہتھیار بن سکتا تھا۔

لڑکی نے بھی یہ آواز سنی' اس نے دھیرے سے پوچھا۔ "بابا؟"

"ہوں۔" گونجیلی رازدارانہ آواز آئی۔ "ہووں۔" اور وہ تیرتا ہوا قریب آ گیا۔

لڑکی کشتی میں کھڑی ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی مدد کو میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مداری کا سوکھا پنجر ہاتھ بہت گرم تھا اور مشقت کی تھکن سے کانپ رہا تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔ "تم چھوڑ دو۔ میں کھینچ لوں گا۔"

مگر بوڑھا اتنا بے حال ہو رہا تھا کہ اسے کشتی میں کھینچنا دوبھر ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت روز تک پانی میں بھیگا رہنے والا لحاف کھینچ کر نکالا جا رہا ہے۔ اتنا بے جان اور بھاری ہو رہا تھا وہ۔

میں نے اور لڑکی نے جیسے تیسے اسے کھینچ کر تختوں کے بیچ ڈال دیا۔

لڑکی نے اپنی چادر اتاری' میں نے تیزی سے بوڑھے کے بدن سے چپکے ہوئے اس کے کپڑے دور کیے۔ اسے چادر میں لپیٹ دیا اوپر سے اپنا کوٹ اوڑھا دیا۔ میں اور اس کی پوتی ہم دونوں اس کانپتے لرزتے زندہ ڈھانچے کو کچھ دیر دبا کر بیٹھے رہے تو اس کا کانپنا بند ہوا۔

تختوں کے بیچ کراہتا ہوا وہ بہت مشکل سے اٹھا اور بیٹھ گیا۔ بوڑھے مداری نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر میرا بازو چھوا۔ آہستہ سے کمزور آواز میں کہنے لگا۔ "وہ پرلی طرف نکل گئے۔ سب ٹھیک ہے۔ کشتی کو اب کنارے پر لے چلو۔" اس نے کنارے کی سمت بھی بتائی۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں کشتی موڑ دی۔

یہ جمی ہوئی ریت کا سخت کنارا تھا۔ یہاں گھاس' آبی پودے' درخت مٹی کچھ نہیں تھا۔ ٹھکی ہوئی ریت اور ادھر ادھر بکھری چھوٹی چٹانوں کے بیچ میں نے کشتی کنارے سے لگا دی۔

پہلے لڑکی اتری۔ اس نے سہارا دے کر اپنے دادا کو اتارا پھر مجھے سہارا دینے کو اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے۔ "اوں ہنک۔" کہہ کر انکار کیا تو اسے احساس ہوا کہ ہاتھ بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہولے سے ہنسی۔

اب جب کہ اس کا دادا اور وہ خود محفوظ تھے تو وہ خوش تھی۔ ہم تینوں کو پھر ایک بار زندوں میں گنا جا سکتا تھا۔ میں چپو کو لاٹھی کی طرح اٹھائے کشتی سے اتر آیا۔

مجھے چپو اٹھائے دیکھ کر بوڑھے نے سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا۔ آہستہ سے بولا۔ "ہاں چپو ادھر نہیں چھوڑنا۔ کشتی کو ڈبو کر اس میں پتھر ڈالو۔ اسے ادھر ہی چھپا دو۔ یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں ہے بس یہیں ٹھیک ہے۔"

تجویز اچھی تھی۔ تھوڑی دیر کی محنت سے میں نے اتنے پتھر اس ڈبوئی ہوئی کشتی میں بار کر دیے کہ وہ پانی میں ہی بیٹھی رہی۔ قریب سے دیکھنے پر کوئی دو ہاتھ گہرے پانی میں میرے اکٹھا کیے پتھروں کا ڈھیر نظر آتا تھا اور بس اتنا اطمینان ہو گیا کہ سرسری سا دیکھنے والے کو کشتی دکھائی نہیں دے گی۔

بوڑھا مداری اپنی پوتی کو ہدایات دیتا رہا تھا۔ اس نے کنارے پر کسی خاص ترتیب سے پتھر رکھوا دیے تھے۔ ایک نشان بنا دیا تھا جو بعد میں اگر ضرورت پڑی تو ہمیں کشتی ڈھونڈنے میں مدد دے سکتا تھا۔

میں نے اس کینڈے' ان صلاحیتوں کا آدمی آج تک نہیں دیکھا تھا۔ یہ مداری نہیں اسرار سے بھرا جادوگر تھا۔

میں نے دیکھا وہ اب ایک چادر اور میرے کوٹ میں لپٹا کافی حد تک اپنی طاقت بحال کر چکا تھا۔ کشتی چھپانے کا کام مکمل ہو گیا تو اس نے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ وہ پتھر پر بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں پاس بیٹھ گیا تو دھیرے دھیرے بولتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم ہم لوگوں کے کوئی نہیں تھے۔ پر اب ایسا ہو گیا کہ ہمارے اپنے بن گئے ہو۔ خان تم نے جو کچھ دیکھ لیا وہ باہر کا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ جو دیکھ لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ کیا ہوا میں اسے زندہ نہیں رہنے دیتا۔ سمجھے؟ اسی لیے یہ بات دیکھنے اور جان لینے والا باہر کا آدمی دوسرا کوئی نہیں ہے۔ بس ایک تم ہی ہو سمجھے؟"

میں ہنسا۔ "تو ٹھیک ہے مار دو مجھے۔ میں نے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ ریچھ کا کیا قصہ ہے۔ بس مار دو۔"

وہ بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو! تم نے کوسومی کی' میری پوتی کی آبرو بچائی' جان بچائی اس کی۔ ہم تو تمہارے بندی ہو گئے۔ غلام ہیں تمہارے۔ تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے ہم پہ۔ دوسرے احسان کا تو کوئی بدلہ' کوئی اتار ہوتا ہوگا ایسے احسان کو کوئی نہیں اتار سکتا۔ ہم تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تم باہر کے نہیں رہے۔ ہمارے اپنے ہو گئے ہو۔"

مجھے مسکراتا دیکھ کر' میری بات سن کر وہ اداس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "خان! پہلے کوئی اور بات تھی۔ اب غلام ہیں' تمہارے بندی ہیں۔ ضرورت پڑی تو تمہاری جان بچانے کو جان پہ کھیل جائیں گے۔ سمجھے؟"

تاروں سے اجلی ہوئی رات کے ہلکے اجالے میں میں نے اس کی آنکھیں چمکتی دیکھیں۔ وہ یہ سب باتیں سنجیدگی اور اخلاص سے کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس کے ہاتھ تپ رہے تھے۔ شاید بخار ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں بخار ہے؟"

"نہیں بخار نہیں ہے۔ کایا بدل پیچھے ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر پڑا رہوں۔ ایک جگہ بیٹھا رہوں تو آپ ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں۔"

"کایا بدل؟" میں نے کسی شاگرد کی طرح سوال کیا۔ "تم ریچھ' پھر ریچھ بن جانے کو کایا بدلنا کہتے ہو؟"

بولا۔ "آدمی ریچھ' پھر ریچھ سے آدمی بننا یہ کایا ہی تو بدلنا ہے اور آتما۔ روح وہی رہتی ہے جسم بدل جاتے ہیں۔ پہلے آدمی کو جانور کا جسم ملتا ہے پھر جانور کو واپس آدمی کا جسم مل جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ سب کیسے ہوتا ہے؟"

"بتا دوں گا۔ اپنے ہی ہو۔ تم پوچھتے ہو تو بتاؤں گا۔ پر ابھی آدھی کے قریب رات پڑی ہے۔ ہم اجاڑ میں بیٹھے ہیں۔ اپنے لیے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ لیں جہاں دن کے اجالے میں چھپے پڑے رہیں۔ اب جہاں بھی جانا ہے رات میں نکلنا ہوگا۔ دن میں وہ دور دور تک اپنے خبر اٹھانے والے مخبر بھیجیں گے۔ ہمیں تلاش کرنے کو۔"

میں نے پوچھا۔ "کون تلاش کروائے گا ہمیں؟"

وہ بولا۔ "فوج کے لوگ بھی' جہاز والے بھی۔ دونوں۔"

دراصل مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے اسٹیمر چھوڑنے کے بعد وہاں کیا ہوا۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ مداری نے اسٹیمر پر اور کتنوں کو ٹھکانے لگایا۔

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اسٹیمر پر کچھ لوگ زندہ بچے ہوں گے۔"

"کیا مطلب کچھ لوگ بچے ہوں گے؟ سبھی بچے ہیں۔ تم کیا سمجھ رہے ہو مجھے آدمیوں کو جان سے مارنے یا زخمی کرنے میں کوئی مزا ملتا ہے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

اس نے احتجاج کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ ظاہر ہے میری بدگمانی پر برا مان گیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں تو۔ یہ بات نہیں ہے____ یہ بتاؤ میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟"

کہنے لگا۔ "جب وہ نیچے آ گئے تو میں بلبلاتا آواز کرتا ہوا ایک طرف اوٹ میں ہو گیا۔ مجھے خبر تھی وہ ضرور رائفلیں اٹھا کر چلے ہوں گے۔ فوجی جو تھے پہلے تو میں سامنے نہیں آیا۔ جہاز کی لوہے کی دیواروں کے پیچھے سے آوازیں سناتا اور دہلاتا رہا۔ انہیں کبھی کسی پائپ کسی کھمبے کے پیچھے جا کر اپنا آپ بھی دکھا دیتا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے اور ڈر کے مارے مرے جاتے تھے۔ رائفلیں اٹھا کے فائر کرنے کا ہوش کسے ہوتا۔ سمجھو دم ہی نکل گیا تھا ان کا۔ ہاں ایک خنجر پھینک کے مارا۔ خیر ہوئی اس کا نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ میں اسے ڈرانے کو بلبلاتا ہوا نکلا۔ اس کی شکل کے سامنے ایک بار ہوا میں پنجا چلا دیا۔ وہ ایسا گھبرایا کہ الٹ کے پھاٹکے (سامان رکھنے کے حوض) میں جا گرا پھر کسی نے حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ اوٹ میں کھڑے ڈکراتے رہے۔ مجھ پر ٹارچوں کی روشنی پھینکتے رہے۔"

"ہاں سبھی نے دیکھ لیا۔ اچھا ہوا۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے قیدیوں کو بھی ریچھ نے زخمی کر کے پانی میں گرا دیا ہے اور کچھ ڈوب مرے ہیں تو اچھی بات ہے۔ وہ تمہیں تلاش کرنے کی تکلیف نہیں کریں گے۔"

"پر یہ بھی تو سوچو تم ان کی کشتی لے آئے ہو۔ وہ تین میں سے ایک کو یا دو کو ڈوبا ہوا سمجھ لیں ٹھیک! تینوں کو ڈوبا نہیں سمجھ سکتے۔ ایک کو تو وہ تلاش کریں گے ہی۔ سمجھے؟ ایک نے تو کشتی پانی میں گرائی اور بچ نکلا۔ اسے تو تلاش کریں گے ہی؟"

مداری ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں اور ایک بات اور ہے۔"

بولا۔ "کیا؟"

"اس ایک فراری یا دو پر فوجی افسر کے قتل کا الزام لگایا جا سکتا ہے کیونکہ کوئی فوج' کوئی عدالت اس کہانی کو نہیں مانے گی کہ چلتے ہوئے اسٹیمر پر کہیں سے ایک ریچھ آ

گیا اور ان کے افسر کو مار کے چلا گیا۔ بس یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ وہ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"ہاں نا۔ تو پھر چلو ادھر سے اٹھو۔"

ہم ساحل سے اٹھے اور ایک طرف چل پڑے۔ علاقہ مداری کا دیکھا ہوا نہیں تھا پھر رات کا وقت مگر وہ اور میں، دونوں جنگلوں کا مزاج سمجھنے والے تھے۔ کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی۔ ہم صبح کا اجالا ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتے تھے۔ اب درخت اور پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کہیں نالوں پر پلیائیں بنی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خیال ہوا کہ بستیاں بھی قریب ہی ہوں گی۔

ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ پہاڑی کے دامن میں ہمیں ایک اکیلا مکان نظر آیا۔ مداری رک کر سوچنے لگا پھر بولا۔ "اس طرف میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ جس طرح کا مکان بنا ہے خیال ہوتا ہے کوئی شکار بنگلا ہو گا۔ کیا پتا خالی پڑا ہو یا ہو سکتا ہے نہ ہو۔ اس وقت شکاری آئے ہوئے ہوں۔"

پھر بتانے لگا کہ ایسے شکار بنگلے پانی کے قریب بنتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ قریب ہی کوئی چشمہ بھی ہو گا۔ پیاؤ چشمہ، انہی چشموں کے قریب شکار بنگلے بنائے جاتے ہیں جن پر جانور پانی پینے آتے ہوں۔

میں نے مداری کی بات سے اتفاق کیا اور کہا۔ "دن میں چھپنے کے لیے ہم پہاڑی پر کوئی کنج، کوئی محفوظ سا غار تلاش کر لیتے ہیں۔ تم اور تمہاری پوتی چھپنے کی جگہ ڈھونڈو۔ میں شکار بنگلے میں گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔"

وہ بولا۔ "میں ادھر ہی کا باسی ہوں مجھے جانے دو۔ تم اور کوسومی پہاڑی چڑھ جاؤ۔"

میں نے سوچا یہ ابھی بہت تھکا ہوا ہے۔ آرام سے کوئی جگہ تلاش کر کے پڑا رہے گا۔ بنگلے تک گیا اور آیا تو اسے اور تھکن ہو جائے گی۔

میں نے سمجھایا تو مداری مان گیا کہنے لگا۔ "تم واپس آتے دکھائی دو گے تو ہم مور کی آواز کا اشارہ دیں گے۔ اگر تم پہلے دیکھ لو تو تم اشارہ دے دینا۔"

میں دونوں کو پہاڑی پر بھیج کر خود چھپتا چھپاتا شکار بنگلے کی طرف چلا۔

دور سے یہ جگہ بے آباد لگتی تھی۔ پہلے تو میں نے اطمینان کر لیا کہ بنگلے کی حفاظت پر کتے تو نہیں چھوڑے گئے ہیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو ایک بار ہر طرف گھوم کر دیکھا۔ آبادی کی سب سے بڑی نشانی دھواں ہوتی ہے۔ شکار بنگلے کی چمنی سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ نہ ہی اس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کے باڑھ پھلانگی اور بنگلے کے احاطے میں پہنچ گیا۔ برآمدے میں بید کی میز کرسیاں پڑی تھیں۔ پھولوں کے تختوں میں کچھ جنگلی کچھ شہری پھول لگائے گئے تھے۔ میں نے چھو کر دیکھا تھا وہ خشک نہیں تھے۔ ایک دو روز پہلے پانی دیا گیا تھا۔ احاطے میں ایک طرف مرغیوں کا ڈربا بنا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ چھ آٹھ مرغیاں بند تھیں۔ ان کے لیے دانہ پانی پڑا تھا۔

تو اس کا مطلب ہے بنگلہ آباد ہے۔ احتیاط کرنا ضروری ہے۔

میں نے دیکھا برآمدے میں دو دروازے کھلتے تھے۔ پچھلا دروازہ رسوئی یا کچن میں کھلتا تھا۔ یہ اندر سے بند تھا۔

خوب! آباد تو ہے لیکن اس وقت بنگلے والے موجود نہیں ہیں۔ وہ اگر صبح ہی صبح شکار کو نکلے ہوتے تو عمارت میں دھوئیں کی خوشبو بسی ہوتی۔ چولہا پچھلے چند گھنٹوں میں نہیں جلایا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ آئے ہوئے ہیں مگر رات انہوں نے یہاں نہیں گزاری۔ اس وقت کہیں مچان باندھ کر یا پانی کے پاس شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔

میں نے دیکھا صبح ہونے والی تھی۔ بنگلے والے زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر میں لوٹ آئیں گے پھر وہ کچھ کھائیں گے پئیں گے اور دن بھر سوئیں گے۔ مجھے جلدی کرنی چاہیے۔

میں تیزی سے مصروف ہو گیا۔ تالا توڑنا غلط تھا۔ ہمیں ابھی قریب ہی بسیرا کرنا ہے۔ کچھ اس طرح کارروائی کی جائے کہ انہیں کسی چور کے آنے کا شبہ نہ ہو۔ دوسری بار آنے کا رستہ کھلا رہے۔ میں نے کچن کے روشن دان کا جائزہ لیا۔ لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سلاخ کو ذرا سا ٹیڑھا کیا جا سکتا ہے پھر کام بن جائے گا۔

دس منٹ میں سلاخ کو میں نے اپنے کام کا بنا لیا۔ روشن دان میں اتنی جگہ ہو

گئی جس سے میں اندر جا سکتا تھا۔

کچن میں تازہ سبزیاں موجود تھیں۔ انڈے' چاول' آٹا دال غرض چھے آٹھ آدمیوں کا اتنے ہی دن کا راشن موجود تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کا راشن ایک فالتو تھیلے میں بھر لیا۔ شکاریوں کی ایک چادر مجھے بہت پسند آئی۔ موسم سے بچنے اور بچھانے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ چادر میں نے اٹھالی۔ برتن' ماچس' موم بتیاں' چائے' چینی اور ایک چھری نہ بھولا۔ کچن کا دروازہ کھول کر پہلے تو یہ سب سامان میں نے باہر برآمدے میں پہنچایا پھر دروازہ بولٹ کرتا روشن دان سے کود کر خود باہر نکل آیا۔

شکار بنگلے سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے ایک درمیانے سائز کی مرغی ذبح کر کے تھیلے میں پہنچادی تھی۔

دن نکل رہا تھا۔ جب میں خاموشی سے بنگلے کی باڑ پھلانگ کر باہر آیا اور میدان پار کرتا پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

پہاڑی کی ڈھلان سے مڑ کر دیکھا ہلکی نئی نویلی سنہری دھوپ میں وادی جگمگا رہی تھی پھر میں نے پہاڑی کنج سے مور کی آواز سنی۔ پہلی بار تو دھوکا کھا گیا۔ مداری نے مور کی آواز کی اتنی کامیاب نقل کی تھی کہ میں چکرا گیا۔ سمجھا یہ جنگل کا اصلی مور بولتا ہے مگر جب دوسری بار مور بولا تو میں جان گیا کہ اشارہ دیا جا رہا ہے۔

میں نے اشارے کا جواب دیا اور آواز کی سمت بڑھ گیا۔ مداری اور اس کی پوتی مجھے تھیلا اٹھائے آتا دیکھ کر خوش ہوگئے۔

ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو رہے تھے کہ مداری نے نیچے وادی میں کوئی آواز سنی یا کچھ دیکھا۔ وہ رک گیا۔ پھر درختوں کی اوٹ سے اس نے مجھے دکھایا کہ شکار بنگلے کے سامنے ایک جیپ آکر رکی ہے۔ پانچ آدمی تھکے ہارے جیپ گاڑی سے اتر رہے تھے۔

تھکے ہارے اور شاید زخمی یا بیمار۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کو جو کرکٹ ٹوپی' زرد قمیص اور سیاہ تنگ پتلون یا جینز پہنے تھا ایک دوسرا اہسنگ کوٹ والا کمر میں ہاتھ ڈالے سہارا دے کر بنگلے میں لے جا رہا تھا۔ کٹ کی ٹوپی اور زرد قمیص والا جو بیمار یا زخمی لگتا تھا کوٹ والے کی گردن میں ہاتھ ڈالے نڈھال اور سر نیہوڑائے آہستہ آہستہ بنگلے میں گیا تھا۔

ایک موہوم سا خیال پیدا ہوا کہ شکاریوں میں سے ایک زخمی یا بیمار ہو گیا ہے تو یہ لوگ اب رکیں گے نہیں۔ یہ ٹل جائیں تو ہمارے لیے شکار بنگلہ اچھی پناہ گاہ بن سکتا ہے۔

مداری اور کوسومی' اس کی پوتی ایک اچھا غار تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں بنگلے کا سامان چرانے' پوٹلیاں باندھنے میں لگا رہا تھا۔ دادا پوتی نے غار کو صاف کر کے گزارے کے قابل بنادیا تھا۔ میں نے ایک طرف لے جا کر مرغی صاف کی۔ ٹکڑے کیے اور اس کے پر وغیرہ گڑھا کھود کر دفن کر دیے۔ کوسومی نے آگ جلا کر چاول دال پکانا شروع کر دیا۔ مجھے مرغی کا گوشت لاتے دیکھ کر مداری ہنسا' بولا۔ "مرغی پکانے کے لیے تمہیں تھوڑا رکنا پڑے گا۔ برتن ایک ہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ہم لوگ شام کو کھائیں گے۔ ابھی نمک مرچ لگا کر اسے رکھ دوں گا۔ شام ہونے سے پہلے کھلی آگ پر پکا لیں گے۔"

مداری بولا۔ "تم نے یہ جو کہا کہ ہم لوگ کھائیں گے تو خان! اسے تم اکیلے ہی کھاؤ گے۔ کوسومی اور میں ماس نہیں کھاتے ہمیں کسی چیز کا بھی گوشت کھانے کا حکم نہیں ہے۔ انڈا بھی نہیں۔ دال چاول پک جائے تو یہ گوشت تم چاہے ابھی بھون لینا۔ چاہے شام کو مرضی ہے۔"

میں نے کہا۔ "حیرت ہے! جنگل کے رہنے والے گوشت نہیں کھاتے۔"

بولا۔ "ہمارے دین دھرم نے زدکا نہیں ہے پر ہم لوگ یوگی ہیں۔ مطلب یہ جو کایا بدل اور دوسری یوگ ودیا (جوگیوں کا علم) میرے گھرانے میں چلی آتی ہے اس کی وجہ سے ہمیں صرف دودھ' پھل' سبزیاں' تمباکو اور پیاز لہسن یہ سب تیز چیزیں منع ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دوسرے یوگیوں (جوگیوں) کو تو میں نے سب کھاتے دیکھا ہے۔"

کہنے لگا۔ "ہاں دوسرے کھاتے ہوں گے۔ ہمارا جان جوکھم کا علم ہے ہمیں حکم نہیں۔"

میں نے نمک مرچ لگا کے مرغی کا گوشت پتوں میں لپیٹ کے درخت کی شاخ

سے لٹکا دیا۔ تینوں نے دال چاول کھائے۔ میں چادر لے کر غار میں ایک طرف اندر جا لیٹا۔ سوچا سامنے رہوں گا تو لڑکی کوسومی کو لیٹنے بیٹھنے میں تکلف ہو گا۔

تینوں ہی تھکے ہوئے تھے' لیٹے اور فوراً سو گئے۔ دن کا وقت تھا' کیڑے کانٹے' جنگل کے جانوروں کا خوف بھی نہیں تھا۔

سو کر اٹھے تو سورج کافی اتر گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا اور ہے پھر اندھیرا اور ہماری روانگی یا بڑے میاں سے مشورہ کر لوں گا۔ وہ اگر رکنے کا کہیں گے تو سوچیں گے۔

میں اپنی چادر اٹھائے غار کے بیرونی حصے میں آیا تو دیکھا بوڑھا مداری ابھی تک سو رہا ہے۔ کوسومی' اس کی پوتی سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ مجھے پریشان لگی۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟'' بولی۔ ''بابا کو تاپ چڑھی ہے۔''

میں نے پیشانی چھو کر دیکھا بڑے میاں کو تیز بخار تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے لڑکی سے کہا کہ کپڑا پانی میں تر کر کے اس کی پیشانی پر رکھو۔

یہ بخار کی بات الجھن کی تھی۔ پہلے ممکن تھا سورج ڈوبنے پر ہم چل پڑتے۔ اب یہ ممکن نہ ہو گا۔ ہم بچ نکلے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں جہاں اسٹیمر پر فوجی افسر کو ''قتل'' کیا گیا تھا اور قیدی لاپتہ ہوئے تھے۔ فوج والے یا جو بھی بھاگے ہوؤں کو تلاش کریں گے تو یہاں قریب ہی سے کریں گے۔ خطرہ ہمارے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ بڑے میاں بخار میں پڑے ہیں مجبوراً اب یہاں رکنا ہو گا۔ بہر حال' ایسا ہو یا دوسری طرح ہو' ہمارے اختیار میں کیا ہے۔

میں نے لڑکی سے کہا کہ دن ہی دن میں کھا پی لو۔ رات کو چولہے کی آگ دور سے نظر آئے گی جو ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے مرغی تیار کی' آدھی اسی وقت ٹھکانے لگا دی' آدھی دوسرے دن کے لیے سنبھالی اور درختوں کی اوٹ لیتا' چھپتا' چھپاتا وہاں آن بیٹھا جہاں سے شکار بنگلے کی جاسوسی ہو سکتی تھی۔

ان کی جیپ باہر کھڑی تھی۔ جیپ میں پچھلی سیٹ پر کوئی تھا۔ اتنے فاصلے سے جیپ میں بیٹھا آدمی مجھے نہ دیکھ پاتا' میں البتہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوب پھیل کر بیٹھا ہوا' بلکہ نیم دراز تھا۔

بنگلے کے گیٹ سے ایک آدمی نکل کر آیا اور جیپ کی طرف بڑھا تو پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا آدمی اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اوہ ہوّ کیسا دھوکا ہوا ہے! جیپ کی پچھلی سیٹ پر ایک نہیں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک اٹھا تھا' دوسرا وہیں نیم دراز رہا تھا۔ پھر عجیب بات ہوئی بنگلے میں سے آنے والا سیٹ سے اٹھنے والے پر جھپٹ پڑا۔ دونوں دشمنوں کی طرح الجھ گئے۔ کھیل نہیں باقاعدہ لڑائی ہو رہی تھی۔

میں نے پہچانا جیپ میں جو بیٹھا رہا وہ وہی کرکٹ کیپ اور زرد قمیص والا شخص تھا جسے دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈالے سویرے آتے دیکھا تھا۔ دو کو لڑتے دیکھ کر وہ اٹھا اور بیچ بچاؤ کرانے لگا۔ بیچ بچاؤ کرانے والا یہ کٹ کا شوقین چھوٹے قد کا اور دبلا پتلا تھا۔ دونوں کی ہاتھا پائی میں اس کی کرکٹ کیپ گر گئی۔ سر سے کیپ گری تو لمبے سنہرے بال جیسے آزاد ہو کر اس کے کندھوں تک آرہے تھے۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا۔ لفظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات میں بہ خوبی سمجھ گیا۔ یہ کرکٹ کیپ والا کوئی مرد نہیں عورت یا لڑکی تھی۔

میں نے سوچا دور سے دیکھے جانے والے اس منظر کے اب تو معنی ہی بدل گئے ہیں۔ دیکھے اور پکڑے جانے کے خطرے کے باوجود مجھے اس خاموش کہانی میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

نئی کہانی اب یوں بن رہی تھی کہ شام کے سہانے وقت میں سب سے چھپ کر دو چاہنے والے جیپ کی پچھلی سیٹ پر آبیٹھے تھے اور راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ایک جان بنے لیٹے تھے یا بیٹھے تھے کہ اندر سے تیسرا نکل کر آیا اور تنہائی کی اس ملاقات میں اس نے کھنڈت ڈال دی۔

ہمیشہ کی طرح دو مردوں اور ایک عورت کی ازلی تکون بن گئی تھی۔

جی ہاں ایک چاہنے والا' دوسرا محبوب اور تیسرا رقیب۔ اب رقیب اور چاہنے والے میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی اور نازک اندام محبوبہ کو اپنے بھاری بھر کم مردوں کی جنگ بند کرانے میں الجھن کا سامنا تھا۔ دونوں میں سے کوئی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

ان کے چیخنے کی آوازیں اوپر ہماری پہاڑی تک پہنچ رہی تھیں۔ شکار بنگلے سے باقی کے دو ساتھی بھی نکل آئے تھے۔ انہوں نے لڑنے والوں کو الگ الگ کر دیا۔ زرد

قمیص سے سیاہ جینز والی عورت اپنے سنہرے بال جھٹکتی' زمین پر پڑی کرکٹ کیپ اٹھا کر تیز چلتی ہوئی بنگلے میں داخل ہو گئی۔ چاروں مرد باہر ہی رہے۔ یہ چاروں ہاتھ ہلا ہلا کر کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ عورت نے بنگلے میں روشنی کر دی تھی اور اونچی آواز میں ریڈیو بجانا شروع کر دیا تھا۔ بیٹری جان دار ہو گی۔ فلمی گانوں کے پروگرام کی زوردار آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ ان کی آپس کی لڑائی اور بے زاری نے خاموش وادی کو شہر کا شور و غل دے دیا تھا۔

میں نے سوچا اب جب کہ شکاریوں میں سے دو لڑ پڑے ہیں تو ہو سکتا ہے یہ لوگ اپنا قیام مختصر کر کے جلد لوٹنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس میں میرے لیے ایک اور الجھن تھی۔ ذہن میں ایک منصوبہ بن رہا تھا۔ جو یہ تھا' شکاری ابھی رات کے شکار پر روانہ ہوں گے' سویرے تھکے ہارے آئیں گے اور حسب معمول کھا پی کر سو جائیں گے۔ یہ ایسا وقت ہو گا کہ میں ان کی جیپ قبضے میں کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے چل دوں گا لیکن اب جو یہ گھروں کو لوٹ رہے ہیں تو اچھی خاصی جنگل میں آئی ہوئی جیپ سمجھو ہاتھ سے گئی۔

زندہ رہنے کے لیے مسلسل اور تیزی سے منصوبہ بندی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ لوگ رکیں یا چلے جائیں میرے بے تاب ذہن نے دونوں صورتوں کے لیے دو منصوبے بنا لیے تھے۔

کچھ دیر اور میں وہاں چھپا بیٹھا رہا پھر جب سارے شکاری اندر بنگلے میں چلے گئے تو مداری کی حالت کا جائزہ لینے میں بھی غار کی طرف آ گیا۔ بوڑھے مداری کی بے چینی کم ہوئی تھی بخار شاید اتنا ہی تیز تھا۔ میں نے کوسومی سے کہا کہ وہ اسے تھوڑی چائے بنا کر پلائے اور میں خود شکاریوں کی جاسوسی کرنے جھاڑیوں' درختوں کی اوٹ میں آ بیٹھا۔

ان کا ریڈیو بجنا بند ہو گیا تھا اور بنگلے کے باہر ایک سرگرمی سی نظر آ رہی تھی۔ وہ ٹارچیں اٹھائے آتے اور جیپ میں کچھ نہ کچھ رکھ کر چلے جاتے۔ آدھے گھنٹے تک وہ اسی طرح آتے جاتے رہے پھر بنگلے کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ وہ ہجوم بنا کر ریڈیو بجاتے ہوئے آئے اور جیپ پر سوار ہو گئے۔ یہ ان کی واپسی کی روانگی بھی ہو سکتی تھی اور یوں

بھی ہو سکتا تھا کہ شکاری رات بھر مچان پر بیٹھنے کے لیے جا رہے ہوں' صبح لوٹ آئیں۔

مجھے بڑے میاں کی طرف سے پریشانی تھی۔ دوا دارو کرنی ضروری تھی۔ میں نے سوچا اگر اسپرین کی دو چار ٹکیاں شکار بنگلے سے حاصل ہو جائیں تو یہ پریشانی دور ہو۔ عام طور پر شکاری اور پکنک کرنے والے فوری ضرورت کے لیے ٹنکچر آیوڈین' اسپرین' بام' ہاضمے کی دوائیں تو ساتھ رکھتے ہی ہیں۔ بنگلے سے سب شکاری جا چکے ہیں اگر میں مداری کے لیے اسپرین اور کوئی فالتو کمبل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بڑے میاں کی حالت میں کوئی بہتری ضرور آئے گی۔ ذہن سے بڑا بوجھ اتر جائے گا۔

میں نے کوسومی کو بتا دیا کہ میں اس کے بابا کے لیے کوئی دوا چرانے جا رہا ہوں۔

دوسری بار بنگلے میں گھسنا پہلی بار سے مختلف تھا۔ پہلے آیا تھا تو یہاں ٹھہرنے والوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اب کئی قسم کی خوشبوئیں' پکے ہوئے کھانوں' عطر اور سینٹ کی' پھلوں' پھولوں اور کریموں کی یہاں گردش کر رہی تھیں۔ یہاں ٹھہرے ہوئے لوگوں کے مشغلوں کی خبروں سے شکار بنگلہ بسا ہوا تھا۔ انہوں نے بھنا ہوا گوشت' پیاز اور سرکہ کھایا تھا۔ شرابیں پی تھیں۔ یہاں پھولوں کی خوشبوئیں تھیں' ارمانوں بھرے سبک ولایتی سینٹ کی مہک تھی۔ شکار بنگلے کی یہ چھوٹی سی دنیا اس وقت دولت مندوں کے مشغلوں کی خبروں سے آباد تھی۔

میں نے باڑ پھلانگ کر اندر کا جائزہ لیا۔ وہ لوگ کہیں ایک دھیمی روشنی والا لیمپ جلا کر چھوڑ گئے تھے۔ میں فوری طور پر معلوم نہ کر سکا کہ کہاں مگر کسی ایک کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

اس کا مطلب ہے وہ بالکل ہی نہیں گئے۔ شکار کھیلنے گئے ہیں۔ لوٹ آئیں گے۔

پہلے کی طرح میں کچن کے روشن دان سے داخل ہوا۔ اندر کی سٹکنی کھول کر کچن سے ملے ہوئے غسل خانے میں جا نکلا۔ غسل خانے میں دواؤں کی کوئی الماری نہیں تھی۔ اب یہی رہ گیا تھا کہ پہلے ایک پھر دوسرے بیڈ روم میں تلاش کیا جائے۔

بیڈ روم میں جانے کے لیے میں نے غسل خانے کا دوسرا دروازہ کھولا اور دہلیز پار کی۔ میں بیڈ روم میں تھا۔ شکار پارٹی والے اسی بیڈ روم میں روشنی کر گئے تھے۔ ڈبل بیڈ سے ملی سائڈ ٹیبل تھی جس پر اونچی چمنی والا کیروسین لیمپ جل رہا تھا۔ کمرے میں سناٹا

تھا۔

مگر کمرے میں سناٹا نہیں تھا۔ بستر پر کوئی سو رہا تھا۔

میری تو جیسے جان نکل گئی۔ بستر پر گرے رنگ کی چادر پڑی تھی۔ چادر کے نیچے کوئی آسائش کے ساتھ ہولے ہولے خراٹے لے رہا تھا۔ کسی کے سنہرے گھنے بال تکیے پر ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔

یہ یقیناً وہی کرکٹ کیپ والی لڑکی تھی جس پر دو شکاریوں میں چند گھنٹے پہلے لڑائی ہو چکی تھی۔

میں نے خاموشی سے کمرے سے نکل جانا چاہا میں مڑا ہی تھا کہ چادر میں ہلچل مچی اور کسی نے گہری مردانہ آواز میں پوچھا۔ "کون؟" مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ تو یہ مرد کی آواز تھی ____ اور میں نے ابھی سنہری بال دیکھے تھے؟

میں نے گھوم کر بستر پر نظر ڈالی۔ مجھ سے دوسری بار وہی غلطی ہوئی تھی۔ یہاں ایک نہیں دو انسان تھے۔ سنہری بالوں والی عورت اور گہری گونجیلی آواز والا مرد۔

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اب کیا ہو سکتا ہے ____" پھر میں نے شاید دل ہی دل میں کہا تھا کہ بس مارے گئے شیر خان۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے دہرایا۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔

مرد نے گھبرا کر عورت کو جھنجوڑ ڈالا' بولا۔ "جوہی! یور ہائی نس! اٹھو! ہم پکڑے گئے۔"

"آں؟" عورت نے جیسے سرشاری میں سوال کیا۔ وہ بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

مرد کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "اٹھو ہم پکڑے گئے! وہ آ گئے سالے۔"

عورت ہلکی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ وہ چادر سے باہر آئی تو مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ مرد برابر چادر میں چھپا بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے بھی بیڈ کے برابر فرش پر پڑے تھے۔ عورت پھر چادر میں چلی گئی تھی۔

"جاؤ۔ آؤٹ! چلو' نکلو یہاں سے۔" عورت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بری

ل رہی تھی لیکن ایسے جیسے گورے لوگ دیسی زبانیں بولا کرتے ہیں۔

میری سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ میں چوری کرنے آیا تھا' پکڑا گیا تھا مگر وہ رد کہہ رہا تھا۔ "ہم پکڑے گئے۔" عورت گھبرا گئی ہے اور گھبرا گھبرا کر جیسے التجا کی جاتی ے اس طرح مجھ سے نکل جانے کو کہہ رہی ہے اور وہ اونچے طبقے کی ہے۔ مرد نے اسے پہلے جوہی کہہ کر پکارا تھا پھر یور ہائی نس کہا تھا' تو کیا وہ کہیں کی شہزادی یا رانی ہے؟

کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کہیں کوئی بہت زبردست گڑبڑ ہے۔ اور گڑبڑ سے نمٹنے ایک ہی صورت تھی کہ میں ان دونوں کو اور گڑبڑا دوں۔

پہلے میں نے ایک بے معنی جملہ کہا تھا۔ دوبار کہا تھا۔ اس دفعہ میں نے وہی لہ دھمکاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں یور ہائی نس! اب کیا ہو سکتا ہے۔" جملے میں یور ہائی نس ھا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"پلیز ایک منٹ۔" عورت نے ایک کھلی بانہہ چادر سے نکالی۔ "ہمیں ایک نٹ دو ____ بات کرو ____ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم سے بات کرو۔ پلیز۔"

میں نے انہیں ایک منٹ دیا مگر وہیں جما کھڑا رہا۔ میں چور نہیں تھا۔ چور وہ ونوں تھے۔ وہ مجھ سے ایک منٹ مانگ رہے تھے۔ خیر ایک منٹ تو کہنے کی بات تھی۔ دو ین منٹ میں وہ چادر سے باہر آنے کے قابل ہوئے۔

عورت اسی زرد مردانہ قمیص اور جینز میں ملبوس ہو گئی۔ مرد جو ان دو لڑنے الوں میں سے کوئی ایک تھا شکاری کپڑوں میں بھی کوئی خاص بھاری بھر کم نہیں لگتا تھا مگر زک اندام عورت کے مقابلے میں بہرحال ایسا تھا جیسے ہرن اور چیتا ایک ساتھ پلنگ ے اتر رہے ہوں۔

وہ دونوں میرے سامنے پڑے صوفے پر ٹک گئے۔ انداز ایسا تھا جیسے ہیڈ ماسٹر کے سامنے دو شریر طالب علم بیٹھے ہوں۔

میں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔ اپنی آنکھیں شعلہ بار تو نہیں اہم کچھ ناراض کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے گھور کر دیکھا اور کہا "ہوں۔"

یہ "ہوں" اور "ہاں" اور "اچھا" ایسے لفظ ہیں جو درجنوں معنی دے سکتے ہیں۔

عورت نے کھسیا کر جبراً ہنستے ہوئے کہا۔ آل رائٹ! یہاں تم بھی ہو اور ہم بھی

ہیں۔"

میں نے نفرت سے اس کے مرد کی طرف دیکھا۔ "مگر ہائی نس! مجھے یہاں ہو
بالکل پسند نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" آواز سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صورتحال پر قابو پاتی جا رہی
ہے، بولی۔ "سمجھتی ہوں، تم وفادار ہو اور پرانے روایتی خیال کے لڑکے ہو ____ یہ کوئی
بری بات نہیں ____ بالکل نہیں مگر یہ بھی تو دیکھو، میں یہاں کی نہیں ہوں۔ میری دنیا
بالکل دوسری دنیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں، صرف آپ کی دنیا میڈم اس کیچوے کی نہیں۔ یہ تو اس
بدبودار دلدل سے اٹھا ہے اور رینگتا ہوا آپ کی بانہوں میں آ گیا ہے۔" یہ فقرہ میں نے
کسی انگریزی فلم میں سنا تھا، اسے یہاں آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بس میں نے
استعمال کر لیا۔

عورت نے ہاں میں سر ہلایا، اپنے مرد کی طرف دیکھ کر مسکرائی، مجھ سے کہنے
لگی۔ "اس پر زیادہ سختی مت کرو لڑکے، تم نے سمجھا اور معاف کیا تو اسے بھی معاف کر
دو۔" پھر وہ ہنسی۔ بولی۔ "بہرحال اسے میں نے چنا تھا ____ اپنے چھوٹے سے کھیل کے
لیے یہ خود سے آنے کی تو جرات نہیں کر سکتا تھا۔"

مجھے یاد آیا کہ حقیر ملازم نے۔ یہ نمک حرام ملازم ہی ہو گا۔ عورت کا نام جو
تو لیا تھا۔ اسے جو ہی کہا تھا۔ اس نے یہ جرات تو کی تھی۔

میں نے یہی بات کہہ دی اس سے کہا۔ "یور ہائی نس! اس نے نام لیا تھا۔ آ
کو جو ہی کہہ کر بلایا تھا۔"

"جو ____ ہی؟ او! یس! یہ غلط کیا تھا۔"

میں نے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر سوال کیا۔ "جو ہی کہنے کا حق اسے کب
مل گیا؟" یہ میں نے سوال کیا تھا اور دل ہی دل میں خود اس کا جواب بھی دے دیا تھا
جب سے اسے بستر پر آنے کا حق ملا۔"

وہ بولی۔ "حق؟ ہاں اسے یہ حق نہیں ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو لڑکے!"

وہ نہ صرف رانی یا پرنس ہونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی بلکہ مجھ پر اپنی عمر کا رع

ی جھاڑ رہی تھی۔

میں نے چہک کر روکھے پن سے کہا۔ "اگر ہائی نس یہ "لڑکے لڑکے" کی تکرار
ریں تو مہربانی ہو گی۔"

"او کے! او کے۔ تم بتاؤ اب کیا کریں ہم؟"

"مجھے نہیں معلوم آپ کیا کریں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے
کرنا ہے۔"

مرد نے جو ابھی تک منہ کھولے کبھی میری صورت اور کبھی اپنی گوری محبوبہ
صورت دیکھ رہا تھا۔ میری بات سن کر کسی سزا دیے جاتے پلے کی طرح بے چارگی میں
وں" کی سی آواز نکالی۔ عورت نے اس کا گھٹنا تھپک کر اسے پرسکون کیا مجھ سے بولی۔
بتاؤ تمہیں ہز ہائی نس دی پرنس کیا دیں گے؟"

میں سمجھ گیا وہ رقم کی بات کر رہی ہے اور ہز ہائی نس دی پرنس اس کا میاں ہو
ظاہر ہے مجھے خبر نہیں تھی کہ ہز ہائی نس دی پرنس وہ جہاں بھی ہے، کسی کو کیا دیتا
۔ میں نے بس روایتی وفاداری کی طرح ہاتھ لہرا کر کہہ دیا۔ "آپ پوچھتی ہیں ہز ہائی
ادی پرنس اپنے اس غلام کو کیا دیں گے؟ تو سنئے ہز ہائی نس کے ایک بار شاباش کہہ
ے سے ہی مجھے دنیا جہاں مل جائیں گے۔"

مرد بڑبڑایا۔ "مجھے پتا ہے یہ سالے اتنے ہی وفادار اور پاگل ہوتے ہیں۔"

عورت نے اسے ڈانٹا۔ "شٹ اپ!" مجھ سے بولی۔ "میں تمہارے پرنس کی
تمہاری دوست، تمہیں شاباش بھی کہوں گی اور یہ بھی دوں گی۔ ____ لو۔" اس نے
جھک کر اپنی جینز کی بیک پاکٹ سے ایک مردانہ پرس نکالا اور اس میں ٹھسی نوٹوں کی
گڈی میری طرف اچھالی۔

کرکٹ کے اچھے کھلاڑی کی طرح میں نوٹوں کی اس گڈی کو ہوا ہی میں جھیل
تا مگر میں نے اسے اپنے پیروں کے پاس دری پر گر جانے دیا۔

اس بات سے عورت اور اس کا لیچڑ محبوب دونوں ہی حیران ہوئے۔ مرد نے
بار عورت کی طرف دیکھا اور مایوسی میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھا میں پہلے ہی
تھا

عورت مجھے رشوت دے رہی تھی۔ پہلے کسی دوسرے نے رشوت دی تھی اور مجھے اس منحوس جگہ جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا اس بے وفا یا پرنس سے۔ وہ جو بھی ہے اس سے یہ رقم لے کر میں جگہ جگہ لوگوں کو کھلاتا' خوش کرتا نکل سکتا ہوں۔ اپنی آزادی خرید سکتا ہوں۔

دماغ نے کہا۔ ہاں اس وقت رشوت ہی کا سکہ چل رہا ہے۔ لے لو اور اپنی جان بچاؤ۔"

عورت نے جو میری خاموشی سے بے چین ہو رہی تھی اور میری صورت تکے جا رہی تھی۔ التجا کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو' نوجوان؟"

میں نے جواب میں ایک اور بے معنی جملہ کہا۔ "تو یہ ہے!"

عورت بولی۔ "یہ اگر کم ہے تو میں گڑھی پہنچ کر اور بھی بہت کچھ دوں گی تمہارا عہدہ بڑھا دوں گی۔"

میں نے مشاق رشوت خوروں کی طرح کہا۔ "میڈم! گڑھی تو بہت دور ہے۔"

بولی۔ "آئی سی! اچھا سمجھ دار آدمی ہو تم۔ تم چاہتے ہو میرا تمہارا گڑھی میں سامنا ہو تو میں تمہیں نہ پہچانوں؟ سینکڑوں ملازموں' وردی پوش نوجوانوں میں کسی ایک میں کیسے پہچان سکتی ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو آج کے بعد میں تمہیں بھول جاؤں۔"

میں نے کہا۔ "میں بالکل یہی چاہتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی۔"

وہ سمجھی میں سودے بازی کر رہا ہوں۔ ان نوٹوں کے علاوہ بھی طلب کر ہوں۔

کہنے لگی۔ "اچھا؟ اس کے علاوہ؟___ تو یہ لو۔" اس نے اپنی گردن میں جھلملاتا سبک ہار اتار کر میری طرف پھینکا۔ درجنوں چھوٹے چھوٹے ہیرے اس جڑے تھے۔ میں نے لاپرواہی سے ایک ہاتھ بڑھا کر اسے جھیل لیا۔

عورت اٹھی۔ سائڈ ٹیبل تک گئی۔ دراز کھینچی اور جھلملاتا ایک بھاری ہیرے جڑا بریسلیٹ نکالا۔ وہ ہار کے مقابلے میں سو گنا قیمتی لگتا تھا۔ اس نے وہیں بریسلیٹ میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے بھی کیچ کیا۔

وہ ہنسی کہنے لگی "بریسلیٹ ملنے کے بعد تمہیں اور تمہاری اگلی تین چار پشتوں

یہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی___ او کے؟"

میں نے جھک کر اپنے پیروں کے پاس پڑی نوٹوں کی گڈی بھی اٹھا لی اور اطمینان کے ساتھ کہا" "جی یور ہائی نس!" اور پھر میں دروازے کی طرف چلا۔

بستر پر بیٹھے ہوئے اس ہائی نس کے پالتو نے نفرت کی سرگوشی میں ایک لفظ کہا'

"سالا!"

اور میں گھوم گیا۔ "کیچوے! اپنا گندہ منہ بند رکھ نہیں تو پتلون کھینچ کر لے جاؤں گا تیری۔"

عورت اس نمک حرام کی طرف غصے میں گھوی تھی' "ناہر سین! تم اپنی چونچ بند نہیں رکھ سکتے؟"

ناہر سین ہنٹر کھاتے ہوئے پلے کی طرح سکڑ سمٹ کر' سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے ہر ہائی نس کو خبردار کیا۔ کہا' "میڈم! اس لدھے کو میرے پیچھے مت آنے دینا۔ باہر میرا ڈرائیور کھڑا ہو گا۔ اگر اس نے اس کی منحوس شکل دیکھ لی تو آپ کا اور میرا کانٹریکٹ ختم سمجھئے۔ میرا ڈرائیور ہز ہائی نس دی پرنس کو خبر کیے بغیر نہیں رہے گا وہ میری طرح "سمجھ دار" نہیں ہے۔"

عورت بولی۔ "فکر مت کرو اینڈ گڈ بائی!"

میں کمرے کی سٹکنی کھول کر برآمدے میں نکل آیا۔

عورت اور اس کا یار سوچتے رہ گئے ہوں گے کہ یہ غسل خانے سے بیڈروم میں آیا تھا مگر غسل خانے میں کس طرح آیا ہو گا؟

وادی کے اندھیرے سے تیز رفتار شکاری جانور کی طرح گزرتا ہوا چند ہی منٹ میں اپنی عارضی پناہ گاہ میں آ گیا مگر میں بنگلے سے اسپرین لیے بغیر آیا تھا۔

لیکن ذرا سوچئے' میں جو لے کر آیا تھا وہ بھی تو دوا تھی۔ بلکہ وہی اصل دوا تھی۔

اس وقت مجھے مداری کا بخار ہلکا لگا۔ وہ آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ میں نے حال پوچھا تو بولا۔ "بخار کم ہوا ہے۔"

بخار واقعی کم ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک اور چادر اڑھا دی تاکہ خوب پسینہ

آئے۔

مداری مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کہاں گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "جائزہ لے رہا تھا۔ بچ نکلنے کی ایک صورت سمجھ میں آئی ہے۔"

"بولا۔ کیسی؟"

میں نے کہا۔ "بتادوں گا۔ ابھی سو جاؤ۔" وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔

پچھلی رات کے مقابلے میں ہم نے یہ رات زیادہ آرام سے گزاری۔ دن نکلنے سے کچھ دیر پہلے شکاری لوگ آئے، کچھ دیر رکے، جانے کی تیاریاں کرتے رہے اور اجالا پھیلتے ہی سوار ہوئے اور نکل گئے۔ میں نے چار شکاریوں اور پانچویں ان کی ہرہائی نس کو جیپ پر سوار ہوتے وقت اچھی طرح گن لیا تھا۔ شکار بنگلے میں اب کوئی نہیں تھا۔

میں نے شکار بنگلے کا ایک دورہ اور کیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ لوگ ہمارے مطلب کی کیا کیا چیزیں چھوڑ گئے ہیں۔

جاتے ہوئے انہوں نے مرغیوں کا ڈربا کھول کر بچی ہوئی مرغیاں آزاد کردی تھیں۔ وہ اب کمپاؤنڈ میں دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ بہت مشکل سے دو میرے ہاتھ میں آئیں۔ جنہیں ذبح کر کے میں نے صاف کیا اور راشن کے ساتھ باندھ لیا۔ کچھ بسکٹ، خشک میوے، پاؤڈر دودھ اور ایسا ہی ہلکا تیار راشن بھی ہاتھ آیا تھا۔ ایک بیڈ روم میں مجھے پرانا سا ہینڈ بیگ پڑا ملا جو پتا نہیں وہ بھول گئے تھے یا فالتو سمجھ کے پھینک گئے تھے۔ ہینڈ بیگ خالی نہیں تھا۔ یہ ہمارے لیے خزانے کا تھیلا ثابت ہوا۔

ہم تینوں کے کپڑے ایسی ابتر حالت میں تھے کہ اگر اس حلیے میں آبادی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تو لوگ ہمیں جیل سے بھاگا ہوا سمجھ کر پولیس کے حوالے کر سکتے تھے۔ شکاریوں کے چھوڑے ہوئے ہینڈ بیگ میں الم غلم کے علاوہ دو جوڑی ٹھیک ٹھاک کار آمد پتلونیں جرسیاں نکل آئیں۔ ہز ہائی نس کی ایک فالتو جینز جسے آسانی وہیں مرمت کیا جا سکتا تھا اور ایک نیا بلاؤزر دوسرے کپڑوں کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں پڑے مل گئے۔ یہ کپڑے ذرا سی محنت کے بعد کوسومی کے کام آ سکتے تھے۔ بس ذرا ڈھیلے تھے۔

یہ سب چیزیں میں نے مال غنیمت سمجھ کر چادر میں باندھیں اور غار میں آ گیا۔ دیکھا کہ مداری کا بخار اتر گیا ہے ناشتے کے بعد وہ کافی چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ غار میں ادھر ادھر ٹہلتا جاتا تھا اور بار بار مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ اب سفر کے قابل ہے مگر اسے کچھ اور آرام دینا ضروری تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ دن کا وقت غار میں پڑے رہ کر گزارا جائے اور شام ہوتے ہی سفر شروع کر دیا جائے۔

مداری نے دن کا وقت آرام کرتے ہوئے اپنی طاقت بحال کرنے میں گزارا۔ میں چادر اوڑھے پڑا رہا اور آگے کے سفر کے منصوبے بناتا رہا۔ میں نے مداری کو بتا دیا تھا کہ شکاریوں سے بہت بڑی رقم ہاتھ آئی ہے۔ وہ تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ تفصیل مت پوچھو۔ بس ہماری تقدیر اچھی ہے کیونکہ اتفاق سے مجھے وہ بات معلوم ہو گئی ہے جو کسی اور کو معلوم ہو جاتی تو شکاری مارے جاتے۔ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کی قیمت دی ہے۔ میں ویسے بھی خاموش رہتا۔ اب انہوں نے اتنی بڑی رقم دے دی ہے تو بالکل خاموش رہوں گا۔ تمہیں بھی نہیں بتاؤں گا اور میں نے کہا۔ "یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ ہم کسی بڑے شہر میں پہنچ کر بہت بڑا مکان خرید کر بہت سے آدمی ملازم رکھ کے باقی عمر دولت مند برمیوں کی طرح گزار سکتے ہیں۔ اگر برما سے باہر نکلنا چاہیں تو خود اپنا ہوائی جہاز خرید کر جا سکتے ہیں۔ اب سرحدوں پر پیدل بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بڑے میاں حیران ہو کر میری صورت دیکھتے رہے۔ آخر مسکرا کر چپ ہو گئے۔

مداری کو یہ تو پورا یقین تھا کہ مجھے "کچھ" رقم ملی ہے باقی وہ سمجھا کہ میں اسے خوش کرنے کو مسخراپن کر رہا ہوں۔

شام سے پہلے ہم نے کھاپی کے تیاری کر کے اپنے مختصر راشن اور سامان کے ساتھ سفر شروع کر دیا۔ ہم تینوں آدمی شہریوں کے کپڑے پہنے کسی سڑک، سواری، کسی بستی کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ اب ہم نے لوگوں کو سنانے کے لیے ایک کہانی بھی گھڑلی تھی۔

کہانی یہ تھی کہ بڑے میاں برما کے بڑے جاگیردار ہیں۔ میں ان کا بیٹا اور کوسومی ان کی بہو ہے۔ ہم لوگ لڑکی کے میکے جانے کے لیے اپنی گاڑی میں نکلے تھے۔ گاڑی میں آگ لگ گئی۔ ڈرائیور زخمی ہو گیا۔ وہ جنگل میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کی امید کم ہے۔ ہم کسی بستی، کسی سواری کی تلاش میں نکلے اور اب بھٹک گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کدھر جائیں۔

مجھے اور کوسومی کو میاں بیوی بتانا ضروری تھا کیوں کہ برما کے سرحدی علاقوں میں نوجوانوں کی دیر سے شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں چودہ برس کا لڑکا اور بارہ برس کی لڑکی آئیڈیل جوڑا ہوتا ہے۔ ہم دونوں کو میاں بیوی نہ بتایا جاتا تو رستے میں ملنے والا ہر آدمی یاد رکھتا کہ دو "بڑی عمر کے" لڑکا لڑکی بیاہ شادی بغیر ایک مشتبہ بڈھے کے ساتھ گھومتے پھر رہے ہیں۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

یہ کہانی مقامی حالات میں بہت آسانی سے باور کی جانے والی اور جلد بھلا دی جانے والی تھی۔ ظاہر ہے ہم چاہتے تھے کہ ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد نہ رکھا جائے۔

آدھی رات گزرنے تک ہم نے کافی رستہ طے کر لیا مگر رستہ تو وہ ہوتا ہے جو کہیں پہنچاتا ہے ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہم اب تک کہاں پہنچ چکے ہیں اور آگے کہاں پہنچیں گے۔

O

ہم بھٹک گئے تھے مگر شاید خانہ بدوشوں میں ایک حس دیہاتیوں اور شہریوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ مداری کو پورا یقین تھا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم کسی قصبے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے شہر کو سڑک کہیں نکلتی ہو۔

رات آدھی ہوئی تو ہم نے درختوں سے گھری ایک کھلی جگہ میں آرام کیا۔ کھایا پیا اور پھر چل پڑے۔

بڑے میاں کا اندازہ صحیح نکلا۔ صبح ہونے والی تھی جب ہمیں کسی بستی کی نشانیاں دکھائی دیں۔ ساری رات چلتے گزری تھی روشنیاں دیکھ کر ہاتھ پیروں میں جیسے جان آ گئی۔ گھنٹے بھر بعد جب دن پوری طرح نکل آیا ہم ایک قصبے میں داخل ہو گئے۔

بوڑھے نے کہیں قصبے کا نام لکھا دیکھا تو کھل اٹھا کہنے لگا۔ "اب سمجھ میں آ گیا کہ ہم کہاں ہیں۔ دارالحکومت رنگون جانے کے لئے یہاں سے ایک سڑک نکلتی ہے۔ رنگون جانے والی کوئی پبلک بس بھی یہاں سے ضرور گزرتی ہو گی۔ ویسے اس سڑک پر موٹر گاڑیوں کا بارہ چودہ گھنٹے سے زیادہ کا سفر نہیں ہو گا۔ کوئی بس پکڑ لیں گے اگلے دن رنگون میں بیٹھے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "رنگون جانے کے لئے بے شک یہی سڑک استعمال کریں گے مگر پبلک بس کو بھول جاؤ۔ ہمارے پاس بہت پیسا ہے۔ ٹیکسی کرائے کی گاڑی کچھ کر لیں گے۔ کرائے پر نہ ملی تو خرید لیں گے یہاں رکو "آرام کرو، دن کا وقت کھا پی کے اور سو کے گزارو۔ ابھی ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرو۔"

مداری کہنے لگا کہ ہوٹل، کرائے کے کمرے، مکان یہ سب شاید یہاں نہیں ملیں گے۔ ہم پہلے کسی دودھ کی دکان یا چائے خانے میں رکیں گے وہاں کھا پی لیں گے اور پوچھ تاچھ کر لیں گے۔

ہم نے ایسا ہی کیا۔ چھوٹے سے بازار کا واحد چائے خانہ چھوٹا ہی تھا نیا کھلا تھا

ابھی پوری طرح چلا بھی نہیں تھا۔ مالک اناڑی سا لگتا تھا۔

ہم پہنچے' ہم نے یہ ظاہر کیا جیسے کسی ہمدرد مسافر نے اپنی گاڑی میں یہاں پ
چھوڑ دیا ہے۔ باقی کہانی وہی سنائی انجن میں آگ لگنے والی۔

میں نے چائے خانے والے سے پوچھا۔ "یار یہ بتاؤ ہمیں کچھ دیر آرام کرنے
جگہ مل جائے گی؟"

کہنے لگا۔ جگہ تو مشکل ہے۔

میں نے کہا جگہ کو چھوڑو اچھا یہ کہو رنگون جانے والی تیز رفتار سواری کہاں
ملے گی۔

وہ کہنے لگا۔ "بس ملتی ہے ایک دن چھوڑ کے چلتی ہے۔ شام میں آتی ہ
گزرے دن آئی تھی۔ اب کل آئے گی۔"

"کوئی اور سواری؟"

وہ بولا۔ 'تم لوگ کھا پی لو گے تو میں جگہ بتا دوں گا۔ یہاں ایک ٹھیکے دار
جیپیں کرائے پر چلاتا ہے اس سے بات کر لینا۔" پھر سوچ کر کہنے لگا۔ "گاڑی چڑھنے
پہلے کچھ دیر اگر آرام کرنا چاہو تو میرا اپنا گھر ہے۔ ایک فیملی تو آرام سے ٹھہر سکتی
وہیں آرام کر لینا۔ تھوڑے سے پیسے دینا پڑیں گے۔"

آدمی ہشیار تھا ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے کھانے کو تو دو۔ خیر ہم نے چاول
مسالے دار تازہ روٹی اور صبح ہی صبح توڑی گئی فوری طور پر پکائی ہوئی سبزی کا ناشتا کیا۔
نے دودھ' کسی نے چائے پی۔ میں نے ناشتے کے پیسے اور بھر مٹھی ٹپ دیا چائے خانے
خوش ہو گیا کہنے لگا۔ "آؤ جیپ والے ٹھیکیدار کے پاس میں تمہیں خود لے چلتا ہوں۔"

بڑے میاں اور کوسومی کو چائے خانے میں بیٹھا چھوڑ کر میں چائے والے
ساتھ ٹھیکے دار کے پاس پہنچا۔ وہ کوئی بہت فضول سا آدمی تھا۔ پہلے گول مول باتیں
رہا مگر جب چائے والے نے شرم دلائی لعن طعن کی تو بولا کی چار جیپیں ہیں میرے
تین بھاڑے پر گئی ہوئی ہیں' ایک کا انجن کھول رکھا ہے دو روز میں تیار ہو جائے
انتظار کرو' دے دوں گا۔

چائے خانے والے نے کہا۔ "اسے چھوڑو" آجاؤ میں کچھ اور بندوبست کرا
گا۔"

وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ بھرے بازار میں تیسری منزل پر دو کمروں اور ا

ن والا گھر تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ گھر میں دو باتھ روم تھے اور بری بات یہ تھی کہ
وئی خالی نہیں تھا۔ دونوں کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ ہاں دالان میں ایک بھاری پردہ
ر اس نے ایک بستر' میز اور تین چار کرسیاں ڈال دی تھیں۔ کہنے لگا۔ "کبھی دونوں
ے کرائے پر اٹھ جاتے ہیں تو میں اپنے لیے یہ انتظام کر لیتا ہوں۔ اکیلا تو آدمی ہوں۔
ن 'بستر' میز' کرسی یہ تم سنبھالو۔ میں تو دن بھر چائے خانے میں رہوں گا۔ تم لوگ
م کرو۔ رات کا پھر رات میں سوچیں گے۔ سمجھے آرام کرو۔ یہاں ٹھہرنے کا تم سے
نہیں لوں گا۔"

ہم نے کہا۔ 'نہیں تمہیں لینا پڑے گا۔ یہی مہربانی کیا کم ہے کہ جگہ دے رہے
"

دونوں کمرے اندر سے بند تھے۔ اس نے بتایا چھ سات امریکن آئے ہوئے
شریف لوگ ہیں اور بڈھے بھی ہیں۔ یہاں سے چھ کوس پر کوئی پرانا مندر ہے۔
دن سے اس کی تصویریں کھینچ رہے ہیں' فلم بنا رہے ہیں پتا نہیں اور کتنے دن ٹھہریں
مجھے ابھی پندرہ دن کے ایڈوانس پیسے دے دیئے ہیں پھر وہ بتانے لگا کہ یہ لوگ
ں صرف سونے اور نہانے دھونے آتے ہیں۔ کھانا پکانا سب ایک بڑی بس جیسی ہے
میں کرتے ہیں۔ یہاں کا پانی بھی نہیں پیتے۔ سب کچھ بس میں بھر کے لائے ہیں۔

کہنے لگا۔ "وہ بس ادھر ہی مندر کے پاس کھڑی ہے۔ یہاں سے وہاں جیپوں
آتے جاتے ہیں۔ ٹھیکے دار کی دو جیپیں انہوں نے ہی کرائے سے لی ہیں۔ جبھی وہ لعنتی
می ترچھی باتیں کر رہا ہے۔ ان سے خوب پیسے جو کما رہا ہے۔"

میں نے سوچا پیسے تو خیر تو بھی کما رہا ہے بھائی مگر آدمی تو ٹھیک ہے۔ چھچھورا
نہیں کر رہا۔

وہ ہم تینوں کو پردہ پڑے دالان میں چھوڑ کر اپنا چائے خانہ سنبھالنے چلا گیا۔

دوپہر تک ہم دالان میں پڑے آرام کرتے رہے۔ چار بڈھے امریکن' دو مرد'
ورتیں تقریباً ایک جیسے پھول دار نیکر' جرسیاں پہنے ان دو کمروں سے نکل کر آئے اور
ہم تینوں کو ہائی ہیلو کہہ کر مسکراتے ہوئے نہانے دھونے چلے گئے پھر آئے تو
اتے ہاتھ ہلاتے بازار میں اتر گئے۔ میں نے جھانک کر دیکھا نیچے جیپوں کا وہی ٹھیکے دار
ک جیپ لیے کھڑا تھا۔ بڈھے امریکن اترے تو وہ اونچی آواز میں انہیں گڈ مارننگ کہتا ہوا
ے بڑھا۔ وہ اس وقت اپنی پوری بتیسی دکھا رہا تھا اور خوشامد میں دہرا ہوا جا رہا تھا۔

امریکن اس سے چابی لے کر روانہ ہوگئے۔ ٹھیکے دار چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ
سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔

وہ آیا تو دانت نکالتے ہوئے 'نمش کار' 'نمش کار' کرتا پہلے مداری کی طرف پھر
میری طرف متوجہ ہوا۔ ہاتھ باندھ کر پہلے بوڑھے کے سامنے پھر میرے سامنے خوشا
کے ساتھ مجھ سے کہنے لگا۔ "کنور صاحب! آپ کو سویرے دیکھا تھا۔ شما کرنا' پہچانا نہیں
تھا۔ سرکار۔ پھر مداری کی طرف ذرا سا اپنا سر خم کر کے بولا۔ "رانا صاحب سرکار کے
آنے کا' آپ کے اور بہو جی کے آنے کا اس حرامی وکمبر نے بتایا ہی نہیں تھا۔ اب میرے
کو کیا پتا کہ وہ سالا کس مہمان آدمی کو میرے پاس لے کے آیا ہے۔ معاف کرنا کنو
صاحب! میں سمجھا کہ ہوگا کوئی پبلک میں سے بس میں نے کنور صاحب! ٹال دیا۔ اس
سالے دکمبر کے سنگ نہیں آتے آپ تو میں منہ سے بات نکالنے سے پہلے جرور کچھ
سوچتا۔ ہو ہو' ہی ہی۔ ابھی بجار میں کسی نے بات کی۔ بولا چیت پور سونیا کے بڑے
ٹھاکر اپنے رانا صاحب مہراج اور کنور صاحب آئے ہیں اور بہو صاحب جی آئی ہیں او
تینوں وکمبر سالے کی اٹاری پہ گئے ہیں تو میں نے سوچی' ہو رہے ہو۔ آپ تو آئے ہی تھے
میرے پاس۔ بڑی بھول ہوئی میرے سے۔ بس سرکار! میں سب سے بڑھیا نئی نویلی جیپ
لے کے چلا آیا ہوں ترنت۔"

میں نے دل میں کہا جتنا اسے سمجھا تھا یہ تو اس سے کہیں زیادہ چھچھورا اور
چالاک ہے۔ خیر مجھے کیا یہ بدمعاش جیپ لے آیا تھا اور خوشامد کر رہا تھا۔ چائے والے
ہم نے بتایا تھا کہ ہم چیت پور سونیا کے جاگیردار اور اس کے بیٹے بہو ہیں۔ یہ جولائن
نے دی تھی۔ اس وقت خوب کام آئی تھی۔

میں نے خوشامدی ٹھیکے دار کی طرف بے زاری سے دیکھا۔ سوکھا سا منہ بنا
کہا۔ "جیپ لے آئے 'اچھا کیا۔ ابھی سے ہمارے نام پہ چڑھالو۔ چابی تم ہی رکھو۔ جب
ہمیں ضرورت ہوگی آدمی بھیج کے بلوالیں گے۔ ٹھیک۔"

وہ خوش ہوگیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "وہ تو کنور صاحب آپ کا حکم تھا۔ جیپ
سرکار آپ کے نام پر پہلے ہی چڑھالی تھی۔ پر ابھی دو باتیں ارج کرنی ہیں۔ پہلی بات
ہے کہ آپ میرے کو شما کرو' مانی دو۔ میں اس ٹیم پہچانا نہیں تھا سرکار! دوسری بات
مہاراج! کہ اس گندی بدبودار جگہ کو چھوڑ دو آپ میرے سنگ چلو۔ ادھر آپ لوگ کے
لائیک کمرہ بھی ہے' جرا سا بگیچہ بھی ہے۔ بے فکری سے بہو جی صاحب ادھر ٹہل سکیں

ہیں۔ ایک بات بتاؤں؟ یہ امریکن میرے سے کمرہ مانگ رہے تھے میں نے کنور صاحب!
منع کردی بھلے کوئی امریکا سے آئے کہ افریکا سے آئے۔ ابھی بھی کسی نے کوئی بات کی'
شکوہ شکایت کی تو سرکار بول دوں گا کہ ہم پرم پرا (روایت) والے لوگ ہیں۔ ایک کمرہ
کیا بڑے ٹھاکر اور کنور صاحب کے لئے' بہو جی کے لئے اپنا گھر خالی کردیں گے۔ ہم۔ ہاں
اور نہیں تو ہر جگہ کی کوئی پرم پرا ہوتی ہے۔ میں نے خبر ہے نئی جیپ ادھر سامنے کیوں
نہیں کھڑی کی۔ گلی میں کس وجے سے کھڑی کی ہے۔"

میں نے اسی بیزاری سے انکار میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "کنور صاحب! سمجھا کرو سرکار! اگر آپ والی جیپ سامنے لے آتا یہ
سالے امریکن اسے دیکھ کے پھیل جاتے کہتے یہ ہم لیں گے ویسے تو مہاراج! وہ بھی کسٹمر
ہیں پر آپ کا یہ سیوک' آلوک ناتھ بسولا' پرم پرا والا آدمی ہے۔ سب سے پہلے اپنے رانا
صاحب کی سیوا میں اچھی' نویلی گاڑی دیں گے۔ پیچھے کسی اور کی سیوا ہوگی۔"

میں نے سوچا اگر اس کا سوئچ بند نہیں کیا گیا تو یہ مسلسل بک بک کیے جائے گا۔

میں نے جماہی لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ۔ رانا صاحب سرکار کو یہی
جگہ پسند آئی ہے۔ اب نہ میں کچھ کہہ سکتا ہوں نہ بہو جی کچھ عرض کر سکتی ہیں۔ ہم شام
تک یہاں ہیں۔ دن چھپے گاڑی تیار کرلانا۔ بارہ چودہ گھنٹے کا دن ہے۔ ٹنکی فل رکھنا۔ ایک
جری کین بھی پٹرول بھر کے ساتھ رکھ لینا۔"

وہ ہاتھ باندھ کر جھکا پھر اپنی چٹکیوں سے دونوں کانوں کی لویں تھام کر کہنے لگا۔
"ایک غس تاخی ہو رہی ہے سرکار اسے بھی جرور شما کریں گے۔ اپنی غریبی کے ہاتھوں
مزبور ہو کے کہہ رہا ہوں کہ سرکار سے تھوڑا سا اڈوانس مل جاتا تو فالتو پٹرول بھروالیتا۔
کنور صاحب! آپ تو سرکار جانتے ہیں کہ چیل کے گھونسلے میں ماس بھلے ہی مل جائے گا پر
ہمارے وہاں۔۔۔۔"

میں نے ایک انگلی اٹھا کر اسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا اور بے زاری سے
پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی وہ پوری گڈی نکالی جو ہرہائی نس نے "عطا" کی
تھی۔

ٹھیکے دار نے گڈی میرے ہاتھ میں دیکھی اور مجھے لگا جیسے وہ کھڑے سے گر
جائے گا۔ میں نے سوکھے منہ سے پوچھا۔ "کتنا دوں؟ ہزار؟ دو؟ ہاں؟ بولو؟"

ٹھیکے دار نے جھک کر سوکھے حلق سے کہا۔ "ہجارے دے دو سرکار۔ باکی جو

مرجی ہو ادھر دے دینا میں آپ کا ہوں۔ گاڑی بھی آپ کی ہے۔ غس تاخی ماف۔" اس کی آنکھیں خوشی اور لالچ سے چھلکی پڑتی تھیں۔

ہم تینوں نے دن میں آرام کرنے کے سوا کوئی خاص کام نہیں کیا۔

رات ہونے سے پہلے ٹھیکے دار اپنی جیپ کو پوری طرح لیس کر کے آموجود ہوا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص کسی اور کو گاڑی نہیں چلانے دے گا۔ سفر کے آخر میں اسے ہم سے بھاری رقمیں جو کھینچنی تھیں۔

میں نے رخصت ہوتے ہوئے دکبر چائے والے کو اچھا خاصا بھاری انعام دیا۔ وہ اچھے انعام کی توقع کر رہا تھا لیکن یہ رقم اس کے خواب و خیال سے بھی زیادہ تھی۔ یہ بات اس نے خود مجھ سے کہی۔

دکبر چائے والا ٹھیکے دار کو اس کی ہڈیوں تک پہچانتا تھا۔ ٹھیکے دار سے جیپ نکلوانے کی یہ ترکیب خود اسی کی سوچی ہوئی تھی۔ اس نے ٹھاکر جیت پور سونیا والی بات پورے بازار میں پھیلا کر اپنے دوست ایک دکان دار کو پابند کیا تھا کہ وہ ہماری جاگیرداری اور دولت مندی کے قصے مبالغے کے ساتھ خاص طور پر ٹھیکے دار تک پہنچا دے۔

اسے یقین تھا باقی جال ٹھیکے دار خود ہی اپنے آس پاس بنتا چلا جائے گا۔

دکبر اور دوسرے بازار والے ہمیں رخصت کرنے جیپ کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے جس سے ٹھیکے دار آلوک ناتھ بسولا بہت جزبز ہو رہا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ اپنے کاروباری حریف۔ "مس سالے دکبر" کو گالیاں دے رہا ہو گا۔

جیپ کی حالت واقعی بہت اچھی تھی۔ میں اور ٹھیکے دار اسے باری باری چلاتے رہے۔ جب میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو ٹھیکے دار بڑے ٹھاکر اور بہو جی کے احترام میں اندر نہیں نکلتا۔ جیپ کے پیچھے بندھے رسوں کے چھینکے میں جا کے لیٹ جاتا تھا۔ سڑک پر دیکھنے والے یہ عجیب منظر دیکھتے اور تالی بجاتے تھے۔ بعض گاڑیاں ہارن دیتی گزرتی تھیں۔ برما میں عام طور پر شکاری لوگ جیپ سے لٹکتے اس جھولنے میں شکار کیا ہوا جانور ڈال کر لے جاتے ہیں۔

بارہ چودہ گھنٹے کا یہ طویل سفر ہمارے لئے تقریباً آرام دہ رہا۔

میں نے چلنے سے پہلے یہ احتیاط کی تھی کہ مداری اور اس کی پوتی کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ راستے میں وہ زیادہ تر خاموش رہیں۔ مجھ سے اور آپس میں بھی برمی زبان کی بجائے بنگلہ میں بات کریں جو زبان آلوک ناتھ بسولا ٹھیکے دار کو نہیں آتی۔ کیا

خبر کس بات سے اسے شک ہو جائے کہ بڑے ٹھاکر اصل میں مداری ہیں اور بہو جی صاحب' ان کی پوتی نہیں' ڈگڈگی بجاتی ہیں۔

ٹھیکے دار بسولا نے درجنوں بار مسافروں کو اپنی قصبے سے رنگون اور رنگون سے پرانے مندر والے اس قصبے میں پہنچایا تھا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ میں "کنور صاحب" رنگون آیا ہوں تو کہاں ٹھہروں گا۔ صرف ایک بار اس نے پوچھا تھا کہ سرکار لوگ کسی کو مجوانی (میزبانی) کی عزت تو نہیں دیں گے؟ ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے؟" ہم نے سر ہلا کر ہاں کا اشارہ دیا تھا۔ اس لئے رنگون شہر میں داخل ہوتے ہی ٹھیکے دار نے جیپ کا رخ ہوٹل کونٹی نینٹل کی طرف موڑ دیا۔

وہ یہاں درجنوں بار آیا تھا پھر اس کا ایک رشتے دار مدن بسولا یہاں گیسٹ منیجر تھا۔ تو اس نے ہم تینوں بدحال "سرکار" لوگوں کو جیپ ہی میں ٹھہرنے کو کہا اور دوڑا دوڑا جا کر کاؤنٹر سے بسولا کو بلا لیا۔ رستے میں اس نے ہماری گاڑی میں آگ لگنے کا اور ہماری زبردست دولت مندی کا ذکر کر دیا ہو گا اس لئے اس کا عزیز بھاگا بھاگا آیا اور اس نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ برابر کے دو بڑھیا کمروں میں پہنچا دیا۔

میں نے چلتے وقت ٹھیکے دار سے کہہ دیا تھا کہ رنگون پہنچ کر سب سے پہلے میں بازار جاؤں گا اور اپنے لیے بڑے ٹھاکر کے اور بہو جی صاحب کے لئے کچھ سامان خریدوں گا۔ ایک ٹیکسی تیار رکھنا۔

ٹھیکے دار ٹیکسی کیوں منگواتا۔ میں جتنی دیر میں 'نہا دھو کر' کھا پی کر' تیار ہوا اور نیچے آیا ٹھیکے دار آلوک ناتھ تازہ دم ہو کر جیپ کو کپڑا مار کر مجھے بازار لے جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے' بڑے میاں اور کوسومی کے لئے شہر کے سب سے فیشن ایبل بازار سے اچھے کار آمد اور ٹھاٹ دار کپڑوں کے بہت سے جوڑے اور جوتے وغیرہ خریدے۔ ٹھیکے دار کو سنا کر ایک فرضی ٹیلی فون کال بھی کی جس میں میں نے اپنی "جاگیر" جیت پور سونیا میں اپنے ملازموں کو گاڑی کے جلنے اور ڈرائیور کے فلاں فلاں جنگل میں رکے رہنے کی خبر دی اور انہیں حکم دیا کہ وہ فوراً ڈرائیور کی خبر لیں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں بڑے ٹھاکر حضور اور بہو جی صاحب کے ساتھ کچھ دن کونٹی نینٹل رنگون میں رکوں گا۔

ٹھیکے دار بسولا۔ بہت دور سے اور بہت دیر سے ہمارے ساتھ تھا۔ اب اسے

رخصت کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلایا تو وہ ہاتھ باندھے، جوتے اتارے قالین پر دور کھڑا رہا۔

میں نے کہا۔ "بتا بھئی تجھے کتنے دیے جائیں؟" تو وہ بہت دیر تک "میں بھی آپ کا' گاڑی بھی آپ کی" والی لائن چلاتا رہا پھر اس نے ایک رقم بتائی جو اس کی لالچی طبیعت دیکھتے ہوئے مجھے کچھ زیادہ نہیں لگی۔

میں نے رقم سے اوپر اسے پیسے دیے تو دہرا ہو گیا کہنے لگا۔ "میرے کو مالوم تھا سرکار لوگ نہال کر دیں گے۔ اسی وجے سے میں نے منہ کھول کے نہیں مانگا۔ پر سرکار اب ایک درکھاس جرور کروں گا۔"

میں نے سوچا لے بھئی اب یہ پھیل رہا ہے اور بھی رقم مانگے گا مگر اس نے جیب سے ایک بڑی سی نوٹ بک نکالی کہنے لگا۔ "کنور جی صاحب! اس نوٹ بک پر میری سیوا سروس کے بارے میں کوئی اچھی بات لکھ دو۔ سب کو دکھاؤں گا کہ دیکھو سالو کیسے کیسے مہمان لوگ نے میری جیپوں کی شوبھا بڑھائی ہے۔"

میں نے نوٹ بک لے کے انگریزی میں لکھ دیا کہ ٹھیکے دار آلوک ناتھ بسولا اچھا بزنس مین ہے۔ بہت اچھا ہم سفر بھی بن سکتا ہے اگر یہ اپنی زبان کبھی بند بھی رکھا کرے۔ ویسے یہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا ہے۔

میں نے یہ پڑھ کر سنایا اور کہا۔ "دیکھ یہ لکھا ہے تیرے لیے۔" تو ادب سے ہنسا ہاتھ باندھے کھڑا رہا پھر کہنے لگا کہ ہاں ٹھیک کہتے ہو سرکار! میں کبھی کبھی زیادہ ہی بول جاتا ہوں۔

کہنے لگا۔ "کنور جی صاحب! انگریزی ادھر کوئی نہیں سمزتا۔
آپ برمی میں یہی بات لکھ دو گے تو اس دکمبر سالے کو پڑھا پڑھا کے آدھا کر دوں گا۔"

میں نے یہی بات برمی میں لکھ دی تو خوش ہو گیا۔ مجھے اور خوش کرنے کو ذرا قریب آ گیا۔ اپنی نوٹ بک الٹ پلٹ کر دکھاتا رہا بولا۔ "سرکار! راج گدیوں کے اور جاگیروں کے بڑے بڑے نام لکھے ہیں یہ دیکھو سرکار! کوچین اسٹیٹ کے مہاراج کمار آئے تھے۔ پچھلے برس میری تعریف لکھی ہے۔ ایک بار حیدر آباد دکھن کے پرنس اجت جا (عزت جا) آئے تھے اور یہ دیکھو مہاراج! یہ ستنا گڑھی راج کے مہاراجا ناہر سین ادھراج اور ان کی مہارانی نے سائن کیا ہے۔"

یہ کچھ قریب کا اور جانا پہچانا سا لگا۔ میں رک کر پڑھنے لگا تو ٹھیکے دار بولا۔
"مہارانی صاحب گوروں کے دیس سے آئی ہے سرکار! کتنی بار کبھی اکیلی کبھی مہاراج کے سنگ مندر دیکھنے آتی ہے۔ ویسے اپنی دس گاڑیاں تو لاتی ہوں گی پن ہر دفے میری ہی جیپ منگاتی ہے مہارانی۔"

ستنا گڑھی؟ گڑھی! گڑھی اور ناہر سین! میں نے نوٹ بک ٹھیکے دار کے ہاتھ سے لے لی۔

اوپر راجا نے برمی میں اپنے دستخط کیے تھے۔ "ناہر سین" اور نیچے رانی نے انگریزی میں "جوئی ناہر سین" لکھا تھا۔

"جوئی۔ جوہی۔ گوروں کے دیس سے آنے والی گڑھی کی مہارانی۔ ہاں، یہی شکار بنگلے میں آئی تھی اور اس کے ساتھ ایک ناہر سین تھا مگر وہ ناہر سین، سالا لیچڑ، جوئی یا جوہی کا نوکر وہ جو بستر سے چیتے کی طرح اتر رہا تھا۔ وہ مہاراجا نہیں اس کا ہم نام ہو گا۔ یا ہم نام بھی نہیں ہو گا۔ وہ گوری مہارانی جوہی اسے اس نام سے پکارتی ہو گی۔

مگر کیا یہ وہی جوئی ہو گی؟ میں نے ٹھیکے دار سے کہا کہ میں نے مہارانی کو کہیں دیکھا ہے۔

بولا۔ "ضرور دیکھا ہو گا۔ راج گدیاں ختم ہو گئیں پر آپ سرکاروں کا میل جول تو آپس میں اسی طرح کا ہے سرکار! راجوں کے سنگ راج ہی اٹھیں گے بیٹھیں گے۔"

میں نے کہا کہ مہارانی جوئی کو بہت پہلے دیکھا تھا وہ ایسی ایسی شکل کی دبلی پتلی، چھوٹے قد کی عورت تھی۔ کہنے لگا۔ "ہاں سرکار! بالکل وہی آپ نے مانو تصویر کھینچ دی مہارانی صاحب کی۔"

میں نے ایسے ہی سرسری سا اس ناہر سین لیچڑ کا ذکر کیا۔ اس کا حلیہ بتایا۔ وہ بولا۔ "نا' نا سرکار! اپنے مہاراج ناہر سین تو کوئی ستر بہتر برس کے ہوں گے۔ موٹاپے نے ایسا کر دیا ہے کہ اب تو دو ڈھائی برس سے گڑھی سے نکلتے ہی نہیں۔" پھر وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ "گورنمنٹ نے باہر جانے پر پابندی بھی لگا رکھی ہے، کوئی مقدمہ ہے۔"

اوہ! میں نے اس ناہر سین کو پہچاننے کی ایک آخری کوشش کی۔ پوچھا کہ "کنپٹی پر مسا ہے اس جواں ناہر سین کے، بات کرتا ہے تو لگتا ہے بہت ڈرا ہوا ہے۔ وہ کون ہے؟"

ٹھیکے دار ہنسا، بولا۔ "اچھا سرکار اس کا کہہ رہے ہیں۔ وہ ناہر سین نہیں نہار سنگھ

ہے' پلے کی طرح کوں کوں کرتا ہے وہ ادھر ہی گائیڈ لگا ہوا ہے۔ کونٹی نینٹل میں۔ میرے کزن مدن بسولا کا چمچا ہے' مکھن لگاتا رہتا ہے۔ آپ نے سرکار! پہلے کبھی اسے یہیں ہوٹل میں دیکھا ہوگا؟"

وہ یہاں ہے؟ وہ ناہر سین یا نہار سنگھ۔ میں تو سمجھا تھا شکار بنگلے میں اس شخص کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ یہ کہاں آگیا؟

ٹھیکے دار میری صورت تکے جا رہا تھا۔ میں نے ٹالنے کو کچھ بھی کہہ دیا۔ ٹھیکے دار بسولا' سلام کر کے رخصت ہوا۔

میں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ "ہم اس ہوٹل میں بالکل غلط موجود ہیں مجھے فوراً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

پہلے تو میں نے انٹر کام پر بڑے میاں سے برابر کے کمرے میں بات کی۔ انہیں بتایا کہ جن لوگوں سے میں نے رقم لی ہے۔ ان کا ایک آدمی اسی ہوٹل میں موجود ہے اس لئے میں اپنے کمرے سے اب کم ہی باہر نکلوں گا۔ بڑے میاں اس وقت میرے پاس اکیلے آجائیں اور ضروری بات سن لیں۔

مداری بڑے میاں آئے۔ (اب جب کہ ہم ایک شاندار ہوٹل میں تھے اور مداری کے بدن پر انگریز بڈھوں کے پہننے کا بڑھیا لباس تھا تو واقعی وہ کہیں کا "راجا ٹھاکر" صاحب لگ رہا تھا۔ اپنے مزاج میں باوقار' رکھ رکھاؤ کا آدمی تو وہ پہلے ہی تھا۔

جتنا بتایا جانا ضروری تھا میں نے اسے بتا دیا کافی رقم اس کے حوالے کی جسے اس نے انگریزی کپڑوں کے نیچے پہنے اپنے برمی شلوکے کی جیب میں رکھ کر اوپر سے سیفٹی پن لگالیا۔

میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہم اچانک بچھڑ جائیں۔ مجھے بن بتائے جانا پڑے۔"

پوچھنے لگا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "ابھی نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو اور اگر آگے جہاں بھی جانا ہے ہم ساتھ ہی جائیں۔ ویسے بھی مجھے تم سے بہت کچھ سمجھنا ہے۔ فکر نہ کرو یہ تو میں احتیاطی بندوبست کر رہا ہوں۔"

میرے بہت کچھ سمجھنے والی بات پر مداری جان گیا کہ میں "اس کی کایا بدل" کا انسان سے ریچھ بننے کا حوالہ دے رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ "سنو میں اگر اکیلا نکل جاؤں تو تم ایسا کرنا کہ ہوٹل کے منیجر مدن

بسولا کو اپنے کمرے پر بلانا۔ خود کاؤنٹر پر مت جانا۔ اسی کو بل کے پیسے دے دینا۔ اسی سے ٹیکسی منگوا کر خاموشی سے نکل جانا۔"

مداری تشویش سے کہنے لگا۔ "کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ اور یہ سن لو! میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ اب تم ہماری ہر بات میں شریک ہو گئے۔ ہمارے اپنے ہو گئے۔"

میں نے کہا۔ "اپنے بیگانے کی بات چھوڑو ایسی کوئی مصیبت نہیں آگئی جو میں تمہیں بتاؤں۔ قصہ یہ ہے کہ شکار بنگلے میں میرا جس سے جو بھی سودا ہوا ہے۔ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور اس لیے تمہیں الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

میری بات مداری کی سمجھ میں آگئی۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ اور میں اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

مداری کے جانے کے بعد میں نے مدن بسولا کے لئے ٹیلی فون کیا۔

منیجر بسولا کو بلا کر میں نہار سنگھ یا ناہر سین کو سمجھنا چاہتا تھا اور مجھے اس بسولا کی مار بھی دیکھنی تھی کہ کہاں تک ہے۔

ہم اس ملک کے سب سے بڑے' سب سے بااثر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ یہاں کے منیجر اور معزز کارندے بین الاقوامی ارب پتیوں کی مہمان داری اور خدمت کرتے' کروڑ پتیوں سے بے تکلفی سے بات کرتے اور لکھ پتیوں کی سفارش کرتے تھے۔ اب جب کہ میرے پاس بڑی رقمیں تھیں۔ میں یہیں بیٹھ کر سب کچھ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے دوسری تمام جگہوں سے زیادہ' یہاں صرف ایک ہی شے کی حکمرانی تھی۔ دولت کی اور یہاں ہم محفوظ تھے۔ پیسے کی طاقت ہے۔

ہوٹل کونٹی نینٹل میں سینکڑوں کی گنتی ٹپ دینے میں اور ہزار اور لاکھ کی گنتی بلوں کی تیاری میں استعمال کی جاتی تھی۔ کسی غیر معمولی کام کے لئے یقیناً کروڑ اور اس سے اوپر کی رقم خرچ ہوتی ہوگی۔ ظاہر بات ہے مجھے غیر معمولی کام کرانے تھے اس کے لئے میرے پاس غیر معمولی رقمیں موجود تھیں۔

مجھے چند گھنٹوں میں تین برمی پاسپورٹ چاہئیں تھے اور یہاں سے نکلنے کے لئے پاکستان یا مشرق وسطیٰ' مشرق بعید کے کسی بھی ملک کے تین ہوائی ٹکٹ درکار تھے اور وہ بھی پہلی یا قریب ترین فلائٹ پر۔ میں ان دو کاموں کے لئے کروڑ یا اس سے زیادہ کی رقم خرچ کر سکتا تھا۔

میں نے سوچا دیکھنا صرف یہ ہے کہ گیسٹ منیجر مدن بسولا کے ہاتھ کیا اتنے لمبے ہیں کہ دی ہوئی مدت میں یہ دو کام کرا سکتا ہے۔ جہاں جسے وہ رقم کھلانی ہے وہ کھلائے 'اپنا کمیشن اپنی جیب میں ڈالے اور بیٹھے بٹھائے خود بھی دولت مند بن جائے۔ تو مجھے اس وقت بسولا کی مار دیکھنی تھی کہ کتنی ہے۔

اس کے آنے سے پہلے میں نے چائے منگوالی۔ بسولا آیا تو دوستوں کی طرح میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ چائے بنانے لگا' بولا۔ "جناب والا نے طلب کیا۔ کوئی خدمت میرے لائق؟ حکم کیجیے؟"

میں نے کہا۔ "بھائی! اتنے رسمی نہ بنو۔ چائے پیو میرے ساتھ۔ مجھے جو کہنا ہے وہ سن لو۔ جواب دینے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لینا۔ میں تمہاری ہاں بھی اور نہ بھی ایک ہی طرح سے قبول کرلوں گا۔ تم نے نہ کیا تو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

بسولا کہنے لگا۔ "درست فرمایا۔"

چائے کا پہلا گھونٹ لے کر میں نے کہا۔ "مدن بسولا! تمہاری لیاقتوں اور صلاحیتوں کے بارے میں تمہارے کزن آلوک ناتھ نے بہت کچھ بتایا ہے مگر تمہارے سپرد جو کام میں کرنے والا ہوں ذرا ٹیڑھا ہے۔"

مدن بسولا بولا۔ "یہ خادم بہت سے بظاہر مشکل کام سرانجام دے چکا ہے۔"

میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔ "مجھے اندازہ ہے۔ اچھا سنو۔ ہماری جاگیر' یا ریاست جو بھی سمجھو۔ چیت پور سونا ہے۔ ہزاروں مربع میل میں ٹیک کے جنگل کھڑے ہیں۔ جنگل کیا' سمجھو سونے کی کانیں ہیں۔ سب آنند ہے بس ایک دکھ ہے کہ ہمارے اپنوں میں سے بعض نے ہم سے اتنا پیار نہ کیا جتنا ہمیں ان سے ہے۔ خیر شکایت سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انہوں نے میرے خلاف بلکہ بابا ٹھاکر کے خلاف جو ان کے بھی بڑے ہیں۔ سازش کی ہے۔ ہم وہاں سے تو بچ نکل آئے۔ آگے کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ پیسا اس وقت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مدن بابو! یہ سمجھ لو۔ جی کھول کر خرچ کرو۔ جو ایک مانگ رہا ہے اسے سوا بھی دے ڈالو تو پروا نہیں۔ پر کام چوبیس گھنٹے میں اور چوکھا کرا دو۔ تمہارا بھی فائدہ ہوگا۔

بسولا کی آنکھیں چمکنے لگیں بولا۔ "جناب والا! میں خادم ہوں۔ سب سے پہلے اپنے معزز مہمان کے فائدے کی سوچتا ہوں۔ مہمان خوش ہو جائے تو خادم کا انعام کہیں نہیں گیا۔" وہ اپنا جملہ کہہ کر میرا منہ تکنے لگا۔ آدمی گھاگ تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سن رہا

تھا۔ مال کاٹتے وقت بھی ٹھنڈے ٹھنڈے چھری چلائے گا۔

میں نے کہا۔ "بابا ٹھاکر کے لیے' میرے لیے اور دھرم پتنی بہو جی کے لئے چار گھنٹے میں انٹرنیشنل پاسپورٹ اور اگلے بیس گھنٹوں میں باہر کی کسی فلائٹ پر تین کنفرم سیٹیں۔ بولو یہ دونوں کام ہو سکتے ہیں؟"

منیجر بسولا سر پکڑ جیسے گہری سوچ میں چلا گیا۔ شاید یہ بھی رقم بڑھانے کا طریقہ ہوگا۔ یا ممکن ہے کوئی بڑی الجھن آپڑی ہو۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ منیجر نے سر اٹھایا' بولا "معافی اس بات کی کہ جناب والا کو فوری جواب نہ دے سکا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے فوری نہیں۔ تسلی بخش جواب سے دلچسپی ہے۔"

کہنے لگا۔ "آپ راجا لوگ ہو۔ مجھ سے زیادہ چیزوں کو سمجھتے ہوگے لیکن یہ خادم ایسے چوراہے پہ بیٹھا ہے جہاں سے حکومتیں چلانے والے صدر اور وزیراعظم اور بادشاہ اگر نہیں تو وزیر' منتری ضرور گزرتے ہیں اور آپ جانتے ہو راج نیتی' سیاست' وزیروں کا دن رات کا کھیل ہوتا ہے۔ کسی وزیر کو قابو کرنا ہوگا۔ اس وقت جو مشکل نظر آتا ہے۔

میں نے کہا۔ "اگر وزیر کو خریدنا پڑا تو کتنا خرچ ہوگا؟"

بولا۔ "وہی عرض کر رہا ہوں۔ پڑوس کے ملک بھارت اور پاکستان کے حالات کو میں نے بستی پہ منڈلاتے ہشیار گدھ کی طرح سمجھو پر پھیلا کے اور آنکھیں کان کھول کے دیکھا ہے ادھر دونوں ملکوں میں گڑبڑ ہے۔ کم سے کم بھارت کی طرف سے تو گڑبڑی کے سگنل مل رہے ہیں۔ پوربی پاکستان میں خاموش ہلچل ہے۔ اسکول کالج بازار کارخانے چل رہے ہیں پر اندر ہی اندر کچھ کڑوا کڑوا گھل رہا ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ بیٹے بسولا۔ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ کتنا کڑوا گھل چکا ہے۔ ویسے میں نے سر ہلاتے ہوئے منیجر کی بات سے اتفاق کیا۔

وہ کہنے لگا۔ "ایسی گڑبڑی پھیلائی جاتی ہے۔ جاسوسوں' گھس بیٹھیوں کے ذریعے۔ جاسوس پھیلائے جاتے ہیں۔ پیسا خرچ کرکے اور آپ کو مجھ سے پہلے پتا ہوگا کہ حکومتوں کے پاس ہر چیز کا بجٹ ہوتا ہے۔ جاسوسی کا بھی بجٹ ہوتا ہے۔ فوج کے خرچے سے بہت کم مگر ہوتا ضرور ہے اور بڑا بھاری ہوتا ہے۔ تو آج کل کنور صاحب۔ برما میں ہر طرف سے جاسوس اور انہیں شکار کرنے والے ان کا الٹ کرنے والے چلے آرہے

ہیں۔ حکومتیں بہت خرچا کر رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میرا تو پاسپورٹ اور ٹکٹوں کا چھوٹا سا کام ہے۔ اس کا جاسوسی یا کاؤنٹر انٹیلی جنس سے کیا واسطہ؟"

وہ آنکھیں چمکا کر بولا۔ "جاسوس لوگوں کے جانے آنے کے لئے بھی پاسپورٹ اور ٹکٹ بھی درکار ہوتے ہیں۔" میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

میری نظروں میں کوئی بات مدن بسولا نے ایسی دیکھی ہو گی جس سے اسے کھیل خراب ہوتا نظر آیا۔ جلدی سے بولا "گستاخی معاف۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ آپ کنور صاحب! جاسوسی کرنے آئے تھے اور اب نکلنا چاہتے ہو۔ نانانا۔ سرکار! ایسی بات تو میں سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتا۔"

میں نے سوچا اسے تھوڑا سا رگڑا دینا پڑے گا۔ تاکہ یہ میرے کام کا ہو جائے۔ اسے مخاطب کر کے کہا۔ "مدن بسولا! تم میرے بارے میں جیسا چاہو سوچتے رہو مجھے پروا نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اور مجھے بے مقصد چیزوں کے بارے میں نہیں' بامقصد اور ٹھوس چیزوں مثلاً کیش 'نقدی' روکڑے کے بارے میں زیادہ سوچنا چاہئے ورنہ جس کے پاس کیش ہوتا ہے وہ اپنی مرضی کا سوچنے والا پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سمجھو۔"

میں نے یہ بات بے مروتی سے کہی تھی اور ہاتھ میں پکڑی پیالی آواز کے ساتھ طشتری میں رکھی تھی۔

منیجر نے دانت نکال دیئے۔ پوچھنے لگا۔ "اور چائے بناؤں سرکار کے لئے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

وہ آہستہ سے بولا۔ "سر! آپ مجھے اور میں آپ کو سینٹ پر سینٹ سمجھ گئے ہیں۔ مجھے ابھی آدھے گھنٹے کا ٹائم دیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چائے اور ٹرالی کھینچتا ہوا کوریڈور میں لے گیا جہاں اس نے ٹرالی چھوڑ دی اور تعظیماً میری طرف جھک کر ادب سے دروازہ بند کر دیا۔ حرام زادہ واقعی بہت ہشیار تھا۔

جتنی دیر مجھے مدن کا انتظار رہا اتنا وقت میں نے اور طرح کی تیاریوں میں صرف کیا۔

اگر مدن تسلی بخش جواب نہیں لاتا کوئی بد خبری سناتا یا دغا کرتا ہے۔ تو مجھے ٹھاکر صاحب اور میری دھرم پتنی بہو جی صاحب کو اس خطرناک جگہ سے یعنی کونٹی نینٹل

ہوٹل سے نکل کر کھلی ہوا میں آنا ہو گا جس کے لئے منصوبہ بندی ضروری تھی اور وہ میں نے کر لی تھی۔

میں نے کمرے کی صفائی کرنے والی ایک برمی بی بی کو آنکھیں چلاتے نئے سامان پر للچائی نظریں ڈالتے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ گلدان رکھنے آئی تھی اور مسکرا کر مجھ سے انگریزی میں کہہ گئی تھی کہ اس کا نام مورا مونگ ہے۔ وہ دن کی ڈیوٹی پر ہے۔ شام میں فری ہے اگر سر کو یعنی مجھے شام میں باہر نہیں جانا ہوٹل میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن سے دل بہلانا ہے تو وہ سر کو ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ دوسری صورت میں وہ ایک بار شام کو ضرور آئے گی۔ گلدان کے پھول بدلنے۔

یہ چالاکی کی باتیں تھیں۔ پانچ ستارے والے ہوٹلوں میں اس طرح کی کھلی دعوت عیش کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کیوں کہ ہر کام سلیقے سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس بد سلیقہ عورت مورا مونگ کی نوکری مجھے فوری طور پر خطرے میں نظر آ رہی تھی اگر کسی مسافر نے شکایت کر دی۔ انتظامیہ کے کسی بندے نے دیکھ لیا تو یہ مونگ بی بی گئی۔

بہر حال میں نے اس کے انگریزی پیغام کے جواب میں کہا تھا کہ بی بی! میں بہت مصروف آدمی ہوں معلوم نہیں شام کو کہیں باہر جاؤں گا یا کمرے میں ہی رہوں گا۔

اس نے کہا تھا۔ "اگر آپ انٹر کام پر تیرہ نمبر ڈائل کریں گے تو میں ہی فون اٹھاؤں گی۔ از راہ کرم بتا دیجئے گا کہ آپ باہر جا رہے ہیں یا نہیں جا رہے۔" مورا مونگ نے یہ بات مسکرا کر کہی تھی۔

اب مدن بسولا کے جاتے ہی میں نے انٹر کام پر تیرہ نمبر ڈائل کیا اور فون واقعی اسی نے اٹھایا چہکتی آواز میں بولی۔ "لکی نمبر تیرہ ---- شعبہ آرائش۔ فرمایئے؟"

میں نے کہا۔ "بی بی! میں سوئٹ سیون اے سے بول رہا ہوں۔ مجھے فوری طور پر جانا پڑ رہا ہے اس لئے اب آپ آکر گلدان وغیرہ سیٹ کر سکتی ہیں۔"

اسی طرح چہک کر بولی۔ "شکریہ سر! سمجھئے میں چل پڑی۔"

ڈیڑھ دو منٹ میں وہ کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "کھلا ہے آجاؤ۔"

اس نے اندر آکر دروازہ بند کیا اور بولی۔ "لیجئے میں آگئی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری جیسی یونیفارم چاہئے۔"

اس نے اپنی یونیفارم اتارنی شروع کر دی۔

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "اے اے۔ ایک منٹ۔ میری بات سنو پہلے جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔" وہ رک گئی۔

میں نے کہا۔ "گلدان سجانے کی فیس تمہارے خیال میں کتنی ہونی چاہئے؟"

بولی۔ "ہزار۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں پانچ سو۔"

اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی ہوٹل یونیفارم کی بیلٹ ڈھیلی کرنی شروع کر دی۔

میں نے کہا۔ "رکو رکو۔ بالکل غلط سمجھی ہو تم۔ سنو۔ میں تمہارے اس ہوٹل کے کاروباری حریف کا نمائندہ ہوں۔ مجھے تین سائز میں یہاں کے یونیفارم درکار ہیں۔ ایک یونیفارم کے پانچ سو دوں گا۔ یعنی تین کے ڈیڑھ ہزار اور تمہیں پانچ سو ٹپ الگ سے۔ بولو کیا کہتی ہو؟ دو ہزار یہاں سامنے میز پر رکھے ہوں گے اگر بیس منٹ میں تین یونیفارم نئے لے آؤ گی تو وہ دو ہزار تمہارے ہو جائیں گے۔"

ہنس کے بولی۔ "میں غلط سمجھی تھی مگر تم صحیح کسٹمر ہو۔ سودا ہو سکتا ہے۔ تین ہزار لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ڈھائی۔"

بولی۔ "منظور۔ تم یونیفارمز کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "اس سوال کا جواب چاہئے تو پھر تمہیں ڈیڑھ ہزار دوں گا۔"

"نہیں چاہیے۔ جواب کی ایسی تیسی ڈھائی ہزار منظور؟"

میں نے شعبہ آرائش کی اس چالاک فتنہ کار بی بی کو پہلے اپنا اور مداری کا سائز بتایا۔ کوسومی کی زنانہ یونیفارم کا سائز سن کر بولی۔ کہ اتنے چھوٹے سائز کی یونیفارم ملنا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ چھوٹی سے چھوٹی جو بھی ملے لے آنا۔ اب تمہارے پاس اٹھارہ منٹ رہ گئے ہیں دو منٹ تم بحث کرنے میں ضائع کر چکی ہو۔

دروازہ کھول کر چھلاوے کی طرح وہ غائب ہو گئی۔

اس کو گئے بیس منٹ اور کچھ ہی سیکنڈ ہوئے تھے اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کہ اس نے دستک دیئے بغیر دروازہ کھولا اور گھس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا۔

میں نے پوچھا۔ "سائز چیک؟ دو مردانہ ایک زنانہ؟"

بولی۔ "دو مردانہ ایک زنانہ' سائز چیک۔"

میں نے کہا۔ "وہ رکھے ہیں تیرے ڈھائی ہزار۔" میری نظر کلائی کی گھڑی پر تھی۔

اس نے بھی گھڑی دیکھی اور میز پر پڑے نوٹ اٹھا کر تیر کی طرح نکل گئی۔

میں نے یونیفارم سنبھال لیے۔ آدھے گھنٹے کے بجائے پونے گھنٹے میں مدن بسولا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا۔ "آجاؤ۔"

وہ جس طرح کمرے میں گھسا اسی سے میں سمجھ گیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہے۔ بے تعلقی سے مجھے باہر کی طرف دیکھتے پا کر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ بولا۔ "جناب والا! غلط بات کیوں کہوں۔ خادم کو سینٹ پر سینٹ کامیابی تو نہیں ہوئی ہے۔ ہاں اب سے دو گھنٹے بعد میرا آدمی وزیر سے بات کرے گا۔"

"کیسی بات؟"

"پاسپورٹ کی۔"

"اور ائر ٹکٹ؟"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے تین کمپنیوں سے پوچھا تھا۔ دو نے امید دلا دی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا معلوم کرو ان دو کمپنیوں میں سے کون سی کمپنی تین بندوں کو کارگو بے میں اسمگل کر کے برما سے باہر لے جا سکتی ہے؟"

بسولا ہنسا۔ "یقیناً جناب والا نے یہ بات مذاق میں کہی ہو گی۔"

میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "یقیناً آپ جناب والا گھاس کھا کر آرہے ہیں یا آپ نے شراب پی ہے۔"

منیجر نے احتجاج کیا۔ "سر ائر کمپنیاں' ائر کمپنیاں ہوتی ہیں۔ کوئی موٹر بس یا پرائیویٹ فیری نہیں ہوتیں۔ جہاز کے کارگو بے میں تین ۔۔۔؟ ایک نہیں تین آدمی کیسے اسمگل ہو سکتے ہیں؟"

میں بولا۔ "تو پھر اس گدھے وزیر کے کمرے میں یہ لے کے گھس جاؤ۔" میں نے تین لاکھ کے نوٹ پہلے سے گن رکھے تھے۔ وہ مدن بسولا کی طرف پھینکے۔ "تین لاکھ ہیں۔ یہ دس پر سینٹ ایڈوانس ہے۔ وزیر سے کہو تین پاسپورٹ بنا کے ہاتھ کے ہاتھ

دے دے۔ تیس لاکھ ملیں گے۔"

بسولا نے نوٹ سمیٹ کر سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوگئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ آہستہ سے بولا۔ "اس میں شک نہیں سر! رقم بڑی ہے۔ وزیر تک کو ہلا دے گی۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر جاؤ"

بولا۔ "باقی کے ستائیس لاکھ وغیرہ؟ ظاہر ہے اس وقت کیش میں تو نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے۔"

منیجر نے جو "وغیرہ" کہا تھا اس میں اس نے اپنا کمیشن، ائر ٹکٹ کے پیسے بھی شامل کیے ہوں گے۔

میری "ظاہر ہے" سن کر اس نے سر کھجایا۔ جیسے خود سے سوال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہنے لگا۔ "آپ کے پاس اس رقم کے ٹریولرز چیکس نہیں ہو سکتے کہ اگر ہوتے تو اب تک مجھے معلوم ہو چکا ہوتا۔ سر! قصور یہ ہے کہ کرنسی مارکیٹ میں اس خادم کا چھوٹا سا انٹریسٹ ہے۔ مانو حصے داری ہے ایک آنے بھر کی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تم، ٹھیک سمجھے ہو، باقی رقمیں سفری چیک کی شکل میں نہیں ہیں۔"

وہ ہنسا، کہنے لگا۔ "سر! میں بھی کیسا گھامڑ ہوں۔ راجے مہاراجے کاغذ کم ہی لے کے چلتے ہیں۔ سرکار کے پاس ظاہر ہے ہیرے ہوں گے۔"

"درست۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے ایک لفظ لکھا۔

"ہیروں میں تو کم از کم چار چھ گھنٹے خرچ ہو جائیں گے۔"

وہ فکر مندی سے بڑبڑانے لگا۔ "میں جوہریوں کو لاؤں گا۔ وہ دیکھیں گے، پرکھیں گے، بھاؤ دیں گے۔"

ہماری بات چیت اب خطرناک علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ مدن بسولا اب قطعی طور پر یہ جان لینا چاہتا تھا کہ میں آخر کون ہوں۔ جاسوسوں وغیرہ کے ہاتھوں میں اتنی بڑی رقمیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے میں کسی ملک کا جاسوس تو ہو نہیں سکتا۔ بسولا کو پہلے شک سا ہوگا، اب ہیروں کا سن کر اسے یقین ہو گیا کہ میں واقعی بڑے جاگیرداروں

میں سے کوئی ہوں۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا ہو گا کہ رشتے داروں کی سازش والی بات میں کوئی دم نہیں ہے۔ میں حکومت کے کسی شکنجے سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ یا تو انکم ٹیکس کا کالے دھن کا کوئی جھگڑا ہے یا پھر میں نے ایک دو آدمی ٹھنڈے کر دیے ہیں اور اپنے بابے اور بی بی کے ساتھ بری قانون کے چنگل سے نکل جانا چاہتا ہوں۔

پاسپورٹ کے کام میں بے شک منیجر کے لئے اچھا کمیشن ہو گا مگر ہیروں کی کیا بات ہے۔ جوہریوں کے ہاتھ آدھے کروڑ کے بھی ہیرے بیچے گئے تو بسولا کا انڈر انڈر کٹ تک پہنچ سکتا ہے۔

میں نے دیکھا اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے خیال کی آنکھ سے لاکھوں کی گڈیاں اپنی جیبوں میں جاتی دیکھ لی تھیں۔

میں نے اسے اور لرزا دیا۔ کہا۔ "مدن! نہ میرے پاس فالتو چار چھ گھنٹے ہیں۔ نہ جوہریوں سے جھک جھک کرنے کا دماغ ہے۔ تم کوئی ایک آدمی پکڑ کر لاؤ وہ بریف کیس بھر کر آئے اور جیبوں میں کنکر ڈال کر چلا جائے۔ ایک گھنٹے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔ آدھا لاکھ کم یا پاؤ لاکھ زیادہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

منیجر نے بہت مشکل سے تھوک نگلا۔ پچیس، پچاس ہزار کا ذکر میں اس طرح کر رہا تھا جیسے لوگ ریزگاری کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے سر! میں یہ ایڈوانس دے کر، وزیر کو قابو کر کے جوہری کے پاس جاتا ہوں۔ جتنی دیر میں پاسپورٹ بنیں گے جوہری آپ کے پاس آئے گا۔ ڈیل کر کے پیسے دے کے چلا جائے گا۔ میں وزیر کے ستائیس لے جا کر اس کے حوالے کروں گا اور پاسپورٹ لے آؤں گا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ میرے ٹیلی فون پر یہیں آجائیں گے۔ تو ٹھیک ہے سر! تھینک یو سر! بائی سر! بہ بائی سر!"

ہکلاتا ہوا منیجر دفعان ہوا تو میں نے فون کر کے مداری اور اس کی پوتی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار کوسومی کو پسند کے کپڑے پہننے کو ملے تھے۔ وہ کئی گھنٹے آرام کر کے آئی تھی۔ اسے پیٹ بھر غذا ملنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ محض میرا خیال تھا یا مداری کی پوتی واقعی کچھ بڑی بڑی لگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر آسائش کی چمک تھی اور وہ کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

تو کیا اس کا چہرہ ہی ایسا تھا۔ مسکراتا ہوا؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں نے کاکیسز بازار میں جب پہلی بار اسے اپنے گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے جھونپڑی میں دیکھا تھا تو وہ لڑکی مجھے بسورتے چہرے والی لگی تھی۔

میں نے کونٹی نینٹل ہوٹل کی ملازموں کی زنانہ وردی کو سومی کو دی۔ اسے سمجھایا کہ یہ کس طرح پہنی جاتی ہے' بال کس طرح ٹوپی میں چھپائے جاتے ہیں اور بیلٹ کیسے باندھی جاتی ہے۔

یہ سب زبانی سمجھا کر میں نے اسے کمرے کے غسل خانے میں بھیج دیا کہ وہ اب جائے اور وردی پہن کر دکھائے۔ ادھر بڑے میاں کو بھی میں نے وردی کے رموز سمجھائے۔

پوتی وردی پہن کر آئی تو دیکھا کہ اس نے نوے بلکہ پچانوے فی صد درست پہنی تھی جو کسر رہ گئی تھی اپنے سامنے پوری کرائی۔ اسے سمجھادیا کہ وردی لے جاؤ اپنے پاس چھپا کے رکھو' ہوٹل کے اسٹاف میں سے کوئی نہ دیکھ لے۔ جب ضرورت ہوگی تمہارا دادا تمہیں بتادے گا۔ تو پھر خیال کر کے ٹھیک ٹھیک پہن لینا۔ ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ وردی شاید جان بچاسکتی ہے۔

مداری سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے بھی سیکھنے کی باتیں جلد سیکھ لیں۔ مگر وہ فکر مند تھا۔ لڑکی کو اپنے کمرے میں بھیجنے کے بعد پوچھنے لگا کہ کیا کوئی خطرہ ہے؟

میں نے کہا۔ "معلوم نہیں۔ ویسے تو ہم اپنے دشمنوں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ خطرہ کسی بھی وقت کہیں بھی سامنے آسکتا ہے اور ہوسکتا ہے نہ بھی آئے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہی منیجر دوڑا دوڑا آیا۔ وہ خوشی سے جیسے پھٹا پڑتا تھا۔ ہم سے دستخط کرانے کے لئے وہ پاسپورٹ فارم لایا تھا۔ وزیر صاحب نے بہت خوشی سے پاسپورٹ تیار کرنا منظور کرلیا تھا بلکہ اس نے بسولا کو تاکید کی تھی کہ وقت ضائع نہ کرے فوراً جائے ضرورت ہو تو جھنڈے اور سائرن والی گاڑی لے لے۔

فارم پر میں نے مداری کا' اس کی پوتی کا اصل نام لکھا جو بہت لمبا اور مشکل تھا احتیاطاً میں نے ان ناموں میں مہارانا اور رانی بڑھوادیا۔ مداری کا نام سن کر مجھے اپنا نام ایجاد کرنا آسان سا ہوگیا۔ پہلی بار ہی ایک نام رانا ئیش پال چھترپال مہاویر جگن مہادیو میرے ذہن میں آیا جو مجھے بہت شان دار لگا۔ میں نے یہی لکھ دیا۔ دستخط کر دیے۔ مداری اور اس کی پوتی نے بھی دستخط کئے۔

ہر کام بہت تیزی سے ہو رہا تھا اور ہم لوگوں کے حق میں ہو رہا تھا۔ مجھے بس ایک بات کی پریشانی تھی وہ یہ کہ نہار سنگھ گائیڈ میرے آس پاس ہی موجود ہے۔ کہیں اس پہچان میں نہ آجاؤں۔

مدن بسولا منیجر کا ذہن پر سکون ہوا تو میں نے سوچا اب یہ نہار سنگھ کا معاملہ اٹھانا چاہئے۔

میں نے بسولا سے کہا تو وہ حیران بلکہ فکر مند ہوگیا۔ سوچتا ہوگا۔ اس قدر فضول نکما چور ٹائپ کے گائیڈ کا نام مجھے کیسے معلوم ہوگیا؟ پوچھنے لگا کہ کب اور کس سے میں نے یہ منحوس نام سنا ہے؟ اسے ڈر تھا کہ کہیں نہار سنگھ نے مجھ سے رابطہ تو قائم نہیں کرلیا؟ وہ حرامی' سونے کے انڈے دینے والی اس چڑیا پر' مجھ پر کوئی جال نہ ڈال رہا ہو۔

میں نے بسولا کو بتایا کہ نہار سنگھ بہت سور قسم کا آدمی ہے۔ حالانکہ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ ریاست میں جن لوگوں نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ یہ ان کا زر خرید اور مخبر ہے۔ ظاہر ہے مجھے صورت سے پہچانتا ہے۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں کونٹی نینٹل میں ہوں نہار سنگھ سسرا! کہیں اور دفع ہو جائے۔ اپنی منحوس شکل مجھے نہ دکھائے۔ منیجر نے کہا۔ "سرا! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اب آپ کے فلائی کر جانے کے بعد ہی نہار سنگھ اس ہوٹل میں بلکہ رنگون شہر میں نظر آئے گا۔ میں فوری طور پر اسے گاڑی دے کر ایک دور دراز کے شکار بنگلے کی طرف بھیج رہا ہوں۔"

لیجئے' میں نے سوچا پھر وہی شکار بنگلا۔

خیر' نہار سنگھ سالے سے اتنی آسانی سے چھٹکارا مل گیا تو مجھے اطمینان ہوا۔

وزیر کی طرف پرواز کرنے سے پہلے مدن بسولا بھاگا بھاگا آیا اور مجھے خبر دی کہ اس مشہور سور کو گاڑی میں بیٹھا کر دفع کر دیا گیا ہے۔ سرکار بے فکر رہیں۔

شام سے پہلے بسولا ایک جوہری اور اس کے اسسٹنٹ کو لے کر آگیا۔ میں اس خطرناک مرحلے کے لئے خود کو پہلے سے تیار کر چکا تھا۔

میں نے سوچا دیسی ریاستوں کی گوری بدیسی رانیاں دور تو نہیں جائیں گی اپنا زیور' جواہر یہیں اپنی ریاستوں' جاگیروں کے قریب ہی میں ریپئر پالش کرائیں گی۔ گڑھی کی سفید فام مہارانی کو' اس کے بریسلٹ اور ہار کو رنگون کے صرافے والوں نے تو ضرور ہی دیکھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہ جو دو آدمی آئے ہیں ان میں سے ایک' جسے اسسٹنٹ بتایا جارہا ہے۔ ہیروں کا ماہر پارکھ ہو۔ ممکن ہے دونوں ہی ماہر ہوں۔ یہ رنگون شہر کے ہیں۔ گڑھی کی جوبی رانی کا زیور اس کا ایک ایک پتھر ہو سکتا ہے۔ انہیں زبانی یاد ہو۔ ان دو ماہروں کی چار آنکھیں اب شکار بنگلے والی رانی جوبی تاہر سیمن کے بریسلٹ اور ہار پر پڑیں گی

اگر ایک بار بھی ان دونوں میں سے کسی نے یہ زیور دیکھے ہوں گے تو غضب ہو جائے گا۔ پٹس پڑ جائے گی۔ دونوں شور مچادیں گے کہ دوڑو گڑھی کے مہاراجگان کا خزانہ کوئی نکال لے جارہا ہے۔ مگر اس خطرے کا سامنا تو کرنا ہوگا۔ تخت ہو گا یا پھر تختہ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہیرے پہچان میں آجائیں اور اونے پونے خریدنے کی لالچ میں یہ دونوں جوہری دم سادھے بیٹھے رہیں۔ انمول رتن کوڑیوں کے مول خریدنے کی کوشش کریں۔

اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو بھی دام لگیں گے انکار نہیں کروں گا۔ ہیرے دے دوں گا۔ ایسے جواہر کوڑیوں کے مول آتے دیکھ کر ہر کوئی چپ رہ سکتا ہے۔ ہاں' انہیں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایسا شور مچائیں گے یہ دونوں کہ گڑھی کا موٹا مہاراجا بھی اپنے گوشہ تنہائی سے نکل کر بھاگا بھاگا آجائے گا۔

زیورات یا جوہریوں پر غیر ضروری توجہ دیے بغیر میں نے سیاہ مخمل کے ٹکڑے میں لپٹے جواہر جڑے دونوں زیور بسولا اور جوہریوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ مخمل کا یہ ٹکڑا میں سوچ سمجھ کر بازار سے لایا تھا۔ اس خزانے کے پاس سے میں ہٹ آیااو بے تعلقی سے اخبار دیکھنے لگا۔

بسولا نے دروازہ بند کر دیا تھا اور کمرے کی سب بتیاں جلادی تھیں۔

بریسلٹ اور ہار دیکھ کر جوہریوں نے ہوودوں یا ہاآں اں جیسی ہلکی آواز پید کی تھی جس سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا اگر وہ دیکھ کر ان جواہر کو پہچان گئے تھے توا کی اس آواز میں ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ پسندیدگی کی آواز ہو۔

میں نے پورے بیس منٹ تک کوئی توجہ نہ دی پھر میں جماہی لیتا میز کے پا آبیٹھا اور یہ ظاہر کرنے لگا کہ اب مجھے ان کا کام دلچسپ لگ رہا ہے۔ وہ چمڑے کے چھو صندوق میں لائے ہوئے ایک آلے سے کئی طرح کے آتشی شیشوں کی مدد سے زیورا میں جڑا ایک ایک دانہ چیک کرتے رہے۔ اسسٹنٹ یا اصل ماہر وہ جو بھی تھا آہستہ بڑبڑا کر جوہری سیٹھ سے کچھ کہتا اور وہ اپنی اشاروں کی زبان میں لکھ لیتا۔

آدھے گھنٹے کی چھان پھٹک کے بعد ایک ساتھ انہوں نے منیجر مدن بسولا طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا یعنی جواہر اس قابل ہیں کہ ان پر بات ہو سکتی ہے۔ بس کھل اٹھا مجھ سے بولا۔ ''سر! آپ کچھ فرمائیے۔''

میں نے تقریباً درشتی سے کہا۔ ''نہیں۔'' اور میز سے ہٹ کر پھر اپنے صو

پر آبیٹھا۔ گویا جوہریوں کی موجودگی سے اب مجھے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔

تینوں آدمیوں نے باادب سرگوشی میں کچھ مشورہ کیا پھر جوہری سیٹھ نے میری طرف گھوم کر اپنے ہاتھ باندھ دیے۔ بولا۔ ''میرے کو بولنے کا آدیش ہے؟''

''میں نے کہا۔ ہاں ہاں کہو۔''

اس نے سیاہ مخمل پر پڑے دونوں زیوروں کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا اور کہا۔ ''سرکار! میں نے دیکھ لیا' پرکھ لیا۔''

''اچھا۔''

پھر وہ دھیرے سے احترام کے لہجے میں بتانے لگا کہ سب کی اتنی رقم بنتی ہے۔

میں نے بیزاری اور نفرت کا ملا جلا تاثر دیتے ہوئے بسولا کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ کس قدر کمینے ہیں۔

بسولا نے ہاتھ جھٹک کر جوہری کے چہرے کے سامنے بے چینی کا اشارہ کیا۔ جوہری کھسیا کر اپنے ماہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہر نے سر کو آگے جھکاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے جیسے اطاعت کرنے' ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا۔ جوہری سیٹھ نے میری طرف مصنوعی بے بسی سے دیکھا اور پہلے بتائی ہوئی رقم بڑھا کر ایک دم سوائی کر دی۔

میں نے بیزاری اور نفرت کے ایک خاموش اشارے سے اتنی رقم بڑھوالی تھی جو پاسپورٹوں اور ٹکٹوں پر خرچ ہونے والی کل رقم کے تقریباً برابر تھی۔

میں نے جوہری کی طرف دیکھ کر ہاں میں سر ہلایا۔ بسولا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہیروں کا سودا ہو گیا تھا۔

بعد کی تفصیلات سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ دونوں جوہری ایک ایک بریف کیس لائے تھے۔ وہ ایک طرف بیٹھے اس بریف کیس کے نوٹ اس بریف کیس میں منتقل کرتے رہے۔ منیجر جو ظاہر ہے پہلے سے طے کر کے آیا ہوگا' جوہریوں سے کوئی فارم' لیٹر ہیڈ لے کر گیا اور کاغذات پر وہ رقم ٹائپ کر لایا جو طے ہوئی تھی۔ جوہریوں نے بریف کیس میری طرف بڑھایا۔ میں نے مدن بسولا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے مستعدی سے ہزار ہزار والے ان بے شمار نوٹوں کو شمار کیا پھر مجھ سے کہا کہ۔ ''سر! رقم صحیح ہے۔''

میں نے مخمل کا ٹکڑا میز پر ایک بالشت آگے سرکا دیا۔ اور کاغذوں پر دستخط کر دیے۔ جوہری نے بھی دستخط کیے اور مخمل کا ٹکڑا محبت سے اٹھا کر اپنے بریف کیس میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

چہرے سے یہی پتا چل رہا تھا کہ جوہری نے بہت اچھا سودا کیا ہے۔

وہ دونوں جھکتے' ہاتھ جوڑتے نمش کار' نمش کار کرتے سوئٹ نمبر سیون الیون سے نکل گئے۔

میں نے رخصت ہوتے بسولا کو آنکھ کا اشارہ دیا کہ وہ انہیں دفع کر کے میرے پاس آئے۔ بسولا نے خوش ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔ اسے معلوم تھا میں نے اسے انعام دینے کے لئے بلایا ہے۔

بسولا کو میں نے ایک لاکھ کی رقم عطا کی۔ مجھے یقین تھا وہ اس سے دگنی رقم انڈر کٹ میں ہتھیا چکا ہو گا۔ میری بلا سے۔

میں نے مدن بسولا کو ستائیس لاکھ کی رقم دے کر برمی وزیر کی طرف بھیج دیا۔ پونے گھنٹے میں وہ ہمارے خوبصورت پاسپورٹ لے آیا۔

رات ہو گئی تھی۔ میں نے بسولا سے کہا آؤ میرا بریف کیس صبح تک کے لئے ہوٹل کے لاکر میں رکھوا دو۔ میں اتنی بڑی رقم کمرے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہوٹل کا لاکر ہندسوں سے کھلتا بند ہوتا تھا۔ ایک گنتی گاہک سوچتا تھا جو ہوٹل والوں کے علم میں نہیں ہوتی تھی دوسری گنتی اسی وقت ہوٹل والے طے کر کے اپنے پاس لکھ لیتے تھے۔ گاہک کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ گاہک اور منیجر دونوں ایک دوسرے کے پابند تھے۔ لاکر اس وقت تک کھل ہی نہیں سکتا تھا جب تک دونوں پارٹیاں تالوں میں اپنے اپنے ہندسوں کی کارروائی نہ کریں۔

یہ رات میں نے دنوں بعد بڑے آنند میں گزاری۔

رات ہی میں کسی وقت ہمارے ہوائی ٹکٹ آ گئے۔ میں نے بسولا کو سویرے پونے نو بجے کا پابند کیا تھا۔ ہمیں کرنسی مارکیٹ جا کر بھاری رقموں کے سفری چیک بنوانے تھے۔ اس میں منیجر بسولا کا قانونی کمیشن تھا۔ روپے میں ایک آنے کا ساجھے دار تھا۔

صبح سویرے ہی میں نے کوسومی کو جا اٹھایا۔ ویسے اسے کیا تیاری کرنی تھی لیکن پھر بھی بتانا ضروری تھا کہ پاسپورٹ' ٹکٹ آ گئے ہیں اور آج ہم برما سے نکل رہے ہیں۔

میں نے ہوٹل کے لاکر سے بریف کیس نکالا اور بسولا کے ساتھ ٹریولرز چیک بنوانے چل پڑا۔

مدن بسولا بہت خوش تھا۔ ہوٹل کی گاڑی لایا تھا۔ اور خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

راستے بھر وہ مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ کبھی گنگناتا رہا۔

میں نے پوچھا۔ "بہت خوش ہو مدن! کیا بات ہے؟"

بولا۔ "سر! آپ بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم سرکار کہ مدن کیوں خوش ہے؟"

میں نے ویسے ہی کہہ دیا۔ "نہیں تو مجھے کیا خبر۔"

بولا۔ "آپ نے مجھے لکھ پتی کر دیا۔ ہم خادموں کے لئے یہی بہت بڑی بات ہے دوسری بات' یہ کہ سر! میری محبوبہ آخر کار مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ مانتی ہی نہیں تھی۔ ٹال رہی تھی دو برس سے۔"

بولا۔ "کہتی تھی تیرے پاس فیملی کو سپورٹ کرنے کا پیسا نہیں ہے۔"

میں ہنسا تو وہ جوش کے ساتھ کہنے لگا۔ "سر! آپ نے میری لائف بنا دی۔ جندہ باد۔"

گاڑی کونٹی نینٹل کے پورچ کی طرف بڑھی ایک ساتھ میری اور مدن کی نظر پڑی۔ ہوٹل کی ویسی ہی ایک گاڑی ہم سے پہلے پورچ میں رکی کھڑی تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سے کوئی اترنے والا تھا اور اترتے اترتے اس نے بڑی خوشامد' بڑی لیچڑپن سے مدن بسولا کو آواز دی تھی۔ "سر! بسولا سر!" منیجر نے سر گھما کر اسے دیکھا اور گالی دی۔

اس نے خوشامد میں پھر آواز لگائی۔ منیجر صاحب! سر! آدھے رستے سے واپس آنا پڑا۔ ڈرائیور میرا بی۔ مار۔"

میں نے دیکھا یہ اترنے والا۔ منیجر کو خوشامد بھری آواز میں بیماری کی خبر دینے والا نہار سنگھ تھا۔

نہار سنگھ! او خدا! وہ گاڑی سے اسی طرح اتر رہا تھا جیسے شکار بنگلے میں اس رات بستر سے اتر رہا تھا۔ چیتے کی طرح اچھل کر۔

لاحول ولا قوتہ۔ یہ سسرا! بدمعاش اس وقت کہاں سے آن مرا۔ میں نے سر جھکا کر چہرہ چھپا کر ایک طرف نکل جانا چاہا مگر نہار سنگھ نے مجھے دیکھ لیا تھا اور پہچان لیا تھا۔

اس نے آواز لگائی۔ "ارے! تم! سالا!" میں گاڑی سے اتر کر ہوٹل کے لاؤنج کی طرف جھپٹا۔

نہار سنگھ کی منحوس پکار پھر سنائی دی۔ "اے! سالا! رکو! جاتا کدھر ہے؟"

مدن بسولا اس بدتمیزی پر بہت خفا ہوا اس کی دھاڑ سنائی دی۔ "نہار سنگھ! تو پاگل ہو گیا ہے؟ کیا بک رہا ہے؟"

میرے پاس شاید ایک منٹ تھا اور اس ایک منٹ کے بعد مدن بسولا کی سلطنت میں ہماری ڈھنڈیا شروع ہو جانی تھی۔

میں لفٹ لے کر سیدھا اپنی لینڈنگ پر پھر مداری کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ تھپتھپا کر میں نے بنگلا میں تیز سرگوشی میں کہا۔ "کوسومی! بابا! میں شیر علی' کھیل ختم ہو گیا۔ چلو فوراً۔"

پہلی آواز پر کچھ نہیں ہوا۔ میرا دل بڑی دیوانگی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ "کوسومی! کھولو۔ دروازہ کھولو کوسومی! خطرہ ہے' جلدی۔"

اندر سے اس کی ڈری ہوئی آواز سنائی دی۔ "بابا سو رہا ہے کیا بات ہے؟"

او خدا! کیسے لوگ ہیں۔ یہ سونے کا وقت ہے؟ میں نے بے دھڑک ہو کر چیخ کر بنگلا میں کہا۔ "کوسومی۔ دشمن آ گئے۔ وردی اٹھاؤ۔ نکل چلو۔"

لمحے بھر بعد اس نے دروازہ کی ہلکی سی جھری سے جھانکا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں وردی کے بنڈل تھے۔ میں دھکا دیتا ہوا کمرے میں جا گھسا۔ شور سن کر مداری بیدار ہو گیا تھا مگر ابھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔ کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "اٹھو۔ منیجر اور پولیس والے آ رہے ہیں' دونوں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھیں پٹپٹائیں۔

مداری کو سمجھنے میں دو چار لمحے لگے۔ اس دوران نچلی منزلوں سے ہلکی جھنجھناہٹ اور لوگوں کے پرہیجان ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہم پکڑے گئے۔ میں نے سوچا۔ اب بچنا مشکل ہے۔

مگر میری پٹھان تربیت کا تقاضا تھا کہ مشکل میں راستہ نکالنے کی ترکیب سوچی جائے۔

میں نے تیزی سے چیزوں کی فہرست یاد کرنی شروع کر دی۔ پاسپورٹ اور سفری چیک میرے ساتھ ہیں۔ بریف کیس میں رکھے ہیں۔ نکل بھاگنے کے لئے ہوٹل اسٹاف کی وردیاں حاصل کی تھیں۔ وہ ان دونوں کی تو یہاں موجود ہیں۔ میری وردی میرے کمرے میں رکھی ہے اس وقت کمرے میں گھسنے کا موقع نہیں بلکہ اب تو جھانکنے کا

بھی وقت نہیں ہے۔ دوسرا سامان میرے لئے بے کار ہو گیا تھا اس لئے کہ کمرے میں پڑا تھا۔ کسی طرح ان دونوں دادا پوتی کو اس لینڈنگ سے ہٹا دیا جائے۔ میں نے بڑھ کر مداری بڑے میاں کا ہاتھ تھاما اور کوسومی کو پیچھے آنے کا کہتے ہوئے لفٹ کو پیچھے چھوڑتا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ اب تک تو لفٹ کے نظام پر ہمیں گھیرنے والوں کا قبضہ ہو چکا ہو گا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے پکڑا جانا یقینی تھا۔ کچھ وقت حاصل کرنے کی بس یہی صورت تھی کہ ہم فی الحال اوپر کی منزلوں پر چڑھ جائیں۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کم سے کم بڑے میاں اور کوسومی اوپر جا کر ہوٹل کی وردی تو پہن سکتے تھے۔ میں وردی کے بغیر ہی کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔

اوپر کی منزل پر ہوٹل والوں کا "چادر اسٹور" کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اسٹور میں داخل ہوا تو دیکھا شعبہ آرائش کی وہی عورت مورا مونگ جس سے میں نے وردیاں خریدی تھیں۔ اسٹور میں کچھ اٹھا دھری کر رہی تھی۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر پہلے وہ سمجھی میں اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے اسٹور میں گھس رہا ہوں۔ تو اس نے بانہیں لہرا کر برمی زبان میں کچھ ایسا کہا جس کا مطلب نکلتا یہ تھا کہ پہلے کنواں مسافر کے پاس پہنچا تو مسافر پیاسا تھا اب کیوں مسافر بے تاب ہو کے کنویں کی تلاش میں رستے جھانکتا پھرتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے میرے پیچھے دیکھا تو اسے صرف کوسومی نظر آئی ہنس کے بولی۔

"اس بار بھی غلط سمجھی۔ مسافر اپنا کنواں اپنے ساتھ لایا ہے۔ ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں' تم دونوں آ جاؤ۔" عجیب عورت تھی۔ ایک بات کے سوا اس کے دماغ میں کوئی اور بات جگہ نہیں کر پا رہی تھی۔

میں نے برابر سے گزرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب وہ کھلکھلا کے ہنسی مگر فوراً ہی اس نے مداری بڑے میاں کو بھی دیکھا اور مسکرانا تک بند کر دیا۔

میں نے کہا۔ "مورا مونگ تم یہیں رکو گی ہمارے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ تم ہمیں نکلنے کا رستہ بتاؤ گی۔"

وہ بولی۔ "پہلے یہ کہو کون لوگ تمہارے پیچھے لگے ہیں؟ پولیس؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

"ہوٹل والے؟"

میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "نہیں ہوٹل والے نہیں۔" مگر میں نے سوچ کر جواب دیا تھا شاید میرا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔

کہنے لگی۔ ”ہوٹل والے ہی ہوں گے۔ تم دوسرے ہوٹل کے ایجنٹ ہو‘ ہماری وردیاں لے جا رہے ہو۔ نقل کرو گے ان وردیوں کی۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارا کھوج لگالیا۔ اب وہ پکڑنے آرہے ہیں۔ بولو ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“

میں نے لمحے بھر میں سوچ لیا۔ ٹھک ہے اسے یہی سمجھنے دو۔ کیا حرج ہے۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

اس نے بھی مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا اور ساتھ ہی ایک دم چیختی ہوئی وہ باہر کی طرف جھپٹی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ”ارے یہاں ہیں۔ یہاں ہیں وہ بدمعاش۔ ادھر اسٹور میں۔“

میں نے دروازے سے نکلتے نکلتے اسے دبوچ لیا اور اندر کھینچ کر اسٹور کا دروازہ فوراً بند کرلیا۔ اگر ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو دور کونے کے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اس مہمان نے تو سمجھو مجھے دیکھ ہی لیا تھا۔ پھر شائد اپنا وہ دروازہ بند کرلیتا اور انٹرکوم پر ہوٹل کی انتظامیہ کو بتا دیتا کہ اس طرح تمہارے اسٹور میں کچھ شور ہوا ہے۔

میں مورا مونگ کو دروازے کے عین پیچھے فرش پر دبوچ بیٹھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر سختی سے جما ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ کا گھیرا اس کی کمر کے گرد تنگ تھا۔ اسے بے بس کیے میں فرش پر ایک گھٹنا ٹکائے دم سادھے بیٹھا تھا۔

ہوٹل کے جس مہمان نے جائزہ لینے کو دروازہ کھولا تھا کچھ دیر تک وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا ہوگا۔ جب کوئی ہنگامہ‘ ہیجان اسے نظر نہ آیا تو اس نے ”ہیلو ہیلو۔ کیا بات ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟“ کہہ کر کوریڈور میں دو تین آوازیں دیں پھر جب کوئی جواب نہ آیا تو دروازہ بند کرلیا۔ وہ لہجے سے غیر ملکی‘ شاید امریکن لگ رہا تھا۔ برمی زبان نہیں جانتا ہوگا۔ اس لئے سمجھ نہ سکا کہ کہاں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔

میں ہوٹل کی مورا مونگ کو دبوچے بیٹھا رہا۔ اس عرصے میں کوسومی نے ریک کے پیچھے جاکر نہ صرف خود وردی پہن لی تھی بلکہ اب اپنے دادا کو بھیج دیا تھا۔ لڑکی ہوشیار تھی۔

بڑے میاں کو وردی پہننے میں دیر لگی۔ شاید اسے پیٹی کسنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے پوتی کو آواز دے لی۔ لڑکی کے ٹہلتے ہی لگا کہ میرے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت میں ایک تبدیلی آگئی ہے۔ اس کے بدن کا تناؤ ختم ہو گیا تھا اور وہ آسائش اور ڈھیلے پن سے میری گود میں جگہ بناتی جا رہی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے ایک ہاتھ آزاد

کرکے میرے چہرے تک پہنچا دیا تھا اور میرا رخسار سہلانے لگی تھی۔

کیا چیز تھی وہ!

میں نے اس کے منہ پر گرفت سخت کرکے ایک بار جھٹکا سا دیا۔ ”سیدھی بیٹھ نہیں تو ککڑی کی طرح گردن توڑ دوں گا۔“

اس نے غوں غوں کی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی۔

میں نے اس سے آہستہ سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟۔ میں منہ پر سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں مگر سن لے اگر اب کے شور کیا تو مار دوں گا۔ خنجر ہے میرے پاس۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔

آہستہ آہستہ میری گرفت میں پھیلتے پھسلتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔ ”اس لڑکی سے اور بڈھے سے پیچھا چھڑا۔ میں تجھے اپنے ریسٹ روم میں لے جاؤں گی۔ کچھ دیر وہاں چھپا رہنا۔ بعد میں ہوٹل سے نکال دوں گی۔ میرا ذمہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تھا اور وہ اسی طرح مسکرائی تھی۔

وہ بہت پکی تھی۔ میں نے اسے نرمی سے گردن سے دبوچ لیا اور خود سے دور کرتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ جو بھی پرابلم ہے وہ تم ہمارے جانے کے بعد دور کرلینا۔ ابھی بس ایک بات سمجھ لو۔ میں تمہارا ٹائپ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو میں اس وقت بھاگ رہا ہوں۔ کوئی پاگل ہی ایسے وقت میں بدمعاشیاں کرنے کی سوچے گا۔“

وہ ہنسی۔ ”اسے بدمعاشیاں سمجھتے ہو تم؟ پھر تو تم کھانا بھی نہیں کھاتے ہو گے اور وہ بھی بدمعاشی ہو گی؟“

میں نے کہا۔ ”سنو۔ یہ وقت علمی گفتگو کا نہیں ہے۔ تمہیں بھی کسی طرح کی جلدی ہے۔ میں اپنا بتا چکا ہوں اپنی جان اور ہمارا پلان بچانے کے لئے خاموشی سے اسٹور میں بیٹھی رہو۔“

اب کے وہ نشہ کی ہوئی عورت کی طرح ہاتھ لہرا کے ہنسی۔ ”تمہارا پلان اور میری جان بس اسی طرح بچ سکتی ہے کہ میرے ساتھ ابھی ریسٹ روم میں چلو۔“

اس نے جو کہا تھا وہ کوسومی نے سن اور سمجھ لیا۔ میں نے دیکھا وہ سن کر پشیمان ہوئی تھی اور کھسیاسی گئی تھی۔ کوسومی کے ہاتھ میں اس وقت ایک نیا ڈسٹر تھا۔ جو اس نے کہیں سے اٹھایا تھا وہ اس سے اپنے جوتے صاف کرنے کو جھکی تھی۔ میں نے اشارے سے

اس سے ڈسٹر مانگا اور اس سے پہلے کہ ہوٹل والی کچھ سمجھ سکتی' اس کا منہ کھول کر ڈسٹر کا بیشتر حصہ اندر ٹھونس دیا۔ کچھ دیر اسے دبوچے رکھا پھر کوسومی سے اور کپڑا لے کر موٹا کے ڈھاٹا کس دیا اور خود اس کی کمر کی پیٹی اور ٹوائن سے ہاتھ پیر باندھ کر اسے اسٹور کے سب سے مضبوط ریک سے باندھ دیا۔

باندھ چکا تو میں نے پیٹھ تھپتھپا کر ہوٹل والی کو شاباش دی۔ "تعاون کا شکریہ"

اس نے بے بسی میں سر جھٹکا اور غوں غوں کی آواز نکالی۔ اب وہ یقیناً مجھے گالیاں دے رہی ہوگی۔

نیچے کی منزل سے بہت سے شور کی آواز آئی میں سمجھ گیا وہ لوگ میرے کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ آواز اور ہوٹل والی مورا مونگ کی آواز کو اس منزل کا امریکی مسافر لمحے بھر میں ملا کر سمجھنے کی کوشش کرے گا اور انتظامیہ سے رابطہ قائم کرلے گا۔ یہ منزل ایک لمحے بھی ٹھہرنے کے لئے مخدوش ہوچکی ہے۔ میں نے دھلی' استری کی ہوئی چادریں اٹھالیں اور تلے اوپر رکھ کر بڑے میاں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر جمادیں۔ اب تو قریب سے دیکھنے پر بھی وہ دونوں ہوٹل کے صفائی کے عملے کے رکن لگ رہے تھے۔

پھر میں نے ایک مضبوط سا تکیے کا غلاف پسند کیا۔ اسی غلاف کو تھیلے کی طرح کھول کر میں نے اپنے بریف کیس کے سب کاغذات۔ یعنی تینوں برمی پاسپورٹ اور اربوں کی مالیت کے سفر چیک اس غلاف میں الٹ دیے اور پہلے مداری بڑے میاں سے پھر خاص طور پر کوسومی سے ان سب "کاغذوں' کی جان کی طرح حفاظت کرنے کا وعدہ لیا۔ میں نے کہا آگ اور پانی اور چوروں سے ان کاغذوں کو بچاؤ گے تو ہم سب مہاراجوں کی طرح کہیں بھی رہ سکیں گے کسی بھی جگہ بچ کے نکل جائیں گے۔

کوسومی نے وعدہ کیا کہ وہ جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرے گی۔ مجھے اس پر پورا اعتبار تھا۔ میں نے بیڈ شیٹس کے ایک گٹھے کے ساتھ یہ غلاف تھیلا کوسومی کے حوالے کردیا۔ میری جیب میں چھوٹے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی تھی جلدی میں جسے تیز جگہ تقسیم کر کے دو حصے دادا پوتی کے حوالے کیے۔ ایک خود میں نے رکھا۔ بڑے میاں کو سمجھایا کہ اول تو ہم تینوں ساتھ نکلنے کی کوشش کریں گے اور خدا کرے گا تو نکل بھی جائیں گے: لیکن اگر ساتھ نہ نکل سکے' بچھڑ گئے تو چوبیس گھنٹے بعد پھر اڑتالیس گھنٹے بعد پھر بہتر گھنٹے بعد رنگون شہر کے پرانے تاریخی قبرستان میں سے آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے مزار پر ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہیں گے۔ بہتر گھنٹے کے بعد بھی نہ ملے

تو ہم ہفتہ گزار کر آج ہی کے دن جو سوموار ہے۔ شاہ کے مزار پر مغرب کے وقت آکر دیکھ جائیں گے۔ اور اگر کسی حادثے کی وجہ سے لمبے عرصے کے لئے بچھڑ گئے تو کوئی بھی سوموار مغرب کا وقت ہمارے رابطے کا دن اور وقت ہوگا۔

میں نے کہا۔ "جاؤ خدا حافظ۔ اب ہوٹل سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

کوسومی اس خدا حافظ کو آخری اور قطعی الوداع سمجھی۔ وہ روہانسی ہوگئی مگر دادا نے کہا کہ اول تو ہم ہوٹل سے ایک ساتھ نکلیں گے۔ ورنہ چوبیس گھنٹے بعد تو شیر علی سے ملاقات ضرور ہوگی۔ تو فکر نہ کر۔ وہ دونوں ہوٹل کے مستعد ملازموں کی طرح اپنا بوجھ اٹھائے مڑے اور زینہ اتر گئے۔

میں تیزی سے لفٹ کی طرف چلا گیا۔ صبح کے وقت یہاں ہوٹل سے نکلنے والوں اور ہوٹل میں ملاقات اور کاروبار کے لیے ملنے آنے والوں کی ایک سرگرمی سی ضرور رہتی ہوگی۔ میں ـــ لوگوں سے خاص طور پر بسولا اور نہار سنگھ سے بچتا ہوا اور ان کے ہاؤس ڈیٹیکٹیو کی نظروں میں آئے بغیر نیچے لابی میں پہنچ گیا تو پھر سمجھو نکل جاؤں گا۔

تیز مگر باوقار انداز میں لفٹ کے بورڈ کے پاس پہنچا اور لفٹ بلانے کے لئے بٹن دبادیا۔ میں نے آتی ہوئی کیرج کی آواز سنی۔ وہ اس منزل پر رکنے والی تھی۔

میں بورڈ سے کچھ دور آرائشی گملوں' آئینوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لفٹ کے کھلتے دروازے کی طرف میں نے پشت کرلی۔

شکر ہے' مجھے تلاش کرنے والے لفٹ میں نہیں تھے۔ لفٹ چلانے والا بھی نہیں تھا۔ اس کا ہونا بھی خطرناک تھا۔ اسے انہوں نے خبردار کردیا ہوگا۔

گوروں کا ایک جوڑا بانہوں میں بانہیں ڈالے مجھ دیسی آدمی کو نظر انداز کرتا لفٹ سے نکلا اور ایک طرف چلا گیا۔ میں نے خالی لفٹ میں قدم رکھ دیا اور نیچے جانے کے لئے بٹن دبادیا۔

کچھ نہیں ہوا لفٹ کو کسی نے اوپری منزل سے طلب کیا تھا۔ وہ اوپر جارہی تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔ میں لفٹ کو نیچے لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خودکار نظام کے تحت اوپر جارہی تھی۔ خدا معلوم اوپر کون ہو۔ فرار کا راستہ نیچے تھا۔ مجھے نیچے جانے کی جلدی تھی۔

میں نے لفٹ روکنے کو ایمر جنسی بٹن دبادیا۔ سوچا کہ اب میں کیرج کو نیچے لے جانے کی کوشش کروں گا۔ خودکار نظام کو بے اثر کرنے کی کوئی تو صورت ہوگی۔ شاید

صورت یہی ہو۔

لفٹ رک گئی اور جب میں نے اسے گراؤنڈ فلور پر لے جانے کے لئے وہ بٹن دبایا جس پر انگریزی حروف جی لکھا تھا تو نہ معلوم کس شیطانی نظام کے تحت بجلی کے سرکٹ نے میرے ساتھ خطرناک مذاق شروع کر دیا۔ رکی ہوئی لفٹ میں ایک دم خطرے کا الارم بجنے لگا۔

"لعنت ہے!" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ مگر الارم اتنا شور کر رہا تھا کہ خود مجھ تک میری آواز نہ پہنچ سکی۔

میں باری باری مختلف بٹنوں کو دباتا رہا۔ جھنجھلا کر میں نے بورڈ پر گھونسے بھی برسائے مگر دو منزلوں کے درمیان رکی ہوئی کیرج میں مسلسل یہ بھیانک الارم بجے جا رہا تھا۔

آگے جو بھی ہوا وہ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ برسوں بعد اب بھی یاد کرتا ہوں تو خفت میں پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔

شاید دو منٹ سے بھی کم مدت میں ہوٹل کا انجینئری ٹیکنیکل اور اسٹاف انتظامیہ کے لوگ بہ شمول مدن بسولا اور ہوٹل میں متعین پولیس والے ہوٹل کا اپنا سیکورٹی گارڈ جاسوس وغیرہ اس منزل پر پہنچ گئے جس منزل سے میں لفٹ میں سوار ہوا تھا۔ لفٹ کی کیرج کو ٹیکنیکل اسٹاف نے اپنی انجینئری کر کے نیچے پہنچایا۔ لفٹ کا دروازہ کھولا گیا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔

یہ آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ سرکٹ میں یہ الٹ پھیر مجھے گرفتار کرنے کو کیا گیا تھا کہ یہ میرے ساتھ بجلی کا کوئی بھونڈا مذاق تھا۔

مجھے پکڑ دھکڑ کر تیزی سے کھینچ کر ہوٹل کے سیکورٹی روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پولیس والوں نے ہوٹل والوں کی موجودگی میں میری زبردست تلاشی لی۔ میرے پاس کچھ نہ نکلا بس چند ہزار کے نوٹ اور ریزگاری تھی۔ مدن بسولا اپنے سیکورٹی چیف کے ساتھ نکل کر باہر بھاگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بوڑھے اور ساتھ والی لڑکی کو تلاش کرو۔ سب کچھ ان کے پاس ہوگا۔"

بہت دیر بعد منیجر مدن بسولا اور اس کا چیف سیکورٹی روم میں داخل ہوئے تو میں ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ بڑے میاں اور ان کی پوتی کامیابی کے ساتھ نکل چکے ہیں۔

وہ مارا! میں نے دل میں کہا۔

مدن بسولا، سیکورٹی روم میں منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا آیا۔ کچھ دیر مجھے بیٹھا گھورتا رہا۔ زبان سے کچھ نہ کہا اس نے بس گھورتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد آیا تو بہت پریشان تھا۔ میرا خیال ہے۔ کسی کو فون کر کے آ رہا تھا۔

میری گرفتاری کے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے کونٹی نینٹل کے سیکورٹی روم سے رنگون کے مرکزی انٹیلی جنس کے دفتر میں جسے عام طور پر سی آئی ڈی ہیڈ کوارٹر کہا جاتا تھا۔ پہنچا دیا گیا۔

سی آئی ڈی ہیڈ کوارٹر میں سب سے پہلے انہوں نے مجھے چائے پلوائی، اچھی خاصی چائے تھی۔ کونٹی نینٹل کے معیار کی۔ پھر جو ان کے افسروں، ماتحتوں نے آنا شروع کیا ہے تو سمجھو میلہ لگا دیا۔

ہر طرح کے لوگ آئے۔ حاکم بھی ماہرین بھی۔ رنگون، نئی دہلی، کلکتے، سنگاپور، بنکاک، لندن اور خدا معلوم کن کن شہروں میں تربیت پائے ہوئے جاسوس برمی، تھائی، ہندوستانی، جاپانی اور انگریز تک۔

چار دن انہوں نے مجھے سونے نہیں دیا۔ اگلے تین دن بھوکا رکھا پھر خوب پر تکلف کھانا کھلایا۔ ایک دن کھونٹی سے ہتھ کڑی باندھ کر کھڑا رکھا۔ دو دن رات کچھ بھی پینے کو نہ دیا۔ نہ پانی نہ دودھ، نہ چائے۔ کسی قسم کا رقیق مادہ مجھے نہ ملا تو میری حالت ابتر ہو گئی۔ بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے گلوکوز چڑھایا۔ چار گھنٹے کسی اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں رکھا۔ بھانت بھانت کے ڈاکٹروں نے میرا طرح طرح سے معائنہ کیا۔ پھر وہ دوبارہ مجھے سی آئی ڈی دفتر میں لے آئے۔ کوئی سنگل یا منگل صاحب۔ حرام زادہ، نئی دہلی کا تربیت یافتہ، ایک جلاد صورت ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ملنے آیا۔ مجھ سے بڑی صاف اردو میں پوچھنے لگا۔ "بھیا! تم نے کبھی ہندوستان کے کسی تھانے میں کچھ وقت گزارا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

افسوس کے ساتھ سر ہلا کر چچ چچ کرتا رہا پھر بولا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ اسے دیکھو یہ میرا ہیڈ کانسٹیبل ہندوستانی ہے۔ کوئی جگہ ہے پیلی بھیت وہاں کا جیل سپرنٹنڈنٹ تھا اس کا باپ۔ باپ نے کوشش کی یہ کچھ پڑھ لے پر اس نے پڑھ کے نہیں دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کروا دے تاکہ یہ بھی ترقی کرتے کرتے باپ کی طرح ایک دن جیل سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔"

وہ دم لینے کو رکا تو میں نے پوچھا۔ "بھیا! یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا' کہنے لگا۔ "سنو۔ جلدی مت کرو۔ بڑی مزے کی بات ہے۔ خیر جی۔ اس سالے نے پڑھ کے نہیں دیا۔ چوری چکاری' بدمعاشی میں تو ہمیشہ سے لگا رہتا تھا لو جی اس نے ایک قتل بھی کر دیا۔ پیلی بھیت کا ہی کوئی غنڈا تھا اسے گلا گھونٹ کے مار دیا تھا کوئی ایسا ہی گندہ قصہ تھا کہ وہ بدمعاش اسے اپنے قابو میں کر کے بری لائن پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ بعض غیر فطری سوچ رکھنے والے کرتے ہیں۔ اس ہیڈ کانسٹیبل کی عمر اس وقت سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ سمجھ گئے ہوں گے وہ غنڈا اسے کیوں گھیرنا چاہتا تھا؟ خیر جی باپ نے اسے پیلی بھیت سے دہلی بھیج دیا تو اس کی ساری ٹریننگ۔ پولیس کی نہیں' بدمعاشی کی۔ ساری ٹریننگ دہلی کے بدمعاشوں' چوروں' نقب زنوں' کے بیچ ہوئی ہے۔ یہ اب تک سولہ سترہ قتل کر چکا ہے عمر اس کی زیادہ نہیں ستائیس اٹھائیس سال کا ہو گا مگر نشوں کی زیادتی اور طرح طرح کی عورتوں کے ساتھ وقت گزار کے اس نے اپنا حلیہ ایسا کر لیا ہے۔ چالیس سے کم کا نہیں دکھتا۔ یقین کرو بھیا یہ پورے تیس برس کا بھی نہیں ہے۔" وہ رکا' مجھے احتیاطاً ہاتھ اٹھا کر اس نے بولنے سے روک دیا تھا۔

سانس درست کر کے سنگل یا منگل صاحب پھر شروع ہو گیا۔ مجھے تو وہ خود بھی بیمار لگتا تھا حالانکہ جوان سا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ "خیر جی بھیا تمہیں اس سالے ہیڈ کانسٹیبل کا کونا شادی تو کرانا نہیں ہے جو اس کی لائف ہسٹری پر اتنی بہت سی بات کریں۔ اس نے دس گیارہ برس جس حرام زادے پن میں گزارے ہیں بھیا جی اس کا سوچ کے مجھے تک جھرجھری آ جاتی ہے۔ تم تو پھر ابھی لڑکے ہو۔ تو تم کہہ رہے ہو تم نے ہندوستان کا کوئی تھانہ نہیں دیکھا؟ آج تک؟"

میں نے کہا۔ "ہاں واقعی میں نے نہیں دیکھا۔"

سنگل صاحب اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "چلو کوئی بات نہیں' اب ہمارا ہیڈ کانسٹیبل آ گیا ہے۔ یہ تمہیں چھ آٹھ گھنٹے میں سب کچھ بتا دے گا۔ مطلب اگر اس حرام زادے نے تمہیں مار نہیں ڈالا تو چھ آٹھ گھنٹے میں تم کو اچھی طرح خبر لگ جائے گی کہ ہندوستان کے تھانوں میں ملزموں سے کس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ہاں ایک بات۔" کہہ کے وہ رکا۔ وہ ہیڈ کوارٹر کے اس کمرے کے دروازے کے برابر دیوار میں لگے ایک لال سوئچ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ لال رنگ کا سوئچ دبا دو گے تو میں آ جاؤں گا۔ اور اس حرام زادے ہیڈ کانسٹیبل سے تمہارا پیچھا چھڑا دوں گا۔ بلاوجہ یہ سوئچ مت دبانا نہیں تو اور مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ جب تم یہ سمجھو کہ ہیڈ کانسٹیبل جو کچھ کر رہا ہے وہ تمہارے بس سے باہر اور تم سچ سچ صحیح صحیح اپنے بیاں دے سکتے ہو تو اس وقت یہ سوئچ دبانا۔ میں آ کر تمہارا بیان لے لوں گا اور اس سالے ہیڈ کانسٹیبل سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔" یہ کہہ کر سنگل یا منگل صاحب چلا گیا۔

دراصل دس بارہ دن میں انہوں نے میرا بیان لینے کے لیے ہر طریقہ آزما کے دیکھ لیا تھا۔ یعنی ہر قانونی طریقہ۔ میرا بیان مختصر تھا اور یہی تھا کہ میں برمی باشندہ ہوں۔ میرا نام رانا لیش پال چھترپال مہاویر جگن مہادیو ہے۔ میرے بابا راجا چھترپال دھرن پال مہاویر جگن مہادیو علاقہ چیت پور سونیا کے جاگیردار ہیں۔ جاگیر تو خیر اب نہیں رہی تاہم چیت پور سونیا کا جنگل ہماری ٹیک کی لکڑی کی اسٹیٹ ہے۔ ہم برما سے باہر سیر و سیاحت پر جانے کے لئے کونٹی نینٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں لابی میں آنے کے لئے لفٹ پر سوار ہوا۔ لفٹ درمیان میں رک گئی۔ میں نے الارم بجا دیا۔ مجھے ہوٹل کے اسٹاف نے لفٹ سے نکالا اور اس کے بعد سے ہر شخص مجھ سے بدسلوکی کر رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ مہارانا سرکار' میرے بابا اور دھرم پتنی رانی صاحبہ کہاں ہیں تو لوگ میرا مذاق اڑاتے اور مجھے دھمکاتے ہیں۔ دراصل ہمارے پاسپورٹ اور شناخت کے سارے ثبوت رانی صاحبہ کے پاس ہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ رانی صاحبہ سے رابطہ کر کے میرے بیان کی تصدیق کر لے اور مجھے چھوڑ دے۔

ظاہر ہے اس بیان میں صرف ایک بات سچی تھی کہ ان ناموں کے تین پاسپورٹ جاری ہوئے ہیں۔ برمی وزیر جس نے تین لاکھ لے کے پاسپورٹ جاری کئے تھے یا تو اب تک مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہو گا یا پھنسنے والا ہو گا۔ اس نے اپنے طور پر بھی مجھ سے سچ اگلوانے کی کوشش کی تھی اور لوگ بھیجے تھے تاکہ کسی طرح جعل سازی کے اس پھندے سے وہ اپنی گردن نکال سکے مگر میں نے اس کی ہر کوشش کو اپنے اٹل بیان کے ذریعے ناکام کر دیا تھا۔

سب جانتے تھے کہ چیت پور سونیا نام کی کوئی جاگیر' جنگل اسٹیٹ کہیں نہیں ہے۔ مگر وزیر کے ریکارڈ میں ہمارے نام رانا فلاں فلاں اور رانی فلاں فلاں لکھے ہوئے ہوں گے۔ جب تک وہ تین پاسپورٹ وزیر کے ہاتھ میں نہیں آ جاتے۔ اس کی گردن

پھندے میں پھنسی رہے گی۔ سب سمجھ گئے تھے کہ پاسپورٹ بوڑھے اور اس کے ساتھ کی لڑکی کے قبضے میں ہوں گے اور تمام حیرت ناک رقمیں بھی انہی دو کے پاس ہوں گی۔ مدن بسولا نے جواہر کی فروخت اور نقد رقموں کے سفری چیکوں میں تبدیل کیے جانے کی پوری داستان مجبوراً حکام کو سنا دی ہو گی اور نہار سنگھ نے مجبوراً بتا دیا ہو گا کہ جو ہیرے بکے ہیں وہ ستنا گڑھی کی جوئی ناہر سین کے بریسلٹ اور ہار کے ہیرے ہیں۔ غرض ہر سطح پر ایک کھلبلی مچ رہی ہو گی۔ میں نے دس دنوں میں بہت سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو تاڑ لیا تھا کہ وہ ستنا گڑھی کے سابق راجا موٹے ناہر سین کے بھیجے ہوئے آئے ہیں اور اس کے خاندانی زیورات یعنی اس انتہائی قیمتی بریسلٹ اور ہار کا سراغ لگانے آئے ہیں۔

مگر سب کے لئے میرا ایک ہی بیان تھا کہ میں تو رانا لیش پال فلاں فلاں ہوں۔ پشت ہا پشت سے ہمارے ٹیک کی لکڑی کے جنگل چلے آ رہے ہیں۔

پولیس شاید جوہریوں کو بھی گھیر لائی تھی۔ یعنی اتنی بڑی رقمیں اور اتنی بڑی پارٹیاں اس میں ملوث ہو چکی تھیں کہ چھوٹا موٹا پولیس افسر تو اپنی نوکری کی خیر منا رہا ہو گا اور وردی میں کانپ رہا ہو گا۔ بڑے حکام اور اہم افسران رقموں کی تفصیل سن کر منہ میں پانی بھر بھر لاتے ہوں گے مگر مجبوری تھی۔ معاملہ بڑا تھا۔

یہ نیا آدمی منگل صاحب یا سنگل صاحب۔ اپنے قصائی ہیڈ کانسٹیبل کو انتہائی اقدام کے طور پر لایا تھا۔ میں نے دانت پر دانت جما کر سوچا کہ شیر علی خاں تیار ہو جاؤ۔ یہ پولیس والا بالکل آخری درجے کی کارروائی کرے گا۔ چند ہی ہڈیاں بدن میں سلامت رہنے دے گا۔ یہ حرام زادہ صورت ہی سے لگتا تھا کہ پیشہ ور قاتل ہے۔

منگل سنگل صاحب کے جاتے ہی ہیڈ کانسٹیبل نے اندر سے کمرے کے بولٹ چڑھا دیے اور اپنی چمڑے کی پیٹی کھول لی۔ پیٹی کے ایک سرے پر پیتل میں ڈھلا بری پولیس کا نشان بکسوئے کے طور پر لگایا گیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے پیٹی کو دوسری ہلکی طرف سے اپنے چوڑے چکلے پنجے میں جکڑ لیا اور بیلٹ کو اپنے سر کے گرد کئی بار تیزی سے گردش دی۔ پیتل کا نشان بھاری ہونے کے باوجود ہوا میں شاں شاں کی بھیانک آواز پیدا کر رہا تھا۔

وہ بیلٹ لہراتا ہوا بڑھا اور میں نے دل میں کہا کہ شیر علی! یہ نشے باز اور اوباش آدمی ہے اس میں اتنی جان تو نہیں رہی ہو گی کہ تمہیں قابو کر لے۔ اس کا پہلا وار ہی کھوٹا کر دو تاکہ تمہارا پلہ شروع ہی سے بھاری رہے۔

میں نے بایاں ہاتھ بیلٹ کے بھاری سرے کو روکنے کے لئے بڑھایا اور دایاں پیر چلاتے ہوئے بڑھ کر اس پولیئے پر جھپٹا۔ وہ ایسے کسی حملے کے لئے تیار تھا۔ بیلٹ کو میری گرفت سے بچاتے ہوئے اس نے میرے دائیں پیر کو نشانہ بنایا۔

میں نے سنا میری چیخ نکل گئی تھی۔ پولیس والے کی پیٹی کا بھاری نشان سیدھا میرے ٹخنے پر لگا تھا۔

پیروں میں مضبوط قیمتی جوتے ہوتے اس ضرب نے مجھے اچھال کر پھینک دیا۔ لگتا تھا پیر پر کلہاڑے سے وار کیا گیا ہے۔ میں فرش پر پڑا تھا اور بھرپور چوٹ کھائے ہوئے اپنے پیر کو کانپتا لرزتا دیکھ رہا تھا مگر تکلیف ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اگر جنگلوں میں پہنے جانے والا بھاری کیمیکل شو میرے پاؤں میں نہ ہوتا تو پنجا کٹ کر گر سکتا تھا۔ ٹخنے کی ہڈی کرچی کرچی ہو سکتی تھی۔ میں نے دیکھا پیتل کے بکسوئے نے جوتا کاٹ دیا تھا۔ پیر میں پہنا ہوا پیلا اونی موزا کٹے ہوئے چمڑے سے باہر نکل آیا تھا۔

پیلی بھیتی ہیڈ کانسٹیبل مجھے فرش پر بے بس پڑا دیکھ کر ہنسا۔ اپنی بھدی بھیانک آواز میں اپنی سرکاری پیٹی کو سر کے گرد گھمایا اور میرے شانے کو نشانہ بنایا۔ میرا دایاں پیر ابھی تک بے حس تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے وار سے بچنے کو میں فرش پر لوٹ لگا سکتا تھا مگر اس کے لئے مجھے اپنی دائیں ٹانگ کو رول کر کے کروٹ لینی پڑتی اور دائیں ٹانگ ابھی بے کار تھی۔ سمجھو اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس قصائی کا یہ دوسرا وار میرے شانے کے پر گوشت حصے پر تھا۔ بری پولیس کا پیتل نشان اس نے میرے شانے پر کھڑا نہیں لگایا تھا۔ طمانچے کی طرح چوڑائی میں مارا تھا اور یہ وار میں نے سو فی صد بے بسی میں کھایا تھا۔ اگر پیلی بھیتی چاہتا تو کھڑا نشان سیدھا میری کھوپڑی پر پڑ سکتا تھا۔ اس صورت میں میرا زندہ بچنا محال ہوتا۔ اس کے دو حملوں ہی سے سمجھ میں آ گیا تھا کہ منگل سنگل حرام زادے نے جو کہا تھا وہ ایک دم درست تھا۔ خالی دھمکی نہیں تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل اپنی سہولت سے جب چاہتا مجھے ختم کر سکتا تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجے کا جلاد اور ماہر لڑاکا تھا۔

ہم بنگشوں کو قدرت کی طرف سے جہاں دلیری نصیب ہوئی ہے وہاں دانش مندی اور سوجھ بوجھ بھی بہت سی دلیر قوموں کی طرح عطا ہوئی ہے۔ میں نے سوچا یہ جلاد چھے آٹھ وار سوچ سمجھ کر کرے گا پھر جب دیکھے گا میں ٹس سے مس نہیں ہو رہا اور پوچھ گچھ کا فائدہ کوئی نہیں تو یہ مجھے زندگی بھر کے لیے اپاہج کر دے گا یا خرچ کر دے گا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ میں نے خود سے کہا شیر علی خان! دانش مندی کے ساتھ فیصلے کرنے

کاوقت آگیا ہے۔

میں گھسٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور تکلیف سے مگر قطعیت کے ساتھ میں نے لال رنگ کا سوئچ دبا دیا۔

سوئچ دبائے جانے کے پانچ چھ منٹ تک کچھ نہیں ہوا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل ہاتھ میں اپنی پٹی لیے سامنے کھڑا مجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہنستا مسکراتا رہا۔ یعنی اگر مسکرانے نام کی کوئی کارروائی وہ اپنے بھیانک چہرے سے کر سکتا تھا تو کرتا رہا۔

پانچ چھ منٹ بعد دروازہ کھلا منگل سنگل صاحب پتلون کے سامنے کے بٹن بند کرتا ہانپتا ہوا کمرے میں آیا کہنے لگا "سوری بھیاجی! باتھ روم میں تھا جب تم نے لال سوئچ دبایا۔ میں بولا کہ لو جی لڑکے نے سمجھداری کا کام کر دیا ہے۔ اس سالے ہیڈ کانسٹیبل سے پیچھا چھڑا لیا ہے لڑکے نے۔ ہاں بھیا؟ صحیح سمجھا ہوں نا میں؟"

میں نے ہاں میں سر ہلایا تو منگل سنگل صاحب ایک دم گھوم گیا۔ غصے میں اپنے جلاد سے کہنے لگا۔ "جا بھئی جا تو ادھر کیوں کھڑا ہے اب۔ سالا!"

لگتا تھا ہیڈ کانسٹیبل پر اس جھڑکی یا ابے تبے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یکسوئی سے اپنی وردی کی پتلون میں بیلٹ لگانے لگا اور جب بیلٹ لگ گئی۔ بکسوا بند ہو گیا تو کاہلی کے ساتھ تقریباً جماہی لیتا ہوا ہیڈ کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

منگل سنگل نے اس کے جاتے ہی لال سوئچ دبایا۔ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں ایک خوش پوش سکریٹری پیازی رنگ کی کلف لگی ساڑھی پہنے پیڈ اور پنسل لیے کمرے میں آ گئی۔ اس کے پیچھے ایک وردی پوش چپراسی تھا جس نے دو کرسیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

"بس دو کرسیاں لایا ہے؟" منگل سنگل کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ برمی میں بات کر رہا تھا۔ "دو کرسیاں لایا ہے سسرے۔" رتے بی بی فرش پر بیٹھے گی کیا .... پر؟ آں؟" منگل سنگل نے اپنی سکریٹری لڑکی کے سلسلے میں نہایت گھٹیا بات کہی مگر لگتا تھا چپراسی یا لڑکی نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔

"ہاں جناب!" منگل سنگل نے جناب کو زناب کی طرح کہا تھا۔ "تو جناب! پہلے چائے پی لو آپ ہاں بھیا پھر جم کے گھنٹے دو گھنٹے بات ہوئے گی ہماری آپ کی۔ اگر بیان میں بھیا کوئی حرامی پن نہیں ڈال دیا تم نے' سب صحیح صحیح بتا دیا تو آج بلکہ چار گھنٹے کے

اندر اندر میں آپ کو اس دلدر جگہ سے نکال کے سینٹرل جیل پہنچوا دوں گا۔ پرامز۔ یہ وعدہ ہے میرا۔" منگل سنگل ایسے وعدہ کر رہا تھا جیسے بچوں سے مٹھائی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔

میں ٹخنے کی چوٹ کی وجہ سے خود اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک طرف سے منگل سنگل اور دوسری طرف سے اس کی سکریٹری نے اٹھایا۔ تکلیف سے جیسے جان نکل رہی تھی۔ منگل سنگل کی سکریٹری رتے بی بی ہمدرد عورت تھی اور میں نے نوٹ کیا وہ دیسی عطر کا شوق رکھتی ہو گی۔ اس نے حنا کا عطر لگا رکھا تھا جو نئی تعلیم والی عورتیں عام طور پر نہیں لگاتیں۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو منگل سنگل نے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ بولا۔ "نام بتاؤ' نام' نام اپنا؟ جلدی۔"

میں نے بتایا شیر علی خان۔ باپ کا نام صمد خان بنگش' پیدائش سندر بن مشرقی پاکستان۔

پوچھنے لگا۔ "یہاں کیسے آئے؟ کیسے کیسے؟ جلدی۔"

اس کی سکریٹری شارٹ ہینڈ میں لکھتی جا رہی تھی۔

میں نے بتا دیا کہ اس' اس طرح کاکیسز بازار کے سلسیل چودھری نے اغوا کرکے مرضی کے خلاف برما میں اسمگل کر دیا اور بارڈر کے سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر ایک فوجی افسر کی قید میں دے دیا مجھے۔ ایک چھوٹے اسٹیمر پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا تو ایک جنگلی ریچھ جسے اسٹیمر کا مالک ادھر سے ادھر اسمگل کر رہا تھا پنجرہ توڑ کر نکل گیا۔ ریچھ نے اسٹیمر میں تباہی مچا دی۔ مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں تیرتا ہوا کنارے پر آ لگا۔ دو دن بھٹکتا رہا' تیسرے دن ایک گوری میم صاحب جوئی ناہرسین' اس کا بوڑھا برمی سکریٹری' سکریٹری کی نوجوان بیٹی جنگل میں مل گئے مجھے۔ پریشان حال بھٹکتا دیکھ کر ان تینوں نے میری بہت مدد کی۔"

اتنا بتا کر میں نے پانی مانگا۔ سکریٹری پانی لینے چلی گئی۔ منگل سنگل منہ پر ہاتھ رکھے کرسی میں دھنسا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ خود بھی اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔

اس کو سرکار کی طرف سے جو ادھر ادھر کی تفصیلات بتائی گئی تھی۔ میرا بیان ان میں فٹ بیٹھتا جا رہا تھا۔ اسٹیمر پر سوار کیے جانے تک کے واقعات میں نے سچ سچ بیان کر دیے تھے۔ ہاں میں نے اسٹیمر کے بعد سے جوڑ توڑ کرنا اور کہانی بنانا شروع کی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کونٹی نینٹل کی لفٹ میں میرے پھنسنے تک کہانی کی چولیں صحیح بیٹھی ہیں یا

نہیں۔

پانی کا وقفہ دے کر میں یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا ہے۔ اور آگے جو بیان کرتا ہے۔ اسے ذہن میں دہرالوں' احتیاط ضروری ہے۔ ٹکراؤ ہوا تو میرا اعتبار جاتا رہے گا پھر منگل سنگل اسی جلاد کو بلالے گا۔ دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ کہانی قابل اعتبار ہو اور ان کے پاس موجود فریم میں صحیح بیٹھے۔

مجھے یاد آیا کہ کونٹی نینٹل کے منیجر مدن بسولا کا کزن وہ جیپوں کا ٹھیکے دار جو اپنی جیپ میں ہمیں رنگون لایا تھا۔ گوری میم جوئی کے بوڑھے موٹے شوہر ناہر سین کے بارے میں بتا رہا تھا۔ کہ وہ دو ڈھائی برس سے اپنی سابق ریاست ستنا گڑھی سے نکلا تک نہیں ہے۔ حکومت نے اس کے باہر جانے پر پابندی لگادی ہے کیونکہ اس پر کوئی مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے پانی پیتے پیتے بوڑھے مداری کو موٹے مہاراجا ناہر سین کے وفادار سیکرٹری کے رول میں پکا کرلیا۔

اس لیے آگے میں نے بتایا کہ "جوئی میم صاحب اور بڈھے سکریٹری نے یہ جان کر کہ میں برما سے ہر صورت میں نکل جانا چاہتا ہوں یہ منصوبہ تیار کیا کہ مجھے اسٹیٹ چیت پور سونیا کا راج کمار بتایا جائے۔ بڈھا برمی سکریٹری میرا باپ مہاراجا بنے اور اس کی نوعمر بیٹی میری رانی بنے' ہم کونٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہریں اور لالچی منیجر مدن بسولا کو پیسے کھلا کر اس بات پر راضی کرلیں گے کہ وہ ہمیں جعلی ناموں سے تین پاسپورٹ بنوادے۔ اور ستنا گڑھی کے خاندانی جواہر بکوا کر رقموں کو سفری چیکوں میں تبدیل کرالے۔" میں نے کہا۔ "شاید جوئی میم صاحب اپنے بیمار شوہر راجا ناہر سین کو چوری چھپے برما سے نکال لے جانا چاہتی تھی وہ اس کے علاج کے لئے حکومت سے چھپ کر باہر رقم اکٹھا کر رہی تھی۔ کیونکہ مجھے ایسا لگا تھا کہ بوڑھے سکریٹری اور اس کی بیٹی کو جعلی ناموں سے ملک سے باہر بھیج کر وہ اپنے مہاراجا کے لئے انتظامات کرا رہی ہے۔ آگے کا تو جناب آپ کو پتا ہے کہ میں پکڑا گیا اور میرے نقلی باپ مہاراجا صاحب اور نقلی دھرم پتنی رانی صاحبہ فرار ہوگئے۔"

میرا بیان پورا ہوچکا تھا۔ ٹخنے کی چوٹ یاد کرتا ہوا میں کراہنے لگا۔ منگل سنگل صاحب نے اپنی اور اس کی سیکرٹری نے اپنے نوٹ بک بند کی اور وہ اپنی کرسیوں کے ساتھ چلے گئے۔

مجھے پورے چھے گھنٹے بعد بھاری گارڈز کے ساتھ رنگون سینٹرل جیل منتقل کر

ا گیا۔

حکومت کے پاس موجودہ واقعات کے چوکھٹے میں میری کہانی ایک وفادار سفید م بیوی اور وفادار دیسی سیکرٹری کے ایثار و قربانی کی کہانی فٹ بیٹھ رہی تھی۔

اور ہاں اگر وہ سالا نہار سنگھ گائیڈ جسے میں نے جوئی میم صاحب کے ساتھ شکار گلے میں پکڑا تھا میری اس کہانی پر اپنے دل میں یقین نہیں کرتا تو نہ کرے' جائے سسرا نہم میں۔

سینٹرل جیل میں پہنچا تو مجھے بی کلاس دی گئی۔ برما کی حالت دیکھتے ہوئے اچھے اصے انتظامات اور سہولتیں تھیں۔ کسی نے بتایا کہ کونٹی نینٹل کا منیجر بسولا صاحب دو ہری اور ہوٹل کا ایک گائیڈ یہاں بی کلاس میں رکھے گئے تھے۔ میرے آنے سے دو گھنٹے پہلے ان سب کو کسی اور جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

جیل عجیب بے کار سی جگہ ہوتی ہے۔ مجھے یہاں ڈیڑھ مہینہ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ ر کیا ہو سکتا تھا صبح ایک عمر قید بھگتنے والا قیدی گرم پانی کی بالٹی نہانے کو لے آتا۔ چائے نادیتا۔ کوئی دوسرا قیدی جمعدار' بسکٹ یا دلیا پہنچا دیتا۔ چائے کے ساتھ میں ناشتا کرلیتا۔ ہر سے ایک دن کے باسی برمی انگریزی اخبار آجاتے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ پڑھتا رہتا یہاں تک کہ دوپہر ہو جاتی۔ دوپہر میں ایک اور عمر قیدی آکے تازہ ساگ اور چاول پکاتا ور چلا جاتا۔ کھانا کھا کر میں کچھ دیر سوتا پھر ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی آجاتی تو نہا دھو کر کچھ دیر جیلر کے باغیچے میں ٹہلتا یا پودوں پھولوں کا کام کرتا۔ یہ شوق میں نے یہاں جیل میں آکر بڑھالیا تھا۔ شام کو میں دو گھنٹے دوسرے قیدیوں کو انگریزی کی ابتدائی تعلیم بھی دیتا تھا۔ سنگل منگل صاحب نے یہ خاص رعایت مجھے دلوا رکھی تھی۔ اس طرح شام کا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ رات کا کھانا مجھے اپنے ان انگریزی والے شاگردوں کے ساتھ ملتا تھا۔ اس میں کبھی انڈا مچھلی بھی ہوتی تھی۔ اتوار کو کوئی میٹھا بھی ملتا تھا مگر یہ زیادہ تر کچھ فضول سا ہوتا تھا۔ میں اپنے حصے کا میٹھا عمر قیدی کام والوں کے حوالے کر دیتا تھا۔

جیل میں آنے کے بعد ایک مرتبہ سنگل منگل صاحب دو تین افسروں کے ساتھ آیا تھا۔ انہوں نے میری تصویریں اتاری تھیں۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ مجھے ادھر اسمگل کرنے والے بارڈر پولیس کے اہل کاروں کو گھیر چکے ہیں۔ انہوں نے اہل کاروں کی آٹھ دس تصویریں بھی دکھائیں جن میں برما کی سرحدی پولیس کے انسپکٹر جمعدار کی تصویر بھی تھی۔ یہ وہی تہمد والا مسلح آدمی تھا جسے برما پاکستان بارڈر پر سلسل

چوھدری نے پیسے اور میری زنجیر پکڑائی تھی۔ میں نے انسپکٹر موجمدار کی تصویر پہچانی اور اس کے ایک دو بدمعاش سپاہیوں کی بھی نشان دہی کی۔ وہ ہمدرد گارڈ جس نے مجھے سرحدی چیک پوسٹ پر ڈبل روٹی اور دہی کھانے کو دیا تھا پانی کو پوچھتا تھا میں نے اس کی تصویر دیکھ کر ہٹا دی کہ نہیں یہ موجمدار انسپکٹر کے ساتھیوں میں نہیں تھا۔ اس بھلے آدمی کو اچھے سلوک کا اتنا صلہ تو دینا چاہیے تھے۔

ایک بار کے سوانہ منگل سنگل صاحب آیا نہ کوئی اور افسر ۔۔۔۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا مجھے جیل میں ڈال کر وہ لوگ بھول چکے تھے یا شاید وزیروں پانچ ستارہ ہوٹل والوں اور سابق راجاؤں' ان کی سفید فام "باوفا" بیویوں کے بیچ کسی طرح کا معاملہ طے ہو رہا تھا۔ شاید لین دین سودے بازی چل رہی ہوگی۔

ٹھیک ڈیڑھ مہینے بعد جب میں انگریزی پڑھانے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے بی کلاس کے کمپاؤنڈ میں بند ہونے کے لیے جا رہا تھا تو ایک اسسٹنٹ جیلر اور پانچ گارڈ' جیل کی مین بلڈنگ کی طرف سے ایک جیپ میں آئے اور مجھے جیپ میں بٹھا کر مین بلڈنگ کی طرف لے چلے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سنگل منگل اور دس بارہ سول اور فوجی افسر موجود تھے۔ مجھے دروازے کے پاس ایک کرسی دے کر بٹھا دیا گیا اور وہ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو کاغذات دکھانے لگے۔

ان کے انداز نے مجھے ڈرا دیا۔ سنگل منگل ایک دم بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور بات بات پر اپنے ساتھ کے افسروں سے جھگڑ رہا تھا۔ آخر کچھ طے ہوا اور مجھے اور سنگل منگل کو ایک گارڈ کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ گارڈ دروازہ بند کر کے باہر کھڑا ہو گیا۔

منگل سنگل یا جو بھی اس کا نام تھا مجھے خاموشی سے گھور کر دیکھتا رہا پھر بولا۔
"بھیا تم نے آخر حرامی پن کر ہی دیا اور اپنی موت بلا لی۔"

میں واقعی کچھ نہیں سمجھا تھا میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں نہیں سمجھا۔ منگل سنگل نے اپنے کاغذوں میں سے دو تصویریں نکالیں' ایک چھپالی دوسری میری طرف بڑھا دی۔ یہ تصویر برمی اسٹیمر کے ناخدا کی تھی۔ کہنے لگا۔ "اسے پہچانا؟"

میں نے بتا دیا کہ ہاں یہ اسی اسٹیمر کا ناخدا ہے جس پر سے میں نے پانی میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی تھی۔

سنگل منگل نے ہاں میں سر ہلایا بولا۔ "یہ ناخدا حلف اٹھا کر کہہ رہا ہے کہ اسٹیمر ایک برمی بوڑھا اور اس کی نوعمر پوتی بھی موجود تھے جو تیرے ساتھ ہی فرار ہوئے ں۔ مطلب سمجھا بھیا اس بات کا؟ مطلب یہ ہے کہ جوئی ناہر سین کے برمی سکریٹری ر اس کی بیٹی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تم نے ہمیں جھوٹ بتایا ہے۔ یہ تمہاری پارٹی کا آدمی ہ۔ سیدھے سبھاؤ بتا دو کہ بوڑھا اور اس کی پوتی کہاں ہیں اور۔ ان کے پاس جو بے گنتی ڈلرز چیک اور تین پاسپورٹ ہیں وہ ہمیں ۔۔۔ برمیز گورنمنٹ کو کس طرح مل سکتے ں۔"

میں نے کہا۔ "خدا جانتا ہے بڈھا اور وہ لڑکی کہاں ہے۔ خدا کی قسم مجھے نہیں لوم۔"

منگل بولا۔ "ایک تو تم خدا کی قسمیں مت کھاؤ بھیا۔ ہم مسلمان نہیں ہیں ہم وئی اثر نہیں ہوگا۔ دوسرے اب جھوٹ بکنا بھی بند کر دو نہیں تو مارے جاؤ گے۔ سچ مچ ا سے جاؤ گے شیر علی کھان۔"

میں نے اسے اور وہ مجھے یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی ش کرتے رہے وہ کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرا کہنا تھا کہ میں بالکل سچ ارہا ہوں اور مجھے بوڑھے اور لڑکی کی کوئی خبر نہیں ہے۔

منگل سنگل نے غصے سے گالیاں بکتے ہوئے وہ تصویر بھی میرے سامنے کر دی ب تک وہ مجھ سے چھپا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "اسے تو پہچانتا ہو گا بھیا تو؟" یہ تصویر اس فوجی کی تھی جسے ریچھ نے' مطلب مداری نے مار ڈالا تھا۔ سنگل بولا۔ "میرے ساتھ فوج جو افسر آئے ہیں اصل میں وہ تجھے لے جانے کو آئے ہیں۔ یہ کوئی دھمکی نہیں وہ جانتے ہیں کہ تو نے ان کے ساتھی افسر کو اسٹیمر پر قتل کیا ہے وہ تجھے چھاؤنی لے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کریں گے۔ کل کا ٹائم طے ہوا ہے اس لئے آئے ہیں "

میرا کچھ بھی کہنا بے سود تھا۔ پھر بھی میں نے بہت کچھ کہا۔ سب کچھ کہا۔ ا کا کہنا تھا کہ اگر تو تینوں پاسپورٹوں اور سفری چیکوں یعنی کروڑوں اربوں کی رقم کا پتا تا ہے تو ہم سول والے اوپر سے زور ڈلوا کے فوج سے تیری جان بخشی کرا دیتے ہیں۔ ری صورت میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم کب تک جھک جھک کر سکتے تھے۔ آخر فوجی افسروں کا بھیجا ہوا آدمی آیا اور

میری سنگل کی ملاقات ختم ہوگئی۔

سنگل منگل نے آخری بات کہی۔ "لے بھئی جا۔ اپنے حرامی پن سے بھیا تو نے آپ اپنی موت بلائی ہے۔"

گارڈوں نے پھر مجھے دروازے کے برابر کرسی پر لا بٹھایا۔ جیل والوں اور فوج کے افسروں میں کسی بات پر زوروں کی بحث چل رہی تھی۔ میں نے سننے سمجھنے کی کوشش کی مگر آہستہ بات ہو رہی تھی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر فوجیوں میں سے ایک اٹھا۔ اس نے تیزی سے آ کے مجھے کالر سے پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے سوا افسر "ہیں ہیں" کرتے رہے مگر فوجی اتنے غصے میں تھا کہ میں نے کہا۔ "بس اب خاتر ہے شیر علی خان۔" جیل میں آفس کے سامنے ان کی کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ فوج افسر نے اشارے سے اپنے حوالدار کو بلایا۔ اس کو حکم دیا کہ اس قیدی کو مجھے ہتھ کڑی کر فوجی جیپ پر چڑھا دیا جائے۔ مجھے جیپ سے منتقل کر دیا گیا تو فوجی نے میرے کان پر ریوالور رکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ "میں اس بحث کو اسی وقت ختم کر رہا ہوں۔ تم ا اتھارٹی اس لاش پر چلاتے رہنا۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب تک کی پوری زندگی، مشرقی پاکستان میں والوں کے درمیان توجہ اور محبت کے ماحول میں گزارا ہوا وقت، اسکول، سیر و شکار، د کے دوستوں کی شفقت پھر کاکسز بازار کے ساتھیوں کے چہرے اور سلیل چوہدری بازلر کا سب کچھ درہم برہم کر دینا تیز رفتار منظروں کی طرح آ کر گزر گیا۔ افسوس زون میں ایک محبت بھری دلچسپ محفل سے مجھے اٹھا لیا گیا۔

خدا معلوم کب تک اس نیم بے ہوشی نیم بیداری کی حالت میں رہا۔ کہیں فون بجنے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے برمی میں کہا۔ "سر! جی ایچ کیو سے فون آیا ہے" میں نے کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا، جی ایچ کیو تو جنرل ہیڈ کوارٹر کو کہتے ہیں۔ یہ فوج کا دم مرکزی دفتر ہوتا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا میرے آس پاس سے لوگ ہٹ ہیں۔ بس جیپ کے پاس کھڑا وہی حوالدار رہ گیا ہے۔ حوالدار نے اب کہیں سے اپنی مشین گن نکال لی تھی جسے تیار کر کے وہ کمر سے لگائے روشنی میں کھڑا تھا۔

آدھی رات تک اسی طرح جیپ پر ہتھ کڑی لگا کر مسلح حوالدار کے ساتھ رو کے رکھا گیا۔ آدھی رات کے بعد جیپ کو دفتر کے سامنے سے ہٹا کر دیوار کے س پارک کر دیا گیا اور فوجی حوالدار کے علاوہ جیل کا ایک مسلح گارڈ بھی لگا دیا گیا۔

شاید فوج اور جیل والوں کی بحث ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

جہاں جیپ کھڑی تھی وہاں دیوار کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اس لیے اندھیرا سا تھا۔ دفتر کے سامنے تو بہت تیز روشنی پڑتی تھی۔ ذرا سایہ ملا تو میں نے جیپ کی باڈی پر سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مرنے سے پہلے نیند کیوں خراب کروں کچھ دیر سو لوں۔

خبر نہیں آدھے گھنٹے یا دو گھنٹے کھڑے کھڑے نیند لی ہوگی کہ دائیں طرف اندھیرے میں کسی نے سرگوشی میں میرا نام لیا۔ یہ میرا وہم ہوگا یا ابھی تک میں نیند میں ہوں۔ میں نے آنکھیں اور بھینچ لیں اور پھر نیند میں جانے کی کوشش کی۔

"شیر علی۔ اے شیر علی۔ ہشیار ہو جا۔" اب کے آواز بہت واضح تھی اور میں نے پہچان لیا۔ یہ بوڑھے مداری کی آواز تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

جیپ اور دیوار کے سائے کے بیچ مداری دبکا بیٹھا تھا۔

نہیں۔ مداری یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ یقیناً میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

موت کے سامنے دیکھ کر میرے ہیجان زدہ ذہن نے یہ کیسی کرشمہ سازی کی ہے۔ مداری کو لا کھڑا کیا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ یہاں میرا اپنا کوئی نہیں جو نجات دہندہ بن کر آگے آئے۔ برما میں اس وقت ایک یہی جاننے والا ہے تو نیند میں۔ یا شاید جاگتے میں خواب دیکھتے ہوئے میں مداری کو دیکھ رہا ہوں۔ آواز تک سن رہا ہوں اس کی۔

مگر اس میرے واہمے نے ـــــ مداری نے ـــــ ہاتھ بڑھایا اور جیپ کی باڈی سے ہتھکڑی کے ساتھ جڑا ہوا میرا ہاتھ چھو لیا۔ یوں لگا جیسے برف کی سوکھی قاش مجھے چھو گئی ہے۔

واہمہ سرد یا گرم نہیں ہوتا۔ اس نے میرا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کے لمس میں برف کی ٹھنڈک تھی۔

"شیر علی!" ہشیار ہو جاؤ شیر علی۔"

"آں؟ بابا؟" میں نے پہلی بار اسے بابا کہہ کر بلایا تھا۔

مداری نے کہا۔ "شیر علی! گھوم کے دیکھو۔ وہ دوسرا سپاہی ادھر تمہاری طرف تو نہیں دیکھ رہا؟"

میں نے سر گھمایا۔ جیل کا گارڈ اپنی رائفل کو لاٹھی کی طرح تھامے ہوئے جیپ کے بمپر سے ٹکا کھڑا تھا۔ میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بہت غور سے فرش کی طرف دیکھ رہا ہے۔ سو رہا ہوگا۔

میں نے کہا۔ ''وہ کھڑے کھڑے سو رہا ہے۔''

دوسری طرف فوج کا حوالدار دیوار سے ٹکا کھڑا تھا اس نے میری مخالف سمت میں دیکھتے ہوئے جماہی لی تھی۔ مداری جہاں دبکا بیٹھا تھا وہاں سے حوالدار کو دیکھ سکتا تھا۔

''ہوں۔'' اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ دونوں میں سے کوئی بھی گارڈ چوکنا نہیں تھا۔ یہ اطمینان کی بات تھی۔

مداری نے اپنے برمی شلوکے کی جیب میں ہاتھ پہنچا کر ایک چابی نکالی اور میری ہتھ کڑی کے تالے میں گھمائی۔ کچھ نہیں ہوا۔ حوالدار دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ مداری نے دوسری جیب سے دوسری چابی نکالی' گھمائی' کچھ ہوا۔ مگر وہ ہمارے حق میں نہیں تھا۔ لگتا تھا چابی پھنس گئی ہے۔ میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے دھڑکتے دل سے سوچا کہ حوالدار اگر ادھر گھوم جائے تو یقیناً وہ مداری کو دیکھ لے گا۔ دونوں مارے جائیں گے۔

مداری کی نظریں اور ہاتھ میری ہتھ کھڑی پر تھے اور میری نظریں حوالدار پر گڑی تھیں۔ مداری اپنی بوڑھی انگلیوں کے ساتھ چابی اور ہتھ کڑی سے جھوجھ رہا تھا اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ حوالدار ہماری طرف مڑ کر دیکھنے والا ہے۔ میرے حلق سے بے اختیارانہ خوف کی آواز نکلی اور ٹھیک اسی وقت کلک کر کے چابی گھوم گئی۔ مجھے یقین تھا یہ آواز حوالدار نے سن لی ہے۔ وہ میری طرف مڑا۔ اس کا ہاتھ ایل ایم جی پر جما ہوا تھا۔

حوالدار نے مجھے دیکھا۔ میں نے کانپتے لرزتے دل کے ساتھ اس سے آنکھیں ملائیں۔

وہ بولا۔ ''اوادھر کیا دیکھتا ہے؟''

مداری پھر اندھیرے میں دبک گیا ہوگا ورنہ حوالدار میرے ساتھ ساتھ اسے بھی دیکھ لیتا۔

''کیا دیکھتا ہے ادھر؟'' حوالدار نے پھر پوچھا۔

آواز میں مسکینی ڈال کر میں نے کہا۔ ''کیا دیکھوں گا'' دیکھنے کو اب رکھا کیا ہے؟''

''آرام سے دو تین گھنٹا گزار لے پھر تو بیڑا ہی پار ہے تیرا۔''

میں نے اداسی سے ہاں میں سر ہلایا اور گردن جھکا لی۔ اندھیرے میں اکڑوں بیٹھا

مداری مجھے تکے جا رہا تھا۔ پکڑے جانے کے خوف نے اس جیسے پکے کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔

گارڈ نے مجھ سے اس طرح باتیں کر کے شائد اپنے دل میں بیٹھے جلاد کو تسکین دے لی ہوگی۔ اس لیے اب وہ باقاعدہ پشت کر کے دیوار سے ٹک گیا۔ اس نے اپنی ہلکی مشین گن کا پٹا کندھے سے اتار کر بازوؤں میں الجھا لیا تھا۔ ہتھیار ہلکا ہوگا مگر شاید کندھے پر مسلسل بوجھ پڑنے سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔

مداری نے ہاتھ تھپک کر آہستہ سے کہا۔ ''چلو'' اور آرام سے ہتھ کڑی کھول کر اس نے مجھے آزاد کر دیا۔

سخت پنجے میں میرا بازو جکڑے وہ اندھیرے ہی اندھیرے میں مجھے جیپ کے عقب میں کھینچ لایا۔ یہاں رائفل پر اپنا بوجھ ڈالے جیل کا گارڈ کھڑا سو رہا تھا۔ مجھے گارڈ کی ناک کے نیچے سے نکالتا ہوا مداری جیل کے دفتر کے پچھواڑے پہنچ گیا۔

اس نے دیوار کے ساتھ بنے سیمنٹ کے ایک بڑے چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ چبوترے پر سیمنٹ ہی کے بہت سے چوکور ڈھکنے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ڈھکنا ایک طرف ایسے پڑا تھا جیسے وہ پوری طرح اپنی جگہ پر نہ ہو۔ کیونکہ وہاں دو بالشت چوڑا۔ اس سے ذرا لمبا تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔

میں جگہ کو ابھی پورا سمجھ نہیں پایا تھا۔ کہ مداری نے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''ادھر نیچے لوہے کی سیڑھی ہے۔ یہاں اترنا ہے' بس کمر کمر پانی ہے۔''

تو یہ جیل کے پانی کا ذخیرہ تھا جس میں مداری خود اتر رہا ہے اور مجھے اترنے کو کہہ رہا ہے۔ آگے کیا ہوگا' یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مداری کے پیچھے پیچھے میں بھی تنگ جگہ میں گھس کر پیروں سے لوہے کے پائپ ٹٹولتا ہوا اترا۔ نیچے کھڑے ہونے کی جگہ تھی اور سانس لی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے ڈھکنا پوری طرح ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ یہی ہمارے فرار کا راستہ تھا۔ اندر پہنچ کر مداری نے اشارہ کیا اور میں نے ڈھکنے کو نیچے سے دھیرے دھیرے سرکاتے ہوئے یہ خلا بند کر دیا گویا ہمارے فرار کا راستہ چھپا دیا گیا تھا۔ سیمنٹ کا ڈھکنا ہلکی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اور اس آواز کے ساتھ ہی تسلسل میں مشین گن کا فائر سنائی دیا تھا۔

میں نے سوچا یہ فوج کا حوالدار ہوگا۔ اس نے ہمیں اترتے دیکھ لیا ہے اور خبردار کرنے کو مشین گن کا برسٹ مارا ہے۔

مگر شاید ایسا نہیں تھا۔ کسی نے ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ ابھی صرف میری غیر حاضری محسوس کی گئی تھی۔ دور کسی کے پکارنے کی آواز آئی اور جیل کا سائرن بھونڈی آواز میں چیخنے لگا۔

ہم مکمل تاریکی میں اور لاعلمی کے احساس تحفظ میں تھے۔ مداری نے کمر کمر پانی میں کھڑے کھڑے کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑ کر ہشیاری سے چلے آؤ۔ وقت نہیں ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ مداری کا ہاتھ برف ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ اسے شاید گھپ اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا ہوگا۔ میرے حساب سے سوسوا سو قدم چل کر وہ بائیں ہاتھ گھوم گیا۔ یہاں میں نے محسوس کیا سامنے سے بہہ کر آتے پانی کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

مداری بولا۔ "جیل والے اپنے کھیت باغیچوں کے لئے باہر سے یہ نہر لائے ہیں۔"

میں نے ہوں کہہ کر مداری کی بات کی رسید دے دی مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ صرف مداری ہی کو تو اس ہذ کی موجودگی کا علم نہیں تھا جیل والوں کو اب تک معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم کس جگہ سے غائب ہوئے ہیں اور کہاں نکلنے والے ہیں کیا عجب ہے کہ باہر زیر زمین نہر کے داخلے پر جیل گارڈز کی ایک استقبالیہ کمیٹی ہمارا انتظار کر رہی ہو۔

مداری شاید میرے خیال کی رو کے ساتھ ساتھ بھی چل رہا تھا کہنے لگا۔ "جیل کا سب سے بڑا افسر آتے آتے دس منٹ تو لے لے گا۔ اس کے حکم سے ہی جیل کا بڑا پھاٹک کھلے گا۔ اور گارڈ لوگ نہر کے منہ پر پہرہ دینے کو آئیں گے۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ہیں۔ اتنی دیر میں اگر ہم اپنی سواری تک پہنچ گئے تو سمجھو بچ کے نکل جائیں گے۔ نہیں جوا تو کھیل ہی رہے ہیں۔"

یہ اطمینان کی بات تھی کہ کہیں کوئی سواری آگے فرار کرانے کے لئے موجود تھی۔

ہمیں نہر کے داخلے کی جگہ تک پہنچنے میں تین چار منٹ لگ گئے۔ وقت پانی بن کر بہہ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں ابھی اور کتنا چلنا ہوگا۔ اتنی دیر میں جیل والے کہیں باہر نہ پہنچ گئے ہوں۔

مداری رک گیا۔ اس کے یکایک رک جانے سے مجھے فکر ہوگئی۔ وہ آگے پانی میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مداری بولا۔ "یہ جیل کی دیوار آگئی ہے۔ یہاں لوہے کا بڑا بھاری جال لگا ہے۔ میں نے۔ مطلب ہے کایا بدل کر کے ریچھ بنے بنے اس جال کو ایک جگہ سے ٹیڑھا کر دیا تھا۔ اندر آنے کی جگہ بنالی تھی۔ میں وہ جگہ ڈھونڈتا ہوں۔"

اندھیرے میں پانی کے ہولے ہولے بہنے کی آواز مداری کے ادھر ادھر ہاتھ چلانے کی شپ شپ کے سوا سناٹا تھا۔ جیل کی آوازیں یہاں نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ بوڑھا آدمی تھا۔ ابھی کایا بدل سے گزرا ہے۔ میں کئی بار اسے دیکھ چکا ہوں کہ آدمی سے ریچھ اور ریچھ سے وہ دوبارہ آدمی کے قالب میں آچکتا ہے۔ تو اس قدر کم زور اور نڈھال ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے دل کے دورے سے گزرا ہے۔ مگر اس وقت اس میں اتنا دم کیسے ہے کہ میری رہ نمائی کر رہا ہے۔ پانی کے ریلے میں ڈبکی لگا لگا کر جال تلاش کرتا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟

مداری ایک بار شاید پانی میں جھکا پھر نکلا تو پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ "مل گئی۔ یہی جگہ ہے۔ پر تم ہشیاری سے آنا۔ ہاتھ پیر نہ پھنسا لینا۔"

میرا ہاتھ تھامے مداری جھکا۔ پانی میں بیٹھ کر ٹیڑھا ترچھا ہو کر اس نے خود کو جال کے باہر کی طرف نکال لیا۔ میں ابھی اندر کے رخ تھا۔ ہاتھ کم سے کم ایک انچ موٹی لوہے کی سلاخ سے مس ہوا۔ میں نے اس سلاخ اور دوسری کے درمیان چھو کر فاصلے کا تعین کیا۔ سلاخوں کو ویلڈ کر کے چوخانہ بنا دیا گیا تھا جس میں کوئی ہوشیار بلی ہی اگر اسے غوطہ لگانا آتا ہو تو گزر سکتی تھی۔ بلی سے بڑا کوئی جانور اس فولادی چوخانے سے نہیں گزر سکتا تھا۔

مداری نے جال کی دوسری طرف سے میرا ہاتھ ٹٹول کر دیکھا بولا۔ "وہاں کدھر تلاش کر رہے ہو؟ نکلنے کا راستہ ادھر ہے۔" اور اس نے میرے ہاتھ کاہی چڑھی چکنی دیوار اور فولادی جال کے بیچ بنائے گئے رخنے تک پہنچا دیے۔ آتے ہوئے ریچھ مداری نے زبردست حیوانی طاقت سے مضبوط سلاخوں کو موڑ کر دیوار سے ہٹا دیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔ مشکل سے۔۔۔ بہت مشکل سے ترچھا ہو کر بدن کو سکیڑ سمٹا کر اس رخنے سے نکلا جا سکتا ہے۔ لیکن ادھر ادھر زیادہ ہاتھ پیر چلانے 'ڈھونڈنے تلاش کرنے میں خطرہ یہ تھا کہ خاص انداز سے مڑی ہوئی سلاخیں بانہوں' بازوؤں' پیروں کو ایک ایسے گورکھ دھندے میں الجھا سکتی تھیں کہ جن سے مرنے کے بعد اس وقت نجات ملتی جب

گوشت گل سڑ جاتا اور پانی کا ریلا ہڈی کو ہڈی سے الگ کر دیتا۔

مداری بولا۔ "اب دیر مت کرو۔"

میں نے ڈبکی لگا کر سلاخوں کے بیچ سے نکلنے کو ایک بازو اور شانہ بڑھایا۔ دوسرا بازو ترچھا ہوا اور سلاخوں کے ٹیڑھے میڑھے جال میں الجھنے لگا۔ مداری کو ادھر خطرے کا احساس ہوا۔ کہنے لگا اگر ایک بازو ڈال دیا ہے تو فوراً نکالو۔ نہیں تو پھنس جاؤ گے۔"

میں نے بازو اور شانہ نکالتے ہوئے گھبرا کر پانی سے سر باہر کر لیا۔ مداری کی آواز آئی۔ "دونوں بازوؤں کو پہلو سے چپکا کر مچھلی کی طرح اس جگہ سے پہلے آدھا بدن نکالو۔"

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق کیا تو میں آدھا جال کے دوسری طرف تھا مگر نچلا دھڑ ابھی باہر نہیں آیا تھا۔ بہت مخدوش زاویے پر جھکا ہوا تھا۔ میں ایک بار خوف سے لرز گیا۔ "دونوں پیر اس پھندے سے کس طرح نکالوں؟ ادھر آگے تو کوئی گرفت کوئی ٹکاؤ نہیں ہے۔"

مداری میرے برابر آ کھڑا ہوا۔ "میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ خود سے کوشش مت کرنا۔ سمجھے؟ بدن کو ترچھا کر لو۔"

وہ آدھا پانی میں ڈوبا ہوا میرے سامنے آ کر جم گیا۔ اس نے نرمی سے مجھے اپنی پشت پر لیا اور کہنے لگا۔ "اپنا نچلا دھڑ مچھلی جیسا سمجھو یا اسے ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں تمہیں نکال لوں گا۔"

اس کی پیٹھ کر چھو کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں برف کی سل پر آ گیا ہوں۔ مداری کا پورا بدن انتہائی ٹھنڈا کیوں ہے۔ مداری نے بڑی مہارت اور مضبوطی سے مجھے اٹھائے ہوئے دو قدم آگے کی طرف لیے۔ میرے پیروں‘ پنڈلیوں سے فولادی جال مس ہوتا ہوا پیچھے رہ گیا۔ مداری کی طرح میں پورا کا پورا جال سے نکل چکا تھا۔

اس نے آہستگی سے مجھے اتار دیا۔ ہم ابھی تک کمر کمر پانی میں تھے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ کہنے لگا۔ "بس۔ یہ میری آخری حد تھی۔ آگے مجھے سہارا دے کر لے جانا۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ہاتھ اب برف جیسا سرد نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا۔ پیشانی چھو کر دیکھی۔ نہر کے فولادی جال سے مجھے ایک برف کے آدمی نے نکالا تھا اور اب مداری کی پیشانی گرم ہوتی جا رہی تھی۔ نہیں بلکہ تپنے لگی تھی۔

وہ میرے شانے پر اپنا بازو پھیلا کر جھول گیا۔ بہت کمزور آواز میں بڑبڑایا۔ "میرا بدن اب گرم ہوتا جائے گا شیر علی۔ کمزوری بڑھتی جائے گی۔ اتار شروع ہو رہا ہے۔ خیال کرنا۔" وہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔

یہ اس نے کیا کہا تھا کہ اتار شروع ہو رہا ہے؟ کایا بدلنے کے بعد اس کی حالت جو ابتر ہو جاتی ہے وہ یہی اتار ہوتا ہوگا۔ میں نے اسے پوری طرح سنبھال لیا۔ مجھے معلوم تھا اب بہت دیر تک وہ کسی قابل نہیں رہے گا اور مجھے معلوم تھا اس تمام عرصے میں اس کا بدن آگ ہوتا رہے گا۔ میں نے سوچا۔ یہ عجیب طرح کی کیفیات تھیں کبھی وہ برف ہو جاتا ہے۔ کبھی آگ۔

میں مداری کو سنبھالے ہوئے کچھ دور نہر نہر چلتا رہا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تاروں کی ہلکی روشنی میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ایک پگ ڈنڈی دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ تھے۔

مداری کو سہارا دیے ہوئے بلکہ تقریباً گھسیٹتا ہوا میں نہر سے نکلا اور پگ ڈنڈی پر آ گیا۔ میں تیزی سے پگ ڈنڈی پر چلتا رہا۔ مداری نے بے ہوش‘ بے حال ہونے سے پہلے جو کہا تھا میں نے وہ یاد کیا۔ اس نے کہا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ہیں اتنی دیر میں اگر ہم سواری تک پہنچ گئے۔ اگر پہنچ گئے اس نے کہا تھا۔ اور یہ بات کہے ہوئے کتنی دیر ہو گئی؟ دس بارہ منٹ یا کچھ کم؟ اور وہ سواری کیا ہے؟ کہاں ہے؟

میں نے گزرتے وقت کی دہشت مین مداری کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

دو تین پانچ سات منٹ گزرے ہوں گے یا اس سے کم یا زیادہ کیونکہ میں وقت کا اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ ہم جیل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں نے غور کیا اس عرصے میں سائرن کی آواز ہلکی مگر بے رکے سنائی دیتی رہی تھی۔ بہت ہوئے تو ہم میل بھر دور ہونگے۔ ایک میل کیا ہوتا ہے ان کے پاس تیز رفتار گاڑیاں ہیں اور مجھے معلوم تھا کتے ہیں ان کے پاس۔ پولیس کے تربیت یافتہ جرمن نسل کے کتے جن کا کام ہی فراریوں کا کھوج لگانا ہے۔

میں نے بھاگتے ہوئے بے حد تھکن اور مایوسی میں سوچا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا۔ وہ میرے فرار کی اطلاع پاتے ہی میری کوٹھری میں پہنچے ہوں گے اور میرے پہنے ہوئے کپڑے جوتے انہوں نے اپنے تربیت یافتہ کتوں کو سنگھائے ہوں گے تا کہ وہ

میری بو پہچان لیں پھر دو تین مسلح گارڈز کو کتوں کے ساتھ جیل کے گرد و پیش میں بھیج کر وہ لوگ آرام سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ باقی کام ان کے نہ ہوتے بھی بڑی سرعت سے انجام پا جائے گا۔ ان کے کتے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں اپنی تلاش پوری کر لیں گے۔

میں نے دور سے آتی سائرن کی بھیانک ہو ہو اور جنگل کی سنسناہٹ پر حاوی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔ یا یہ میرا وہم تھا؟

نا۔ یہ کتے نہیں بھونکے تھے۔ کہیں قریب ہی گھوڑوں نے پھوں پھوں کر کے جیسے بیزاری کی آواز نکالی تھی۔

میں نے آواز کے رخ سر گھما کر دیکھا۔ گھنے نیم قد درختوں اور جھاڑیوں میں گھوڑے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑے نے بے زاری سے پھر سانس لی تھی۔

کیا فائدہ؟ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ میں رک گیا۔ یہ یقیناً جیل کے گرد پیٹرولنگ کرنے والی گھڑ سوار پولیس ہوگی۔

مجھے رکا ہوا دیکھ کر گھوڑوں کے برابر سے کسی نے جیسے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

"شیر کھاں۔" پوچھنے والے کا لہجہ رازدارانہ تھا۔ یہ پولیس نہیں ہو سکتی۔

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

"یہ تو نے بابا کو اٹھایا ہوا ہے۔" یہ سوال سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ یہ مداری کا آدمی ہے۔

"ہاں۔ بابا ہے۔ پر اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"وہ زخمی تو نہیں ہے۔" پوچھنے والا بے تابانہ آگے آیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو گھوڑے اور تھے۔

میں نے بتایا کہ نہیں مداری زخمی نہیں ہے۔ غشی میں ہے۔ اس کا بدن بہت تپ رہا ہے۔

'گھڑ سوار' ظاہر ہے' سمجھتا تھا۔ اس نے بے فکر ہو کر کہا۔ "اچھا۔ وہ سب ٹھیک ہے۔"

وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ تینوں گھوڑوں کی راسیں تھامے ہوئے درختوں کی اوٹ سے نکل کر پگ ڈنڈی پر آیا۔ اس نے گھوڑوں کو تھپک کر اپنی بولی میں کچھ کہا اور انہیں کھڑا چھوڑ کر تیزی سے میرے پاس آگیا۔ نوجوان آدمی تھا۔ اس نے مہارت سے مداری کو سنبھالا اور قریب والے گھوڑے کی راسیں تھامنے کا کہہ کر مداری کو گھوڑے پر بچھی

ی پر اس طرح لٹا دیا کہ اس کا اوپری دھڑ ایک طرف اور نچلا دھڑ ایک طرف ہو گیا۔ ں نے کسی زندہ کو اس طرح گھوڑے پر لے جاتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بے ش مداری کو کپڑا بھی اڑھا دیا تھا۔ دونوں گھوڑے سنبھالے پگ ڈنڈی چھوڑ کر درختوں اڑیوں میں رستہ نکالتا میری رہ نمائی کرتا وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔

گھوڑے خوب آرام کیے ہوئے اور اچھی تربیت لیے ہوئے تھے۔ میرا رہنما وہ جواں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کو چمکارتا ان سے بات کرتا چلا تھا۔

میں نے سوچا اسے یہ بتا دینا ضروری ہے جیل والوں کے پاس کھوج لگانے لے کتے ہیں۔

میری بات سن کر وہ بولا۔ "ہاں مجھے پتا ہے۔"

بڑے میاں کی طرف سے میں تشویش میں تھا۔ اسے اتنی خراب و خستہ حالت ں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے تشویش ظاہر کی تو گھوڑا میرے برابر لے ا کہنے لگا۔ "بابا کی طرف سے مجھے بھی فکر ہے۔ اتنی محنت کا کام اس عمر میں اس کے لئے یک نہیں ہے۔ میں نے سمجھایا اور بھی لوگوں نے کہا پر وہ خود آنے پر تلا ہوا تھا۔ آگیا۔ ب دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا کہ "دوسرے لوگوں" نے بھی کہا تو میرا جی چاہا کہ پوچھوں وسرے لوگ کون مگر سوچا ابھی تو میں خود اس شخص کو نہیں جانتا۔ دوسروں کے بارے یں پوچھنا مناسب نہ ہوگا۔

میں کوسوی کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر یہی کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔

جنگل میں ہم کچھ دور نکل آئے تو ایک پہاڑی چشمہ سامنے دکھائی دیا۔ نوجوان نے مجھے اشارہ کیا اور اپنا گھوڑا اور بڑے میاں والا گھوڑا جس کی راسیں وہ خود تھامے ہوئے تھا بڑھا کر چشمے میں چلانے لگا۔ میں نے اس کے کہنے پر اپنا گھوڑا بھی پانی میں چلانا شروع کر دیا۔

وہ اپنا جانور قریب لے آیا۔ مجھ سے بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا نہیں ویسے تم خود سمجھ گئے ہو گے کہ ہم پانی میں اپنے جانور کیوں چلا رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اگر جیل والوں نے میرے پیچھے کتے لگا دیے تو اس طرح پانی میں رہتے ہوئے ہم انہیں دھوکا دے کے نکل سکتے ہیں۔"

بولا۔ "ہوں۔ یہ ٹھیک کہا۔ کتے پانی میں ہماری بو نہیں اٹھا پائیں گے۔ ان سے

جان چھڑانے کی ایک ترکیب یہ بھی ہوتی ہے مگر تم نے یہ کیا کہا کہ اگر کتے پیچھے لگا دیے تو۔۔اگر کیوں؟ کتے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"کیا؟" میں پریشان ہو گیا۔

وہ بولا۔ "ہاں میل بھر پہلے میں نے آوازیں سنی تھیں۔ وہ ٹھیک ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اس وقت تک تو ٹھیک ہی آرہے تھے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کتے ہمارے پیچھے ہیں؟

وہ ہلکے سے ہنسا بولا۔ "حیران ہو گئے؟ ایسی کیا بات ہے؟ میں جنگل ہی میں پیدا ہوا ہوں۔ یہیں رہتا ہوں۔ اس لیے آواز' نشان' بو اور ایسے دوسرے سب اشارے تم شہر والوں سے پہلے اٹھا لیتا ہوں۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ میری بھی اب تک کی عمر جنگلوں میں گزری ہے مگر وہ ہر حال میں زیادہ باعلم تھا۔ میں چپ ہو گیا اور اس فوری مصیبت کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ بولا۔ "بابا کو اب تو آرام کے پورے دو گھنٹے ملنا چاہئیں تبھی وہ زندوں کی دنیا میں واپس آئے گا۔ اس کے بعد ہی ہم ساتھیوں سے ملیں گے۔ دو گھنٹے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے نہیں مل سکتے۔"

"ساتھی؟"

کہنے لگا۔ "ہاں پورا قبیلہ ساتھ چل رہا ہے۔"

"ساتھ؟ کس کے؟ ہمارے ساتھ؟"

وہ ہنسا۔ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں اور کیا۔ آوازیں نہیں سن رہے؟ بکریوں کے ریوڑ سب سے زیادہ شور کرتے ہیں۔"

میں نے خفیف سا ہو کر بکریوں کی آوازیں سننے کی کوشش کی پھر اسے کوشش فضول سمجھ کر ترک کر دیا۔

نوجوان قبائلی نے زیادہ شرمندہ نہ کیا' بولا۔ "تم گھبرا کے بھاگے ہوئے آئے ہو۔ اگر آرام آرام سے چل رہے ہوتے تو میری طرح یہ آوازیں بھی سن لیتے۔"

میں جاننا چاہتا تھا اس لئے پوچھا کہ مداری کے ہوش بحال ہونے سے پہلے ہم کیوں قبیلے والوں سے نہیں مل سکتے؟

بولا۔ "سردار کو کم زور' کچا دیکھ کے لنگڑے گیدڑ بھی سردار بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے۔"

میں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھا۔"

"تمہیں نہیں خبر کہ بابا اس وقت سمجھو آدھا مر گیا ہے؟ اس بار دو گھنٹے تک ایسا ہی رہے گا؟"

میں نے کہا کہ ہاں مجھے خوب علم ہے۔ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے سوا اس کے کہ بے ہوشی بے حالی اس دفعہ کہیں زیادہ گہری ہے اور یہ کہ یہ حالت میری دیکھی ہوئی ہے۔

کہنے لگا۔ "بابا اراوڈی کے سب سے بھاری قبیلے کا سردار ہے۔ یہ خبر ہے تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں تو۔" مجھے حیرت ہو رہی تھی جس بے نوا مداری کو میں نے اپنے دانست میں بہت چالاکی سے کونٹی نینٹل ہوٹل میں مہاراجہ بنا کر بٹھایا تھا وہ تو خود پیدائشی سردار تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ کاکیسز بازار میں ہمارے گیسٹ ہاؤس کے بچے کھچے کھانے سے انکار کرنے والا یہ مفلس اور باوقار مداری کسی بڑے بھاری قبیلے کا سربراہ ہے۔

میری رہبری کرنے والے نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھری بولا۔ "یہ سارے کھٹ راگ سے سرداری ورداری سے بابا اکتا گیا تھا۔ چھے برس ہوتے ہیں ادھر مائنگ یان میں۔ چھوٹا سا ہی شہر ہے۔۔ بابا نے کالج کھولا تھا۔"

"کالج؟" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہاں۔ بابا اس کا پرنسپل تھا۔ آکسفورڈ نام کی کوئی جگہ ہے بابا ادھر کا پڑھا ہوا ہے۔"

میں نے بے خیالی میں اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ آکسفورڈ؟ حد ہو گئی!

نوجوان نے مجھے رکتے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "آکسفورڈ تو بہت بڑی جگہ ہے۔"

"ہاں یہی تو میں بولتا ہوں۔" وہ پوری بات نہیں سن پایا تھا آگے اپنی رو میں کہنے لگا۔ "ادھر مائنگ یان کے کالج میں بڑا پیسا لگا دیا ہے بابا نے۔ سب لگا دیا۔ وہ ادھر ہی رہتا تھا۔ قبیلے کے بہت سے نوجوانوں کو ادھر لے گیا ہے۔ ہم سب جنوں کو دھیرے دھیرے کر کے مائنگ یان میں روکنا چاہتا تھا۔ پر بیٹا مر گیا تو اپنے پوتا پوتی کا اور قبیلے کا کھٹ راگ پھر ہاتھ میں لے لیا۔ لینا پڑا۔ کیا کرتا۔ خبر نہیں مائنگ یان میں کالج ابھی چل

بھی رہا ہے کہ نہیں۔ تو اس لئے کہتا ہوں اسے اس کمزوری میں لے کے میں قبیلے میں نہیں جاسکتا۔ قبیلے کے دو چار گھر' تگڑے لوگوں کے' پہلے ہی سے بک بک کر رہے ہیں۔ کالج کھولنے پر ناراض ہیں کہتے ہیں ہزار برس سے ہمارا قبیلہ اراوڈی دریا کی ترائی میں ہزار میل اوپر ہزار میل نیچے راج کرتا تھا اور اب اس بڈھے نے مائنگ یان کے لعنتی قصبے میں پاٹھ شالا کھول کے ہمارے پاؤں میں بیڑی ڈالنے کا جتن کیا ہے۔

"دیکھو نا' بابا کو ہماری بہت فکر ہے اس کا بیٹا نہیں رہا تو ہمیں بے سردار نہیں رہنے دیا۔ دوڑا دوڑا آگیا۔ اس بات سے وہ تگڑے تین چار گھرانے اور جل گئے ہیں۔ سمجھ رہے تھے۔ یہ اب نہیں آئے گا بلکہ پوتا پوتی کو بلا لے گا۔ مائنگ یان ہی میں رہے گا۔ تو یہ قصہ ہے! میں اسے ان دلالوں' بدمعاشوں کے سامنے اس حالت میں نہیں لے جاسکتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

مداری کی بے ہوشی کو۔ مگر میں ایسے بھاری قبیلے کے زبردست سردار کو ابھی تک مداری کیوں کہہ رہا ہوں؟ تو "بڑے میاں" کی بے ہوشی کو ایک گھنٹا ہو چکا تھا کہ نوجوان قبائلی نے اچانک اندھیرے میں ایک جانب اشارہ کیا اور مجھ سے کہا۔ "شیر کھان! وہ اب تک ٹھیک آرہے تھے۔ کتے والے' پر وہ اب بھٹک گئے۔ ادھر دوسری طرف چل پڑے ہیں۔ پانی میں اتر کے اچھا کیا ہم نے پیچھا چھڑا لیا آؤ تیز چلنے کا وقت آگیا۔" اور چشمے سے اپنا گھوڑا نکال کر' دوسرے گھوڑے کی راسیں تھامے ہوئے وہ ہموار میدان کی طرف ڈپٹ پڑا۔

کوئی آدھے گھنٹے ہم نے تیز رفتاری سے راستہ طے کیا پھر ایک پہاڑی کا کٹاؤ دیکھ کر اس نے گھوڑے روک دیے۔ اپنے گھوڑے سے کود کر اترا' مجھے مدد کا اشارہ کیا اور بڑے میاں کو جواب تک جانور کی پشت پر بے سدھ پڑے تھے سنبھال کر اتار لیا۔ اس نے انہیں مٹی پر سیدھا لٹا دیا تھا۔ میں نے پیشانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ بڑے میاں کی بدن کی حرارت معمول پر آتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ کراہے بھی تھے۔

قبائلی مطمئن تھا کہنے لگا۔ "پاؤ گھنٹے میں ایسا ہو جائے گا کہ ہم بابا کو گھوڑے پر بٹھا کے لے چلیں گے۔ قافلہ بہت ہوا تو ادھر سے دو میل دوری پر ہوگا۔ دن اوگنے سے پہلے ہم کو بڑی سڑک پر آجانا ہے۔"

"بڑی سڑک" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "رنگون سے دوسرے نمبر کا شہر ہے منڈالے۔ راج دھانی رنگون سے

می سڑک منڈالے جاتی ہے پھر وہ اوپر دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک شاخ ھے ہاتھ مڑ کر چین کی طرف نکلتی ہے دوسری بائیں ہاتھ گھوم کر اوپر ہندوستان کے بے آسام میں امپھال شہر سے جاملتی ہے۔ ہمیں پہلے برما کے شہر منڈالے میں رکنا ہے۔ برسات کا موسم ہم ادھر ہی منڈالے میں گزارتے ہیں۔ جاڑوں میں اور اوپر چل تے ہیں۔ امپھال کی طرف ہندوستان میں نہیں جاتے۔ ادھر بارڈر کے پاس میلہ بھرتا ہے۔ دو مہینے وہیں کاٹتے ہیں۔ ہر سال ایسا ہی کرتے ہیں۔"

کوئی دس منٹ تک بڑے میاں مٹی پر بے سدھ پڑے رہے' پھر کسمسا کر' ٹ بدل کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں' قبائلی نے جھک کر تاروں کی روشنی میں ھے کا چہرہ دیکھا۔ دھیرے سے کچھ کہا تو بڑے میاں نے ہوں کہہ کر جواب دیا۔

نوجوان نے سہارا دے کر اٹھا کر بٹھا دیا۔

میں نے پوچھا "کیسے ہو بابا؟" انہوں نے ہاں میں سر ہلایا۔

بڑے میاں ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔

نوجوان نے زین سے بندھی پانی کی بوتل سے پانی دیا۔ جیب سے پکے خرمے یا بخارے کی طرح کا کوئی پھل نکالا' کھانے کو دیا۔ بڑے میاں اسے منہ میں گھولتے ہے۔ نوجوان نے ان کی پیشانی چھو کر اور نبض پر انگلیاں رکھ کر اپنا اطمینان کیا اور کہنے "اب چل سکتے ہیں۔"

بڑے میاں سہارے سے گھوڑے پر سوار ہوئے لیکن آگے اپنی ہمت سے تے رہے۔

ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے طے کیا۔

قافلے کی آوازیں مجھے آدھے میل سے سنائی دے رہی تھیں۔ مویشیوں کا شور گاڑیاں ہانکنے والوں کی آوازیں' کبھی بچوں کے بیدار ہو کر فیل مچانے کا شور اور کبھی ریڈیو ٹرانزسٹر پر فلمی گیتوں کے بول بھی سنائی دے جاتے۔ فلمی گیت سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ایشیا کا کوئی سا ملک گھوم دیکھو۔ ہندوستان کی گانے والیوں اور گانے والوں کی آوازیں تمہارا پیچھا کرتی رہیں گی۔ گیتوں کی زبان چاہے سمجھ میں نہ آئے دھنیں بلکہ پسند کی جاتی ہیں۔

ہم قافلے سے چند فرلانگ دور تھے تو گھوڑوں پر سوار دو قبائلی نظر آئے۔ انہوں نے تاروں کی ہلکی روشنی میں بھی بڑے میاں اور اپنے ہم قبیلہ نوجوان کو پہچان لیا

تھا۔

قریب پہنچے تو میں نے دیکھا دونوں نو عمر لڑکیاں تھیں۔ دونوں نے کاندھے پر
رائفلیں ٹانگ رکھی تھیں۔ وہ سیدھی بڑے میاں کے پاس پہنچیں۔ ایک نے اپنے سردار
سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ بڑے میاں نے غور سے سنا اور ساتھ آنے والے قبائلی کو کچھ
ہدایتیں دیں۔ وہ اندھیرے میں گھوڑا دوڑاتا ایک لڑکی کے ساتھ چلا گیا۔ دوسری ہمارے
ساتھ چلنے لگی۔

بڑے میاں اپنا گھوڑا میرے قریب لے آئے۔ لڑکی ہم سے آگے ہو گئی۔ اا
اتنی دور چلی گئی کہ ہم دونوں کی باتیں نہ سن سکے۔

بڑے میاں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”شیر علی! لڑکے نے تمہیں بتا دیا ہوگا
میں کون ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ اگر آپ خود سے بتاتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔“

کہنے لگے۔ ”تم اچھے دنوں میں ملتے تو میں خود سے مانگ یان کالج کا ذکر بھ
کرتا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاکر سب کچھ دکھاتا بھی۔ اپنے ساتھ رکھتا۔ بڑی محنہ
سے ہم سب نے اپنے لیے ایک جگہ بنائی ہے۔ میرے ساتھ تم جیسے بہت سے نوجوا
ہیں۔ کوسومی اس وقت وہیں ہے مانگ یان کالج کی لڑکیوں کے ہاسٹل میں ٹھہری ہو
ہے۔ تمہاری امانتیں سب محفوظ ہیں۔ وہ خیال سے سنبھالے ہوئے ہے سب کچھ۔ یہا
کے معاملوں سے فارغ ہو کے وہیں جائیں گے۔ مانگ یان۔ سمجھے؟ اپنی چیزیں تم سنبھا
لینا۔“

میں نے کہا۔ ”چیزوں کا ذکر آپ کیا لے بیٹھے۔ میں تو چاہتا تھا ہم تینوں آ
کوسومی اور میں کسی طرح خطرے سے دور ہو جائیں۔ وہ سب مال دولت جو بھی ہے آ
وسیلہ بن گیا تھا۔ یہاں سے نکلنے کا۔ اب دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔“

بڑے میاں بولے۔ ”میں نے تمہیں جیل سے نکال کر ایک خاص مقصد
اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر اب لگتا ہے مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ اور وقت
میرے پاس اب بالکل نہیں ہے۔ تم نے دیکھا کایا بدل پیچھے اس بار میری حالت کیا
ہے۔ سمجھو تلوار کی دھار جیسی باریک سرحد سے لوٹ کے آیا ہوں۔ ایک قدم آگے
جاتا تو اس بار زندہ نہیں لوٹتا۔ یہ سب کچھ اب زیادہ چل نہیں سکتا۔“

میں نے کہا زیادہ پریشان نہ ہو۔ انہیں تسلی دی اور شکر گزاری میں کہا کہ

جیوں گا آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا مجھے جیل سے نکال کر آپ نے نئی زندگی دی
تو کہنے لگے۔ ”سوچ رہا تھا تمہیں کسی دھوکے میں نہ رکھوں۔ سب کچھ بتا دوں۔ یہ جو
نے کیا ہے اور کرنا چاہتا ہوں یہ بے غرضی میں نہیں تھا۔ میری اپنی بہت بڑی غرض
ھی ہوئی ہے تم سے۔ وقت آنے پر پوری بات خود ہی سمجھ میں آجائے گی۔ اس وقت
اور الجھن آپڑی ہے۔ قبیلے کے کچھ لوگ ہیں۔ بہت تھوڑے ہیں مگر مضبوط اور بااثر
۔ وہ برسوں سے میری مخالفت کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جی۔ معلوم ہے۔“

بڑے میاں بولے۔ ”میں تین روز سے ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ تمہارا کھوج
نے، جیل سے نکالنے میں لگا ہوا تھا۔“

تین دن! میں کیا کہتا احسان مندی میں سر جھکائے چلتا رہا۔

کہنے لگے ”ان تین دنوں میں میرے مخالفوں نے قبیلے کے لوگوں میں بے چینی
بے اعتمادی بہت بڑھا دی ہے۔ بڑی عمر کے لوگ پہلے ہی شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ اس
ت لگتا ہے میرے خلاف بغاوت کی سی فضا بن گئی ہے۔ نوجوان سب میرے ساتھ
ا۔ بڈھے اور درمیانی عمر کے باغی ہو گئے ہیں۔“

”کیا کیا ہے انہوں نے؟“

”ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ دو گاڑیاں ہیں جن میں رائفل، میگزین اور ایسی
چیزیں چھپائی گئی ہیں۔ دونوں مخالفوں کے ”پہرے“ میں آگئی ہیں۔“

میں اس نئی افتاد کے لئے تیار نہیں تھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

میں نے پوچھا۔

مجھے بہت پریشان دیکھ کر بڑے میاں نے تسلی دی کہنے لگے۔ ”دنیا ہے۔ یہی
ب چلتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی موٹی جنگ ہے۔ دوسرے طاقت اور قبضے کے لئے مجھ سے
کارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اپنے بچوں کے لئے نیا راستہ بنانا ہے۔ قبیلے کی
راری پر کسی اور وجہ سے قبضہ نہیں رکھنا چاہتا۔ میں نئی عمر کے لوگوں کو ان بدمعاشوں
گرفت سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ وہ بچوں کو خانہ بدوش اور جاہل رکھنا چاہتے ہیں تاکہ
کا ریوڑ کی طرح ہنکاتے رہیں، ان کی محنت کے پھل خود سمیٹتے رہیں۔ میں یہ نہیں
نے دوں گا۔ جب تک زندہ ہوں۔ جب تک بھی ہوں۔ پر کوئی زیادہ وقت نہیں ہے۔
رے پاس۔“

میں نے تاسف کے ساتھ کہا۔ "میری وجہ سے آپ کی مشکل اور بڑھ گئی۔"

بڑے میاں بولے۔ "ہم پہلے ہی سے بڑی مشکل میں تھے۔ اگر میرا حساب ٹھیک بیٹھا تو ہو سکتا ہے تمہاری وجہ سے ہماری مشکلیں حل ہو جائیں۔"

میں نے دھیرے سے کہا۔ "جو کچھ میرے لائق ہو بتایئے۔"

اور اس وقت میں نے سامنے اندھیرے میں ایک بھاری بھر کم ہیولا سا بے آواز اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے آگے آگے دو سائے مشقت کی سانسوں کے ساتھ اسے آہستہ آہستہ کھینچے لا رہے تھے۔

میں نے اندھیرے میں نظریں گڑا کر خاموشی کے ساتھ آنے والی اس چیز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

ایک بے ڈھب اونچی سی پہیئے لگی کشتی جیسی گاڑی کو دو قوی بھینسے کھینچے ہوئے لا رہے تھے۔ موٹر کے ٹائروں کی وجہ سے اس کے چلنے کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ صرف بھینسوں کی پر مشقت سانسیں' اژدھے کی پھنکار کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

بڑے میاں نے کہا۔ "لڑکے گاڑی لے آئے ہیں۔ تم یہ گھوڑا چھوڑ دو' گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ جلدی!" ان کا لہجہ سردار قبیلہ کا لہجہ تھا۔ میں نے اس کشتی نما بھینسا گاڑی کے سامنے گھوڑا روک دیا اور اتر پڑا۔

گاڑی لانے والا نوجوان اچھل کر میرے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑاتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بڑے میاں نے تازیانے کی طرح چٹخنے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "کھڑے کیا ہو بیٹھو۔"

وہ نرم خو آدمی تھے۔ اس لہجے میں مجھ سے ابھی تک بات نہیں کی تھی انہوں نے۔

کچھ الجھن کچھ شکوہ سا دل میں لیے میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اونچی چمنی کا مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک لیمپ اندر گاڑی کی چھت سے لٹک رہا تھا۔ بھینسا گاڑی اندر سے بہت فراخ اور کشادہ لگتی تھی۔ یہاں ریل گاڑی کی بنچوں جیسی سیٹیں اور سامان رکھنے کے خانے تھے اور گاڑی کی دیواروں میں بنی الماریاں تھیں۔ اندر کی روشنی ذرا بھی گاڑی سے باہر نہیں جا سکتی تھی' کالے رنگ کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔

میں تو اندر پہنچتے ہی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا مگر کسی نے ہاتھ بڑھا کر مجھے سیٹ سے

اتارا اور فرش پر بٹھا لیا۔

میں نے دیکھا یہ قبیلے کے سیاہ شلوکے اور تہمد جیسے سیرونگ یا لاچے میں ملبوس لڑکی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں معذرت کی۔ "ماپھی کرنا۔ ادھر نہیں تمری جاگہ ادھر۔۔۔ ہے۔"

میں نے برمی میں کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ نیچے اوپر جہاں بٹھاؤ گی بیٹھ جاؤں گا۔"

وہ ہلکی آواز میں ہنسی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی ٹھیک ٹھاک برمی بولوں گا۔

باہر گھوڑوں کے سرپٹ دوڑ جانے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک آواز اور سنی۔ یہ کتوں کے بھونکنے کی آواز تھی۔ کتوں کی آواز دور سے آ رہی تھی مگر اس فاصلے سے بھی میں پہچان سکتا تھا۔ کھوج اٹھانے والے جرمن نسل کے کتے بھونکتے آ رہے تھے۔

بڑے میاں کے جلدی کرنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی اور یہ کہ انہوں نے سوار ہونے کو کیوں کہا تھا۔

ہم سفر برمی لڑکی میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے فرش سے اٹھی سرگوشی میں بولی۔

"اس گاڑی کے فرش میں چھپنے کی جگہ ہے۔ ایک منٹ کے لئے سیٹ پر بیٹھو میں جگہ تیار کردوں۔"

میں سیٹ پر جا بیٹھا اور اسے بہت مستعدی اور تیزی سے کام کرتے دیکھنے لگا۔

اس نے فرش پر بچھا قالین کا ٹکڑا اٹھایا۔ قالین کے نیچے ایک تختہ جو فرش میں خوب جڑا ہوا دکھائی دیتا تھا اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ نیچے مخمل بچھی ایک پرتکلف قبر سی دکھائی دی اس میں ایک تکیہ بھی پڑا تھا۔

لڑکی نے اشارہ کیا۔ "یہ تمہارا بستر ہے۔ آؤ' لیٹ جاؤ۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "میں لیٹ جاؤں گا تو تم اوپر تختہ جما کر قالین بچھا دو گی؟"

کہنے لگی۔ "ہاں۔"

"میرا دم نہیں گھٹ جائے گا؟"

وہ ہنسی۔ قبر میں نیچے ہاتھ پہنچا کر اس نے ایک قیف سی نکالی۔ قیف کے سرے

پر ربر کا پائپ لگا تھا۔ یہ قیف اس نے میرے چہرے کے سامنے کر دی۔ ”دم نہیں گھٹ سکتا۔ اس میں سے تازہ ہوا آتی ہے۔“ فر فر ہوا چلی آرہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی بانہہ پھیلا کر گاڑی کی دیواروں سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ بولی۔ ”یہ ربر کا پائپ یہاں سے ہوتا ہوا گاڑی کی چھت سے باہر نکلا ہے۔ روشنی میں دیکھنا بالکل چمنی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ بنا بھی چمنی کی طرح ہے اگر بارش ہونے لگے تو ایک قطرہ اندر نہیں آئے گا۔ ہوا آتی رہے گی۔ چلو بس جلدی لیٹ جاؤ۔“

میں کیا کرتا۔ مسکراتا ہوا اس آرام دہ مگر پریشان کر دینے والے کھانچے میں جا لیٹا۔

تختہ بند کرنے سے پہلے وہ آہستہ سے مسکرا کر بولی۔ ”تم اندھیرے سے تو نہیں گھبراتے 'بس اندھیرا ہوگا اندر مگر اندھیرا تو باہر سب جگہ ہے دن نکلے گا تو کچھ روشنی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اتنی دیر چھپنا پڑے گا' دن نکلنے تک؟“

”کیا پتا؟“ اس نے قیف میرے منہ پر ڈھک دی' پھر تختہ رکھ دیا۔ اندر مکمل اندھیرا ہو گیا۔

مگر باہر کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔

گاڑی ہانکنے والے نے اونچی آواز میں کوئی برمی دیہاتی گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے ہمارا تعاقب کرنے والے قریب آگئے ہیں۔ گاڑی۔۔انہیں سنانے کو گا رہا ہے مگر جلد ہی گانے پر حاوی ہوتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن کر گاڑی والے نے گانا بند کیا۔

اور اگلے ہی لمحے جیسے جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جیپ گاڑیوں کے زلیس کرتے انجن' ہوائی فائر اور لوگوں کے خبردار کرنے کے آوازے 'گاڑی والے کی فریاد اور ان سب سے بلند جیل کے کھوجی کتوں کی شیطانی آوازیں۔

میں نے سوچا' بڑے میاں فرار ہو چکے ہیں۔ گاڑی پر میرے سوار ہونے کے بعد میں نے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی جو آواز سنی تھی تو یہ بڑے میاں اور ان کی باڈی گارڈ اس رائفل والی نوجوان لڑکی کے گھوڑے ہوں گے۔

کتوں نے اور جیل کے گارڈز نے ہماری بھینسا گاڑی کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔ یہ بڑے میاں نے کس طرح کا انتظام کیا ہے؟ کھوجی کتے تو میری بو پر آئے

ہیں گاڑی کو چھوڑ کر اب وہ نہیں ہٹیں گے۔ یہ لوگ مجھے فرش میں کب تک بند رکھیں گے۔ جیل والے اور کتے اس گاڑی کو دن نکلنے تک گھیرے رکھیں گے۔ پھر دن میں وہ گاڑی کو ادھیڑ کے رکھ دیں گے۔ میں نہیں بچ سکتا۔ کوئی نہیں بچ سکتا۔

پانچ چھے منٹ یا دس منٹ کتوں کا یہ دیوانہ کرنے والا شور جاری رہا۔ سرد موسم کے باوجود اور پائپ سے آتی سرد ہوا میں سانس لیتے ہوئے بھی میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر مجھے پکڑا جانا ہے اور اب جب کہ یہ لوگ مجھ تک اور قافلے تک پہنچ گئے ہیں تو بڑے میاں بھی کس طرح ان کے چنگل سے بچ سکتے ہیں۔ ان کے دشمن جو قافلے میں ہیں کیا وہ انہیں سرکاری لوگوں کے حوالے نہیں کر دیں گے؟ ٹھیک ہے بڑے میاں اس وقت گھوڑا سرپٹ بھگا کر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر میں انہیں گھیر لیا جائے گا۔

مگر میں نے ایک آواز سنی اور میں جان گیا کہ بڑے میاں' قبیلے کے سردار بھاگ گئے نہیں۔ اپنے مہمان اور اپنے لوگوں کے ساتھ ہیں۔

گاڑی کے پچھلے حصے سے ریچھ کے انتہائی غیظ و غضب میں چیخنے کی آواز آئی تھی۔ بڑے میاں کایا بدل کر ہماری گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔

پھر گاڑی والے نے کتوں کے بھیانک شور سے بلند کرتے ہوئے اپنی آواز جیل کے اہل کاروں تک پہنچائی۔ وہ بہت غصے میں لگتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”ارے اپنے کتوں کو ہٹاؤ رے۔ یہ ریچھ کو زخمی کر دیں گے۔ ہٹاؤ انہیں۔ غریب تماشے والے کی روزی ختم کرو گے کیا؟ ریچھ بے کار ہو گیا تو ہم بے کار ہو جائیں گے۔ کیوں ہماری روزی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو رے۔ ہٹاؤ انہیں۔“

کافی دیر تک کچھ نہیں ہوا۔ کتے اسی طرح گاڑی کو گھیرے رہے۔ گاڑی بان اسی طرح فریاد کرتا' غصہ دکھاتا رہا۔

پھر کسی بااختیار کی آواز نے مختلف احکام دیے اور پاگلوں کی طرح بھونکتے ہوئے کتوں کو کھینچ کر گاڑی سے دور لے جایا گیا۔ وہاں سے بھی ان کے چیخ پکار کرنے' بے تاب ہونے کی آوازیں آتی رہیں۔

کسی نے بلکہ' یہ اسی بااختیار کی آواز معلوم ہوتی تھی کہا۔

”گاڑی سے اتر آرے۔“

یہ حکم گاڑی بان کو دیا گیا تھا۔ وہ اتر گیا ہوگا' حکم نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں

بااختیار آواز نے سوال کیا۔ "ہاں رے کہاں جارہا ہے؟ کون کون ہے گاڑی میں؟"

گاڑی والے نے بتایا کہ سال کے سال اس کا قافلہ ہندوستان کے سرحدی علاقے امپھال کے قریب برمی سرحد تک جاتا ہے۔ میلے میں شریک ہوتا ہے۔ اس وقت وہیں جارہے ہیں اور گاڑی میں وہ خود ہے اس کی بہن ہے اور باہر یہ ریچھ ہے۔

افسر نے کہا۔ "بہن کو اپنی نکال گاڑی سے 'بلا اسے باہر۔"

گاڑی بان نے لڑکی کو آواز دی وہ "ہاں رے ہاں" کہتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔ اترنے سے پہلے اس نے مجھے حوصلہ دینے کو فرش پر تھپکی دی تھی۔

باہر سے اسی افسر کی تعریف کرتی ہوئی لیچڑ بازاری سی آواز آئی۔ "آہا۔ ہاہا۔ یہاں چھپا کے رکھا ہے اپنی بہن کو۔ اوہو ہو ہو۔ کھوب چیز ہے!"

گاڑی بان کی مسکین سی مگر ڈنک مارتی ہوئی آواز آئی۔ "ہاں دوسرے کی چیز ہوتی ہیں یہ' بہنوں کو تو اسی طرح چھپا کے رکھنا ہوتا ہے صاحب! آپ بھی چھپا کے ہی رکھتے ہوگے۔ چوبارے بٹھا کے تو نہیں نا رکھتے ہوگے اپنی بہنوں کو۔"

"کیا بکتا ہے!" جیل کے افسر نے یا تو اسے تھپڑ مارا تھا یا چابک۔ زبردست کڑک سی سنائی دی تھی۔

گاڑی بان نوجوان کی مسکین آواز سنائی دی۔ "ناراض کیوں ہوگئے؟ کیا کچھ غلط کہہ دیا؟"

"پکڑ لو اس ۔۔ کو۔" جیل افسر نے گاڑی بان کو گالی دیتے ہوئے حکم دیا۔

وہ زیادہ سے زیادہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ گاڑی بان جیسے اس کی نادانی پر ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ وردی والے ادھیکاری (بااختیار 'افسر) لوگ ہو۔ سرکار کے لئے کام کرتے ہو' ہماری جان اور عزت کو آپ سے تو کوئی خطرہ نہیں۔"

"مارو سالے کو۔"

کسی نے شاید بید سے ضرب لگائی تھی اس کی آواز کے ساتھ ہی ریچھ کے بہت غصے میں چیخنے کی آواز آئی۔ وہ گاڑی بان پر ہونے والی زیادتی پر سخت برہم ہوا تھا۔

گاڑی بان بولا۔ "ریچھ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مارنا پیٹنا ہے تو مجھے دوسری طرف لے جاکے مارو پیٹو بھیا۔ نہیں یہ بلبلاتا' آپ لوگ پر غصہ کرتا رہے گا۔ کھال ماکھاں۔"

لڑکی نے کہا۔ "ایسا کیا قصور ہوا ہے جو آپ لوگ بھیا کو مار رہے ہو؟ خواہ مخواہ!"

"تو چپ رہ!" افسر نے کڑک کے کہا۔

گاڑی بان کی آواز آئی۔ "ہاں ہاں ری چپ رہ! ادھیکاری لوگ ہیں ذرا اوپر غصہ کر کے بک جھک کے چلے جائیں گے۔"

"جائیں گے نہیں بیٹا۔ تجھے اور تیری اس۔ بھین کو لے کے جائیں گے۔"

"کیوں جی۔ کیوں لے کے جائیں گے؟" دور کے اندھیرے سے یہ آواز آئی ہوگی۔ میں نے لکڑی اور مخمل کی اس پناہ گاہ میں لیٹے لیٹے محسوس کیا جیسے اس آواز کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ یہ نیا بولنے والا' گاڑی بان کی طرح مسکینی سے نہیں بولا تھا۔ اس نے زیادتی کرنے والے کو جیسے اندھیرے کے پھیلاؤ سے ٹوکا تھا' چیلنج کیا تھا۔

"تو کون ہے رے۔ سامنے آ۔"

"سامنے ہی ہوں صاحب!" آواز اور تیکھی ہوگئی تھی اور قریب آگئی تھی۔

"ارے سامنے آ۔" افسر جھنجلاتے ہوئے جیسے ایک طرح کی بے بسی میں چیخا۔

"یہ لو صاحب! آگیا سامنے۔"

"آہ! فوجی ہے۔ جب ہی ٹیڑھی طرح بات کرتا ہے۔ ایک بات یاد رکھ بھئی۔ ہم بھی بانئے کے نوکر نہیں ہیں۔ سرکاری لوگ ہیں اور آفیسر ہیں۔"

"ہاں جی برابر آفیسر ہو۔ یہ لوگ آپ کا سلوٹ۔" فوجی نے ہنستی آواز میں بات کی تھی اور کھڑک کر کے جیل افسر کو سیلوٹ مارا تھا۔

"چل سیلوٹ فلوٹ کو رہنے دے۔ یہ بتا ہمارے آڈر پر سوال کیسے کیا تو نے؟ تو اپنے کام سے کام رکھ ہمیں اپنا کام کرنے دے سمجھا بھئی؟"

"سوال نہیں کیا آپ کے آڈر پر ۔۔۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب! اپنی ڈیوٹی بجائی ہے۔"

"تیری ڈیوٹی؟ ادھر؟ جنگل میں؟"

"ہاں جی۔ جنگل بیڑے 'دلدل ٹیلے' جدھر بھی یہ لوگ قافلے والے جائیں گے ادھر ادھر ہم ڈیوٹی بجاتے چلیں گے۔"

جیل والے کے لہجے میں حیرت تھی۔ "قافلے کی ڈیوٹی؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے صاحب کہ بارڈر تک ساتھ جائیں گے۔ اس لئے کہ کوئی ان

لوگ 'کو' ستائے نہیں۔ ادھر میلے میں ساتھ رہیں گے۔ واپسی میں رنگون منڈالے روڈ پر
لگا کے ہماری پلاٹون اپنی چھاؤنی کو لوٹ جائے گی۔"

"پلاٹون؟ تم بولتے ہو؟ پوری ایک پلاٹون ساتھ ہے۔" جیل والا اب تو سے تم
کرنے لگا تھا۔

"ہاں جی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ پوری جائے گی۔ آدھی پلاٹون تو کہیں
نہیں جائے گی۔" فوجی نے جیل افسر کے احمقانہ سوال کا جیسے مذاق اڑایا تھا۔

"اچ چھا!" ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس بات سے بھی پریشان
ہو گیا کہ جیل میں فوج والوں سے جھک جھک تو ہو ہی رہی تھی اب ادھر جنگل میں بھی
ہونے لگی۔

جیل والے نے جیسے پھر "دم پکڑا" سنو جی ایک قیدی جیل سے بھاگا ہے۔
ہمارے کھوجی کتوں نے یہاں تک کا کھوج اٹھایا ہے۔ کتے سیدھے اس گاڑی پر آئے ہیں۔
قیدی اسی گاڑی میں ہے۔ ہمیں تلاشی لینی ہے۔"

"لو جی صاحب! ضرور تلاشی لو' اور کوئی حکم؟ اصل میں صاحب! پلاٹون کمانڈر
آگے آگے چلتا ہے۔ کوئی بات ہوئے تو پلاٹون کمانڈر کو وائرلیس کر کے پوچھتا ہوتا ہے۔
پر آپ سرکاری کام پر آئے ہو۔ آپ تلاشی لو آرام سے۔ چل بھئی ریچھ کو ہٹا ادھر سے
صاحب کے آدمی گاڑی کی تلاشی لیں گے۔" یہ آخری جملہ فوجی نے گاڑی بان سے کہا
ہو گا۔

دونوں طرف ایک ہلکی پھلکی خیر سگالی کی سی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ گاڑی کی
تلاشی میرے اور قبیلے والوں کے لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ گاڑی بان کی آواز
آئی۔ "ریچھ ایک طرف بندھا ہے۔ آپ لوگ چڑھ جاؤ گاڑی پر۔ میں کھڑا ہوں ادھر۔"

کھٹر پٹر کر کے بہت سے آدمی گاڑی پر چڑھ گئے۔ گاڑی کے اندر بھلا کون تھا؟
انہوں نے سامان رکھنے کے ریک اور الماریاں کھول کھول کر دیکھیں۔ یہ آوازیں میں دم
سادھے پڑا سنتا رہا۔

کسی نے' یہ شاید ان کا وہی افسر ہو گا کہا "گدیاں ہٹاؤ۔" پھر سیٹوں کے قبضے لگے
ڈھکنے اٹھا کر اندر جھانکا گیا ہو گا۔

ایک سپاہی نے اندر سے اونچی آواز میں پوچھا۔ "او گاڑی والا۔ یہ کیا بھرا ہوا؟
سیٹوں کے اندر؟"

"بورے ہیں۔ بھیا جی! سوکھی مچھلی کا' شکاری جانور کا سوکھا گوشت ہے بھیا۔"
یہ گاڑی بان کی آواز تھی۔

"بخ تیری تو! تھو سالا! کیسا باس مارتا ہے۔"

اب گاڑی بان کے خوش مزاجی سے ہنسنے کی آواز آئی۔ "راشن پانی ہے بھیا' ہم
لوگ کا۔۔۔۔ اور کیا۔"

"اندر کوئی نہیں ہے' تو پھر کیوں کتے پاگل ہوئے جا رہے ہیں؟ ایں رے؟"
افسر کسی ماتحت سے سوال کر رہا ہو گا۔ اس نے یہ سوال خود سے بھی پوچھا ہو گا۔

"صاحب یہ گوس مچھلی باس مارتا ہے۔ اس کے کارن دماگ کھراب ہو رہا ہوئے
گا۔ سالوں کا"

"نہیں رے۔" اب کوئی دوسرا سپاہی تھا۔ "ارے ریچھ پر چڑھے آ رہے ہیں
کتے' دیکھا نہیں ہے۔ گاؤں میں مداری آتا ہے تو گاؤں بھر کے کتے بھونکتے ہوئے ریچھ
کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔"

"بکواس کم کیا کرو نائک۔ چھابے جی! چلو اترو۔ ان کتوں کے منہ بند کرو۔ تو
بڑے چڑھا دو۔ خوامخواہ رات بھر سے دوڑائے پھر رہے ہیں۔ ڈیم اٹ!"

پریشان ہو کر سب لوگ گاڑی سے اتر گئے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" ڈی ایس پی نے یہ اس فوجی سے کہا۔

اس نے فرماں بردار ماتحت کی طرح پوچھا۔ "گاڑی کو جانے دوں صاحب؟"

"ہوں۔"

پھر کچھ دیر بعد جیپ کے ریس کرنے اور کتوں کے دیوانہ وار بھونکنے کی
آوازیں آئیں۔ مخالف سمت میں جاتے ہوئے کتوں نے جنگل سر پر اٹھا لیا تھا۔ یہ سب
آوازیں دور ہوتی گئیں۔ جنگل کا سناٹا لوٹ آیا۔

میں نے اپنی مخمل کی پناہ گاہ میں مسکراتے ہوئے سوچا کہ ایک بار پھر میں بچا لیا
گیا ہوں۔

اگر بڑے میاں ریچھ کی صورت میں اس گاڑی کے ساتھ ساتھ نہ ہو لیتے تو
ان احمق جیل والوں کو مداری کے ریچھ اور گاؤں کے کتوں کی دلیل نہ سوجھتی اور وہ یقیناً
گاڑی کو ادھیڑ کے رکھ دیتے۔ ظاہر ہے کتوں کا ٹرینر اپنے کتوں کو جانتا ہو گا اس نے ان
جیل والے دیہاتیوں کو بے کار سمجھانے کی کوشش کی ہو گی کہ گاؤں کے کتوں اور اس

کے جرمن کھوجیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹریز کو یقین ہو گا کہ کتوں کے بھونکنے، مشتعل ہونے کی وجہ ریچھ یا سوکھے گوشت کے بورے نہیں ہو سکتے۔ وجہ کچھ اور ہی ہے بلکہ وجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فراری کی بو اٹھالی ہے۔ اور بس۔

لڑکی اندر آن بیٹھی۔ گاڑی چل پڑی باہر گاڑی بان کسی سے دھیرے دھیرے بات کر رہا تھا۔ ایک بار کسی کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ لڑکی نے مجھ پر کھینچے ہوئے تختے کو تھپکی دی اور ہٹالیا۔ گاڑی کی ہلکی روشنی میں وہ مسکرا رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اس آرام دہ قبر سے کھینچ کر باہر نکالا اور اپنے برابر سیٹ پر بٹھالیا پھر پرانے دوستوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے میرا شانہ پکڑ کر جھول گئی۔ وہ رازدارانہ ہنسے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس کے اس طرح ہنسے جانے پر مجھے حیرت تھی۔

"چکما دیا۔ پولیس والوں کو چلا دیا۔"

"اوہ! تو وہ سب چالاکی تھی۔ جو آیا تھا وہ فوجی نہیں ہے؟"

اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔ "بڑا بھائی ہے میرا۔ اسے فوجی وردی پہن کے رات میں قافلے کے آگے پیچھے گھومنے کا شوق ہے۔ کبھی اس طرح سب کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ ایک بار پھنس بھی گیا تھا۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

گاڑی آدھے گھنٹے اور چلتی رہی میزبان لڑکی نے بتایا کہ صبح ہونے والی ہے۔ سایہ دار درختوں تلے گاڑی روک دی گئی۔

لڑکی نے کہا کہ آجاؤ باہر کچھ دیر بابا کے پاس بیٹھیں گے۔ ہم باہر آئے تو دیکھا انہوں نے صاف ستھری جگہ کمبل ڈال کر بڑے میاں کو لٹا دیا ہے اور دونوں نوجوان آہستہ آہستہ بدن دباتے اور ان کے سر کی مالش کر رہے ہیں۔

مجھے اترتے دیکھ کر بڑے میاں نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تھا۔

میں نے کہا آپ نے ایک بار مجھے پھر بچالیا ہے۔ مہربانی ہے آپ کی۔ وہ دھیمے سے مسکرائے۔ کمزوری صورت سے عیاں تھی۔ ابھی اتنے بڑے جھٹکے سے وہ سنبھلے ہی تھے کہ دوبارہ کایا بدلنے کے ہلا دینے والے تجربے سے گزرنا پڑا۔ تو اب بحال ہوتے پھر کچھ دیر لگے گی۔

روشنی ہوتے ہوتے بڑے میاں کی قوت اتنی بحال ہو گئی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

لڑکی نے گاڑی سے سامان نکال کر قہوہ بنالیا تھا۔ تھوڑا کچھ کھا کر قہوہ پی کر قبیلے کے دونوں نوجوان اور لڑکی ہٹ گئے۔ بڑے میاں نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں کمبل کے فرش پر آبیٹھا تو کہنے لگا۔ "یہ لڑکا۔ لڑکی تمہاری جتنی عمر کے یا تم سے کچھ بڑے ہیں۔ انہوں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ قبیلے کے آدمیوں سے نمٹنے کے لئے ان کا مشورہ اور مدد مجھے کافی ہو گی مگر اپنے آپس کے معاملے نمٹا کے ہمیں۔ مطلب مجھے تمہیں، کوسومی کو آگے کا بھی کچھ سوچنا ہو گا۔ اس وقت میں چاہتا ہوں۔ ہم دونوں بیٹھ کر آگے کا سوچ لیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، مگر آگے شاید میرا آپ کا زیادہ دن کا ساتھ نہ رہ پائے گا۔"

"کیسے؟" بڑے میاں نے پوچھا۔

"یوں کہ اب جیسے ہی مجھے موقع ملا میں پاکستان کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ بولے۔ "یہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"پھر؟"

بڑے میاں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے کہنا شروع کیا "شیر علی! جو بات تمہیں نہیں معلوم۔ اور اب معلوم ہو جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ میں دو تین دن کا مہمان ہوں۔ نہیں، نہیں پوری بات سن لو، بیچ میں مت ٹوکو۔ یہ بات میرے قبیلے کے ان لڑکوں لڑکیوں کے بھی علم میں ہے، کوسومی بھی یہ بات جانتی ہے۔ میں نے یہ سب باتیں جو اس وقت تم سے کہہ رہا ہوں کوسومی کو سمجھا دی ہیں۔ اس کی مرضی معلوم کرلی ہے۔ تمہیں جیل سے نکالنے سے پہلے ایک ایک بات اس لڑکی کوسومی سے کہہ سن لی ہے۔ میں جو کچھ کرنے والا ہوں اس پر کوسومی رضامند ہے مگر اصل رضامندی اور منظوری تمہاری ہے۔ تم نے اگر ہماری امیدوں کے خلاف فیصلہ کیا۔ تم رضامند نہ ہوئے تو اس صورت میں ہم کیا کریں گے ہم نے وہ بھی سوچ لیا ہے۔"

بڑے میاں دم لینے کو رکے۔ میں سوچنے لگا یا الٰہی مجھے بتائے بغیر میرے بارے میں کیا کیا سوچ لیا ہے ان دادا پوتی نے؟

دم لے کر بڑے میاں نے بولنا شروع کیا۔ "یہ کوسومی میرے اکلوتے بیٹے کی اولاد ہے۔ اب اکیلی یہی رہ گئی ہے اسے اگر میں قافلے کے پاس چھوڑ کے رخصت ہوتا

ہوں تو یہ سب لوگ۔ اسے قبیلے کی سرداری دینا چاہیں گے۔ بہت زور ڈالیں گے اور یہ بات اسے۔۔۔ میری پوتی کو پسند نہیں۔ سمجھو۔ یہ اس کے بس کا کام نہیں ہے۔ میں اگر اسے مانگ یان میں رہنے دیتا ہوں تو بھی وہی بات ہے۔ سب مانگ یان میں ڈیرا ڈال دیں گے۔ اس سے ہاں کرا کے چھوڑیں گے' پھر ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ میرا برسوں کا کام مانگ یان کالج سمجھو اکھاڑا بن جائے گا۔ سارے جھگڑے ادھر ہی اٹھیں گے۔ ادھر ہی نمٹارا کرنا چاہیں گے۔ سب کے سب نمٹے گا کچھ نہیں میرا کالج ختم ہو جائے گا۔ یا تو پڑھنے والے' ہاسٹل میں رہنے والے بھاگ جائیں گے یا برمی حکومت ادھر اپنے آدمی بٹھا دے گی' قبضہ کرلے گی۔ ہر صورت میں میرا کام برباد ہو جائے گا۔"

میں نے پریشانی میں سر کھجانا شروع کر دیا۔ یہ بڑے میاں چاہتے کیا ہیں؟ اگر یہ ویسا چاہتے ہیں جس کا مجھے شک سا ہو رہا ہے تو وہ ممکن نہیں ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ تو سب میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتایئے آپ نے سوچا کیا ہے ؟"

بڑے میاں نے شکاری پرندوں کے پنجے جیسا اپنا ہاتھ میرے شانے میں مس کیا۔ "شیر علی! میں چاہتا ہوں تم اسے' کوسومی کو اپنے ساتھ نکال لے جاؤ۔"

"نکال لے جاؤں؟ کہاں؟"

"جہاں تم جا رہے ہو' وہاں لے جاؤ۔"

"مگر۔۔۔ میں۔۔۔" میں گڑبڑا کر بڑے میاں کی صورت دیکھنے لگا۔

"میں تو پاکستان جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صوبہ سرحد جاؤں گا۔ جہاں میرے گھر والے ہیں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وقت آنے پر یہ اگر کہے' جہاں کہے' اس کا گھر بسا دینا۔ نہیں تو یہ تم لوگوں کے قریب کہیں رہ لے گی۔ آپ اپنی دیکھ ریکھ کرلے گی۔ لڑکی ہشیار ہے۔"

بڑے میاں کی بات سن کر ایک بوجھ سا اتر گیا۔ یہ وہ نہیں چاہتے جس کا مجھے خدشہ ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے یقین سے آپ کیوں کچھ کہہ رہے ہو؟ اس وقت طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرو گے' دوا دارو کرو گے ٹھیک ہو جاؤ

گے۔"

بڑے میاں ہلکے سے مسکرائے۔ "اچھا' یہ تو تمہاری پہلی بات ہوئی۔ دوسری بات کہو' کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اگر کچھ ہو گیا آپ کو تو میں کوسومی کو اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ میری ماں اس کی دیکھ بھال کرلے گی۔"

بڑے میاں کا چہرہ روشن ہو گیا' بولے' بڑی عمر ہو تمہاری۔ تمہاری ماں سلامت رہے بس مجھے یہی سننا تھا۔"

بڑے میاں نڈھال ہو کر پڑ رہے' دور سے نوجوانوں میں سے ایک نے جھانکا۔ بڑے میاں نے اسے دیکھ کر کمزوری سے اپنا ہاتھ اٹھا کر گرا دیا۔ لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ وہ کہنے لگے۔ "اب چلنے کی کرو۔ ہمارے لوگ دور نہ نکل گئے ہوں۔"

قبائلی دوڑا دوڑا گیا۔ گاڑی لے آیا۔ لڑکی نے اور اس نے سہارا دے کر بڑے میاں کو سوار کرایا۔ فرش میں بنے مخمل کے آرام دہ کھانچے میں لٹا دیا وہ دونوں لڑکے اور لڑکی باہر جا بیٹھے۔

میں ان کے قریب فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے۔ "باتیں کرو۔ کچھ اپنی' اپنے لوگوں کی۔ یہ بتاؤ تم زندگی میں آگے کیا بننا چاہتے ہو؟"

مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آگے کیا ہو گا' کیا بنوں گا۔ پاکستان کا مشرقی صوبہ جسے ں نے پیدائش سے اب تک اپنا گھر سمجھا' دشمنوں کی کارروائی کے بعد اب میرے لئے ید خانے سے بدتر ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد کا کوئی بھی شہر یا پنڈی' لاہور میرے وطن کے ر تھے۔ یہ پانچ چھ شہر میرے دیکھے ہوئے بھی تھے۔ مگر میں انہیں اس طرح یاد کرتا ا جیسے کوئی ٹورسٹ خوب صورت سیر گاہوں' ہل اسٹیشنوں کو یاد کرتا ہے۔ خوش ہو کر۔ ا بے تعلقی کے ساتھ۔ گھر کی طرح نہیں' گھر تو میرا سندر بن میں تھا۔ یہ الگ بات کہ لدین اور بہن بھائیوں کی وجہ سے میرا دل مجھے مالاکنڈ ڈویژن میں' صوبہ سرحد کے اس وٹے خوب صورت گاؤں کی طرف بار بار کھینچتا تھا جہاں وہ سب' میرے پیارے جا بسے ے۔ یہ وہ گاؤں تھا جسے یاد کرکے میرا باپ ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا اور کہتا تھا کہ یار ایک ز جانا ادھر ہی ہے۔ میں نے یہی سب باتیں کہیں تو بڑے میاں اداسی سے مسکرائے نے لگے۔ "وطن' گھر' یادیں انسانوں کے ساتھ یہی قصہ ہے۔ ہاں تمہارے مسلمان یوں نے اس بھید بھاؤ سے آدمیوں کو نکالنے کا کہیں کہیں جتن ضرور کیا ہے۔ تم نے

سنا، پڑھا ہو گا۔ انہوں نے کئی کئی طرح کہا ہے۔ ایک مرشد، گرو کہتا ہے کہ ہر ملک ہمارا ملک ہے کیوں کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔ بڑی بات ہے۔ اگر آدمی سمجھ لے تو۔ چڑیوں کو دیکھا ہے تم نے سال بھر میں دنیا کا طواف کر لیتی ہیں۔ ہر نیا موسم نئے خطے میں گزارتی ہیں۔ ہزاروں ہزار میل پر مارتی نکل جاتی ہیں۔ ہر ملک ان کا ملک ہے۔ اس لئے کہ ان کے مالک کا ملک ہے۔"

میں نے سر ہلا کر ان کی بات سے اتفاق کیا تو وہ اچانک پوچھ بیٹھے "شیر علی! تمہیں جانور کیسے لگتے ہیں؟"

"جانور؟" میری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے دہرایا۔

"ہاں، ہرن، چیتے، شیر، ریچھ، باز، گدھ اور چڑیا۔ سب جانور لومڑی، سور، اژدھے، کتے۔ سب ہی۔"

میں نے کہا۔ "مخلوق ہے خدا کی۔ یہ زمین ہم سب انسانوں، چوپایوں، پرندوں، کیڑوں کا ہم سب کا مشترکہ گھر ہے۔"

خوش ہو کر بولے۔ "ٹھیک! اور جانوروں میں سب سے بھلا جانور کون سا ہے؟"

"سب ہی بھلے ہیں۔ مخلوق ہیں خدا کی۔"

"نہیں۔ اس طرح نہ کہو۔ یہ تو ہم پہلے طے کر چکے کہ سب کی زمین ہے کس لیے کہ اس ملک کی زمین ہے اور سب اپنے اس مالک کا مال ہیں۔ اب یہ کہو ان سب میں۔ سب ہی میں، ایک سب سے بھلا، من موہنا کون سا جانور ہے؟"

میں نے ایک دم کہا "شیر۔"

بڑے میاں نے دہرایا "شیر" پھر بولے۔ "شیر تو پھر شیر ہی شیر۔ تیرے مقدر میں شیر۔ بچ کے کہاں جائے گا۔ کون اپنے مقدر سے بچا ہے۔"

میرے بدن سے سردی کی لہر گزر گئی۔ کیا یہ کوئی پیش گوئی ہے؟ کیا کوئی شیر مجھے مار دے گا؟ ایک عجیب سے خوف نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں نے کچھ پڑھنا چاہا، اس وقت کوئی دعا یاد نہ آئی۔

O

ایک آدھے منٹ گاڑی میں سناٹا رہا، پھر بڑے میاں کے دھیرے سے ہنسنے اور بڑبڑانے کی آواز آئی۔ "واہ تیری قدرت! کیا تیری لیلا ہے، جے ہو، میں پہلے ہی جانتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا جانتے تھے؟"

بولے۔ "یہی کہ جانوروں میں تجھے شیر سب سے بھلا لگتا ہو گا۔ تیرے مزاج میں شیر ہے۔"

"کیسے؟"

"دلیری، غصہ، سرداری...... یہ تیرے مزاج میں ہے۔"

"اچھا؟"

"جو جس کے مزاج ہیں، جس کے گھٹ میں بیٹھا ہوتا ہے، وہی اس کی کایا میں ہوتا ہے۔ جیسے میرے انتر میں، میری کایا میں ریچھ اترا ہوا ہے۔"

"ریچھ؟" میں بڑے میاں کی باتوں سے خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

"ہاں ریچھ۔ طاقتور، ضدی، بے چین، مٹھاس کا لوبھی۔"

"بابا یہ مٹھاس کی کیا بات کہی؟"

"جنگل میں رہتے رہے اور جان نہ پائے یا بھول رہے ہو؟"

"ہاں۔" مجھے یاد آیا۔ "ریچھ شہد کے چھتے ڈھونڈتا ہے۔ جانتا ہوں میں۔"

وہ گہری جاندار آواز میں بولے۔ "پر تمہاری کایا میں شیر ہے۔ پکے سونے اور نارنجی رنگ کا، کالی کاجل دھاری سے سجا۔ طاقتور، غصے میں بھرا، عزت دار، مغرور، سردار، آرام طلب، دلیر اور دلیر اور ایک بار اور بھی دلیر۔"

بڑے میاں نے یہ جو کچھ کہا، بہت جوش سے بلکہ شاید ایک طرح کی دیوانگی سے کہا تھا۔

کچھ دیر سکون سے پڑے رہے پھر بولے۔ "ریچھ جان کھینچ لیتا ہے' اس لیے برابر حرکت میں رہتا ہے اور ضدی ہے۔"

میں نے بے سمجھے ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ بولے۔ "شیر جو بیس گھنٹے میں سو سولہ اٹھارہ گھنٹے پڑا سوتا ہے۔ اپنی بھی دوسرے کی بھی جان روکے رکھتا ہے۔ ش بہت دن جیئے گا۔ بہت دن زندہ رکھے گا۔"

وہ ایک طرح کی آدھی بیداری میں خود سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ میں چا تھا' کچھ دیر وہ سولیں۔ وہاں سے اٹھنے لگا تو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا' میں بیٹھا رہا۔

دھیرے سے بہت کمزور آواز میں بولے۔ "سب پیسہ پورا اثاثہ مائننگ یان کا میں لگا دیا۔ اب جو تمہیں کو سومی کا سرپرست بنا کر اسے تمہارے سپرد کر رہا ہوں تو دیکھ ہوں میرے پاس دینے لائق کچھ نہیں۔ سونا' جواہر' جائیداد...... کچھ نہیں۔ بینک میں بھ کچھ نہیں رکھا۔ سب کالج کے نام کر دیا۔"

میں نے تسلی دی۔ "آپ نے خود دیکھا ہے کو سومی کو جو دولت سنبھالنے کو د گئی ہے' وہ کتنی ہے۔ وہ میرے اپنے لوگوں کے کام آئے گی اور کو سومی اب میرے ا لوگوں میں شامل ہے۔ میں اس کے لیے الگ سے بھی کچھ رکھ دوں گا۔ پھر کسی کا کوئی ز نہیں رہے گا۔ کبھی بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

کہنے لگے۔ "پھر بھی۔ تمہارے پاس میرا دیا کچھ نہیں ہو گا۔ بس ایک ذمہ دار ہو گی اس لڑکی کی شکل میں۔ اس لیے میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ کہو میں جو دوں گ قبول کرو گے؟ بولو' لے لو گے مجھ سے؟"

میں نے مطمئن کرنے کو کہا۔ "ہاں' لے لوں گا۔"

بڑے میاں کھل اٹھے۔ "جیتے رہو مگر یہ بات' یہی بات کہ لے لوں گا' تمہیں ایک بار اور کہنی ہو گی۔ جس وقت میں "ارپن" کر رہا ہوں گا۔ دے رہا ہوں گا' تمہیں یہ سب کرنا ہو گا۔ کہنا ہو گا کہ میں نے وہ عطیہ لے لیا' خوشی سے لیا سمجھے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کہہ دوں گا۔"

بڑے میاں نے اس کھانچے مخمل کی اس "قبر" میں سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تلاش کیا۔ وہ کچھ دیر اسے تھپکتے رہے' پھر سو گئے یا یہ غشی تھی؟

ہماری بھینسا گاڑی کھلی ہوئی دھوپ میں ایک خشک برساتی نالے سے گزر کر جیسے ہی درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچی' اچانک بڑی سڑک کے رخ سے گولی چلنے

کی آواز آئی۔

بڑے میاں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی چلانے والے نے راسیں کھینچ لی تھیں اور بھینسوں کا رخ موڑ کر گاڑی درختوں کے جھنڈ میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور فائر ہوا اور پچھلے سیدھے پہیے نے دھماکہ کیا۔ گاڑی اسی طرف جھک گئی۔ گولی نے ٹائر پھاڑ دیا تھا۔

بڑے میاں نے دھیرے سے کہا۔ "اتنا سچا نشانہ جسگھے کا ہی ہو گا۔ یہ پولیس والے نہیں ہیں۔ جسگھے وہی بدمعاش ہے جو کہتا ہے' میں نے کالج کھول کے برا کیا ہے۔ وہ لوگ ہتھیاروں پر قبضے کر چکے' اب دھمکانے آئیں گے۔ شیر علی خان! مجھے باہر پہنچا دو۔ میں نہیں چاہتا اپنے گندے جوتوں کے ساتھ وہ میری اس گاڑی میں آئیں۔"

میں نے ہاتھ پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے انہیں فرش کے کھانچے سے نکالا۔ اس وقت ہماری طرف سے دو فائر کیے گئے۔

بڑے میاں ہنسے۔ "یہ میرے بچے جواب دے رہے ہیں۔ تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ جو لڑکا گاڑی ہانک رہا ہے' وہ جسگھے کا بیٹا ہے۔ ابھی جو دو فائر ہوئے ہیں' ایک تو اسی نے کیا ہو گا' باپ کو ڈرا رہا ہے۔"

میں بڑے میاں کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارنے ہی والا تھا کہ لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی برمی میں تیز تیز بولتے ہوئے بڑے میاں لو گاڑی سے اترنے کو منع کر رہی تھی۔ بڑے میاں نے ہاتھ کے بے چین اشارے سے اے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔ نوجوان اپنے سردار کی سلامتی کی طرف سے فکرمند تھے۔ لڑکی کہنے لگی کہ جسگھے کے بیٹے کا خیال ہے' وہ بات کرنے نہیں آئیں گے اور نہوں نے یہ فائر ڈرانے کو نہیں کیے ہیں۔ باہر آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں گاڑی سے ہی ائر کرتے رہنا چاہیے۔

لڑکی یہ باتیں کر رہی تھی کہ اس کا بھائی دو رائفلیں اور میگزین اٹھائے جھکا جھکا یا۔ وہ ہمیں دروازے میں کھڑا دیکھ کر سمجھ گیا کہ بڑے میاں گاڑی سے اترنا چاہتے ہیں۔ ل نے بھی وہی کہنا شروع کیا جو اس کی بہن کہہ رہی تھی۔

بڑے میاں نے مجھے اشارہ کیا۔ ایک رائفل اور اضافی میگزین میں نے لے لی۔ سری رائفل لڑکی کی تھی۔ میں سنا سڑک کی طرف سے فائر تیز ہو گیا تھا۔ یہ اچھی امت نہیں تھی۔ میں نے بڑے میاں سے کہا۔ "گاڑی میں ہی رہیے۔ یہ لوگ ٹھیک

کہتے ہیں۔ ہمیں بلا ضرورت گاڑی نہیں چھوڑنی چاہیے۔"

وہ بولے۔ "ہم بے ضرورت گاڑی نہیں چھوڑ رہے۔ شیر علی! تم اور اے لڑکی! تم مجھے کورنگ فائر دو۔ میں گاڑی چھوڑ کر سامنے درخت کی اوٹ میں جا رہا ہوں۔"

وہ ٹھیک کہتے تھے' واقعی بہت ضدی آدمی تھے۔ سب کے منع کرنے کے باوجود بڑے میاں لڑکھڑاتے ہوئے درخت کی طرف بڑھے۔ میں نے گاڑی کی اوٹ سے نکل کر ایک گھٹنا ٹیک دیا اور سڑک کے رخ فائر کرنا شروع کر دیئے۔ لڑکی میرے برابر سرک آئی تھی۔ اس نے بھی تیزی سے فائر کیے۔ پھر جب دیکھا کہ بڑے میاں درخت کی اوٹ میں پہنچ گئے ہیں تو ہم نے فائر روک لیا۔ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گئی۔ میں بابا کے پاس چلا آیا۔

وہ تنے سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھے تھے کہ سڑک سے آنے والے فائر کے اور ان کے بیچ تین فٹ موٹا زندہ درخت کا تنا تھا۔ میں ان کے برابر آ بیٹھا تو ہنس کر کہنے لگے۔ "بچے سمجھتے ہیں' میں ان بدبختوں کے ارادے سمجھ نہیں پایا ہوں۔ میں جان گیا ہوں' وہ اب بات کرنے نہیں' گولی مارنے آئیں گے۔"

میں حیران رہ گیا۔ اگر ایسا تھا تو ہم گاڑی میں زیادہ محفوظ تھے۔ کیوں نکل آئے اور بڑے میاں نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں نہیں چاہتا' وہ بدمعاش گندے جوتے لے کر گاڑی میں آئیں۔

میں نے یہی بات کہہ دی تو بولے۔ "اس گاڑی میں' میں اپنے بیٹے کی ماں کو بیاہ کے لایا تھا۔ میں نہیں چاہتا' میرے اور ان بدمعاشوں کے خون سے یہ گاڑی ناپاک ہو۔"

اپنے خون کا وہ اس طرح ذکر کر رہے تھے جیسے انہیں پورا یقین ہو کہ وہ خون بہے گا۔

میں نے پوچھا۔ "اگر یہ صحیح ہے کہ مخالفت تین چار گھروں کے بڈھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ ہی کر رہے ہیں اور نوجوان سب آپ کے ساتھ ہیں تو یہ کیسے ہوا کہ وہ چند بدمعاش لوگ اکثریت پر غالب آ گئے؟"

کہنے لگے۔ "ہتھیاروں کے بل پر' ان بدمعاشوں نے بچوں کو اچانک گھیر لیا ہو گا...... بے بس کر دیا ہو گا۔"

میں نے دھیرے سے کہا۔ "یقین نہیں آتا۔ آدمی جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے' نرم خو ہوتا جاتا ہے۔ آپ کے قبیلے میں یہ کس قسم کے بوڑھے ہیں؟"

مسکرا کر بولے۔ "بدمعاش قسم کے بوڑھے...... اصل میں وہ بگڑ گئے ہیں۔ میں نے' میرے بیٹے نے وہ نہیں کیا جو ہم سے پہلے گزرنے والے سردار کرتے رہتے تھے۔"

"وہ کیا کرتے تھے؟"

"مخالفت کرنے والوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کے اراوڈی دریا میں بہا دیتے تھے۔"

"اوہ!"

"یہ دو سرداروں کے بیچ کی گئی نرمی ہے جس نے ان ناسمجھ لوگوں کو سخت بنا دیا۔ وہ نرمی کا بدلہ نرمی سے دینا نہ سیکھ سکے۔ خیر شکوہ بیکار ہے۔ شیر علی! کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا' میں دو تین دن کا اور ہوں...... وہ بات غلط تھی۔ میں آج...... ابھی نہیں تو رات پڑنے سے پہلے مارا جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "ہنہہ! یہ عجیب بات کہی آپ نے...... آپ ابھی بہت دن جئیں گے۔"

"سنو۔" وہ لمحے بھر خاموش رہے' پھر بولے۔ "میں جو ابھی گاڑی میں بات کرتے کرتے چپ ہوا تھا تو میں سو گیا تھا اور سوتے ہوئے خواب دیکھا تھا' تم نئی عمر کے' نئی سوچ کے آدمی ہو' خواب کو خواب میں دیئے گئے اشاروں کو نہیں مانتے ہو گے۔ ٹھیک ہے' ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں تم سے کچھ بھی ماننے کو نہیں کہتا۔ صرف ایک خبر دے رہا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ ایسے ہی درختوں...... شاید اسی درختوں کے جھنڈ میں ایک ریچھ' سر سے پیر تک کالا ریچھ آخری سانسیں لے گا اور پکے سونے کا اور نارنجی رنگ کا کالی کاجل دھاری سے سجا ایک دلیر' طاقتور' مغرور شیر غصے میں بھرا یہیں سے اٹھے گا۔ یہیں سے پہلی جست لے گا اور خوب چلے گا۔ جیتا رہے گا۔ یہ خبر مجھے خواب میں ملی ہے اور یہ خبر مجھے تمہیں سنانی تھی جو میں نے سنا دی۔"

یہ یقیناً ایک ہیجان زدہ بیمار اور تھکے ہوئے آدمی کی باتیں تھیں۔ پوری طرح بے ربط نہ سہی مگر خواب اور پیش گوئی اور یہ سب اشارے کہ میں کیونکہ شیر کو سب سے اچھا اپنا پسندیدہ جانور سمجھتا ہوں تو ایک شیر' دلیر' مغرور وغیرہ وغیرہ یہاں ان درختوں کی سایہ سے جست لگا کر نکلے گا...... شیر یہاں کہاں سے آئے گا؟"

میں نے بڑے میاں سے کہا۔ "آپ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کر لیں۔ دیر سے انہوں نے فائر نہیں کیا ہے۔"

وہ کہنے لگے۔ "اور کیا کرنا ہے۔ اب آرام ہی کرنا ہے۔ تم کہہ رہے ہو ان بدمعاشوں نے دیر سے فائر نہیں کیا تو ابھی سن لینا۔ وہ گاڑیوں کو دھکا دیتے ہوئے خاموشی سے ادھر لا رہے ہوں گے۔ ہمارے قریب آ کے چڑھ دوڑیں گے...... خیر ان کی بات رہنے دو۔ یہ کہو میری بات سن لی اور سمجھ لی تم نے؟...... نہیں شاید ابھی نہیں سمجھ پائے۔"

"کون سی بات؟" میں نے ٹالنے کو پوچھا۔

"یہ بات کہ میرے جانے میں کم ہی وقت ہے شیر علی! بہت کم وقت۔ اب جو میں دینے والا تھا' تمہیں ارپن کرنے کو تھا' وہ سنبھالنے کا وقت آ گیا ہے' لے لو۔ تمہاری امانت جانے سے پہلے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

"کیسی امانت؟" مجھے ان کی باتوں سے خوف آ رہا تھا۔

بڑے میاں نے گھور کے مجھے دیکھا۔ روکھے پن سے بولے۔ "ٹالو مت...... تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں جو عطا کروں گا' جو بھی تمہیں بخشوں گا' تم اسے خوشی سے قبول کر لو گے۔"

وہ اب غصے سے کانپ رہے تھے۔ "تم نے وعدہ کیا تھا' تو لو میں تمہیں' تمہارے اپنے گھٹ میں بیٹھے تمہاری اپنی کایا میں اترے شیر کو' میں تمہارے شیر کو تمہیں ارپن کرتا ہوں۔ کہو شیر علی! کہو میں نے لیا' کہو لے لیا اور مٹی پر گر کر ایک بار شیر بن کر اٹھ کھڑے ہو شیر علی! کہو یہ کہو' میں نے لے لیا اور اٹھ کھڑے ہو شیر!"

"نہیں!" میں نے اتنے ہی غصے سے کہا۔ "نہیں۔"

بڑے میاں کی تمام تر قوت ان کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو پورے غیظ و غضب سے انگارہ کر کے انہوں نے چیخ کر حکم دیا۔ "کہو کہ میں نے مرشد سے اپنے گرو سے اپنے انتر کا شیر لے لیا۔ کہو اور مٹی پر گر کے جن نی' دھرتی پر گر کے شیر بن جاؤ۔ شیر نصیبوں والے۔"

"نہیں۔"

مجھے لگا جیسے بڑے میاں کسی اندرونی ضرب سے گھائل ہو گئے اور اب گرنے والے ہیں۔

میرے عقب سے ایک لڑکی کی تاسف اور خوف سے سسکاری سنائی دی۔ یہ وہی میزبان لڑکی تھی' وہ رو رہی تھی۔

"ہم گھر گئے ہیں شیر علی۔ وہ لوگ انہیں' تمہیں' ہمیں' کو سومی کو سب کو ماریں گے۔ ہم گھیر لیے گئے ہیں۔ اب نکلنے کی کرو سردار' نکلنے کی کرو شیر علی سردار۔"

میرے سامنے سے ایک فائر ہوا اور بڑے میاں کا دایاں شانہ اور آدھا رخسار پکے قندھاری انار کی طرح پھوٹ کر میرے پیروں میں آ گرا۔ ایک اور فائر ہوا۔ گولی میرے چہرے سے تین انگلی دور سے نکل گئی۔ میں بیٹھا رہا۔ میرے پیروں کے پاس گرا ہوا خون میں نہایا جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوا بوڑھا لاغر بدن آخری جی وٹ کے ساتھ اٹھا' ندی بڑے میاں نے کمزور مگر صاف لفظوں میں کہا۔ 'میں تمہیں شیر ارپن کرتا ہوں یر۔"

اور تب میں نے بنگشوں کے غیرت مند خون کے ابال میں خدا کی قسم کھائی اور میں نہائے اس دلیر بوڑھے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے اور چیخ کر کہا۔ "میں نے مرشد ے اپنے انتر کا شیر لے لیا۔"

یہ میرا وہم تھا یا میں نے دیکھا کہ بڑے میاں کے خونم خون چہرے پر گر جانے ے پہلے ایک مسکراہٹ آئی تھی۔

پھر وہ شاید میری میزبان لڑکی تھی جس نے دھکا دے کر مجھے درختوں تلے اگلی ور گھاس پر گرا دیا۔

میں نے ایک سیاہ غبار کو اپنے گرداگرد پھیلے اور غالب آتے محسوس کیا اور یوں وس کیا جیسے ہزاروں بجلیاں ایک ساتھ میرے بدن میں چشمک کرتی ہیں۔ بجلیوں کی سنسناہٹ زندگی بخش اور ساتھ ہی ناقابل برداشت تھی۔ میں چیخا۔

میں چیخا اور میں نے شیر کو دہاڑتے سنا۔ شیر بالکل قریب سے' میرے پہلو ے...... نہیں میرے اندر سے دہاڑ رہا تھا۔

میں نے پھر ایک چیخ ماری۔ یہ نر شیر کی دہاڑ تھی۔ سندر بن کا رونل بنگال بگر دہاڑتا تھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے مٹی سے اٹھتے ہوئے خود سے سوال ۔ میں ہاتھوں کے بل اٹھا تھا اور میری نظر اپنے ہی پنجوں پر پڑی تھی۔

میرے پنجے! دونوں پنجے اب سنہرے اور نارنجی فر سے ڈھکے ہوئے تھے جس پر ئیر دھاریاں تھیں۔ فر کے جیسے دو دستانے تھے اور اسٹیل کے چاقو جیسی دھار والے ے ہوئے شیر ناخن ان پنجوں سے نکل کر مٹی میں گرتے جاتے رہے تھے۔ میں نے سر کرا کر اپنا پورا آپ دیکھا۔ میں ر تا سر شیر ہو چکا تھا۔

میں نے مسرت کا ایک نعرہ' ایک دہاڑ ماری۔
میں اب شیر تھا۔
سامنے سے رائفلیں اٹھائے دوڑے آتے درمیانی عمر کے دو آدمیوں نے مجھے' مجھ شیر کو درخت کے نیچے پورے قد سے کھڑے ہوتے دیکھا اور دہاڑتے سنا۔ وہ دونوں جیسے پتھر ہو گئے۔
ان سے رائفلیں الگ کرنا ضروری تھا۔ میں ان کی طرف چلا' قدم قدم چلا۔ وہ سانس روکے' آنکھیں کھولے تکے جا رہے تھے جیسے مسمریزم کے اثر میں آئے معمول سب کچھ دیکھ بھی رہے ہوں اور کچھ کچھ دیکھ بھی نہ سکتے ہوں۔
میرا اٹھا ہوا پنجا ان سے ابھی چھ فٹ دور ہو گا کہ دونوں کے ہاتھ سے رائفلیں چھوٹ کر زمین پر گریں اور وہ غیر انسانی دہشت میں اپنے حلق سے ہو او او او کی آوازیں پیدا کرتے الٹے پیروں بھاگے۔
میں نے ایک اور دہاڑ لگائی۔ ان میں سے ایک گرا' دوسرا اس پر پیر رکھتا ڈگمگاتا سنبھلتا سڑک کی طرف دوڑ گیا۔ وہ دوڑنے والا اب چیخنے کے قابل ہوا تھا اور بے رکے چیخے جا رہا تھا۔ شیر' شیر' شیر' شیر۔
میں نے مڑ کر اس گرے ہوئے کو دیکھا۔ اس کے یا دوسرے کے فائر نے بڑے میاں کی جان لی تھی۔ میرا جی چاہا ایک پنجا چلا کر اسے ختم کر دوں مگر وہ گرا ہوا تھا۔
میں جانور نہیں تھا' انسان تھا اور انسانوں میں دشمنی تک کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔
ہمارے ساتھ کی لڑکی پاس پڑی دونوں رائفلیں اٹھا رہی تھی۔ اس کے بھائی نے گرے ہوئے بدمعاش کو جو بے ہوشی میں تھا' رسی سے باندھنا شروع کر دیا۔
میں سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ یہ اطمینان دلانے والی بات تھی۔
میں فرار ہونے والے کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی نے دیکھا اور گڑبڑا کر اپنی بگڑی ہوئی اردو میں پکارنے لگی۔ "سردار' سردار' واپس۔ واپس۔ آگے نہیں جانے ہے۔ نانا' واپس۔"
مجھے یاد آیا' اس طرح لوگ اپنے پالتو جانوروں سے کتوں وغیرہ سے بات کرتے ہیں۔
میں اگر ہنس سکتا تو ضرور ہنستا۔

میں واپس درخت کی اوٹ میں آ گیا۔ یہاں بڑے میاں کا جسد خاکی پڑا تھا۔
ان کا ٹوٹا پھوٹا خون آلودہ جسم بہت چھوٹا' کسی نوعمر لڑکے کا جسم لگتا تھا۔ زخمی یک رخے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جو میں نے اس چہرہ پر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پر ان کی آنکھیں جیسے ایک حیرت میں کھلی رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا کاش میں اس وقت انسان کی جون میں ہوتا...... انسان کی جون میں ہوتا تو یہ آنکھیں ہاتھ بڑھا کر بند کر دیتا۔
یہ سوچنا ہی کافی تھا۔ میں نے سوچا اور میری کایا بدل گئی۔ بجلی کے ایک لشکارے میں جس سے شاید صرف میں چکاچوند ہوا تھا۔ میں نے خود کو درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے محسوس کیا۔ میں نے دیکھا' میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوں' شیر نہیں' اب میں پھر شیر علی تھا۔
لڑکی نے درخت کی اوٹ سے پکارا۔ "شیر خان۔"
"ہوں۔" اور میں نے ہاتھ بڑھا کر آہستگی اور احترام سے بڑے میاں کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔
لڑکی' جس کا نام بھی اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا۔ میرے پاس آئی اور گردن میں بانہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بازو کے گھیرے میں اس کا سر لے کر آہستہ آہستہ سے تھپکنا شروع کیا۔ میں تسلی کے سوا اور کیا دے سکتا تھا۔
اس کا بھائی اور دوسرا نوجوان ہمارے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے اور ان جوانوں کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا۔
"حوصلہ کرو' حوصلہ میرے دوست۔"
لڑکی میرے برابر سے اٹھی۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور گریے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "سردار! جو بھاگ گیا' وہ جسگھے تھا۔ اس ہمارے ساتھی کا باپ۔"
میں نے کہا۔ "سنو! میں تمہارا سردار نہیں ہوں مگر جب تک ہم رستے میں ہیں اور جب تک تمہارے دوسرے ساتھیوں سے مل نہیں لیتے' میں تمہارا منہ بولا ساتھی ضرور رہوں گا۔ آؤ اس جسگھے کو گرفتار کرنا ہے۔ ہر صورت میں اور ابھی۔ تم دونوں بہن بھائی میرے ساتھ آؤ گے۔" میں نے جسگھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ یہاں بابا کے اور اس قیدی کے پاس رہے گا۔ گاڑی کی نگرانی کرے گا۔"
لڑکی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ بولی "تم خود سردار کہو کہ

نہ کہو' پر سردار ہو اور شیر تو ہو ہی۔ یہ ہم تینوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔"

میری پیشانی پر بل پڑ گئے ہوں گے کیونکہ میں نے الجھ کر کہا تھا۔ "کیا یہ بات تم سب سے کہتی پھرو گی؟"

اس کا بھائی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا اور مجھ سے کہنے لگی۔ "کیا بابا نے کبھی تمہیں یہ نہیں بتایا کہ ایسی بات کسی باہر والے کو معلوم ہو جائے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے اور اپنوں کو اس راز میں شریک رکھتے ہیں۔ جیسے بابا کے کایا بدلنے کی بات بس ہم تین اور تم اور کوسومی جانتے ہیں۔ یہ پانچ جنے ہمارے اپنے ہیں' یہ جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ بابا کایا بدل کے ریچھ اور ریچھ سے آدمی بن جاتا تھا۔ پر کسی چھٹے آدمی کو نہیں معلوم۔ اسی طرح اب کوسومی اور ہم تین یہ جانتے ہیں کہ شیر علی کایا بدل کے شیر نر سمبھا اور کایا بدل کے پھر آدمی بن سکتا ہے۔ یہ بات بس چار لوگوں کو معلوم ہے۔ سمجھو کہ وہ چار تمہارے اپنے ہو گئے۔ مانو کہ نہیں مانو اور بابا کہتا تھا' ایک وقت میں چھ سے زیادہ آدمی لوگ کو یہ بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے جو ساتویں کو خبر ہو گئی تو ترنت' اسی سے' ایک کو مار دینا ہوتا ہے۔' سمجھے؟ شیر علی سردار؟"

وہ مجھے سردار کہنے پر مصر تھی۔ عجیب ضدی لڑکی تھی۔

رستے چلتے اس نے اپنا نام بتایا' اس کا نام مورنی تھا۔

درختوں کی اوٹ لیتے' رائفلیں اٹھائے ہم تینوں سڑک کے پار نظر آتی ان کی گاڑیوں کی طرف سیدھے نہیں گئے۔ کوئی آدھے میل کا پھیر پڑا ہو گا لیکن گھوم کر ہم گاڑیوں کے اس نصف دائرے کے بالکل پیچھے جا پہنچے جسے انہوں نے اپنی دانست میں مورچے کی طرح ترتیب دیا تھا۔

مگر مورچوں کو تو کسی جنگی اصول پر بنایا اور برتا جاتا ہے۔ ان کے سب لڑاکے' ہماری اس اکیلی بھینسا گاڑی کی طرف منہ کیے کھڑے ہوں گے۔ گاڑیوں کے پیچھے کوئی پہرہ چوکی کچھ نہیں تھا۔ ایک اکیلا بوڑھا چوکسی پر تھا۔ وہ پتھر پر بیٹھا رائفل سے ٹیک لگائے جماہی لے رہا تھا۔

ہم تینوں اس نکمے چوکیدار کو دیکھ کر جھاڑیوں میں دبک گئے۔

وہ لڑکی مورنی اپنی رائفل کھسکاتی' رینگتی ہوئی میرے برابر آئی۔ کان کے پاس منہ لے جا کر ہنستی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔ "یہ چوکیدار ایک کان سے بہرا ہے۔" لڑکی نے اپنے دائیں کان کو اشارے سے بتایا تھا۔ ہم جدھر جھاڑی میں دبکے ہوئے تھے'

بڈھے کا ادھر ہی کا کان بیکار تھا۔

مورنی نے یہ اچھی بات بتائی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے' اس کے بھائی کو خبردار کیا کہ میں کچھ کرنے کو بڑھ رہا ہوں مگر اس سے پہلے کہ جھاڑی سے نکل کر میں بوڑھے چوکیدار کی طرف جاتا' لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر میرا سر پھر شاخوں میں گھسا دیا۔

میں نے گھاس پتوں کی اوٹ سے دیکھا' بوڑھے نے اپنی رائفل اٹھائی اور تیار کی تھی۔ وہ ہمارے رخ کی چھدری گھاس کو نشانہ بنائے ہوئے رائفل کی نال ادھر لا رہا تھا' جدھر مورنی اور میں دبکے ہوئے تھے۔

کیا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے؟ ظاہر ہے آنکھیں تو خراب نہیں ہوں گی اس کی...... ہم دیکھ لیے گئے ہیں اور اب اس کی گولی کا نشانہ بننے والے ہیں۔

لڑکی مورنی نے رائفل کی نال پکڑ کر اپنی طرف کھینچی۔ کیا میں اس کے گولی چلانے سے پہلے اس پر فائر کر پاؤں گا؟ لڑکی مورنی نے رائفل پر ہاتھ مار کر مجھے روک دیا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولی۔ "آگے دیکھو گھاس پر۔"

میں نے آگے گھاس پر دیکھا۔ کالے رنگ کا بھوری چیتوں والا ایک ناگ' زہریلا بائیں ہاتھ کی جھاڑی سے نکل کر ہماری جھاڑی کے سامنے سے گزرتا ایک چھوٹے ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ادھر اس ناگ کی بانبی ہو گی۔ وہ ہمارے اور رائفل چھپاتے بڈھے کی موجودگی سے بے خبر تیزی سے لہراتا اپنے بل کی پناہ لینے چلا جا رہا تھا۔

اگر اور وقت اور حالات ہوتے تو ہم دم سادھے دبکے بیٹھے رہتے۔ سانپ گزر جاتا مگر بڈھے نے اس پر رائفل سیدھی کی تھی۔ اس لیے دو خطر موجود تھے' ایک امکانی خطرہ یہ کہ کراس فائر میں ہم آ رہے تھے۔ ناگ مرتا نہ مرتا بڈھے کے فائر سے ہمارا زخمی ہونا یا مرنا گویا طے تھا۔ دوسرا لازمی خطرہ یہ تھا کہ فائر کی آواز سن کر دشمنوں کی تمام نفری ادھر آ جاتی۔ اچانک حملے کی ہماری حکمت عملی بے کار ہو جاتی۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا' پلک جھپکتے میں دونوں خطرے اور شاید تیسرا خطرہ ناگ کے پلٹ پڑنے' حملہ کرنے کا بھی' لڑکی کے تیز و طرار ذہن میں واضح ہو گیا۔ یہ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا اور پلک جھپکتے میں ایک ایسی غیر متوقع...... نہیں...... شاید مجھے ہلا دینے والی بات ہو گئی۔

لڑکی مورنی کے گرد سیاہ غبار سا آیا اور کرررر کی کرلاتی ہوئی کسی پرندے کی پکار سنائی دی۔ اس برمی لڑکی کی جگہ اب جھاڑی میں بازو پھڑپھڑاتی ایک مورنی طاؤس کی

خوبصورت سبک جسم مادہ......ایک مورنی جھاڑی سے جیسے جست کر کے کھلے قطعے میں آئی اور بجلی کی سی سرعت سے اس بھوری چیتوں والے ناگ کو اپنی چونچ میں لے کر اس نے جھٹکا دیا اور دور ایک طرف اچھال دیا۔

بوڑھے چوکیدار نے پوپلی آواز میں کہا۔ "ہرے رام۔" اور رائفل کندھے سے ہٹا کر اپنے زانو سے ٹکالی۔ پھر اس نے مورنی کی طرف عقیدت سے دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے لگا دیئے۔

وہ مورنی کو طاؤس کی مادہ مورنی کو تعظیم دے رہا تھا۔

مور پنکھ شری کرشن کی نشانی تھے اور اس کے لیے محترم تھے۔

اس لڑکی مورنی کے بھائی نقلی فوجی کے لیے یہی وقت پیش قدمی کا تھا۔ وہ چوکیدار کے بہرے کان کی طرف سے پرشور انداز میں جھپٹتا ہوا چلا اور بڈھے کی گدی پر اپنے کھڑے پنجے کی ضرب لگا کر اسے گرا دیا۔ میں نے بڈھے کی رائفل قبضے میں کی۔ مورنی کے بھائی نے اپنی کمر کے گرد لپٹی رسی کھول کر اس کے ہاتھ پیر باندھنا شروع کر دیئے۔ میں نے اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" لڑکی کی ہنستی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

میں گھبرا کر مڑا۔ میرے پیچھے وہ برمی لڑکی کھڑی تھی جس کا نام مورنی تھا مگر اس وقت وہ مورنی کی جون میں نہیں تھی۔ وہ پھر انسان کے قالب میں آگئی تھی۔

میرے لیے یہ بہت حیرت ناک اور پریشان کر دینے والی بات تھی......اور نہیں بھی تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ میں ایک اور راز میں شریک ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم نے اچانک یہ سب کیا' بتایا بھی نہیں کہ تم......"

وہ ہولے سے ہنسی۔ "اس میں بتانے کو کیا تھا؟ میں اگر اسی پل اپنی کایا نہ بدلتی اور ناگ کو ہٹا نہ دیتی تو تین بری باتوں میں سے کوئی ایک ہو جاتی۔ سب ہی کچھ بگڑ جاتا۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھی اور میرے قمیض کی آستین سے رگڑ رگڑ کر اپنے ہونٹ پونچھنے لگی۔ ٹھیک تو ہے۔ پرندے مورنی نے ناگ کو اپنی چونچ میں لے کے دور پھینکا تھا۔ میں نے یونہی مسخرے پن میں قمیض کی آستین چٹکیوں سے پکڑ کر اسے دکھائی اور منہ بنا کر کہا۔ "تخ! چھی چھی۔"

وہ آنکھیں چمکا کر بولی۔ "نانا' مورنی نے آرام سے ہٹا کے پھینکا تھا ناگ کو توڑا

نہیں تھا......زخمی نہیں کیا تھا اسے"

میں مسکرا تو رہا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ بابا کے ششوں مریدوں میں ایسے کتنے ہوں گے جنہیں کایا بدلنے پر قدرت حاصل ہے۔ کبھی پوچھوں گا' یہ کیسا جادوگروں کا ٹولہ ہے جو چیز میں نے کبھی سنی بھی نہ تھی' ان کے ساتھ رہ کر نہ صرف دیکھی بلکہ اب تو میں خود بھی جی ہاں میں خود بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جادوگر۔

مگر یہ جادوگری' سرداری مجھے بھاری لگ رہی تھی۔

وہ کہتے ہیں تم شیر ہو' سردار ہو اور سرداری کا ثبوت تو دینا باقی ہے۔ شیر بنتے تو ان تین نے مجھے دیکھ لیا' پر اس میں میرا کون سا کمال تھا۔ وہ کسی کی بخشش تھی۔ ہاں سرداری مجھے کسی کی عطا اور بخشش سے نہیں ملے گی۔ مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ اپنے ہمعصر نوجوانوں کے مقابلے میں کیا کوئی ایسی اضافی لیاقت مجھ میں ہے جو میں ان سے بڑھ جاؤں اور ان کے کہے کو سچ کر دکھاؤں۔

مورنی نے آہستہ سے کہا۔ "کیا سوچتے ہو سردار؟"

میں نے کہا۔ "مجھے قبیلے والوں کے طور طریق' عادتیں کچھ نہیں معلوم۔ سردار بھلا کیوں کہتی ہو؟ مجھے یہ خبر نہیں کہ وہ لڑنے کی تیاری کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ مجھے مشورہ دو تم دونوں......بلکہ میں چاہتا ہوں آگے چلو۔ تم بتاؤ کہ تمہارے ساتھیوں کو کس طرح آزاد کرایا جا سکتا ہے اور یہ بتاؤ وہ دو گاڑیاں جن میں ہتھیاروں میں میگزین رکھا ہے' کہاں ہوں گی؟ میں سب سے پہلے ان گاڑیوں کو قبضے میں لینا چاہتا ہوں۔"

مورنی بولی۔ "وہ بھی دوسری سب گاڑیوں جیسی ہیں۔ کوئی پہچان نہیں سکتا۔ جب تک ہر گاڑی کے فرش میں بنے خاص خانے میں دیکھ نہ لے۔"

مجھے فرش کے اس خانے "قبر خانے" کا خیال آیا جس میں جیل والوں سے بچانے کو مجھے چھپایا گیا تھا۔

"پہچان کا ایک طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "سب سے زیادہ نگرانی وہ ان دو گاڑیوں کی کر رہے ہوں گے۔"

"کوئی ضروری نہیں۔" لڑکا کہنے لگا۔ "وہ دلیر نہ سہی' عیار بہت ہیں۔ کس طرح سوچ رہے ہوں گے' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا۔ "ہم کسی ایک گاڑی کو آگ لگا دیتے ہیں۔"

لڑکا بولا۔ "آگ نہیں لگا سکتے' انہوں نے ہمارے جوانوں کو گاڑی میں بند کر کے رکھا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جو دن اوگنے سے پہلے قافلے کی طرف گھوڑا دوڑاتی آئی تھی؟ وہ ہماری مدد کرے گی۔"

میں نے یاد کیا۔ گھوڑوں پر سوار رائفلیں اٹھائے مگر وہ دو آئی تھیں۔ میں نے مورنی سے کہا۔ "وہ دو لڑکیاں تھیں۔"

"دوسری میں تھی۔ میں یہاں رک گئی اور وہ اپنے آدمی کے ساتھ چلی گئی۔"

"اچھا وہ اس کا آدمی تھا۔" میں نے اس نوجوان کو یاد کیا جو جیل کی چہار دیواری کے بعد نہر کے کنارے گھوڑے سنبھالے ہوئے انتظار کر رہا تھا۔ اسی نے تو مجھے پہلی بار بتایا تھا کہ بابا دراصل قبیلے کا سردار ہے۔ مائنگ یان کالج کے بارے میں سبھی اسی نے بتایا تھا۔

"خوب! وہ میاں بیوی ہماری مدد کریں گے۔"

"میاں بیوی نہیں' صرف بیوی۔ اس کا میاں مائنگ یان جا چکا ہے کوسومی کو خبر کرنے۔ بابا نے اسی طرح کہا تھا کہ جب وقت آجائے تو ایک آدمی جا کر کوسومی کو خبر کرے اور سنبھالے۔"

"اچھا تو بیوی کس طرح ہماری مدد کرے گی؟"

لڑکی نے کہا۔ "وہ اپنے آدمی کو مائنگ یان بھیجنے کے بعد جسگے کی گاڑی میں بیٹھ گئی ہوگی۔"

"گاڑی میں بیٹھ گئی ہوگی؟ کیسے بیٹھ گئی ہوگی؟" میں نے کہا۔ "مجھے سمجھاؤ' میں نہیں سمجھا۔"

مورنی نے کہا۔ "اس میں سمجھانا کیا ہے؟ وہ جسگے کی گاڑی میں گئی ہوگی۔ اس کی چادر اپنے اوپر لے لی ہوگی اور اس کی عورت بن گئی ہوگی۔"

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "بیوی بن گئی ہوگی؟"

وہ بولی۔ "بیوی نہیں۔ عورت عورت۔"

میں پوچھتے ہوئے ہکلا رہا تھا۔ "مطلب بیوی' وہ اسی پہلے والے کی رہے گی اور...... ٹھہرے گی...... بسے گی اس جسگے کی گاڑی میں اس جسگے کی...... مطلب عورت بن کے......؟"

مورنی نے الجھ کر سر جھٹکا۔ "ہاں تو یہی ہے نا؟"

میں نے پریشان ہو کر اس قصے کو ختم کرنا چاہا۔ "تو اب وہ اس کی عورت بنی رہے گی؟"

"ہوں جب تک اس کا میاں نہیں آجاتا۔ اگر کوئی بچہ ہوا تو وہ اس کے میاں کا ہی مانا جائے گا۔ جسگے کی گاڑی سے اسے بس چار آنے بھر کا...... مطلب چار حصے میں سے......"

میں نے بھی الجھن میں سر جھٹکا۔ یہ ان کا کوئی دستور ہوگا' مجھے اس سے کیا۔
میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جو اب جسگے کی عورت ہے' اس پر کس حد تک بھروسا کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟

مورنی نے بتایا۔ "دستور یہ ہے کہ کسی کی "عورت" اس کے پیٹھ میں خنجر نہیں مارتی۔ جب تک گاڑی میں رہتی ہے۔ گاڑی والے سے سچی رہتی ہے۔ پر یہ جسگے قبیلے کا دشمن ہے۔ بابا کا دشمن ہے اور کوسومی کا اب وہ جو جسگے کی عورت ہے' سب کچھ کر لے گی۔ موقع ملنے پر اسے مار بھی سکتی ہے۔ وہ ہمارے لیے اس گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اپنے میاں کے کہنے پر بیٹھی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے جیسے اتمام حجت کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو اپنے میاں کے کہنے پر بیٹھی ہے اس گاڑی میں؟"

مورنی نے کہا۔ "ہاں نا۔" اور اس نے دو قدم ہٹ کے جھاڑی میں منہ دے کر مورنی کی آواز نکالی۔

یہ اشارہ تھا کہ اس عورت کے لیے جو جسگے کی گاڑی میں بھیجی گئی۔ اب ہماری جاسوس تھی۔

مورنی نے کئی کئی طرح سے آواز نکالی۔ چونکتی ہوئی مورنی کی آواز۔ اپنے ساتھیوں کو پکارتی ہوئی مورنی کی کوک دانے پر سب کو بلاتی ہوئی اور ڈر کر اڑی جاتی مورنی کی آواز

جواب میں کوئی اشارہ نہیں آیا۔
کہیں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ دونوں بہن بھائی نے تشویش سے میری طرف دیکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ سامنے کھڑی گاڑیوں میں سے جسگے کی گاڑی کون سی

ہے؟"

لڑکا بولا۔ "نہیں معلوم۔"

سب گاڑیاں ایک سی تھیں۔ ایک جیسا رنگ و روغن' ایک سی بناوٹ۔ مجھے تو برمی بھینسے بھی ایک جیسے لگے۔ پھر بھی میں نے کہا کہ اس کے کسی بھینسے کی کوئی پہچان اگر یاد ہو تو ہشیاری سے اور تیزی سے گھوم پھر کے جسگھے کی گاڑی پہچانو۔ اس گاڑی تک پہنچنا ضروری ہے۔ عورت خطرے میں ہے۔

دونوں بہن بھائی گھات لگائے دائیں بائیں نکل گئے۔ قبیلے کے کیمپ میں بلا کا سناٹا تھا۔ حیرت کی بات تھی مگر پھر مجھے یاد آیا کہ شور تو بکریوں کے ریوڑ' بچوں اور ٹرانزسٹر ریڈیو کا ہوتا تھا۔ گاڑیوں کا یہ گھیرا لڑاکوں کا مورچہ ہے۔ عورتوں' بچوں اور ریوڑوں کو الگ کر کے وہ حملہ کرنے آئے ہیں' اس لیے اتنا سناٹا ہے۔

میں جھاڑی میں دبکا بیٹھا تھا کہ میں نے مورنی کو ایک درخت کی اوٹ سے اشارے کرتے دیکھا۔ اس کا بھائی بھی کسی طرح چکر لگا کر درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس درخت تک ادھر سے پہنچنا مشکل تھا کیونکہ میرے اور درخت کے درمیان ایک کھلا قطعہ آتا تھا۔ کسی طرح کی اوٹ نہیں تھی۔ اگر کوئی دشمن چھپا ہوا ہمیں گھات لگائے بڑھتا دیکھ رہا ہوتا تو آسانی سے ایک فائر کر کے مجھے گرا سکتا تھا۔ میں نے مورنی کو رکنے کا انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور نظروں ہی نظروں میں کسی اور طرف سے ان تک پہنچنے کا رستہ تلاش کرنے لگا۔

اسی دم مجھے کسی فوری خطرے کا احساس ہوا اور میں وہ جھاڑی چھوڑ کر اپنے دائیں طرف نشیب و فراز میں اترتی پگڈنڈی پر بے آواز دوڑتا چلا گیا۔ پگڈنڈی درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ درختوں کی وہ پناہ گاہ میرے بہت کام کی تھی۔

میں نے وہاں تک پہنچنے میں بمشکل ایک منٹ لیا ہو گا۔ اس ایک منٹ میں' میں نے اپنی اگلی کارروائی کا خاکہ تیار کر لیا۔ درختوں کا یہ جھنڈ اس طرح اٹھا تھا کہ بہت تھوڑی کوشش سے سب سے اونچے درخت کی سب سے بلند شاخ تک پہنچا جا سکتا تھا' ایک طرح کی ٹیڑھی سی بن گئی تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں میرے لیے یہ سیڑھی استعمال کرنا بچوں کا کھیل تھا۔

اس جھنڈ کی بلند ترین شاخ پر پتوں میں چھپ کر میں نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ وہاں سے میں قبیلے کی سب گاڑیاں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے وہ جھاڑی پہچان لی جس

ہیں ہم جسگھے کے ساتھی بوڑھے چوکیدار کو ہاتھ پیر منہ باندھ کر ڈال آئے تھے اور وہاں سے مجھے وہ درخت بھی نظر آ گیا جس کی اوٹ میں مورنی اور اس کا بھائی کھڑے تھے۔

پھر وہاں سے میں نے عجیب بات دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ دو آدمی رائفلیں اٹھائے' شکاری جانوروں کی طرح جھکے جھکے دو طرف سے اس درخت کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی اوٹ میں بہن بھائی کھڑے تھے۔

میں نے اپنی رائفل سے پہلے ایک کو پھر دوسرے کو زد میں لیا۔ اگر ان میں سے کوئی بہن یا بھائی کو گولی مارنے کے لیے بندوق اٹھاتا ہے تو میں نے سوچ لیا کہ میں اسے یہیں سے نشانہ بنا کر بے اثر کر دوں گا۔

مگر وہ دونوں قبائلی مورنی اور اس کے بھائی کو جان سے مارنے کے لیے نہیں بڑھے تھے۔ وہ ان پر اچانک جاپڑنے اور بے بس کر کے گرفتار کرنے آرہے تھے۔

ایسی صورت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے تو مورنی کے اشارے کے جواب میں اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا تھا اور پھر میں غائب ہو گیا تھا۔ اب وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھتی تھی۔ اس نے مورنی پرندے کی آواز نکال کر مجھے متوجہ کرنا چاہا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ دونوں بہن بھائی دشمن کے مورچے میں تھے۔ پھر بھی میرے دیر کرنے اور روپوش ہو جانے سے نہیں کوئی اشارہ کیوں نہیں ملا؟ انہیں خبردار' چوکنا ہو جانا چاہیے تھا مگر بڑے سے بڑے ماہر' سورما بھی کبھی نہ کبھی حماقتیں کر جاتے ہیں۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں قبائلیوں نے مورنی اور اس کے بھائی کو رائفل دکھا کر بے بس اور نہتا کر دیا۔ ڈوریوں سے دونوں کی مشکیں کس کر وہ گاڑی کے گھیرے میں ایک طرف چل پڑے۔

اب میرا کام شروع ہو رہا تھا۔ یہ دو قبائلی انہیں جسگھے کی گاڑی پر لے جائیں گے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ درخت کی بلندی سے جسگھے کی گاڑی کی پوزیشن سمجھ لوں گا' پھر انہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اچانک گاڑی پر چڑھائی کر دوں گا۔

میں نے یہی کیا۔ درختوں' ٹیلوں اور زمین کے کٹاؤ کی پہچان مجھے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں اس گاڑی کو اچھی طرح نظر میں رکھے ہوئے درختوں کے اس واچ ٹاور سے اترا اور گاڑی کے پیچھے علاقے میں داخل ہو گیا۔ پھر بچتا بچاتا' دیکھتا گھات لگاتا اس گاڑی تک جا پہنچا جس میں قبائلی ان دونوں بہن بھائی کو لے کر گئے تھے۔

میں نے سنا کوئی شخص بہت غصے میں بک جھک رہا تھا۔ ایک جملہ میری سمجھ
آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "حکم ہے جنگیے سردار کا کہ جب بھی وہ بہن بھائی پکڑ میں آ جائیں
گولی مار کے قصہ ختم کر دوں۔ چلو منہ ادھر کرو۔" اس کے ساتھ رائفل لوڈ کرنے
صاف آواز آئی۔ پھر عورت کے غوں غوں کر کے ایسے چیخنے کی آواز آئی جیسے اس
منہ میں کپڑا ٹھونسا ہو۔

دیر کرنا خطرناک ہوگا' وہ بدمعاش دونوں کو قتل کر رہے تھے۔ میں تیزی
مگر نرمی سے گاڑی کی سیڑھی پر پیر رکھتا پردہ اٹھا کر اندر جا کودا۔ "خبردار!" میں نے
لگایا تھا۔

مگر یہ بے مقصد نعرہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ خبردار تھے۔ میرے اندر پہنچتے ہی
نے جو پہلے سے میری آمد کا منتظر تھا۔ میرے سر کی پشت پر کسی بھاری اور نرم چیز
ضرب لگائی اور میں گاڑی کے فرش کی طرف جھکتا چلا گیا۔ اس نے گرتے ہوئے یہ
ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا تھا اور رائفل میرے ہاتھ سے لے لی تھی۔

انہیں معلوم تھا' میں پیچھے پیچھے آؤں گا۔ انہوں نے مجھے سنانے کو سب
کیا تھا۔

بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے والے کو قطعی طور پر تو معلوم نہیں ہو
وہ کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہے۔ میں نے ہوش میں آتے ہوئے گاڑی کے فرش پر
دری کے گنجلک ڈیزائن پر توجہ دی تھی۔ سمجھنا چاہتا تھا کہ دری بننے والوں نے ان
سے کیا بنایا ہے اور کیا نتیجہ نکالنا چاہا ہے۔ سر درد کرنے لگا مگر تین انچ کی دوری پر
دری کے ڈیزائن میری سمجھ میں نہ آئے۔

پھر دھیرے دھیرے مجھ پر کھلتا گیا کہ سر میں اتنا شدید درد کس لیے ہے۔
نے حملہ آور یا اس کے ساتھی کی آواز سنی۔ وہ آواز ایک ہی لے پر چلی آ رہی تھی۔
ڈر رہا تھا کہ اگر ایک ہی پچ پر یہ بولتا رہا تو میں بے ہوشی کے بعد اب نیند میں گم ہو جاؤں
مگر وہ جو کچھ' جس طرح کہہ رہا تھا مجھے جگائے رکھنے کے لیے بہت کافی تھا۔

وہ دھمکی دے رہا تھا' اس لیے میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ
صاف طور پر وہ مورنی کو دھمکا رہا تھا۔

میں بے ہوش بنا پڑا رہا کیونکہ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں ہوش
آ چکا ہوں تو وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دیتا۔ میرے لیے پوری بات سننا ضروری تھا!

ی تھی۔

مورنی کو پکڑنے والے نے جو اس وقت گاڑی میں اکیلا پہریدار تھا' اپنی گھوں
کرتی مگر وہ آواز میں پوچھا تھا۔ "سمجھ رہی ہے تو' میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

مورنی کی آواز آئی۔ "نہیں۔ میرے کچھ پلے نہیں پڑا۔" اس نے مورنی کے
بندھا ڈھاٹا کھول دیا تھا۔

وہ کمینگی سے ہنسا۔ "کیا سمجھ نہیں آئی؟ یہ کہ میں تجھے اپنی عورت بنا کے رکھنا
ہوں یا یہ کہ تیرا راز مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ آں مورنی؟"

"خبر نہیں کیا بک رہا ہے؟"

"میں نے دن کی اجاگر روشنی میں بلکہ دھوپ میں اپنی ان آنکھوں سے تجھے
ے مورنی بنتے' پھر مورنی کو جھاڑی سے چھلانگ مار کر باہر آتے' سانپ کو اپنی چونچ
ر کے دور پھینکتے' پھر واپس جھاڑی میں آ کے لڑکی بنتے دیکھا ہے' سمجھی تو...... سمجھی
کیا بک رہا ہوں؟ یا اب بھی نہیں سمجھی؟"

مورنی نے حقارت سے کہا۔ "خواب دیکھا ہوگا تو نے...... جیسے جیسے آدمی بڈھا
اتا ہے' ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے بڈھوں کو جاگتے میں خواب دیکھتے اور
یں کھاتے دیکھا ہے کہ ایسا ہوا تھا' ویسا ہوا تھا۔"

قبائلی نے جو ظاہر ہے بوڑھا ہوگا' اسی لیے برا مان رہا تھا۔ "مجھے بوڑھا کہہ رہی
وہ تیرا سردار' کوسوی کا دادا' وہ بوڑھا نہیں ہے جو تو اس کی گاڑی میں جا بیٹھی ہے؟
ساپا ٹھا ہے' مجھ سے پندرہ بیس برس بڑا ہی ہوگا سالا۔"

مورنی بولی۔ "ہاں' میں اس کی گاڑی میں جا بیٹھی ہوں۔ اس کی عورت بن کے
ں کوسوی بن کے اس کی پوتی بیٹی بن کے بیٹھی ہوں۔"

قبائلی کو شاید بڑے میاں کی موت کی خبر نہیں ہوگی ورنہ اس طرح نہ کہتا مگر
ا بات کی خبر تھی' وہ مورنی کے لیے تباہ کن ہو سکتی تھی۔

قبائلی غصے میں کہنے لگا۔ "یہ بیٹی' پوتی والی بکواس میں خوب سمجھتا ہوں۔ سب
کی باتیں ہیں۔"

مورنی بولی۔ "چل تو نہیں مانتا' مت مان۔ میں بیٹی' پوتی نہ سہی' عورت سہی۔
ے اور بھی شرم کرنی چاہیے تو قبیلے کے پرانے دستور پر تھوکنے لگا ہے۔ میں اگر
ا عورت ہوں تو جب تک میں خود اس کی چادر اتار کے اس کی گاڑی سے نکل نہ

آؤں، تجھے یا کسی کو بھی میرے لیے ایسا دل میں لانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"سوچ لے۔" اس کے لہجے میں اب واضح دھمکی بلکہ غنڈا گردی سنائی دے رہ
تھی۔ "سوچ لے، میں نے جو دیکھا ہے، اگر وہ جھگے سردار سے جا کے بول دیا تو جانتی ہ
تیرا کیا حال ہونا ہے؟"

مورنی کو طیش آگیا۔ "کیا ہونا ہے؟ ہاں بتا کیا ہونا ہے؟"

"زندہ جلا دے گا جھگے سردار۔ دستور دستور بکے جا رہی ہے۔ خبر ہے جاد
کرنے والے کو قبلہ کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اسے الاؤ کے بیچ پہنچانے کا دستور ہے۔ ج
جادوگری کرتا ہے، پکڑا جائے۔ ہاں۔ میں قسم کھالوں گا کہ تو میری آنکھوں کے سامن
لڑکی سے مورنی بن گئی تھی اور پھر دوبارہ سے لڑکی بنی۔ یہ میں قسم کھا کے کہوں گا س
کے سامنے۔"

"میرا بھائی موجود تھا ادھر۔"

"ہاں تیرا بھائی اور تیرا یہ عاشق، خبر نہیں کون ہے یہ...... یہ بھی تھا۔"

"میرا بھائی قسم کھا کے کہے گا کہ تو بکواس کرتا ہے۔ نہ میں لڑکی سے مور
بنی، نہ پھر دوبارہ کچھ بنی اور مورنی تو میں جنم سے ہوں۔ نام ہے یہ میرا۔"

"سوچ لے۔ میں جا رہا ہوں۔ زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ا
آجائے گا۔ میرا جوڑی دار یا تیرا عاشق اٹھ بیٹھے گا۔ ابھی تک تو ٹھنڈا پڑا ہے۔ ایک جم
دیا تھا میں نے بھی...... سمجھی؟ سوچ لے کہ تجھے آرام سے میری گاڑی میں میری عور
بن کے رہنا ہے یا الاؤ میں مرنا ہے۔ میں جاتا ہوں، پھر آؤں گا...... ابھی کسی کو نہیں
ہے تیرے جادو کا۔ تجھ سے آخری جواب سن لوں، پھر دیکھوں گا۔ آئی سمجھ
مورنی! ذرا خوب سوچ لینا۔"

پھر آہٹوں سے پتا چلا کہ وہ اٹھا اور گاڑی سے نکل گیا۔ میں نے کروٹ لی ا
مورنی کی طرف گھوم گیا۔

میری طرح اس کے بھی ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ مورنی کے برابر اس
بھائی پڑا تھا۔ اس کے سر کی چوٹ ایسی تھی کہ کھال پھٹ گئی تھی اور کچھ خون گاڑی
بچھی دری پر گر کر جم گیا تھا۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

مجھے کروٹ لیتے، آنکھیں کھولتے دیکھ کر مورنی آہستہ سے ہنس کر بولی
"جاگ اٹھے، کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں، تمہارا بھائی ابھی ہوش میں نہیں آیا۔ انہوں نے بہت مار پیٹ کی
ہوگی جو ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔"

"یہ باز بھی تو نہیں آتا۔ بڈھے کو برابر گالی دیے جا رہا تھا۔"

"بڈھا جو کہہ رہا تھا، میں نے سب سن لیا ہے۔ کیا اس نے تمہیں مورنی بنتے
دیکھ لیا ہوگا؟ کہیں سنی سنائی یہ خالی شک پہ تو بات نہیں کر رہا؟ یہ بتاؤ تمہارے قبیلے میں
جادو کرنے والے کو واقعی زندہ جلا دیتے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ تقریباً بے پروائی سے کہنے لگی۔ "ہاں۔ یہ جادو نہیں ہے بابا کا علم
ہے جو اس نے مجھے بخشا تھا۔ تمہیں بخشا تھا۔"

"مگر دوسرے لوگ جو ہیں، دوسرے لوگ اسے جادو سمجھتے اور جادو کہتے ہوں
گے۔ وہ تو کہیں گے نا کہ اسے آگ میں ڈال دو۔ کیوں مورنی؟"

وہ کہنے لگی۔ "نہیں دوسرے سب اسے جادو نہیں سمجھتے اور کہنے کا کیا ہے۔
جیسی مرضی بکواس کریں۔ اس وقت ان کے پاس ہتھیار ہیں، طاقت ہے۔ ویسے اگر یہ
سب کہہ دیں گے کہ میں نے جادو سے کایا بدلی تھی تو قبیلے والے جلا بھی سکتے ہیں مگر مجھے
اس کی پروا نہیں کہ یہ کیا سمجھ رہے ہیں۔"

"پروا نہیں ہے۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے اور تم کہتی
ہو، پروا نہیں ہے۔"

"جان خطرے میں ہے۔" وہ بولی۔ "یہ ٹھیک کہہ رہے ہو مگر خطرہ جلانے،
سینکنے کا نہیں ہے۔ یہ بالکل بکواس بھی ہو سکتی ہے۔ جان کو اصل خطرہ اس سے ہے کہ
مورنی بننے والی بات اس نے کسی ایک سے بھی اگر کہہ دی تو پھر میری بات جانے والے
آدمی سب ملا کے سات ہو جائیں گے اور جیسے ہی سات بندے ہو گئے، ایک جاننے والے
کو ختم کر دینا پڑے گا، فوراً ختم کرنا ہوگا۔ یہ لازمی ہوتا ہے نہیں پھر کایا بدلنے والے کا
خاتمہ ہے۔"

"یہ کیوں؟" میں پریشان ہو گیا تھا۔

"کیوں کا مطلب؟" اس نے الجھ کر کہا۔ "یہ سب اسی طرح ہے۔ میں نے بتایا
نہیں تھا پہلے بھی اور بابا نے بھی بتایا ہوگا کہ جو کسی کے کایا بدلنے کی بات جان لے، اسے یا
تو مار دیتے ہیں یا وہ اپنوں میں سے ہو جاتا ہے۔ پر اپنوں میں بھی ایک وقت میں چھ بندوں
سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ چھٹے کے بعد ساتواں کایا بدلتے دیکھ لے یا کسی سے سن لے کہ

فلاں کا یا بدل سکتا ہے تو ایسا جاننے یا دیکھنے والوں میں سے ایک کو مار دینا ہوتا ہے۔ وہ اپنا ہو یا پرایا ہو' کوئی ہو' ہر حال میں ایک کو ختم کر کے چھ بندوں کی گنتی قائم کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر نہیں رکھو چھ کی گنتی۔ بات جاننے والوں کی تعداد سات ہی رہے تو؟"

مورنی آرام سے بولی۔ "تو کا یا بدلنے والا اس دن کا سورج ڈوبنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔"

"خدا رحم کرے۔" میں نے فکر مندی سے کہا۔ "یہ تو بڑی خوفناک' بہت عجیب بات ہے۔"

مورنی ہلکا سا مسکرائی۔ "اس میں کون سی عجیب بات نہیں ہے۔ سبھی باتیں عجیب اور ڈراؤنی ہیں۔"

وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ میں بھی کیسے الجھاوے میں الجھ گیا ہوں۔ یہ بات بڑے میاں نے بتائی تو تھی مگر اس طرح نہیں بتائی تھی۔ ان بیچارے کو وقت ہی نہ مل سکا۔

میں نے اپنے دل کی خاموشی میں عہد کیا کہ اپنے شیر بننے کا راز کم سے کم لوگوں کو جاننے دوں گا مگر مجھے تو ابتدا ہی سے گھاٹے' ٹوٹے کا سامنا ہے۔ دیکھو نا...... کوسومی' مورنی یہ دو لڑکیاں' تیسرا مورنی کا بھائی اور چوتھا جسگے کا بیٹا۔ یہ چار انسان تو شروع ہی سے میری بات جانتے ہیں۔ صرف دو کی گنجائش اور ہے۔ اس کے بعد خطرے کی گھنٹی۔

پھر میں نے خوف کے ساتھ سوچا کہ اگر حملہ کرتے ہوئے اس شخص جسگے یا اس کے ساتھی نے جو بابا کی گاڑی کے پاس اس وقت ہمارے کیمپ میں بندھا پڑا ہے' دونوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تھا تو ہو گئے پانچ آدمی یا اگر خدانخواستہ دونوں ہی نے مجھے درخت کے نیچے انسان سے شیر بنتے دیکھا تو پھر سمجھو شیر علی خان کہ پہلے منٹ سے تمہارے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری قسمت کا فیصلہ اب تک ہو بھی چکا ہو۔ کسی ایک نے دیکھا ہو' دوسرے سے کہہ دیا ہو اور اس طرح اب تک سات کی تعداد بن چکی ہو تو تمہارے جانے بغیر شیر علی خان آج کا ڈوبتا سورج تمہاری جان لے کر ڈوب جائے گا۔

میرے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا۔ اس کیفیت کو مورنی دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "سردار کس الجھن میں پڑے ہو؟"

میں نے ٹالنے کو کہہ دیا۔ "بس ایسے ہی کچھ وہم آ رہے تھے۔"

"وہم؟" "کہ کہیں چار کے بعد پانچویں' چھٹے اور ساتویں کو خبر نہ لگ گئی ہو کہ شیر علی سردار جنگل کا شیر بن جاتا ہے' کیوں؟ کیا ایسے وہم آ رہے تھے؟"

میں نے کہا۔ "مورنی تم دل کا حال کیسے جان گئیں؟ حیرت ہے۔"

بولی۔ "چہرہ پسینے میں تر ہے۔ میں نے تمہیں ہونٹ ہلاتے ایک سے چار تک گنتے دیکھا۔ آگے سمجھنا کون سا مشکل ہے سردار! وہم نہ کرو۔"

"میں وہم نہیں کرتا مورنی مگر ایک دبھدبھا' ایک فکر تو ہر وقت لگی رہے گی۔"

"فکر بھی مت کرو۔" وہ بولی۔ "فکر کرنے والے ہم جو ہیں جانثار۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہ جانثار اچھا لفظ سوجھا ہے۔"

وہ سنجیدہ رہی۔ "یہ لفظ کوئی اس وقت ابھی ابھی نہیں سوجھا ہے۔ ہم لوگ تمہارے اپنے ہیں سردار۔ یہ فرض بھی ہے ہمارا اور دستور بھی کہ سردار کی جان پر بن جائے تو کوئی بھی جان باز' جانثار' کوئی بھی اپنوں میں سے جان پر کھیل جاتا ہے۔"

میں کیا کہتا' چپ رہا۔ وہ اتنے جوش اور جذبے سے بات کہہ رہی تھی کہ اسے ٹوکنا یا بات کو آگے بڑھانا مجھے اچھا نہ لگا۔

مورنی خود ہی کہنے لگی۔ "خبر ہے کوسومی کے دادا' بڑے سردار کی جان اس کی پنی بہو نے کوسومی کی ماں نے بچائی تھی۔"

"کیسے؟"

وہ بولی۔ "ایسی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کسی نے خیال نہیں' سردار کو بھی یاد نہیں رہا۔ ہ کایا بدل کے ریچھ بنتا تھا اور کسی آدمی نے کوئی راہ گیر تھا' اسے دیکھ لیا۔ وہ آدمی ڈر گیا۔ ناموشی سے نکل بھاگا۔ سردار کو پتا نہ چل سکا۔ شام ہو گئی۔ سردار کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ سورج ڈوبتے وہ چکرا کے ایک دم گرا جیسے جیسے سورج چھپ رہا تھا۔ سردار کا رنگ پیلا پڑتا جاتا تھا۔ کوسومی کی ماں اس وقت سب کے لیے بھات پکا رہی تھی۔ اس نے دیکھ یا' سمجھ گئی کہ آج چھٹے سے ساتویں آدمی نے بابا کو کایا بدلتے دیکھ لیا ہے۔ دوڑی دوڑی ئی' آوازیں دے دے کے بابا سے اتنا ضرور پوچھ لیا کہ آج اس نے کایا بدل کی ہے؟ بابا نے بتایا کہ ہاں کھلے جنگل میں...... بہو سمجھ گئی کہ وہیں کسی کی نظر پڑ گئی ہو گی تو سورج چھپنے سے پہلے سات آدمیوں کی گنتی کم کر کے چھ آدمیوں پر لانا تھا۔ تبھی بابا کی جان بچ

سکتی تھی۔ کوسومی کی ماں گھر کی عورت تھی۔ وہ ان چھ گھر والوں میں شامل تھی جو جاگ
تھے اور جنھوں نے بابا کو کایا بدلتے دیکھا تھا۔ سردار کو بچانے کا اسے ایک ہی طریقہ سمجھ
میں آیا۔ وہ سردار کا بھالا لے کر گاڑی کے پیچھے گئی اور الٹا بھالا مٹی میں گاڑ کے خود کو اس
میں چھید لیا۔ بھالا دل کے پار ہو گیا۔ فوراً ہی جان نکل گئی۔ سورج چھپنے میں سمجھو ایک دو
سانسوں کی دیر ہو گی' ادھر بہو کی جان نکلی' ادھر بابا کے پران لوٹ آئے۔ سب دوڑے
دوڑے گئے۔ دیکھا پیلی رنگت دور ہو کر منہ پر سرخی آتی جا رہی تھی۔ بابا مرتے مرتے بچ
گیا تھا۔ یہ جانثاری ہوئی تھی سردار کے لیے۔"

یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں تکلیف سے گھوم کر مڑا تڑا ہوا مورنی کی صورت تکے جا
رہا تھا۔ کیسے حیران کر دینے والے جانثار ہیں یہ لوگ...... میں ابھی کون سا سردار ہوں مگر
دیکھو کس طرح ڈوب کر اس نے اپنی بات کہی ہے۔ دل کو بڑی تقویت ہوئی۔

میں نے کہا۔ "مورنی! اگر میرے پیر کھلے ہوتے تو میں تیرے پاس آتا۔ ہاتھ
آزاد ہوتے تو تیری پیٹھ تھپکتا۔ تجھ سے بات کر کے اس وقت بڑی ہمت ہوئی۔"

کہنے لگی۔ "میں آزاد ہوتی تو تمہارے سینے لگ جاتی۔ پھر بھی دیکھو' کچھ کرتی
ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس باؤلی لڑکی نے اپنے بدن کو کسی طرح لڑھکا کر میرے پہلو سے
بھڑا دیا۔

یہ جانثاری کا ایک معصوم سا انداز تھا۔ مورنی ہنسے جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے
بھڑی ہوئی بندھے ہوئے بستر کی طرح پڑی تھی کہ اچانک ہی باہر آہٹ ہوئی اور جس
تیزی سے وہ قریب آئی تھی' اتنی ہی تیزی سے دور چلی گئی۔ میں نے گردن ڈال کر ہولے
ہولے کراہنا شروع کر دیا جیسے ابھی ہوش میں آ رہا ہوں۔

یہ آنے والا وہ نہیں تھا جو مورنی کو الٹی میٹم دے گیا تھا کہ سوچ لے نہیں تو
الاؤ میں مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ اس دوسرے نے آتے ہی ایک لات مجھے رسید کی۔
ایک اس لڑکے مورنی کے بھائی کے ٹکائی اور بولا۔ "اٹھو رے ادھر مزے کرنے' سونے
کو نہیں آئے ہو...... تمہاری تو......"

میں ہڑبڑا کے کچھ منہ ہی منہ میں بکتا ہوا اٹھا۔ مورنی کا بھائی بس کراہا تھا۔ وہ
ابھی تک بے ہوش تھا۔

مورنی نے اس نئے بوڑھے سے کہا۔ "اس کے ہاتھ نہیں بندھے ہوتے تو
تیری ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنی لنگڑی ٹانگ سے اس کی طرف اشارہ بھی کرتا۔ یہ

تیری آدھی ٹانگ بھی توڑ کے پیٹ میں گھسا دیتا۔ سمجھا او دلاور...... لنگڑے۔"

غصہ ور بوڑھے نے جو واقعی ایک ٹانگ سے معذور تھا' ہاتھ میں پکڑی رائفل کا
بٹ چلایا۔ اس نے مورنی کے سر کو نشانہ بنایا تھا مگر مورنی تیار تھی۔ وہ بستر کی طرح رول
کر کے اس کی زد سے دور ہو گئی۔ بندوق کا بٹ بڑی آواز سے گاڑی کے فرش سے ٹکرایا۔

باہر سے دوسرے بوڑھے کی آواز آئی۔ "کیا ہوا؟"

لنگڑانے والے نے ہکلا کر کہا۔ "یہ' یہ رنڈی منہ ماری کر رہی ہے۔"

باہر سے مورنی کے عاشق بڈھے کے گالی بکنے کی آواز آئی۔ اس نے اپنے
ساتھی کو بہت ہی گھٹیا بات کہہ کر للکارا تھا اور وہ بندوق اٹھائے غصے میں جھاگ اڑاتا گاڑی
میں گھس پڑا تھا۔ یہ اگر سامنے سے ہٹ نہ جاتا تو آنے والے نے بٹ کر مار کر اس کا منہ
ہی توڑ دیا تھا۔

"تیرے کو کیا پریشانی ہے رے؟ یہ کیا حرامی پن ہے؟ کیا بکواس کرتا ہے؟"
معذور نے ہکلا کر پوچھا۔

"مورنی کا عاشق پینترا لے کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر معذور بڈھا حملہ
کرنے کو بڑھے تو وہ اسے ایک ہی گولی میں لٹا دے۔

مورنی نے بڑھاوا دیا۔ "مار اسے۔ میرے بدن پہ ہاتھ ڈالتا تھا سالا۔"

میں نے حیرت سے اس عیار لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے آدھے منٹ میں
ان بدمعاش جوڑی داروں کو جانی دشمن بنا دیا تھا۔

معذور بڈھا چیخا۔ "نہیں رے۔ جھوٹ بولتی ہے کتیا۔" مگر اس کا فقرہ زبان
سے ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس پرانے عاشق بڈھے نے گولی چلا دی۔

کمزور ٹانگ والے کے پیٹ میں گولی لگی جو اسے چھیدتی ہوئی گاڑی کا تختہ توڑ کر
نکل گئی۔ عاشق کا جوڑی دار پیٹ کے سوراخ کو مٹھی میں جکڑے جکڑے الٹ گیا۔ اس
کے بدصورت چہرے پر غضب کی حیرت تھی۔

مورنی نے اپنے حیران و پریشان عاشق سے تیز تیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔
'چل ہم دونوں بھاگ لیں۔ چل آ میرے ساتھ نکل جا۔ آ جا اٹھا مجھے میرے ہاتھ پیر
کھول دے' دونوں نکل چلیں گے۔ ادھر رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ چل ہاتھ پیر کھول
میرے۔ آ جا۔"

عشق کا الگ الگ مسمرازم ہوتا ہوگا۔ جو شخص تھوڑی دیر پہلے مورنی کو موت

کی دھمکی دے کر وصال کا طالب تھا' اب اس کی آواز اپنے ساتھی کو گولی مار دینے کے بعد کشاں کشاں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے اگلے حکم پر عمل در آمد کرنے۔

میں نے مورنی کا اگلا قدم خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

"خدا کرے۔" میں نے دعا کی۔ "خدا کرے ابھی اور آدھے منٹ تک اس گاڑی کی طرف کوئی نہ آئے۔ گولی کی آواز دور دور تک سن لی گئی ہو گی۔ خدا کرے ابھی کوئی نہ آئے۔"

اگر کوئی اور آواز مورنی کی آواز کے سوا کوئی بھی آواز عاشق کے کانوں کے رستے اس کے شعور تک پہنچ گئی تو ایک دل نواز محبوبہ کی آواز کا سحر ٹوٹ جائے گا۔ کچے شیشے پر پتھر آ لگے گا۔

بوڑھے عاشق نے جیسے ایک محویت میں اپنی کمر سے خنجر نکالا۔ مورنی کے پیروں سے بندھی رسی کاٹ دی۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا' پھر ہاتھوں کو باندھنے والی رسی کاٹ دی اور آدھی بیداری' آدھی نیند میں اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میں نے اردو فارسی شاعری پڑھتے ہوئے حسن جفا پیشہ' قاتل' بے وفا اور ایسی درجنوں تراکیب محبوب ستم گر کے لیے استعمال ہوتے پڑھی ہیں۔ یقیناً یہ سب شاعرانہ اشاریت ہوتی ہو گی۔ کون بھلا اتنا ظلم کرتا ہو گا اپنے عاشقوں پر۔

بوڑھے عاشق کی آنکھیں بند تھیں۔ "آاہ" کی محویت اور تسکین کی آواز اس کے لبوں سے نکلی ہو گی۔ یہ آخری سے ذرا پہلے کی آواز تھی۔ اس فلکی آخری آواز بڑی بھیانک تھی۔

کیونکہ مورنی نے گلے سے لگے لگے پوری طاقت سے عاشق کے پیڑو پر اپنا گھٹنا مارا تھا۔ وہ "ہوواہ" جیسی کوئی آواز کرتا دہرا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر مورنی کے ہاتھ میں آ گیا اور اس وحشی قبائلی لڑکی نے نیچے سے اوپر وار کرتے ہوئے اپنے اس عاشق کو کھول کے رکھ دیا۔

سودائے عشق میں رقیق ہوا اس کا لہو مجھ پر بھی گرا ہو گا۔ مورنی نے اس تڑپتے ہوئے جسم کو اس کے مقتول ساتھی پر پھینکا اور خون آلود خنجر سے میری رسیاں کاٹنے لگی۔

"چل سردار چل۔" مورنی نے اپنے بے ہوش بھائی کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹ دی تھیں۔ "اسے اٹھا لے سردار۔ چل ادھر سے نکل چلیں۔"

میں نے جھک کر بے ہوش لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور خود بیٹھ کر اسے فرش سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

مورنی نے دونوں دشمنوں کی رائفلیں قبضے میں کی تھیں۔ پھر بجلی کی طرح اس نے فرش میں بنے چور خانے کا تختہ اٹھایا اور اندر جھانکنے لگی۔

وہ بولی تو اس کی آواز بے پناہ مسرت سے چھلکی پڑتی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہ کام کی گاڑی ہے سردار' سارا میگزین کارتوس ادھر ہی ہے۔ اس خانے میں۔"

ابھی میں کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ گاڑی کا پردہ چیرتی ہوئی ایک گولی چھت میں پیوست ہو گئی۔ "ہلنا مت۔" کسی نے کھردری آواز میں برمی میں کہا اور گاڑی کا پردہ کھینچ دیا۔ دھوپ اندر آنے لگی۔

"اچھا۔ دونوں کو مار دیا؟"

سوال کرنے والے نے کسی سے بھی خاص طور پر سوال نہیں کیا تھا۔ پھر وہ بولا۔ "چلو رائفل رکھ دو مورنی اور اس لڑکے سے اس کی زبان میں کہہ دو کہ تمہارے بھائی کو فرش پر ڈال دے۔ کوئی کہیں نہیں جا رہا۔" اس کی آواز میں بلا کا تحکم اور قیامت کی خود اعتمادی تھی۔ ایک اندازہ سا ہو رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔

میں نے سر گھما کر دیکھا' یہ وہی بھاگنے والا لگتا تھا جو بڑے میاں پر فائر کرنے کے بعد شیر کی' میری دھاڑ سن کے بھاگا تھا۔ جسگھے' ہاں یہ وہی باغی نقلی سردار جسگھے تھا۔

مورنی فرش پر گھٹنا ٹیکے اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے ایک رائفل گلے میں پہنی ہوئی تھی۔ دوسری اس کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کا منہ گاڑی کے چور خانے کی طرف تھا۔ مورنی نے کم سے کم حرکت سے رائفل کو فائر کے لیے تیار کیا۔ کرڑچ کی سی آواز ہوئی۔

جسگھے نے چیخ کر کہا۔ "اب ہلنا مت ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"ہلے گا کوئی نہیں' جسگھے۔ نمک حرام سائیں کے حرامی بیٹے۔ ہلے گا کوئی نہیں۔ اب ہم چاروں اس گاڑی کے ساتھ اڑ کے تیسرے آسمان تک ہی جائیں گے۔ بہت بڑی آواز کے ساتھ۔ میری رائفل کی نال ڈائنامائٹ کے ڈبے پر سمجھ ٹکی ہوئی ہے۔ اب میں چار تک گنوں گی۔ ایک ایک گنتی ہم چار زندہ آدمیوں کے لیے اگر چار گننے پر بھی تو نے ہتھیار ڈال کے ہم تینوں کو راستہ نہیں دیا تو ڈائنامائٹ کے ڈبے کو گولی مار کر

چھید دوں گی۔ بو دوم! ختم...... نہیں تو چل ہٹ جا۔"

میں نے جسگے کا چہرہ اچانک پسینے میں بھیگتے ہوئے دیکھا۔

ہر آدمی سرداری کی ہوس کرتا ہے اور دل اس کا چڑیا یا شاید بکری جتنا ہے۔

جسگے تھوک نگل کر پھنستی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "بکتی ہے تو جھوٹ بکتی ہے۔ یہ وہ گاڑی ہی نہیں ہے۔"

مورنی فرش کے چور خانے میں دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے جیسے پڑھتے ہوئے کہا۔ "لے سن۔ ڈبے پر لکھا ہے اے' زیڈ' ٹی اور نمبر پڑا ہے سولہ' پوائنٹ تین' پوائنٹ......"

"سس...... سترہ۔" جسگے نے ہکلا کر ڈبے کا کوڈ نمبر اپنی یادداشت سے پورا کیا تھا۔

مورنی خوش ہو کر بولی۔ "ہاں سترہ۔ ارے واہ رے واہ۔ تجھے تو سب پتا ہے رے سردار۔ چل پھر میں آخری گنتی گننا شروع کرتی ہوں...... ایک......"

"کیا...... کیا کرتی ہے مورنی۔ ٹھٹھ' ٹھیر جا۔ سن تو مور......"

مورنی نے گنا۔ "دو۔"

"ارے بات سن۔"

"تین۔"

"یہ پڑی ہے رائفل۔ لو' لو نکل جاؤ تم لوگ۔" میں نے پیر بڑھا کر جسگے کی رائفل اپنے قریب کر لی۔

مورنی نے کہا۔ "کوٹ اور شرٹ اتار۔"

جسگے سردار نے اپنا بھڑک دار شکاری کوٹ اور ریشمی قمیض جس میں دوسرے رنگ کی ڈھکن دار پیچ پاکٹس لگی تھیں' اتار ڈالی۔ کوٹ کی جیب لوہے سے بھاری ہو رہی تھی۔

مورنی نے کہا۔ "کوٹ کو ٹھوکر مار کے میری طرف پھینک جسگے۔"

اس نے کوٹ کو کک مار کر مورنی کی طرف سرکا دیا۔ مورنی نے اس نقلی سردار کو مسکرا کر دیکھا اور کوٹ کی جیب سے اس کا چھوٹا پستول نکال کر اپنے شلوکے کی جیب میں پہنچا دیا۔ جسگے موٹے بنیان جیسے سوئٹر اور چمکیلی پتلون میں ملبوس ذلت و خواری میں کھڑا فرش کو تکے جا رہا تھا۔

مورنی کی آواز آئی۔ "پتلون اتار اپنی۔"

"نن...... نن...... نہیں۔ یہ نہیں اتاروں گا۔"

"اتار۔ حرام کے۔ نہیں میں اڑا دوں گی گولی سے۔" مورنی نے پورے طیش میں اس کی طرف رائفل سیدھی کی تھی۔

جسگے سردار نے بیلٹ ڈھیلی کی اور مجبوراً اپنی چمکدار پتلون بھی اتار دی۔ وہ دس دن کا میلا انڈرویئر پہنے ذلت اور غصے اور سردی میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

مورنی نے اشارہ کیا کہ وہ اب پتلون کو بھی ٹھوکر لگا کے اس کی طرف پھینک دے۔

جسگے نے ایسا ہی کیا۔

پتلون کی جیبیں چابی کے گچھوں سے بھاری ہو رہی تھیں۔

میں مورنی کے بھائی کو کاندھے پر لادے جسگے کی رائفل اپنے جوتوں کے حصار میں لیے کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

مورنی مجھ سے کہنے لگی۔ "آپ میرے بھائی کو ادھر ہی لٹا دو۔ اب ہم جسگے کے ساتھ کہیں سیر کو چلیں گے۔" مورنی نے مجھے دکھا کر چابیوں کے گچھے اچھالے تھے۔

میں نے اس کے بھائی کو گاڑی' پھر گاڑی کے فرش پر لٹا دیا۔ اس نے کراہ کر کروٹ بدلی تھی۔

مورنی فرش کے خفیہ خانے کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میں نے فرش پر پڑی رائفل اٹھائی اور جسگے پر سیدھی کر لی۔

مورنی نے اس سے کہا۔ "کس کس گاڑی میں ہمارے جوان ہیں۔ یہ چابیاں لے چل اور کھولتا جا انہیں۔"

جسگے نے احتجاج کیا۔ "ایسے۔ ایسے نہیں جاؤں گا میں۔"

"میں یہ تیری چڈی بھی اتروا دوں گی۔ اتنا سمجھ لے۔ اگر اس طرح نہیں چلے گا تو جان پھر اس طرح جانا پڑے گا۔"

جسگے نے منہ ہی منہ میں گالی دی اور چابیاں سنبھالے گاڑی سے اتر کر ہمارے آگے چل پڑا۔

آٹھ نو آدمی جو سبھی بڑی عمروں کے تھے' رائفلیں اٹھائے ہماری طرف

بڑھے۔ وہ کوؤں کی طرح کائیں کائیں کرتے آرہے تھے۔

جنگجو میری زد پر تھا۔ مورنی نے اپنی رائفل اس بے سرے ہجوم پر سیدھی کر لی۔ بولی۔ ''اس نقلی سردار کو اور تمہارے مال مویشی اور بال بچوں کو اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہیں، ہم روکیں گے نہیں۔ ہاں ہمارے ساتھیوں کو اور اس سامان کو جو تم نے ہم سے چرالیا ہے، واپس کر دو گے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ جھنجھٹ اور چالاکی کرو گے تو گولی چلے گی اور ہم تمہیں بھی اس سائیں کی اولاد جنگجو کی طرح ننگا کر کے جنگل میں دوڑا دیں گے۔''

ان میں سے ایک زیادہ بک بک کرنے لگا تو مورنی نے بڑھ کے اس کی پنڈلی پر اپنے شکاری بوٹ کی سخت نوک سے ٹھوکر لگائی اور اس کی بندوق رکھوالی۔ آہستہ آہستہ سب نے اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔''

میں نے دیکھا مورنی کا بھائی سر پکڑے آرام آرام سے چلتا ہوا ہماری طرف چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب رائفل تھی۔

ہم ڈائنامائٹ والی گاڑی کو بے نگران چھوڑ آئے تھے۔ اب مورنی کا بھائی ہوش میں آیا تھا تو وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ میں نے مورنی سے آہستہ سے کہا۔ ''اپنے بھائی کو گاڑی کے پہرے پر بھیجو۔ اس سے کہو وہیں رہے۔''

مورنی نے ہنستے ہوئے پوری آواز سے کہا۔ ''کیوں؟ اس گاڑی میں کیا ہے؟''

وہ عجیب بات کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''واہ، بھول گئیں، گاڑی میں ڈائنامائٹ، کارتوس، میگزین نہیں ہے؟''

مورنی آرام سے بولی۔ ''نہیں تو بسکٹوں کے ڈبے ہیں۔ وہ سب تو میں نے اس جنگجو سردار کو سنانے اور ڈرانے کو کہا تھا۔''

حد کر دی اس لڑکی نے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے اسے، پھر جنگجو کو دیکھا۔

جنگجو نے انڈرویئر بنیان میں لرزتے ہوئے مورنی کو بڑی بھاری گالی دی، وہ برا نہیں مانی۔ ہنس کے جنگجو سے بولی۔ ''پتا نہیں بارود کارتوس کس گاڑی میں ہیں۔ ویسے مجھے پیٹیوں پر لکھے نمبر یاد تھے اور جنگجو وہ تجھے بھی یاد تھے۔ بس میرا کام نکل گیا۔'' پھر ایک دم تیور بدل کر وہ بولی۔ ''چل ہمارے ساتھیوں کو آزاد کر دے۔ ہنسنا ہنسانا ہو چکا۔ سیدھی طرح سب کو کھولتا جا نہیں جیسے تیرے اس حرامی کو مار پھینکا ہے، تجھے بھی مار دوں

گی۔''

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں مورنی کے سب ساتھی۔ بڑے میاں کے مرید سامنے میدان میں قطار بنائے کھڑے تھے۔ مویشی باندھنے کی جن زنجیروں اور تالوں سے مخالف گروہ نے ان نوجوانوں کو گرفتار کر رکھا تھا۔ ان سے اب ہم نے کام لیا۔ وہ زنجیر تالے اب دس بارہ باغیوں اور ان کے سرغنہ کے حصے میں آئے تھے۔

اگلے دو گھنٹوں میں قافلے کی گاڑیاں، مال مویشی اور بال بچے اکٹھا ہو گئے۔ قبیلے کے دستور کے مطابق نوجوانوں نے جنگجو اور اس کے ساتھیوں کے پاس ہتھیار اور نقدی نہیں رہنے دی۔ ان کی چھ گاڑیاں، بال بچے جو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے اور گنتی کے جانور جو ان کے بچوں کی دودھ کی ضرورت پوری کر سکتے، ان کے حوالے کر گئے اور انہیں راتوں رات اراوڈی دریا کی ترائی میں ہانک دیا۔ وہ باغی گروہ والے قبیلے کے ساتھ امپھال کے سالانہ میلے میں نہیں جا سکتے تھے۔

مورنی اور اس کے بھائی کسی مردار کے نہ ہوتے ہر بات مجھ سے پوچھ پوچھ کر کر رہے تھے۔ میں قبیلے کے دستور سے واقف نہیں تھا۔ پھر یہ معرکہ تو تن تنہا مورنی نے سر کیا تھا۔ میں نے کون سی سرداری دکھائی تھی۔ پھر بھی ان بہن بھائی کو خوش کرنے کو میں نے نام کا سردار بننا گوارا کر لیا۔

رات بڑے نوجوانوں کے ہنگامی جرگے میں فیصلہ کیا گیا کہ امپھال کے میلے میں ہماری گاڑی بان دوست جنگجو کے بیٹے اور مورنی کے بھائی کو مشترکہ سرداری دے کر بھیجا جائے گا۔ باقی قبیلہ ایک دن رک کر آگے جائے گا۔ میرے ساتھ مورنی اور بیالا بائے بڑے میاں کی گاڑی میں مانگ یان روانہ ہوئے۔ یہ بیالا بائے وہ لڑکی تھی جو سب کے مشورے اور اپنے میاں کے کہنے سے جنگجو کی گاڑی میں اس کی عورت بن کے بیٹھ گئی تھی۔

مانگ یان جاتے ہوئے میں تھکا ہوا اور اداس تھا۔ بڑے میاں کی آخری رسوم دن نکلنے سے پہلے نوجوانوں نے بہت عقیدت سے ادا کی تھیں۔ وہ بہت اداس، بہت دل گرفتہ تھے۔ میں نے بڑے میاں کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا مگر اتنے کم دنوں میں بھی میں ان سے اس حد تک مانوس ہو گیا تھا کہ چتا پر رکھی ان کی میت کا آخری دیدار کرنے، سلامی دینے بڑھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

یہ بوڑھا آدمی میرے دین، میرے مسلک کا نہیں تھا۔ زبان بھی کوئی اور بولتا

تھا مگر اس نے اپنی دلاویز شخصیت اپنی شرافت اور توجہ سے میرا دل جیت لیا تھا۔

مورنی نے چتا کو آگ دکھائی، پھر وہ قریب ہی مٹی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور بلک بلک کر اس طرح روئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

بہت سے نوجوانوں کی یہی حالت تھی۔ میں نے سوچا، یہ اس بابا کا خون نہیں تھے۔ کوسومی ان کی پوتی ہے، اس کا کیا حال ہو گا۔

مانگ یان جاتے ہوئے وہ لڑکی بیالا گاڑی ہانک رہی تھی۔ میں اس کے برابر بیٹھا برما کے موسم خزاں کے رنگ اچھالتے جنگلوں کو اداسی سے دیکھتا تھا۔ مجھے اپنے گھر والے یاد آرہے تھے۔

میں بہت دیر سے خاموش تھا۔ بیالا نے پوچھا۔ "کچھ کھاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

کہنے لگی۔ "اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہو، اندر مورنی کے پاس جا کے بیٹھو۔ وہ بہت بکھری ہوئی ہے۔ باتوں سے...... بابا کی باتوں سے اس کا دکھ ہلکا کرنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں بہت مانتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ مانتی تو ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اسے تنہا چھوڑ دوں گا تو سنبھل جائے گی۔"

بیالا بائے نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ "تنہا کسی بڑے دکھ کو نہیں جھیلا جا سکتا۔ تم اس کے پاس جاؤ، ساتھ ہی لیٹ جاؤ، باتیں کرو اس سے۔ رات وہیں رہنا۔ اسی طرح دکھ بٹاتے ہیں۔"

میں نے اندھیرے اجالے میں اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ دل گرفتہ تو یہ عورت بھی ہے۔ ایسے میں کوئی مذاق چھیڑ چھاڑ تو نہیں کرتا۔

اس کا چہرہ سادہ تھا۔ یہ بات بیالا نے سنجیدگی اور معصومیت میں کہی تھی۔

لمحے بھر بعد اس کو یاد آیا کہ میں اس کے کسی فقرے پر حیران ہو کر خاموش ہوا تھا اور اس طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگی۔ "اپنے اپنے دیس کے طریقے ہوتے ہیں۔ ہم قبائلی اس بات کو اس طرح سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی کھوٹ، کوئی ہلکا پن نہیں ہے۔ تمہیں اگر کوئی بات بری لگی ہو تو......"

میں نے جلدی سے کہا۔ "بری نہیں لگی۔ نئی بات سنی ہے۔ عجیب لگی ہے۔ اس لیے سوچ میں پڑ گیا۔"

کہنے لگی۔ "سوچو مت، اس کے پاس جاؤ۔ وہ یہ بات پسند کرے گی، شاید تمہارا انتظار کرتی ہو گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر چپ رہا تو بولی۔ "تم پٹھان ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں مگر تم کیوں پوچھتی ہو؟"

بولی۔ "پٹھان کیا شرمیلے ہوتے ہیں؟"

عجیب سوال تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے نہیں پتا، شرمیلے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ پٹھان مسلمان ہوتے ہیں اور ہمارے دین میں جن چیزوں کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے، ان میں ایک بے شرمی بھی ہے۔ اس طرح تم کہہ سکتی ہو کہ ہم...... مطلب شرمیلے ہوتے ہیں۔"

"ایک لڑکا تھا۔ پٹھان تھا وہ بھی۔ ادھر تمہارے ایسٹ پاکستان سے آیا تھا۔ بہت شرمیلا تھا۔"

وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی، میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا۔"

کہنے لگی۔ "میرباز نام تھا اس کا۔ تمہاری عمر کا......"

میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "کیا نام تھا؟"

"میرباز۔ کوئی جگہ ہے کاکسیز بازار وہاں کے کسی ہوٹل میں......"

"کہاں ملا تھا وہ میرباز؟ کہاں ہے وہ؟"

"پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ مانگ یان میں دیکھا تھا۔ اب خبر نہیں کہاں ہے۔"

میرباز؟ مانگ یان؟ وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟ میں نے اس لڑکی بیالا بائے سے پوچھا تو بولی۔ "کرے گا کیا؟ بابا سردار نے لڑکوں کے رہنے کے کمرے بنائے ہیں۔ میں نے وہیں ایک کمرے میں اسے دیکھا تھا۔"

"حیرت ہے۔ کمال ہی ہو گیا۔ واہ" میں نے جوش مسرت سے کئی بار دہرایا۔ پوچھا۔ "وہ کب سے ہے؟"

بولی۔ "مہینے سے زیادہ ہو گیا بابا نے کسی چوکی گارد سے اسے نکالا تھا۔ زخمی تھا۔ ادھر ہی مانگ یان کالج میں چھپا کے رکھا تھا۔ دوا دارو کی تھی۔ میں نے جب دیکھا تھا، ٹھیک تھا۔"

بڑے میاں نے میرباز کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں...... شاید اچانک سامنے لا کر خوش کرنا چاہتے ہوں گے۔

لڑکی بیالا نے پوچھا۔ "وہ کون ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔ "بھائی ہے۔"

پوچھنے لگی۔ "سگا؟"

میں نے کہا۔ "سگا نہیں مگر اپنا ہی ہے۔ میرے باپ کے گیسٹ ہاؤس میں کام کرتا تھا۔"

"ہاں۔" وہ کہنے لگی۔ "بولتا تھا ہوٹل میں نوکر ہوں۔ کیا ہوٹل کے مالک تم ہی لوگ تھے؟"

میں نے سر ہلا کر ہاں کہا تو تعریفی انداز میں بولی۔ "نوکر کو بھائی بولتے ہو۔ خوب۔"

میں نے کہا۔ "خوب کہا۔ میرے باپ نے اسی طرح رکھا ہے۔ میر باز کو اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔"

مجھے میر باز اور خدا بخش رائیں بہت یاد آرہے تھے۔

بہت دیر تک میں بیالا کو اپنے کاکسیز بازار میں گزارے شب و روز کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں بابا اور کوسومی سے پہلی بار کن حالات میں ملا تھا تو بیالا بولی کہ وہ بابا اور کوسومی کے لیے بہت سختی کا زمانہ تھا۔ تین طرف سے پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک تو برما کے سرکاری لوگوں نے بابا کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ دوسرا یہ جسگے پریشان کر رہا تھا۔ تیسرا کوئی آسامی تھا۔ ہندوستانی' دتہ نام کا وہ کیا جانے کس بات پر بابا کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میں نے سوم ناتھ دتہ' ہندوستانی جاسوس کا نام لیا تو لڑکی بیالا کو یاد آ گیا۔ کہنے لگی۔ "ہاں وہی حرام کا جنا سوم ناتھ دتہ۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اور سرکاری کارندوں سے جان بچانے کو ہی تو برما سے پوربو پاکستان نکل گئے تھے بابا۔"

میں نے کہا۔ "کوئی برمی ڈرائیور بھی تھا جو کوسومی سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔"

بیالا سوچ میں پڑ گئی۔ "نہیں ایسا کوئی نہیں تھا۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "کسی ڈرائیور سے کوسومی کی شادی کاہے کو ہو گی' اس کے تو کالج میں ہی کوئی بارہ پندرہ ڈرائیور نوکر ہیں۔"

تو بازلر کا وہ برمی ڈرائیور کون تھا جو بڑے میاں کو دیئے ہوئے قرضے کے عوض کوسومی کی شادی کر دینے پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

اور قرضہ؟ دو ہزار کا قرضہ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے دل میں کہا۔ وہ قرضے کی کہانی بڑے میاں نے میرے لیے گھڑ لی تھی۔

بیالا کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ ایک دم کہنے لگی۔ "جسگے کا بڑا بیٹا راحل' کوسومی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ سنا ہے وہ ان لوگوں کو ڈھونڈتا تمہارے پوربو پاکستان تک گیا تھا۔ ادھر جنگل میں ریچھ نے زخمی کر دیا تھا' اسے ابھی بچا نہیں بچا' کچھ خبر نہیں۔"

"اوہ تو وہ ڈرائیور جسگے کا بیٹا راحل تھا؟"

"ہاں۔" لڑکی نے سیدھا سا جواب دیا تھا۔ ظاہر ہے بڑے میاں کے کایا بدلنے کا راز اسے نہیں معلوم ہوگا جبکہ اس عورت کے میاں کو جو اس وقت مانگ یان میں ہے' سب کچھ خبر تھی۔

ٹھیک تو ہے چھ آدمی پورے تھے۔ ساتویں کو معلوم ہونا گویا موت تھی۔ بابا کی ان میں سے ایک کی۔

بیالا پوچھنے لگی۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہمارے ایسٹ پاکستان میں بہت ریچھ ہیں۔"

کہنے لگی۔ "تمہارے پاکستان سے زیادہ ریچھ ادھر برما میں ہیں مگر یہاں ریچھ کے ہاتھ نہیں آیا' راحل ادھر جا کے مرا۔"

"کیا پتا زندہ ہو۔"

بولی۔ "اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ ایک دم باپ جیسی بدمعاشی ہے اس میں۔"

برے لوگوں کو یاد کرنا شروع کیا تھا تو ایک سرے سے سب کے نام یاد آنے لگے۔ سلیل چودھری' اس کا بھتیجا بازلر یعنی وہ بدمعاش بذل الرحمٰن اور ان کے سب زر خرید گرگے۔ سوم ناتھ دتہ اور جسگے کا بیٹا وہ راحل۔ عجیب بات ہے ان دو برے آدمیوں راحل اور بازلر کا ساتھ کس طرح ہو گیا؟ شیطانی اتفاق تو دیکھو ملاقات ہو گئی ان کی۔

میں نے سوچا جس طرح بڑے میاں کو ہم دونوں یعنی میں اور میر باز مل گئے تھے اور کاکسیز بازار سے نکل کے جس طرح مجھے اچھے لوگ ملتے گئے' اسی طرح جرائم ...دل اور سازشیوں کو بھی ان جیسے لوگ مل جاتے ہیں۔

اچانک بیالا بائے نے کہا۔ "تم اندر نہیں گئے' کیوں نہیں گئے؟"

مجھے یاد آیا کہ اندر گاڑی میں وہ غم زدہ لڑکی مورنی موجود ہے۔ میں نے سوچا' وہ اگر جاگتی ہوئی تو کچھ دیر اس سے باتیں کر کے پھر باہر آ بیٹھوں گا۔

مگر بیالا بائے نے اپنے رواج کے مطابق معصومیت میں جس بات کا مجھے مشورہ دیا تھا' وہ میرے عزت دار کنبے' میری تربیت بلکہ میرے پورے سماجی اور دینی نظام اخلاق کے منافی تھی۔

بیالا نے مشورہ دیا تھا کہ میں اسے تنہا دکھ جھیلنے کے لیے نہ چھوڑوں۔ مورنی بہت بکھری ہوئی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ "تم اس کے پاس جاؤ' ساتھ ہی لیٹ جانا۔ باتیں کرنا اس سے...... بابا کی باتیں اور رات وہیں رہنا۔ اسی طرح دکھ بٹاتے ہیں۔"

یہ عورت بیالا کہتی تھی کہ وہ قبائلی اس بات کو اسی طرح سادہ اور معمول کے مطابق سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی کھوٹ' کوئی ہلکا پن نہیں ہے۔

میں گاڑی ہانکتی ہوئی اس عورت بیالا بائے کے برابر سے اٹھا اور اس کے عقب میں کھٹکے سے کھلنے والی کھڑکی کھول کر گاڑی میں چلا گیا۔

ہرے رنگ کی چمنی چڑھا مٹی کے تیل کا لیمپ گاڑی کی اونچی چھت سے لٹک رہا تھا۔ اس ہرے اندھیارے میں بھاری کمبل اوڑھے وہ سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹی تھی۔

میں لیٹی تھی' اس لیے کہا کہ جاگ رہی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ تھوڑا ایک طرف سرک گئی اور فرش پر میرے لیے جگہ کر دی مگر میں برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل سے ہاتھ نکال کر گھٹنے پر ٹکا دیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے پوچھا۔ "کیسی ہو مورنی؟"

اس نے اداسی سے مجھے دیکھا اور ہاں میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "بیالا نے کہا تھا کہ مجھے آنا چاہیے۔ میں بہت دیر سے یہاں آنے کی سوچ رہا تھا۔"

وہ دھیرے سے بولی۔ "آ جاتے......"

"تمہارے...... تمہارے قبیلے کے اپنے دستور ہیں۔ سب جگہ کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔"

"اچھا...... وہ۔" مورنی نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "اسے تم سے نہیں کہنا تھی وہ بات...... تم اپنوں میں تو ہو مگر......"

"مگر کیا مورنی؟"

کہنے لگی۔ "تمہارا رہن سہن' تمہارے دستور شہروں کے ہیں۔ پھر تم مسلمان بھی ہو۔"

"ہاں۔ مسلمان ہوں۔"

کہنے لگی۔ "مسلمانوں میں ایسی باتوں پر تو پابندی ہے۔"

"ہاں ہمارے ہاں اور بھی دوسرے دینوں میں بھی پابندی تو ہے۔ تم بہت پرانا قبیلہ ہو' کسی بہت پرانے طریقے پر چلتے ہو گے۔ خیر"

"سمجھتی ہوں میں نے جسگھے کی گاڑی میں بیالا کے بیٹھنے۔ اس کی عورت بن کے بیٹھنے کی بات کہی تھی۔ جب بھی تمہیں بڑی حیرانی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں سمجھی نہیں۔ سوچنے لگی' اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے شیر علی سردار کو بھلا اچنبھا کیوں ہوا ہے؟ پھر میں نے سوچا' یہ بات ہم کسی باہر والے سے کبھی نہیں کہتے۔ سردار شیر علی باہر والا نہیں ہے مگر پھر بھی ہے تو......"

میں نے ہاں کہتے ہوئے سر ہلایا۔

مورنی بولی۔ "بابا کے بعد میں بالکل جیسے بے ماں باپ کے ہو گئی۔ ماں باپ تو سمجھو یاد بھی نہیں تھے۔ مجھے بابا ہی تھے سب کچھ۔" وہ پھر رونے لگی۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر تھپکا تو اس کو کچھ قرار سا آیا۔

اپنی بات پوری کرنے کو وہ بولی۔ "بابا کے بعد' سردار کوئی نہیں...... سوا تمہارے تم ہی تھے سردار تو میں نے سوچا' تم آؤ گے' تسلی دو گے...... رات ادھر ہی میرے پاس رہو گے۔" اس نے آنکھوں سے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر بولی۔ "پھر بہت دیر بعد جب میں رو رو کے سونے لگی تھی۔ مجھے یاد آیا تھا کہ تم تو شیر علی ہو' ہمارے ہو پر ہم سے باہر کے بھی ہو۔"

میں آہستہ سے سیٹ سے اتر کر فرش پر اس کے برابر اس کے کمبل سے ٹک کے بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل سے دونوں ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ تھام لیے۔

میں نے کہا کہ اب تم سونے کی کوشش کرو۔ میں یہیں ہوں۔ تمہارے پاس بیٹھا ہوں گا' فکر مت کرنا کوئی...... ہاں اور دکھی مت رہو۔

وہ آہستہ سے گنگنائی۔ "فکر مجھے اب کوئی نہیں...... تم آ گئے نا میرے پاس...... سردار۔" اور اس نے سر اٹھا کر میری گود میں رکھ لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

بھینسا گاڑیاں بہت آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ جتنی دیر وہ میری گود میں سر رکھے سوتی رہی‘ گاڑی نے بہت ہوا تو پانچ سات میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ مانگ یان کتنی دور ہوگا۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بیالا کو میل‘ کلومیٹر کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ خوب دن نکل آئے گا‘ تب ہم مانگ یان کے قریب پہنچیں گے۔ وہاں بیالا ہمیں گاڑی کو سب کی نظروں سے چھپا کر چلی جائے گی اور خود مانگ یان کالج جاکر اپنے میاں کو لے کر آئے گی۔ ایک دم گاڑی لے کر کالج کے سامنے جا کھڑے ہونا خطرناک ہوگا۔ ان نے بتایا تھا کہ سرکاری لوگ ابھی تک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ بیالا کا خیال تھا کہ کیونکہ میں صورت اور زبان سے برما قبائلی نہیں لگتا‘ اس لیے وہ قبائلیوں کے تحفظ کے کسی قانون کا سہارا لے کر مجھے ستا سکتے ہیں۔

میں نے گاڑی کے پردوں کے پیچھے روشنی بڑھتے محسوس کی۔ صبح ہونے والی تھی۔ ایک بار کھڑکی کھول کر بیالا بائے نے اندر جھانکا تھا اور مورنی کا سر میری گود میں اور اسے گہری نیند سوتے دیکھ کر سر ہلا کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال تھپک دیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم۔ اس سے کیا مقصد تھا اس کا اور وہ کیا سمجھی بیٹھی تھی۔

مجھے پروا بھی نہیں تھی۔ ایک نوعمر‘ دلیر اور سادہ لڑکی کو میری رفاقت سے سکون ملا تھا‘ اس کا غم ہلکا ہوا تھا۔ بس میرے لیے یہی کافی تھا۔

باہر روشنی بڑھ رہی تھی۔ سوتی ہوئی مورنی کو اس کا احساس ہو گیا تھا اور وہ کسمسا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرائی اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر آسودہ بلی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ وہ فرش پر پھسکڑا مارے مجھ سے ٹکی بیٹھی تھی۔

کہنے لگی۔ ”تم کو تھکا دیا میں نے۔ آں؟“

میں نے کہا کہ نہیں تھکن کس بات کی؟ تم بہت ہلکی ہو اور پھر سارے بدن کا بوجھ تو فرش پر تھا‘ میں تو تمہارے سر کو سہارے ہوئے تھا۔

بولی۔ ”سر تھامنا کسے کہتے ہیں ہماری قبائلی زبان میں...... کچھ خبر بھی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

بولی۔ گونے (شادی) کے وقت میاں اپنی بیوی کا سر تھام کر اس کی پیشانی چوم

لیتا ہے۔ یہ ساتھ جینے مرنے کی سوگند (قسم) ہوتی ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”مگر میں نے تمہاری پیشانی نہیں چومی‘ اس لیے بے فکری ہے۔“

اس نے جھٹ میرا سر تھام کے میری پیشانی چوم لی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ کس لیے؟“

بولی۔ ”یاد دلانے کو کہ آگے جب بھی میرا سر تھامو تو پیشانی چومنا مت بھولنا۔“

اس نے‘ مورنی نے یہ بات اتنی لگاوٹ‘ اس قدر محویت سے کہی تھی کہ میں ڈر گیا۔

وہ سمجھ گئی۔ بولی ”مرضی ہے تمہاری...... تم اگر مجھے اپنی بیوی نہیں بناتے تو نہ سہی۔ عورت بنالو۔ اپنی چادر دو‘ یہ گاڑی سردار کی تھی اور اب تمہاری ہے یہ گاڑی۔ میں تمہاری چادر اپنے اوپر لے کے تمہاری عورت بن جاتی ہوں۔ ابھی لو۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مورنی! یہ گاڑی سردار کی ضرور ہوگی مگر میں سردار نہیں ہوں اور میرے پاس کوئی چادر نہیں ہے جسے تم اوپر لے کر اپنا دستور پورا کرو گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ابھی بیوی کی یا عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سب سامنے کام پڑا ہے۔“

کہنے لگی۔ ”میں تمہارے کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ تم بڑی ہمت والی‘ بہت پکی دوست لڑکی ہو۔ تم ایسا ہی کرو گی مگر دشمن میرے اپنے ہیں اور پختون روایت یہ ہے کہ اپنے دشمنوں سے خود ہی نمٹا جاتا ہے۔ عورتوں کو تو بالکل دور رکھتے ہیں۔ دوستوں سے بھی دور رکھتے ہیں اور دشمنوں سے بھی۔“

پوچھنے لگی۔ ”دور کیسے رکھ سکتے ہو۔ زندگی میں تو ساتھ ہوتی ہیں عورتیں‘ ایک ایک قدم پر ساتھ ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مرنے جینے کی ساتھی ہوتی ہے عورت مگر حجرے میں اور لڑتے وقت باہر درے میں عورت ساتھ نہیں ہوتی‘ ناں ناں۔ حجرے میں ہم دوستوں کے سامنے بیٹھتے ہیں اور درے میں دشمنوں کے سامنے اور یہ دو وقت ایسے ہوتے ہیں جب ہم اپنے دوستوں‘ اپنے باپ‘ بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں۔“

وہ ہنسی، بولی۔ ”تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بیٹے دوں گی۔ حجرے میں اور درّے میں ساتھ بیٹھنے کے لیے۔ میں شیر جیسے بیٹے دوں گی، وعدہ۔“

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ”ابھی بیٹے نہیں چاہئیں۔ ابھی تو، تو مجھے کچھ کھانے کو دے۔ مورنی! بہت بھوک لگی ہے۔“

عورت کتنی ہی خوابناک، کیسی ہی سرشاری میں ہو، جیسے ہی اسے خبر ملتی ہے کہ مرد بھوکا ہے، وہ اپنی سرشاری اور خواب سے باہر آجاتی ہے۔ وہ مرد کو بھوکا پیٹ نہیں دیکھ سکتی۔ مورنی نے لپاک جھپاک کر کے کچھ ادھر ادھر سے خشک میوے، بکری کے دودھ کا پنیر اور چاول کے پھولے لا دیئے۔ کہنے لگی۔ ”ابھی اس سے گزارہ کرو۔ مانگ یان میں بہت اچھا کچھ کھلاؤں گی۔“

میں کچھ کھا پی کے فارغ ہوا تھا کہ بیالا نے بتایا، وہ اب گاڑی کو اور ہمیں چھپانے لے جا رہی ہے۔ میں اور مورنی باہر ہی آبیٹھے۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ وہ گاڑی کو بھینسے سمیت کیسے چھپاتی ہے۔

ہم ایک تھلی ندی کے ساتھ چلتی کچھ کچی پکی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ سڑک کے ایک طرف ندی کنارے اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے جھنڈ تھے، دوسری طرف گنے کی فصل کھڑی تھی۔ گاڑی کے دونوں بھینسے پانی کے قرب کی وجہ سے اور زیادہ سست رو اور نکمے ہو گئے تھے۔ بیالا نے انہیں تیز چلنے پر اکسانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گاڑی کو ان بھینسوں کے حوالے کر کے اب تیز تیز چلتی ہوئی کافی آگے نکل گئی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد گنے کی فصل میں کھڑی گھاس پھونس کی ایک برجی سی نظر آئی۔ جیسے برسات میں چارا اسٹور کرنے کے لیے چھپرا بنا لیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح۔ گاڑی نے اس چھپرے تک پہنچنے میں پانچ، سات منٹ اور لیے۔ چھپرا قریب آگیا تو میں نے دیکھا، اس پر بانس کی سیڑھی لگائے کچھ عورت مرد کام کر رہے تھے۔ ایک عورت مجھے بیالا بائے جیسی لگی۔ وہ سیڑھی سے اتر کر دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی تو معلوم ہوا، بیالا ہی ہے۔ اس نے اپنا سفری لباس اتار کر برمی کسانوں کا سیر ونگ شلوکا پہن لیا تھا۔

بیالا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی سے اتار لیا۔ مورنی نے کود کر خود کو گاڑی سے اتارا۔ اس وقت وہ خاصی چونچال دکھائی دے رہی تھی۔ بیالا کے ساتھ آنے والوں نے تیزی سے گاڑی کے دونوں بھینسے کھول دیئے۔ وہ کاہلی سے چلتے ہوئے سڑک پار کرنے لگی، پھر وہ ندی میں اتر گئے۔ برجی سے اتر کر ساتھ آنے والے عورت، مردوں نے

بنا بھینسے کی اس گاڑی کو دھکا دے کر اب اس برجی یا چھپرے کے نیچے پہنچا دیا اور بانسوں کی چٹائی کا بنا پھاٹک بند کر دیا۔ گاڑی اب سڑک سے نظر نہیں آتی تھی۔

چار پانچ منٹ پہلے گزرنے والی بھینسا گاڑی سڑک سے بالکل غائب ہو گئی تھی۔

بیالا نے مجھے خاص مہمانوں کی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے لے جا کر برجی یا چھپرے کے پیچھے سفید اور سیاہ ناہموار پتھروں سے چن کر بنائی ایک جھونپڑی میں پہنچا دیا۔ جھونپڑی کی دیواریں چونے پتھروں کی اور چھت گھاس پھونس کی تھی۔ چھت پر زردی مائل سبز پتوں کی تروتازہ بیل چڑھی تھی۔ بیل اتنی گھنی تھی کہ چھت کا گھاس پھونس تک پوری طرح چھپ گیا تھا۔

بیالا کہنے لگی۔ ”یہ بابا سردار کے ایک ششو (مرید) کا کھیت اور چھپرا ہے۔ جب سے سرکاری لوگوں نے کالج کی زمین کا جھگڑا کھڑا کیا ہے، مانگ یان میں داخل ہونے سے پہلے ہم لوگ یہاں کچھ دیر رکتے ہیں۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ سب ٹھیک ہے تو آگے بڑھتے ہیں۔“

بابا کا ششو اس وقت کہیں گیا ہوا تھا، اس کی بیٹی اور بہت سے نواسا، نواسی پیشوائی کو جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ششو کی بیٹی چالیس پینتالیس سال کی صحت مند عورت تھی۔ خود اس کے بیٹا، بیٹی بیس اکیس برس سے لے کر نو دس سال تک کے تھے۔ سبھی صحت مند اور تمیز دار لگتے تھے۔

بڑا بیٹا جو ہماری گاڑی کو دھکا دیتا ہوا چھپرے میں چھوڑ آیا تھا، میرے برابر آکر بنچ پر بیٹھ گیا اور خوش ہو کر بتانے لگا کہ وہ مانگ یان کالج میں فزکس، کیمسٹری کا کورس کر رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ”میں انگریزی بھی بول سکتا ہوں۔“

ابھی میں مانگ یان پہنچا بھی نہیں تھا کہ بڑے میاں کی بوئی ہوئی تعلیم کی فصل لہلہاتی ہوئی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔

مورنی اور بیالا مجھے اس خوشحال کسان گھرانے کے حوالے کر کے چلی گئیں۔

ان سادہ دل مہمان نواز لوگوں نے میری اتنی خاطر مدارات کی کہ مجھے اپنے پاکستان کے قصبوں، گاؤں دیہات کی تواضع، مہمان نوازیاں یاد آگئیں۔ شاید دنیا بھر میں کسانوں، چرواہوں، ملاحوں کا مزاج ایک جیسا ہوتا ہے۔

فطرت فراخ دل ہوتی ہے۔ وہ انہیں کھیتوں، مرغزاروں میں اور جھیل، تالابوں، دریاؤں میں فراخدلی سے نعمتیں دیتی ہے اور یہ کسان چرواہے، ملاح کھلے دل سے

اسے مہمانوں کے آگے رکھ سکتے ہیں۔

میں بچوں کے ساتھ ان کی گنے کی فصل دیکھنے نکلا ہوا تھا اور وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ یہاں اس مسافر نے ٹھیکی لی ہے' پڑاؤ نہیں کیا ہے۔

وہ لوگ مجھے اپنے پسندیدہ کھیت کے بہترین گنے کاٹ کاٹ کر دے رہے تھے۔ میں خود کو صوبہ سرحد کے یا سندھ اور پنجاب کے کسی کھیت میں اترا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دو چار بار کی وہ یادیں جب میں چارسدہ میں یا پنجند اور سکھر ضلع کے فارموں میں اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ گنے کے کھیتوں میں اترا تھا۔ وہ یادیں جیسے پھر سے تازہ ہو رہی تھیں کہ اچانک کسی نے پشتو میں پکار کر کہا۔ "شیر خان! میرا بھائی' میرا دوست......یارا تم کدھر ہے۔ سامنے آ۔"

ایک برمی کسان پشتو میں پکارتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔

نہ' نہ برمی شرمی کوئی نہیں۔ یہ تو میرباز تھا' میرا دوست' میرا بھائی' میرباز خان۔

مہینوں کے بچھڑے ہوئے اور شاید یقینی موت سے بچ کر آئے دونوں دوست دوڑ کر لپٹ گئے۔

میں نے تیزی سے اس کے بارے میں پوچھا کہ "وہ کیسے زخمی ہوا تھا؟ اب تو ٹھیک ہے' زخم گہرے تو نہیں تھے۔ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اسے زخمی کیا۔ خدا بخش کہاں ہے؟ خدا بخش رائیں کا کچھ اتا پتا ہے؟"

وہ اپنی تیز رفتار پشتو میں یہی سب مجھ سے پوچھ رہا ہوگا کہ نہ اس کا ایک لفظ میں نے سننے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی میرباز نے میری بات سن کے دی۔

اب تک بیالا اور اس کا میاں قریب آ چکے تھے۔

انہوں نے اتنی رفتار سے کسی کو بات کرتے' وہ بھی پشتو میں کاہے کو سنا ہوگا۔

دونوں میاں بیوی باری باری میری اور میرباز کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

ہمارے میزبانوں کے بچے ہمیں گھیرے کھڑے تھے اور حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔

آخر بیالا بائے نے بڑھ کر ہم دونوں کی پیٹھ تھپکی سے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دھکا دیتے ہوئے پھر ایک بار گلے لگا دیا۔ اس نے چیخ کر مجھ سے کہا تھا کہ شیر علی اندر چل کے بیٹھو' اپنے دوست کو بھی لے جاؤ اور دونوں آدمی کچھ دم بھی لو۔

میں آخرکار میرباز کو لے کر اپنے میزبانوں کی خوبصورت جھونپڑی میں آبیٹھا۔

جھونپڑی پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی خوبصورت بنچ پر میں نے لے جا کر اسے بٹھا دیا۔ میں نے محسوس کیا' وہ بنچ تک رسانیت سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی چال بدلی ہوئی تھی۔ میرباز لنگڑا رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟ تو لنگڑا کیوں رہا ہے؟" میں پریشان ہو گیا۔

"کچھ نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ بیٹھو نا شیر خان۔ یار' کھڑے کیوں ہو؟"

"تیری ٹانگ میں کیا ہوا؟ تو لنگڑا کیوں رہا ہے؟"

وہ ہنسا۔ "میں لنگڑا نہیں رہا۔ تمہارے سامنے بھی دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ بیٹھو بیٹھو یارا' وہم میں نہیں پڑو۔"

میں اس کی ہنسی کو اس کی حجت کرنے کو سمجھتا تھا۔ میرباز مجھے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا برمی پتلون کے نیچے ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بائیں ران پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میں نے غور سے دیکھا' ران پر سے پتلون کا رنگ گلابی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی پٹی خون سے رنگین ہوتی جا رہی تھی اور پتلون کو رنگتی جا رہی تھی۔

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تو زخمی ہے' تیری ران پر کوئی زخم ہے۔ دیکھ' خون جھلک گیا ہے۔"

میرباز پھر ہنسا۔ "شیر خان' دوستا' جھگڑا کیوں کرتے ہو؟ مہینوں پیچھے دیکھ رہا ہوں تم اور تم جھگڑا کرتے ہو۔ بیٹھو میرے بھائی بیٹھو' سناؤ کیسے ہو؟"

بیالا کا میاں جھونپڑی میں آ گیا۔ وہ ہماری باتیں سمجھ تو نہیں سکا تھا مگر میرے اشاروں سے جان گیا تھا کہ میں کس بات سے پریشان ہو رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ ابھی ٹانکے کاٹے گئے ہیں۔ ران کا زخم اچھا ہو رہا ہے۔ اس کے بھاگنے دوڑنے سے زخم پھر کھل گیا ہوگا۔"

بیالا کے میاں نے بتایا کہ میرا سن کر یہ بے تاب ہو گیا تھا۔ رستے میں ٹرک خراب ہو گیا تو اسے سمجھایا بھی کہ رک جاؤ' تمہیں سواری پر لے جائیں گے مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

اسے ڈانٹ پھٹکار کرنا مجھے اچھا نہیں لگا مگر میرباز اپنی طرف سے جب بھی بے پرواہ ہوتا تھا' مجھ سے ڈانٹیں کھاتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ دانت نکالے ہنستا رہا

اور ڈانٹیں سنتا رہا۔ آخر میں بولا۔ "ابھی بس کرو خاناں۔ وعدہ کرتا ہوں' بے پروائی نہیں کروں گا۔ تم سناؤ تمہارے ساتھ کیسی گزری؟"

میزبانوں نے تواضع جاری رکھی۔ بیالا اور اس کا میاں ہمیں لے جانے کے انتظامات کرتے رہے۔ ادھر میں نے میرباز کو بتایا کہ بازلر کے ہاتھوں ہم تینوں کے یعنی میرباز' خدا بخش اور میرے گرفتار ہونے اور بھاگیر بوڑی کے کارخانوں میں رکھے جانے کے بعد کس طرح اس دلیر لڑکی روپالی سے ملاقات ہوئی اور اس نے قصاب برادری کے ایک نوجوان کو اپنا گرویدہ کر لینے کے بعد باگھیر بوڑی کارخانے پر مویشیوں اور گوشت منڈی کے بیوپاریوں کا حملہ کروایا اور کس طرح روپالی کے ساتھ مجھے بھی چھڑا لیا گیا۔ پھر کاکسیز بازار جانے کی تیاری میں کس طرح میں نے اپنے قصائی محسن کے دوستوں گجراتی دکاندار صدیق اور سلیم کے ہاں سے اپنے کاکسیز بازار کے گیسٹ ہاؤس فون کیا جس سے دشمنوں کو میرے فرار کا علاقہ معلوم ہو گیا اور انہوں نے مسلح نوجوانوں کی سیاسی تنظیم بنگلہ دوست کے رضاکاروں سے مدد لے کر میرا پیچھا کیا۔ میں بمشکل کاکسیز بازار پہنچ کر وکیل مزمل صاحب کے منشی سے ملنے میں کامیاب ہوا اور پھر سلسیل چودھری اور اس کے ذلیل بھتیجے بازلر کے چنگل میں آ گیا۔

اس کے بعد کا کچھ حال بڑے میاں نے میرباز کو بتا ہی دیا تھا کہ مجھے باگھیر بوڑی کارخانے میں لڑکی روپالی کے قریب کوٹھری میں قید رکھ کر سلسیل اور بازلر نے والد صاحب کو دکھانے کے لیے مجھ سے نشے کے اثر میں جعلی رسیدیں اور دوسری دستاویزات پر دستخط کرا لیے تھے تا کہ والد صاحب کو دھوکے سے مغربی پاکستان سے بلا کر وہ لوگ یہاں اپنے جاسوسی کے منصوبے کی تکمیل کر سکیں تو اسی پلان پر عمل کرتے ہوئے مجھے برما کی سرحد میں دھکیل دیا گیا۔

برما کو سومی اور بڑے میاں سے ملاقات اور ان کی مدد سے رنگون شہر تک پہنچنے کا احوال اور رنگون میں کونٹی نینٹل ہوٹل میں ہم تینوں فراریوں کی کارگزاریاں سب میرباز کے علم میں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ بڑے میاں نے کس طرح مجھے رنگون جیل سے فرار کرایا ہے اور وہ قبیلے کے باغی جسگمے کی غنڈا گردی سے بچتا بچاتا مجھے یعنی شیر علی خان کو لے کر شاید یہاں مانگ یان آ جائے گا یا خود میرباز کو مانگ یان سے کہیں بلوا بھیجے گا' جہاں ہم دونوں دوست مہینوں بعد ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔

مگر میرباز کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کایا بدل بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور یہ کہ بڑے

میاں کایا بدل کر ریچھ بن سکتے تھے۔

میرباز کو بڑے میاں کی موت کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "یارا...... تیرا والد صمد بنگش خان صاحب کے بعد اگر میں نے اپنے پہ شفقت کرتے' باپ دادے کی طرح پیار کرتے کسی کو دیکھا ہے تو وہ یہی کوسومی کا دادا' مداری بابا تھا۔ باخدا۔ سچ کہتا ہوں۔ اس کی وفات کا سن کے شیر خان' یارا ایسا لگتا ہے جیسے میرا اپنا والد دوبارہ فوت ہو گیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

میرباز کی اپنی روداد مختصر مگر بہت تکلیف دہ تھی۔

سلسیل چودھری اور بازلر کے گرگوں نے اسے اور خدا بخش رائیں کو بہت مارا پیٹا تھا۔ ان سے میرے بارے میں اور والد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی تھی۔ میرباز نے اور خدا بخش نے بس یہی کہا تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے صمد خان صاحب اور شیر علی ہمارے بھائی بند ہیں۔ جس طرح ہم اپنے باپ' بھائیوں' بیٹوں' بھتیجوں کے بارے میں دشمنوں کو کچھ نہیں بتا سکتے' اسی طرح ان کے بارے میں تم حرام زادوں کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ چاہے ہمیں مار ڈالو۔

میرباز بتانے لگا کہ خدا بخش رائیں نے اپنی پنجابی ملی اردو میں انہیں شرم بھی دلائی تھی کہ "اوئے کتے' او شرم کرو' تم کیہو جے ایماندار بندے کے خلاف سازش پے کر دے او۔ ارے سالو! بنگش صاحب ہوری جیسے پچاس بندے ہر محکمے میں ابھی موجود نیں۔ جبھی پاکستان چل رہا ہے۔ نہیں تم دشمن بے دینوں نے تو اس جنت ورگے ملک نوں بیچ کے ہی کھا جانا تھا۔"

بازلر اور چودھری کے گرگوں نے بخش کے ساتھ اتنی زیادتیاں کیں اور ایسا تشدد کیا کہ اس کی دماغی حالت متاثر ہوئی اور پھر ان بدمعاشوں نے مقامی پولیس کی مدد سے خدا بخش رائیں غریب کو وہیں کسی پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔

میرباز کو باگھیر بوڑی سے ہٹا کر چودھری نے کچھ دن اپنے گھر کے گیراج میں بند رکھا۔ پھر مختلف جگہ قید اور مار پیٹ کے بعد اسے برما کی بارڈر پولیس کے حوالے کر دیا۔ بارڈر پولیس والوں کو تو میں دیکھ چکا تھا کہ کتنے ظالم اور بدمعاش ہیں۔ انہوں نے چودھری کے منصوبہ کے مطابق میرباز کو بارڈر پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی مگر بات کھل گئی اور کسی عورت نے جو میرباز کے کہنے کے مطابق بدمعاشی کے لیے لائی گئی تھی۔ (میں نے سوچا یہ یقیناً بولاری ہو گی۔) اتنا شور شرابا کیا کہ

بارڈر پولیس والے اور برمی فوجی گھبرا گئے۔

وہ تو اس عورت کو مارے ڈال رہے تھے مگر ماتحت پولیس والوں نے اپنے افسروں کو سمجھایا کہ آس پاس جنگل میں سرکاری لکڑی کٹ رہی ہے۔ عورت کے شور مچانے سے ٹھیکیدار اور مزدور ادھر متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگر اسے مار دو گے تو بات اوپر تک جا سکتی ہے۔ مجبوراً افسروں نے اس عورت (بولاری) کو اور میرباز کو الگ الگ گارڈ چوکیوں پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عورت کا تو پھر پتہ نہ چل سکا۔ میرباز کو دوسری چوکی پر منتقل کرنے کے بہانے سے بارڈر پولیس کے افسروں نے گولی مارنے کے لیے کسی ندی کا قرب طے کیا تھا۔ انجانے میں انہوں نے میرباز پر دو فائر بھی کیے۔ ایک گولی ران میں لگی، دوسری شانے کو کھرچتی نکل گئی۔ وہ زخم اب مندمل ہو چکا ہے۔

میرباز کہنے لگا۔ "شیر خان قدرت کو بچانا منظور تھا ورنہ وہ قاتل تو سمجھو میرے پر ایسے گولی چلا رہے تھے جیسے چھاؤنی میں فوجی لوگ چاند ماری کرتے ہیں۔ بس قدرت خداوندی سے بچ گیا یار۔ دو گولی کے بعد ان کے چار چھ فائر مس ہوئے۔ میں ہتھکڑی سنبھال کے بھاگتا تھا کہ جنگل میں سے ایک اونچا پورا ریچھ نکل کے آیا۔ اس ریچھ نے ان خدائی خوار پولیس والوں کی جیپ کو الٹ دیا۔ زخمی بھی کیا حرام زادوں کو۔ میں ادھر سے جان بچا کے نکل گیا۔ ایسا ہی خون بہتے میں ندی پار کر کے چھپ گیا۔ بے ہوش ہو گیا۔ ابھی خبر نہیں، کدھر سے یہ کوسومی اور دادا مداری آ گیا۔ یہ لوگ نے مرہم پٹی کیا۔ میرے کو جنگل سے نکالا۔"

میں نے کہا۔ "ریچھ بہت ہیں ادھر برما میں۔ چلو ایک برمی ریچھ نے تمہاری جان بھی بچالی۔"

وہ بولا۔ "برمی شرمی نہیں یار۔ میرے کو تو وہی مداری کا ریچھ لگتا تھا۔ اونچا پورا، ایک دم کالا سیاہ۔"

میں نے پوچھا۔ "تم پھر مانگ یان کس طرح آئے؟"

کہنے لگا۔ "یہ پتا نہیں کس طرح آیا۔ جنگل سے یہ لوگ نے نکال کے کسی ٹرک پر لادا، پھر میرے کو مداری، خانہ بدوش کے ڈیرے پر لے گئے۔ ادھر اس نمونے کی بھینسا گاڑی بہت تھی۔ تو چھ آٹھ روز میں بخار میں جلتا گرتا پڑتا ان لوگوں کے قبیلے کے ساتھ ادھر پہنچ گیا۔ لڑکی کوسومی میرے بعد ادھر آئی۔"

میرباز کی داستان مختصر مگر مجھ سے کہیں زیادہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی

تھی۔ میرے ساتھ تو چودھری والوں نے اور بارڈر والوں نے اتنا زیادہ کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کو تو جیسے توڑ کے رکھ دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو سمجھو میرے والد کے ساتھ جنگلوں میں رہتے ہوئے اسے سختیاں جھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی، جو یہ سب جھیل گیا۔ پھر اسے جو محبت مجھ سے، میرے کنبے سے تھی، اس نے بھی میرباز کو طاقتور رکھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاس جا کر کسی بڑے بھائی کی طرح اس کا سر اپنے پہلو سے لگا کر تھپکا۔ اس کی تعریف کی کہ نام تو تیرا شیر نہیں ہے مگر یارا تو واقعی شیر آدمی ہے۔

بیالا اور اس کا میاں اچانک بہت تیزی سے اور جوش میں بھرے ہوئے آئے۔ کہنے لگے کہ کالج ہاسٹل میں گھسنے کا یہی موقع ہے، چلو تم ٹرک میں بیٹھ جاؤ۔

باہر سبزیاں لے جانے والا ٹرک کھڑا تھا۔ میرباز کو انہوں نے میرے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا۔ ڈرائیور کے برابر بٹھایا۔ ٹرک پر گوبھی کے ٹوکرے لدے ہوئے تھے۔ بیالا نے دو ٹوکروں کے بیچ کی جگہ میں دری بچھا کر مجھے لیٹ جانے کو کہا۔ وہ خود پچھلے حصے میں ٹرک کے ڈالے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا میاں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ہمارے میزبانوں نے ہمیں جھونپڑی سے نکل کر رخصت نہیں کیا۔ وہ اس بات سے اداس ہو گئے تھے کہ میں جا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ اب اور نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے امید دلائی کہ میں پھر آؤں گا۔

تازہ گوبھی کی تیز مہک میں لپٹا اس ٹرک میں پڑا میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اور میرباز کو قید سے چھڑانے والے بڑے میاں تو نہیں رہے مگر ان کے مریدوں اور بچوں کا ایک گروہ خود کو خطرے میں ڈال کر ہمارے لیے وہی سب کر رہا ہے جو بڑے میاں نے کیا تھا۔

ایک غیر ملک میں ہمیں بے آسرا نہ رکھنے پر میں نے مالک کا شکریہ ادا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس کریم کی عنایت نہ ہوتی تو اب تک ہم دونوں مٹی ہو چکے ہوتے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہم بڑی سڑک سے گزر رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ بڑی سڑک پر چلنے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ بیالا کا میاں ہارن بجا کر کسی کو بلا رہا تھا۔

بھاری بوٹوں کی آواز آئی، پھر کسی نے اکھڑپن سے برمی زبان میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

بیالا کا میاں بولا۔ "گیٹ کھولو، سبزی آئی ہے۔"

اکھڑ آدمی نے کہا۔ "صبح سے یہی سب کر رہا ہے تم لوگ...... دودھ آیا ہے' سبزی آئی ہے۔ ایک بار میں سب نہیں لا سکتے سالے؟"

"ابھی چاول کی بوریاں لاؤں گا۔"

اکھڑ آدمی بڑبڑایا۔ "چاول کی بوریاں۔"

"ہاں...... پھر جلانے کی لکڑی آئیں گی۔" بیالا کے میاں نے اسے چڑانے کو لہک کر کہا تھا۔

اکھڑ آدمی نے جو دروازہ کھولنے کے لیے بھاری قدموں سے ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا' گالی دی۔ بیالا کے میاں نے بھی جواب میں وہی گالی لوٹا دی۔ اکھڑ آدمی نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے سنا نہیں ہے۔ اس نے اور ہی سوال کیا۔ "یہ پیچھے ٹرک میں کون ہے رے او سور؟"

میں نے سانس روک لی۔ کیا اس بے ہودہ آواز والے نے مجھے دیکھ لیا ہے؟

مگر وہ بیالا کا پوچھ رہا تھا۔ اس کے میاں نے جواب دیا۔ "ماں ہے تیری۔"

"دھت تیری تو۔" کہہ کر گیٹ کھولنے والے نے ٹرک کی باڈی پر لاٹھی ماری یا لات جما دی۔ بیالا کا میاں چڑانے کو ہنستا ہوا ہارن بجاتا ٹرک کو اندر لے آیا۔

اندر کوئی بہت پیچ دار رستہ تھا جس سے گزرتا ہوا ٹرک رک گیا۔ ٹرک کے رکتے ہی لگا جیسے کچھ غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ بیالا بائی نے تیز سرگوشی میں کہا۔ "اٹھو...... شیر علی' پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ آواز نہیں کرنا۔"

میں نے گوبھی کے ٹوکروں سے اٹھ کر دیکھا۔ بیالا تیزی سے ٹرک کے ڈالے پر چڑھی اور نیچے کود گئی۔

میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کچھ دور چل کر پھر وہ جیسے زمین سے چپک گئی۔ میں نے بھی یہی کیا۔

ادھر ادھر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ بیالا چل پڑی' میں بھی پیچھے چلا۔ وہ پھرتیلی عورت سرخ پتھر کی دیواروں کے درمیان سرخ پتھر جڑی گلی میں جھکی جھکی تیزی سے نکلی چلی جا رہی تھی۔ ہم نے بہت سے موڑ مڑے۔ میں نے گوشہ چشم سے دیکھا' دور جہاں بلند دیوار پر برجیاں جیسی بنی تھیں' خاکی کپڑوں والا ایک شخص رائفل کندھے پر رکھے پہرہ دے رہا تھا۔ پہریدار کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔

بیالا برجیوں پر ٹکے ہوئے اس سائے کو تکے جا رہی تھی۔

میں لپکتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے پنجے میں پنجا پھنسا لیا اور سرگوشی میں بولی۔ "جیسے ہی یہ چلنا شروع کرے' ہم لوگ گلی چھوڑ کے کھلے میں نکلیں گے۔ کھلے میں رکنا نہیں ہے۔ دوسرا پہریدار برجی پر آ جائے گا۔ وہ ہماری طرف منہ کر کے آئے گا۔ یہ سمجھ لو رکنا نہیں ہے اور خاموشی سے نکل جانا نہیں تو پکڑے جائیں گے۔"

سامنے برجیوں پر ٹکے سائے نے حرکت کی۔

بیالا نے میرا پنجا اچھی طرح اپنی گرفت میں لیا اور گلی سے نکل کر کھلے قطعے میں دوڑ پڑی۔ میں دوڑتے ہوئے سامنے برجیوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ نیچے قدموں تلے گھاس تھی۔ ہم دونوں جس عمارت کی طرف دوڑے چلے جاتے تھے' میں نے دیکھا' اس کا دالان ہماری طرف کھلتا تھا۔ دالان کے ایک سنگی ستون کے پیچھے سے دو چہرے' دو لڑکیاں۔ تشویش کے ساتھ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھیں۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر بے تابی کا اشارہ بھی کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی ہم جلد از جلد دالان کی پناہ میں آ جائیں۔

دالان چار پانچ قدم دور ہو گا کہ سامنے برجیوں پر کچھ آتا محسوس ہوا۔ میں نے تیز سرگوشی میں بیالا کو خبردار کیا۔ "آ رہا ہے۔" اور ہم نے آخری قدم لینے میں اپنی جان لڑا دی۔ میں سامنے اب صرف دالان کی پناہ گاہ میں دیکھ رہا تھا۔

مگر ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔

برجیوں پر سے کسی نے للکارا اور ہماری طرف فائر کیا۔ فائر بظاہر ڈرانے کو کیا گیا تھا۔

"مارے گئے۔" میں نے دل میں سوچا۔

ہم دالان میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس گارڈ نے ہمیں دالان میں داخل ہوتے تو دیکھا ہے۔ وہ لوگ اب ہمارے پیچھے آئیں گے۔

یہی بات۔ بالکل یہی بات ستون کے پیچھے چھپی ہوئی ان دو لڑکیوں نے سوچی ہو گی...... کہ وہ اب بیالا کے اور میرے پیچھے آئیں گے۔ اس لیے انہوں نے عجیب دلیری کا کام کیا۔

دونوں لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی ستون کے پیچھے سے نکلیں اور گھاس پر دوڑتی ہوئی کھلے میں گئیں۔ دور سے دیکھنے والے کو لگتا ہو گا کہ وہ اس وقت ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کر رہی ہیں۔

پہریدار نے انہیں دیکھا' پھر اس نے للکار کو کچھ کہا اور ڈرانے کو پھر فائر کیا۔

"اے ے......اے......اندھے۔" لڑکیوں نے ہنسی روک کر غصے میں برجیوں کی طرف ہاتھ ہلائے تھے۔ انہوں نے چیخ کر کہا۔ "او اندھے۔ تیرے کو دکھتا نہیں ہے؟ ادھر کو فائر کیوں کرتا ہے؟ کیا فالتو کارتوس ہیں تیرے پاس۔ آں رے؟"

برجیوں پر سے چیخ کر پہریدار نے کچھ کہا ہوگا جو ہمیں سنائی نہ دیا۔

لڑکیوں نے اسی طرح کھلے لان پر کھڑے کھڑے ان سے منہ ماری شروع کر دی تھی۔

"اے اے سالا! ادھر لان پر نہیں کھیلے گا تو کیا تیری کھوپڑی پر دوڑ لگائے گا؟ اندھے کا جنا نہیں تو۔ اپنی بندوق قابو میں رکھ۔ کیوں جائے اندر؟ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہاں آآں۔" اور چیخنے والی نے اپنی دوست سے کہا۔ "آؤ جی۔" وہ دونوں پھر لان پر ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کرنے لگیں۔

لڑکیوں نے ہمیں یقینی گرفتاری سے بچا لیا تھا۔

بیالا نے ہاتھ ہلا کر خاموش اشارے میں ان کا شکریہ ادا کیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے دالان کی خاتمے پر نیچے اتری۔ سرخ پتھر کی فراخ سیڑھیوں کی طرف ڈپٹ پڑی۔

نیچے ٹھنڈک تھی اور دھوپ کی چمک نہیں تھی۔ نیچے عافیت تھی۔

میں سیڑھیوں پر ہی رک گیا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

"رک کیوں گئے؟ آؤ" بیالا نے میرا ہاتھ کھینچا۔

"بال بال بچے ہیں۔ دم لینے دو ذرا۔"

وہ بھی بہت بے حال ہو رہی تھی۔ کچھ دیر رک کر دم لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے رک کر پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ اور یہ گولیاں کیوں چلا رہے ہیں؟"

کہنے لگی۔ "میرے آدمی نے یا اس میرباز نے بتایا نہیں' یہاں کیا ہوا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولی۔ "وہ لوگ یہ سب بہت روز سے بھگت رہے ہیں۔ تم سے کہنا یاد نہیں رہا ہوگا۔ سرکار نے کالج اور ہاسٹل پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"کیوں؟"

"بابا کے مرنے کا پتا چل گیا۔ بس آگئے' بولے خالی کرو۔"

"خالی کرو؟ پر اتنی توپ بندوق' فوج فاں ٹالانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ جو ادھر آگیا ہے حرام کا...... جسگھے۔"

"مگر جسگھے کے آنے کا اور اس پہرے چوکی' چاند ماری کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

بیالا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کسی شاگرد کی طرح مجھے سمجھانا شروع یا۔ بولی۔ "دیکھو لڑکوں کے کمروں کی طرف بڑا بھاری جنگل ہے۔ بڑے بڑے درخت یں۔ ایک دن سویرے سرکاری لوگ نے کالج پر پرچا لگا دیا کہ اتنے اتنے دن میں یہ جگہ الی کر دو' نہیں ہم طاقت سے خالی کرا لیں گے اور باہر انہوں نے پہرہ بٹھا دیا۔ رات میں ی وقت جسگھے اور اس کے بدمعاش جنگل کی طرف سے درختوں پر چڑھ کے لڑکوں کے صے میں کود گئے۔ وہ لوگ خبر نہیں کہاں سے چوری کر کے' کچھ کر کے بندوق کارتوس ئے تھے جو انہوں نے لڑکوں کے کمروں کے پاس چھپا دیئے۔ پھر باہر نکل کے انہوں ے جنگل کی طرف سے گولی چلائی۔ پہرے والے سرکاری لوگ ادھر آئے تو یہ درختوں ں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے حرام کے جنوں نے گولی چلا کے دو سرکاری آدمی مار دیئے ر بھاگ گئے۔ بس پھر کیا تھا' ایک گھنٹے کے اندر اندر کالج میں لڑکوں کے کمروں کی رف ادھر لڑکیوں کے حصے پہ سب جگہ فوج نے گولی توپ چلاتے ہوئے گھیرا ڈال دیا۔ کوں کی آنکھ جسگھے والوں کی گولی کی آواز سے کھل گئی تھی۔ وہ خود پریشان تھے۔ اب جو رکاری لوگوں نے فائرنگ کر دی تو انہوں نے دہائی دی۔ ہاتھ اٹھا دیئے۔ لڑکوں کو تو ب کو گرفتار کر لیا اور لے گئے۔ تلاشی لی تو کمروں کے پاس سے بندوقیں' کارتوس نکلے۔ نہوں نے فوراً قبضہ کر لیا۔ وہ تو لڑکیوں کے حصے کو بھی خالی کرا رہے تھے' پھر خبر نہیں یسے ان لوگوں کو ادھر ہی رہنے دیا ہے۔"

"کوسومی کہاں ہے؟"

"ہم کوسومی کے پاس ہی چل رہے ہیں۔ وہ نیچے وہار میں ہے۔"

وہاں دراصل بودھ عابدوں کی خانقاہ ہوتی ہے۔ یہاں قدیم عمارت میں انہوں نے یہ وہار تہ خانوں میں بنایا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ "انہوں نے تمہارے میاں اور میرباز کو یہاں کیسے رہنے دیا؟"

بولی۔ "قبضے کے وقت میرا آدمی ٹرک لے کر گیا ہوا تھا۔ میرباز کو اس نے یسے ہی اپنا کلینر بنا کے رکھا ہوا ہے۔ جبھی سبزی' راشن لے کے یہ لوگ آئے تو ادھر رکاری لوگوں کا قبضہ دیکھا۔ بڑی جھجک جھک کے بعد ٹرک کی اور ان دونوں کی اچھی

تلاشی لے لے ان لوگوں کو اندر چھوڑا' پھر فوٹو پاس بنا دیئے۔ اب یہ لڑکیوں کے لیے راشن سامان لے کے آتے ہیں۔ فوج والے تلاشی لے کے پھر اندر جانے دیتے ہیں۔ رات کو دونوں کو ادھر سے نکلنے نہیں دیتے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم اور مورنی اندر کیسے آ گئیں؟"

بولی۔ "مورنی کا تو پتا نہیں۔ وہ جنگل کی طرف منڈلاتی پھر رہی تھی۔ خبر نہیں اتنے پہرے میں اندر کیسے پہنچ گئی۔ مجھے تو میرے آدمی نے پاس بنوا کر اندر پہنچایا ہے۔"

مجھے حیرت تھی کہ جب تلاشی اور نگرانی ہو رہی ہے تو انہوں نے ٹرک میں جھانک کر مجھے کیوں نہیں پکڑ لیا؟

میں نے بیالا سے یہ بات پوچھی تو اس نے بتایا۔ "جہاں ہم دونوں ٹرک سے کودے تھے' اس جگہ ٹرک کو رکنا پڑتا ہے۔ روک کے وہ لوگ تلاشی لیتے ہیں' پھر آگے جانے دیتے ہیں۔ ہم کود کے گلی گلی پچھواڑے نکل کے ادھر دالان کی طرف آ گئے تو بچ گئے۔ ایک منٹ ٹرک میں اور بیٹھے رہتے تو بس آ ہی رہے تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر وہ پہلے سے ہوتے تو تم لوگ کیا کرتے؟"

کہنے لگی۔ "مشکل تو ہوتی' پر کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا میرا آدمی۔ ناٹک کرتا میرباز سے' کوئی جھگڑے والی بات کر کے منٹ بھر کو انہیں اپنی طرف بلا لیتا۔ ہم نکل جاتے' یہی طے ہوا تھا۔"

یہ بڑے عیار لوگ تھے جبھی ایسے مشکل حالات میں سرکار کا اور بری قبائلیوں' جاگیرداروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

دیر ہو چکی تھی۔ بیالا بائے اور میں اب تازہ دم اور آگے جانے کو تیار تھے۔

یہ پرانی عمارت عبادت گزار بودھ بھکشوؤں کی پناہ گاہ تھی۔ عمارت میں معبدوں' خانقاہوں سے مخصوص ایک گھمبیر سناٹے کا راج تھا۔ ہم دونوں اب اس ٹھنڈے نیم تاریک زینے سے اتر کر سرنگ جیسے کسی راستے پر چل پڑے۔ بیالا نے رہنمائی کے خیال سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ شاید اس کی آنکھیں اندھیرے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہ تو کتنی ہی بار اس راستے سے گزری ہو گی مگر میرے لیے اگلا قدم کسی نئی صورت حال میں پڑتا معلوم ہوتا تھا۔

بیالا نے بتایا کہ ہم گھاس کے جس کھلے میدان سے دوڑتے ہوئے گزرے تھے' یہ راستہ اسی میدان کے نیچے بھول بھلیاں بناتا گزر رہا ہے۔ اس زیر زمین راستے کے ساتھ

ساتھ دو ہاتھ اونچی دیوار چل رہی ہے جس کے پار تازہ پانی کی ایک نہر بہتی ہے۔

میں نے بیالا سے ایک منٹ رکنے کو کہا اور سنا پانی بہنے کی ہلکی آواز ہمارے بائیں طرف سے آ رہی تھی۔ بہت ہلکی روشنی میں دو ہاتھ کی وہ حفاظتی دیوار بھی دکھائی دے رہی تھی۔

مجھے دور کہیں روشنی کا دھبا سا دکھائی دیا جس نے جلد ہی ایک مستطیل جالی کی شکل اختیار کر لی۔ پتھر کی اس جالی کے پار سے لڑکیوں کے باتیں کرنے یا گنگنانے کی آوازیں چلی آ رہی تھیں۔ روشن دان سے آتی روشنی اور آوازوں نے مجھے عہد قدیم کے امن اور سناٹے سے نکال کر آج اس لمحے کے ہیجان میں پہنچا دیا۔

لمحہ لمحہ روشن ہوتی سیڑھیوں سے چڑھ کر ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچے۔ ہال دن کی روشنی اور گنجارتی ہوئی نوجوان لڑکیوں کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہال میں کوئی آٹھ نو جگہ لڑکیوں کے دائرے بنے تھے۔ ان دائروں کے بیچ میں بھی ایک لڑکی تھی' وہ کتاب اٹھائے پہلے کچھ پڑھتی تھی' پھر دائرے میں بیٹھی لڑکیاں ایک آواز ہو کر اسے دہراتیں۔ مجھے تو یہ فزکس' کیمسٹری' بیالوجی کے فارمولے لگے جنہیں یہ لڑکیاں رٹ رہی تھیں۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "یہ تو رٹا لگا رہی ہیں جیسے گاؤں' قصبوں کے ماسٹر پہاڑے رٹواتے ہیں۔ ویسے ہی۔"

قریب کے دائرے سے ایک لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا اور نرم لہجے میں مگر اونچی آواز سے کہ جو گنجارتی ہوئی لڑکیوں کی نامانوس موسیقی کی لہروں سے اوپر اٹھ کر مجھے خوب صاف سنائی دی تھی۔ کہا۔ "نہیں۔ رٹ نہیں رہیں' ہم سب اپنی یادداشت نکھارنے کی مشق کر رہے ہیں۔ دن بھر میں چوتھائی گھنٹا اس مشق کو دہرایا جاتا ہے شیر خان۔"

شیر خان میں نے بات سن اور سمجھ لی تھی اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ لڑکی مجھے کیسے پہچانتی ہے؟

لڑکیوں کا گنجارنا بند ہو گیا تھا۔ میرا نام لینے والی لڑکی دائرے سے اٹھی۔ پہلی نظر میں وہ جانی پہچانی مگر نئی نئی سی لگی۔ پھر وہ مسکرائی تو پوری سمجھ میں آ گئی۔ وہ کوسومی تھی۔

کوسومی' بڑے میاں کی پوتی۔ یہ وہی تھی مگر یہ وہ لڑکی ہی نہیں تھی جسے میں

نے پہلی بار مشرقی پاکستان میں اپنے گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے دیکھا تھا۔

وہ ایک باوقار خاتون کی طرح اٹھی تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی مگر خوبصورت یا بہت خوبصورت کہنا ناکافی ہوگا۔

کونٹی نینٹل ہوٹل میں قیام کے دوران کوسومی میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ اس وقت مجھے وہ ذرا بڑی سی اور صحت مند سی لڑکی لگی تھی۔ یہاں بودھ عابدوں سے منسوب اب خانقاہ میں وہ کچھ اور ہی بن گئی تھی۔ شاید زیادہ وقت اس نے اس زیرزمین دنیا میں گزارا ہوگا تو اس کی رنگت میں نکھار آگیا تھا مگر اس کے چہرے کی جلد میں دھوپ سے محروم رہنے والوں کی پیلاہٹ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر صحت مند سرخی تھی۔ مناسب غذا اور ورزش اور آرام اور کھلی ہوا میں وقت گزارنے والوں کی طرح اس کے پاس دھوپ کی اور نئے اگتے ہوئے پودوں کی مہک اٹھ رہی تھی اور اس لڑکی کوسومی سے جیسے نسائی حسن کی روشنی پھوٹتی تھی۔

میں سمجھنا چاہتا تھا' پر سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اتنا حسن میرے تجربے میں نہیں تھا' میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "اہا۔ کوسومی! کوسومی کیا کر رہی ہو یہاں؟ کیسی ہو تم کوسومی؟"

وہ مسکرائی۔ کاکسیز بازار گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے بنی جھونپڑی سے نکل کر آنے والی لڑکی شاید اس طرح پہلے کبھی نہیں مسکرائی تھی مگر نہیں ایک دوبار رنگون کونٹی نینٹل میں وہ کسی بات پر مسکرائی تھی تو مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ اس کی پوری شخصیت ایک دھیمی مسکراہٹ سے ترتیب پائی ہے۔

اسی مسکراہٹ کی وجہ سے کوسومی کو ایک بار دیکھنے والا دوبارہ اپنی یادداشت میں بہت آسانی سے لا سکتا تھا۔ بس اسے مسکراتا یاد کرنا ہوتا اور وہ خیال کی آنکھ سے نظر آجاتی۔

میں نے ایک بار اور اس کی طرف گھبرا کر دیکھا اور کہا۔ "ہاں کوسومی..... کیسی ہو؟ زمانے کے بعد دیکھا ہے تمہیں تو۔"

وہ بولی۔ "زمانہ نہیں..... چند مہینے اور تم..... شیر خان' تم کیسے ہو؟"

وہ بے تکلف دوستوں کی طرح مجھے تم کہہ کر بلارہی تھی۔

بیالا نے جو کبھی میرا' کبھی کوسومی کا چہرہ تکتی تھی' مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ایک طرف چلنا شروع کردیا۔ اس نے کوسومی سے کہا تھا۔ "کوسومی آؤ' یہاں کھڑے

کب تک کیسا' کیسی کرتے رہو گے؟"

وہ دھیما سا قہقہہ مار کر ہنسی تھی مگر اسے قہقہہ نہیں کہا جاسکتا۔ قہقہے میں ایک طرح کی بے پروائی ہوتی ہے۔ کوسومی کی اس ہنسی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔

ہم تینوں اس ہال سے نکل آئے۔ ہال میں لڑکیوں نے پھر موسم بہار کے بھونروں کی طرح گنجارنا گنگنانا شروع کردیا تھا۔

ہال سے نکلے تو ہم بودھ وہار کا ایک اور طبق اتر کر چھوٹے زیرزمین کمروں کی ایک منظم دنیا میں داخل ہوگئے۔ یہاں پتھر کا فرش تھا۔ پتھر کی دیواریں اور چھت بھی پتھر کی تھی۔

یہاں ایک چوڑی راہ داری کے دونوں طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ راہداری کے خاتمے پر ایک بلند دروازہ تھا جس کی چوکھٹ اور دروازے کے پلر بھی سرخ پتھر سے تراش کر بنائے گئے تھے۔ دروازے کے پٹوں میں بڑی حکمت سے پتھر تراش کر فولادی کنڈا اور زنجیر لگادی گئی تھی۔

بیالا نے اشارہ کیا۔ "یہ دھیان تپسیا کا کمرہ ہے۔"

یعنی اس جگہ کبھی بودھ راہب ریاضت' مراقبہ کرتے ہوں گے۔

دھیان تپسیا کے ہال کے قریب دو تین کمرے چھوڑ کر ایک عام سا کمرہ تھا جس کی طرف بیالا نے اشارہ کیا۔ "یہ کوسومی کا کمرہ ہے یا شاید اس کے برابر والا۔"

کوسومی بولی۔ "برابر والا نہیں' میرا کمرہ یہی ہے۔"

وہ دونوں مجھے ساتھ لیے پتھر کے دروازے چوکھٹ والے ہال کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

کوسومی کہنے لگی۔ "لڑکوں کے رہنے والے کمروں پہ سرکاری آدمیوں کا قبضہ ہے' اس لیے تمہیں یہاں وہار ہی میں چھپنا پڑے گا۔"

"یہاں؟ کہاں؟" میں لڑکیوں کے ہاسٹل میں قیام کرنے کے خیال ہی سے الجھ ہا تھا۔

بیالا بولی۔ "یہاں تپسیا والے کمرے ہیں۔" وہ پتھر کے دروازے کی طرف ثارہ کر رہی تھی۔ کوسومی نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ جیسے لب اشارے سے کھلتا چلا گیا۔ کئی ٹن وزنی پتھر کے اس پٹ کو اتنے مکمل توازن سے ٹکادیا یا تھا کہ یہ پٹ ایک بچہ بھی کھول سکتا تھا۔

کوسومی نے دہلیز پار کی اور دھیان تپسیا کے اس ہال میں داخل ہو گئی۔ اس کا قدم پڑنے سے ہلکی چاپ پیدا ہوئی جس کی گونج میں نے سنی۔ مجھے یہ کسی اور زمانے کی آہٹ لگی۔

ہال بہت وسیع اور عریض تھا اور بالکل خالی تھا۔ کہیں کوئی بت، مورتی، پتھر میں تراش کر بنائی ابھاری ہوئی کوئی تصویر، کہیں کچھ نہیں تھا۔

مراقبے کے اس لمبے چوڑے ہال میں اس ایک دروازے کے سوا کوئی دوسرا دروازہ، کھڑکی، روشندان، روزن کچھ نہیں تھا۔ چاروں طرف اور اوپر نیچے ٹھوس سرخ پتھر تھا مگر ہال میں باسی بند ہوا یا گھٹن نہیں تھی۔ ایک نامانوس سی تروتازگی اور سناٹا تھا۔ سکون بھرا سناٹا جو غور و فکر اور ریاضت کے لیے سازگار ہو سکتا تھا۔

فرش سے اٹھتی سفید روشنی سے ہال روشن تھا۔ پورے ہال میں دیواروں کی جڑ میں دودھیا پتھروں سے دو فٹ چوڑی ایک اوٹ بنا دی گئی تھی جس کے پیچھے روشنی کا ماخذ تھا۔ بجلی کے تار یا ٹیوب کچھ نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے کہا۔ "بہت اچھی جگہ ہے۔"

"ٹھیک ہے تو میں چلتی ہوں۔" بیالا نے کہا اور وہ مجھے اور کوسومی کو ہال کے وسط میں کھڑا چھوڑ کر چلی گئی۔

بیالا کے جاتے ہی کوسومی میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی۔ وہ جو کسی اچھی افسر رابطہ کی طرح میری طرف متوجہ تھی اور مسکرائے جا رہی تھی۔ اچانک بجھ گئی۔ مسکراتے چہرے پر اب ایک اداسی کھنڈ گئی تھی۔ کوسومی میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی تھی اور فرش کو تکے جا رہی تھی۔

میں اس بدلتی کیفیت کو فوری طور پر سمجھ نہ پایا۔ گھوم کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔ اس نے آستین سے آنکھیں پونچھ لیں، بہت دھیمی آواز میں بولی۔ "میں اس وقت وہاں کیوں نہ ہوئی۔"

کوسومی اپنے دادا کو یاد کر رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "ہاں، یہ خلش تو رہے گی کہ آخر وقت تم ان کے پاس نہیں تھیں۔"

"میں تو آخری رسم بھی ادا نہ کر سکی۔" وہ اب دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔

"ہاں کوسومی۔ اس موقع پر نہیں تمہیں، تم ان کی آخری رشتے دار تھیں۔

تمہیں اس موقع پر ہونا چاہیے تھا مگر......"

وہ جلدی سے بولی۔ "مگر تم وہاں تھے، یہ اچھا ہوا تم تھے۔"

میں نے آہستہ سے ہوں کہا۔

"تمہیں انوکھا لگ رہا ہوگا؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگی۔ "دوسری لڑکیوں کے ہوتے، میں ہنستی اور بات کرتی تھیں۔ اس وقت کوئی نہیں ہے تو تمہارے سامنے روتی ہوں۔"

میں نے تسلی دی۔ "اس میں کونسی انوکھی بات ہے؟"

وہ کچھ دیر سر جھکائے رہی، پھر بولی۔ "میں ان لڑکیوں کی اگوا ہوں۔ سمجھو ایک طرح کی رستہ دکھانے والی شاگرد۔ پڑھاتی نہیں ہوں مگر میں جس جس طرح خود پڑھتی ہوں، دوسری لڑکیوں کو اسی طرح پڑھنا ہوتا ہے۔ دوسری باتیں یہ مجھ سے سیکھتی ہیں۔ مجھے خود پر قابو رکھنا ہوتا ہے۔"

وہ غم کی باتوں سے ہٹ کر کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اس کا دھیان بٹائے رکھنے کو میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگوا لڑکی سے دوسری سب لڑکیاں سیکھتی ہیں۔ یہ تو بہت اچھا انتظام ہے۔"

وہ بولی۔ "مجھے اگوا اس لیے نہیں بنایا کہ میں بابا کی بیٹی ہوں۔" اس نے پوتی نہیں، بہت پیار سے بیٹی کہا تھا۔

میں نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"میں اگوا اس لیے بنی تھی کہ پڑھائی میں سب سے آگے رہتی آئی ہوں۔ بس ایک برس کوئی اور لڑکی اگوا بنی تھی۔ مجھ سے ایک سیڑھی اوپر آگئی تھی وہ۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں، یہ بڑا منصفانہ طریقہ ہے۔"

وہ پھر گم صم ہو گئی۔ اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔

پھر ایک دم سر اٹھا کر بولی۔ "جانے سے پہلے بابا نے تمہیں کایا بدلنے پر راضی کر لیا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔"

"کیا اچھا ہوا؟" میں جاننا چاہتا تھا۔

"یہ چار شتابدی (صدی) کا تحفہ تھا۔ کسی نے، پرکھوں میں سے کسی نے، بڑی جوکھ بڑے تپ سے حاصل کیا تھا۔ بابا آگے نہ بڑھاتا اس تحفے، اس علم کو تو یہ زنجیر کٹ

جاتی۔ اب تم آگے چلاتے رہو گے۔ چار شتابدی کا علم اگلے حق داروں کو ارپن کرو گے۔ بڑھادو گے آگے والوں کو۔"

"بالکل نہیں۔" میں یہ بات نرمی سے کہنا چاہتا تھا مگر اپنی رو میں ذرا روکھے پن سے کہہ گیا۔

وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔ "کیوں؟"

میں نے سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "دیکھو کوسومی! میں بالکل ہی دوسری دنیا کا آدمی ہوں۔ میری پرورش' میرا دین' دھرم اور میرا مزاج۔ ایسے کسی جادو جنتر' کسی علم کو جو میری وچار دھارا (فکر کے بہاؤ) سے پورے زندگی کے نظام سے ٹکرا رہا ہے' ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ میں نے مجبوری میں اور تمہارے دادا کے ایک طرح سے دباؤ میں آکر اسے قبول کیا تھا' نہ میں اس...... تحفے سے اب کبھی فائدہ اٹھاؤں گا' نہ آگے کسی کو بخشوں گا۔ یہ بات شاید تمہیں اچھی نہ لگے مگر اسی طرح ہے۔ سمجھیں کوسومی۔"

وہ خاموش کھڑی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ افسوس میں سر ہلانے لگی۔ پھر بہت مشکل سے بولی۔ "بابا کو وقت نہیں ملا' نہیں تو وہ تمہیں اچھی طرح سمجھا کے جاتے۔ وقت مل جاتا تمہیں سمجھنے کا پھر یہ بات اس طرح نہ سوچتے' یوں نہ کہتے تم۔"

"وہ سال بھر تک بھی سمجھاتے رہتے تو میری سمجھ میں اس طرح نہ آتا جس طرح تم نے کہا ہے۔"

اس نے غصے سے سر جھٹکا۔ "وہ ایک سپتاہ (ہفتہ) اس وہار میں سامنے بٹھا کر تعلیم کرتے تو تم ان کے سچے ششو بن کر اٹھتے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں گرمی آگئی تھی۔ "میں ان کا سچا مرید کبھی نہیں بن سکوں گا۔ وہ ایک اچھے آدمی تھے اور اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ان کی بڑائی اچھائی یہی تھی کہ انسانوں سے اور علم سے پیار کرتے تھے۔ ریچھ بننا' شیر بنانا' یہ سب......"

اس نے پتھر کے فرش پر پیر پٹکا۔ "بس شیر علی' میں جا رہی ہوں۔ تمہارے آرام کے لیے وہ لڑکی مورنی' کچھ لادے گی یہاں سے آنے جانے کا سب سمجھا بھی دے گی۔"

وہ مڑی اور دروازے کے پٹ کو اشارے سے کھولتی باہر چلی۔

میں نے ندامت اور نرمی سے اسے پکارا۔ "کوسومی۔"

وہ نہ رکی نہ ٹھہری۔ دروازہ اس کے اشارے سے بند ہو گیا تھا۔

مجھے یہ سب بحث نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں آئندہ شیر بنتا یا نہ بنتا' کسی کو یہ ...... علم آگے بخشتا نہیں بخشتا' یہ میرے اپنے سوچنے' فیصلہ کرنے کی بات تھی۔ مجھے چپ رہنا تھا' میں نے بے وجہ اسے خفا کر دیا۔

کتنی خوبصورت تھی۔ خوبصورت ہے وہ۔ میں نے نرمی اور مروت سے سوچا۔ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ اس ہال کی پوری فضا اس کے چلے جانے سے بجھ گئی ہے۔

پتھر کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا۔ کوئی آرہا ہے' وہ آرہی ہے مگر آنے والی مورنی تھی۔ وہ خوب کھل کر مسکراتی ہوئی آئی تھی۔

وہار میں آکر اس نے دوسری سب لڑکیوں جیسے کپڑے پہن لیے تھے۔ وہ بے تکلف دوستوں کی طرح آئی اور میرے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں' چہرہ' پورا بدن مسکرا رہا تھا۔

بولی۔ "کیسی لگ رہی ہوں میں' وہار کے ان کپڑوں میں؟ بتاؤ شیر۔ کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بہت اچھی۔"

"تم نے شیر' یہ بات میرا دل رکھنے کو کہی ہے۔ تم اداس ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں تو۔"

مورنی بولی۔ "اداس ہو اور مجھے خبر لگ گئی ہے' کس لیے ہو۔ کوسومی نے تم سے جھگڑا کیا ہے۔"

"نہیں۔ وہ نہیں جھگڑی۔ جھگڑا میں نے کیا تھا۔"

مورنی بولی۔ "منا لینا۔ اب جو وہ سامنے آئے تو منا لینا۔ وہ بہت دکھی ہے۔ اپنے آپ میں نہیں۔ اس پر سختی سے فیصلہ نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "فیصلہ میں کیا کروں گا۔ بس بے کار بحث میں الجھ گیا۔ تمہارا اس کا سامنا ہو تو کہہ دینا شیر علی نے خفا کر دیا تھا۔ اب وہ خود اس بات سے دکھی ہے۔"

مورنی نے ہاں میں سر ہلایا' پھر بولی۔ "دکھی مت ہو' یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں تپسیا کے کمرے میں ٹھہرانے کا کوئی سادھن (تدبیر) کرتی ہوں۔ پھر تمہارے پاس آکے

بیٹھوں گی۔ باتیں کروں گی۔"

میں خاموش بیٹھنا چاہتا تھا۔ مورنی سے کسی سے بھی باتیں کرنے' کسی کی باتیں سنتے رہنے تک کی ہمت نہیں تھی مجھ میں مگر یہ بات میں مورنی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک اور دوست کو کیسے ناراض کر دیتا؟

وہ تیزی سے گئی اور کہیں سے ایک گدا کھینچ لائی۔ پیال بھرے اس گدے پر مورنی نے ایک چادر لا ڈالی۔ سیمل کی روئی کا نرم تکیہ لا کے رکھا اور گدے کے پائنتی خود آڑی ترچھی دراز ہو گئی۔

بولی۔ "تم تھکے ہوئے بھی ہو شیر علی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... بہت تھکا ہوا ہوں۔" میں نے سوچا شاید اس طرح کہنے سے وہ چلی جائے گی۔

کہنے لگی۔ "میں تمہارا سر' تمہارے ہاتھ پاؤں دبا دیتی ہوں۔"

"یہ۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ کام دوستوں کا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر کس کا ہوتا ہے؟"

میں اس سوال سے گڑبڑا گیا۔ "دیکھو...... تم میری دوست ہو۔ ہو نا؟"

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

"تو دوست اپنے دوستوں کے ہاتھ پاؤں نہیں دباتے۔"

"کیوں؟ اور کیا وہ سر دبا سکتے ہیں؟"

"ہاں' اگر سر درد کرتا ہو مگر میرا سر درد نہیں کر رہا' اس لیے تم بس باتیں کرو مجھ سے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔"

"پوچھو' کیا پوچھنا ہے؟" اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس ضدی لڑکی کو آخر کس طرح ٹالوں۔

وہ سننے کے لیے مستعد ہو بیٹھی تھی۔

ذہن میں ایک روشنی سی لشک گئی۔ میں نے پوچھا۔ "مورنی تمہیں جو کایا بدل کر مورنی بننے کی طاقت ملی ہے۔ یہ تم دوسرے کو۔ مطلب اگر کسی دوسرے میں کچھ بننے کا حوصلہ اور......اور گنجائش ہے یا لیاقت ہے تو کیا تم اسے کایا بدل لینے کا علم بخش سکتی ہو؟ ہاں؟ بتاؤ۔ بخش سکتی ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"بخشا صرف جگد گرو ہے۔"

"جگد گرو۔ یہ کون ہوتا ہے؟"

"سب جگت کا گرو۔ سب عالم کا' اس دنیا کا استاد جو بابا تھے' جو اب تم ہو گئے ہو۔"

میری چیخ نکل گئی۔ "میں؟ جگد گرو؟" میں نے کچھ کہا نہیں تھا بلکہ میں چیخا تھا۔

"میں جگد گرو ہو گیا؟ کب سے؟"

"جب سے بابا کا ارپن کیا گیا ورن (درجہ) تم نے قبول کیا ہے۔"

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "میں نے کوئی درجہ ورجہ ورن شرن قبول نہیں کیا ہے۔ وہ دم توڑ رہے تھے اور مجھے کچھ دینا چاہتے تھے۔ آخری وقت میں انہیں مطمئن کرنے کو میں نے ہاں کہہ دی اور بس۔"

کہنے لگی۔ "بس یہی موقع' یہی اوسر تھا جب تم نے جگد گرو بننا منظور کیا۔ اب پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ایسا کوئی بھیانک معاملہ تو نہیں ہو گیا۔ خوش رہو' مگن رہو' کوئی کچھ نہیں مانگے گا تم سے۔"

"واہ یہ خوب کہی۔ مانگے گا کیسے نہیں۔ کوسومی ابھی اسی بات پر خفا ہو کے گئی ہے۔ کہتی تھی' تمہیں آگے کچھ کرنا ہوگا۔ یہ چار صدی کا علم کسی کو دے کر جانا ہوگا۔"

"دینے کو اور شیر علی جانے کو ابھی پورا ایک جنم پڑا ہے۔"

میں کڑوے پن سے بولا۔ "ہاں جی۔ پوری ایک زندگی پڑی ہے۔ کسی کو چیتا' کسی کو اژدھا' بھیڑیا بننے کا علم بخشتا رہوں' بیٹھا رہوں جگد گرو بنا۔ اپنے لیے آگ کا گھڑا تیار کرتا رہوں۔"

"آگ؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں تم نہیں سمجھو گی۔"

بولی۔ "سمجھاؤ نا۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑو۔ یہ بتاؤ تمہیں مورنی کی کایا میں جانے اور واپس آنے کی لاقت کس سے ملی؟"

کہنے لگی۔ "کوسومی سے۔"

"ایں۔" میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا' پھر پوچھا۔ "اور کوسومی خود کیا

بن سکتی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ اسے کچھ نہیں بننا ہوتا۔ وہ ایسے ہی پرم اگوا ہے۔"

یہ پرم اگوا اور بلند رتبہ ہوگا۔ بہر حال میں نے کہا۔ "چلو پرم اگوا ہے۔ وہ پروہ تمہیں کوئی طاقت کیسے دے پائی۔ کیا وہ جگ ماتا ہے یا ایسی ہی کچھ۔ وہ چھوٹی سی لڑکی؟"

مورنی نے بے چینی سے مجھے دیکھا۔ "تم اس کے لیے یہ سب کیوں کہہ رہے ہو شیر علی' اتنے کڑوے پن سے اس کی بات مت کرو۔ وہ ہم سب سے پیار کرتی ہے۔ ہم سب اس سے پیار کرتے ہیں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر چھو لیا۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح وہ ایک دوسرے کو منا لیتے ہیں۔ مورنی کا رنج دور ہو گیا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔

کہنے لگی۔ "بابا کے کٹم کنبے میں پیدا ہو کے اس میں آپی آپ یہ تج آگیا کہ وہ کسی کو کایا بدلنے کی ودیا (علم) دے سکتی ہے۔ میں ایک کو اور جانتی ہوں جسے کوسومی نے یہ ودیا ارپن کی ہے۔ یہ مت پوچھنا' وہ دوسرا کون ہے۔ یہ بات جان کر اپنی اور اس کی جان کو تم کیوں چھ سات کی گنتی کے جوکھ میں ڈالو۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مگر تم نے ابھی کہا "دوسرا" کون ہے تو ایک بات میں سمجھ گیا کہ وہ دوسرا کوئی مرد ہے۔ عورت نہیں ہو سکتی ورنہ تم دوسری کا لفظ کہتیں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اس بھروسے مت رہنا سردار۔ میری بات اس طرح بھی ہوتی ہے اور اس طرح بھی۔"

مورنی نے بہت کام کی باتیں بتائی تھیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ سردار قبیلہ کے خاندان میں پیدا ہونے والا یہ صلاحیت اور اختیار لے کر پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مناسب اور رضامند شخص کو کایا بدلنے کی طاقت بخش دے۔ کوسومی نے اس لڑکی مورنی کو اور ایک کسی اور کو یہ شکتی ارپن کی ہے یا اپنے لفظوں میں یہ طاقت دی ہے کہ وہ انسان سے جانور اور جانور سے انسان بن سکتا ہے۔ لڑکی مورنی کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم تھا کہ کوسومی نے ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی کسی اور کو کایا بدلنے کی شکتی ارپن کی ہے یا نہیں۔ اس لڑکی کو شاید یہ بھی علم نہ ہوگا کہ بڑے میاں نے کس کس کو یہ تحفہ دیا۔ مطلب میرے علاوہ اور کس کس کو دیا۔

میں نے پوچھا۔ "بابا نے اور کسے یہ علم دیا ہے؟"

وہ بولی۔ "کسی اور کا نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو نام نہ بتاتی تمہیں۔ بس یہ

کہہ دیتی کہ ہاں ایک اور ہے یا دو اور ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے۔" اچانک ایک خیال ذہن میں آیا۔ میں نے پوچھا۔ "کوسومی کے باپ نے بھی کیا یہ علم پھیلایا۔ آگے عطا کیا کسی کو؟"

مورنی کچھ سوچ کر بولی۔ "کوسومی کا باپ دارو پینے کا اور عورت رکھنے کا بڑا رسیا تھا۔ بڑا تیکھا جوان تھا اپنے وقت میں۔ بیوی کے علاوہ بھی عورتوں پہ اپنی چادر ڈالتا پھرتا تھا۔" وہ پھیکے پن سے ہنسی۔ "خود میری ماں تین بار اس کی گاڑی میں بیٹھی۔ میں اور بھائی میرا' دونوں تو اپنے باپ ہی سے پیدا ہیں۔ ایک بھائی ہمارا تھا' مر گیا وہ کوسومی کے باپ سے تھا۔"

میں اس معلومات پر سر ہلا کر ہاں ہی کہہ سکتا تھا۔

مورنی اب کے ذرا اعتماد سے ہنسی۔ "اب تو دونوں ہی مر گئے۔ میری ماں بھی چلی گئی اور کوسومی کا باپ بھی چلا گیا۔ اس لیے بتا رہی ہوں۔ کوسومی کے باپ نے میری ماں کو کایا بدلنا ارپن کیا تھا۔"

مجھے تجسس ہوا۔ "وہ کیا بن سکتی تھی؟"

"آدمی۔"

"آدمی؟ کیا مطلب۔"

"مرد' پہلوان' خوب تگڑا۔"

"اوہ۔" یہ عجیب بات تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ انسان تو وہ تھی ہی' تمہاری ماں نے کسی جانور کا روپ کیوں نہیں لیا؟"

مورنی بولی۔ "کیوں نہیں لیا کا جواب کیا دے سکتی ہوں۔ یہ تو تمہیں پتا ہے کہ آدمی کے گھٹ میں جو جاندار اترا ہوا ہوتا ہے' وہ وہی بن سکتا ہے۔ میری ماں کی کایا میں عورت نہ تھی' نہ کوئی جانور تھا۔ ایک مرد پہلوان چھپا تھا۔ کایا بدلتے وقت وہ پہلوان باہر آتا اور کسی جانور کی طرح اپنے تماشے دکھاتا تھا۔"

"تماشے؟"

کہنے لگی۔ "ہاں' میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ سنا ہے گھنٹے گھنٹے' دو گھنٹے میری ماں اور کوسومی کا باپ کشتی لڑتے رہتے تھے۔ وہ پہلوان میری ماں کو خوب اٹھا اٹھا کے پھینکتا یا پھینکتی تھی اسے۔ کبھی تو دو دو دن ہلدی چونا تھوپے پڑا رہتا تھا کوسومی کا باپ......" وہ ہنسی۔ "جاننے والے دو تین اور تھے" اسے دیکھ دیکھ کر تھو تھو کرتے تھے۔

خبر نہیں کیوں۔"

"عورت سے مار کھاتا تھا' شاید اس لیے۔"

مورنی ہنس پڑی۔ "اگر اسے پہلوان بننا نہیں ملتا' وہ گھوڑی' ہتھنی یا سانڈنی بنتی تو بھی کوسومی کے باپ سے تگڑی ہی پڑتی۔ وہ تھی ہی ایسی بھاری بھر کم مزاج کی۔"

"کیسے بھاری بھر کم مزاج کی؟"

مورنی نے شرما کے بلکہ شرمندہ ہو کے بتایا کہ اس کی ماں دھان پان کی عورت تھی مگر دارو بہت پیتی تھی۔ نشے میں ہو جاتی تو بک بک کرتی تھی اور مورنی کے باپ کو گاڑی سے دھکے دے کے نکال دیتی تھی۔ کئی بار اٹھا کے بھی پھینکا تھا اسے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہو گیا تھا اسے؟ بیمار ہو گیا تھا کیا؟"

اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ میں نے ناحق اس سے یہ سوال کیا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ سر اٹھا کر مسکرانے لگی۔ بولی "ماں نے ایک روز الاؤ کے آس پاس جب پورا قبیلہ اکٹھا تھا نشے میں آ کے اپنی جون بدلی اور پہلوان بن گئی۔ کوئی جشن رت جگا تھا۔ سو دو سو آدمی الاؤ پہ گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب نے ماں کو عورت سے کڑیل جوان پہلوان بنتے دیکھا۔ ڈر گئے۔ بہت سے اپنی گاڑیوں' چھولداریوں میں چلے گئے۔ میرا باپ سمجھو' صدمے سے مرتے مرتے بچا۔ کوسومی کے باپ نے ماں کو میری سنبھالا۔ اسے اپنی گاڑی میں لے جا کے بند کر دیا۔ رات بھر قبیلے میں جگار رہی۔ جنہیں کایا بدل کی خبر نہیں تھی' وہ پریشان تھے۔ جنہیں خبر تھی' وہ بابا کو ڈھونڈنے نکل گئے کہ شاید بابا کوئی اتار' کوئی علاج کر سکے۔ دو چار دشمن تھے ہمارے' وہ بک بک کرنے لگے کہ ماں جادوگرنی ہے' اسے الاؤ میں زندہ ڈال دو۔ کوسومی کا باپ میری ماں کو اپنی گاڑی میں ادھر سے نکال لے گیا۔"

مورنی خاموش ہو گئی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی' اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

آخر خود ہی بولی۔ "دوسرے دن جیسے جیسے سورج ڈوبتا گیا' ماں پیلی پڑتی گئی۔ ادھر تم لوگ کی مغرب کی بانگ ہوئی۔ ادھر بتاتے ہیں ماں ختم ہو گئی۔ شراب نے مار دیا اسے۔ نہ اتنی پیتی' نہ بے قابو ہو کے سب دنیا کے سامنے کایا بدلتی۔"

کچھ دیر مورنی جھکی ہوئی ہاتھ سے چادر کی سلوٹیں دور کرتی رہی۔ خاموش بیٹھی رہی' پھر بولی۔ "بہت چھوٹی تھی میں۔ اسے جان ہی نہ پائی۔ نہ اپنے باپ کو جان پائی یہ سنا ہے ماں کے بعد مہینہ ڈیڑھ اور جیا وہ بیمار ہو کے مر گیا وہ بھی۔"

مورنی اب دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ یہ بظاہر بے فکر لڑکی' ہر دم ہنسنے والی' کیسے دکھ' کتنی محرومیاں چھپائے بیٹھی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر تسلی دی۔ اس کا سر تھپکا۔ وہ میرے سینے سے آ لگی' سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

مراقبے والے بڑے کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا اور ایک لڑکی باورچیوں کا اپرن کمر سے باندھے لکڑی کا بڑا سا پیالہ اٹھائے اندر آئی۔ اس نے مورنی کو میرے سینے سے لگے دیکھا اور مسکرائی۔ میں نے آہستہ سے اسے خود سے دور کیا تو آنے والی لڑکی نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے' اس کا مسکرانا بند ہو گیا۔ وہ پیالہ اٹھائے میرے پاس آئی۔ میری طرف بڑھا کر بولی۔ "لمبی پھلیوں کا شوربہ ہے۔ مکئی کا دلیہ پڑا ہے پی لو۔ تھوڑا سا اسے بھی پلا دینا۔ خوش رہے گی' خوش کرے گی۔"

اس نے مورنی کی طرف اشارہ کیا تھا اور پھر مسکرائی تھی۔ عجیب بات کہی تھی س نے۔

میں نے سنجیدہ صورت بنائے اس کی طرف دیکھا تو مسکرانا بند کر کے وہ رازدارانہ کہنے لگی۔ "تمہیں شاید خبر نہ ہو' اسے مورنی کو تو خیر پتا ہے کہ دھیان والے کمرے میں کوئی اکیلا سو تو سکتا ہے پر دو کے' عورت مرد کے رہنے بسنے کی سمائی نہیں ہے۔ اگر تم نے اس پہ اپنی چادر ڈال دی ہے تو آگوا سے کہہ کے کوئی کمرہ لے لینا' وہاں رہنا بسنا دونوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگی' پھر ذرا رک کر بولی۔ "ابھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔ بولو تو ادھر کوئی کمرہ تلاش کر کے رکھوں۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ کیا بے وقوف لڑکی ہے۔ میں نے کہا۔ "رکو۔ وہ مڑ گئی۔" "یہ تم کیا بک بک کر کے چلی ہو۔" میں نے مورنی کو مخاطب کیا۔ "مورنی۔ یہ لڑکی کیوں ایسی بے کار باتیں کر کے جا رہی ہے۔ کون ہے یہ؟"

مورنی نے سر اٹھا کے دیکھا۔ نرمی سے اس سے کہا۔ "سنو۔ تمہاری سمجھ میں جو نہ آئے' وہ پوچھ لیا کرو۔ ناسمجھی کی باتیں کیوں سوچتی اور کہتی ہو؟"

مورنی اگرچہ ڈانٹ رہی تھی تو یہ بالکل بے اثر ڈانٹ تھی۔

لڑکی نے اس کی بات سنی۔ مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور ہال سے نکل ئی۔

میرا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے مورنی سے کہا۔ "جاتے ہوئے یہ شوربہ

ودر بہ لیتی جانا' میں نہیں پیئوں گا۔"

مورنی بولی۔ "تم ابھی تک خفا ہو اس سے؟ وہ اچھی لڑکی ہے۔ قافلہ واپس آلے تو یہ میرے بھائی کی بیوی بن جائے گی۔"

میں نے سوچا ابھی سے یہ مورنی کے آس پاس تہمتوں اور افواہوں کا جال بن رہی ہے۔ شادی کے بعد خدا معلوم کیا کرے گی۔ مورنی بہت دیر تک مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ لڑکی بس یہی تو یاد دلا رہی تھی کہ دھیان تپسیا کا یہ کمرہ شدھ (پاک صاف) جگہوں میں شامل ہے۔ یہاں ایک دوسرے کو دل سے مانے ہوئے مرد عورت بھی نہ سو سکتے اور نہ رہ بس سکتے ہیں۔

میں نے کہا' میں تمہارے طریقوں پر نکتہ چینی نہیں کرتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے قبیلے کے دستور بنانے والے بڑوں نے ہر نوجوان لڑکا لڑکی کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے اور کامی بوڑھوں کی بھی رسی دراز کر دی ہے جو جس کی گاڑی میں اس کی چادر اوپر لے کے رہ پڑے' سمجھو اس کا جوڑا بن گیا۔

مورنی خندہ پیشانی سے میری یہ بات سنتی رہی۔ پھر بولی کہ شاید آگے کبھی تمہیں ہمارے اس قبیلے کے سینکڑوں برس کے حالات سننے کا موقع ملے گا۔ سمراٹوں مہاراجوں اور پھر جاگیرداروں' حاکموں نے ایک ایک وقت میں قبیلے کے ہزار ہزار دو دو ہزار کڑیل جوان مردوں کو مار گرایا ہے۔ ہم چار چار مہینے کھلے آسمان تلے پڑے رہے ہیں۔ ہر دھرم کے طاقتور لوگوں نے گھیرا ڈال کر ہمیں پکڑنا اور اپنے دھرم میں شامل کرنا چاہا ہے۔ انگریز مشنریوں نے تو ہمارے بچوں کو کھیدا کر کے جال ڈال کے پکڑا ہے اور اپنے مشنری یتیم خانوں میں پال پوس کے اپنے دھرم میں اٹھایا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ آٹھ سو جانور کے قبیلے میں صرف سترہ جوان مرد بچے تھے۔ باقی بچے' بوڑھے' مرد اور مختلف عمروں کی عورتیں تھیں۔ قبیلہ ختم ہی ہو گیا تھا۔ اگر ہم اپنے شادی بیاہ اور پیدائش کے طور طریقوں کو اور اپنی رسموں کو اپنی ضرورت کے حساب سے نہ بناتے۔

میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔

میں نے سوچا' میرا طرز زندگی میری اپنی تاریخ سے ابھرا ہے۔ وہ اگر ایسا ہی شکار کیا ہوا قبیلہ ہے تو ہو سکتا ہے اسی شدت اور ظلم کے زمانے میں کسی ریاضت والے فقیر' سادھو یا ساحر نے کایا بدلنے کی قوت حاصل کی ہو گی اور اسے محدود طرز پر اپنے گھرانے میں اپنے اعتماد کے لوگوں میں پھیلا دیا ہو گا۔ ظلم و جور سے بچنے' خود کو زندہ رکھنے

کے لیے۔

ٹھیک تو ہے یہ ان کے زندہ رہنے کی ایک سبیل تھی۔ کایا بدلنے کا یہ علم کوئی لیل تماشا جادوگری نہیں تھا۔

میں نے ان لوگوں پر سختی سے فیصلہ دیا تھا اور میں نے یہ فیصلہ بغیر جانے سنا دیا فا۔ ٹھیک تو ہے۔ میں ان کے عذاب کس طرح جان سکتا' اگر مورنی اپنی سادہ دلیلوں سے لھے قائل نہ کر لیتی۔

میں نے کہا۔ "مورنی مجھے ابھی کوسومی کے پاس لے چلو۔ میں اسے منانا چاہتا ں۔ اس سے کچھ اچھی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

مورنی جو تھکی ماندی سی پیال کے گدے پر آلیٹی تھی' مستعدی سے اٹھ کھڑی ئی۔ بولی۔ "ابھی لو۔ میں کہہ آتی ہوں کہ تم اس کے پاس آ رہے ہو۔" اور وہ تیر کی رح کمرے سے نکل گئی۔

وہ اب پہلے والی مورنی تھی۔ بجلی کی طرح سبک رفتار اور مستعد۔

وہ دو تین منٹ میں لوٹ آئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میری کلائی تھامی' ٹھیک ے پاپوشیں پہننے کا موقع بھی نہ دیا اور مجھے کھینچ کر لے چلی۔

مراقبے دھیان کے کمرے کے باہر برآمدہ سنسان تھا۔ وہ بے آواز اس ہداری سے گزرتی کوسومی کے دروازے پر لے گئی اور مجھے اندر دھکا دے کر دروازہ ـڑتی خود دھیمی آواز میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔

کوسومی کے کمرے میں نئے کھلے ہوئے کنول کے پھول کی مہک تھی اور ساتھ ہی اگر بتی کی دھیمی خوشبو بھی۔ کمرے میں ایک سادہ اور بڑی سی چوکی' ایک کرسی اور لتابوں کی چھوٹی الماری کل اتنی چیزیں تھیں۔ روشنی اور ہوا یہاں بھی اس طرح نامعلوم ور کم معلوم ماخذ سے آ رہی تھی۔ کسی قسم کی گھٹن یہاں نہیں تھی لیکن یہاں کی تازگی بھی نامانوس سی تھی۔ جیسے کسی کیمیاوی طریقے سے ہوا صاف کی گئی ہو۔

جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا' کوسومی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ "آؤ مل اب تک اس بات سے دکھی ہوں کہ تم سے کڑوی بات کہہ کر چلی آئی تھی۔ اب تم زد آ گئے۔ یہ تمہاری بڑائی ہے۔ میں معافی مانگنے آنے والی تھی مگر تم بازی لے گئے۔"

میں نے کہا۔ "کوسومی۔ وہار میں رہ کے تم دنیا ترک کر دینے والوں کی سی زبان لنے لگی ہو۔ غلطی میری تھی اور میں عذر پیش کرنے' اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے آیا

ہوں۔ معافی دینے کا حق تمہارا ہے۔"

وہ ہلکے سے ہنسی۔ 'جو تم اس وقت بولتے ہو' اصل میں تو بھکشوؤں جیسی زبان ہے۔ خیر اچھی بات ہے۔ اگر غلطی تمہاری تو میں معاف کرتی ہوں لیکن غلطی کیونکہ مجھ سے ہوئی تھی' اس لیے اب معاف کر دو۔"

کوسومی نے یہ کہتے ہوئے بڑھ کر میرے سر کو ہاتھ لگایا تھا۔ وہ مجھے منا رہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور سفید تال کنول کی بھینی خوشبو سے جیسے میں سرور میں آ گیا تھا۔

وہ اچانک بولی۔ "تم نے لمبی پھلیوں کا شوربہ نہیں لیا۔ آؤ میرے ساتھ رسوئی گھر میں چلو۔ وہاں ہم دونوں کے اٹھنے بیٹھنے ٹہلنے کے لیے بہت جگہ ہے۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی کمرے سے نکل گئی۔

وہ مجھے راہداری سے گزارتی' سیڑھیاں چڑھاتی دو منزل اوپر لے گئی۔ یہاں دن کی روشنی اور تازہ ہوا تھی۔

میں خوشبو اور خواب کے کاندھوں پر اڑتا وہاں تک پہنچا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ کوسومی کے ساتھ تھا۔

وہار کا رسوئی گھر اچھا خاصا فیکٹری کا چھپرا سا لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ چولہوں کی قطار تھی۔ بند الماریاں اور کھلے ریک تھے۔ ریک جگمگاتے پیتل کے اور قلعی کی گئی کانسی اور تانبے کے برتنوں سے جگمگا رہے تھے۔

وہی لڑکی جو مراقبے کے کمرے میں شوربہ لے کر آئی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھ دو اور لڑکیاں ایپرن باندھے کچن میں مصروف تھیں۔ شوربہ لانے والی لڑکی نے میری طرف شوخی سے دیکھا تھا اور کوسومی کے کسی اور کی طرف متوجہ ہونے پر اشارہ کیا تھا۔ اس نے ہاتھ اپنے سر کو لگا کر میری طرف بڑھا دیا تھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی گھوم گئی۔ میں سمجھ گیا' وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہے اور مجھے منانے کا اشارہ کر رہی ہے۔

میں زیر لب مسکرایا۔ یہ نوجوان کپٹ اور کینہ رکھنا نہیں جانتے۔

کوسومی مجھے لیے ہوئے ایک کھلے فراخ دریچے کے سامنے آئی۔ بولی "شیر علی! تم نے یہاں سے ہمارے اناروں کا باغ نہیں دیکھا تو سمجھو کسی بہت بڑی نیکی سے محروم رہ گئے۔ اس وقت انار پھول پر آئے ہوئے ہیں اور......"

ایک زبردست دھماکہ ہوا اور گولی میرے اور کوسومی کے درمیان کی خالی جگہ

سے گزرتی برتنوں کے ریک میں جا لگی۔

میں نے کوسومی کا ہاتھ پکڑ کر جھکاتے ہوئے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چیخ کر رسوئی میں موجود دوسری لڑکیوں سے بیٹھ جانے کو کہا تھا۔

ہم اس دریچے کی طرف رخ کیے ہوئے تھے جس سے کوسومی اناروں کے قطعے دکھانا چاہتی تھی کہ دوسری طرف سے دو فائر ہوئے۔ دونوں فائر ایک ڈیڑھ بالشت سے مس ہو گئے ورنہ اس وقت یہ کہانی سنانے کو میں موجود نہ ہوتا۔

کوئی مجھے پہچانتا تھا اور نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

کوسومی کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں لیٹ گیا اور فرش پر پھسلتے ہوئے میں نے رسوئی گھر کے ایک ایسے گوشے میں پناہ لے لی جسے کہیں سے زد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔

کوسومی میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے رسوئی گھر کے صاف ہموار' پتھریلے فرش پر میرے برابر لیٹی تھی۔ وہ اس اچانک حملے سے کچھ پریشان ضرور ہو گئی تھی مگر خاصے سنبھلے ہوئے انداز میں حملے کا سامنا کر رہی تھی۔

وہ کہنے لگی۔ "ہم اس وہم میں تھے کہ انہیں تمہارے آنے کی خبر نہیں ہوئی' پر وہ اس عرصے میں گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ وار کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں تھے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ہوا جو دن کی روشنی میں خبر لگ گئی۔ وہ اگر ذرا بھی سمجھدار ہوتے تو اس وقت سامنے نہ آتے۔ رات ہی میں جو کرنا تھا کرتے۔"

کوسومی بولی۔ "وہ رات میں وہار کے اس حصے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سب کچھ ٹھوس چٹانوں میں بنا ہے اور داخلے کا رستہ انہیں نہیں معلوم' معلوم ہو بھی جائے تو اسے اڑانے توڑنے میں کم سے کم دو ہفتے لگیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ صرف مجھے ہٹ کرنا چاہتے ہیں۔ باقی تم لوگوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔"

وہ کہنے لگی۔ "شاید۔"

ابھی کوسومی کا کہا ہوا لفظ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ہمارے سامنے سے اور عقب سے تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔

کوئی گولی دیوار سے ٹکرا کر پاس آ گری ہو گی یا پتھر کی کرچیاں رسوئی میں کام کرنے والی لڑکیوں پر گری ہوں گی تو وہ خوف سے چیخنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ "کوئی زخمی تو نہیں ہوئی؟"

لڑکیوں نے بتایا کہ نہیں مگر وہ بہت خوف زدہ تھیں۔ کوسومی نے کہا وہ تینوں فرش پر رینگتی ہوئی نچلی منزل میں چلی جائیں۔ ہم ان کے پیچھے آتے ہیں مگر وہ کوسومی کو چھوڑ کر جانے پر تیار نہیں تھیں۔

ابھی معاملہ طے بھی نہ ہوا تھا کہ گھاس کے میدان کی طرف کھلنے والے دریچوں میں سے کسی ایک دریچے سے ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبا اڑتا ہوا آیا اور رسوئی کے بیچوں بیچ فرش پر لڑھکنے لگا۔ ڈبے سے دھوئیں کی پتلی لکیر نکل رہی تھی۔ آنسو گیس۔

میں جھپٹ کر بڑھا اور خود کو ہوا کے رخ پر رکھتے ہوئے فرش پر لیٹے لیٹے ڈبے کو اٹھا کر کھلے دریچے سے نیچے لان پر پھینک دیا۔

کوسومی نے لڑکیوں سے درشتی سے کہا۔ "جاؤ۔" میں نے دیکھا وہ رینگتی ہوئی رسوئی سے باہر جا رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں خوف اور شرمندگی سے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ مورنی کی ہونے والی بھاوج انہیں سمجھا رہی تھی۔

دو تین منٹ تک عقب سے اور سامنے لان کے رخ سے گولیوں کی بوچھار آتی رہی۔ رسوئی گھر کی الماریاں اور برتن ٹوٹنا شروع ہوگئے۔

پھر لان کی طرف سے گونج دار آواز آئی جیسے کوئی مائیکروفون ٹیسٹ کر رہا ہو۔ جی ہاں یہ مائیکروفون ہی تھا۔ لمحے بھر بعد بھاری اجڈ سی آواز نے لاؤڈ اسپیکر پر کہا۔ "لڑکیوں کے ہاسٹل میں ایک بھاگا ہوا قیدی چھپا ہے۔ ہاسٹل کی اگوا کو چاہیے اسے سرکاری فوج کے حوالے کر دے۔ یا وہ خود اپنی ساتھی لڑکیوں کو لے کر نیچے چلی جائے۔ ہم آرہے ہیں۔"

کوسومی نے میری طرف دیکھا۔ بولی۔ "فوج والے اب تک تو اپنی کارروائی میں لگے تھے وہ کالج اور ہاسٹل کی عمارتوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اب انہیں تمہاری تلاش ہے___ لگتا ہے جسگمے ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ یہ بھاگے ہوئے قیدی والی لائن اسی کی دی ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسے کہہ سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "جسگمے کو تمہارے مانگ یان آنے کی خبر ہوئی ہے اتنا تو ہمیں پتا ہے۔ تم نے 'مورنی نے اور دوسروں نے اسے ذلیل کر کے قافلے سے نکال دیا اور سردار کی گاڑی لے کر یہاں آئے؟ تو اسے کالج کے خلاف اپنا منصوبہ ناکام ہوتا دکھائی دیا اس لیے اس نے فوج سے ہاتھ ملا لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "برمی فوج آخر جسگمے کی ہم نوائی کیوں کر رہی ہے؟"

کوسومی نے کہا۔ "جسگمے چھوڑ وہ خود شیطان سے بھی ہاتھ ملا لیتے ہیں۔ سرکاری فوج کو تو کسی طرح مانگ یان کالج پر قبضہ کرنا ہے۔ اب جبکہ جسگمے نے انہیں گولی چلا کے کالج میں گھسنے کا موقع دیا ہے تو وہ اسے استعمال کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس حالت میں کہ جسگمے نے یا اس کے آدمیوں نے دو سرکاری آدمی مارے ہیں؟ فوج کیا یہ بات نہیں جانتی؟"

کوسومی نے کہا۔ "وہ دو کیا دس آدمی بھی مار دیتا تو برمی فوج اس موقع سے فائدہ اٹھاتی۔ جسگمے سے ہاتھ ضرور ملاتی۔"

لاؤڈ اسپیکر پر پھر اسی اجڈ آواز میں کہا گیا۔ "سنو یہ اعلان اگوا کے لیے بھی ہے۔ ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی سب لڑکیوں کے لیے بھی ہے اگر دس منٹ کے اندر اندر لڑکیاں نیچے اپنے اپنے کمروں میں نہیں گئیں تو ہو سکتا ہے ہماری کارروائی سے ان کو نقصان پہنچ جائے۔ یہ آخری وارننگ ہے اگر ہاسٹل کی اگوا ہماری بات پر توجہ کرتی ہے تو اچھی بات ہے اگر وہ ہمارے اعلان کو اہمیت نہیں دیتی تو لڑکیوں کو خود اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سب لڑکیاں نیچے چلی جائیں۔ ہم نو منٹ میں ہاسٹل میں داخل ہو جائیں گے۔"

پھر منٹ بھر کے بعد اعلان کیا گیا۔ "آٹھ منٹ بعد ہم ہاسٹل میں داخل ہونے کی کارروائی کریں گے۔"

اگلا اعلان انگریزی اور برمی زبان مین تھا۔ اجڈ آواز والے نے براہ راست مجھے مخاطب کیا تھا۔ "رنگون جیل سے بھاگے ہوئے قیدی شیر خان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ معصوم بے قصور لڑکیوں کو یرغمال بنائے رکھنے سے باز رہے۔ خود کو برمی فوج کے حوالے کر دے۔ ہم قانون میں رہتے ہوئے ہر ممکن سہولت دیں گے۔ برمی قانون کے مطابق اسے سرکاری خرچ پر وکیل دیا جائے گا۔"

پھر لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے برمی میں یہی بات کہی۔ آخر میں وہ بولا۔ "میں مانگ یان کی جامع مسجد کا پیش امام مولانا زنگون میاں___ (پاسان گور میاں) بولتا ہوں۔ شیر علی تم موسلمان ہے اللہ تعالیٰ کا شکر کرو اور خود کو آرمی کے حوالے کر دو۔" پھر مولوی سانگور یا زانگور میاں نے قرآن کریم کی وہ آیت پڑھی جس میں خدا اور رسول ﷺ اور ولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

اس کے بعد برمی فوج نے بہت بڑی حماقت کی کہ مائیکروفون جسگمے کے

حوالے کر دیا۔ اس نے دینی قبائلی برمی زبان میں کوسومی کو بھتیجی کہہ کر بلایا اور
اسے خبر دی کہ شیر علی مسلمان نے ہم لوگ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے تیرے
دادا اور میرے بوڑھے سردار کو میری آنکھوں کے سامنے خنجر مار کر ہلاک کیا ہے اور
مورنی کے بھائی کو بھی سازش میں شریک کر کے اسی وقت بڑے بوڑھے سردار کا کریا
کرم بھی کر دیا۔ تجھے اس کا دیدار نہیں کرنے دیا۔ اس لیے کوسومی میری پیاری بھتیجی تو
اس بدمعاش شیر علی کو جو تجھے اور دوسری لڑکیوں کو فرض کے خلاف روکے ہوئے ہے
فوراً فوجی حکام کے حوالے کر دے اور میرے اور فوج کے ہاتھ مضبوط کر۔"

حسنگھے نے یہ احمقانہ اعلان' جس کی کوئی ایک کل بھی سیدھی نہیں تھی' کرنے
کے بعد فوجیوں کو مائیکروفون دے دیا جنھوں نے اعلان کیا کہ وہ پانچ منٹ بعد ہاسٹل میں
داخل ہو جائیں گے اور نقصان کی تمام ذمے داری ہاسٹل کی لڑکیوں پر ہو گی جو فوج کے
ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتیں۔

وہ لوگ سیاست' عیاری' جھوٹ اور فوجی حکمت عملی سب کو ملا جلا کر دھوکا دینا
اور کسی طرح مجھے قابو میں کرنا چاہتے تھے مگر۔

کوسومی نے کہا۔ "ان کی بکواس مت سنو وہ ہمیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ہمارے
پاس خوراک کا ذخیرہ ہے۔ پروا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ان کے پاس وقت ہی وقت ہے اور وقت ہمارا دشمن ہے
کوسومی۔ وہی ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ چھاؤنی ڈال کر یہاں پڑے رہیں گے ہمارا خوراک
کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور ہم دروازے کھول دیں گے۔"

کوسومی سوچ میں پڑ گئی۔ کوئی پانچ چھے منٹ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے
پھر دونوں طرف سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ کسی مقصد کے بغیر انہوں نے آنسو
گیس کا ایک شیل اور پھینکا تھا۔ میں نے اسے بھی واپس انہی کی طرف اچھال دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ میرا اچھالا ہوا شیل اب ان کے اس مورچے میں جا گرا جو انار
کے جھنڈ کے پیچھے انہوں نے قائم کر رکھا تھا۔ اس طرف کی فائرنگ بند ہو گئی اور وہ ہڑبڑا
کر برمی میں مجھے گالیاں دیتے ہوئے باہر لان پر نکل آئے۔ ہماری طرف سے خبر نہیں
کس نے پے در پے دو فائر داغ دیے وردی والوں کی مدد کرنے والے قبائلیوں میں سے
ایک جو انار کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میں آ گیا تھا۔ ہمارے فائر سے زخمی ہو کر گرا۔
فائر سے پناہ لینے کے ارادے سے وردی والے ایک دوسرے ہی کنج میں جا چھپے

اور وہاں سے ہماری طرف گولیاں چلانے لگے۔ انہوں نے حسنگھے کے اس ساتھی کو بے
یار و مددگار چھوڑ دیا تھا جو ٹانگ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور اب کھلے لان پر بے بسی
کے عالم میں پڑا ڈکراتا تھا اور کبھی گالی دے کر کبھی گھگیا کر فوج والوں کو مدد کے لیے بلاتا
تھا۔

وردی والوں میں سے ایک کو شرم آئی ہو گی تو وہ بہت زبردست کورنگ فائر
سے مدد لیتا ہوا جھپٹ کر اپنی نئی پناہ گاہ سے نکلا اور زخمی قبائلی کو ہاتھ سے پکڑ کر لان پر
کھینچتا ہوا واپس لے چلا۔

ہماری طرف سے فائر کرنے والا کوئی بہت ہی ہوشیار اور بے خوف بندوقچی
تھا۔ اس نے فوجیوں کی طرف سے اتنے بھاری کورنگ فائر کے باوجود پناہ گاہ کی طرف
واپس جاتے ان دو فوجیوں پر پھر فائر کیے۔

زخمی قبائلی کو اس بار سر میں گولی لگی اور اسے مصیبت سے نجات مل گئی۔ قبائلی
کے گولی لگتے ہی فوجی نے اس کا بے جان ہاتھ چھوڑ دیا اور بھاگ کر اپنی نئی کمین گاہ میں جا
چھپا۔

میں نے کوسومی سے پوچھا۔ "یہ ہماری طرف سے فائر کس نے کیا تھا؟"
کہنے لگی۔ "معلوم نہیں ____ آؤ پتا کرتے ہیں۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رسوئی کے ہموار فرش پر رینگتے ہوئے
ڈھکی ہوئی سیڑھیوں پر آئے اور وہاں سے تقریباً دوڑتے ہوئے نیچے وہار کی محفوظ دنیا میں
پہنچ گئے۔

کمروں کے سامنے لڑکیاں کھڑی تھیں اور تشویش سے ہمیں آتا دیکھ رہی
تھیں۔

لڑکیوں میں نئی اور پرانی سبھی تھیں۔ پورا برآمدہ خاموش کھڑی لڑکیوں سے
بھرا تھا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں جائزہ لیا۔ مورنی اور بیالا اس ہجوم میں نہیں
تھیں۔

کوسومی نے مجھے اشارہ کیا اور کھچا کھچ بھرے برآمدے میں راستہ بناتی وہ ایک
طرف چل پڑی۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھے اور لان کی طرف کھلنے
والی ایک گیلری میں نکل آئے۔ یہاں گیلری میں کوئی لڑکی گھٹنوں کے بل رائفل
سنبھالے بیٹھی تھی اور فوج کے نئے مورچوں کی طرف اپنی دوربین سے درختوں کے

جھنڈ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہماری آہٹ سن کر وہ تڑپ کر پلٹی۔

یہ مورنی تھی۔ وہ مجھے اور کوسومی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ کوسومی نے پوچھا۔ "بیالا کہاں ہے؟"

مورنی نے گیلری سے آگے مورچوں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں۔"

"خدایا۔ وہ لڑکی بیالا ان کے قابو میں آگئی۔ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جسے ابھی میں نے گولی مار کے ٹھنڈا کیا ہے جھنگے کے پیچھے 'اس کمینے کو میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ وہ بیالا کو ہتھکڑی لگا کے منہ باندھ کے لایا تھا۔ انار کے اس مورچے میں لایا تھا کتے کا جنا۔"

کوسومی نے پوچھا۔ "انہوں نے کیوں___؟ انہوں نے بیالا کو کیوں پکڑا ہے؟ اسے یہاں مورچے میں کیوں لائے ہیں؟"

مورنی نے کہا۔ "سودے بازی کرنا چاہتے ہوں گے___ یا___"

"یا کیا؟" کوسومی نے پوچھا۔

"یا حرام کے جنے بیالا کو خراب کرنے لائے ہوں گے۔"

کوسومی کے لہجے میں بہت بے اعتباری تھی۔ "یہ___ کیسے ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔"

میں نے کہا۔ "نہیں کوسومی! میں جانتا ہوں۔ اس طرح کی فوج سب کچھ کر سکتی ہے۔"

کوسومی جو عام طور پر خود کو وقار کے ساتھ اور پرسکون رکھتی تھی ایک دم مورنی کی طرف مڑی۔ "تم نے اچھا کیا اس بے غیرت کو گولی مار دی۔ لاؤ دوربین دو مجھے۔"

مورنی نے اسے دوربین پکڑا دی۔ کوسومی کچھ دیر تک مورچے میں اور اس کے گردوپیش دیکھتی رہی پھر اس نے دوربین میرے حوالے کر دی اور مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں۔"

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور اگلے ہی لمحے شرم اور غصے میں جیسے لرز کر رہ گیا۔ انہوں نے انار کے چھدرے جھنڈ کے پار ریت کی بوریاں جما کر اپنی گن پوزیشن بنائی تھی۔ ریت بھری بوریوں پر انہوں نے کچھ ڈال رکھا تھا۔ ایک نظر میں وہ گلابی رنگ کا کپڑا دکھائی دیتا تھا مگر غور سے دیکھنے پر سمجھ میں آجاتا تھا کہ وہ ایک انسانی جسم

ہے۔ کپڑوں سے عاری___ اور وہ عورت کا جسم تھا۔ وہ بیالا بائے کا زندہ بدن تھا۔

ان کتوں کو معلوم تھا کہ گیلری کی اس پوزیشن پر جو بھی رائفل لیے بیٹھا ہے' اس کے پاس دوربین ہے۔ وہ دوربین والے کو یہ منظر دکھانا چاہتے تھے۔

لمحے بھر بعد لاؤڈ اسپیکر کی نحوست بھری آواز سنائی دینے لگی' وہی کرخت اجڈ لہجے والا بکواس کر رہا تھا' کہنے لگا۔ "گیلری والے ہمارے دوست کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن سے دوربین لگا کر دیکھ لیں۔ ہماری مجبوری کا انہیں اندازہ ہو جائے گا۔ ہم ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بھاگے ہوئے قیدی شیر خان کو ہمارے حوالے کر دیں اور اس بچی___ کیا نام بیالا بائے کو___ اور دوسری تمام بچیوں کو امتحان میں نہ ڈالیں۔"

میں نے دوربین مورنی کے ہاتھ میں تھما دی ان کی اس بزدلی اور کمینگی پر مجھے متلی ہونے لگی تھی۔ کتے تو پھر باوقار ہوتے ہوں گے وہ سوروں بلکہ ان سے بھی گھناؤنی کسی چیز سے زیادہ گندے اور لعنتی تھے۔

مورنی نے آنکھوں سے دوربین لگا لی تھی۔ اس کا بدن چڑھی ہوئی کمان کی طرح تن گیا تھا اور رائفل کے اسٹوک پر جما ہوا اس کا ہاتھ کسی حملہ آور جانور کی طرح کڑا ہو کر ہلکے سے ایک بار لرز اٹھا۔

پھر اچانک مورنی نے ایک ہاتھ سے دوربین لگائے لگائے رائفل اٹھا کر اپنے کندھے سے نکالی۔

میں نے حملہ کرتے کو برے طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "مورنی کیا کرتی ہو؟"

وہ لرزتی آواز میں بولی۔ "میں اس 'اس بزدل' کتے کو ہٹ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اس پر حاوی آگیا ہے۔"

میں نے اس کے رائفل والے ہاتھ کو گیلری کی ریلنگ پر دبا دیا۔ "پاگل ہوئی ہو فائر مت کرو۔ اتنی دور سے گولی اسے نہیں لگ سکتی بیالا کے لگ سکتی ہے گولی۔"

لاؤڈ اسپیکر پر جیسے اپنی ذلالت کی رننگ کمنٹری کرتے ہوئے اس کرخت آواز والے نے کہا۔ "گیلری والے ہمارے دوست نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہم نے کس طرح اس بچی بیالا کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنے ایک والنٹیئر کو بیالا کی نہایت پرسنل ضرورت کی تکمیل کے لیے خطرے تک میں جھونک دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں گیلری سے ہمارے اس والنٹیئر کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے لیکن اٹھارہویں گڑوں گھال ڈویژن کی پہلی ترچنار جنٹ کے یہ جوان___ یہ پرعزم جوان خطروں سے کھیل___"

میرے ذہن کی رو بھٹک گئی تھی اور میں اس گراوٹ کو کہ جس تک مائنگ یان کا گھیراڈالنے والے وہ بزدل جا سکتے تھے' ابھی تک سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ کوسومی نے تڑپ کر رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور میرے اور مورنی کے کچھ کرنے سے پہلے انار کے جھنڈ کی طرف فائر کر دیا۔

کوسومی نے' جو اتنی پرامن' اتنی سنجیدہ اور سوشل لگتی تھی ایک پر تشدد کارروائی کر ڈالی تھی۔ میں حیران رہ گیا____ اور میں بیالا کی طرف سے فکر مند ہو گیا۔ میں نے مورنی کے ہاتھ سے دوربین جھپٹ لی۔

گھیراڈالنے والوں کی پوزیشن پر جیسے آفت آگئی تھی۔ خود کو بندوقچی کی متوقع زد سے بچاتے ہوئے دو تین برمی فوجی اپنے اس ساتھی کو بیالا کے بدن پر سے کھینچ کر ہٹا رہے تھے میں نے خوف زدہ ہو کر دیکھا کہ بیالا کا بے داغ بدن خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس پر سے جس وردی پوش کو کھینچ کر ہٹایا جا رہا تھا وہ بھی خون سے تر تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ خون جس میں بیالا اس وقت تر ہے خدا کرے کہ اس نجس جوان کا خون ہو جو یقیناً کسی اٹھارہویں گھوں گھال ڈویژن کی پہلی ترچنار جمنٹ کے لیے بھی باعث شرم ہو گا۔

پھر اس مورچے سے ایک ایل ایم جی اور بہت سی آٹومیٹک رائفلوں سے فائر ہونے لگے۔ ہم تینوں سیدھی آتی اور اچٹتی گولیوں کی زد سے بچنے کو لیٹ گئے۔ مورنی نے تشویش سے کہا۔ "کوسومی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ غصے میں بیالا کو ختم بھی کر سکتے ہیں۔"

کوسومی بولی۔ "وہ ویسے بھی اسے مار ڈالیں گے۔"

بیالا کے لیے کچھ کرنا ہو گا میں نے سوچا۔ مثلاً کیا کر سکتے ہیں ہم لوگ؟ میں تیزی سے مختلف منصوبے بناتا اور رد کرتا رہا۔

ان کی فائرنگ بند ہوئی تو لاؤڈ اسپیکر کی مکروہ آواز آنے لگی۔ "گیلری والے کو معلوم ہونا چاہیے ہمارا جوان اس کی گولی سے مارا گیا ہے۔ ہماری طرف سے یہ پہلا____ نہیں دوسرا آدمی تھا۔ ایک اور سویلین کو گیلری سے فائر کر کے مار دیا گیا ہے۔ دو کی تعداد ہماری حد ہوتی ہے لہٰذا اب وہ حد آچکی ہے۔ ہم اب اپنا بچاؤ کریں گے۔ اس لیے اس بچی بیالا' کو جسے ہم نے گیلری کی طرف سے آتے فائر سے بچانے کو اپنے مورچے میں پناہ دے رکھی تھی ہم اب افسوس کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں کیونکہ اب ہم اپنا

بچاؤ کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ اس لیے لڑکی بیالا کو بڑے دکھ کے ساتھ اس کے مقدر کے حوالے کر دیں گے اب جو اس بے چاری کے نصیب میں لکھا ہو گا وہ خود بھوگے گی۔"

یہ نہ معلوم کیسا شیطانی منصوبہ تھا جس پر وہ عمل کرنے جا رہے تھے۔ ہم تینوں دم سادھے دیکھتے رہے۔

اچانک ان کے مورچے کی طرف سے چھ آدمی بیالا کو اس حالت میں اٹھائے کہ اس کے بدن پر ایک چیتھڑا نہیں تھا' لان میں لے آئے۔ ایک نے بجلی جیسے تاروں کا گچھا گھاس پر ڈال دیا۔ دوسرے نے ہتھکڑی لگائی ہوئی زنجیروں میں جکڑی "منہ بندھی" مچلتی ہوئی اس بے بس لڑکی کو تاروں کے گچھے پر ڈال دیا' پھر ان میں سے ایک وردی والا تار کا ایک سرا پکڑ کر بھاگتا ہوا واپس مورچے میں کود گیا۔

دوسرے فوجی بھی پلک جھپکتے ہی مورچے میں جا چکے تھے۔ میں نے سوچا یہ فیوز وائر ہو گا۔ اگر اس کے ایک سرے پر آگ لگا دی جائے تو یہ آہستہ آہستہ جلتا ہوا گچھے تک آ جائے گا جہاں انہوں نے بیالا کو ڈال دیا ہے۔ پسینے سے میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ یہ فیوز اگر جلتا ہوا گچھے تک آ گیا تو پھر ایک دھماکے سے پھٹے گا۔ ہو سکتا ہے ان بدمعاشوں نے اسے زیادہ موثر بنانے کو کچھ اور بھی کیا ہو۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ او خدا! یہ بدمعاش ہمارے تصور سے کہیں زیادہ ظالم ہیں۔

انہوں نے بیالا کی بغلوں میں ٹیپ کی مدد سے ڈائنامائٹ کی ایک ایک اسٹک چپکا دی تھی اور پشت کی طرف ہاتھ لے جا کر ہتھکڑی ڈال دی تھی۔

میں نے خاموشی سے دوربین کوسومی کے حوالے کر دی۔ کوسومی نے وہ سب کچھ دیکھ کر دوربین مورنی کو پکڑا دی۔

مورچے کی طرف سے مائکرو فون پر کہا گیا۔ "دیکھو میرے دوست! یہ دھیرے دھیرے جلنے والا فیوز وائر ہے جس کا ایک سرا لے کر ابھی ہمارا ایک شیر دل جوان مورچے میں کود گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ دھیرے دھیرے جلنے والے اس تار کے سرے پر بے دھیانی میں کوئی جوان سگریٹ سلگاتے ہوئے کہیں اپنا لائٹر نہ لگا دے۔ وہ بہت برا ہو گا۔ ہم پوری احتیاط کریں گے پھر بھی اگر ایشور نہ کرے تار کے سرے سے جلتا ہوا لائٹر چھو گیا تو ایسی بھینکر ورگھٹنا____ اتنا بھیانک ایکسیڈنٹ ہو جائے گا کہ چچ' چچ____ چچ____ توبہ' توبہ' توبہ۔ اسی کارن گیلری میں بیٹھے اس دوست سے ہم

ہاتھ باندھ کر بنتی کرتے ہیں کہ لڑکی بیالا کو بچانے کا کوئی سادھن (تدبیر) کرو۔ اس مجرم شیر علی کو اوپر سے دھکا دے کر گرا دو تاکہ قانون پر عمل کرتے ہوئے اسے واپس رنگون کی جیل میں' قانون کی حفاظت میں پہنچا دیا جائے۔"

یہ آواز تنی اشتعال انگیز تھی ___ اس کی کہی ہوئی بات نہیں' بلکہ اس گھگیاتے ہوئے فریبی کی آواز ہی خون میں غصے کی لہریں دوڑا دیتی تھی۔ مورنی سے غصہ ضبط نہ ہو سکا اس نے چیخ کر کہا۔ "نرگ (جہنم) میں جا تو کتے!" اور اس نے ان کی پوزیشن پر پے در پے تین فائر جھونک دیے۔

ایک پٹاخہ سا ہوا اور لاؤڈ سپیکر کی آواز بند ہو گئی۔ لاؤڈ اسپیکر کو گولی نے چھار چھار کر دیا تھا۔

ایک دم ایسا سکون بخش سناٹا ہو گیا کہ میں نے خود اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنی۔ کوسومی آنکھوں سے دوربین لگائے ان لوگوں کے مورچے میں دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے سسکی لی۔ "شیر علی! انہوں نے فیوز کو آگ دکھا دی ہے۔"

اس فاصلے سے بھی ہمیں فیوز کے جلنے کی "سس سس" خوب واضح سنائی دے رہی تھی۔

میں اٹھا اور ایک جست میں گیلری کی ریلنگ پر آ گیا۔ اس بے قصور لڑکی کو اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں خود کو ان کے حوالے کر دوں گا۔

اپنے فیصلے میں اتنا پریقین اور بے پروا ہو گیا تھا کہ میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ مورنی نے اپنی بانہہ پھیلا کر میری ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے جکڑ لی ہیں پھر وہ اپنا سر' شانہ اور بازو ایک جنونی گرفت میں باندھے اور خود کو میری پنڈلیوں' رانوں سے جوڑے لوہے کی ریلنگ سے اس طرح الجھ گئی کہ جست کرنا کجا میرے لیے تو حرکت کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

میں نے غضب ناک آواز میں کہا۔ "مورنی! چھوڑ دے مجھے ___ تو چوٹ کھا جائے گی۔ چھوڑ مجھے۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "مار دے مجھے سردار ___ پر میں تجھے چھوڑوں نی نہیں۔"

میں نے جھٹکا دیا۔ ٹھیک ہے اگر یہ لڑکی باز نہیں آئی تو جو ہو سو ہو۔ جست تو مجھے کرنی ہے ٹھیک ہے اگر میں اسے لے کر گیلری سے گرتا ہوں تو یہ اپنا بچاؤ خود کر لے

گی۔ میں نے جھٹکا دے کر ریلنگ پر اپنے قدم جمائے تھے۔

مگر مورنی کو چوٹ نہیں لگنی چاہیے میں نے سوچا اور مجھے اس کی گرفت سے آزاد بھی ہونا ہے۔

میری اگلی حرکت کا آغاز بھی نہ ہو پایا تھا کہ کوسومی کی سنساتی سرگوشی سنائی دی۔ "شیر علی! رکو! وہاں کچھ ہو رہا ہے۔ مورچے پر کوئی آ گیا ہے۔ چڑھ آیا ہے کوئی۔ دو ہیں۔ اے مالک! یہ تو میرباز ہے اور ___ بیالا کا آدمی ہے۔"

میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ آ گئے ہیں تو پھر مجھے مت روک ___ جانے دے۔ ہم تین ان حرام زادوں سے نمٹ لیں گے۔"

لڑکیوں نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مورچے کی طرف سے ایک دم ایل ایم جی چلی اور ایک لمبے برسٹ کے بعد بند ہو گئی۔ "یاخا" کا نعرہ سنائی دیا۔ یہ ایک بے معنی آوازہ تھا جو میرا دوست میرباز حملے کرتے ہوئے یا خوشی کی مستی میں لگاتا تھا۔

مجھے وہیں کھڑے کھڑے کوسومی نے دوربین تھما دی۔ میں نے ریلنگ پر سے دیکھا کہ میرباز خان' میرا شیر دل دوست' مورچے کی ریت بھری بوریوں پر کھڑا ہے۔ اس نے ایک وردی پوش کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کیا ہوا ہے۔ وردی پوش بے بسی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے کہ میں نے دیکھا۔ میرباز نے نعرہ مارتے ہوئے وردی پوش کو نشانہ سادھ کر جلتے ہوئے فیوز وائر پر پھینک دیا۔

مورچے میں سے ایک ہی فائر ہوا۔ گولی شاید میرباز کے بازو میں لگی تھی۔ وہ بوریوں پر کھڑے کھڑے ہل کر رہ گیا مگر اس نے خود کو سنبھالا اور مورچے سے بہت تکلیف سے کود کر دوڑتا لڑکھڑاتا فیوز کے لچھے پر پڑی بیالا کی طرف بڑھا۔

"میرباز! بریدا۔ ٹھہر جا مڑا۔ ٹھہر میں آتا ہوں۔" میں نے پکار کر کہا مگر مجھے معلوم تھا اس تک میری آواز نہیں پہنچی ہو گی۔

کہیں سے ایک شاٹ گن سے ایک اور اس کے بعد دوسرا فائر کیا گیا۔ ایک فائر مس ہوا۔ دوسرا میرباز کے بائیں پہلو میں لگا۔ ادھر میں نے پیر چلا کر ٹھوکر مارتے ہوئے مورنی کی گرفت سے خود کو آزاد کیا۔

معرکے کی خاموشی میں کوسومی کی پکار سنائی دی۔ "شیر! میں دیکھ رہی ہوں وہ مشین گن ری لوڈ کر رہے ہیں۔ شیر!! انہیں فوراً ہٹا دو۔ گن کے پاس سے ہٹا دو نہیں تو دونوں مارے جاؤ گے۔"

حیرت ہوئی کہ میرے غصیائے ہوئے دماغ میں کوسومی کی اس بات کا مطلب فوراً کھل گیا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا چاہتی ہے۔ میں جان گیا کہ اس وقت صرف دلیری سے کام نہیں چلے گا۔ انہیں مشین گن کے پاس سے فوراً ہٹانا ہوگا۔

میں نے ریلنگ سے ادھر ہی گیلری میں الٹی جست لگائی اور فرش پر جھک کر خود سے کہا۔ "شیر کی کایا میں آ جا شیر علی۔"

پلک جھپکتے میں ایک سیاہ غبار پیدا ہوا اور میں نے فرش پر جمے اپنے انسانی ہاتھوں کو چمکتے تلوار ناخنوں والے شیر پنجوں میں بدلتے دیکھا۔ میں اب ____ شیر نر تھا۔

اگلے ہی لمحے میں گیلری کی فولادی ریلنگ پر تھا اور اس سے اگلے پل جست لگا کر پھلواری کے قطعے میں۔ یہاں سے مورچہ میری ایک جست کی دوری پر تھا۔

میں نے غضب ناک دھاڑ ماری اور اس ایک جست میں بوریوں کی نیچی دیوار الانگتا ہوا مورچے میں کود گیا۔

وہاں تین وردی پوش ایل ایم جی کے پاس ماہرانہ انداز میں جمے ہوئے تھے۔ مشین گن لوڈ کرنے کے بعد وہ اسے میرباز کی اور بیالا کی طرف سادھنے والے تھے کہ میں۔ شیر۔ دھاڑتا ہوا اپنے پنجے اور دہانہ کھولے خنجر دانت تیز کیے ان پر آ پڑا۔

"ہا آ آ آ کھ۔" لرزتی ہوئی آواز میں ایک نے واویلا کیا اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل مورچے سے نکل کے بھاگے۔

دوسرے کے گھگھی بندھ گئی تھی اور مجھے لگا جیسے اس نجس نے اپنی وردی، کچھ اور بھی زیادہ نجس کر دی ہے۔

تیسرے نے ہمت کر کے ایل ایم جی کا ٹریگر بریکٹ اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنی کہنیوں کی مدد سے گن کی نال میری طرف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف ایک لمحے کی مہلت اسے مل گئی ہوتی تو وہ اپنے اوپر آتے سنہرے سرخ سیاہ دھاری والے شیر کو ____ مجھے ____ ہلکی مشین گن کے فائر سے لہولہان کر کے رکھ دیتا۔

میں نے دھاڑ مارتے ہوئے کھلا پنجا چلایا اور ٹریگر بریکٹ کی طرف بڑھنے والا اس کا ہاتھ مونڈھے سے اکھڑ کر مشین گن پر جھول گیا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ وہ تکلیف اور شاک میں خود بھی گر گیا تھا۔

میں اب اس کی طرف سے بے تعلق ہو گیا کیونکہ نئی میگزین بیلٹ لگی اس ایل ایم جی پر بھرپور توجہ ضروری تھی اس لیے میں نے دو زبردست ضربیں اپنے بھاری خوں

خوار پنجوں کی لگا کر اس خوف ناک مشین کو توڑ موڑ کر اس قابل کر دیا کہ اسے اب کباڑ خریدنے والے ہی ترازو سے تول کر کہیں لے جا سکتے تھے۔

اس مورچے کو ختم کرنے کے بعد اب مجھے دوسرے مورچے اور شاٹ گن سے فائر کرنے والے قبائلی کو تلاش کرنا تھا۔

میں نے ریت کی بوریوں پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ میرباز نے اپنا خون میں لت پت اوپری لباس اپنے بدن سے کھینچ کر اتار لیا تھا اور اس کی مدد سے معقول حد تک بیالا کا جسم ڈھک دیا تھا۔ اب وہ اس لڑکی کو اپنے زخمی پہلو اور ایک بازو کی معذوری کے باوجود فیوز کے گچھے پر سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار وہ کامیاب ہو گیا پھر اس نے مجھے دیکھا اور وہ اپنے خون آلودہ، پھٹے ہوئے شلوکے میں بیالا کو لپیٹے پناہ کی تلاش میں لڑکھڑاتا گرتا سنبھلتا کسی اور طرف بڑھ گیا۔

میں نے دیکھا فیوز بجھ چکا تھا۔

تو پھر میرباز کس خطرے سے بچ کر بھاگ رہا ہے؟

اور میرباز نے مجھے شیر کو، ریت کی بوریوں پر کھڑے دیکھا تھا جب ہی وہ ہٹ گیا۔

گولیاں چلاتے دشمنوں کے بعد اب ایک خوں خوار جانور شیر آ موجود ہوا تھا جس سے وہ بیالا کو اور خود کو بچا رہا تھا۔

میں بوریوں سے اتر آیا۔ مجھے میرباز سے دور ہو جانا چاہیے۔ میں اس سمت میں درختوں کے درمیان جست و خیز کرتا دوسرے مورچوں اور دشمنوں کی تلاش میں کالج کے وسیع کمپاؤنڈ میں نکل گیا۔

اور یہاں میں نے ایک قبائلی کو دونالی بارہ بور پکڑے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر دوسرے کی اوٹ میں جاتے دیکھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ جسکے تھا۔

جسکے برمی تھا۔ وہ قبائلی تھا اس نے کھلے علاقوں میں عمر گزاری تھی۔ وہ جنگلی جانوروں، خاص طور پر کٹیلوں کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔

اگر اس نے درخت کی اوٹ اس لیے لی ہے کہ وہ سامنے آئے شیر کو، مجھے، گزر جانے کا موقع دینا چاہتا ہے تو یہ عین فطری رد عمل ہے۔ کوئی بھی شیر، اگر وہ شکار پر نہ نکلا ہوا ہو، وہ آدمی کی تلاش میں درخت کے پیچھے نہیں جھانکے گا۔ اور اگر جسکے درخت کی

اوٹ میں فائر کی تیاری کرنے' شاٹ گن لوڈ کرنے کے لیے گیا ہے تو وہ مناسب موقع سے نکلے گا اور مجھ پر فائر کر دے گا۔

میں نے جسگے کو اس کی عمر کا پہلا اور آخری اچنبھا۔ سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا۔ میں' شیر' دو قدم بڑھا اور خاموشی سے ایک درخت کے چوڑے تنے کی اوٹ لے کر رک گیا۔ جسگے اپنی چھپنے کی جگہ سے مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ شاٹ گن کو لوڈ کرنے چھپا تھا۔ میں نے نال ٹوٹنے' کارتوس ڈالے جانے اور کھڑاچ کی آواز کے ساتھ نال بٹھانے کی آوازیں سنیں پھر میں نے دیکھا کہ وہ جھپٹ کر اوٹ سے باہر نکلا اور شیر کو سامنے نہ پا کر اس نے غصے میں لکارا۔ "آ___ او سمہا۔ کدھر گیا ہے سمہا___؟ اور سمہا۔"

اس کی للکار کے جواب میں کہیں سے کوئی شیر نر نکل کر نہ آیا۔ جسگے نے پتھر اٹھائے اور مختلف درختوں کی جھاڑیوں پر مارنا شروع کر دیے۔ اس کا پھینکا ہوا ایک بڑا سا پتھر اس درخت کے تنے سے بھی آ کر لگا جس کے پیچھے میں چھپا بیٹا تھا۔ ظاہر ہے میں دم سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر پتھر چلانے اور شور کرنے کے بعد اس نے کھسک جانے میں عافیت سمجھی اور وہ بندوق چھتیائے ہوئے اپنے حمایتی فوجیوں کے مورچے کی طرف چلا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب اس دوسرے مورچے میں جا کر ان سے ہدایات لے گا۔ یا اب جبکہ کھلے چھوٹے ہوئے شیر کے خلاف اس کی دلیری سرد پڑ چکی ہے' شاید وہ شیر سے بچنے کے لیے مورچے کی پناہ میں جانا چاہتا ہے۔

میں گھات لگائے کٹیلوں کے انداز میں (کیونکہ میں اس وقت خود کٹیلا تھا) جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے پیچھے چلا۔

مجھے معلوم تھا کہ کب اوٹ سے نکلنا اور کب آڑ لے لینا ہے۔

جسگے اپنی پناہ گاہ کے قریب آ گیا تھا۔ یہ اس کے انداز ہی سے ظاہر ہو گیا۔ وہ اب بے فکری سے چلتا ہوا مالتی کی جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ اگر میں اس وقت جسگے کا پیچھا نہ کر رہا ہوتا تو ہرگز مجھے اس چھپے ہوئے مورچے کا پتا نہ چلتا۔

جسگے نے اپنی شاٹ گن کی دہری نال سے مالتی کی جھاڑی ہٹائی تو میں نے ایک ایل ایم جی کا دہانہ اپنی طرف سدھا ہوا دیکھا۔

مگر وہ ایل ایم جی تو جسگے کی طرف بھی سیدھی تھی۔ مشین گن پر ہاتھ جمائے جو فوجی بیٹھا تھا لمحے بھر کو میری اس کی آنکھ سے آنکھ ملی۔ فوجی نے گھبرا کر سیفٹی

اتار دی۔

جسگے چیخا۔ "کیا کرتا ہے رے؟ میں ہوں۔"

فوجی نے جسگے کی بات سنی اور سمجھی مگر وہ مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "ارے تیرے پیچھے باگھ ہے رے___ شے ے ے ر۔"

میں نے اسے گھوم کر دیکھنے کا موقع نہ دیا' اپنا شیر بدن ایسا سادھ لیا جیسے جست کر کے مورچے پر آ گروں گا مگر جھپٹ کر جسگے کو اپنے سر کی ٹکر مارتا میں خود کو بائیں طرف لڑھکاتا چلا گیا۔

مورچے میں بیٹھے فوجی نے اپنے سامنے شیر کو___ مجھے___ جست کی پوزیشن بناتے دیکھا اور اس نے اپنی ایل ایم جی سے فائر کھول دیا۔ وہ سمجھ رہا ہو گا کہ اس نے شیر کو اس لمبے برسٹ سے کاٹ کے رکھ دیا ہے مگر میرے سر کی زبردست ٹکر کھا کر ایل ایم جی کے دہانے میں بے بسی سے گھس جانے والے جسگے ہی کے نصیب میں مشین گن کی سب گولیاں لکھی تھیں۔

ایل ایم جی کے فائر اسے چھیدتے ہوئے مجھ سے دو فٹ دور کیاری کی مٹی ادھیڑتے چلے گئے۔ یہ مٹی جسگے کے غدار خون سے رنگی ہوئی تھی۔

فائر کرنے کے بعد فوجی کا فوری ردعمل "ارے رے رے" کا تھا وہ فائر پوزیشن سے اٹھ کر جسگے کی چیتھڑے ہوئی لاش کو دیکھنے چلا ہی تھا کہ میں نے کیاری سے اپنے پنجے کھولے ہوئے جست کی اور اس قاتل فوجی کو جسگے کے قتل پر فوری سزائے موت دیتا ہوا مورچے میں وارد ہو گیا۔

اس معرکے میں چار دوسرے فوجی بھی زخمی یا ہلاک ہوئے۔ جن میں ایل ایم جی والے کے پہلو میں دبکا ہوا اس کا مددگار اور تین دوسرے "جان باز" شامل تھے۔

کارروائی ختم ہو چکی تو میں نے___ شیر نر نے' مالتی کی جھاڑیوں کی اوٹ میں سوچا کہ اب مجھے آدمی کی جون میں آ جانا چاہیے۔

میں جانور سے آدمی یعنی شیر علی کی کایا میں آ گیا۔

ایک ایل ایم جی کو مکمل برباد کرنے کے بعد مجھے دکھ ہوا تھا کہ اچھی خاصی کام کی مشین کو خراب کر کے اپنے استعمال کے لائق بھی نہیں رکھا۔

اب میں نے شیر علی بنگش نے' مال غنیمت سمجھ کر چار رائفلوں کو ادھر ادھر کندھوں پر پہن لیا۔ ٹرائی پوڈ پر لگی ہوئی اس نئی لائٹ مشین گن اور میگزین کی پیٹی کو پیٹھ پر

سنبھالا اور مالتی کے کنج سے نکل کر لان کی طرف چلا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جسکے کو ہلاک کرنے والے اس فیصلہ کن برسٹ کے بعد کمپاؤنڈ میں ہتھیاروں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔

اندر اگر قبضہ کرنے والے فوجیوں کے یہ دو ہی مورچے تھے تو دونوں کی نفری یا تو بھاگ چکی تھی یا زخمی اور ہلاک ہو گئی تھی۔ اب جو بھی کمک آئی تھی کالج کے باہر سے آئی تھی۔

میں فولاد اور گولہ بارود میں لدا پھندا اس گیلری تک جانا چاہتا تھا جس پر سے میں نے شیر کی جون میں چھلانگ لگائی تھی۔

میں نے مشکل سے سر اٹھا کر گیلری کی طرف دیکھا۔ وہاں صرف کوسومی کھڑی تھی۔

مورنی کیا کر رہی ہے؟ وہ کہاں گئی؟ میں نے سوچا اور میرے برابر سے مادہ طاؤس کی کر رررر سنائی دی۔ مشکل سے سر گھما کر دیکھا مورنی' طاؤس کی مادہ میرے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

میں نے اس خوبصورت پرندے سے کہا۔ "مورنی! اچھا ہوا تو آ گئی۔ آ ذرا ہاتھ بٹا لے۔ بھاری ہیں یہ ہتھیار۔"

مادہ پرندے نے میری بات بھی نہ سنی اور وہ پر پھڑپھڑاتی ایک طرف دوڑ گئی۔
میں نے پکارا۔ "مورنی!"

دوسری سمت سے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی وہ لڑکی مورنی میری طرف بڑھی' اور بولی۔ "جنگل کی چڑیوں سے باتیں کرتے ہو سردار۔ اپنی عاشق مورنی کو بھی نہیں پہچانتے۔"

میں نے جس سے ابھی مدد مانگی تھی وہ لڑکی مورنی نہیں تھی وہ اصل مورنی تھی۔

میں کھسیا گیا مگر خفیف اور شرمندہ ہونے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ میں پریشان تھا کہ یہ مورنی آخر اس طرح برملا اظہار عشق کیوں کرتی پھرتی ہے۔
مورنی بڑھ کر آئی اور اس نے میرے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کیا اور بتایا کہ اس نے میرباز اور بیالا دونوں کو اندر وہاں وہار میں پہنچا دیا ہے۔ دونوں ہوش میں ہیں۔ کوسومی نے مرہم پٹی شروع کر دی ہے۔

مجھے بیالا کا آدمی یاد تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو مورنی نے دھیرے سے کہا۔
"وہ کام آ گیا۔"
"کیسے؟" اس معرکے میں یہ پہلا نقصان ہوا تھا۔
مورنی بولی۔ "یہ دونوں بیالا کو بچانے زنجیریں توڑ کے مورچے سے باہر بھاگے تھے۔ اس وقت مشین گن کا پہلا برسٹ انہوں نے' دشمنوں نے تمہارے پٹھان بھائی پر چلایا۔ بیالا کا آدمی اچھل کر سامنے آ گیا۔ ساری گولیاں اس نے اپنی چھاتی پہ لے لیں۔"
"مگر کیوں؟" مجھے لڑنے والوں کی طرف سے اس قسم کی "قربانی" ٹائپ کارروائیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ حالانکہ یہ کر کے اس نے میرے دوست میرباز کو بچا لیا تھا۔
مورنی نے بتایا۔ "ویسے بھی وہ زندہ نہیں بچتا۔ ان کتوں نے بیالا کے آدمی کو یہاں پیٹ سے نیچے خنجر کا زخم لگایا تھا۔"
"خنجر کا زخم؟"
مورنی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ "ہاں' اس کی مردانگی ختم کر دی تھی کتوں نے ____ بولتے تھے تیری محبت کرنے والی عورت نہیں رہے گی تو پھر یہ سب کس کام کی۔"
مورنی رک گئی تھی اور سر جھکائے رو رہی تھی۔
میں اسے کس طرح تسلی دیتا۔ لمحے بھر کو میں اس کے پاس رک گیا۔
مگر ہم کھلے میں تھے۔ مورنی نے خطرے کا احساس کر کے فوراً خود کو سنبھالا اور قدم بڑھا کر جھاڑیوں میں چھپے کسی چور دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میں اس طرف سے پہلے بھی گزرا تھا۔ ایسی چابکدستی اور مہارت سے یہ دروازہ بنایا گیا تھا اور اس کے آگے جھاڑیاں اگا دی گئی تھیں کہ خاص طور پر سمجھائے بغیر رستہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مورنی نے دروازے کے قریب جا کر کہا۔ "میں مورنی' رشنا کھولو۔"
رشنا اس لڑکی کا نام تھا جو دوسری طرف کھڑی پکارے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ وہی مورنی کی ہونے والی بھابی تھی۔
وہار کی محفوظ چہار دیواری میں آتے ہی ایک احساس تحفظ' زخمی میرباز کی طرف سے تشویش ایک آدمی کے نقصان کے صدمے اور لڑکی بیالا بائے کے بچا لیے

جانے کی طمانیت ____ ان ایک دوسرے سے متصادم کیفیتوں کی یورش نے جیسے مجھے تھکا کے رکھ دیا تھا۔

ہم تیزی سے اس حصے میں پہنچے جسے پہلے اسٹور کے طور پر اور اس وقت فیلڈ اسپتال کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

بیالا کو سر سے پیروں تک چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک بانہہ چادر سے باہر تھی جس پر وہار کی ایک بڑی عمر کی عورت پٹی باندھ چکی تھی۔ وہ عورت اب میرباز کی طرف آگئی تھی اور کوسومی کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ میرباز کو شیٹ بچھا کر ایک میز پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے بدن پر بس ایک تولیہ پڑا تھا۔ کوسومی اور وہار کا ایک مرد ملازم اور اب یہ بڑی عمر کی عورت اس کے خونم خون بدن کو صاف کر کے زخموں کو بساط بھر ٹانکے دے کر پٹیاں کر رہے تھے۔ میرباز کے دائیں بازو اور پہلو پر خاصے گہرے گہرے زخم آئے تھے۔ اس کے علاوہ لگتا تھا اس کی ران کا پرانا زخم پھر کھل گیا ہے۔ میرباز کے سر پر بھی پٹی بندھی تھی۔

پھر بھی مجھے آتا دیکھ کر اس نے دروازے کی طرف سر گھمایا اور دھیرے سے بولا۔ "شکر الحمد ____ یارا تم ٹھیک ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھو لی۔ "میرباز! بڑا کام کیا دوستا تو نے، بے قصور لڑکی کو مرنے نہیں دیا۔"

وہ کمزوری سے مسکرایا بولا کچھ نہیں۔

کوسومی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس سے باتیں نہ کروں میرباز کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں میرباز کا اور بیالا کا سر تھپکتا فیلڈ اسپتال سے نکل آیا۔

کوسومی میرے پیچھے چلی آئی باقی کام وہ کسی دوسرے کے ذمے کر آئی تھی۔ کہنے لگی۔ "ان کے کئی آدمی مر گئے ہیں ____ وہ اب پوری طاقت سے کالج پر حملہ کریں گے۔"

میں نے اسے تسلی دینے کو کہا۔ "ہمارے پاس ایک ہلکی مشین گن اور اس کا میگزین ہے۔ رائفلیں ہیں۔ راشن ہے ہم پوری طاقت سے اپنا بچاؤ کریں گے۔"

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "اب یہ مت کہنا کہ ہم کب تک بچاؤ کریں گے۔ کوسومی! جب تک دم ہے ہم ڈٹے رہیں گے۔" وہ چپ ہو گئی۔

باقی سارا دن کچھ نہیں ہوا۔ یعنی ہمارے دشمنوں کی طرف سے کچھ نہیں ہوا۔ ہم البتہ اپنے گرلز ہاسٹل کے قلعے کو مضبوط کرتے رہے۔

زخمی میرباز کے اور میرے علاوہ دو مرد کوسومی کے اسٹاف میں اور تھے۔ ہم نے ہلکی ڈیوٹی پر قبیلے کی لڑکیوں کو لگا دیا اور ہم تین مردوں نے شفٹوں میں دو دو گھنٹے ڈیوٹی دینے، آرام کرنے چوبیس گھنٹے گیلری پر پہرہ دینے کا طے کیا۔

کوسومی نے ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی لڑکیوں کا حوصلہ مضبوط رکھنے کے لیے ان سے صاف صاف بات کی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اگر کمزوری دکھاؤ گی تو جو لوگ کالج کو گھیرے ہوئے ہیں تمہیں ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی زیادتی کا نشانہ بنائیں گے۔ جم کے مقابلہ کرو گی تو اپنی جان اور آبرو بچا سکو گی۔ ہم بے شک گھرے ہوئے ہیں لیکن کمزور ہر گز نہیں ہیں۔

لڑکیوں میں سے زیادہ باہمت کو ہتھیاروں کے استعمال کی فوری تربیت دے کر انہیں مسلح نگرانی کا کام دیا گیا۔ جو لڑکیاں لڑاکا ٹائپ نہیں تھیں انہیں سب کے لیے کھانا تیار کرنا، زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا اور مراقبے کے کمرے میں اپنے اپنے حساب سے دعا کرنا سونپا گیا۔

ہم سب نے ایک لمبے محاصرے کے لیے خود کو تیار کر لیا اور انتظار میں بیٹھ گئے۔

راج دھانیاں اور بڑے شہر خبریں لینے والوں اور آگے پہنچانے والوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ مانگ یان قصبے کی حیثیت ایسی تھی جیسی سر سید احمد خاں کی زندگی میں علی گڑھ کی ہو گی۔ وہ تعلیم پھیلانے کی ایک نئی نویلی تحریک کا مرکز تھا۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ یہاں یہ تعلیمی تحریک ایک قبائلی سیانے نے شروع کی تھی۔ جنوبی ایشیا کے ملکوں میں قبائلی ویسے بھی خبروں میں کم سے کم ہوتے ہیں۔ اگر برمی آرمی بھاری توپ خانہ لگا کر مانگ یان کالج کو اور وہار کی قدیم عمارت کو اڑا بھی دے گی تو باہر کی دنیا کو خبر نہیں ہو گی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا اور بڑے میاں کی مفید اور مصروف زندگی کا ماحصل، یہ کالج صفحہ ہستی سے اس طرح غائب ہو جائے گا جس طرح ایک غلط لفظ یا جملہ کسی تحریر کے متن سے نکال دیا جاتا ہے اور نکالنے والے کے سوا اس بات کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔

چار دن گزر گئے اور انہوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ لگتا تھا فوج کی حکمت عملی یا کمان بدل گئی ہے۔ کسی بہت ہی ہشیار بلکہ عیار کمانڈر کو مانگ یان کالج کمپلکس کی ذمہ داری

سونپی گئی تھی۔ وہ سکون سے گھیرا ڈالے بیٹھا تھا۔

ان چار دنوں میں زیادہ تر رات کے وقت کوئی بیس مرتبہ مورنی' مادہ طاؤس کی کایا میں باہر گئی اور حالات کا جائزہ لے آئی۔ وہ جو کچھ دیکھتی کوسومی کو اور مجھے آ کر بتاتی۔ ظاہر ہے اس کے کایا بدلنے کا راز وہار میں اس وقت ہم ہی دو آدمیوں کو معلوم تھا۔

فوج والوں نے کمپاؤنڈ کے صدر دروازے پر دو ٹینک لا کھڑے کیے۔ بہت سی بکتر بند گاڑیاں پہلے ہی موجود تھیں۔ برمی فوج کی بھاری نفری کمپاؤنڈ کو گھیرے کھڑی تھی اور کمانڈر وائرلیس پر رنگون سے ہدایات لے رہا تھا۔

مورنی نے دیکھا تھا کہ مانگ یان کی مقامی آبادی جو فوج کے خوف سے پہلے ہی دور دور رہتی تھی اب بالکل بھی ادھر کا رخ نہیں کر رہی۔ مورنی نے کالج سے دور بڑے میاں کے ششو کے گنے کے کھیت اور چھپرے پر وہار والوں کی پوری بپتا جا سنائی تھی۔ ششو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دارالحکومت رنگون کے باسیوں تک محاصرے کی خبر پہنچا دے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ غیر ملکی اخبار نویسوں' نامہ نگاروں کو مانگ یان کی طرف متوجہ کر سکے۔

محاصرے کے تیسرے دن مورنی نے دیکھا کہ جینز اور جرسی پہنے ایک گوری میم کیمرا لٹکائے ایک پرانی فوکس ویگن میں صدر دروازے پر کھڑی فوج کے نوجوان افسر سے جھک جھک کر رہی ہے۔

اس نے اگلے دن بھی اس میم کو گیٹ پر جھگڑا کرتے دیکھا۔ مورنی پرندے کی کایا میں' لڑکی مورنی اسی رات کنجوں' تناور درختوں میں چھپتی چھپاتی آئی اور مجھے گیلری میں آ کر بتانے لگی کہ گیٹ پر آج پھر وہی ہو رہا ہے۔

دن کے وقت پرندے مورنی کا نکلنا بھی مخدوش تھا۔ عام برمی اور بودھ مذہب کے پیروکار تو طاؤس کو متبرک اور مقدس پرندہ مانتے تھے۔ ان کے سامنے تو آنے جانے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر دوسری قوموں' مذہبوں کے لوگ بھی سرکاری نفری میں شامل تھے۔ اگر کسی نے مور کا گوشت کھانے کے ارادے سے لڑکی مورنی کو مار گرایا تو یہاں تو سب کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ لڑکی مورنی' کوسومی کے اور میرے بعد ہماری طرف کی جیسے نائب کمانڈر تھی۔

کوسومی نے تو اسے پابند کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ دن کے وقت مور کی کایا میں کمپاؤنڈ میں بھی دکھائی نہ دے مگر بعض اوقات وہ بہت قیمتی خبریں لے آتی تھی اس

لیے میں دن کو نکلنے کی یہ پابندی کبھی نرم بھی کر دیا کرتا تھا۔

اس گوری میم کے یہاں آنے سے رنگون میں بیٹھے ہمارے بارے میں فیصلہ کرنے والوں پر دباؤ ڈالنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔

میں نے کاغذ لے کر غیر ملکی نامہ نگار کے لیے انگریزی زبان میں پوری تفصیل لکھ دی کہ کالج کے ہاسٹل میں کل کتنی لڑکیاں ہیں۔ لڑکی بیالا جو زخمی ہے اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ اس کے شوہر کو کس طرح مورچے والوں نے مار گرایا ہے۔ اس رقعے میں' میں نے غیر ملکی نامہ نگار سے درخواست کی تھی کہ وہ دنیا کو ہماری بپتا سنا کر برمی حکام کو اس پر آمادہ کرے کہ ہمیں یعنی تمام لڑکیوں اور کالج کے بانی کی پوتی کو نکل جانے دیا جائے۔ ہم لوگ کالج پر قابض رہنے پر ہرگز اصرار نہیں کریں گے۔

اس رقعے کو پہنچانے کے سلسلے میں میرا مورنی سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی خطرہ نہ لے گی۔ پرندے کی کایا میں کالج کمپلیکس کے اس حصے سے جہاں کبھی لڑکوں کا ہاسٹل تھا تناور درختوں میں ہوتی کچھ دور نکل جائے گی پھر انسان کی جون میں آ کر کسی طرح کیمرے والی اس میم تک پہنچے گی اور میرا خط حوالے کر کے واپس مادہ طاؤس بن کر کمپاؤنڈ میں آ جائے گی۔

ابھی مورنی روانہ بھی نہ ہوئی تھی کہ کوسومی آ گئی۔ مجبوراً اسے ساری بات بتانی پڑی۔ کوسومی نے بہت سختی سے اس تجویز کی مخالفت کی اور مجھے مجبوراً کوسومی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

مگر کوسومی کے جاتے ہی مورنی میرے برابر آ بیٹھی بولی۔ "سردار! کوسومی نے مجھے دن کے وقت مورنی کی کایا میں وہار کے کمپاؤنڈ سے نکلنے اور گوری میم تک جانے کو منع کیا ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

تو بولی۔ "سردار تم پر تو کوئی پابندی اگوا کوسومی نے نہیں لگائی ہے؟"

"اوں ہنک۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔

وہ جوش میں اٹھ کھڑی ہوئی' بولی۔ "تو آؤ میں تمہیں ایک جگہ دکھاتی ہوں۔" ہنس کر کہنے لگی۔ "اگوا نے مورنی کے کچھ بک بک کرنے اور کچھ کام کی چیزیں دکھانے پر تو پابندی نہیں لگائی ہے؟"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں۔ کوسومی نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی۔"

وہ مجھے لیے ہوئے وہار کے چور دروازے تک آئی کہنے لگی کہ کھلے کمپاؤنڈ میں نکلنا ہوگا۔ یہ مسئلہ تھا کیونکہ ہم دونوں شیر اور مورنی بن کے ہی نکل سکتے تھے۔ مورچوں کی تباہی کے بعد فوج والوں نے کمپاؤنڈ کی دہری دیوار پر باہر سے بانس کی سیڑھیاں وغیرہ لگا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکیاں سی بنا دی تھیں۔ رات میں سرچ لائٹیں لیے' ان میں دور بینیں لگائے بھاری ہتھیاروں کے ساتھ محاصرہ کرنے والے اندر وہار کے کمپاؤنڈ کے چپے چپے پر نظر رکھتے تھے۔ مورچوں پر میں نے شیر بن کر جو حملہ کیا تھا اس سے فوج والے یہ سمجھ سکتے تھے کہ مور مورنیوں کی طرح وہار میں شیر بھی پلا ہوا ہوگا۔ وہار والے شیر کو باندھ کے رکھتے ہوں گے یا تو وہ اتفاقاً کھل گیا یا کھول دیا گیا اور اس نے اندر مورچوں میں تباہی مچا دی۔

ان کا یہ سمجھنا ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ مورنی نے باہر کے چکر لگا کر بہت سی کام کی خبریں اٹھائی تھیں ان میں ایک قیمتی خبر یہ بھی تھی کہ کچھ لوگ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔

پھر بھی اس وقت مورنی مجھے کمپاؤنڈ میں لا کر اپنے اور میرے لیے اضافی خطرہ مول لے رہی تھی۔ میں نے سوچا مورچوں میں مرنے والوں کا کوئی جذباتی ساتھی اگر مجھے' شیر کو' کمپاؤنڈ میں دیکھ کر بھاری فائر آرام سے کھول دے تو وہ تو اپنے حساب سے کسی مرے ہوئے ساتھی کا انتقام لے رہا ہوگا ____ میں بلاضرورت کام آ جاؤں گا۔

میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار مورنی سے کیا تو وہ بولی۔ "میں نے جو ادھر ادھر سے فوجیوں کی باتیں سنی ہیں تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ وہار میں کھلے چھوڑے ہوئے شیر کو کسی پرانے غصے میں بھرے بھکشو کی بھٹکتی ہوئی آتما (روح) سمجھتے ہیں۔"

یہ توہم پرستی والی لائن مجھے اچھی لگی۔ ان فوجیوں کے توہمات ایک طرح سے میری بیمہ پالیسی تھی۔ وہ بھکشو کے بھوت' پر ہرگز گولی نہیں چلائیں گے۔

چور دروازے سے نکلتے ہی میں نے جھاڑیوں میں خود کو شیر میں تبدیل کیا۔ لڑکی مورنی مادہ طاؤس بن گئی اور ہم درختوں کی اوٹ لیے چہار دیواری کی طرف بڑھ گئے۔

آج محاصرے کے چوتھے دن میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ان کا گھیرا کتنا سخت ہے۔ وہ کتنے انتظامات کر کے بیٹھے ہیں۔ ہر دس فٹ کے فاصلے سے ان کا ایک فوجی آٹومیٹک رائفل یا ہلکی مشین گن کے ساتھ دیوار پر جما بیٹھا تھا اور وہاں جہاں انہوں

نے سیڑھی لگا کر یا مچان بنا کر چوکی سی بنائی تھی ایک ایک ہیوی مشین گن پوسٹ تھی اور دور بینیں لگی تھیں۔ رات میں وہ یہاں طاقت ور سرچ لائٹس لگا دیتے ہوں گے۔

ہمیں چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چلتے پھرتے فوراً ہی دیکھ لیا گیا۔ گارڈز ایک دوسرے کو اشارے سے یا ششش کی آواز نکال کر بتا رہے تھے کہ دیکھو وہ شیر جا رہا ہے۔ جنگل میں شیر کے ساتھ دوسرے پرندوں' خاص طور پر طاؤس کو دیکھا جاتا ہے تو ان کے لیے منظر کوئی انوکھا نہیں تھا۔

مگر کافی دور تک چہار دیواری کے ساتھ چلنے کے بعد محاصرے کے انتظامات دیکھ کر میں بڑی سوچ میں پڑ گیا۔ اپنی گنتی کی رائفلوں ایک ایل ایم جی اور مختصر میگزین کے ساتھ ان کا مقابلہ تو خیر کیا کرتے ہمارے تو بچ کر نکل بھاگنے کے لیے بھی حالات سازگار نہیں تھے۔

مگر خیر مجھے یاد تھا کہ مورنی مجھے یہاں کسی کام سے لائی تھی۔ وہ درختوں' جھاڑیوں کے ایک بھاری کنج کے نیچے پہنچ کر رک گئی۔ طاؤس سے انسان بن کر وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ لڑکی ہو گئی۔ میں شیر کی کایا چھوڑ انسان کے قالب میں آیا تو لڑکی مورنی نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور آہستگی سے سنبھل سنبھل کر آم کے ایک گھنے پیڑ پر چڑھنے لگی۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

درخت کی خاصی اونچی شاخ پر گھنے پتوں میں چھپے ہم دونوں چہار دیواری پر بنی ان کی چوکی میں دیکھ رہے تھے۔ یہ مشین گن پوسٹ تھی۔ تین فوجی جو پہلے آرام سے بیٹھے تھے اب نظروں ہی نظروں میں ہمارے درخت سے مخالف سمت میں شیر کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کا دھیان ہمارے درخت کی طرف نہیں تھا۔ مورنی نے میرے کان سے منہ لگا کر کہا۔

"سردار! اس چوکی اور اگلی چوکی کے بیچ دیکھو دیوار پہ کیا ہے؟"

میں نے دیکھا باہر اگا ہوا کھجور کا ایک پیڑ نظر آ رہا تھا۔

میں نے فوراً مورنی کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا۔

کہنے لگی۔ "اگر کوئی دیوار پر پہنچ جائے تو اس کھجور کے پیڑ سے اتر کر باہر جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں اگر دیوار پر پہنچ جائے اور کوئی اسے دیکھ نہ رہا ہو تو یہ کھجور کا پیڑ آسانی سے اسے باہر پہنچا دے گا مگر سوال یہ ہے ____"

مورنی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "بس سردار! یہی دکھانا تھا' آ جاؤ نیچے۔"

یہ کیا پاگل پن تھا؟ میں نے کہا۔ "تم یہاں صرف کھجور کا پیڑ دکھانے لائی تھیں؟ مورنی! تمھیں کیا ہو گیا؟"

وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "نہیں میں یہ بھی دکھانے لائی ہوں کہ دونوں چوکیوں کے بیچ باہر تو یہ کھجور ہے اور اندر کی طرف دہری دیوار میں پتھر کا یہ پرنالا بنا ہے۔"

میں نے دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پرنالا دہری دیوار پر اکٹھا ہو جانے والے بارش کے پانی کو اندر کی طرف گٹر میں گرانے کے لیے بنایا گیا تھا۔

مورنی بولی۔ "اگر میں مورنی چڑیا بن کر کسی ہلکے جان دار کو اپنے پنجوں میں لے کر ادھر سے اڑوں اور اس جان دار کو اوپر پرنالے میں چھوڑ دوں تو وہ اوپر والوں کو نظر نہیں آئے گا اور ڈھکی ہوئی نالی میں رینگتا ہوا کھجور کے پیڑ تک پہنچ جائے گا پھر پیڑ کے تنے پر سے باہر اتر کر وہ آگے جھاڑیوں میں انسان کی کایا لے کر سیدھا گوری میم تک جا سکے گا۔"

اس کا دماغ بہت مشکل حالات میں بھی بہت ٹھنڈے کام کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں کوئی بھی جان دار اس طرح باہر جا سکتا ہے اور اسی طرح واپس آ سکتا ہے مگر وہ ہے کہاں؟ کہاں ہے وہ جان دار؟"

مورنی مسکرائی۔ "نیچے آؤ سب کچھ بتا دوں گی۔"

نیچے جھاڑی کی اوٹ میں اس نے بتایا کہ اندر وہار میں کوئی ایسا ہے جو کایا بدل کر انسان سے سانپ اور سانپ سے پھر انسان بن سکتا ہے۔ مورنی کہنے لگی۔ "میں بتاؤں گی تمھیں کہ وہ کون ہے۔ ہاں اگر میری یہ بات تمھیں ٹھیک لگتی ہے تو سردار! تم ادھر ہی انتظار کرنا' میں اسے___ سانپ کو مورنی بن کر پنجوں میں اٹھائے لاتی ہوں اور اڑ کر پرنالے کے منہ میں چھوڑ دیتی ہوں۔ وہ کھجور کے رستے باہر اتر جائے گا۔ یہ فوجی لوگ اصلی مور مورنیوں کو اڑتے' اترتے' دوڑتے دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ شک بھی نہیں کریں گے۔ بولو لے آؤں؟"

میں دو منٹ خاموش بیٹھا اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ اگر احتیاط سے عمل کیا جائے تو سانپ کی کایا میں باہر جانے والے کے لیے کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ باہر اسے بہت احتیاط سے غیر ملکی نامہ نگار تک جانا ہو گا۔ وہ لوگ ہر

طرح سے یہ کوشش کریں گے کہ کوئی مقامی آدمی اس غیر ملکی عورت کے قریب تک نہ جا سکے مگر یہ کام بہت ضروری تھا۔ ہم لوگ بودھ وہار والے 'زندہ بچیں' نہ بچیں' کم سے کم یہ اطمینان تو آخر وقت تک رہے گا کہ ہمارے تباہ کر دیے جانے' ایک لڑکی کے ذریعے' ہم تینوں مردوں کو مار دیے جانے کی خبر باہر کی دنیا تک پہنچ گئی ہے۔

میں نے مورنی سے کہا کہ تو وہ رقعہ سنبھال کر' اسے' سانپ کو' سب کچھ سمجھا کر لے آ۔ میں آم کے درخت پر بیٹھا انتظار کرتا ہوں۔

لڑکی مورنی نے پھر سے طاؤس کی مادہ کا قالب اختیار کیا اور سانپ کو___ وہ جو کوئی بھی تھا___ لانے کے لیے وہاں کے چور دروازے کی طرف چپھپاتی چلی گئی۔

میں پھر سے آم کے درخت پر چڑھ گیا۔ فوجی لوگ مورنی کو جاتے دیکھتے رہے۔ ان میں سے کسی کو یہ خیال آیا ہو گا کہ مورنی اس کنج سے نکلی ہے تو شیر کو بھی ادھر ہی تلاش کرنا چاہیے۔ انہوں نے دوربین والے سے پکار کر کہا۔ "ارے ادھر کہاں دیکھ رہا ہے رے۔ باگھ اور مورنی جھاڑی میں گئے تھے۔ مورنی ابھی نکل کے بھاگی ہے باگھ کو ادھر ہی آم کے نیچے جھاڑیوں میں دیکھ۔"

میں پتوں کے بیچ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ لوگ اپنی دوربین ادھر گھما رہے ہوں گے۔ میں دم سادھے بیٹھا رہوں گا تو کپڑوں کا رنگ بھی ایسا ہے دوربین والے کو بھی دھوکا ہو جائے گا۔

مگر ٹھیک اسی وقت اوپر کی شاخ سے ایک بھورا لنگور کود کر میری شاخ پر آیا اور مجھے دیکھ کر ڈر کر چیختا ہوا بھاگا۔ پتوں کی جو اوٹ میرے اور فوجیوں کے بیچ کھڑی تھی لمحے بھر کے لیے ہٹی۔ ٹھیک اسی لمحے دوربین والے نے لنگور کی پکار سن کر اپنی دوربین آم کی اسی شاخ کی طرف گھمائی۔ میں نے دوربین کے شیشے اپنی آنکھوں میں چمکتے دیکھے۔ دوربین والے نے شاید میری آنکھوں میں دیکھا ہو گا' اس نے چیخ کر کہا۔ "اندر آم کے درخت پہ کوئی بیٹھا ہے۔ ادھر سب سے اونچی شاخ پر۔ لا اپنی رائفل دے مجھے۔ رائفل دے۔"

میں نے سسکاری لی۔ "لو جی مارے گئے شیر علی۔"

میں نے ایک بار آیت کریمہ پڑھی اور آم کی شاخوں سے خود کو بچاتا ہوا سیدھا زمین پر کودا اور جھاڑی میں رینگتا گیا دیوار سے فائر ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ گولی مجھے نہیں لگی ہے اسی وقت اوپر سے کچھ گرا آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر بھورے لنگور کی لاش پڑی تھی۔

یا تو گولی چلانے والے کو مغالطہ ہوا ہو گا یا اس نے واقعی لنگور کو نشانہ بنایا تھا۔
ایک فوجی کی چڑچڑاتی آواز آئی۔ "تو نے کس پر فائر کیا ہے؟"
"وہ جو اوپر درخت پہ چڑھا بیٹھا تھا ___ اسے گرایا ہے۔"
"ارے تو نے لنگور کی ہتیا کی ہے رے بدھو۔ آدمی کدھر بھی نہیں' لنگور مرا پڑا ہے' وہ دیکھ۔"
"بکواس کرتا ہے۔"
"ایک دم اندھا ہے سورا ___ ارے نہیں دکھتا تو اپنی دوربین سے دیکھ' کمنڈل کی طرح بلاوجہ گلے میں لٹکا رکھی ہے۔ وہ جھاڑی کے پاس کیا پڑا ہے ذرا دیکھ۔"
"ارے ہاں رے ہاں۔ لنگور کی ہتیا ہو گئی۔ چچ ___ چچ ___ چچ۔"
اس نے ساتھی کی اس آواز کی نقل اتاری۔ "آؤ بھئی اب چچ چچ کرنے سے کچھ نا ہوئے۔ بارہ پنڈتوں کو بھوگ دینا پڑے گا سورے۔"
میں نے سوچا یہ لوگ بودھ نہیں ہندو ہوں گے اسی لیے لنگور بندر کے مارنے پر کفارہ دینے کی بات کر رہے ہیں۔ لنگور کی ہتیا کی ہے تو اب اسے بارہ پنڈتوں کو کھانا کھلانا پڑے گا۔ حلوہ پوری اور دودھ کا جرمانہ بھرے گا پنڈتوں کے تو مزے آ گئے۔
"پر وہ آدمی کدھر گیا؟" یہ فوجی آواز ہی سے بہت پریشان لگتا تھا۔ خود ہی ایک لمحے بعد کہنے لگا۔ "تیری قسم آدمی تھا رہے۔ میری اس کی آنکھ ملی تھی۔"
اس کا ساتھی ہنسا۔ "او رہنے دے رے رہنے دے۔ میری قسم کیوں کھاتا ہے۔ سامنے پڑا لنگور نہیں دکھتا تجھے۔ آدمی کیسے دیکھ لیا تو نے ___؟ آنکھ ملی تھی ___ سالا۔"
"تیری قسم۔"
"دھت۔ بدھو سالا۔ پھر سے میری قسم ___ او رہنے دے' نیچے ٹینٹ میں جا کے سو جا تھوڑی دیر کو۔ دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا ___ جا۔"
اتنی دور سے کچھ اور سنائی نہ دیا۔ اسی بدھو کے بڑبڑانے کی آواز آئی اور بند ہو گئی۔ جو چیخ چیخ کر اس کا مذاق اڑا رہا تھا اس نے پکار کر کسی اور سے کہا۔ "او رے' سنا تو نے' دیکھا سورے کو؟ کیسا دیدہ چشم ہے اس سالے کا ___ ہاں جبر؟ سالا بولتا ہے مگالتا ہو گیا۔"
تیسرے کے ہنسنے کی آواز آئی اس نے بس ایک لفظ دہرایا "مغالطہ۔"
"پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ "مغالطہ" کہنے والے جبر نامی فوجی نے دوسری چوکی سے کہا۔ "تم لوگ کا بھی خوب ہے بندر مار دیا تو بارہ پنڈتوں کو مال کھلاؤ تب جان چھوٹے گی۔"

جواب میں پہلے فوجی نے ذرا تیور بدل کر کہا ہو گا کیونکہ اس کا لہجہ تیکھا تھا' بولا۔ "اُس میں کھوب' نا کھوب کہاں ہے رے جبر ___ کہاں؟"
جبر بولا۔ "ارے یہ سب پنڈتوں کا اپنا بنایا اصول ہے۔ مال کاٹنے کا رستہ نکال لیا۔ بارہ پنڈے کھلاؤ۔ بیس کھلاؤ۔ مٹھائی لاؤ۔ دودھ لاؤ۔ بس مفت خوری چل رہی ہے۔"
ہندو فوجی برا مان رہا تھا' چیخ کر پوچھنے لگا۔ "مُفت کھوری تمہارے ملا لوگ نہیں کرتے؟"
جبر جو مسلمان ہو گا بولا۔ "کیوں نہیں کرتے۔ خوب کاٹتے ہیں کہتے ہیں کالا مرغا لاؤ' سفید بکرا لاؤ' حلوہ لاؤ۔"
"تو پھر؟"
جبر ہنسنے لگا۔ "اوبے" یہ تو پھر کیا ہوتا ہے میں کوئی ایجنٹ ہوں ملا لوگ کا جو مجھ سے پوچھتا ہے' تو پھر؟ میں نے تو ایک بات کہی تھی ___ یہ پنڈے ملے سبھی ہشیار ہیں۔"
ہندو فوجی چڑ گیا تھا۔ "ہشیار تم ہو۔ ہمارے بامن پنڈتوں کو برا کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا۔ بیچ میں ایک بات اپنے موسلمان ملا کو بھی بول دی۔ لو بھئی بات بھی کہہ دی بات بگڑی بھی نہیں۔"
قریب کی چوکی سے کوئی سن رہا تھا۔ وہ پکار کر بولا۔ "چپ کرو رے' یہ تم لوگ نے پھر ہندو مسلم دنگا شروع کر دیا۔"
دونوں فوجیوں کی جھک جھک سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ادھر چوکی پہ ایک برمی مسلمان بھی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ اس بات سے ایک بے نام اطمینان سا ہوا کہ اپنا ہم مذہب یہاں قریب ہی ہے اور ایک فکر بھی ہو گئی کہ مورنی خطرے میں ہے مسلمان بھائی کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ پکانے کھانے کے لیے مورنی کو مار لے گا ___ رعایت نہیں کرے گا۔
اندر کہیں مورنی نے فائر کی آواز سن لی ہو گی تو وہ میری طرف سے فکرمند ہو کر اڑتی ہوئی آئی اور کنج کے اور آم کے آس پاس کرلانے لگی۔ میں نے کنج کی عافیت سے اسے اپنی شیر کی آواز سنا دی۔ یعنی شیر جب آسائش سے کنجوں میں ٹھہرا گونجتا ہے۔ میری آواز سن کر مورنی پر پھڑپھڑاتی چلی گئی شاید اس نئے رضاکار کو لینے جو سانپ کی کایا میں کمپاؤنڈ سے باہر نکل سکتا تھا۔
بیس پچیس منٹ بعد میں نے جھاڑی میں چھپے چھپے لڑکی مورنی کے آنے کی آوازیں سنیں اور کچھ ہی دیر میں وہ پتوں شاخوں میں رستہ بناتی مسکراتی میرے برابر آ

بیٹھی۔ بولی۔

"جانے والا تمہارا رقعہ لے کے چلا گیا۔ میں پورے گھنٹے بھر بعد کھجور کے پار دہری دیوار پہ جا بیٹھوں گی اور اسے پنجوں میں بھر کے اتار لاؤں گی۔"

میں نے خوش ہو کر اس کا سر تھپک دیا تو وہ کچھ شوخی‘ شرارت کچھ سنجیدگی سے بولی۔ "تم اپنی مورنی پہ حکم چلاتے رہو سردار اور دیکھتے جاؤ وہ کیسے کیسے کام کرے گی۔"

پھر وہ مجھ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہوئی ان اچھے دنوں کے لیے منصوبے بنانے لگی جب وہ میرے بچوں کو جنگلی پودوں‘ پرندوں کے نام سکھائے گی۔ انہیں سارا سارا دن سرحد کے گھنے جنگلوں میں لیے لیے پھرے گی۔

میں نے کہا۔ "پاگل ہے تو۔ صوبہ سرحد میں ایسے ایسے گھنے جنگل تو نہیں ہوں گے جیسے یہاں برما میں ہیں اور پھر وہاں تو کس طرح جائے گی؟"

بولی۔ "ادھر تو لے کے جائے گا نا____ مجھے اپنے بچوں کی ماں بنانے کو لے جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "شاباش ہے تجھے۔ ایسے مصیبت والے دنوں میں اتنی سخت پریشانی میں بھی تو اپنے پاگل پن کے لیے وقت اور موقع نکال لیتی ہے۔"

ایسی ہی ہلکی پھلکی دیوانی باتوں میں‘ مورنی نے وہ ایک گھنٹا گزار دیا۔

میں نے کوسومی کے بعد اگر کسی میں اتنی دل آویزی پائی تھی‘ کسی کے پاس بیٹھنے میں‘ کسی کی باتوں میں جی لگتا تھا میرا تو وہ یہی باؤلی مورنی تھی۔

گھنٹے بھر بعد وہ کایا بدل کر کنج میں مورنی بنی اور پھڑپھڑاتی احاطے کی دہری دیوار کی طرف پرواز کر گئی۔ وہ جس خوبصورتی اور جتنی شان سے درختوں سے بلند ہو رہی تھی اسے دیکھ کر میرا دل ایک بار بے تابانہ دھڑکا تھا۔ خوبصورت چیزیں نہ معلوم کیوں اتنی عارضی ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا‘ پھر اس بدشگونی پر میں نے خود کو ملامت بھی کی۔

اور میں نے سوچا جب تک وہ اس "سانپ" کو واپس وہار میں چھوڑ کر فارغ نہیں ہو جاتی میں اس کنج میں رہوں گا۔ انتظار کروں گا۔ میں ٹانگیں پھیلا کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر جھاڑیوں میں لیٹ گیا پر دوسرے ہی لمحے میں اٹھ بیٹھا۔

دہری دیوار کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی اور ایک آواز اور تھی____ کسی پرندے کی چیخ____ مجھے مادہ طاؤس کی چیخ سنائی دی تھی۔

میں جھاڑی سے نکل کر باہر بھاگا اور فوراً ہی لوٹ آیا۔ میں تو شیر علی بنگش تھا۔

نسان تھا اور وہار کے احاطے میں آدمی کی جان کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔

جھاڑی کی اوٹ میں‘ میں نے شیر کی کایا بدلی اور غیض و غضب میں دھاڑتا ہوا احاطے کی دیوار کی طرف چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا ان کی دو چوکیاں عین میرے سر پر تھیں۔ وہ اگر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہار کے پالتو شیر یا کسی بھکشو کی بھٹکتی ہوئی روح سے کالج کی عمارت کو پاک کر دینا ہے تو پھر یہی شیر کا جسم میرا کفن بن سکتا تھا۔

مگر انہوں نے گولیاں نہیں چلائیں۔ وہ سب تکلیف میں پکارتی‘ کرلاتی مورنی کو دہری دیوار پر پڑے پڑے بازو پھڑپھڑاتے‘ پنکھ چلاتے دیکھ کر اپنے کسی شیطانی جذبے کی تسکین کر رہے تھے۔ "میں وحشی جذبہ نہیں کہوں گا کیونکہ وحشی اور طائر۔ جنگلی جانور اور پرندے تو عین فطرت پر زندہ رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہ تو سکتے ہیں ظلم جیسا شیطانی عمل ان سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ میں نے خود کتنی بار جنگلی جانور بن کے دیکھ لیا تھا اور میں جانتا تھا کہ دشمنی اور ظلم آدمیوں سے مخصوص ہے۔ یہ جانور کے مزاج میں‘ اس کی جبلت میں نہیں۔" وہ لوگ جو مورنی کو تڑپتا دیکھتے تھے اب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

تب میں نے دہاڑتے ہوئے زبردست جست کی اور کوئی پندرہ فٹ کی بلندی تک دیوار کو اپنے شیر پنجوں سے چھو کر میں واپس احاطے میں آ گرا۔ میں نے طیش میں احاطے کی نرم گھاس پر پنجے کھولے کھولے ایک کاوا مارا اور زمین ادھیڑ کر رکھ دی۔ پیچھے ہٹ کر میں نے پھر ایک زقند بھری اور اس بار میں زیادہ بلندی تک پہنچا مگر پتھر کی دیوار پر شیر ناخنوں سے خراشیں ڈالنے کے سوا مجھ سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ مورنی کا کانپتا‘ تڑپتا ہوا بدن میری جست کے بعد بھی تین چار فٹ اوپر پڑا تھا۔ میری پہنچ سے دور تھا۔

مگر دیوانہ وار جست و خیز کا یہ منظر ان حرام خوروں کے لیے مرعوب کن ہو گا کیونکہ پندرہ اٹھارہ فٹ کی جست لگاتے تو انہوں نے سدھائے ہوئے شیروں کو بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ میری دھاڑ سن کر اور طیش میں لان پر میری چلت پھرت دیکھ کر یا پھر ہو سکتا ہے کسی انسانی جذبے سے مغلوب ہو کے ان میں سے ایک نے اپنی رائفل کے بٹ سے ہولے سے دھکا دیا اور مورنی کو دیوار سے نیچے گرا دیا۔ وہ تکلیف کی چیخ مارتی اندر احاطے میں آ گری۔

وہ گھاس پر گری تھی مگر اس زخمی کی تکلیف سمجھ کر جیسے میں نے اپنے بدن‘ اپنی کایا میں محسوس کی اور نرمی سے گونجتے اس شیر نے____ میں نے منہ بڑھایا اور جس طرح دانتوں میں کٹیلے اپنے نئے پیدا ہوئے بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں میں نے اس خون آلودہ پرندے____ مورنی____ کے بدن کو منہ میں دبایا اور جھپٹ کر دیوانہ وار وہار

کے چور دروازے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ نہ معلوم کیوں مجھے کسی کے بتائے بغیر ایک خیال سا تھا کہ اگر مورنی بے ہوش ہو گئی ـــــ یا اسے ہوش آئے بنا کچھ ہو گیا تو وہ دوبارہ انسانی قالب میں نہیں آسکے گی۔ مورنی بنی بنی سدھار جائے گی۔

میں جھپٹتا ہوا احاطے کی دیوار سے ہٹا تھا مگر میں نے اوپر سے آتی یہ آواز بھی سن لی۔ ایک فوجی' اس گولی چلانے والے کو چھیڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ لے جر میاں' تیری شکار کی ہوئی مورنی کو شیر نے جھپٹ لیا۔ اب اسے ایک طرف بیٹھ کے کھائے گا سورا۔"

میں نے چور دروازے کو چھپانے والی جھاڑیوں میں کایا بدلی اور انسان بن گیا مگر اس مورنی کا کیا ہو گا؟ جب تک یہ خود سے خواہش نہ کرے پرندے سے لڑکی نہیں بن سکتی۔

میں نے اس زخمی پرندے کو بانہوں میں بھر لیا اور اس کے کان میں سنا کر کبھی اس کو اپنا چہرہ دکھا کر بار بار کہا۔ "مورنی! لڑکی بن جا مورنی۔ او مورنی! کایا بدل لے اب۔ میں تجھے اندر وہار میں لے جاؤں گا مورنی! لڑکی بن جا لڑکی۔"

مگر وہ زخمی پرندہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھتا تھا اور گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ خبر نہیں وہ پہچان بھی رہی تھی مجھے کہ نہیں پہچان پائی تھی۔ میں دیوانہ وار اس کے کان سے منہ لگائے پکارتا رہا۔ مورنی۔ مورنی۔

خوف سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ لڑکی مورنی اگر ہوش میں آتی ہے اور میری بات سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ خود کو لڑکی بننے کا حکم دیتی ہے تو یہ بچ سکتی ہے۔ بس اسی صورت میں اسے بچایا جا سکتا ہے۔ اندر لے جا کر اس کی مرہم پٹی کی جا سکتی ہے اور اگر اس نے کچھ دیر اور کایا نہ بدلی۔ مورنی پرندہ ہی بنی رہی تو پھر اس کا علاج کیسے ہو گا۔ بالکل نہیں ہو سکتا۔ یہ چڑیا بنے بنے مر جائے گی۔ یہ خوبصورت لڑکی۔ یہ کھلنڈری مورنی۔ میری باوفا دوست لڑکی نہیں بچ سکتی۔

اس کی پرندوں والی آنکھیں بند تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ گہری' مشقت کی ایک سانس آئی اور پھر کچھ دیر' بہت دیر' وہ بے حرکت پڑی رہی۔

یہ جا رہی ہے۔ یہ مجھ سے کچھ کہے بنا جا رہی ہے۔ بے زبان پرندہ بنی رخصت ہو رہی ہے۔ یہ انسان ہے ـــــ مگر ـــــ میں نے اس پر اپنا چہرہ جھکا دیا' الوداع تو کہہ دوں اسے' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مورنی! میری دوست۔ مورنی! خدا حافظ میری جان۔"

اس کے چڑیا پوٹوں میں حرکت ہوئی یا یہ میرا وہم تھا؟

میں نے بے تابانہ کہا۔ "مورنی آنکھیں کھول' جان۔"

اور اس نے ایک زبردست کوشش میں آنکھیں کھول دیں۔ عجیب بات تھی۔ یہ چڑیا کی آنکھ نہیں تھی۔ نہ ہی انسانی آنکھ تھی۔

میں نے ایک آخری کوشش میں دھیرے سے کہا۔

"مورنی! ہمت کر دوست! لڑکی بن جا۔ بدل لے اپنی کایا۔ انسان بن جا۔ میری گود میں ہے تو۔ شیر علی کی گود میں مورنی! لڑکی بن جا۔"

اس کی آنکھوں نے مجھے کہا۔ "ہاں۔" مگر وہ آنکھیں پھر ایک بار جھپک گئیں۔

"میں جانے نہیں دوں گا تجھے۔ جانے نہیں دوں گا۔ لڑکی بن جا مورنی! لڑکی بن۔" میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

یکلخت اس نے آنکھیں کھول دیں اور میرے دل نے جان لیا کہ وہ واپس آ رہی ہے۔

ان آنکھوں میں میرے لیے ایک پیغام تھا۔ "لو' میں آتی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی سیاہ غبار میری بانہوں کے گھیرے میں پیدا ہوا اور وہ پرندے سے لڑکی بن گئی۔

مگر ایک دم نڈھال بے ہوش اور زخمی لڑکی۔ میں نے پھولوں کی ٹوکری کی طرح اسے اٹھا لیا اور چور دروازے پر ٹھوکر ماری۔ چیخ کر کہا۔

"رشنا! میں شیر علی!"

دروازہ کھلا۔ دروازہ رشنا نے نہیں کوسومی نے کھولا تھا۔

میں نے بے تابانہ کہا۔ "کوسومی! اسے سنبھالو۔ مورنی کو گولی لگی۔ ہے۔"

اور کوسومی اگوا نے ایک چھوٹی سی شفیق ماں کی طرح باہیں پھیلا کر بے ہوش لڑکی کو لے لیا اور وہار کی بھول بھلیاں جیسی غلام گردشوں میں وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑی۔

O

اس کے بعد "جانور" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کریں۔

جانور
اسد محمد خان
2

میں لمحے بھر کے لیے پتھر کی ٹھنڈی دیوار کے سہارے کھڑا رہا۔ جی چاہتا تھا اس طمانیت میں ہلکا ہو کر کچھ دیر اور دیوار کے سہارے کھڑا رہوں۔ گلے میں کچھ اٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔

مگر یہ وقت کمزوری دکھانے کا یا آرام کا وقت نہیں تھا۔

کوسومی، لڑکی مورنی کو اٹھائے ہوئے اس عارضی "فیلڈ اسپتال" میں نہیں گئی جہاں میرباز اور بیالا کی مرہم پٹی ہوئی تھی جہاں اس وقت بھی میرباز کو رکھا گیا تھا۔ کوسومی اسے اپنے کمرے کی طرف لیے جارہی تھی۔

پیچھے پیچھے میں بھی کوریڈور میں نکل آیا۔ کوسومی لڑکی مورنی کو اپنے کمرے میں لے کر نہ گئی۔ وہ مراقبے اور ریاضت کے ہال کی طرف چلی اور دروازے پر ٹھہر گئی۔

میں نے دوڑ کر مراقبے کے بڑے کمرے کا سنگی پھاٹک کھولا۔ اندر ابھی تک وہ گدا پڑا تھا جو مورنی کہیں سے اٹھا لائی تھی۔ گدے پر اسی طرح سلیقے سے چادر بچھی ہوئی تھی جس طرح مورنی بچھا کر گئی تھی۔

کوسومی نے اسے آہستگی سے گدے پر لٹا دیا، مجھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ خود تیزی سے بے آواز پھاٹک کھول کر ہال سے نکل گئی۔

میں ان دانش مندوں کو یاد کرتا ہوا کہ جنہوں نے خوب غور و فکر کر کے فقیروں، بھکشوؤں کی "توجہ اور دھیان" کے لیے یہ وسیع ہال یا کمرہ بنایا تھا، گدے کے برابر دوزانو بیٹھ گیا۔ وہ جگہ ہی ایسی تھی کہ بے اختیار دعا کرنے کو جی چاہتا تھا۔

میں نے بغیر کسی تیاری کے پشتو میں دعا کی کہ "پروردگار! یہ لڑکی سب کی بھلائی کے لیے اور خدمت کے ارادے سے نکلی تھی۔ یہ لڑکی میرا بھی بھلا چاہتی تھی۔ اس کو تو نے اگر ایک بار اور زندگی کا تحفہ دے دیا تو یہ خاص کرم مجھ عاجز پر بھی ہوگا۔ ہر چند کہ میں تیری عنایتوں کا اس لڑکی سے زیادہ حق دار تو نہیں ہوں پھر بھی تو اگر مجھے کچھ دیے جانے کے قابل سمجھتا ہے تو مورنی کی زندگی مجھے انعام کر۔"

آہستگی سے پھاٹک کھلا اور وہار کا خادم مرد، بڑی عمر کی وہ عورت اور دو لڑکیاں کوسومی کے ساتھ مراقبے کے ہال میں داخل ہوئیں، ان کے ہاتھوں میں جراحی، مرہم پٹی کا سامان تھا۔

لڑکیوں نے قینچی لے کر مورنی کے بدن سے کپڑے کاٹ کر الگ کرنا شروع کر دیے۔ میں سر جھکائے ہال سے نکل آیا اور پھاٹک کے باہر سنگی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد کوسومی باہر آئی۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو اس نے آہستگی سے ہاں میں سر ہلایا۔ مورنی کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ کوسومی نے دھیرے سے کہا۔ "گولی بازو میں لگی تھی۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ دعا کرو بازو کام کا رہے۔ ویسے وہ ابھی ہوش میں نہیں آئی۔ وقت لگے گا مگر ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے سر ہلا کر اس کی بات سے اتفاق کیا۔

کوسومی کا چہرہ گمبھیر تھا۔ آہستہ سے کہنے لگی۔ "مگر وہ جسے تم نے اور مورنی نے باہر بھیجا تھا ابھی تک باہر ہی ہے۔"

"اوہ!" میں اس نامعلوم رضاکار کے لیے جو سانپ کی کایا میں احاطے سے باہر تھا فکر مند ہو گیا۔

میں کوسومی سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ میں نے اور مورنی نے اس کی واضح ہدایت اور خواہش کی خلاف ورزی جو کی تھی ___ اب اس کی خیر خبر لینا، اسے واپس لانا میری ذمہ داری ہے۔ میں نے ایک بار کوسومی کی طرف دیکھا آہستہ سے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" اور باہر جانے کے لیے چل پڑا۔

کوسومی نے ذرا آواز بلند کر کے پوچھا۔ "کہاں دیکھو گے؟" مگر اس نے یہ بات میری پشت سے کہی تھی۔ میں چلتا رہا۔

"رکو! شیر علی۔"

میں نے رک کر سر گھمایا اسے دیکھے بغیر کہا۔ "کوسومی! اسے احاطے کی دیوار پار کرنی ہو گی۔ مجھے خبر ہے دیوار کہاں سے پار کی جائے گی۔ میں دیکھ لوں گا۔"

"مگر شیر! کیسے دیکھو گے۔ تم جانتے بھی نہیں وہ کون ہے؟"

میں نے اسی طرح مڑے بغیر کہا۔ "جانتا ہوں ___ وہ سانپ کی کایا میں ہے۔" اور میں نے تیزی سے گھوم کر موڑ پار کیا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

"شیر! شیر علی!" کچھ دور تک کوسومی کی آواز آتی رہی۔

میں وہار کے چور دروازے سے نکل کر جھاڑی کی پناہ میں لمحے بھر رکا اور کایا بدل کر شیر بنا اور پھر میں کھلے میں نکل آیا۔ کوسومی کے پاس رک کر، اس بارے میں بات کر کے یا مشورہ لے کے میں اور شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اب آم کے نیچے جا کر دیکھوں گا کہ احاطے سے باہر نکلنے کے لیے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔

آم کے نیچے میرے بدلے میں مارے جانے والے لنگور بندر کی لاش اسی طرح پڑی تھی اور آم کے آس پاس اگی جھاڑیوں میں میرے یعنی شیر کے پہنچتے ہی کہیں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔

کیا وہی سانپ تو نہیں آ گیا؟ مگر نہیں لنگور کی لاش کا جائزہ لینے وہاں جنگل چوہے آنا شروع ہو گئے تھے۔

میں نے خاموشی سے آم کے درخت کا ایک چکر لگایا۔ حیرت ہوئی اوپر کی دونوں چوکیوں میں سناٹا تھا۔ شاید وہ شیر اور مورنی کے واقعے سے بیزار ہو کر یہاں سے ٹل گئے تھے ___ ہو سکتا ہے کھانا زہر مار کر رہے ہوں۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔

میں جھاڑی کی اوٹ میں گیا اور شیر سے انسان بن گیا۔

درخت کی سب سے بلند اور گھنی شاخ تک پہنچنا شیر علی کے لیے اب دوسری بار مشکل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے دوربین والا فوجی اپنے ساتھی سے اتنی باتیں سن چکا ہے کہ وہ ابھی اور کچھ دیر دوربین لے کر نہیں بیٹھے گا مگر میں نے دیکھا دونوں چوکیاں خالی تھیں۔ یہ عجیب بات تھی۔

ابھی تو ایسا ہوا نہیں کہیں مغالطہ تو نہیں ہو رہا؟ یا ایسا تو نہیں کہ ایک دو گارڈ چھپ کر کہیں بیٹھے ہوں؟

میں نے کئی طرح سے بار بار دیکھ کر اطمینان کر لیا۔ اس حصے میں دور دور تک احاطے کی دیوار خالی تھی۔ دونوں چوکیوں میں گارڈ نہیں تھے۔ یہی موقع کچھ کرنے کا تھا۔ میں نے دیوار پر جھکی ہوئی مگر دور رہ جانے والی آم کی ایک شاخ پہلے ہی تاک رکھی تھی۔

شاخ پر چاروں ہاتھ پیروں سے چلتا ہوا اپنا بدن سادھے میں احاطے کی دہری دیوار سے پانچ فٹ دور لٹکتی اس شاخ سے چمٹا ایک دم معلق جیسے جھولا جھول رہا تھا۔ یہ بہت خطرناک لمحہ تھا۔ میں نے سوچا۔ اگر کہیں سے کوئی دیکھ رہا ہو تو اس وقت میں اس کی زد پر ہوں۔

میں نے دل ہی دل میں الااللہ' کہہ کر چھلانگ لگا دی اور سلامتی کے ساتھ دہری دیوار پر پہنچ گیا۔ اب فوراً ہی دبک جانا اور اپنے حواس اکٹھے کرنا ضروری تھا۔

کہیں سے کوئی آواز' کوئی پکار نہیں آئی۔ میں محفوظ تھا۔ سامنے ایک چوکی اور باہر کی طرف کھجور کا وہ درخت تھا جسے مورنی نے سانپ کے چڑھنے اترنے کا رستہ بنایا تھا باہر دیوار کے نیچے کھجور کے درخت کے ساتھ بالکل ملا ہوا فوجی ٹینٹ لگا تھا اور ایک ٹرک کھڑا تھا۔ ٹرک میں ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔

ٹرک ڈرائیور اسٹیئرنگ پر جھکا ہوا ایک سوئی سے اپنے سامنے ٹینٹ میں کچھ دیکھے جارہا تھا۔ اس کا انہاک اتنا مکمل تھا کہ میں نے دیوار سے سر ابھار کر ٹرک کی طرف ایک کنکری پھینکی اور دبک گیا پھر جو سر اٹھا کر دیکھا تب بھی وہ اسی طرح شیشے کے پار سامنے خیمے میں دیکھے جارہا تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ٹرک میں کچھ بھی گرنے کی آواز نہیں سنی تھی۔

وہ خیمے میں کوئی بہت دلچسپ منظر دیکھ رہا ہوگا۔ اس نے ایک بار خود اپنی ران پر ہاتھ مار کر خاموش قہقہہ لگاتے ہوئے منہ کھول دیا تھا۔

ڈرائیور اگر اسی طرح کچھ دیر ٹینٹ کی طرف متوجہ رہا تو میں بڑی آسانی سے کھجور کے تنے کو اوٹ اور سیڑھی بناتے ہوئے دہری دیوار کے باہر اتر جاؤں گا لیکن میں نہتا تھا۔

مگر ہاں چوکی! مجھے اس خالی چوکی میں دیکھ لینا چاہیے۔ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔

میں آہستگی سے پیچھے ہٹ کر دیوار پر بنی گارڈز کی چوکی میں آیا۔ کوئی فوجی اپنے فائر آرمز چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا مگر ممکن ہے چوکی میں کوئی لاٹھی' بید' چاقو ____ کوئی بھاری بکل والی بیلٹ ہی پڑی مل جائے تو میرا کام نکل جائے گا میں نہتا نہیں رہوں گا۔

میرے ستارے اس وقت عروج پر ہوں گے۔ سامنے کھونٹی پر ایک کھکھری ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ اردو کے حرف واؤ سے ملتا جلتا نیپالی خنجر ہوتا ہے۔ بڑی ظالم چیز ہے۔ یہ حربہ اگر صحیح طرح استعمال کیا جائے تو ایک وار میں بھینسے کے پٹھے کی ہڈی تک ایسے اڑا سکتا ہے جیسے چاقو سے صابن کی ٹکیہ کاٹ دی جائے۔

چمڑے کے چوڑے نیام میں بڑی ریزر کی طرح تیز کھکھری میں نے اپنے ڈب میں لگائی اور ٹرک کو اوٹ میں رکھتے ہوئے کھجور سے اترنا شروع کیا۔ اس رخ سے دیکھتے

ہوئے مجھے لگا جیسے خیمے میں بہت سے آدمی ہیں۔ مجھے ان سے بچ کر اور ٹرک ڈرائیور سے بچ کر باہر کے جنگل میں گم ہو جانا ہوگا پھر وہیں چھپے رہ کر اس سانپ کا' وہار کے اس رضاکار کا کھوج اٹھانا ہوگا۔

مگر پہلا کام پہلے۔ میں کھجور کے پیڑ سے اتر کر خیمے کے پیچھے سے بے آواز نکلنا چاہتا تھا کہ ٹینٹ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔ کسی کی گھٹی ہوئی چیخ ____ پوری نہیں آدھی چیخ سنائی دی۔ خیمے کا کپڑا ایک جگہ سے یوں اٹھا پھر ٹھیک ہو گیا جیسے کوئی اس سے ٹکرایا ہو۔ کسی کے دبی زبان میں گالی دینے کی آواز سنائی دی اور ایک تھپڑ' زبردست طمانچہ مارا گیا۔

پھر ایک آواز نے ____ عورت کی آواز نے بددعا دی۔ "تیری نسل رک جائے۔"

مجھے لگا یہ بات' بددعا میں پہلے سن چکا ہوں۔

اور ہاں! یہ تو کوسومی کے قبیلے کی عورتوں کا کوسنا تھا۔

کوسومی کے اپنے قبیلے کی کوئی عورت اس خیمے میں ہے۔ اس پر تشدد ہوا ہے۔

اس ٹینٹ میں یقیناً وہار کی کوئی لڑکی ہے۔ بہت سے مردوں کا اس طرح چپ چپاتے لڑکی یا عورت کے ساتھ ٹینٹ میں موجود ہونا' پھر ڈرائیور کا انہاک ____؟ یہ بہت کھلا اشارہ ہے۔

میں نے گردن بڑھا کر ٹرک کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور نے اس وقت اپنے ہاتھ سے ایک رکیک اشارہ کیا تھا جیسے وہ خیمے میں موجود کسی دوسرے کو کسی فحش بات پر اکسا رہا ہو۔

خیمے سے عورت کی تکلیف کی گھٹی ہوئی سی چیخ سنائی دی۔ یہ جو بھی ہو رہا ہے یقیناً کسی کمزور کے خلاف زور آوروں کی کاروائی ہے اور کسی شک شبے کے بغیر ایک بے بس عورت کو گھیر لیا گیا ہے۔ اب میں رک نہیں سکتا۔

میں نے ڈب میں ہاتھ پہنچا کر نیام کی ہوئی کھکھری کھینچ لی۔ نیام سے باہر اس کا پھل آسمانی بجلی کی طرح ایک بار لشک گیا۔ ہتھیار کا یہ بڑھاوا میرے لیے ایک نشے کی طرح تھا۔ میں کھکھری تول کر جھپٹنے کو ہوا تھا کہ لگا کسی نے میرا شانہ چھوا ہے۔

میں تڑپ کر گھوم گیا۔ کھکھری والا ہاتھ میرے سر سے بلند ہو چکا تھا مگر میں نے ہاتھ وہیں روک لیا۔ جینز' ٹی شرٹ اور جیکٹ پہنے ایک ہاتھ میں تیار کیمرا اٹھائے

میرے پیچھے ایک گوری میم کھڑی تھی۔

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموشی کا اشارہ کیا پھر گونگوں کی طرح میرا ہتھیار والا ہاتھ دکھا کر مٹھی بند کی یعنی ہتھیار ابھی روکو' پھر اس نے اپنے کیمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود کو بتا کر میرے ہتھیار کی طرف اپنا کیمرا جھکا دیا۔ یعنی کہہ رہی تھی کہ کیمرا اس کا ہتھیار ہے پھر اس نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ اس کا نمبر پہلا ہے۔ وہ چاہتی تھی میں ابھی رکوں اسے پہلے کیمرا استعمال کرنے دوں۔ خیمے میں جو ہو رہا ہے وہ اسے کیمرے میں ریکارڈ کرنا چاہتی تھی۔

تجویز معقول تھی۔ میں نے اشارہ دیا' ٹھیک ہے۔

وہ حملہ آور چیتے کی طرح بے آواز چلی۔ میں کھکھری تولے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

میں گوری چمڑے والوں سے مرعوب نہیں ہوں مگر جو کام اس قدر سلیقے سے' جان کی پروا کیے بغیر میری ان آنکھوں کے سامنے کیا گیا ہو اسے میں کیسے اور کیوں جھٹلاؤں۔ وہ کیسی دلیر اور باصلاحیت عورت تھی۔

کیمرے والی میم خیمے کے پیچھے سے نکلی اور بالکل سامنے آئی پھر خیمے میں جو کچھ ہو رہا تھا ایک' دو اور تین اس نے فلیش لائٹ چلاتے ہوئے اپنے اعلیٰ کیمرے سے پے در پے اس کی تین تصویریں اتار لیں پھر وہ میری طرف گھومی اس نے ایک لفظ کہا۔

"ڈرائیور!"

میں سامنے کے شرمناک منظر سے نظریں ہٹا کر ٹرک کی طرف گھوم گیا۔

کیمرے والی نے بالکل آخر وقت میں مجھے خبردار کیا تھا وہ نہ معلوم کس پل میں دیکھ چکی تھی کہ ٹرک ڈرائیور نے ایک بھاری جرمن لیوگر پستول نکالا تھا اور وہ گوری میم کو نشانہ بنا چکا تھا مگر میم چوکنی تھی۔

جرمن لیوگر کے فائر سے غیر ملکی عورت یا اس کا کیمرا متاثر نہ ہوا۔ البتہ خیمے میں کوئی بھینسے کی طرح ڈکرایا اور الٹ گیا۔ زمین پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھی ہوئی کیمرے والی نے دھواں چھوڑتے پستول اور خیمے میں الٹتے ہوئے فوجی کو اپنی کھینچی ہوئی ایک اور تصویر میں محفوظ کر لیا تھا مگر یہ مجھے بعد میں پتا چلا۔ غور کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ میں مسلح ٹرک ڈرائیور کو غیر مسلح کرنے کی کارروائی کر رہا تھا۔

میں جھپٹ کر ٹرک پر چڑھا تھا اور میں نے کھکھری کے ایک ہی وار سے

ڈرائیور کا بازو پستول سمیت کاٹ کر گرا دیا تھا۔

اس کا لیوگر پستول اٹھاتے ہوئے اب میں خیمے کی طرف پلٹا۔ خیمے میں پانچ فوجی تھے اور پانچوں اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ فوری طور پر اپنا دفاع کر سکتے۔ ان کے بدن پر تو پورے کپڑے بھی نہیں تھے۔ ان کے ہتھیار خیمے کی ایک چارپائی پر ڈھیر تھے دوسری چارپائی پر ایک بے بس' بے لباس عورت تھی جسے وہ سب مل کر اپنی شیطانی خواہش کا نشانہ بنا رہے ہوں گے۔ عورت اس وقت منہ ڈھکے جیسے سکتے میں پڑی تھی۔

اس وقت وہ پانچوں فوجی گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ساتھی ٹرک ڈرائیور کی چلائی ہوئی گولی سے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کی مکمل برہنہ لاش خیمے کے کچے فرش پر پڑی تھی۔

پانچ فوجیوں میں سے ایک ہمت کر کے دوسری چارپائی کی طرف بڑھا یقیناً ہتھیار اٹھانے کو۔ میں نے پستول لہراتے ہوئے جست کی اور اس کے بعد چارپائی کے درمیان حملے کی پوزیشن بنا کر کھڑا ہو گیا' آدھا ننگا فوجی واپس اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں جا ملا۔ ہجوم کی نگرانی میم کے سپرد کر کے میں ہتھیاروں والی چارپائی گھسیٹ کر خیمے سے باہر لایا اور اپنے مطلب کی دو رائفلیں پسند کر کے ان کا میگزین سنبھال کر ہتھیار اور میگزین میں نے پوری طاقت سے وہار کے احاطے میں اچھال دیے۔ اس دوران میں بھی کیمرے والی نے خیمے والوں کی بہت سی تصویریں بنا لیں۔

پانچوں نے اب اپنے منہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی جو پہلے منہ ڈھکے تھی کیمرے کے فلیش کے سامنے آنکھیں جھپکتی اٹھی اور اب اس نے دہشت کی چیخیں مارنی شروع کر دیں۔

مگر یہ چہرہ' یہ چہرہ دیکھا ہوا ہے۔ یہ کون عورت ہے؟ او خدا' یہ تو وہ لڑکی ہے رشنا۔ یہ مورنی کی ہونے والی بھاوج رشنا ہے۔ وہ لڑکی جس سے ابھی ابھی وہار میں میری جان پہچان ہوئی تھی۔ یہ یہاں کیسے آئی؟

"رشنا___؟ تو یہاں کیسے آئی؟" میں بے اختیارانہ اس کی طرف بڑھا۔

کیمرے والی نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کا اوپری بدن ڈھک دیا تھا۔ رشنا نے خود کو پلنگ کی چادر میں لپیٹنے کی کوشش کی۔ اس کا چیخنا بند ہو گیا تھا۔ روتے ہوئے اس نے میرا نام لیا "شیر علی___ شیر" اور پلنگ پر دہری ہو کر ہچکیوں سے پھر رونا شروع کر دیا۔

میں نے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیمرے والی عورت میرے پاس آئی اس نے انگریزی میں پوچھا کہ کیا میں یہ زبان جانتا ہوں؟ میرے ہاں کہنے پر اس نے کہا۔ "ہم آدھے گھنٹے میں یہاں سے ہٹ نہ گئے تو تمہاری میری سب محنت اکارت جائے گی۔ بھاگو۔ بس لڑکی کو ساتھ لو اور بھاگ کھڑے ہو۔"

میرے ذہن میں منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔

وہ اپنا کیمرا سنبھال کر کیس میں رکھ چکی تھی۔ میں نے ایک رائفل تیار کر کے ان بدمعاشوں کی طرف سیدھی کی ہوئی تھی۔ میم نے رشنا کو چادر اور جیکٹ میں جیسے تیسے لپیٹا اور اس کے شانوں کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیے وہ درختوں بھرے جنگل میں داخل ہو گئی۔ میں نے پکار کر اس سے کہا۔ "تم چلی جاؤ میں ان بدمعاشوں کو ابھی روکے کھڑا ہوں۔"

جاتے جاتے اس نے کہا۔ "تم ہمیں بوڑھے سادھو کے پاس تلاش کرنا۔" یہ بات ظاہر ہے اس نے انگریزی میں کہی تھی اور "بوڑھے سادھو" جو کہا تھا وہ میں آسانی سے سمجھ گیا تھا۔ بڑی سڑک کے کنارے جنگل سے ملا ہوا برگد کا بہت بڑا جٹادار درخت تھا جسے وہار والے اس نام سے پہچانتے تھے۔ فوجی سپاہیوں میں اگر کوئی انگریزی سمجھنے والا بھی ہو گا تو بوڑھے سادھو کا حوالہ اس کے پلے نہیں پڑا ہو گا۔

میں نے احتیاطاً گرلز ہاسٹل اور وہار کی عمارتوں پر اور احاطے کی وہری دیوار پر نظر دوڑائی۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ مجھے انتظار کرنا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ جٹاؤں والے اس پرانے برگد تک پہنچنے میں وہ دونوں پانچ منٹ لیں گی اور میں دوڑتا ہوا چلا تو دو ڈھائی منٹ میں پہنچ سکتا ہوں۔

میں تین منٹ تک ان پانچوں حرام خوروں کو اور ٹرک میں بے ہوش پڑے ڈرائیور کو اپنی رائفل کی زد پر لیے رہا اور پھر میں نے دور برگد کی مخالف سمت سے آتی کار کے انجن کی آواز سنی۔ یہ فوج کی پٹرولنگ کرنے والی جیپ ہو سکتی تھی۔

اپنی رائفل کی نال سے میں نے انہیں آخری بار دھمکایا اور گھنے جنگل میں دوڑتا ہوا داخل ہو گیا۔

مین نے سوچا دو رائفلیں، ایک پستول اور پھر نیپالی کھکھری بھی ___ اتنا بوجھ کس لیے؟ میں نے بھاگتے میں کھکھری اور نیام جنگل میں پھینک دی۔ یہ فائر آرمز میرے اور اگر ضرورت پڑی تو باقی دو عورتوں کے بھی کام آ سکتے تھے۔

بھاگتے ہوئے میں اس خیمے سے اور وہار کی چہار دیواری سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا اور پٹرولنگ کرنے والی جیپ سے بھی دور ہو رہا تھا۔

بے شک میں دور ہو رہا تھا مگر اتنا دور بھی نہیں تھا۔ کسی نے مجھے ڈرانے کو کسی چوکی سے فائر کیا یہ فائر کرنے والا دیوار پر سے مجھے دیکھ رہا ہو گا۔ اس نے شاید مجھے رک جانے کا حکم بھی دیا تھا۔ اب میں جٹا والے برگد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر فائر کرنے والے کے پاس دوربین لگی رائفل ہے تو اگلی دفعہ وہ مجھے آرام سے مار گرائے گا۔ اگر معمولی گن یا رائفل ہے تو پھر مشکل ہے۔

ایک اور فائر ہوا اور گولی میرے کندھے پر ٹنگی ہوئی ایک رائفل کے بٹ پر لگی۔ گولی کے دھکے سے میں بھاگتے ہوئے بے توازن ہو گیا اور منہ کے بل جا گرا مگر پھر اٹھا۔ خود کو اور اپنے بوجھ کو سنبھالتے ہوئے چار قدم دوڑا ہوں گا کہ پھر فائر ہوا گولی اس بار درخت میں پیوست ہو گئی۔ میں نے خود یہ آواز سنی اور لرز کر رہ گیا۔ یہ میں دوسری بار اس نشانچی کی گولی سے بچا ہوں۔ گولی سمجھو میرے سر سے دو انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ میں خوف سے لڑکھڑا گیا۔ اسی وقت درخت کے پیچھے سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر طاقت سے مجھے کھینچ لیا۔ میں اب درخت کی اوٹ میں آ گیا تھا۔

یہ کیمرے والی میم تھی۔ ہم "بوڑھے سادھو" یعنی اس جٹا دھاری برگد کے نیچے موجود تھے۔ درخت کے نیچے گوری میم کی پرانی فوکس ویگن کھڑی تھی اور فوکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر چادر میں لپٹی رشنا بیٹھی تھی۔

گوری میم نے وہ رائفل دیکھی جس کے بٹ پر گولی لگی تھی۔ رائفل کا کافی نقصان ہو گیا تھا۔ اس نے وہ میرے شانے سے کھینچ کر زمین پر ڈال دی۔ مجھ سے بولی۔ "بس بیٹھ جاؤ۔ دیر مت کرو۔ ہمارے پیچھے ان کی جیپ چلی آ رہی ہے۔"

میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ گشت کرنے والی جیپ تھی۔

میں اور میم اس کی پرانی گاڑی میں بیٹھ گئے اور برگد کے نیچے سے دیوانہ وار گاڑی بھگاتی ہوئی وہ بڑی سڑک پر آ گئی۔

اس وقت تک گشت کرنے والی جیپ نے دیکھ لیا تھا کہ انہوں نے فائرنگ کی جو آواز سنی تھی تو وہ کیا قصہ ہو گا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ بڑی سڑک پر تیر کی طرح اڑتی جاتی اس پرانی فوکس ویگن کو وہ نکلنے نہیں دیں گے۔

اس غیر ملکی عورت کی گاڑی دیکھنے میں بدحال اور پرانی تھی مگر اس کا انجن اور

ٹائروں کی حالت ایسی تھی کہ سرکاری جیپوں کو آسانی سے پیچھے چھوڑ سکتی تھی اور اس نے پیچھے چھوڑ بھی دیا مگر جیپ سے ایک فائر کیا گیا۔ یہ شاید وارننگ دی گئی تھی۔

گوری میم بڑبڑائی۔ ''اگر دو کلو میٹر ____ بس ہم دو کلو میٹر تک اور ہٹ نہ ہوں تو پھر ان کی پہنچ سے دور ہو جائیں گے۔''

وہ عجیب بات کہہ رہی تھی۔ دو کلو میٹر بعد یہ تو ہو گا نہیں کہ ہم اس ملک کی سرحد سے باہر ہو جائیں گے۔ دو کلو میٹر بعد بھی ہم رہیں گے تو اسی برما میں۔ یعنی برمی فوج کے دائرہ اثر میں ان کی گرفت میں۔ مگر مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ اگر دو کلو میٹر ہی کی بات ہے تو کچھ ضرور کرنا ہو گا۔

میں نے رائفل فائر کے لیے تیار کی اور میم سے کہا۔ ''گاڑی ترچھی کر کے مجھے فائر پوزیشن لینے دو۔ میں ان کا ٹائر اڑانا چاہتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''او کے' مگر صرف ٹائر! کسی آدمی کو ہٹ مت کرنا ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔''

''فکر مت کرو۔''

اس نے کہا۔ ''تیار!'' اور ایک لمحے کا انتظار کر کے اس نے گاڑی کو بریک دینے کے ساتھ ہی سڑک پر بائیں طرف گھما دیا۔ کچھ دور ہمارا پیچھا کرتی آنے والی ان کی جیپ میرے نشانے پر تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے چلتی گاڑی سے اپنی طرف دوڑتی آتی جیپ پر ایک اور پھر دوسرا اور تیسرا فائر کیا۔ پہلے دونوں ٹِنگ کی آواز کرتے جیپ کی فولادی باڈی سے ٹکراتے کہیں سے کہیں چلے گئے میرا تیسرا فائر اگلے ایک ٹائر پر لگا۔ اس زبردست آواز سے ٹائر پھٹا کہ لگا جیسے میں نے جیپ پر بم مارا ہے۔ ان خبیثوں کی جیپ چوڑی سڑک پر پوری گھوم کر بہت آواز کرتی آخر کار رک گئی۔

اس مشاق لیڈی ڈرائیور نے فائر پورے ہوتے ہی گاڑی کو پھر سڑک پر سیدھا کر لیا اور بے پرواہ نوجوان کی طرح ٹھٹھا مارتے ہوئے اپنی پرانی مگر مضبوط فوکس ویگن کو خالی سڑک پر تیز کر دیا۔

میں نے مڑ کر شیشے کے پار دیکھا سرکاری جیپ بیچ سڑک پر الٹی طرف منہ کیے کھڑی تھی اور اس سے کود کود کے خاکی وردی والے اتر رہے تھے۔

اگلے ہی لمحے ان میں سے دو نے سڑک پر گھٹنے ٹیک کر نہایت جان باز ماہر مانڈوز کی طرح پوزیشن لے لی اور اب ہماری اس زگ زیگ لہراتی جاتی فوکس ویگن پر

فائرنگ شروع کر دی۔ بدمعاش کہیں کے۔

ہم اگلے ڈیڑھ منٹ میں ایک لمبے راستے سے مانگ یان کالج کمپلیکس کے صدر دروازے پر آن رکے۔ یہاں فوجیوں' اخبار نویسوں' تماشا دیکھنے والے برمی باشندوں اور بہت سی گاڑیوں' ٹرکوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ میں نے میم سے پوچھا۔ ''یہاں؟ کیوں؟''

بولی۔ ''یہ سامنے وائس آف جرمنی کی نیوز یونٹ کا ٹریلر کھڑا ہے۔''

''تو اس سے کیا ہو گا؟''

وہ ہنسی۔ ''تم خاموشی سے رائفل اور پسٹل گاڑی میں چھوڑ کر سب کو اپنے خالی ہاتھ دکھاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ہم نیوز والے ٹریلر میں جا رہے ہیں۔''

جیسا اس نے کہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ ویسا ہی کروں گا۔ میں فوکس ویگن سے اترنے کو تیار ہو گیا۔

مگر مجھے اتارنے سے پہلے میم نے جرمن زبان میں پکار کر ان ٹی وی کیمرے والوں سے کچھ کہا تھا۔ جو نیوز ٹریلر کے پاس مستعد کھڑے تھے۔ وائس آف جرمنی کے دو کیمرے پورے ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت تک تماشا دیکھنے والا ہجوم اور فوج کے گارڈز وغیرہ بھی دیکھنے لگے تھے۔

ان وقت تک ہم آدھی بیرک' جتنے لمبے ایلومینیم کے ٹریلر اور اسے ٹھنڈا رکھنے اور پانی بجلی فراہم کرنے والی مددگار گاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

گوری میم نے کیمرے میں دیکھتے ہوئے چیخ کر انگریزی میں کہا۔ ''یہ وہ نوجوان آدمی ہے جس نے جان پر کھیل کر مانگ یان کالج ہاسٹل کی ایک طالبہ کو جنسی جنونی فوجیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے بچالیا ہے۔ اگرچہ وہ اسے چھ کی نفری کی طرف سے ریپ کیے جانے سے نہیں بچا سکا۔'' میرے ساتھ چلتے اور یہ کہتے ہوئے اس نے نیوز یونٹ کے ٹریلر کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکا دے دیا۔

اندر مددگار ہاتھوں نے مجھے سہارا دے کر اسٹول پر بٹھا دیا۔

ٹریلر کے کھلے دروازے سے میں نے دیکھا وہ تیز قدموں سے چلتی دوبارہ اپنی فوکس ویگن کی طرف گئی اور دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر اس نے رشنا کو پچھلی سیٹ سے اٹھایا اور خود سے بھڑائے ہوئے گاڑی سے باہر لائی۔ کیمرے یہ سب ریکارڈ کر رہے تھے۔

مظلوم رشنا ایک ہاتھ سے میم کی وہ جیکٹ سنبھالے تھی کہ جس سے اس کا اوپر کا بدن ڈھکا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بے ڈھنگے پن سے لپٹی ہوئی چادر پکڑے چلی آ

رہی تھی۔ اترتے ہوئے خدا معلوم دھوکے سے یا موقع کے ہیجان میں گوری میم کا پیر چادر کے ایک کونے پر پڑ گیا اور چادر گاڑی کے دروازے اور رشنا کے اور میم کے پیروں سے لپٹ کر کھلی اور وہیں رہ گئی۔ غریب لڑکی لمحے بھر کو کمر سے نیچے بالکل کھلی ڈلی سڑک پر کھڑی رہ گئی تھی۔

میں نے چیختے ہوئے اور بدن ڈھانکنے میں لڑکی کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھو لوگو! یہ وہ لڑکی ہے۔"

ہجوم نے جیسے انتہائی حیرت اور تکلیف کی ایک آواز نکالی۔ "اوہ ___ وہ!"

وائس آف جرمنی کی دونوں کیمرا یونٹوں نے یہ منظر اور یہ آوازیں ریکارڈ کر لیں۔

گوری میم نے رشنا کو سہارا دے کر ٹریلر پر چڑھا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر میں نے سہارا دے کر رشنا کو اسٹول پر بٹھا دیا۔

وہ بیٹھے بیٹھے چکرا رہی تھی۔ میں نے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "حوصلہ رکھ رشنا! میں ہوں تیرے پاس میم صاحب ہے۔ ہم سب ہیں۔"

سامنے ٹریلر کی چھوٹی سی شیشہ بند کھڑکی سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ باہر کی آوازیں اب پوری طرح نہیں سنائی دیتی تھیں۔

میں نے دیکھا گوری میم اب اپنی فاکسی کے پاس گئی اور اس نے پہلے اپنا کیمرا سنبھال کر تسمے کے ساتھ گلے میں پہنا۔ گلوکمپارٹمنٹ سے اپنے کاغذات نکالے۔ جیبی رومال سے پکڑ کر برمیوں کی فوجی رائفل اور لیوگر پسٹل ہجوم کو اور کیمروں کو دکھا کر گاڑی کے پاس ہی زمین پر ڈال دیے اور تماشا دیکھنے والوں اور فوجیوں کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ٹریلر کا دروازہ کھول‘ خود بھی اندر آ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

میں نے دیکھا ٹھیک اسی وقت پٹرولنگ کرنے والی جیپ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی اور میم کی فوکس ویگن کے برابر آ کر ایسے رکی کہ جیپ کے ٹائروں کی چرچراہٹ سن کر میم نے مسخرے پن میں آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کہ وہ لوگ فاکسی کو ٹکر ہی مارنے والے ہیں۔

جیپ والے فوجیوں کے ساتھ اب گیٹ پر موجود فوجیوں نے بھی میم کی فاکسی اور نیوز یونٹ کے ٹریلر کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی دو بکتر بند گاڑیاں بھی سامنے لا رہے تھے۔

دونوں کیمروں نے گھوم پھر کر اب یہ پورا منظر یہ سب آوازیں ریکارڈ کرنا شروع کر دی تھیں۔

ٹریلر میں ایک طرف سے تھری پیس سوٹ پہنے ایک گورا نکل کر آیا۔ اس نے بہت غصے سے امریکی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے گوری میم سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

وہ ہنسی‘ کہنے لگی۔ "تم نے سب کچھ ریکارڈ کر لیا ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ٹیپ ری وائنڈ کر کے دیکھ لو۔"

تھری پیس سوٹ والے نے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بکتر بند لے آئے ہیں۔ ہمیں گھیر لیا ہے انہوں نے۔"

عورت نے ٹھٹھا لگایا۔ "مجھے یہ بھی مت بتاؤ یہ سفارتی معاملہ ہے۔ یہ تمہارا بے بی ہے‘ سنبھالو۔ میں اور میرے دونوں مہمان اب اس ٹریلر میں رہیں گے انہیں فوراً کچھ پینے کو دو۔ سفارتی قانون کے مطابق یہ ٹریلر جہاں تک ہے وہ مغربی جرمنی کی ملکی حدود ہیں۔ جب تک ہم تینوں اس ٹریلر میں ہیں برما کی فوج ہو یا سویلین ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس دعا کرو طوفانی بارشیں نہ شروع ہو جائیں کیونکہ بارشیں کسی سفارتی تحفظ کا خیال نہیں کرتیں۔ ہمارے ٹریلر کے لیے بہت دن تک یہاں کی سڑکیں خراب کر دیں گی۔"

تھری پیس سوٹ والے نے غصے میں اپنا منہ بگاڑ کر "اچھا!" کہا۔

میم ہنسی‘ بولی "یہی اچھا تمہاری صورت پر بھی‘ اب جاؤ باہر جا کر موسیقی کا سامنا کرو۔ ہم تینوں بہت پیاسے ہیں کچھ پینا چاہتے ہیں ___ ہاں بھئی ہر من!" میم نے یہ آخری بات ایک اور گورے سے کہی تھی جو مسکراتا سر ہلاتا ایک طرف چلا گیا۔

کیا قیامت کی دانش مند اور دلیر عورت تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم دونوں کو اور خود کو اس تمام الجھن سے ایسی چابک دستی سے نکال لائے گی۔

یہ جگہ بین الاقوامی قوانین کے مطابق پولیس‘ فوج یا قانون شکن شہریوں‘ سب کی پہنچ سے محفوظ تھی۔ یہ ٹریلر مغربی جرمنی کے سفارت خانے کا تکنیکی مرکز اور اس وقت مغربی جرمنی کے سفارت کاروں کی ایک رہائشی یونٹ تھی اس لیے سفارت خانے کی حدود میں شامل تھی اور سفارت خانے کی عمارت تو سب جانتے ہیں اسی ملک کی حدود شمار ہوتی ہے جس کا پرچم عمارت پر لہرا رہا ہو اور جس کا سفارتی عملہ اپنے سفارتی فرائض

کی ادائی میں اس جگہ مصروف ہو۔ اس ٹریلر پر مغربی جرمنی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس پر سفارتی نمبر پلیٹ لگی تھی اور مغربی جرمنی کا نائب پریس اتاشی' وہی تھری پیس سوٹ والا' پوری ذمہ داری کے ساتھ سرکاری ٹی وی سروس کی مدد کے لیے یہاں موجود تھا۔

میں نے کھڑکی سے دیکھا نائب پریس اتاشی اپنی واسکٹ کی جیبوں میں انگوٹھے پھنسائے برمی فوج کے افسروں کو کسی شک شبے کے بغیر سفارتی تحفظ کے قانون پر لیکچر دے رہا تھا۔

گوری میم نے ٹریلر کے آدمی ہرمن کا لایا ہوا کوک میری طرف بڑھا دیا اور رشنا کو اسٹرا دے کر اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے باہر تقریر کرنے والے تھری پیس میں ملبوس سفارت کار کے بارے میں ہنس ہنس کر بتانے لگی کہ موڈ بگڑ جائے تو وہ بہترین سفارت کار بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ مقامی برمی کمانڈروں کی ایسی تیسی کر رہا ہو گا۔ کہنے لگی۔ "باہر ان کو ادھیڑ کر یہاں ٹریلر میں آئے گا تو مجھ پر جھپٹ پڑے گا باؤلا ہے مگر ہے بہت ہی لائق آدمی ___ ہاہاہا۔"

ہم کوک پی کر فارغ ہوئے تو گوری میم نے اپنا تعارف کرایا بولی۔ "میں مسز گی زل ہوں۔ ہنا گی زل۔ تم دلیر آدمی ہو تم مجھے ہنا کہہ سکتے ہو۔ یہ بتاؤ وہاں ٹینٹ کے پاس کھکھری سنبھالے تم کیسے موجود تھے؟"

میں نے مدد کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ کون مدد کرتا۔ مجبوری تھی بتانا ہی پڑا' میں نے کہا۔ "میں اندر وہار میں پھنس گیا تھا۔ اسی وقت دیوار کود کے باہر آیا تھا۔"

"ہم م۔" اس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ "اندر کیا واقعی کوئی بھاگا ہوا قیدی ___ کوئی شیر الی ___ موجود ہے۔ یا یہ لوگ بہانہ بنا کر گھسنا چاہتے ہیں؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے توقف کیا۔ وہ میری صورت تکے جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "نہیں اندر اب کوئی شیر علی نہیں ہے۔"

"آہ! سمجھی ___ اور ہاں' ٹھیک تو ہے۔ لڑکی نے تمہیں نام لے کر پکارا تھا۔ شیر؟ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ ہنسی۔ "اندر اب کوئی شیر علی نہیں ہے۔ ہاہاہا۔"

میں نے شرمندگی سے ہاں میں سر ہلایا۔

ہنا نے پوچھا۔ "اندر مرد کتنے ہیں؟ ٹھہرو بتاتی ہوں۔ ہاں ایک کک اور ایک ڈرائیور اس وقت بس دو' وہ لیٹر جو مجھے اندر سے ملا ہے وہ تم ہی نے لکھا ہو گا۔ اندر ایک تم ہی انگریزی پڑھے لکھے مرد ہو گے۔ وہ خط مرد کے لہجے میں لکھا گیا تھا۔ رائٹ؟"

میں نے سٹپٹا کر اس کا لفظ دہرا دیا۔ "خط۔"

کہنے لگی۔ "ہاں خط جو یہ لڑکی لائی تھی۔" اس نے رشنا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

خدایا! تو یہ رشنا تھی جو سانپ کی جون میں باہر آئی تھی۔ یہ رشنا تھی جس نے جان پر کھیل کر خط پہنچایا؟ میرا حلق خشک ہو گیا۔

مورنی نے اور کوسومی نے تو یہ بات مجھ سے چھپائی تھی۔ چھپانی بھی چاہیے تھی۔ اب ہنا کی لاعلمی اور سادگی میں یہ خطرناک بات میرے علم میں آ گئی ہے۔ خدا رحم کرے۔ ایسا تو نہیں کہ یہ بات جاننے والا میں ساتواں آدمی ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو رشنا بے چاری تو گئی۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ختم ہو گئی یہ لڑکی۔

ہنا گی زل میری صورت دیکھے جا رہی تھی۔ ایک دم کہنے لگی۔ "کیا بات ہے؟ تم پیلے پڑ گئے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہوں ___ اس ___ اس لڑکی کی طرف سے پریشان ہو گیا میں ___ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

ہنا اٹھ کر ایک طرف کو چلی گئی۔ "ضرور تم پوچھو میں ابھی آئی۔"

رشنا ہم دونوں کو انگریزی میں باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے قبیلے کے ساتھ زیادہ وقت گزارا ہو گا اسی لیے اسے انگریزی زبان کی اتنی سمجھ نہیں تھی مگر اسے احساس ہو گیا تھا کہ خود اسی کے بارے میں کوئی بات کی گئی ہے۔

ہنا کے جاتے ہی میں اس کی طرف مڑا تو خود ہی دھیرے سے بولی۔ "کیا کوئی میری بات ہے؟ کیا ہے؟"

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "رشنا! پہلے پوری بات سن لینا۔ سمجھ لینا۔ پھر جواب دینا۔"

بولی۔ "اچھا ___ ایسا ہی کروں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "تم ایک خط لائی تھیں اس گوری میم کے لیے؟"

اس نے بات سنی' لمحے بھر رک کر ہاں میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں یہ خط مورنی نے دیا تھا۔"

اس نے پھر ہاں میں سر ہلایا۔

"خط لے کر تم وہار سے باہر کس طرح آئیں؟"

اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک لہر آئی، گزر گئی۔ سنبھل کر بولی۔ "مجھے باہر آنے کا ایک رستہ معلوم ہے۔"

ویسے ہی وہ بڑی عذاب ناک کیفیت سے گزر کر آئی تھی۔ میں اسے زیادہ پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر ایسی نازک صورت حال تھی کہ اصل سوال سے پہلے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "کیا وہ رستہ ایک پرنالے، پتھر کی ایک ڈھکی ہوئی نالی اور کھجور کے درخت سے ہو کر گزرتا ہے۔"

رشنا کے چہرے پر خوف اب جیسے ایک نقاب کی طرح منڈھا ہوا تھا۔ وہ ہکلا کر بولی۔ "خبر نہیں شیر علی تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے اتنی ہی نرمی سے پوچھا۔ "کیا مورنی کو گھنٹے بھر بعد آنا تھا؟ تمہیں لینے ___ تمہیں لے جانے کو ___ آنا تھا اور وہ نہ آ سکی تھی؟ کیا اسی لیے تم باہر اکیلی رہ گئی تھیں؟"

رشنا کا چہرہ روہانسا ہوا مگر اس نے خود پر قابو پایا پھر بھی بے تاب ہو کر پوچھا۔ "مورنی کو کچھ ___ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟"

مجھے اب یقین ہو گیا کہ رشنا ہی کایا بدل کر آئی تھی۔ مجھے آخری سوال پوچھنا تھا ___ اور وہ میں نے پوچھ لیا۔ "رشنا! خوب سوچ کر جواب دو، بتاؤ مجھ سے پہلے کتنوں کو یہ معلوم ہے کہ تم کایا بدل کر کچھ ___ کچھ بن سکتی ہو؟"

اس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھیں ایک ہیجان سے روشن تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ ایک منٹ سے زیادہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش ہے نہ چاہتے ہوئے بھی آدمی اسے دیکھتے رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر شعوری کوشش سے اس نے نظر ہٹائی اور دھیرے سے بولی۔ "سوچتی ہوں، بتاتی ہوں ___ تم کو ملا کے ___ تمہیں ملا کے چار، بس چار کو خبر ہے۔"

میرے سینے سے جیسے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ وہ مجھے مسکراتا دیکھ کر خود بھی پرسکون ہو گئی مگر اگلے ہی پل بے تابی سے بولی۔ "تم نے بتایا نہیں شیر علی! مورنی کیوں نہیں آئی تھی؟"

میں نے کہا۔ "پریشانی کی بات ہو گئی تھی مگر اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ اسے مورنی کو ___ دیوار پر کسی نے شکار سمجھ کر گرا لیا تھا۔ بازو میں گولی لگی تھی۔ ٹھیک ہے وہار میں ہے۔ کوسومی اسے دیکھ رہی ہے۔"

وہ سختی سے منہ پر ہاتھ جمائے جھکی ہوئی کچھ دیر روتی رہی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر تھپکا۔ "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے بڑی ہمت سے خود کو سنبھالا سر اٹھا کر بولی۔ "تم نے رشنا پہ بڑا احسان کیا ہے شیر علی! تم رشنا کو لینے باہر آئے۔ تمہیں گولی بھی لگ سکتی تھی۔ میں کس طرح چکا سکوں گی یہ احسان؟"

میں نے کہا۔ "ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ ہمت باندھے رکھو اور خود کو دکھی مت کرو سمجھی لڑکی؟ بس یہی طریقہ ہے احسان چکانے کا۔"

وہ آہستہ آہستہ ہاں میں سر ہلاتی رہی اور دھیمے دھیمے روتی رہی مگر یہ رونا تکلیف کا رونا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا اب وہ پرسکون ہوتی جائے گی۔

ہنا گی زل کافی کے دو مگ اٹھائے ہوئے آئی۔ سیاہ کافی تھی، اس نے ایک مگ مجھے تھما دیا۔ رشنا کا رخسار تھپک کر بولی۔ "میں اتنی صحت مند جلد والی پیاری لڑکیوں کو بلیک کافی نہیں پینے دیتی۔ تمہاری کریم کافی ہرمن لا رہا ہے۔"

رشنا کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی مسکرا دی۔

ہنا اپنا اسٹول میرے برابر کھینچ لائی بولی۔ "شیر علی! تم رنگون جیل سے کیوں فرار ہوئے تھے؟"

میں نے کافی کا مگ منہ سے ہٹا لیا، "ہنا! یہ بڑی لمبی کہانی ہے ___ میں ضرور تمہیں پوری کہانی سناؤں گا۔ مختصر یہ سمجھ لو کہ مجھے ایسٹ پاکستان میں کاکسیز بازار سے اغوا کر کے زبردستی برما کی سرحد میں لا کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس سازش میں برمیز بارڈر پولیس کے لوگ اور بعض فوجی افسر بھی شامل تھے؟"

ہنا مسکرائی پھر آنکھ دبا کر شرارت سے بولی۔ "تم کوئی بہت بڑے انقلابی ہو؟ چے جیسے یا ماؤ جیسے؟ یہ سب تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذرا روکھے پن سے کہا۔ "ہنا تمہیں بڑے انقلابیوں کے نام ضرور یاد ہوں گے تم رپورٹر جو ہو مگر اچھے رپورٹر چھوٹے ملکوں کے چھوٹے مسئلوں کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ ایسٹ پاکستان میں "بنگلہ دوست" کا جو ناٹک ابھی

شروع ہوا ہے اس کا تمہیں کچھ آئیڈیا تو ہو گا؟ اور سرحد پار کسی چھوٹے سے شہر میں بیٹھ
کے پاکستان کے خلاف کچھ لوگ آپس میں مشورے کر رہے ہیں۔ تمہیں اس کا بھی علم ہو
گا۔ سوم ناتھ دتہ ایک چھوٹا سا فتنہ انگیز آدمی ہے۔ تم نے اس کا نام بھی سنا ہو گا؟؟

"دتہ؟ دتہ؟ آئی سی ___ یہ نام بالکل سنا ہے۔ ادھر ہی برما میں سنا تھا۔ اب وہ
یہاں نہیں ہے مگر میں جانتی ہوں اس نام کا کیا مطلب ہے۔"

"دتہ اس وقت ایسٹ پاکستان میں ہے۔ اس نے میرے باپ کا گیسٹ ہاؤس
ہتھیا لیا ہے۔ وہاں اس نے اپنا جاسوسی کا اڈا بنایا ہے۔"

ہنا میری باتوں سے متاثر ہوئی تھی۔ وہ کھسیا کر مسکرانے لگی۔ میری پیٹھ تھپک
کر بولی۔ "میری باتوں کا برا مت ماننا۔ پچھلا ایک گھنٹا میں نے بڑے ہیجان میں گزارا ہے۔
مگر ہیجان میں تو تم بھی رہے ہو۔ تم شاید مضبوط آدمی ہو شیر علی! میں برمی حکومت کا
پرابلم سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ تمہارا اور بنگلہ دوست کا مسئلہ تو میں سمجھ گئی۔ ہاتھ
ملاؤ___ اس ایشو پر ہنا گی زل تمہارے ساتھ ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہنا نے ہنستے ہوئے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ لگتا تھا ہم
دونوں میں جو تھوڑی بہت بدمزگی شروع ہوئی تھی وہ اب نہیں رہی۔

مگر یہ چھوٹا ٹریلر اگلے ہی لمحے بدمزگی اور چڑچڑے پن سے پھر بھر گیا۔ نائب
پریس اتاشی، وہی تھری پیس سوٹ والا گورا، باہر سے آیا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر میرے
سامنے کھڑا ہو گیا بولا۔ "تم انگریزی جانتا؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہاں میں جانتا ہوں تو وہ اسٹول کھینچ کے جیسے میری ناک
سے اپنی ناک بھڑا کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تم نے بہت سے سویلین مارے ہیں؟ ان کے علاوہ
ایک برمیز آرمی افسر، ایک سولجر قتل کیا ہے ایک اور سولجر کو کسی دھارے دار آلے سے
ہاتھ کاٹ کر اپاہج بنا دیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آخری بات کے سوا سب کچھ غلط ہے۔ میں نے کوئی قتل نہیں
کیا۔"

نائب اتاشی نے پوچھا۔ "تمہارا نام شیر علی خان ہے؟"

میرے بجائے ہنا بولی۔ "ہاں اس کا نام شیر علی خان ہے۔"

نائب اتاشی نے چیخ کر کہا۔ "تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔"

ہنا اتنی ہی بلند آواز میں چیخی۔ "میں اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتی۔ میں

شیر علی خان کی اٹارنی ہوں۔ وکیل ہوں اس کی، اور یہ بات شیر علی سے معلوم کی جا سکتی
ہے۔ شیر علی! کیا میں درست کہہ رہی ہوں؟" وہ میری طرف مڑی اور اس نے آنکھ دبا
کر اشارہ کیا کہ میں ہاں کہہ دوں۔ میں نے ہاں کہہ دیا۔

وہ اتاشی کی طرف مڑی۔ "دیکھا؟ اب یاد رکھو یہ میرا موکل ہے اور یہ براہ
راست بات نہیں کرے گا۔ میرے واسطے سے تمہارے سوالوں کے جواب دے گا۔ اچھا
کہو، تمہارا اگلا سوال کیا ہے؟"

اتاشی نے کسی بہت تھکے ہوئے آدمی کی طرح ہنا کو دیکھا اور کہا۔ "میں اس
وقت اور کچھ نہیں پوچھ رہا___" اور دھیرے سے کہنے لگا۔ "تم جہنم میں جاؤ۔"

ہنا نے اتاشی سے خوش ہو کر کہا۔ "اور جہنم میں تم بھی جاؤ۔" پھر وہ میری
طرف گھوم گئی۔ "شیر! تم نے جسے ڈس آرم (نہتا) کیا___" اس نے لفظ نہتے کو آنکھ مار
کر "بے ہاتھ کا" کہا تھا۔ بولی۔ "جسے ڈس آرم کیا وہ لیوگر پستول والا تھا۔ ایک کو اسی لیوگر
والے نے غلطی سے مار دیا۔ یہ دو تو میرے سامنے کے ہیں خیر، برمی فوج نے یہ دونوں
تمہارے حساب میں لگا دیے ہیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ فوجی افسر کہاں مارا گیا اور سویلین
کس طرح مارے گئے___؟ ہمارا نائب پریس اتاشی کوئی بھی خبر لاتا ہے تو چھان پھٹک کر
لاتا ہے وہ افواہیں نہیں لاتا۔"

میں نے کہا۔ "ہنا چھاننا اور پھٹکنا اچھی بات ہے۔ تم بھی تصدیق کر لو___
سنو۔ برمی افسر کو اسٹیمر پر ایک ریچھ نے چیر پھاڑ دیا تھا۔ اسٹیمر کا کیپٹن کسی سرکس کے
لیے ریچھ اسمگل کر رہا تھا۔ وہ پنجرے سے نکل گیا اور اس نے تباہی مچائی۔ آرمی کے
ڈاکٹروں کی رپورٹ دیکھ لینا۔ شراب میں دھت اس افسر کو میری آنکھوں کے سامنے
ریچھ نے معانقہ کر کے مار ڈالا۔ ریچھ باقاعدہ اس سے گلے ملا تھا۔ باقی سولین قبیلے والے
تھے۔ وہ مانگ یان پہنچنے سے پہلے آپس کی فائرنگ میں مارے گئے۔ میرا ان کی موت سے
بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے بارے میں ہاسٹل کی اگوامس کو سومی کو میں نے سب کچھ بتا
دیا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ باتیں کہی تھیں۔ ظاہر ہے
اسٹیمر پر مرنے والے فوجی افسر کی موت اسی طرح واقع ہوئی تھی۔ میں نے جھوٹ تو
ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ ہاں پورا سچ کسی کو بتایا نہیں جا سکتا تھا۔

ہنا نے مطمئن ہو کر ہاں میں سر ہلایا۔

تین روز تک ٹریلر ہمیں لیے وہیں کھڑا رہا۔ رشنا اور میں اور ہنا ہم تینوں فرش پر قالین ڈال کر لیٹے، بیٹھتے اور تنگ جگہ میں ٹہلتے رہے۔ برمی فوجی اس ٹریلر کو گھیرے رہے۔ ہم تینوں کے سوا دوسرے سب باہر آ جا رہے تھے۔ سیکڑوں ٹیلی فون کالیں آئیں اور گئیں۔ درجنوں اعلیٰ سطح کے حاکم برمی بھی اور مغربی جرمنی اور امریکا کے بھی آئے اور گئے۔ مانگ یان کالج کے سامنے میلہ لگا تھا۔ بی بی سی اور وائس آف امریکا کے نیوز ٹریلر ہمارے برابر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

نائب اتاشی کا اب یہ معمول تھا کہ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد آکر مجھ سے سوالات کرتا تھا۔ پرانے سوالوں میں اب کچھ نئے سوالات بھی شامل ہو گئے تھے جو کاسیز بازار کے گیسٹ ہاؤس اور میرے والد کے بارے میں بھی تھے۔ میں اتاشی کے ہر سوال کا جواب ہناگی زل کی معرفت دیتا رہا۔ وہ بہترین وکیل ثابت ہو رہی تھی۔ رنگون سے سفارت خانے کے افسر بھی آ رہے تھے۔ ہاں دوسروں کے ٹل جانے کے بعد وہ مجھ سے ادھیڑنے والے سوالات کرتی تھی اور پھر میری طرف سے جواب دینے بیٹھتی تو سب کو لاجواب کر دیتی۔

تیسرے روز رات میں کسی وقت وائس آف جرمنی اور برمی حکومت میں کچھ طے پا گیا اور ٹریلر مانگ یان سے روانہ ہو گیا۔ ہنا ہنس کر بولی۔ "لو جی پکنک ختم ہوئی ____ اب کام پر واپسی ہے۔"

ایک دن راستے میں گزار کر چوتھے دن نیوز ٹریلر رنگون میں مغربی جرمنی کے سفارت خانے کے احاطے میں ٹھہر گیا۔

ہنا نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر باقاعدہ ٹریلر سے چھلانگ لگائی اور امریکی کاؤ بوائز کی طرح یاہو، کا نعرہ مارا۔ پھر چیخ کر کہنے لگی۔ "آؤ شیر۔ آؤ رشنا دوڑ لگائیں۔ کم آن۔"

تنگ جگہ میں چار روز تک پھنسے رہنے کی تکلیف سے ہم تینوں کو نجات ملی تھی۔

ہنا نے اپنے سوئٹ میں جو ظاہر ہے سفارت خانے کی حدود میں تھا، رشنا کو اور مجھے ایک ایک کمرہ دے دیا۔ وہ سفارت خانے کے اسٹاف میں سے کسی کو، یہاں تک کہ کک اور صفائی والی میڈ کو بھی ہمارے کمروں میں نہیں آنے دیتی تھی۔ خود ہی ہمارا کھانا لے کر آتی اور صبح شام لان پر ہمارے ساتھ ٹہل لگاتی۔ باقی وقت کے لیے اس نے ہمیں

ہدایات دی تھیں کہ اپنے اپنے کمروں کو اندر سے مقفل رکھو اور انٹر کام پر ایک دوسرے سے بات کرنے اور خود ہنا کا فون سننے کے سوا کوئی ٹیلی فون اٹینڈ نہ کرو۔

رنگون پہنچتے ہی نہا دھو کر، ہنا کے مردانہ، زنانہ کپڑے پہن کر ہم دونوں اپنے اپنے کمروں میں پانچ چھ گھنٹے جم کے سوئے تھے۔

چار دن اسی طرح آرام کرتے گزر گئے۔ پانچویں دن میں نے ہنا کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے اور مختلف رپورٹیں دیکھنے میں تین گھنٹے گزارے۔ اخباری رپورٹوں سے، اخبار کے تراشوں سے ہنا کی گفتگو سے اور ریڈیو پر سنی، ٹیلی ویژن پر دیکھی خبروں سے معلوم ہو گیا کہ مانگ یان میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔

امریکا، برطانیہ، مغربی جرمنی ان تین طاقت ور ملکوں کے علاوہ بھی دنیا بھر سے کوئی ایک درجن خبر دینے والی ایجنسیاں مانگ یان کو کور کر رہی تھیں۔ وہ شور ہوا تھا دنیا بھر میں کہ برمی حکومت نے فوج کا محاصرہ اٹھا لیا تھا اور کوسومی کو، جسے خبروں کے میڈیا نے مانگ یان کالج کی نوجوان نگراں یا "بے بی پرنسپل" بیان کیا اور لکھا تھا چند دوستوں کے ساتھ نامعلوم مقام کے لیے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

رپورٹوں سے چند دوستوں، کی تفصیل بھی معلوم ہو گئی تھی۔

رپورٹوں میں بیان کیا گیا تھا کہ کوسومی مانگ یان سے ریڈ کراس کی ایک ایمبولینس میں نکلی تھی جس میں ایک لڑکی زخمی (مورنی) اور وہار کا زخمی ڈرائیور (میرباز) اور بیالا بائے نام کی ایک "مقامی نرس" اس کے ساتھ تھی۔ "نرس" وہار کے چھوٹے شفاخانے میں کام کرتی رہی تھی۔

مانگ کالج اور لڑکوں، لڑکیوں کا ہاسٹل کھول دیا گیا تھا۔ استاد سب واپس آ گئے تھے کیونکہ برما کے سپریم کورٹ کے ایک جج کو کالج کی پرانی انتظامی مجلس کا نگراں بنا دیا گیا تھا۔ برمی حکومت نے کالج کی زمینوں پر جو مقدمہ قائم کیا تھا اسے سماعت کے لیے سپریم کورٹ کی فل بنچ کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔

میں نے سوچا چلو چھٹی ہوئی بڑے میاں نے پوری زندگی جس کام میں لگائی تھی وہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔

یہ سب باتیں بتانے کے بعد ہناگی زل کہنے لگی۔ "شیر علی! میں نے خود "بے بی پرنسپل" مس کوسومی سے وائرلیس پر بات کی ہے۔ وہ تمہاری دلیری سے بہت خوش ہے اور تمہیں پیار کہتی ہے۔ اس نے رشنا کے بارے میں مجھ سے درخواست کی ہے کہ

میں اسے مغربی جرمنی سفارت خانے کے کسی ذمے دار افسر کے ساتھ مائنگ یان کالج بھیج دوں تو یہ کام میں نے خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ کل سویرے میں رشنا کو کالج کے گرلز ہاسٹل میں پہنچا آؤں گی۔"

میں نے سوچا۔ بڑی طاقتوں نے اپنے ریڈیو' ٹی وی اور اخباروں ہی کی طاقت سے برمی حکومت کو گھٹنوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انہیں سیاسی دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وجہ شاید یہ ہے کہ کوسومی کا قبیلہ' بڑے میاں اور ان کا مائنگ یان کالج برما کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

میں غیر ملکی ہوں۔ میں فکر مند تھا کہ آخر میرے بارے میں اعلیٰ یا ادنیٰ کسی سطح پر کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟ یہ نہ کسی اخباری رپورٹ میں تھا' نہ کسی ٹی وی رپورٹ میں اس مسئلے پر ایک بھی فقرہ کہا گیا تھا۔ ہناگی زل نے بھی صرف رشنا کے کے بارے میں بتایا تھا۔ خیر اس مظلوم لڑکی کی طرف سے تو پریشانی دور ہوئی۔ وہ اپنے لوگوں میں' ہاسٹل کی چہار دیواری کی حفاظت میں چلی جائے گی۔

ہنا کے چلے جانے کے بعد میں نے رشنا کے دروازے پر دستک دی۔ رشنا نے اپنے کمرے کا ٹی وی لگایا ہوا تھا۔ اسے مائنگ یان کالج' کوسومی اور بڑے میاں کے ششوؤں (مریدوں' شاگردوں) کی مجلس کے حوالے کیے جانے کی خبر ہو گئی تھی۔

وہ مجھے دروازے پر دیکھ کر کھل اٹھی اور بے ساختہ قہقہہ لگاتی ہوئی بڑھی' ہاتھ پکڑ کر کمرے میں کھینچ لے گئی اور مجھے گول گول گھمیری دلاتے ہوئے ناچنا اور ہنسنا شروع کر دیا۔

میں نے کہا۔ "رک تو اس طرح مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔ بیٹھ کے بات سن ٹی وی کی خبروں سے بھی آگے ایک بات سناتا ہوں تجھے۔"

وہ مجھے لے کر ایک صوفے میں دھنس گئی۔ دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ "ہاں بولو۔ بولو شیر علی!"

میں نے اسے ہناگی زل کی سنائی ہوئی سب خبریں سنا دیں کہ کس طرح کوسومی' مورنی' میر باز اور بیالا مائنگ یان کالج سے جا چکے ہیں اور خود اس کے بارے میں کوسومی نے ہنا میم صاحب سے کیا کہا ہے۔

رشنا کا چہرہ سب سن کر بے رنگ ہو گیا' بولی "میں کسی ہنا میم صاحب کے ساتھ مائنگ یان کالج نہیں جاؤں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

بولی۔ "وہاں اب کون ہے؟ نہ کوسومی' نہ مورنی' نہ بیالا اور' اور نہ وہ تمہیں ___ شیر علی تمہیں اب وہ کالج واپس نہیں جانے دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ میرے بارے میں انہوں نے کیا سوچا ہے' مجھے نہیں معلوم' لیکن میرا کالج واپس بھیجا جانا ممکن نہیں لگتا۔ میرا وہاں کیا کام؟"

رشنا بولی۔ "تو پھر میرا بھی وہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "تیرا وہاں وہی کام ہے جو پہلے تھا۔ اب کسی کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ گیا؟"

کہنے لگی۔ "تجھے کیا پتا کسی کو بھی کیا پتا ___ پڑا ہے نا فرق۔"

یاالٰہی یہ سب کیا ہے؟ میں نے اس لڑکی کی زندگی میں اتنی اہمیت کیوں حاصل کر لی؟ یہ کیا الٹی الٹی باتیں ہو رہی ہیں؟

میں نے کہا۔ "خیر' ابھی تو ہنا نے مجھ سے ذکر کیا ہے۔ تجھ سے بات کرے تو پھر سوچنا۔ پوچھنا اس سے۔"

کہنے لگی۔ "پوچھنا کیا ہے۔ میں اسے بتا دوں گی کہ میں اس کے ساتھ کالج واپس نہیں جانے کی۔ میں تو شیر علی کے ساتھ جاؤں گی۔"

"میرا کیا پتا کیا ہو۔ کہاں جانا پڑے ___ ہو سکتا ہے یہاں سے وہ مجھے جیل ہی بھیج دیں۔"

اس کا پورا دن جیسے چلہ چڑھی کمان بن گیا۔ "بھیج کے تو دیکھیں جیل' کیسے جیل بھیجتے ہیں میں بھی دیکھتی ہوں۔"

اسے بہت سی باتوں کا علم ہی نہیں تھا۔ ہنا کو بھی ابھی تک بہت سی باتیں نہیں معلوم تھیں ___ سب سے بڑا مسئلہ تو رنگون کے ہوٹل کونٹی نینٹل سے جعلی پاسپورٹوں اور بہت بڑی رقموں کے سفر چیکوں کے ساتھ میرے نکل بھاگنے کا تھا۔ اتنی بڑی رقمیں برما کی پرانی ریاست گڑھی کی سفید فام مہارانی جوئی ناہر سین کے خاندانی جواہر اونے پونے بیچ کے حاصل کی گئی تھیں۔ معاملہ صرف فوج کے آدمیوں یا چند قبائلیوں کے مارے جانے کا نہیں تھا۔ یہ برما کی مرکزی حکومت کے ایک وزیر کی بددیانتی کا معاملہ تھا جس نے رقم لے کر میرے' بڑے میاں کے اور کوسومی کے جعلی پاسپورٹ بنا دیے تھے۔ بڑے میاں گزر گئے تھے کوسومی کا نام ایک بہت بڑے بین الاقوامی تماشے یعنی مائنگ یان

کالج کے محاصرے کے سلسلے میں بطور مظلوم دنیا کے سامنے آ چکا تھا۔

وہ دونوں تو ایک طرح سے بری الذمہ تھے۔ ایک میں ہی رہتا تھا۔ پاکستانی پٹھان بھائی' ایک غیر ملکی جو غیر قانونی طور پر برما میں موجود تھا۔ جس پر فوج کے ایک افسر اور چند کارندوں کو قتل اور زخمی کرنے کا الزام تھا۔ جس نے سابق مہارانی جوئی ناہر سین کے زیورات چرا کر اونے پونے بیچے اور جعلی ناموں سے سفری چیک بنوائے اور جعلی پاسپورٹ بنوانے کے لیے برمی حکومت کے ایک وزیر کو کرپٹ کیا۔ جو رنگون جیل سے فرار ہوا جس نے بہت سے قبائلی قتل کیے۔ جسے اگر برما کی حکومت کا بس چلے تو فوری موت کی سزا سنادے۔ بلکہ زندہ دفن کر دیا جانا بھی میرے لیے کم سے کم سزا ہو سکتی تھی۔

مگر یہ سب باتیں میں رشنا سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

دن اپنی بہت سی بے رنگ مصروفیات میں گزر گیا۔ رات میں کھانے کے بعد جب میں ٹی وی دیکھ رہا تھا دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ہنا گی زل تھی۔ کہنے لگی۔ "ابھی رشنا کو لان پر ٹہلانے لے گئی تھی۔ اب تمہاری باری ہے۔ آؤ بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

یہ لان پر ٹہلانے کا کون سا وقت تھا مگر ہنا میری میزبان اور محسن تھی میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا باہر آ گیا۔ خاصی خنکی تھی مگر ہم دونوں گرم شال لپیٹے گھاس پر ٹہلتے رہے۔

ہنا بولی۔ "میں نے سفارت خانے کے ترجمان کی مدد سے رشنا سے بات کی تھی وہ مائنگ یان کالج جانے پر تیار نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں' یہ الجھن کی بات ہے۔ بتاؤ اس سلسلے میں' میں کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ "وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔"

میں نے ہنس کر ہنا کی طرف دیکھا۔ "یقین کرو میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔"

ہنا فکر مندی سے بولی۔ "ہاں اور تمہارے بارے میں بھی ایک بات جو دو روز پہلے میرے علم میں تھی میں نے بعض وجوہ سے تم سے چھپائی۔"

میں نے کہا۔ "اب بتا دو۔ دو روز وہ خبر روکنے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

"خبر یہ ہے شیر علی! کہ برما کی حکومت اور مغربی جرمنی کی حکومت کے درمیان بہت اعلیٰ سطح پر بات چیت ہوئی ہے اور آخر کار یہ طے ہوا ہے کہ تمہیں برما کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ سویرے ان کے لوگ تمہیں لینے یہاں آئیں گے۔"

میں آنکھیں پھاڑے ہنا گی زل کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ خبر نہیں کیا کچھ کہتی رہی بس اس کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے موسم میں لان پر سکڑا' سمٹا ٹہلتا ہوا میں بے سمجھے ہاں میں سر ہلاتا اور اس کی ہر بات سے اتفاق کرتا رہا۔ وہ سفری چیکوں اور پاسپورٹوں اور وزیروں کا ذکر کرتی رہی___ تاریخی جواہر اور نوسر بازی اور وہی سب کچھ___ پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔

میں نے کہا۔ "مسز گی زل! تم نے جس دلیری اور دردمندی سے میرا ساتھ دیا ہے میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کو الفاظ نہیں ہیں۔ میں پختون ہوں' ہزار سال کی مہمان نوازی کی روایت کو اپنے خون میں لیے زندہ ہوں۔ تمہاری مہمان نوازی کی داد اسی طرح دے سکتا ہوں کہ تم پر کوئی مصیبت آ پڑے تو جان دے کر تمہیں بچا لوں۔ اور بس۔"

ہنا چلتے چلتے رک گئی اس نے مجھ سے بغل گیر ہو کر اپنے رخسار سے میرا رخسار لگایا' یہ ان کا شفقت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے' کہنے لگی۔ "تم دلیر لڑکے ہو اور سمجھ دار بھی ہو۔ میں نے پٹھانوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ تم اچھے پٹھان ہو۔ میں تمہیں تمہاری باتوں کو یاد رکھوں گی۔ آگے بھی اگر کوئی سفارتی معاملہ ہوتا تو میں خوشی سے تمہاری وکالت کرتی۔ میرے پاس وہ لیاقت اور لائسنس موجود ہے مگر یہ معاملات کرمنل کورٹس کے ہیں جو میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ایک بہت اچھے بنگالی وکیل کو جانتی ہوں تار دے کر اسے کاکسز بازار سے بلوا لیتی ہوں۔ خرچ کی پروا مت کرو وہ تمہاری وکالت کرے گا۔"

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "کیا اس وکیل کا نام مزمل حسین ہے؟"

ہنا پھر چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ "تم اسے جانتے ہو؟ مگر مزمل تو اسپتال میں ہے۔ وہی تمہارے مخالف بنگلہ دوست والوں کا کوئی سیاسی تشدد کا قصہ ہے___ نہیں یہ مزمل نہیں مگر اس کی پرنسپل فرم کا نوجوان ایڈووکیٹ ہے نصرت علی سید۔"

میں نے اس نام کے کسی وکیل کا نام نہیں سنا تھا۔ میں نے ہنا کا شکریہ ادا کیا اور

کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کسی کو تو میری وکالت کرنی ہو گی وکیل نصرت کو میری وکالت کے لیے کہہ دو۔ ان کی فیس میرے باپ پاکستان میں ادا کر دیں گے۔

میں سردی میں لان پر ٹہل کر لوٹا تو ہر قسم کے زیاں اور تشویش کے احساس سے خالی تھا۔ جیسے برف کا تودہ بنا ہوا تھا۔ ہنا کو خدا حافظ کہتا دروازہ بند کرتا بستر پر آیا تو لگا جیسے میرے بستر پر کوئی سویا ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر لائٹ جلائی اور بہ مشکل بلند آواز سے چیخنے سے خود کو روکا۔

بستر پر شال لپیٹے رشنا سو رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے تالی بجائی تو وہ ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ میں نے سوچا ہنا کو ابھی خدا حافظ کہا ہے وہ اگر باہر کوریڈور میں ہوئی تو رشنا کی ہنسی سن لے گی خبر نہیں کیا سوچے گی۔ الجھن میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر میں نے اسے چپ ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ دھیرے سے بولی۔ "میم سے ڈر رہے ہو؟ میں نہیں ڈرتی کسی سے___ ہاں___ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ مجھے مانگ یان نہیں جانا۔ شیر علی جدھر جائے گا ادھر جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "شیر علی کو تو صبح جیل لے جانے کے لیے پولیس آئے گی۔ سب طے ہو گیا ہے۔"

ہنس کے کہنے لگی۔ "مجھے معلوم ہے کیا طے ہوا ہے؟ کہاں ہوا ہے۔ بس میں نے بھی سب بندوبست کر لیا ہے۔"

"بندوبست؟ کیسا؟"

"کام آسان ہو گیا ہے کیونکہ تمہیں خبر ہے کہ میں کایا بدل کے سانپ بن سکتی ہوں___"

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ خبر نہیں اس کا چلبلا ذہن کس طرف چل پڑا تھا۔

"میں کایا بدل کے سانپ بنوں گی ایک ٹوکری میں تم مجھے سنبھال لینا۔ اس طرح بس اکیلے تم رہ جاؤ گے اور تمہیں اکیلے کو یہاں سے نکالنے کا انتظام میں نے کر لیا ہے۔"

وہ باؤلی لڑکی عجیب بات کہہ رہی تھی۔ میں نے سوچا اسے اپنی پوری بات کر لینے دوں ورنہ اور نہ معلوم کتنی بحثیں کرے گی۔ اسی لیے چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

بولی۔ "وہ لڑکا دیکھا ہے تم نے جو مجھ سے برمی اور میم صاحب سے انگریزی

بولتا ہے؟"

وہ سفارت خانے کے مترجم کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ یاد آیا خوب صورت' خوش لباس ایک لاابالی نوجوان تھا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

بولی۔ "وہ مجھ پر ریجھا ہوا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "مبارک ہو!"

کہنے لگی۔ "سنو تو___ وہ مجھ سے بھاگ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ہم تم دو نہیں بھاگ سکتے۔ بھاگیں گے تو تینوں ہی بھاگیں گے۔ شیر علی اور تم اور میں۔ پوچھنے لگا شیر علی کو لے جانا ایسا کون سا ضروری ہے؟ ہم دو کے بیچ وہ کس لیے؟ میں نے اسے فوراً کہانی بنا کے سنا دی' کہا شیر علی سردار ہے ہمارا' بنا سردار کی مرضی کے شادی کر لیں گے تو لعنتی ہو جائیں گے قبیلے والے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دونوں کو قتل نہ کر لیں___ اس لیے ہم سردار کو یہاں سے ساتھ نکال لیں گے وہ خوش ہو کے اجازت دے دے گا۔ بس ختم۔ وہ کہنے لگا دوسرے دن جواب دوں گا' سوچ لوں کیسے کیا کرنا ہے۔ تو اب شیر! اس نے جواب دے دیا ہے مگر کہتا ہے ایک وقت میں ایک آدمی کو نکال سکتا ہوں گاڑی کی ڈکی بہت تنگ ہے۔ وہ پہلے مجھے نکالنے کی کہتا تھا بالکل نہیں مان رہا تھا' میں نے کہا نہیں' پہلے تو سردار کو نکال' واپس آ کے دوسری بار مجھے لے جا اور اگر اس پہ تیار نہیں ہے تو پھر چھوڑ رہنے دے۔"

وہ چالاکی سے آنکھیں چلاتی اپنا منصوبہ مجھے سمجھا رہی تھی۔

قیامت کی تیز و طرار لڑکی تھی۔ میں نے جب کہا کہ باہر نکل کے تجھے اس سے شادی کرنی پڑے گی تو ہنس کے کہنے لگی۔

"یہی تو ساری چالاکی ہے۔ وہ چھپا کے پہلے تمہیں نکالے گا۔ تمہارے ہاتھ میں ٹوکری ہو گی۔ ٹوکری میں سانپ کی کایا میں' میں بیٹھی ہوں گی۔ وہ تمہیں ٹوکری سمیت باہر پہنچا کے مجھے لینے اندر آئے گا۔ اندر بھلا کون ہو گا؟ اور بس ہم دونوں آگے بھاگ لیں گے۔"

اس سے کیا بحث کرتا۔ میں نے اسی وقت اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ برمی مترجم لڑکا مجھے لینے آئے گا تو میں شور مچا دوں گا۔ لڑکے سے رشنا کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور میں رشنا کی پاگل اسکیم سے نجات پا کے اپنی تقدیر کا سامنا کرنے رنگون جیل پہنچ جاؤں گا۔ رشنا کو اس صورت میں مجبوراً مانگ یان کالج جانا پڑے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہاں سے

فرار ہو کے کیا میں اپنی محسن کو مشکل میں ڈال دوں؟ یہ مجھے منظور نہیں۔

رشنا نے مجھے سوچتے اور مسکراتے دیکھا تو بولی۔ "لگتا ہے تمہیں میری یہ ترکیب پسند آئی ہے جبھی مسکرا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بہت پسند آئی یہ ترکیب۔"

چہک کر بولی۔ "اسی بات پہ تمہارا' اپنا منہ میٹھا کرتی ہوں۔"

اس نے پنی زنانی پتلون کی جیب سے لمبی سی چاکلیٹ بار نکالی بہت احتیاط سے پنی الگ کر کے پہلے خود اپنے حصے کی دانت مار کے کاٹ لی باقی ہنستے کھلکھلاتے ہوئے میرے منہ میں ٹھونس دی۔ میں شور کرتا رہا کہ رک تو' ٹھہر تو جا' میں رات کو میٹھا کھا کے نہیں سو سکتا مگر وہ نہ مانی بولی یہ میٹھی نہیں ہے کافی کی کڑوی چاکلیٹ ہے۔

چاکلیٹ واقعی امریکی ٹیسٹ کی کڑوی سی تھی۔ وہ اٹھی جلدی جلدی میرے بستر کی سلوٹیں دور کر کے دونوں ہاتھوں میں میرے ہاتھ لے کر مجھے جیسے جھولا جھلاتی ہوئی شب بخیر جیسا کچھ کہتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس نے شاید ہنا کے ادھر ادھر آنے جانے' چلنے پھرنے کی آوازیں سن لی تھیں۔

میں تھکا ہوا سا تھا لیٹ گیا۔ سوچ رہا تھا اٹھ کر کلی کروں گا۔ دانت صاف کر کے لیٹوں گا۔ بچوں کی طرح کچھ کھاتے ہوئے سو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا مگر ایک دم ایسی نیند آ رہی تھی کہ واش روم جانے کا بس سوچتا ہی رہا۔ سو گیا۔

آنکھ کس وقت اور کہاں کھلی مجھے نہیں معلوم۔ ابھی اندھیرا ہی تھا بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور سردی کے مارے دانت بج رہے تھے۔ میرے اوپر کوئی وزنی کمبل لحاف دری جیسی چیز یا تینوں چیزیں پڑی تھیں اور میرا پلنگ مسلسل ہلے جا رہا تھا جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔

میں نے کمبل لحاف ہٹا کر اٹھنے کی کوشش کی تو سر میں جیسے زبردست ٹیس اٹھی۔ سر اتنا درد کر رہا تھا کہ میں نے اٹھنے کا خیال ترک کر دیا' ویسے ہی پڑا رہا۔ اسی طرح سردی لگے جا رہی تھی اور پلنگ تھا کہ برابر زلزلے میں تھا۔

نہیں۔ یہ پلنگ نہیں ہے۔ میں کسی سواری پر ہوں۔ تیز رفتار سواری۔ موٹر کار یا ٹرک جیسی' سر درد تو کر رہا تھا مگر میں نے ہمت کر کے پوری بات سوچ لی۔

ہاں میں کسی موٹر کار یا ٹرک پر ہوں جو بہت رفتار سے دوڑے جا رہا ہے۔ ہوا تیز ہے۔ بہت سردی ہے اور میں جو اپنے کمرے ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا' مجھے اس وقت

کہیں لے جایا جا رہا ہے۔

اور وہ برمی مترجم؟ وہی نوجوان' رشنا کا عاشق؟ اس نے یقیناً ہمیں ہنا گی زل کے سوئٹ سے اور سفارت خانے کی حدود سے باہر نکال لیا ہے۔

میں طاقت لگا کر خود پر پڑے لحاف کمبل وغیرہ میں ہاتھ چلاتا اٹھ بیٹھا۔

سر باقاعدہ پھٹا جا رہا تھا۔ کمزوری کا زبردست احساس ہو رہا تھا اور منہ ایک دم کڑوا تھا مگر میں نے چیخ کر کہا۔ "او! او رے او!"

میرے برابر کپڑوں کے انبار میں حرکت ہوئی' ایک لڑکی کی ہنسی سنائی دی اور ایک سوال۔ "اٹھ گئے جی شیر علی سردار؟" یہ رشنا کی آواز تھی۔

"رشنا!" میں نے آواز دی اور اندھیرے میں ہاتھ چلائے وہیں کہیں اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اٹھ بیٹھی۔ وہ بالکل پہلو سے لگی سانس لے رہی تھی اور وہ راز دری سے ہنسے جا رہی تھی۔

"ہم لوگ کہاں ہیں؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"رشنا' میری گردن کے خم میں اپنا چہرہ ڈال کر سرگوشی میں بولی۔ "یہ جیپ گاڑی ہے۔ سرکس والوں کی۔"

"سرکس؟" اس نے برمی لڑکے کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ سرکس کیا ہوتا ہے؟

کہنے لگی۔ "ہاں رے سرکس۔ ہم شہر سے بہت آگے نکل گئے تھے پھر یہ ایک جیپ نظر آئی' میں نے ہاتھ دے کے رکوالی۔ کوئی تین چار گھنٹے سے جیپ چل رہی ہے۔ بہت دور نکل آئے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"خطرہ؟ خطرہ کیسا؟" میں نے پوچھا۔ ابھی میرا ذہن صاف نہیں ہوا تھا۔

"اسی برمی اور انگریزی بولنے والے لڑکے کا اور کس کا خطرہ۔"

رشنا اس مترجم برمی نوجوان کا ذکر کر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"بتاؤں گی__ تو ابھی سو جا۔" اس نے میرے رخسار سے اپنا رخسار بھڑا کے مجھے بچے کی طرح تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کے پاس سے مہنگے سینٹ اور بدیسی مٹھائیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ چاکلیٹ!

کڑوا چاکلیٹ! میں نے غصے میں کندھا جھٹک کر اسے خود سے برے ہٹانے کی

کوشش کی اور کہا۔ "رشنا! تو نے مجھے چاکلیٹ کھلا کے بے ہوش کر دیا تھا۔"

وہ ہنسی اور پھر میرے قریب سرک آئی۔

میں نے اپنی محسنہ سے غداری کی ہے۔ میں نے سوچا کم سے کم مجھے ہنا گی زل سے ایسی بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کی حفاظت سے فرار کرایا گیا ہے مجھے۔ اب وہاں ہنا کے ساتھ بہت برا ہو گا۔ مجھے رشنا پر اور اس برمی لونڈے لپاڑی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

میں نے غصے میں اوپر کا لحاف کمبل جو بھی تھا ہٹا دیا۔ ہم کھلی جیپ میں سیٹوں کے درمیان بنڈل بنے پڑے تھے۔ اب جو ہوا کے تھپیڑے روکنے والا کمبل' لحاف ہٹا تو یخ بستہ ہوا نے مجھے بے حال کر دیا۔ میں نے جلدی سے پھر لحاف اوپر لے لیا۔

"رشنا! تو نے مجھے چاکلیٹ کھلا کر کیوں بے ہوش کیا؟" میں نے پھر وہی سوال کیا تھا۔ میری آواز خاصی بلند تھی۔

جو بھی جیپ چلا رہا تھا اس نے مڑے بغیر چیخ کر پوچھا۔ "جی بھائی صاحبو! کیا ہم سے کچھ کہا؟"

میں کچھ کہنے کو تھا مگر رشنا نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور لہکتی ہوئی سی ہنسوڑ آواز میں پکار کر جیپ والے سے کہنے لگی۔

"نہیں رنگ ماشٹر! تم سے نہیں کہہ رہے ہیں یہ نیند میں کچھ بولتے ہیں آپ ہی آپ۔"

"ہاں بھئی ہاں___ راجا بناوا ہے بھئی راجا___ ہاں نا بھائی صاحبو؟"

رشنا نے کھلکھلاتی ہوئی "ہاں آ آں" کہہ کر جیپ والے کی بات سے اتفاق کیا۔

میں نے پھر کہا۔ "رشنا؟ بول! بتا___ مجھے کیوں بے ہوش کیا؟" مجھے جیسے ضد چڑھ گئی تھی۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "بتا کیوں بے ہوش کیا تو نے؟"

وہ سمجھاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "دیکھ شیر علی! مجھے تو ہر صورت میں سویرے سے پہلے تجھے ادھر سے نکال لینا تھا۔ پہلے میں نے بھائی بندی میں سمجھا کے تیری مرضی معلوم کی___ تجھ سے پوچھا۔ پوچھا تھا نا؟ پر جس طرح تو نے میری بات سنی اور بات سن کر مسکرانے لگا میں اسی وقت سمجھ گئی کہ شیر علی مجھ سے غداری کرے گا۔ نہیں جائے گا میرے ساتھ۔ کوئی اڑچن ڈال دے گا عین وقت پہ۔ بول سچ کہہ رہی ہوں نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں' میں خود سے نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ اس گوری میم کے

ساتھ دھوکا ہوا ہے۔"

رشنا بولی۔ "میں سمجھ گئی تھی کہ تو نہیں جائے گا۔ میں نے جب پوچھا تھا کیا تجھے یہ بات پسند آئی تو' تو نے چالاکی سے مسکرا کے کہا تھا کہ ہاں بہت پسند آئی تیری یہ ترکیب___ بس میں نے یہ دوسری ترکیب کر لی میں پہلے ہی سے تیار کر کے بیٹھی تھی اس چوکلیٹ موکلیٹ کی۔"

"تو نے برا کیا رشنا۔"

"برا نہیں کیا بہت اچھا کیا شیر علی! خبر ہے' جس وقت تو میم صاحب کے گھر میں سو رہا ہوتا اس وقت گھر کے باہر جیل کی پولیس تجھے لے جانے کو بیٹھی ہوتی اور قاتل رستے میں گھات لگائے ہوتے۔"

"جو بھی ہونا ہوتا بھگت لیتا۔ یہ تو نہیں ہوتا۔"

کہنے لگی۔ "کیا نہیں ہوتا؟ بول' بتا؟"

میں نے کہا۔ "دل اندر سے ملامت کر رہا ہے کہ ان گوروں نے برمی حکومت کے قبضے محاصرے سے کالج کو' کالج کی سب لڑکیوں کو نکالا۔ بات چیت کر کے ایک اصول طے کر لیا کہ بھئی اس آدمی کو ہمیں دے دو___ باقی لوگوں کو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ ہنا میم صاحب نے ذمہ داری لی ہو گی___ خبر ہے؟ اس کے لوگ اب اسے بے عزت کر رہے ہوں گے۔"

وہ سنتی رہی۔ میری بات پوری ہو گئی تو بولی۔ "شیر علی! ہم قبیلے والے بھی احسان کا مطلب سمجھتے ہیں اور احسان کو یاد رکھتے ہیں۔ تم کو میں نے ابھی کچھ بتایا ہی نہیں۔ پوری بات سن لو گے تو آپ ہی سمجھ لو گے کہ اچھا کیا جو شیر علی تمہیں انہوں نے جیل والوں کے سپرد نہیں کیا۔ اب مجھ پر خفا نہیں ہونا۔ پوری سات سنو سردار۔" اس نے سردار' بہت شرارت سے کہا تھا۔

کہنے لگی۔ "بڑی مہربانی ہوئی مالک کی جو یہ برمی لڑکا میرے اوپر ریجھ گیا۔"

میں نے سوچا اسے ٹوکنا نہیں بات پوری کرنے دینا ہے۔

وہ بولی۔ "یہ لڑکا ہنا میم صاحب کی بات کہتے کہتے اپنے دل کی بات بھی کہنے لگا تھا۔ چھپ کر ملنے آتا تھا۔ میں نے سوچا میم صاحب کو بتا دوں مگر پھر خیال ہوا لڑکا سیدھا سا لگتا ہے۔ تھوڑے دن کی بات ہے بھگت لوں گی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی پیار کی باتیں سنتی رہی۔ ایک روز شیر علی! یہ تمہارے بارے میں بہت پوچھنے لگا۔ مگر

آہستہ آہستہ یہ بڑے انوکھے سوال پوچھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کسی نے اس کو کام پہ لگا دیا ہے کہ معلوم کرے ہنا میم صاحب اور اس کے لوگ تمہارے لیے کیا سوچ رہے ہیں۔ مجھے خبر تھی کوئی لوگ ایسے ہیں جو پہلے سے تمہاری خبریں اٹھا رہے ہیں اور آگے بھی تمہیں گھیرنا چاہتے ہیں۔"

میں سمجھ رہا تھا۔ یہ رشنا کو سومی کے بہت قریب ہو گی اگوا کو سومی نے اسے بنگلہ دوست والوں کی کارروائیوں کا بتا دیا ہوگا۔ تاہم میں نے چپ رہ کر اس کی پوری بات سننا مناسب سمجھا۔

رشنا بولی۔ "ہنا میم صاحب کے بتانے سے پہلے ہی اس لڑکے کو معلوم تھا کہ وہ لوگ تمہیں حکومت کے حوالے کر دیں گے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "میرے جاننے والوں نے وعدہ کیا ہے وہ ہماری مدد کریں گے۔ آؤ میرے ساتھ بھاگ چلو۔" باقی میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے کہ اکیلے نکلنے سے میں نے انکار کر دیا تھا۔ اگلے دن یہ اپنے جاننے والوں سے پوچھ کے آ گیا کہ ٹھیک ہے سویرے پولیس کے آنے سے پہلے ہم نکل چلیں گے۔ آدھی رات کو باہر میرے آدمی گاڑی لے کے آ جائیں گے۔"

وہ اپنی شرارت یاد کر کے ہنسی' بولی۔ "وہ لوگ ہمیں فرار کرانے آ گئے' تجھے شیر علی! میں نے آدھی چاکلیٹ کھلائی تھی۔ آدھی خود منہ میں ڈالی تھی جو باہر جا کے فوراً تھوک دی۔ خیر' میں نے جھانک کے دیکھ لیا تھا باہر ایک بڑی سی کار آ گئی تھی۔ پولیس اس وقت تک نہیں آئی تھی اور چوکی دار یا تو ملا ہوا تھا یا لڑکے نے اس کا کوئی بندوبست کر دیا تھا۔ وہ خود پائپ سے چڑھ کے اوپر آیا۔ میں نے تمہیں بے ہوش کر کے اس سے کہہ دیا تھا کہ لے اب شیر علی کو اور اس کی چھوٹی سی ٹوکری کو سنبھال کے لے جا گاڑی میں رکھ آ پھر واپس میرے کمرے آ میں تیرا انتظار کر رہی ہوں آ کے مجھے اور میرے سامان کو لے جانا۔ اسے میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ٹوکری میں سردار کا ناگ ہے اگر ڈھکنا بند رکھے رکھے لے جا کے گاڑی میں پہنچا آئے گا تو ناگ کچھ نہیں کہے گا اور اگر ڈھکنا کھول کے اسے دیکھے گا' چھیڑے گا تو قصہ ختم۔ ٹوکری لے جانے کے لیے بھی بڑی مشکل سے اس نے "ہاں" کی تھی۔ خیر' میں اس کے پاس سے تمہارے کمرے میں آ گئی۔ ناگ کی کالی ٹوکری تمہارے سینے پہ رکھی تھی۔ میں کایا بدل کر سانپ بنی اور تمہاری چھاتی پر سے رینگتی ہوئی ٹوکری میں سما گئی____ برمی لڑکا کسی کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس آنے والے نے گاڑی کے ڈرائیور سے پیسے لیے اور چلا گیا۔

"شیر علی! اگر لڑکا چپ رہتا اور ڈرائیور سے بات کیے بغیر مجھے' میرے سامان کو لینے اوپر چلا جاتا تو نقصان ہو جاتا' میں ایک بہت بھیانک اور بہت کام کی بات نہ سن پاتی۔"

"کیسی کام کی بھیانک بات؟"

بولی۔ "بتاتی ہوں۔ لڑکے نے ڈرائیور کا نام لے کے بات شروع کی تھی۔ میں تو نام ہی سن کے سمجھو جھنجنا اٹھی۔ اس نے ڈرائیور کا نام لیا تھا اسے راحل کہا تھا اور جب ڈرائیور بولا تو میں آواز سے پہچان گئی وہ حرام زادہ راحل ہی تھا۔ شیر علی! خبر ہے راحل کون ہے؟ حسگھے کا بیٹا____ دشمن ہمارا۔"

میں نے کہا۔ "ہوں۔ خبر ہے وہ میرا بھی دشمن ہے۔"

رشنا آگے سنانے لگی' بولی۔ "برمی لڑکے نے پتا ہے کیا کہا تھا؟ لڑکے نے اس سے کہا تھا کہ راحل! مجھے اور لڑکی کو پہلے تو ٹیکسی کرا دینا۔ ہم دونوں نکل جائیں گے۔ نہیں ادھر ایک بار 'ڈزاڈز' شروع ہو گئی تو پھر میرا اور لڑکی کا نکلنا آسان نہیں رہے گا۔ اس پر وہ کتا____ راحل بولا۔ اب ڈزاڈز کاہے کو ہو گی۔ تیری معشوقہ نے شیر علی کو بے ہوش حوالے کیا ہے' رام کرے گا تو بے ہوش ہی بے ہوش شیر کھان اوپر سدھار جائے گا ارے چاکو سے گلا کاٹ کے پتھر باندھ کے دس فٹ گہرے پانی میں ڈال دوں گا سورے کو____ یہ سمجھ لے گولی ایک بھی نہیں چلے گی۔"

اتنی سردی میں بھی میری ہتھیلیاں پسینے سے پسیجنے لگیں۔

خدایا! وہ حسگھے کا بیٹا' راحل وہ جو کاکسیز بازار میں بازلر کا ڈرائیور بن کر آیا تھا۔ جس بدمعاش کو بڑے میاں نے ریچھ کی کایا میں رہتے ہوئے پنجا مار کے زخمی کر دیا تھا۔ وہ میری تلاش میں چلتا یہاں تک آ گیا ہے۔

اگر رشنا وہ سب کچھ نہ کرتی جو اس نے کیا تو پولیس کے ہاتھ لگنے سے پہلے____ یا فوراً بعد مجھے مار دیا جاتا۔ میں دن کی روشنی نہ دیکھ پاتا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر رشنا کے گھنے بھونرا بالوں میں اپنی انگلیاں الجھا دیں۔

"رشنا! تو نے بڑا کام کیا ہے رشنا____ تو جیتی رہے دوست۔"

وہ انعام پانے والے بچے کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ "چلو رے عمر سوارت ہو گئی میرے سردار کو میری کوئی تو بات پسند آئی____ اچھا آگے کی سن۔ آگے پھر جو میں نے کیا وہ بس ویسے ہی ٹوکری میں کنڈل مارے بیٹھے سوچ لیا تھا۔

جیسے ہی بری لڑکا ہٹا' اپنے حساب سے مجھے اوپر سے لانے گیا' میں ٹوکری کا ڈھکنا اپنے سر کی ٹکر سے اتار کے رینگتی ہوئی گاڑی سے باہر بلب کی روشنی میں آ گئی۔ ایک بار روشنی میں آ کے میں نے پھن پھیلا کے ایک پھنکار ماری۔ راحل سسرے نے تو سوچا بھی نہ ہو گا کہ وہاں اچانک سانپ نکل آئے گا۔ پہلے تو آنکھیں پھاڑے وہ دیکھتا رہا پھر کسی لاٹھی' لکڑی' برچھی کی تلاش میں اس نے ادھر ادھر آنکھیں چلائیں تو میں پھنکارتی اس کی طرف چلی۔ وہ بزدل گھبرا کے دوڑا۔ مڑ مڑ کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ میں لہراتی اس کے پیچھے تھی۔

"پھر جھاڑی کی اوٹ لے کے میں سانپ سے انسان کی کایا میں آئی اور دوڑ کر کار کی ڈرائیور سیٹ پر جا بیٹھی۔ مورنی کے بھائی نے مجھے اتنی ڈریوری سکھا ہی دی تھی چلتی گاڑی پر قبضہ کر کے شیر علی سردار کو لیے میں کھلی سڑک پہ نکلی اور ہوا ہو گئی۔

"پیچھے سے اس سور راحل کے "او او او! کون ہے رہے؟ روک ارے کون ہے؟" پکارنے کی آوازیں آتی رہیں' پر میں بہت دور نکل گئی تھی اور پھر ہائی وے پر سرکس کی جیپ مل گئی۔ اکیلا آدمی دیکھ کے میں نے سوچا یہ صحیح ہے۔ میں نے اس سے آگے گاڑی نکال لی' کافی جا کے سڑک کے کنارے اپنی والی گاڑی روک لی اور بونٹ کھول کے جو دو چار تار مجھے اندر نظر آئے کھینچ کے ایک طرف ڈال دیے۔ سڑک پر منہ لٹکا کے کھڑی ہو گئی' انتظار کرنے لگی۔ جب یہ پہنچ گیا تو اس جیپ والے کو روک لیا۔ پہلے تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کو کہا۔ یہ بھی یونہی ہے کوشش کرتا رہا پھر آنکھیں چلا کے بولا کہ اس کو یہیں کھڑا رہنے دو۔ سویرے کسی کو بھیج کے منگوا لینا۔ ابھی بتاؤ کدھر جانا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ میں نے شیر علی! تیرا بتا دیا کہ یہ آدمی ہے میرا۔ زیادہ پی لیتا ہے تو نشے میں کئی کئی گھنٹے پڑ سوتا رہتا ہے۔ ہم لوگ کو بہت دور جانا ہے۔ پوچھنے لگا کہاں؟ میں نے سڑک پہ بہت ہی میلوں آگے کے کسی شہر کا نام لے دیا۔ اس نے کہا۔ "چلو بیٹھو آگے کا کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ "ابھی تو بھائی صاحبو بیٹھو۔"

"تو بس۔ اب تین چار گھنٹے سے جیپ چل رہی ہے۔ یہ کسی سرکس کا رنگ ماسٹر ہے۔ خود بھی کہیں سے بوتل لگا کے چلا ہے۔ آدمی دل پھینک مگر مزے کا ہے۔ اب صبح ہونے والی ہے اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا سویرے تک سرکس گراؤنڈ میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں تم لوگوں کو بڑی جنگلی ناشتا کراؤں گا۔ بھائی صاحبو۔"

پھر وہ ہنسی بولی۔ "تمہارا کہتا تھا کہ ان بھائی صاحب کو بغیر دودھ کی تیز کافی

پلاؤں گا ابھی تو یہ راجا بنے ہوئے ہیں پہلے ان کا نشہ اتاروں گا پھر کچھ کھانے کو دوں گا سمجھے بھائی صاحبو!"

رشنا نے یہ "سمجھے بھائی صاحبو!" ذرا بلند آواز سے کہا ہو گا وہ رنگ ماسٹر نے سن لیا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی کر کے وہیں سے پکارنے لگا۔ "ہاں بھائی صاحبو! اٹھ گئے آپ کے راجا جی؟"

رشنا ادھر سے بولی۔ "ہاں جی اٹھ گئے۔"

رنگ ماسٹر ٹھٹھا مار کے بولا۔ "ہم یہی سوچ رہے تھے کہ پیچھے سے آپ دونوں بھائی صاحبو کے راز و نیاز کی آواز آ رہی ہے' کوئی موج میلہ چل رہا ہے پیچھے ——— ہاہاہا' ہاں نا بھائی صاحبو؟"

عجیب بونگا آدمی تھا۔ یہ "بھائی صاحبا۔" میں نے کوئی کڑوی بات کہنے کے لیے اسٹارٹ ہی لیا تھا کہ رشنا نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور اس سے پوچھا کہ تمہاری سرکس کتنی دور ہے؟

کہنے لگا۔ "ہماری سرکس گراؤنڈ تو بھائی سمجھو آ گئی ہے پہلے ہمارا ہی خیمہ ہے۔ اس وقت اس میں ہماری بیلا جی سو رہی ہوں گی ان کو تو ہم اٹھائیں گے نہیں۔ وہ کچی نیند سے اٹھ جائیں تو سارا سارا دن گندی گندی گالیاں بکتی ہیں اس لیے آپ بھائی صاحبو کے لیے ہم خود ہی ناشا واشتا تیار کر لیں گے۔ ہاں بھائی صاحبو!"

میں نے چیخ کر کہا۔ "اچھا بھائی صاحبا!" رشنا ہنسنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ بیلا جی کون ہے؟ بیوی تمہاری؟"

رنگ ماسٹر بولا۔ "بیوی ویوی نہیں وہ رکھیل ہیں ہماری۔"

رشنا نے اور زور سے ٹھٹھے مار کے ہنسنا شروع کر دیا تو "بھائی صاحبا" خود بھی ہنسنے لگا بولا۔ "آپ صاحبو کو گشتی تھیٹروں' سرکسوں کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ ہم اگر اپنے ساتھ کوئی بیوی ویوی رکھیں تو چل چکا سرکس' چل ہی نہیں سکتا۔"

مجھے اس کی باتوں میں مزا آنے لگا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں نہیں چل سکتا۔

کہنے لگا۔ "بیویاں تو ویسے ہی اپنے مردوں کی پتلونیں پھاڑ رکھتی ہیں۔ ہوش و حواسوں میں نہیں رہنے دیتیں اور ہمارا کام جان جوکھم کا کام ہے۔ کوئی ساٹھ فٹ اونچے تار پہ چل رہا ہے بھائی صاحبو! تو کسی نے اوپر پٹرول چھڑک کے آگ دکھا کے سو فٹ بلندی سے بالشت بھر کے ٹب میں چھلانگ لگائی ہے۔ کوئی شیر کے منہ میں اپنی کھوپڑی

دیے بیٹھا ہے بھائی صاحبو تو کسی نے ریچھ کے پچھائے میں ہاتھ دے کے کرتب دکھانے شروع کیے ہیں___ الغرض سب سرکس والے اپنی جان پہ کھیل کے روزی کما رہے ہیں۔ ایسے میں کون عقل سے پیدل تیار ہو گا جو اپنے اوپری چڑی گٹھانے کو ایک بیوی بھی رکھے گا۔ نا صاحبو نا! ہم لوگ تو رکھیلوں سے گزارہ کر لیتے ہیں شروع سے یہی چل رہا ہے___ اور کیا۔"

رشنا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے ہنسی تھام کے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بولی۔ "اور یہ جو___ رکھیل تمہاری گالی دیتی ہے گندی گندی___ یہ کیا ہے؟ اس نے بھی تو تمہارے اوپر چڑی گانٹھ رکھی ہے؟"

وہ بولا۔ "نا بھائی صاحبو نا! بیلا جی ٹائم ٹائم سے گالی نکالتی ہے___ وہ جو بولتے ہیں نا کہ تیرے ہونٹ کتنے شیریں ہیں کہ گالیاں کھا کے بھی وہ سسرا بے مزا نہیں ہوتا___ تو وہی قصہ ہے بھائی صاحبو! پھر اگر بیلا جی ڈارلنگ کبھی بے سری بولنے لگتی ہیں۔ آؤٹ ہونے لگتی ہیں تو آپ کا فلک شیر رنگ ماسٹر ان کی سڑائی بھی کر دیتا ہے___ تاہم بیویوں کی سڑائی نہیں کی جا سکتی۔"

رشنا نے پوچھا سڑائی کیا ہوتی ہے تو بولا۔ "سڑائی نہیں جانتیں بھائی صاحبہ آپ؟ ارے چھینٹی لگانے کو بولتے ہیں۔ چار چوٹ کی مار لگائی نہیں کہ بیلا جی گنے کی طرح سیدھی اور میٹھی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں ماسٹر۔ یہ بتاؤ بیوی کو جو چھینٹی نہیں لگائی جا سکتی اس کی وجوہ کیا ہیں؟ کہیں بیوی کے بھائی بند تو سب سے بڑی وجہ نہیں ہوتے؟"

رنگ ماسٹر فلک شیر بولا۔ "حیرت ہے صاحبو! آپ بیوی والے ہو کے بھی یہ وجہ نہیں جانتے۔ خیر اس ٹائم کیونکہ آپ کی میم صاحب سامنے موجود ہے۔ یہ نکتے کی باتیں پھر کبھی وقت ملا تو عرض کروں گا۔ لو جی' آ گئی سرکس گراؤنڈ۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سب طرف پیلے بلبوں کی جھالریں سی ٹنگی نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکلنے میں دیر تھی۔ اس لیے ابھی تک ڈیزل اور کیروسین سے چلنے والے جنریٹروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میلے کچیلے اوور آل اور ڈانگریاں پہنے گھٹنوں تک کے ربر کے جوتے چڑھائے بہت سے آدمی جانوروں کو کھانا' پانی دینے اور پنجروں کی صفائی کرنے' خیموں کے بیچ سے نکل' نکل کر آ جا رہے تھے۔ پہیوں والے پنجروں کی ایک

قطار خیموں اور چھولداریوں کے بیچ کھڑی کر دی گئی تھی۔ مختلف قسم کے جانوروں کی بھی' ہلکی ہلکی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

پہلا خیمہ اسی فلک شیر رنگ ماسٹر کا تھا۔

ہمیں لانے والی جیپ رک گئی۔

وہ گاڑی کا انجن بند کر کے اترتے نشے اور شرارت کے ساتھ ہمیں دیکھتا اور آنکھ مارتا ہوا پنجوں کے بل خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد پکنک باسکٹ جیسی بید کی ایک ٹوکری اٹھائے وہ برآمد ہوا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتا خیموں کے بیچ بیچ چلنے لگا۔ ڈانگریوں والے ورکر اس کے سائے کو پہچان پہچان کے سلام کر رہے تھے۔

بلبوں کی پیلی روشنی میں سرکس کے خیمے کچھ زیادہ اجاڑ اور صبح کی آوازوں کے ہوتے بھی خاموش اور افسردہ لگ رہے تھے۔ تاہم اس افسردگی اور اجاڑ پن میں ہمیں دور ایک بہت بڑا خیمہ روشنی سے اور چمکیلی آوازوں سے چھلکتا ہوا دکھائی دیا۔

رنگ ماسٹر اپنی پکنک باسکٹ اٹھائے اسی روشن خیمے میں داخل ہو گیا اور اندر رک کر ہمارا انتظار کرنے لگا۔ اب وہ اپنی اونچی کھلکھلاتی آواز میں ہمیں خیمے میں چلے آنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ "چلے آؤ بھائی صاحبو! آ جاؤ۔ رکنا نہیں ہے___ توقف نہیں کرنا ہے۔ یہ خیمہ بے تکلف ہے بھائی صاحبو! شیروں' اژدہوں سے پنجا کرتے ہوئے دلیروں کے لیے طاقت سے بھرپور فولادی ناشتے اسی خیمے میں ملیں گے۔ سمجھے بھائی صاحبو! تکلف نہیں کرنا ہے اور توقف بھی نہیں کرنا ہے۔ آ جاؤ۔"

رنگ ماسٹر کے اور ہمارے خیمے میں داخل ہوتے ہی سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

ہماری طرف' میں نے زیادہ صحیح نہیں کہا۔ سب رنگ ماسٹر اور رشنا کی طرف دیکھ رہے تھے میں تو جیسے ان دونوں کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ گٹھے ہوئے بدن والے تین چار بونوں نے منہ میں انگلیاں ڈال کر تیز تیز سیٹیاں ماری تھیں اور ہا ہا ہا کی آواز نکالی تھی۔ رنگ ماسٹر خود کو اس وقت جیسے سرکس کے رنگ میں اترا ہوا سمجھ رہا تھا اس نے سیٹیوں کے جواب میں ایک قدم آگے بڑھا کر رشنا کو خود سے بھڑا لیا' اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور جھک جھک کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی بات کی داد وصول کرنے لگا۔ ہجوم میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "واہ بھئی وا___ رنگ ماسٹر نے ایمان سے نمبر ون ماشوک گھیرا ہے۔"

رنگ ماسٹر نے خوش ہو کے ٹھٹھا مارا اور داد وصول کرنے کو پھر ہاتھ لہرایا۔

میں نہ معلوم کیوں غصے سے بے قابو ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر رنگ ماسٹر کی کلائی پکڑی اور وہ ہاتھ جس سے وہ رشنا کی کمر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا جھٹکے سے ہٹا دیا۔ ہجوم نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ "واہ!" وہ سب سمجھ رہے تھے اب رقیبوں کی لڑائی شروع ہو گی۔

مگر انہیں مایوسی ہوئی۔

رشنا نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہجوم سے چیخ کر کہا۔

"سنو رے سنو___ رنگ ماسٹر میرا ماشوک نہیں ہے۔ میرا ماشوک یہ ہے۔"

اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کے مجھے ہجوم کے سامنے کر دیا تھا پھر وہ کھلکھلاتی ہوئی آواز میں چیخ کر کہنے لگی۔

"یہ رنگ ماسٹر تو میری ماں کا بھائی ہے۔ ارے ماموں ہے میرا اور اس میرے ماشوک کا ممیا سسر ہے۔ کچھ سمجھے ممیا سسر کیا ہوتا ہے؟"

ہجوم نے ایک آواز میں ہو کر کہا۔ "ہاں' سمجھ گئے۔"

"کیا ہوتا ہے؟" رشنا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

دو تین آوازوں نے گا کر کہا۔ "ماشوک کا سسر ہوتا ہے۔" اور باقی سب تالی بجانے لگے۔

رنگ ماسٹر بے وجہ کھلا پڑتا تھا۔ وہ ہر سمت میں جھک جھک کر اور ٹھک ٹھک کر کے اپنی ایڑیاں بجا رہا تھا۔ جیسے یہ پورا شو اسی کے لیے ہو رہا ہو۔ اسے بات بات پر داد وصول کرنے کا شوق تھا۔

ہم تینوں کسی میز تک پہنچے بھی نہ تھے کہ تالیاں بجاتے سرکس والوں نے اپنی میزیں چھوڑ دیں۔ ہمیں گھیر لیا۔

میرا غصہ یا جھنجھلاہٹ "جو بھی تھی" اب تک ختم ہو چکی تھی۔ سرکس والے کھلے دل کے لوگ لگتے تھے۔ ان کی ان باتوں سے رشنا کی "یا کسی کی بھی" توہین نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنے مسخرے پن اور ٹوٹتے نشے میں نئے دن کا استقبال کر رہے تھے۔

رنگ ماسٹر نے سرکس والوں کو خوش مزاجی سے دھکے دیتے ہوئے کافی جگہ بنا لی اور پکنک باسکٹ اپنی کرسی کے پاس فرش پر رکھ دی۔ اب اس نے کرتب دکھانے کے انداز میں باسکٹ سے ایک ایک چیز نکالنی شروع کی اور اپنی مرضی سے رشنا کے' میرے اور خود اپنے سامنے چیزیں رکھتا گیا' یا واپس ٹوکری کے حوالے کرتا گیا۔

ہر چیز دیکھ کر ہجوم داد دیتا یا تالی بجاتا تھا۔

باسکٹ سے وہسکی کی بوتلیں' بیئر کے ٹن' لمبے ڈنٹھلوں والے شراب کے گلاس۔ پنیر کے سربند ڈبے اور پھر ڈبے کھولنے والے کٹر اور بوتلوں کے کارک اڑانے والے پیچ کش' بڑھیا بسکٹوں کے ٹن' بٹر پیپر میں لپٹی روسٹ کی ہوئی سالم مرغی' کافی مگ' کانٹے' چھریاں' پلیٹیں' آٹھ دس نارنگیاں' اتنے ہی سیب' مخمل کے خوبصورت جھولنے میں بند سخت سینکی ہوئی ڈبل روٹی' شہد کا جار اور وٹامن کی گولیوں کی شیشی___ بے شمار چیزیں نکلی آ رہی تھیں۔ لگتا تھا عمرو عیار کی زنبیل ہے جس سے نعمتیں اور عیش کی چیزیں بس چلی آ رہی ہیں۔

رنگ ماسٹر نے گولیوں کی شیشی اٹھا کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے ہجوم کو "درجہ بہ درجہ" آنکھ ماری اور اپنی اعلانچیوں والی آواز میں رشنا کو اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "اور بھائی صاحبو! یہ ہیں اصلی سلاجیت کی گولیاں' یہ شیرنی کے دودھ اور کنوارے ریچھ کی کمر سے حاصل کیے ہوئے ایک خاص جوہر میں گوندھ کے تیار کی گئی گولیاں ہیں بھائی صاحبو! یہ حکیم ارسطاطالیس اصلی کی ایجاد ہیں صاحبو اور موج میلے کی کارکردگی میں سمجھو کہ تیر بہ ہدف ہیں۔ اسی لیے یہ گولیاں اس معزز جوڑے کو پیش کرتا ہوں۔ کس لیے کہ اس وقت پورے سرکس گراؤنڈ میں ان دونوں سے زیادہ اس کا حقدار اور کون ہو گا۔ بتاؤ کون ہو گا؟"

ہجوم نے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا چیخ کر ایک آواز میں کہا۔

"کوئی نہیں۔"

رنگ ماسٹر نے حکم دیا۔ "اچھا تو ان کے لیے ایک ایک گلاس سادہ پانی لاؤ۔"

پانی آ گیا۔

رنگ ماسٹر نے رشنا اور مجھے حکم دیا۔ "بھائی صاحبو! دو دو گولیاں سلاجیت اصلی ممسک جوہری درجہ اول آپ دونوں کھا لو' فوراً___ رام بھلی کرے گا۔"

رشنا نے انکار کر دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر شیشی اٹھا لی اس پر لکھا ہوا پڑھا' عام سی وٹامن بی کمپلیکس کی گولیاں تھیں۔ دو نکال کر میں نے پانی سے نگل لیں۔ رنگ ماسٹر سمیت ہجوم نے "ہاں آ۔ شیر کا بچہ ہے!" کہہ کر تالی بجائی۔ میں اٹھا "تعظیم کے لیے جھکا اور میں نے داد وصول کی۔

میں بھی ان کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔

اب رشنا بھی اٹھی اس نے بھی دو ممسک جوہری گولیاں نکالیں' ہتھیلی پر رکھ کر پورے حلقے کو دکھائیں۔ حلقے سے پسندیدگی کی گونج سنائی دی۔ "ہا آ آ آں!"

رشنا نے پہلے ایک پھر دوسری گولی پانی سے نگلی اور وہ بھی میری طرح داد وصول کرنے کو جھکی۔ اپنے برمی فراک کا گھیرا پکڑ کر دونوں گھٹنے خم کر کے اس نے ہجوم کو سلامی دی۔

"ہا آ۔ شیر کی بچی ہے ماشوک____ شیر کی بچی ہے۔" ہجوم نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

دو بونے میزوں کے بیچ خالی جگہ میں ایک دوسرے کے پنجوں میں پنجے پھنسا کے گھمن گھیری ناچنے لگے۔

رنگ ماسٹر نے رشنا نے اور میں نے تال دینی شروع کر دی۔

جو ہجوم ہمیں گھیرے ہوئے تھا۔ وہ اب گھمن گھیری ناچتے ان بونوں کی طرف گھوم گیا اور بڑے جوش سے تال دے دے کر کچھ گانے لگا۔

ہم تینوں اس تال دیتے گاتے ہجوم میں شامل ہوگئے۔ ہماری مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی' اسپاٹ لائٹ سمجھو اب ان بونوں پر تھی۔

"تری درا' دا۔ تری دادا۔ تانا تانا' تن تنانا____ او' تری درا' دا۔ تری دادا۔" نہ معلوم کیا گیت تھا میں بھی سب کے ساتھ چیخ چیخ کر تری درادا کرنے لگا۔

کوئی پانچ سات منٹ یہ ناچ' تالیاں اور تری دادا چلتا رہا پھر جس طرح اچانک بونوں نے ناچنا شروع کیا تھا ایک دم ہی انہوں نے بند کر دیا۔ وہ دونوں ہنستے اور ایک دوسرے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دائرہ توڑ کر ایک طرف نکل گئے اور کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

ہجوم چھٹ گیا' سب اپنی میزوں پر چلے گئے۔ ہمیں لیے ہوئے رنگ ماسٹر اپنی میز کی طرف بڑھا اور پھر ٹھٹک کر وہیں کھڑا رہ گیا۔

رنگ ماسٹر کی میز پر شیر کی کھال سے بنا کاسٹیوم پہنے ایک لمبا تڑنگا' چوڑا چکلا ادھ ننگا باڈی بلڈر بیٹھا پر شور طریقے سے اس کے سیب کھا رہا تھا۔ کھا نہیں رہا تھا چر رہا تھا۔ باڈی بلڈر کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سیب تھا اور وہ اپنے مضبوط سفید دانتوں سے کبھی ایک سیب کو اور کبھی دوسرے کو اپنے سر کا جھٹکا دے کر جیسے اکھاڑتا تھا پھر خچر کی طرح منہ چلاتے ہوئے چبانے لگتا تھا۔ بہتے ہوئے رس سے اس کا نچلا آدھا چہرہ چمک

رہا تھا اور سیب کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کی ہتھوڑے جیسی ٹھوڑی اور بالوں بھرے سینے پر گر رہے تھے۔

سٹراپ سٹراپ کی آوازیں سن کر اب دوسرے بھی ادھر دیکھنے لگے۔

رنگ ماسٹر کو سامنے پا کر وہ بھرے منہ کے ساتھ ہو ہو ہو کر کے ہنسا۔

میں پریشان ہو کر کبھی بلڈر کو کبھی رنگ ماسٹر کو دیکھنے لگا۔ رنگ ماسٹر غصے میں باقاعدہ کانپنے لگا تھا۔

باڈی بلڈر اپنی بھونڈی آواز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا سوچ رہا ہے؟ آ مار مجھے۔ آ۔"

کیسی اچھی صبح طلوع ہوئی تھی مگر اب سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ ماحول میں غصہ تھا۔

رنگ ماسٹر نے اپنا سر جھٹک کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا جیسے کوئی نیند کے جھونکے سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا ہو' بالکل اس طرح۔

باڈی بلڈر نے ہنستے ہوئے اسے پھر للکارا۔ "آ مار۔" رنگ ماسٹر نے رشنا کی طرف گھوم کر دھیرے سے کہا۔ "تم دونوں ایک منٹ کو ذرا باہر چلے جاؤ۔"

خیمے میں سناٹا ہو گیا تھا۔

رشنا نے رنگ ماسٹر کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک بار ایسے تھرایا جیسے بجلی کا زندہ تار اسے چھو گیا ہو۔ پہلے کی طرح آہستہ سے بولا۔ "نہیں بے بی! چھونا نہیں مجھے____ ہاتھ نہیں لگانا____ نہیں۔"

رشنا کو اندازہ نہیں تھا۔ اس نے "اب ایسا بھی کیا" کہہ کر رنگ ماسٹر کی پیٹھ تھپکنا چاہی تھی کہ وہ منہ اٹھا کر پوری طاقت سے چیخا۔ "ہا آ آ آ۔" پھر اس نے جھپٹ کر قریب پڑی کرسی اٹھائی اور باڈی بلڈر کے سر پہ چلا دی۔

میں نے دل میں سوچا۔ "یہ گیا شیر کی کھال والا اب نہیں بچتا۔"

مگر باڈی بلڈر نے بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ اٹھایا اور بازو کے پر گوشت حصے پر یہ وار روکا۔ کرسی تین ٹکڑوں میں ٹوٹ کر گر گئی۔

میں رشنا کو بانہہ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا خیمے سے باہر لے گیا۔

جاتے ہوئے سنا اندر سے ایسی آوازیں آئی تھیں جیسے سانڈ ایک دوسرے پر پھنکارتے ہوئے جھپٹ رہے ہوں۔ خیمے میں بھرے لوگوں نے نا نا نا کہہ کر کسی کو باز

رکھنے کے لیے ایک ساتھ شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم دونوں خیمے سے نکل کر دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ اندر پھٹ کی سی آواز ہوئی لگتا تھا چھوٹے بور کا فائر آرم چلایا گیا ہے۔ کسی کے دھم سے گرنے کی بھی آواز آئی تھی۔

میں واپس اندر جھپٹا۔ رشنا میرے پیچھے تھی۔ رنگ ماسٹر اپنی میز کے پاس ہاتھ میں پیتل کا چھوٹا سا جیبی پستول لیے کھڑا تھا۔ پستول کی نال سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ باڈی بلڈر کی کرسی الٹی پڑی تھی۔

میرے برابر سے ایک بونا۔ ''مار دیا رے مار دیا آتو بجار کو مار دیا۔'' چلاتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ کوئی اور اسے روکتا ہوا پیچھے بھاگا مگر بونا بہت تیز دوڑا تھا۔

میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ یہ خبر سنی۔ ویسے ہی ہماری اپنی کرنی کیا کم تھی جو اب ہمیں پناہ دینے والا رنگ ماسٹر ایک قتل کر بیٹھا۔ نحوست شاید ہمارے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

میں نے فرش پر گرے ہوئے باڈی بلڈر کو دیکھا۔ وہ ٹوٹی کرسیوں کے ملبے میں پڑا اپنا بایاں شانہ سختی سے دبائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں بھیگتی جا رہی تھیں۔ آتو بجار (بونے نے اس کا یہی نام لیا تھا) مرا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب تک منہ چلا رہا تھا۔ ہو ہو کر کے ہنستے ہوئے اس نے منہ میں بھرے سیب کے ٹکڑے اور گگری فرش پر تھوک دی اور بولا۔ ''پشتول چلایا ہے___ حرامی!''

رنگ ماسٹر نے اسے مارنے کو ایک اور کرسی اٹھالی۔ اس کے دیسی پستول سے شاید ایک ہی فائر ہو سکتا تھا۔

میں رنگ ماسٹر کو اس حملے سے روکنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ خیمے کے لوگوں اور بونوں نے چیخ کر کہا۔ ''نہیں بابو! قریب مت جانا۔''

ارے رنگ ماسٹر نے زخمی آتو کو مارنے کے لیے کرسی اٹھائی ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ مجھے آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں مگر میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ ایک جتھے کی صورت میں وہ رنگ ماسٹر کو گھیرتے جا رہے تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ کرسی کی ٹانگیں چار انگلیوں والے پنجے کی طرح رنگ ماسٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ گھیرا ڈال چکے تب ماسٹر کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر گیا ہے۔

اس نے دیکھا اور حملے کے لیے اٹھائی ہوئی اپنی کرسی اس نے فرش پر رکھ دی

اور اس پر بیٹھ گیا پھر سر جھکا کر اپنے جوتوں کے درمیان فرش کو گھورنے لگا۔

اب وہ ایک پرسکون اور فکر مند آدمی تھا۔

میں نے سرکس میں کٹیلے جانوروں کو کرسی کے بڑھتے ہوئے پنجوں سے قابو میں آتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے سامنے ایک انسان___ خود کٹیلوں کا تماشا دکھانے والا رنگ ماسٹر کرسی سے قابو میں آ گیا تھا۔

ایک چھوٹی سی آواز نے کسی بچے کی آواز نے اچانک سوال کیا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

رشنا اور میں گھوم گئے۔ خیمے کے دروازے میں ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی تھی۔ آٹھ نو برس کی بچی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی تجسس بھری آواز میں پھر پوچھا۔ ''جانم! کیا ہوا تھا ابھی؟''

اس نے یہ سوال رنگ ماسٹر سے کیا تھا۔

''کچھ نہیں ڈارلنگ___ تم کیوں آ گئیں؟ جاؤ سو جاؤ۔'' رنگ ماسٹر نے جس طرح کہا تھا اس سے مجھے شک سا ہوا۔ میں نے پھر دیکھا اب کے غور سے دیکھا۔

وہ بچی نہیں، عورت تھی پوری عورت___ وہ بونی تھی۔

بونی نے پوچھا۔ ''جانم! یہ ایسے کیوں بیٹھا ہے؟'' وہ بجار کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ''کیا ہو گیا اس کو؟ کیسے چوٹ لگ گئی؟''

جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کیا ہوا ہے۔ اسے خبر کرنے والا بونا خیمے کے دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا اس کو؟'' بونی نے پھر پوچھا۔

''کیا خبر؟'' رنگ ماسٹر نے پھر سر جھکا کر فرش کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

آتو بجار کبھی بونی کو کبھی رنگ ماسٹر کو سر گھما گھما کر دیکھتا رہا تھا۔ اب جو رنگ ماسٹر نے ''کیا خبر'' کہہ کر سر جھکا لیا تو آتو فرش پر سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور شکایت کے لہجے میں بولا۔

''بیلا جی! بیلا جی! اس نے پشتول مارا ہے___ حرامی نے۔''

خوب تو رنگ ماسٹر کی رکھیل بیلا جی یہ ہے___ بونی۔

آتو کی بھدی آواز میں ماسٹر کے لیے گالی سن کر بیلا جی کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ بجار کی طرف دیکھے بغیر اس نے منہ میں سے ایک کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔

"او سن ادھر آ۔ ہاں تجھی سے کہہ رہی ہوں ___ لے جا اسے ___ کمپوڈر اٹھ گیا ہوگا۔
اس کی پٹی کرادینا۔"

میز سے جو اٹھ کر آیا وہ بھی بونا تھا۔ وہ بھنبھناتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں
بولا۔ "ابھی کدھر اٹھا ہوگا۔ کمپوڈر رات پوری باٹلی ٹکا کے گیا تھا۔"

"جا جا سالا بالشٹر! ادھر ہی جرح کرنے لگا ہے حرام کا۔ ابے جاتا ہے یا پچھائے
ٹھڈا کھائے گا۔ گاں ___!" رنگ ماسٹر ٹھیک کہتا تھا۔ بیلا جی کچی نیند سے اٹھادی گئی
تھی۔ اب یہ دن بھر گندی گندی گالیاں بکے گی۔

گالی کھا کر بونا بجار کے پاس گیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے چلا۔ لگتا
تھا کرکٹ کے بلے کو اس کی گیند کھینچے لیے جا رہی ہے۔

جوں ہی آتو بجار اور بونا خیمے سے نکلے بونی بیلا جی حلق سے لاڈ کی آوازیں نکالتی
رنگ ماسٹر کے جوتوں پر پیر رکھ کر اچھلی اور اس کی گود میں جا بیٹھی۔ "ار۔ ارے میرا فلک
شیر۔"

"پھلکو میرا کیا بات ہوگئی ڈارلنگ؟ ___ تجھے کیوں غصہ آگیا؟ آں میری
جان! پستول کائے کو چلایا تو نے اس حرامی ___ اس پونے پہ کائے کو چلایا پستول؟"

بونی رنگ ماسٹر کے بڑھے ہوئے شیو پر اپنے رخسار رگڑنے لگی اور چچ چچ کی
آوازیں نکالتے ہوئے کچھ یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ اس کے بوسے لے رہی ہے یا لینا
چاہتی ہے۔ مگر حاضرین کی وجہ سے جھجھکتی ہے۔

رنگ ماسٹر اس کی پہنچ سے دور ہونے کو اپنا چہرہ دائیں بائیں ہٹا کر اسے روکتا
رہا۔ "نا ڈارلنگ! نا بیلا! اری بات تو سن۔" مگر بیلا جی کا لاڈ اور نقلی چوما چاٹی چلتی رہی اور
بار بار وہی سوال کہ کیا بات ہوگئی؟ کیوں غصہ آگیا؟ پستول کائے کو چلایا؟

رنگ ماسٹر نے بیلا جی کی اس غیر معمولی توجہ سے بچنے کو شاید ایک بار منہ کھول
کر بتا دینا چاہا مگر پھر "ہاں وہ یہ" کہہ کر چپ ہوگیا۔

"بتا نا کیا بات ہوگئی جانم؟" بیلا جی اب اپنے پھلکو فلک شیر کی گود میں کھڑی ہو
گئی اس کے کھلے گریبان میں دور تک اپنا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ ڈال دیا اور اندر ہی اندر رنگ
ماسٹر کا سینہ تھپتھپانے لگی۔ اسے گدگدی ہو رہی تھی یا کوئی بات ہوگئی جو وہ سرخ ہوگیا
اور گھگیانے لگا۔ "بس کر ذرا ٹھہر تو ___ اری دیکھ تو سب ہیں ___ یہاں ___ بھلا یہ
کون سا وقت ہے؟ ___ بیلا او بیلا جی! نہیں سنے گی؟"

بونی بیلا جی مم مم کرتی ہوئی جیسے خود بھی اپنی مصروفیت میں مگن ہو رہی
تھی۔ فلک شیر دلاور نے ہتھیار ڈال دیے اور منہ سے رال گراتے ہوئے بولا۔ "سنیں!
بتاتا ہوں ___ بتاتا ہوں۔ اس نے ___ اس نے سالے نے میرے سیب کھا لیے تھے۔
اس لیے اس لیے گولی ماری ہے۔ چل ہاتھ نکال ___ اتر۔"

بیلا جی بہت فتح مند اور مسرور اپنے فلک شیر کی گود سے اتر آئی۔

اس نے خیمے میں موجود لوگوں اور بونوں کی طرف جیتی ہوئی عورت کے
غرور سے دیکھا اور حکم دیا۔ "پھلکو کی باسکٹ میں اس کی سب چیزیں واپس رکھ دو۔"

خیمے میں موجود لوگ، حد یہ ہے کہ بونے تک بے تعلقی یا بے زاری بلکہ ایک
دھیمی نفرت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بیلا جی کی بات پر توجہ
نہ دی۔ میں نے دیکھا چند لوگ دو تین بونے تک، جماہیاں لے رہے تھے۔

"تمہاری بھین کا یہ، کا وہ ___ سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟"

بونی نے منہ بگاڑ کر گفتار بکنی شروع کر دی تھی۔ رشنا نے حیرت سے مجھے
دیکھا۔ دھیرے سے بولی۔ "اس چھوٹی ڈبیا سی عورت میں کتنا گند بھرا ہے۔"

میں کچھ نہ بولا، بھوک لگنا شروع ہوگئی تھی۔ صبح تڑکے سے بلکہ آخری پہر
کے اندھیرے سے اب تک بڑی دیوانگی کے ساتھ ہم نے وقت گزارا تھا۔ پھر ساری
رات جاگتے ہوئے کٹی تھی۔ بھوک تو لگنا ہی تھی۔

بیلا جی کی گالی گفتار سن کر سبھی بونے رنگ ماسٹر کا سامان اس کی باسکٹ میں
بھرنے لگے تھے۔

بونی نے اب ہماری طرف توجہ کی۔ لگتا تھا ہم دونوں پر ___ اس سے پہلے اس
کی نظر نہ پڑی ہوگی۔ اس نے ایک بار مجھے دیکھا۔ منہ بنایا پھر رشنا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں
چمکنے لگیں۔ جھک کر اس نے رنگ ماسٹر فلک شیر کے کان میں کچھ کہا۔ فلک شیر نے بہت
شدت سے انکار میں سر ہلایا۔ وہ دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا پاگل ہوگئی ہے؟ اری وہ
میاں بیوی ہیں۔"

بیلا جی رنگ ماسٹر کی کرسی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اب وہ اس کے برابر آگئی۔ وہ
رنگ ماسٹر پر جھکی ہوئی برابر اس سے کچھ کہہ جا رہی تھی۔

رنگ ماسٹر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بیلا جی گرتے گرتے بچی۔ کھسیا گئی۔
اس نے ڈپٹ کر بہت غصے سے مجھے دیکھا۔ بولی۔ "او ___ رے کیا دیکھتا ہے؟ کون ہے تو؟"

کدھر سے آیا ہے سالا پرورٹ!" وہ نہ معلوم کیوں مجھے خلاف فطرت ہونے کا طعنہ دے رہی تھی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے رنگ ماسٹر نے کہا۔ "مہمان ہے میرا۔ اس سے کیا منہ ماری کر رہی ہے۔ بتایا نا' میرے ساتھ آئے ہیں دونوں۔"

بونی نے فلک شیر کی کہی بات ان سنی کر دی' اسی گندے لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ "اورے' او یہ رنڈی کون ہے تیری؟___ کیا تیری ماں ہے؟"

میرے کچھ کہنے سے پہلے رشنا آواز بنا کر ہنسی' بولی۔ "اری او پاگل کیسی بھلکڑی ہے___ کیا بھول گئی؟ ارے اس کی نہیں میں تیری میا ہوں۔ تانگہ ہوں ادھر کی۔ آٹھ آٹھ آنہ لے کے میں ہی تو چھوڑتی جاتی ہوں___ پورے کا آٹھ آنہ' بونے کا چار آنہ' پونے کا ایک آنہ___ یاد آیا؟"

رنگ ماسٹر کا منہ تھتھا ہوا تھا لیکن رشنا کی بات سن کے اس نے چہرہ اٹھا کے ایک زبردست قہقہہ لگایا پھر پیٹ پکڑ کے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا۔ "آج ملی ہے یہ تیرے سسر کی استاد___ اے شاباشے___ ہاہاہا۔ یہ ملی ہے۔"

بیلا جی کرسی کے پیچھے سے غصہ ور نیولے کی طرح خی خی کی آواز نکالتی ہوئی جھپٹی اور اس نے بہ یک وقت رشنا کی طرف کک چلایا اور میرے پیٹ میں گھونسا مارا۔ رشنا اس کے لیے تیار تھی اس نے اپنی طرف آتے بیلا کے کک کو ہتھیلی بڑھا کر ذرا اوپر اٹھا دیا۔ بونی کا توازن بگڑ گیا۔ وہ گر گئی میری طرف چلایا ہوا اس کا گھونسا اوچھا پڑا' ذرا سا نیچا___ مارے تکلیف کے میں دہرا ہو گیا۔

بیلا جی بونی فرش پر پڑی ہوئی مجھے___ خدا معلوم مجھے کیوں___ طرح طرح کی گالیاں نکال رہی تھی___ "تیری ماں کو بھین کے یاں کاواں۔___ حرامی سالے بنگلوری آئس کریم' گینگلو کی اولاد سالہ دلا کدھر کا___"

رنگ ماسٹر فلک شیر نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے بھی جھک کر فرش پر پیچ و تاب کھاتی بونی کو کمر کے گرد بازو ڈال کے چھوٹے بنڈل کی طرح اٹھایا اور اسے بغل میں مار خیمے سے نکل گیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

تین بونوں نے رنگ ماسٹر کی پکنک باسکٹ اٹھائی اور مشقت کی آوازیں نکالتے ہوئے وہ بھی پیچھے چل پڑے۔

دور سے بونی بیلا جی کی چیختی چنگھاتی آواز آ رہی تھی۔ "ان دونوں سالوں کی

بھین کا یہ کاوہ کا دلا سالا فش ٹولا اور وہ سالی رانڈ___"

رشنا نے تھکی ہوئی بیزار خوش مزاجی سے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "گئی سسری۔ جان چھوٹی۔"

"مگر وہ تو کھانے کی سب چیزیں لے گئے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟"

رشنا نے لاعلمی میں کندھے اچکائے۔

میرے پیچھے سے ایک سنجیدہ آواز آئی۔ "آؤ میرے ساتھ ہم تمہیں ناشتا کراؤں گا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نیلے اوور آل میں ایک سنجیدہ چہرے والے عرب' ایرانی یا شاید پاکستانی اوور آل کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

اس نے جیبوں سے ہاتھ نکالے۔ مصافحے کے لیے بڑھا دیے۔ "میرا نام بادل ہے۔ ادھر الیکٹریشن لگا ہوا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا تھا۔

میں نے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں محنتی آدمی کا کھردرا پن اور بے غرضی تھی۔

"تم پاکستانی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں اور والد صاحب مسقط میں پیدا ہوئے تھے۔ دادا صاحب بلوچستان سے گیا تھا۔"

بادل بلوچی ہمیں لیے ہوئے میزوں کے درمیان راستہ بناتا خیمے کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔

میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اب اپنے مگوں' گلاسوں اور پیالوں میں جھکے ہوئے چائے کافی کچھ پیتے لگتے تھے۔ میں نے دیکھا ان کے مگ اور گلاس جھڑی ہوئی تام چینی اور پیلے ایلومنیم کے تھے۔ پیالیاں سب کوریں' جھڑی اور بے جوڑ تھیں۔ تام چینی کی کالونچ لگی رکابیوں اور برمی زبان کے پرانے اخباروں پر بھورے بدرنگ آٹے کی گیندیں رکھی تھیں اور بہت سے کھیرے چیر ادیئے ہوئے اور نمک مرچ لگے کھری میز پر پڑے تھے۔

کوئی کوئی ورکر بے دلی سے ان بھوری گیندوں کو اٹھا اٹھا کر کتر رہا تھا___ کھیروں کو تو میرے دیکھتے کسی نے چھوا بھی نہیں۔

ہم تینوں بڑے روشن خیمے کو چھوڑ کر اس سے ملی ہوئی باورچیوں کی چھولداری میں آئے۔ چینیوں جیسی صورتوں کے چار آدمی چولہوں پر کچھ گرم کر رہے تھے یا پکا رہے تھے۔

انہوں نے بادل سے کچھ کہا تو معلوم ہوا کہ شکلیں بے شک چینیوں جیسی ہیں مگر وہ چینی نہیں ہیں۔ وہ شکایت کے لہجے میں ہمارے میزبان سے کچھ کہہ رہے تھے۔

بادل نے انہیں دھیرج سے کچھ سمجھاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ لوگ ہمارے بارے میں بات کر رہے ہوں گے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ہم سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ آخر تھوڑی بحثا بحثی کے بعد چینی دکھائی دینے والوں میں سے ایک نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا جو باہر سے تین فولڈنگ کرسیاں اٹھا لایا جو اس نے دیگوں، چولھوں سے دور ایک صندوق کے پاس بچھا دیں۔ صندوق ایک طرح کی میز بن گیا۔

ہم تینوں بیٹھ چکے تو باورچیوں میں سے ایک بڑے خیمے میں کھلنے والے دروازے میں اسٹول ڈال کے راستہ روک کے بیٹھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ادھر سے کوئی نہ آ جائے ___ دوسرے باورچی جلدی ناشتا تیار کر رہے تھے۔

بادل کہنے لگا۔ "دیگوں والی چائے بے کار ہے۔ یہ آپ لوگ کو نئی چائے بنا کر دے گا۔"

میں نے دھیرے سے کہا۔ "مہربانی ہے تمہاری۔"

وہ بولا۔ "ادھر ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے دوست۔ یہ لوگ ویسے ہی طبیعت کا اچھا ہے۔ ابھی یہ بولو۔ آپ لوگ دونوں کو ایک انڈا کافی ہوئے گا' چلے گا؟"

رشنا کہنے لگی وہ انڈا نہیں کھاتی۔ انڈے میٹ کے سوا جو بھی ہو گا چلے گا۔ رشنا شاید بودھ تھی۔ میں بھی انڈا گوشت چھوڑ چکا تھا۔ کایا بدل کرنے والے کو انڈا' گوشت' تمباکو' شراب کچھ بھی لینے کی اجازت نہیں تھی۔

ہم نے بلوچی کو سمجھا دیا۔ اس نے باورچیوں کو بتا دیا تو انہوں نے آلو ابالنے کو چڑھا دیے۔

وہ دھیمے لہجے میں باتیں کرتا ہوا اس ناکافی ناشتے کے لیے پیشگی معذرت کرتا رہا جو ابھی ہم دونوں کے سامنے لایا بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی محبت سے جو بھی مل جائے گا نعمتوں سے بڑھ کے ہو گا۔

بلوچی بولا۔ "دوست! بڑا کڑکی ہے ویسے تو سرکس چل ہی نہیں رہا اور جو تھوڑا بہت آتا ہے وہ تینوں آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ وہ لوگ ورکروں کو وعدے وعید کے سوا دیتے ہی نہیں کچھ۔ بے زبان جانوروں تک کو بھوکا مار رکھا ہے۔ وہ لوگ بس سب کو آدھا پیٹ دیتا ہے۔"

میں نے سوچا تینوں سے اس کی مراد وہ تینوں ہوں گے۔ رنگ ماسٹر' باڈی بلڈر اور بیلا بونی۔

اخباروں پر پڑے کھیروں اور آٹے کی گیندوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ یہ وہ ناشتا تھا جسے رنگ ماسٹر طاقت سے بھرپور ایک دم بم فولادی ناشتا بتا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "جب کچھ ملتا ہی نہیں ہے تو سب لوگ کیوں ٹکے ہوئے ہیں؟"

بادل بولا۔ "کدھر جاوے؟ سب لوگ کی شناختی پرچیاں سرکس کے ساتھ ہی ہیں۔ پرچی کے بغیر کہیں کسی جگہ کوئی گھسنے ہی نہیں دے گا۔ دم لیاقت نہیں ہے یہیں کام ملے گا' نہیں کوئی کدھر ٹکنے دے گا۔"

مجھے بونی اور رنگ ماسٹر کی سنگت یاد آ رہی تھی۔ میں نے ویسے ہی کچھ نہ کچھ کہنے کو کہہ دیا کہ یہ دو ایک طرف ہیں اور باڈی بلڈر ایک طرف ہے۔ میرے خیال میں تو وہ زیادہ خطرے میں ہے۔ رنگ ماسٹر کے پستول سے ابھی مرتے مرتے بچا ہے۔

بادل میری بات سن کر ہنسا۔ کہنے لگا۔ "آپ کیا سمجھتے ہو' یہ جو آتو بجار کو گالی نکالی تھی یہ تو سب ناٹک تھا اصل میں تو وہ آتو کی عورت ہے۔ رنگ ماسٹر کو تو پھنسا رکھا ہے۔ یا سمجھو کسی کی بھی نہیں ہے۔ بس کھلی چھوڑی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کو فلک شیر کے خیمے میں گئی ہے۔ ادھر سے اپنی تسلی کرا کے بجار کے خیمے میں جا کے پڑ جائے گی۔ چوما چاٹی کر کے اس مردار کو منائے گی۔ کمپوڈر کو ٹھڈے مار مار کے بجار کے بازو پر ایک دم نئی بینڈیج کرائے گی۔ اسے بھلے ہی بخار ہووے نہیں ہووے سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھے گی پھر شام تک ادھر ہی پڑی سوتی رہے گی۔"

"اور شام کے بعد؟"

"شام کے بعد سرکس کا شو چلے گا۔ شو کے پیچھے وہ فلک شیر کے ٹینٹ میں جا سوئے گی۔ سب کو پتا ہے۔ آتو بجار کے گولی پڑنے کی خبر دینے کو وہ بونا بھاگا بھاگا گیا تو سیدھا رنگ ماسٹر کے ٹینٹ میں گیا تھا۔ سب کو خبر ہے شو کے پیچھے وہ ادھر ہی ہوتی

ہے۔"

"عجیب بات ہے!"

بادل بولا۔ "ایسا ہی نظام ہے۔" انتظام کا لفظ کہتے ہوئے اس نے برا منہ بنایا تھا۔

"یہ بتاؤ اب جو گولی چلی ہے اور بجار زخمی ہو گیا ہے تو رنگ ماسٹر کے اس کے بیچ دشمنی نہیں ہو گی؟"

"ہاں برابر دشمنی ہو گئی مگر یہ وقتی ہے۔"

میں نے دھیرے سے کہا۔ "عورت پہ ان کی دشمنی نہیں ہوتی۔ سیبوں پہ ہو گئی۔"

"عورت؟ کیسی عورت؟ وہ عورت مورت نہیں ہے پارٹنر ہے بھئی سمجھے؟ سب چیز میں وہ بھی حصہ بٹاتی ہے۔ ان لوگ کا دوستی دشمنی سب ٹائم ٹائم سے ہوتا ہے۔ کتنی دفعہ وہ مردار اس کو اٹھا کے پھینک چکا ہے کبھی یہ اس پر فیر کرتا ہے کبھی وہ کرتا ہے' مرتا کوئی نہیں' بھاگتا کوئی نہیں۔ ہر بار سیزن ختم ہونے پر یہ لوگ دوست بن جاتا ہے۔ حصہ بخرا کرتا ہے۔ ہم لوگ کو تسلی دیتا ہے۔ بولتا ہے انتظار کرو۔ بونی اپنی کہتی ہے۔ باڈی بلڈر اپنی بولتا ہے۔ میں رنگ ماسٹر کی کمر توڑوں گا بس دیکھتے رہو۔ فلک شیر کہتا ہے آتو بجار کو زندہ نہیں رہنے دینا ہے۔ ابھی یہ بھی ہو سکتا ہے بجار کے خیمے میں اس وقت وہ خود بھی بیٹھا ہو۔ تین گلاس سامنے رکھے اپنا بوتل کھولے لگا پڑا ہو یا کھڑے ہو ہو کے ٹھک ٹھک ایڑی بجا بجا کے بجار کا بونی کا گلاس بھرتا ہووے۔ آنکھ مار مار کے ٹھٹھے لگاتا ہووے۔ ان لوگ کا ہمیشن سے ایسا ہی ہے۔"

اور میں کیا کہتا۔ میں نے کہا۔ "ان کو مار کے نکالو۔ سرکس تو تم ہی لوگ چلا رہے ہو۔ بس چلاتے رہو۔"

بلوچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اپنی سنجیدہ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ چینیوں جیسے دکھائی دیتے دو بیرے کھانے کی چیزیں اور چائے کی کیتلی گلاس اٹھا کر لا رہے تھے۔ انہوں نے صندوق پر سب چیزیں لگا دیں۔ بادل نے ہمیں اشارہ کیا کہ کرسیاں آگے سرکا لو اور شروع ہو جاؤ۔

آلو کی دال اور پوریاں تھیں۔ زعفرانی رنگ کا حلوہ تھا اور چائے تھی۔

بادل نے بہت کہنے پر ہمارے ساتھ چائے پی لی۔

ناشتے سے فارغ ہو کے چینیوں جیسی صورت والوں کا شکریہ ادا کر کے ہم باورچیوں کے علاقے سے نکل آئے۔

اتنی دیر میں بادل کو ہم نے مختصراً اپنی پریشانی بتا دی تھی کہ کچھ لوگ بے وجہ ہمارے دشمن ہو گئے ہیں انہوں نے پولیس کو کچھ دے دلا کے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ خود بھی اور برما کی پولیس بھی ہماری تلاش مین نکلی ہوئی ہے۔ اگر دن کے دن بلوچی ہمیں پناہ دے دے گا تو ہم موقع ملتے ہی آگے نکل جائیں گے۔

بادل بلوچی دو تین منٹ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا مگر جب سوچنے کے بعد بولا تو اس کے لہجے میں کسی طرح کا شک شبہ نہیں تھا۔ ایک قبائلی مرد کی سی مضبوطی تھی کہنے لگا۔ "زندگی میں پہلی بار تمہارے چہرے پر نگاہ ڈالی ہے دوست! مگر ہم الیکٹریشن ہوں جس طرح نظروں ہی نظروں میں سرکٹ سمجھ لیتا ہوں اس طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم ہمارے سے عیاری غداری نہیں کرے گا۔ مرد کا بچہ ہے۔ ایسا ہے کہ وہ تینوں مردار کو تو تم لوگ ابھی یاد بھی نہیں ہوئے گا پی پلا کے دو چار گھنٹے بعد وہ لوگ ٹینٹ سے باہر آئے گا تو تم دونوں کو بالکل بھول چکا ہوئیں گا۔ بڑے خیمے میں سویرے کام سے پہلے جو آدمی اکٹھا ہو گیا جنھوں نے تم کو دیکھا تھا وہ ورکر لوگ ہے۔ دل کا صاف ہے۔ پولیس آ کے کچھ بھی پوچھے گی تو بس انکار میں سر ہلائے گا وہ لوگ' ویسے ہم بھی جا کے بول دوں گا کہ یہ عورت مرد میرا مہمان ہے۔ ان لوگ کا خیال کرنے کا ہے۔"

ہم بے فکر ہو گئے۔ "بس۔ پھر پروا نہیں۔" اچھی طرح روشنی ہو گئی تھی۔ سرکس گراؤنڈ میں صفائی والے اور جانوروں کو خوراک دینے والے پوری طرح مصروف ہو گئے تھے۔ بادل ہمیں چھوٹے خیموں کی بھول بھلیوں میں لے چلا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ عام ورکر بادل کو دیکھ کر مسکراتے ہیں اور سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ سرکس کا یہ الیکٹریشن شاید اپنے مزاج کی شرافت کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ یہ چند ہی منٹ میں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کبھی کسی نے کام کرنے والوں کا حق ان لٹیروں سے مانگنے کی ہمت کی تو وہ یہی بلوچی ہو گا۔

ایک خاصے بڑے سایہ دار پنجرے کے پاس جسے سلاخوں کی بجائے بھاری پلائی وڈ اور اسٹیل کی باریک جالی سے بنایا گیا تھا۔ ہم نے ایک دلچسپ چیز دیکھی۔ سبز پتوں اور شاخوں کے ڈیزائین سے پینٹ کیا ہوا ایک دہرا خیمہ تھا جو ایک ہی نظر میں رشنا کی اور میری توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

ہمارا میزبان بادل اس پینٹ کیے ہوئے خیمے کے پاس جا رکا۔ بولا۔ "یہ سانپوں کے بادشاہ ناگی شا کا خیمہ ہے۔" اس نے پلائی وڈ اور جالی والے پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ "اس پنجرے میں اس کے اژدہے، ناگ، سانپ، سنپولئے، کوبرے، موبرے رہتے ہیں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں رشنا کی طرف دیکھا۔ رشنا دھیمے دھیمے مسکرانے لگی۔

میں نے اس پینٹ کیے ہوئے خیمے جیسی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عام سے کینوس کا خیمہ تھا جسے ہر طرف سے سبز، زرد، براؤن، کاہی، دھانی حقیقی فطری رنگوں اور شکلوں میں روغنی پینٹ سے سجا دیا گیا تھا کہ دیکھ کر گھنی جھاڑی کا گمان ہوتا تھا۔ تروتازہ بھی اور سوکھتے ہوئے پتے بھی اور ساتھ میں نئی کونپلیں، شاخیں اور کلیاں اور جنگلی جھاڑیوں کے پھل اس مہارت سے بنائے گئے تھے کہ دیکھ کر طبیعت فرحت محسوس کر سکتی تھی۔ پینٹ تازہ لگتا تھا۔

بادل نے بتایا کہ ناگی شا کے دو ہی شوق ہیں ایک تو سانپ پالنا، سانپ کا تماشا دکھانا اور دوسرا اپنے خیمے کے پتوں، شاخوں، کونپلوں میں جب بھی موقع ملے رنگ بھرنا۔

ناگی شا کا خیمہ دو کمپارٹمنٹ کا تھا۔ یعنی دروازے کے بیچوں بیچ ایک قنات کھینچ دی گئی تھی جس نے خیمے کو دو برابر حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصے پر پردہ لہرا رہا تھا۔ دوسرے کا پردہ سمٹا ہوا تھا۔ اس پردے پر ریلوے اسٹیشنوں کے باتھ رومز وغیرہ پر کالے پینٹ سے بنے عورت مرد کے پتلوں جیسے نقش بنے ہوئے تھے یعنی یہ حصہ مردانہ اور وہ زنانہ ہے۔

بادل نے اشارے سے بتایا کہ زنانہ حصے میں ناگی شا کی بیٹی رہتی ہے جو اس کی اسسٹنٹ بھی ہے۔

بادل کی آواز پر اپنے خیمے کے کسی کونے کھدرے سے جو نکل کے آیا وہ عجیب وضع کے کپڑے پہنے تھا۔

فلمی خانہ بدوشوں کو تو شوخ رنگ سارٹن کی شلوار، نکا اور پھولی ہوئی گھیر دار آستینوں والی چوڑے کالر کی جھلملاتی قمیص پہنائی جاتی ہے اور سر سے شوخ رنگ کا ریشمی رومال باندھا جاتا ہے۔ یہ شخص جو مسکراتا ہوا برآمد ہوا دھاری دار صوفیانہ رنگوں میں بھاری سرج کی گھیر دار شلوار سیاہ سانپ کے چمڑے کی چوڑی بیلٹ گہرے نیلے رنگ کی سنجیدہ سی خانہ بدوش قمیص، سیاہ چمکیلے کپڑے کا رومال اور شوخ سبز کاہی دھانی رنگوں کی

واسکٹ پہنے تھا۔ واسکٹ کے کپڑے پر پتوں سے بھری گھنی جھاڑی کا وہی ڈیزائن بنا تھا جو ناگی شا کے خیمے پر دہرایا گیا تھا۔

میں نے دل میں سوچا جھاڑی سے نکل کر آتے سانپوں کے بادشاہ کو ایسا ہی لباس پہننا چاہیے۔ لگتا تھا ایک قد آدم سانپ دو ٹانگوں پر چلتا جھاڑی سے برآمد ہو رہا ہے۔

ناگی شا مسکراتا ہوا نکلا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بادل بلوچ کا استقبال کیا۔ "آؤ میرے باشا آؤ بادل شا۔ سویرے سویرے کیسے نکل پڑے میرے باشا۔" دونوں میں بہت مراسم ہوں گے۔ ادھر بادل بڑھ کر ناگی شا سے بغل گیر ہوا۔

ناگی نے معانقہ کرتے ہوئے کہا اس کے شانے پر سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "خوش آمدید باشا۔ آپ کون ہو؟"

بادل بلوچ نے ابھی میرے تعارف میں کہنا ہی شروع کیا تھا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں کہ اچانک ناگی شا کی نظر رشنا پر پڑی اور اس کی ہنسی ایک دم رخصت ہو گئی۔ چہرہ ست گیا اور تکلیف یا سخت حیرت میں "ہہ!" کہہ کر وہ بلوچ کے کندھے سے چھک کر ایسے ہٹا جیسے بجلی کے زندہ تار سے بچنے کو ہٹا ہو۔

بادل اس کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ناگی شا نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بادل! بادل! یہ کون ہے؟ یہ مرد کے پیچھے کون کھڑا ہے؟"

بادل نے خفگی سے کہا۔ "ناگی! تجھے نہیں دکھتا کون ہے۔ ارے عورت ہے۔ میرے مہمان کی عورت۔"

"نہیں۔ نہیں۔ او باشا نہیں۔ بالکل نہیں۔ عورت نہیں سانپ۔ مرشد کی قسم سانپ ہے۔ ہرنے درخت کا بیلارا سانپ ____ کبھی ایسا نہیں دیکھا عورت کی جون میں بیلارا۔ اے میرے مرشد مولا۔ یہ کدھر سے آیا؟ بیلارا۔ او بابا کدھر سے آیا بیلارا۔"

اور اسی طرح چیختا بک بک کرتا دوڑ کر اپنے خیمے میں جا چھپا۔

"یاالٰہی۔" میں نے سوچا۔ "اب یہ کیا مصیبت آ گئی۔"

رشنا نے میری طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ یہ کوئی کر جاننے والا جانکار ہے۔ ہم غلط آ گئے۔ یہاں سے نکلنے کی کرو۔

بادل نے خیمے میں آواز دی۔ "ناگی شاہ۔ او ناگی! ادھر آ بھئی کیا تو پاگل ہو رہا ہے؟ صبح ہی صبح نشہ تو نہیں کیا تو نے؟"

اندر سے اس کی گھٹی ہوئی آواز آئی۔ "تو نہیں سمجھتا۔ مرشد کی قسم تجھے کچھ پتا ہی نہیں بادل شا۔"

بادل کو طرارہ آ گیا۔ "یہ تم کس نمونے کا آدمی ہے؟ تمہارے ٹینٹ کے سامنے مہمان آیا کھڑا ہے اور تم پاگل چریا آدمی جیسا بات کرتے ہو۔ یہ کیسا بے شرمی ہے؟"

ناگی شا کے ٹینٹ کے زنانہ کمپارٹمنٹ پر ڈالا ہوا پردہ ہلا۔ ہلکے اور سنہرے سبک رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے لمبے قد کی ایک لڑکی خوش مزاجی سے آنکھیں ملتی جماہیاں لیتی پردہ ہٹا کر باہر آئی۔

"ہاں بادل کیا ہوا؟"

بادل کی جھونجھل اسے دیکھ کر کم ہو گئی۔ بلکہ وہ ہلکے سے مسکرایا بھی بولا۔ "ناگی شا کو خبر نہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں مہمانوں کو تمہارے ٹینٹ پر لایا ہوں اور وہ مہمان عورت کو سانپ بولتا ہوا اندر چھپ گیا ہے۔"

اندر سے ناگی پکار کر کہنے لگا۔ "سانپ نہیں بولا۔ بے بی! بیلارا بولا ہے۔ دیکھ لے اگر تیری سمجھ میں آئے تو۔ عورت کے بھیس میں بیلارا ہے تو خود ہی دیکھ لے بے بی۔"

لڑکی نے مسکرا کر رشا کی طرف دیکھا۔ اسے آنکھ مار کر دھیرے سے بولی۔ "بابا کی بات کا برا مت ماننا بی! تم آجاؤ میرے ساتھ۔" پھر وہ چیخ کر باپ سے کہنے لگی۔ "بابا رے بیلارا ہوا بھی تو میرا تمہارا کیا بگاڑے گا۔ ہم کو مرشد کی دعا ہے۔ میں عورت کو لے جا رہی ہوں ساتھ۔ تم اس کے مرد کو دیکھو' کچھ کھلانے پلانے آرام دینے کا سوچو۔ ایسی بات بول کے مہمان کو ناراض تو نہ کرو۔"

ناگی شا بیٹی کے جانے کے بعد بھی ایک دو منٹ بعد تک اپنے ٹینٹ میں چھپا رہا پھر آیا تو بیٹی کے کمپارٹمنٹ کی طرف چوکنا ہو کر دیکھتا دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا آیا مگر اب وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ ہلکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ میرے پاس آ کھڑا ہوا اور اولاد پر فخر کرنے والے باپ کی طرح لیکن آواز دبا کر بولا۔ "دیکھا میری بے بی کو؟ کیسی دلیر' شیر کی بچی ہے؟ لے گئی اپنے ساتھ بیلارا کو۔"

بادل نے اس کے کندھے پر تھوڑی خوش مزاجی' تھوڑی جھونجھل سے ہاتھ مار کر کہا۔ "ناگی شا! اب یہ چریا جیسی بات ختم کرو۔ مہمان سے تمیز سے بات کرو۔ تم بچہ

نہیں ہے جو ابھی بھی کھیل تماشے کرتا ہے۔"

"ناگی شا نے بادل کے شرم دلانے' ڈانٹنے پر بڑھ کے مجھ سے معانقہ کیا مگر وہ مجھے گلے لگاتے ہوئے سوں سوں کر کے جیسے میرے بدن کو سونگھے جا رہا تھا۔ گلے مل کر الگ ہوا تو رازداری سے بولا۔ "تمہاری تو وہ عورت ہے باشا۔ تم تو سمجھو اس کو سونگھ چکھ کے بیٹھے ہو۔ مرشد کی قسم تمہیں بتاؤ تو بھلا کیا اس کے پاس سے جلتی ہوئی شکر کی بو نہیں آتی؟ قسم تمہیں مرشد کی بتاؤ؟ ارے بیلارا کی____"

بادل نے ہاتھ بڑھا کر اب ناگی شا کا گال تھپتھپا دیا اور روکھے پن سے کہا۔ "بس کرو ناگی۔ بس بہت ہو گیا۔"

بادل نے بات اتنی قطعیت سے کہی تھی کہ ناگی سن کر اور اس کے تیور کو دیکھ کر اب قابو میں آ گیا۔ وہ ہمیں اندر ٹینٹ میں لے گیا۔ بادل بلوچ نے اسے بتایا کہ ہم دونوں ناشتا کر کے آئے ہیں۔ رات کے جاگے ہوئے ہیں ناگی اگر ہمارے سونے کا بندوبست کر دے گا تو بہت اچھا ہو گا۔

ناگی شا کا خیمہ اندر سے ایسے سجا تھا جیسے شکار کے لیے نکلے ہوئے کسی چھوٹے موٹے نواب یا راجے کا خیمہ ہو۔ بہت سی قیمتی چیزیں بے ترتیبی سے رکھی تھیں۔ ایک جانب مہاگنی کی لکڑی سے بنا اسکرین تھا جس میں ہاتھی دانت کے ٹکڑوں سے پھول پتیاں اور جانوروں کی شبیہیں جڑی ہوئی تھیں۔ اسکرین کے پیچھے ہلکی مگر شان دار مسہری تھی جسے شکاری خیموں کے حساب سے قدرے تنگ بنایا گیا تھا۔ یہ شاید فولڈ بھی کی جا سکتی ہو گی۔ مسہری کے پاس پتائیاں اور فٹ اسٹول رکھے تھے ان کا مسہری سے یا خیمے کے دوسرے فرنیچر سے کوئی جوڑ نہیں بیٹھ رہا تھا مگر تھے سبھی قیمتی۔ خیمے کی ہر چیز کا یہی حال تھا۔

مجھے ناگی شا نے اونچی پشت کی ہتھوں والی کرسی پر جا بٹھایا۔ خود ایک آرام کرسی میں نیم دراز ہو گیا۔ بادل بلوچ مخمل کی گدیوں والے دیوان پر چوڑا ہو کر جا بیٹھا۔ بادل نے مختصراً بتا دیا کہ ہم سرکس گراؤنڈ تک کس طرح آئے ہیں۔

ناگی شا نے مجھے جس کرسی پر بٹھایا تھا اس کے ہتھوں کو اس طرح بنایا گیا تھا جیسے کالا چیتا شکار پر گھات لگائے بس جست کرنے ہی والا ہو۔ میں نے ہتھوں پر ہاتھ پھیر کر کاری گری کی تعریف کی تو ناگی شا بولا۔ "یہ کرسی حضور مہاراجا بریٹھا پور نے اس خادم کو گفٹ کی تھی۔"

میں نے ایسی شکل بنالی جیسے مجھ پر بڑا رعب پڑ رہا ہو۔ یہ دیکھ کر ناگی شا شروع ہو گیا اور ٹینٹ میں سجی ایک ایک چیز کی تاریخ بتانے لگا کہ یہ پارچہ قالین اس وقت ہاتھ آیا تھا جب رایان صاحب فلاں نگر نے میرے ایک تماشے پر خوش ہو کر کہا تھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے اور میں نے رایان صاحب کے نیچے بچھے اس قالین پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ شیشہ اسٹینڈ بیگم صاحبہ ڈولا گنج کی عطا ہے۔ نہاتی ہوئی عورت کی یہ پینٹنگ ایک انگریز میجر صاحب نے گفٹ کی تھی۔ یہ گل دان فلاں نے دیا تھا۔ غرض ناگی شا کے ٹینٹ کی ہر چیز کسی نہ کسی قدر دان کا تحفہ تھی اور ناگی شا کے قدر دانوں میں جاگیرداروں' رجواڑوں اور حاکموں سے لے کے ڈیرے دار طوائفیں اور علاقے کے پولیس افسر تک شامل تھے۔ ہر ایک نے اپنے مزاج یا ناگی شا کی پسند کے مطابق تحفہ دیا تھا۔ صاف معلوم ہو گیا تھا کہ ناگی شا کی پسند ناپسند کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

اب جب کہ کچھ دیر میں نے وہاں گزاری تھی مجھے وہ خیمہ شکار پر نکلے ہوئے راجے نواب کا نہیں کسی بڑھیا قسم کے کباڑیے کا سٹور لگتا تھا۔

پانچ دس منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور اپنے ٹینٹ کی ہسٹری بتانے کے بعد ناگی شا مجھے مہاگنی کے اسٹینڈ کے عقب میں بچھی رجواڑا ٹائپ مسہری کے پاس لے گیا اور اس کی تاریخ بتانے کے بعد بولا۔ "او باشا۔ آرام کرو۔ پان سات گھنٹے کے لیے یہ مسہری میں نے آپ کو گفٹ کی ہے۔ اگر جلدی اٹھ جاؤ تو میرے ساتھ لنچ بھی کر لینا نہیں تو آپ اور آپ کی بیلار____ بیگم الگ اپنا کھانا چائے کر لینا ہم دونوں باپ بیٹی آج شام میں تماشے کی ریہرسل کریں گے۔"

ناگی شا اور بادل بلوچ مجھے خیمے کے اس حصے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت میں نے ہلکی آواز میں ٹیپ ریکارڈرز بجائے جانے کی اور لڑکیوں کے ہلکے ہلکے ہنسنے' باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ رشنا اور ناگی شا کی بیٹی میں لگتا تھا خوب دوستی ہو گئی ہے۔

ایک بار رشنا اونچی آواز میں ہنسی اور ساتھ ہی ٹیپ کی آواز بڑھ گئی۔ پرانا گیت گایا جا رہا تھا۔ "سر وتا کہاں بھولیائے پیارے ننادوئیا" رشنا نے ہنس کر پوچھا۔ "سر وتا کیا ہوتا ہے؟" پھر وہ اور ناگی کی بیٹی ہنسنے لگیں۔

نہ معلوم کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ جرمن سفارت خانے کے رہائشی علاقے سے جس ہیجان اور پریشانی میں فرار ہوا تھا کچھ اس کی تھکن کچھ رات بھر کی جگار میں جو میں سویا تو شام کر دی۔ آنکھ کھلی تو خیمے کے کھلے پردے سے جاتی سرخ نارنجی اور سنہری

دھوپ خیمے میں جھانک رہی تھی۔ پہلے چند لمحوں میں تو خبر نہ ہوئی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ میں سرکس کے کس خیمے میں کیوں ہوں۔ پھر مسہری کے قریب کرسی پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔ رشنا ایک دم تر و تازہ اور مسکراتی ہوئی بیٹھی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

رشنا۔ دیوانی لڑکی۔ میں نے یاد کیا۔ یہ اس لڑکی مورنی کی ہونے والی بھابی ہے مورنی جو سخت زخمی ہونے کے بعد مانگ یان کالج میں محصور ہو گئی تھی اور پھر مغربی ملکوں کی مداخلت کے نتیجے میں محاصرہ ہٹا لیا گیا تھا۔ ایمبولینس اس مورنی اور بابا کی پوتی کوسوی کے ساتھ میرے ہم وطن ساتھی میر باز خان کو لے کر عافیت سے نکل گئی تھی۔ اگر یہ دیوانی رشنا نہ ہوتی تو مداری بابا کے دشمن اس قبائلی جسگمے کے بدمعاش بیٹے رامل نے مجھے ختم ہی کر دیا ہوتا۔ یہ وہی رامل تھا جسے ہمارے کاکسیز بازار کے پچھواڑے ہونے والے واقعے میں بابا نے ریچھ کے قالب میں آ کر زخمی کر دیا تھا۔ اب تک تو یہ رامل مجھے بے ہوشی کی حالت میں ختم کرنے کے بعد بورے میں بند کر کے پانی میں پھینک بھی چکا ہوتا۔ رشنا نے بہت ہشیاری سے کام لیا تھا۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔

میں نے رشنا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھا دیں اور بڑی اپنائیت سے ایک لفظ کہا۔ "سردار۔"

"پاگل ہے تو تو____ اور وہ مورنی بھی باؤلی ہے____ میں بھلا کس بات کا سردار ہوں؟"

میں نے چھیڑنے کو کہہ دیا۔ "وہ ہے نا جسگمے سرپنچ کا بیٹا رامل سردار۔"

رشنا نے مجھے گھور کے دیکھا اور نیولے کی طرح خی خی کی آواز نکال کر بولی۔

"رامل کی بھین کا یہ کا وہ کا فش ٹولا! وہ کدھر سے آیا سردار۔"

ہم دونوں کچھ دیر ہلکے پھلکے موڈ میں اسی طرح باتیں کرتے رہے پھر بھوک لگی تو کھانے کی تلاش میں سانپوں کے بادشاہ کے ٹینٹ سے نکلے۔ سانپوں والے کے ٹینٹ کے باہر لکڑی کے موٹے کندے پر بیٹھی گیارہ بارہ برس کی ایک لڑکی ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رشنا نے بتایا یہ ناگی شا کی بیٹی روکسانا کی شاگرد لڑکی ہے۔ روکسانا کہہ گئی ہے یہی ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کر دے گی۔ روکسانا کی شاگرد شاید ہماری زبان نہیں جانتی تھی۔ وہ اشارے سے ہمیں پیچھے آنے کو کہتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔

روکسانا کی شاگرد ہمیں اپنے ماں باپ کے ٹینٹ میں لے گئی۔ یہ بہت غریب سا

ٹینٹ تھا مگر میز پر اچھا خاصا کھانے پینے کا سامان سجا ہوا تھا۔ وہاں شاگرد لڑکی کے ماں باپ میں سے اس وقت کوئی نہیں تھا۔ لڑکی نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خیمے سے نکل گئی۔ اس کے دوڑنے کی آواز سن کر ہم صبر اور سکون سے بیٹھ گئے۔ ہم سمجھے تھے وہ شاید اپنے ماں باپ کو بلانے گئی ہے مگر پانچ سات منٹ بعد وہ جو واپس آئی تو چینیوں جیسی شکل کا ایک کک اس کے ساتھ تھا۔ کک تام چینی کی کیتلی اور دو فنجان اٹھائے آیا تھا۔ اس نے چائے کے برتن میز پر سجا دیے اور ہمیں اشارے سے کھانا شروع کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ لڑکی کچھ دور پیچھے اسٹول پر جا بیٹھی اور ہمیں کھاتے دیکھتی رہی۔ وہ کچھ دیر بعد آتی اور جائزہ لے کر چلی جاتی کہ کہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

بھوکے تھے اور بہت دیر بعد کھا رہے تھے ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

کھا پی کر شاگرد لڑکی کے خیمے سے نکلے اور ہم سرکس گراؤنڈ کا جائزہ لینے کو ایک طرف چل پڑے۔ لڑکی برتن سنبھالنے میں لگی تھی۔ ہمیں اس طرح جاتے دیکھا تو دوڑ کر آئی اور راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ ناگی شا اور بادل بلوچی دونوں تاکید کر گئے ہیں کہ ہم لوگ سرکس گراؤنڈ میں کہیں ادھر ادھر نہ نکلیں۔ کھانے پینے کے بعد سیدھے ناگی شا کے خیمے میں جائیں۔ رشنا اس لڑکی کے اشارے مجھ سے زیادہ سمجھ رہی تھی۔ جب اس نے یہ بتایا کہ ہر حال میں ہمیں ناگی کے ٹینٹ میں واپس چلنا ہے تو پھر میں نے حجت نہ کی۔

اندھیرا ہونے تک ہم دونوں ناگی شا کے شان دار بے جوڑ فرنیچر میں گھرے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ رشنا میرے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں اس کی شادی اور مورنی کے بھائی یعنی رشنا کے ہونے والے شوہر کے بارے میں پوچھتا رہا۔ رشنا بتانے لگی کہ وہ بس ٹھیک ٹھاک ہی آدمی ہے۔ دل کا کھرا ہے مگر اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ کسی اور کی پروا نہیں ہوتی اسے۔ وہ بولی۔ ”سردار! تجھ ایسی کوئی بات نہیں اس میں۔ بس ایسا ہے کہ شادی کر کے مجھے دو تین بچے دے دے گا۔ روٹی کپڑے کا کرتا رہے گا ساری زندگی۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ بتا اور کیا چاہیے ہوتا ہے زندگی میں۔ کھرا آدمی ہے۔ خیال رکھے گا۔ بچے پیدا کرا دے گا اور کیا چاہیے تجھے؟“

کہنے لگی۔ ”وہ ماشوک تو نہیں نا بن سکتا میرا۔ جیسا تو ہے۔“

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ”رشنا! تو سرکس والوں کی طرح

بات نہ کر۔ یہ تو مجھے سب ہی کھسکے ہوئے پاگل لگتے ہیں۔ ارے لڑکی! زندہ رہنے کے لیے سرکس کا دھوم دھڑکا نہیں چاہیے۔ بس گزارے والا کام ہو جائے تو عمر بسر ہو جاتی ہے۔“

پھر رشنا نے عجیب بات کہی۔ وہ میری طرف سرک آئی۔ بالکل جڑ کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”ایک بات تو خوب سوچ کر مجھے بتانا۔ ابھی نہیں چاہے میری شادی کے بعد جواب دے دینا مگر جواب دینا ضرور۔“

میں نے پوچھا۔ ”ہاں۔ بول کیا بات ہے؟“

کہنے لگی۔ ”ایک لڑکا مجھے تیرا چاہیے۔ سمجھا تجھ سے چاہیے۔ دے گا؟“

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا خیمے میں قیمتی بے ڈھب چیزوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ”یہ کیا بکتی ہے؟ رشنا تو فضول باتیں مت کیا کر۔“

وہ سنجیدہ تھی کہنے لگی۔ ”چوری چھپے کا نہیں لوں گی۔ اپنے آدمی کو راضی کر کے اس سے پوچھ کے لوں گی۔“

”ماری جائے گی تو۔ اپنے آدمی سے ایسی بات کہنا بھی مت۔ وہ گردن کاٹ دے گا تیری۔“

رشنا ہنسی۔ ”کوئی نہیں کاٹتا گردن وردن۔ بس معمولی ناراض ہوئے گا۔ ایک دو روز بات نہیں کرے گا مجھ سے۔ میں منالوں گی تو وہ ہاں بول دے گا۔ بتایا نا دل کا کھرا ہے وہ۔“

مجھے اس کی یہ بات اور بھی عجیب لگی۔ ”اچھا؟ وہ دل کا کھرا ہے تو اس کے ساتھ یہ کرے گی؟“

”اس کے ساتھ کچھ نہیں کروں گی۔ یہ تو میرا اپنا شوق ہے۔ ہمارے لوگ ان باتوں پہ ایسا شور شرابا نہیں کرتے۔“

مجھے یاد آیا۔ پہلے بھی میں ایسی بات ان کے قبیلے کے بارے میں سن چکا تھا پھر بھی مجھے اس میں اپنی توہین ہوتی نظر آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”سن! اس بات کو پھر کبھی نہ دہرانا۔ اب تو تو نے کہی ہے۔ آگے بالکل مت کہنا ____ میں جنگلوں میں نہیں پروان چڑھا ہوں۔ میرا اک کنبہ ایک قبیلہ ہے۔ میری اولاد ہو گی تو وہ اس کنبے قبیلے کا حصہ ہو گی۔ ہم لوگ اپنے کنبے کو اس طرح بانٹتے پھینکتے نہیں پھرتے۔“

مجھے اپنے بابا یاد آئے جو اس وقت اپنی اس اولاد کو مجھے مشرقی پاکستان میں اور

شاید برما میں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ میرا چہرہ دیکھ کر اس بے وقوف لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور جھک کے میرا رخسار چوم لیا۔

اسی وقت خیمے کی ہلکی روشنی ایک دم تیز ہو گئی۔ کوئی طاقت ور ٹارچ لیے ناگی شا کے خیمے میں داخل ہوا تھا۔

یہ روکسانا تھی۔ ناگی شا کی بیٹی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا دوڑتی ہوئی آئی ہے۔ رشنا کو اور مجھے ایسی بے تکلفی سے بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر بولی۔ "معاف کرنا' ایک دم گھسی چلی آئی۔ اجازت نہیں لی مگر بہت کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تم دونوں کو پوچھتے ہوئے کوئی لوگ آئے ہیں۔ وردی تو نہیں پہنے مگر وہ کہہ رہے ہیں ہم سرکاری لوگ ہیں۔ پولیس جاسوس ہیں۔"

رشنا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بولی۔ "بکواس کر رہے ہیں۔ وہ سرکاری نہیں ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے آدمی ہیں۔"

"اس لیے تو۔" روکسانا بولی۔ "اس لیے بادل نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ کہتا ہے ہمارا یہ ٹینٹ سب سے حفاظت والی جگہ ہے۔ میں روشنی بند کر کے ٹینٹ کے پردے گرا کے چلی جاتی ہوں۔ آپ دونوں خاموش بیٹھے رہنا۔ ہم کوئی بندوبست کر رہے ہیں۔ پریشان مت ہونا۔"

روکسانا نے ٹینٹ کی روشنی بجھا دی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے ہاتھوں پیروں سے ٹٹولتے ہوئے خیمے کا ایک چکر لگایا۔ یہاں اتنا زیادہ سامان تھا کہ دشمن گھس آیا تو میں لڑکی اور اپنا دفاع نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے کھلی جگہ چاہیے۔ یہ تنگ جگہ اور کاٹھ کباڑ ان آنے والوں کو نہیں روک سکے گا۔ وہ تو آتے ہی روشنی کریں گے اور چیزوں سے ٹکرائے بغیر سیدھے ہمیں آدبوچیں گے۔ یا ہو سکتا ہے گولی مار دیں۔

رشنا نے مجھے خیمے کا جائزہ لیتے محسوس کر لیا۔ وہ بے آواز چلتی ہوئی میرے پاس پہنچی اور میرے کان سے منہ لگا کے کہنے لگی۔ "جگہ ٹھیک نہیں ہے شیر! کھلے میں ہم زیادہ اچھے رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں ـــــ پہلے میں باہر جا کے یہ دیکھتا ہوں کہ نکلنے کا راستہ کون سا ٹھیک رہے گا۔"

وہ بولی۔ "یہ کام تو بیلارا زیادہ اچھی طرح کرے گی۔ میں سانپ کی کایا میں نکلتی

ہوں اور دیکھ بھال کے آجاتی ہوں۔"

اس نے سانپ کی جگہ بیلارا کہا تھا جو نام ناگی شا نے استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ سانپ کی جون میں آ کے وہ بے شک دشمنوں کی نظروں سے بچی رہے گی لیکن سرکس کے شو کا وقت ہو چلا ہے۔ ادھر خیموں میں' پنجروں کے آس پاس چہل پہل شروع ہے۔ وہ کسی کے پیروں میں نہ آ جائے۔ سرکس کے جانور لائے لے جائے جا رہے ہیں۔" جانوروں کی جھپٹ میں آ کے وہ زخمی نہ ہو جائے۔ مجھے مورنی بے چاری کے ساتھ ہونے والی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

رشنا کہنے لگی۔ "اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو سمجھے گا ناگی شا کا کوئی سانپ نکل بھاگا ہے۔ کوئی شور ہو گا جانوروں کے کھروں و ٹاپوں سے اور لائی لے جاتی پنجرہ گاڑیوں سے میں ہشیار رہوں گی۔ مگر شیر! یہ سمجھ لو تم اگر نکلے تو دیکھ لیے جاؤ گے۔"

وہ میرے برابر کھڑے سے بیٹھ گئی اور میں سمجھ گیا کہ وہ اب انسان سے سانپ بن چکی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

آدمی اکیلا ہو تو دل میں ہزار طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ مجھے اپنا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں تو ٹینٹ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی رشنا اگر انسان کی کایا میں تھی اور اگر دوسرے جاندار کی کایا میں تھی تو دونوں ہی صورتوں میں وہ خطرے میں تھی۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ اس کا کہا ایک دم ہی کیوں مان لیا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا لڑکیوں کو مردوں کے کام پر نکل جانے دیا۔ یہ اچھا نہیں کیا میں نے۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اب مجھے خیمے کی پناہ میں بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر کس صورت سے باہر جاؤں۔ اجنبی آدمی کو تو وہ تلاش کر رہے ہیں میں اگر شیر کا قالب اختیار کرتا ہوں تو دیکھنے والوں کو کوئی خاص حیرت بھی نہیں ہو گی۔ ہم سرکس میں ہیں شیر یہاں برابر چلے گا۔

میں نے اور وقت ضائع نہ کیا ناگی شا کے قالین پر خود کو شیر علی بنگش سے شیر نر بنایا اور ٹینٹ سے باہر نکل آیا۔

دور سرکس کا بینڈ بج رہا تھا اور تماشے والے بڑے ٹینٹ کی روشنیوں سے سرکس گراؤنڈ کا یہ رخ ایک دم اجلا ہو رہا تھا۔ میں نے ناگی شا کے ٹینٹ سے نکل کے دیکھا۔ اس کی سانپوں والی پنجرا گاڑی یہاں سے ہٹا دی گئی تھی۔ دونوں باپ بیٹی ریہرسل کے بعد اب شو کی اصل تیاری میں ہوں گے اسی لیے سانپوں کا پنجرا۔ کھیل دکھانے

والے اصل خیمے کے پاس لے جایا گیا ہے۔

میں ابھی جانے کے لیے کوئی مناسب سمت سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سامنے سے شو کے زرق برق کپڑے پہنے شتر مرغ کے پروں سے سجا انوکھا سا ہیٹ لگائے روکسانا اپنے خیمے کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس کی بیلٹ میں چھوٹا ٹیپ ریکارڈر لگا تھا۔ اونچی آواز میں وہی پرانا گانا بج رہا تھا۔ "سرو تا کہاں بھولیائے۔" میں نے خود کو ایک چھولداری کی اوٹ میں کر لیا۔ روکسانا تیزی سے بڑھی آ رہی تھی۔ وہ یقیناً ہمیں کوئی اہم خبر سنانے آ رہی ہو گی۔ میں نے سوچا خود کو انسان بنالوں۔ واپس خیمے میں چلا جاؤں ورنہ ہم دونوں کو وہاں نہ پا کر روکسانا الجھن میں پڑ جائے گی۔ پھر وہ بات جاننا بھی ضروری تھی جو روکسانا سنانے آ رہی ہو گی۔ ابھی میں اچھی طرح اوٹ میں ہو کر خود کو دوبارہ شیر علی بنگش ہونے کا حکم دے بھی نہیں پایا تھا کہ روکسانا ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ فرش زمین کو بہت محویت سے تکے جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی پشت کی طرف ہاتھ لے جا کر کمر سے ایک دوشاخہ چھڑی نکالی جس میں سرخ نیلے پیلے نگ جڑے ہوئے تھے۔ یہ سپیروں کی دو شاخہ چھڑی تھی مگر کیونکہ سرکس کے شو میں ناگوں کو پکڑنے اٹھانے میں استعمال کی جاتی تھی اس لیے خوب جھلملاتی سجائی ہوئی بنائی گئی تھی۔ روکسانا نے بہت احتیاط اور مہارت سے اپنی وہ جگمگاتی چھڑی چلائی اور کہیں زمین پر سے سبز رنگ کے ایک چھوٹے سانپ کو اس کا پھن قابو کر کے اٹھا لیا۔

اوہ خدا! یہ تو رشنا تھی۔ سبز سانپ کی کایا میں وہ لڑکی رشنا تھی جسے ناگی شا کی بیٹی روکسانا نے اپنی چھڑی سے پکڑ کر قابو کر لیا تھا۔

کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ کیا میں شیر علی بن کر روکسانا کے سامنے چلا جاؤں۔ اسے آمادہ کروں کہ وہ سبز بیلارا سانپ کو جسے ابھی اس نے پکڑا ہے چھوڑ دے؟ مگر وہ پوچھے گی کیوں؟ میں کیا جواب دوں گا؟ یہ بات تو کسی کو بتائی نہیں جا سکتی تھی کہ رشنا نے سانپ کا جسم اختیار کیا ہوا ہے۔ اگر کایا بدلنے کا راز اسی طرح ایک دو آدمیوں کو اور معلوم ہو گیا تو پھر سورج ڈوبتے ہی رشنا بے چاری کی موت یقینی ہے۔ کیا خبر کس پل یہ راز چھے کے بعد ساتویں آدمی کو معلوم ہو جائے، پھر ساتویں کو معلوم ہوتے ہی کسی طلسم سی ساحرانہ انتظام سے کایا بدلنے والا انسان سورج ڈوبتے ہی پیلا پڑ جائے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گا۔

میں اگر شیر بنا ہی بنا روکسانا کے سامنے آ جاؤں تو کیسا رہے؟ وہ اچانک اپنے

سامنے پنجرے کے بغیر کھلا شیر دیکھے گی تو شاید گھبرا کے ہاتھ سے لپٹے ہوئے سبز بیلارا سانپ کو رشنا کو۔ چھوڑ دے گی۔

میں نے کھلے میں نکلنے سے پہلے اپنی آواز سنانی چاہی اور بنگالی شیر کی بیزار سی اوووہنہ کی آواز نکالی۔ روکسانا پر اس آواز کا کوئی اثر ہوا یا نہیں یہ مجھے نہ معلوم ہو سکا کیونکہ رائل بنگال ٹائیگر کی میری ایک اوووہنہ کے ساتھ ہی بہت کچھ ہو گیا۔ سات فٹ اونچے سامان کے کریٹ کے پیچھے چھپے کالی جرسیوں پتلونوں والے دو آدمیوں نے جھپٹ کر روکسانا کو جا لیا۔ ایک نے پیچھے سے خوف زدہ لڑکی کی گردن میں اپنی بانہہ ڈال کر اسے کھینچ کھینچ کر ہٹانا شروع کیا تو دوسرے نے اس کے سینے پر لمبی نال والا ریوالور رکھ دیا اور ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ وہ اسے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی وہ ریوالور کی نال سامنے دکھائی دیتے شیر کی طرف یعنی میری طرف کر لیتا تھا۔ غنیمت تھا کہ ابھی تک اس نے فائر نہیں کیا تھا۔

ادھر روکسانا یہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک سامنے نکل کر آنے اور اوووہنہ کہہ کر سب کو دہلا دینے والا یہ کون سا شیر ہے۔ زندگی بھر سرکس سے متعلق رہی تھی۔ یہ لڑکی یہاں کے ایک ایک کٹیلے کو پہچانتی ہو گی۔

مگر حملہ آوروں نے روکسانا کو نہ مجھے کوئی وقت دیا تھا۔

وہ دونوں اسے لیے ہوئے لمبے کریٹ کے پیچھے چلے گئے پھر اگلے ہی لمحے کریٹ کے پیچھے گاڑی کا انجن بیدار ہوا اور اس سے پہلے کہ میں جھپٹ کر وہاں پہنچ سکتا۔ ایک تیز رفتار اسٹیشن ویگن روشنیاں جلائے جیسے اچھل کر اس کریٹ کے عقب سے نکلی اور خیموں، چھولداریوں کی طنابیں گراتی، کھمبے توڑتی ہوئی غراتی، فائر کرتی نکل گئی۔

فائروں کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ لڑکی کو اغوا کرنے والے شاید ڈرانے کو گولیاں چلا رہے تھے۔

لڑکی کو نہیں لڑکیوں کو اغوا کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا روکسانا کے پنجے میں ہرے بیلارا سانپ کا۔ رشنا کا۔ پھن تھا اور بیلارا سانپ روکسانا کے بازو سے لپٹا ہوا تھا۔

اپنی دوست رشنا کو اور روکسانا کو بھی بچانا ضروری تھا۔ میں دھاڑتا ہوا اسٹیشن ویگن کے پیچھے چلا۔

فائروں نے اور شیر کی دھاڑ نے نہ صرف سرکس والوں کو ادھر متوجہ کر دیا تھا بلکہ کھیل کا ٹکٹ خریدنے کو لائن میں لگے ہوئے لوگ بھی لائن توڑ کر نکل آئے تھے اور

غراتی ہوئی تیز رفتار گاڑی کو اور اس کے پیچھے دھاڑتے اور جست و خیز کرتے شیر کو دیکھ کر شور مچانے لگے تھے۔

کسی نے چیخ کر کہا۔ "شیر نکل گیا رے بھاگو۔"

اور پھر جو بھگدڑ مچی ہے تو جس کا جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ عورتوں' بچوں نے چیخنا رونا اور گھگیانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فرار ہوتی گاڑی کو بڑے شامیانے کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا۔ دور سے چاندنی میں ہائی وے چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔

اغوا کرنے والے اگر ہائی وے تک پہنچ گئے تو پھر میرے لیے انہیں پکڑنا ممکن نہیں ہو گا۔

میں نے دیکھا وہ ہائی وے کی طرف ہی نکل رہے تھے۔ ایک آخری کوشش میں' میں نے جست ماری تو اغوا کرنے والوں کی گاڑی کے قریب تھا۔ میں اس سے بہ مشکل چار فٹ دور رہ گیا تھا۔ میں نے روکسانا کے خوف زدہ چہرے پر امید اور جوش کی کیفیات بھی دیکھیں۔ وہ نہ معلوم کیا سمجھ رہی تھی۔ اغوا کرنے والوں میں وہ بد معاش جو گولیاں چلاتا رہا تھا۔ اب شیر کو___ مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر اڑتی سنسناتی گاڑی میں بیٹھ کر دیوانہ وار جست و خیز کرتے کٹیلے کو نشانہ بنانا آسان نہیں تھا۔ اس نے ایک فائر بھی کیا جو ظاہر ہے مس ہوا مگر اس کے فائر سے بچنے کو میں نے کچھ کیا جو ظاہر تھا جس سے میری رفتار بگڑ گئی تھی اور میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔

وہ نکل جائیں گے۔ میں نے غصے میں ایک دھاڑ ماری۔ وہ بد معاش لڑکیوں کے ساتھ نکل جائیں گے مگر اس نا امیدی اور طیش میں بھی میں نے قریب ہی پارکنگ ایریا میں سبز رنگ کی ایک جیپ دیکھی جس پر خوف کے عالم میں ایک ڈرائیور بیٹھا الٹے سیدھے ہاتھ چلا رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کو بیک کر کے تار کھنچی پارکنگ کی جگہ سے نکالنا چاہتا تھا اور شیر کی دھاڑ سنتے ہوئے اور مجھے' شیر کو' اتنے قریب دیکھتے پا کر لحہ بہ لحہ سخت دہشت زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور بار بار الٹے سیدھے گیئر لگا رہا تھا۔ اتنی سی دیر میں دو مرتبہ اس کی جیپ بند ہو چکی تھی۔

میں نے یہ نئی جیپ گاڑی دیکھی اور اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان فراریوں کو پکڑنے میں جیپ اچھی رہے گی۔

مگر پہلا کام پہلے خوف زدہ ڈرائیور کو جیپ سے اتارنا ضروری تھا۔

میں نے اغوا کرنے والوں کی گاڑی کا پیچھا چھوڑا اور فوراً ہی خوف زدہ ڈرائیور کی

طرف مڑ گیا۔ ڈرائیور نے مجھے آتے دیکھا اور انجن چلتا ہوا چھوڑ کر ہو ہو ہو کرتا جیپ سے اتر کے بھاگا پھر ٹھوکر کھا کر گرا۔ میں بنکارتا دھاڑتا غرض کئی قسم کی خون خشک کرنے والی آوازیں نکالتا پیچھے دوڑا اور ایک دم اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ ڈرائیور کی آواز بند ہو چکی تھی۔

وہ ساکت و صامت پڑا تھا۔ بے چارہ اب تو کانپ بھی نہیں رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور بہت دور تک کوئی مجھے دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ جتنے نظر آ رہے تھے پیٹھ دکھاتے بھاگے جا رہے تھے۔ یہی موقع تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے خود کو شیر سے انسان کی جون میں آنے کا حکم دیا۔ اب میں شیر علی بنگش تھا۔

انجن چلتی جیپ پر سوار ہونا اور اسے بھگاتے ہوئے ہائی وے پر لے آنا اب کیا مشکل تھا۔ گاڑی ٹاپ کنڈیشن میں تھی۔ میں نے دیکھا پٹرول ٹینک تقریباً فل تھا۔

یہ بد معاش اگر بھاگ کر واپس رنگون شہر بھی جانا چاہیں گے تو میں ان کا پیچھا کروں گا مگر ان کی فرار ہوتی اسٹیشن ویگن کی سرخ روشنیاں بہت دور دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے گاڑی دوڑاتے ہوئے دیکھا تھا کہ بے ہوش ڈرائیور اسی طرح زمین پر پڑا ہے لیکن یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی وقت چھولداری کھنچے احاطے سے ایک اور سبز رنگ کی جیپ نکل کر آئی تھی۔ اس نے شاید میری والی جیپ دیکھ لی تھی۔ اس نے متوجہ کرنے کو زور سے ہارن دیا تھا اور جب میں نے اس کے ہارن پر توجہ نہیں دی تھی تو اس نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔

یعنی اب صورت حال یہ تھی کہ اغوا کرنے والے بد معاشوں کے تعاقب میں میں تھا اور میرے تعاقب میں ہرے رنگ کی ایک اور جیپ تھی۔

یہاں کا نقشہ کس نے دیکھا تھا۔ اگر دیکھا بھی ہوتا تو بات شروع ہو چکی تھی۔ میرے لیے رات میں سمتوں کو سمجھنا دوسروں سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ بس آگے بھاگتی اسٹیشن ویگن کی سرخ بتیاں میرا ہدف تھیں۔ وہ جیپ جو میں نے دہشت زدہ ڈرائیور سے حاصل کی تھی بے شک اچھی حالت میں تھی مگر فراریوں کی بھاری گاڑی میں زبردست رننگ پاور ہو گی وہ لوگ اطمینان سے دوڑتے جا رہے تھے اور میرا ان کا درمیانی

فاصلہ برابر بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنی حاصل کی ہوئی جیپ سے اس دوسری گاڑی کو دیکھا۔ وہ لوگ بھی ضدی پن کے ساتھ میرے پیچھے لگے آرہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کا آدمی، وہی دہشت زدہ ڈرائیور پیچھے رہ گیا ہے اور آگے والی جیپ کو جو چلا رہا ہے اس نے جیپ چرائی ہے۔ ایک بار مجھے خیال ہوا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والی ہری جڑواں جیپ کی طرف سے مجھے ڈرانے کو فائر ہوا ہے۔ وہ مجھے روکنا چاہتے تھے اور میرے لیے آگے والوں تک جا پہنچنا ضروری تھا۔

ہم ہائی وے پر چھ سات میل نکل آئے تھے کہ اچانک دو عجیب باتیں ہو گئیں فرار ہوتی اسٹیشن ویگن کی پچھلی سرخ بتیاں مجھے نظر آنا بند ہو گئیں۔ حالانکہ سڑک پہلے سیدھی چلی آرہی تھی اور آگے بھی سیدھی تھی۔

جتنی دور تک انگریزی محاورے کے مطابق اس جنگلی بط کے تعاقب میں جا سکتا تھا میں گیا پھر اس تعاقب کو بے سود سمجھ کر میں نے ختم کر دینا چاہا مگر اب صورت حال یہ تھی کہ میں جس کا پیچھا کر رہا تھا وہ غائب ہو چکا تھا اب صرف میرا تعاقب ہو رہا تھا میری جیسی ہرے رنگ کی جیپ میں آنے والوں نے دو فائر کیے تھے اور یہ دونوں ڈرانے کو نہیں کیے گئے تھے۔ وہ مجھے زخمی یا ہلاک کر دینا چاہتے تھے یا پھر وہ جیپ کا کوئی ایک ٹائر اڑا دینا چاہتے ہوں گے۔

اب جبکہ اسٹیشن ویگن والوں کی بجائے میں اکیلا فراری رہ گیا تھا تو مجھے اپنی فکر ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہائی وے کے دونوں طرف جنگل گھنا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اعلا درجے کی برمائیک کا جنگل تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لیے باضابطہ سڑکیں ہائی وے سے اندر جاتی نظر آرہی تھیں۔ بعض جگہ ان سڑکوں کو روشن رکھنے کے لیے کھمبوں پر ٹیوب لائٹس لگا دی گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اندر جاتی سڑکوں میں ایک طرح ترتیب رکھی گئی ہے۔ میں نے تاروں کی مدھم روشنی میں اور کہیں کہیں سڑکوں کے شروع میں نصب بجلی کے ان کھمبوں سے حساب لگا کر اپنا راستہ طے کر لیا اور ایک بار جب ہائی وے دائیں ہاتھ کو گھومی تو میں نے جیپ کی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ رفتار مجھے قدرے ہلکی کرنی پڑی تھی مگر میں پیچھے آتے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر راستہ طے کرنے لگا تھا۔ ایک اور ہلکے موڑ پر جب مجھے بجلی کے کھمبے کے پاس سے ایک سڑک اندر جنگل میں گھستی دکھائی دی تو بسم اللہ پڑھی اور میں نے جنگل میں گھسی سڑک پر جیپ

ڈال دی۔

ہلکے اجالے میں میل دو میلے گاڑی کی روشنیاں جلائے بغیر بھاگتے جانے کے بعد جب اطمینان ہو گیا کہ میرا پیچھا نہیں کیا جا رہا تھا تو میں نے نہ صرف روشنیاں جلا لیں بلکہ اپنی رفتار بھی بڑھا دی۔

اب یہ جنگلی سڑک نہیں رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ چوڑی ہوتی جا رہی تھی اور دائیں بائیں بوگن ویلیا کی سدا بہار قسم کی پھولوں بھری جھاڑیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے خوف کے ساتھ سوچا سڑک مجھے کسی ٹمبر اسٹیٹ کے رہائشی علاقے میں لیے جا رہی تھی۔ ہو سکتا ہے جانے آنے کا ایک یہی راستہ ہو ایسا نہ ہو میں پھنس جاؤں۔

دس منٹ بعد میری جیپ کی روشنیاں ایک سفید کولونیل عمارت کو روشن کر رہی تھیں۔ سرخ بجری، سرو بلند و بالا پام اور چھالیہ کے بے شمار درخت۔ یہ باغ وغیرہ سب ایک شان دار ولا کا پھیلاوا تھا اور ولا کو میں ایک ہی جھلک میں دیکھ کر مرعوب ہو چکا تھا۔

میں نے گاڑی کی روشنیاں اس ایک جھلک کے بعد بجھا دی تھیں مگر جو کچھ دیکھا وہ اتنا خوب صورت تھا کہ میرا جی چاہا اسے پھر دیکھا جائے۔ احتیاط و حتیاط کو بہ قول کسے بالائے طاق رکھ کر میں نے پھر ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔

ولا کے دامن میں پھیلے ہوئے اس حسین باغ میں سفید مرمر کا ایک مغلئی طرز کا حوض دکھائی دیا۔ اس خنکی میں بھی فوارہ چل رہا تھا اور غضب خدا کا۔ میری طرف پشت کیے کمر تک آتے اور اپنے چمکیلے بال چھٹکائے ایک خوب تنومند تگڑی سی عورت صرف چڈی پہنے حوض کے فوارے کی پھوار میں کھڑی تھی۔ لاحول ولا قوۃ۔

یہ میں کہاں آگھسا ہوں؟ کوئی بہت ہی غیر محتاط لوگ ہیں۔ عورتیں اس طرح صرف ایک زیر جامے میں کھلے میں کھڑے ہو کر تو نہیں نہاتیں۔ یہ بہت غلط ہے۔ بھئی اگر بہت زیادہ ماڈرن سمجھتی ہو خود کو تو بابا بکنی ہی پہن لی ہوتی۔ اوپری جسم تو اس طرح کھلا ___ بھلا بتائیے اچھی خاصی ہوش مند عورت دکھتی ہے کوئی بچی بھی نہیں اور پہنے کھڑی ہے صرف ایک کچ چھا___؟

روشنی دیکھ کر عورت ایک دم میری جیپ کی ہیڈ لائٹس میں گھوم گئی۔ اس کا چہرہ اور ___ بدن میری طرف تھا۔ اوہو۔ عورت نہیں یہ تو ایک تن و مند سکھ تھا۔ لمبی لہراتی ہوئی داڑھی وغیرہ کے ساتھ۔

سردار جی نے مسکراتے ہوئے اپنے بال جھٹکے اور پکار کر پوچھا۔ "ہاں وئی کیا صلاح ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں اس کا چاندی چڑھا ایک دانت چمکا تھا۔

وہ مجھے اتنا مضحکہ خیز یا اس قدر دلچسپ لگا کہ میں نے بھی اسی کی طرح آزاد بے فکر انداز میں پکار کر کہا۔ "بڑی نیک صلاح ہے۔"

وہ پکارا۔ "آ جا فیر۔ پانی اتنا ٹھنڈا اوی نئیں ہے۔ مجا آ جائے گا۔" اس کا دانت پھر چمکا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "نہیں سردار! نہانے کی نہیں صرف دیکھنے کی صلاح ہے۔ تمہیں نہاتے دیکھ لیا بہت ہے۔"

وہ بھی ہنسا بولا۔ "اور جنتریا نہاتے دیکھنے میں کیا مجا؟"

"اوہو!" میں نے اپنی ہیڈ لائٹس کے پیچھے سے کھڑے کھڑے لہک کر کہا۔

"دیکھنے ہی میں تو مزا ہے سردار جی۔ تم نے سنی نہیں وہ مشہور بولی۔"

"کیا کہا؟ بولیاں؟" وہ پھوار میں بھیگتے ہوئے چہک کر بولا۔ "توں اپنا ہی لگتا ہے یار! سناوئی کیا مشہور بولی ہے۔"

میں نے مزے سے کہا۔ "وہ کہتے ہیں نا ____ گوری چھپڑوں نہا کے نکلی' تے سلفے دی لاٹ ورگی۔"

"اوہک اوہک اوہک۔" کہہ کے اس نے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر بھنگڑا ناچنے کا پوز بنایا اور پھوار میں کھڑے کھڑے ٹھٹھا مار کے ہنسا' بولا۔ "یار تو کدھر نکل آیا ادھر اندھیرے میں سے ____ مجے دار آدمی لگتا ہے وئی ____ سنا اوئے توں اپنا گرائیں ہے کیا؟"

"سمجھو تو ایک طرح سے ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔"

وہ کود کر خوض کے دائرے سے نکل آیا۔ "نا یار نا۔ ایہو جیئی دل توڑنے والی بات تے ناں کر۔ بول دے گرائیں ہوں تیرا گلے گلے گرائیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "چل تو ہی خوش رہ ____ ہاں گرائیں ہوں تیرا ____ گلے گلے۔"

وہ قریب آ رہا تھا اور ہنس بھی رہا تھا۔ اس کا چاندی چڑھا دانت پھر چمکا۔

میں نے اسی پر لطف کیفیت میں کہا۔ "لے اور سن لے بھئی سردار! ایک اور سن لے یہ ذرا بہت زیادہ شاعرانہ ہے ____ مطلب مستی ذرا کم ہے اس میں شاعری زیادہ

ہے سلفے کی لاٹ سے تو کم ہی مستی ہے۔"

وہ سردی میں ہولے ہولے سوں سوں کرتا آ کھڑا ہوا' بولا۔ "سنا دے' فیر آپاں اندر چلاں گے ادھر اب سردی شروع ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی خاص نہیں روشنی میں تمہارے دانت کا لشکارا دیکھ کے کچھ یاد آ گیا تھا۔"

وہ جھٹ سے بول پڑا۔ "ہاں اوئے سمجھ گیا۔ او خوئی نا؟ تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لیے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں وہی محبوب کی لونگ کہہ لو یا سردار کا دانت کہہ لو ایکوئی گل اے۔"

وہ ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ "یہ ہوئی بات ____ میرے دند دا پیا لشکارا ____ ہاہاہا۔ حد ہو گئی وئی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر میری بانہہ تھپکی۔ "چل آ دوست اندر چلیے ____ ناں کی ہے تیرا؟"

میں نے اپنا نام بتا دیا۔

بولا۔ "ادھر کدھر سے آ رہا ہے؟" پھر جیپ کی طرف دیکھ کے بولا۔ "بڑی جبردست جیپ ہے تیری۔"

میں نے کہا۔ "ایک دوست کی ہے۔"

"دوست کی ہے تو خیر ہے۔" وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے ولا کی طرف لے چلا۔ "میرا نام انحد سنگھ ہے۔"

میں نے نام کی تعریف کی اور پوچھا۔ "یہ انحد حلوے والی سے ہے یا دوسرے سے۔"

وہ ننگے پیر تھا کنکروں پر پنجوں کے بل چلتا ہوا بولا۔ "یار دونوں ہی صحیح ہیں۔ حلوے سے سمجھ لے۔ تو مسلمان ہے تو وئی توں خوش ہو جائے گا۔ چھوٹی ہ سے کوئی اور پرسن ہو جائے گا۔ اصل میں شیر کھان ہم تو یار صوفی آدمی ہیں۔ ایک صوفی نے ____ میرے پتا کے مرشد حجرت اصغر علی شاہ البیلے صاحب نے یہ نام رکھا تھا۔ وہ بولتے تھے انہد' ان حد' اپرم پار ٹرم ہوتی ہے صوفیوں کی۔" اسنے اپنے چھے سے لٹکتی چابی سے ولا کا دروازہ کھولا اور کندھا چھو کر مجھے خود سے پہلے دہلیز پار کرائی۔ "آ جاؤ جناب ہاں جی' تو آئی سمجھ میں؟ اس ان حد نام کی کرپا ہے' اس انحد سنگھ کا بیڑا اتر گیا ہے جناب! بڑا کاروبار پھیلا

ہے مالک کے کرم سے کوئی حد حساب ہی نہیں ہاہاہا۔"

ہم جس ہال میں آ کھڑے ہوئے تھے وہ واقعی سرداران حد سنگھ کی زبردست خوش حالی کی کہانی سنا رہا تھا۔ سنگ مرمر اور اعلیٰ درجے کی ٹیک کی لکڑی نے دور تک اور اوپر تک خوش ذوقی اور امارت کی ایک دنیا سجا رکھی تھی۔ سیمنٹ تو خیر دیواروں' فرشوں' چھتوں کے اندر استعمال ہوئی ہو گی وہ تو دیکھنے والوں کو کہیں نظر نہ آئی تھی دیواروں پر ٹیک کے اعلیٰ قسم کے وہی نیئر والے تختے' اس طرح جڑے تھے کہ خوب پالش کی ہوئی لکڑی ہی چمک مارتی تھی۔ گھومی ہوئی دہری سیڑھی اور بالکونی پر لکڑی کا ایک خوبصورت گورکھ دھندا بناتی تھی۔ فرش پر سنگ مرمر جڑا تھا اور چھت خدا معلوم کس میٹریل کی تھی کہ ایک کندنی سی چمک چھت کے اندر سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

ان حد سنگھ نے بے حد پیسا خرچ کر کے یہ ولا بنوائی تھی۔ ٹیک کا اعلیٰ فرنیچر' ایک فانوس جسے سردار جی نے اپنی گفتگو میں ایک بار جھوم کر کہا تھا' اور بالکونی کے بالکل نیچے دیوار پر ایک زبردست سر سیدی' سفید داڑھے والے سکھ کی روغنی پینٹنگ' یہ نمایاں چیزیں تھیں۔ گمان غالب ہے کہ پینٹنگ کسی مہنگے غیر ملکی پورٹریٹ کرنے والے سے بنوائی گئی ہو گی۔

ان حد سنگھ بدن سے ننگا بس ایک کچھا پہنے اس خوابوں میں نظر آنے والی عمارت کے ہال میں میرے ساتھ داخل ہوا تھا اور میٹ پر اپنے گیلے ننگے پاؤں پونچھتا ہوا سفید داڑھی والے تصویری بڑے میاں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم دے رہا تھا۔

تصویر والا اپنی زندگی میں ایک خاصا شاندار بارعب بوڑھا رہا ہو گا۔

ان حد سنگھ آہستہ سے بولا۔ "یہ میرے دادا صاحب ہوری ہیں ___ سردار ودھاوا سنگھ جی ترکھان۔"

میں نے سر ہلا کر اپنے میزبان کی دی ہوئی اطلاع وصول کی۔ سب کچھ صحیح تھا مگر یہ ترکھان؟ کیا میرے میزبان کا دادا بڑھئی تھا؟ مطلب عام سا گاؤں کا بڑھئی؟

ان حد سنگھ نے اسی رو میں اگلے ہی لمحے وضاحت کر دی' بولا۔ "جناب دادا ہوری صاحب جیسا ترکھان سولہ اٹھارہ پنڈ ادھر تے سولہ اٹھارہ پنڈ ادھر دوسرا کوئی نہیں تھا۔ منجی' اشٹول والے ترکھان نہیں تھے ودھاوا سنگھ جی۔ کیبنٹ بناتے تھے اور مالک کے کرم سے ایسی ایسی کیبی نٹ جناب کہ برمنگھم گلاس گو کی سوالہ اٹھارہ کاؤنٹی تک سے بڑے بڑے گورے ودھاوا سنگھ جی کے پاس خود چل کے آتے تھے کیبی نٹ بنوانے۔"

"تو آپ لوگ یو کے میں رہتے ہیں؟"

"لوگ نہیں دوست! میرا دادا صاحب سمجھو پوری لائف ادھر ہی۔ میرے والد کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔ اسے بھی ادھر ہی ولیت میں جمانا چاہتا تھا۔ پھر ملک آباد ہوا تھا جبھی سے میرا والد اپنے بابے کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ انگریجاں دا ملک چھوڑ ___ چل اپنے گھر چل اپنے آیاد ملک میں۔"

"تو پھر؟"

"بس جی۔ بج رگ لوگ تھے۔ بڑا بوڑھا جھک وی مارے تو سنتان کو ___ مطلب اولاد کو نکتے نہیں نہ نکالنا چہیئے۔ میں ابھی پیدا نہیں ہوا تھا تے دونوں ونج رگ' گئے پٹیالے ___ میرے والد صاحب ہوری اجے بچے ہی تھے سمجھو کوئی بائیس سال کے ___ خیر جی ابھی شکیت کرنے کا کوئی مجا نہیں جو ہوئی سو ہوئی۔ پٹیالے میں لٹ لٹا کے ایک انگریج پڑوسی کے بلائے پہ وہ دونوں باپ بیٹا برما آ گئے اپنے آیاد ملک کو دور سے سلام کیا۔ ادھر مالک کے بھنڈار کھول دیے سمجھو۔ ودھاوا سنگھ جی کے اور پتر وسایا سنگھ جی کے نام پہ لاٹری جیسی نکل آئی۔ وسایا سنگھ جی میرے پتا تھے۔ گجر گئے۔ ان کے پیچھے دادا صاحب ہوری سولھے برس اور جیسے مجھے پال پوس کے بڑا کیا کاروبار پر بٹھایا پھر شیر نے انہیں کھالیا۔

"شیر نے؟"

ہاں جی۔ جنگل بیلے تو یہی سب کھطرے شطرے رہتے ہیں۔ جیپ میں جا رہے تھے۔ جاتی جرورت سے اترے' شیر نے مار دیا ___ لو جناب! آپ کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو سرکار! دادا صاحب ہوری کے بعد اب ان حد سنگھ ترکھان ٹیک کی یہ سپر اسٹیٹ سنبھالے ہوئے ہے۔ شکیت کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ پر ایک بات کہوں گا مدھوری بائی کا کصہ بیچ میں نہیں نہ آتا تو ان حد سنگھ ترکھان کی سمجھو سورگ میں کٹ رہی تھی۔ سورگ سمجھتے ہو؟ جنت۔ جنت؟"

مین نے پوچھا۔ "مدھوری بائی کا کیا قصہ ہے؟"

سردار جی بولے۔ " کصہ کچھ نہیں چھاتی میں سوراخ ہو گیا ہے ان کے کارن۔"

میں نے ذرا غور سے انحد سنگھ کی ننگی چھاتی دیکھی۔

وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ "باہر سے چھاتی کا سوراخ کب دکھے گا شیر

کھان صاحب! چلو چھوڑو۔ بندہ (زندہ) رہے تو سنادیں گے مدھوری بائی پاک پٹن والی کی اشٹوری۔"

میں نے گھبرا کے پوچھا۔ "یہ بیچ میں یہ پاک پٹن کہاں سے آ گیا؟"

ان حد سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چوم کے آنکھوں پر رکھ لیں' بولا۔ "سنا ہے بڑا ہینیا شہر ہے پاک پٹن شریف ____ سنا ہے' ایک سچے پیارے کا ادھر مجار ہے____ پر بھائی صاحب ایسا ہے ناکہ ہری دوار میں بھی درواجا کھلا دیکھ کے کوکر' مطلب کتی اندر آ جاتی ہے۔ خیر مدھوری بائی کی اشٹوری فیر کسی ویلے سناواں گے____ اورے!"

ان حد نے منہ اٹھا کے کسی رمے کو آواز دی تھی۔ "رمیا اوئے! او دیکھ بھئی۔ مالک کی شان آئے نیں____ ساڈھے گھر مہمان آئے نیں۔"

رمیا رمیا آیا تو اطمینان ہوا۔ یہ سکھ نہیں تھا۔ ایسا نہیں کہ میں ان سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ ناں ناں سکھوں سے میں الجھتا نہیں ہوں۔ بڑے زندگی سے بھرپور بلکہ خوب چاہلی بھرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک سردار ان حد سنگھ صاحب نے ہی سانس پھلا دی تھی۔ یہ رما اگر رما سنگھ ہوتا تو دونوں اپنی باتوں سے مجھے ایسا تھکا دیتے کہ اس خوبصورت ولا کو دیکھنے کا مزا ہی جاتا رہتا۔

رما رمیا کو خوب معلوم تھا کہ جب کوئی مہمان آتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔ "وہ آؤ جناب! آؤ جی سر جی!" کہتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔ میں نے ایک بار اپنے میزبان کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر ہاتھ کا اشارہ کیا کہ جائیے جیسا وہ کہہ رہا ہے کیجیے۔

رمیا مجھے زینے کے نیچے ایک ہلکے انگوری کمرے میں لے گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اگر میں ہندو ہوتا تو میرے کمرے کا رنگ ہلکا بسنتی اور مسیحی بھائی ہوتا تو نفیس پنک ہونا چاہیے تھا۔ میں دوسرے ہی کسی دین سے منسلک ہوتا یا بے دین ہوتا تو مجھے آسمانی کمرے میں ٹھہرایا جاتا۔ کمرے کی ہر چیز' باتھ روم کے ٹائلز' حد یہ ہے کہ جس ڈھب کے شب خوابی کے کپڑے اور ہاؤس کوٹ دیے گئے وہ بھی کمرے کے رنگ پر سوچے اور ڈیزائن کیے گئے تھے۔ خود سردار ان حد سنگھ کا کمرہ سفید بے داغ تھا۔ وہ اپنے سکھ بھائیوں کو بھی مہمانوں کے کسی سفید کمرے میں ٹھہراتا تھا۔ میں نے کہا کہ سکھ بھائیوں کا تو کھٹا زرد رنگ ہوتا ہے۔ ان حد نے سمجھایا کہ ہاں کھٹا رنگ ہوتا ہوگا سکھوں کا پر میں تو صوفی بندہ ہوں۔ حجرت البیلے شاہ ہوری کا مرید۔ میں تو اپنے لوگوں کو اپنے ہی رنگ میں رنگا دیکھنا

چاہتا ہوں۔

رمیا نے غسل خانہ تیار کر دیا تھا اور اس نے بستر پر میرے پہننے کے لیے ہر طرح سے تیار استری کیا ہوا شب خوابی کا لباس اور خوبصورت انگوری' پھولوں اور گہرے کاہی آستینوں کالروں والا ہاؤس کوٹ پھیلا دیا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ سر جی! میں آدھے گھنٹے میں سردار صاحب کے کمرے میں گلاس' بوتلیں اور برف پہنچا دوں گا۔ گویا سردار اپنے مہمانوں کی پہلی تواضع شراب سے کرتا ہوگا۔

میں نے کہا۔ "رمیا بھائی! تم بے شک اپنے سردار صاحب کے لیے بوتل' گلاس' برف پہنچاؤ پر میں صرف چائے' کافی' شربت پینے والوں میں سے ہوں۔ اس بات کا خیال رکھنا۔"

رمیا نے مسکرا کر کچھ اس طرح سر ہلایا جیسے اس سے کسی معذور آدمی نے کہا ہو کہ میری فکر مت کرو' میں اپنی وہیل چیئر پہ آ جاؤں گا۔

دنیا بھر کے بیسنگ' سالٹ اور بڑھیا صابن سردار کے اس مہمان خانے والے باتھ روم میں مہیا تھے۔ میں نے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگا کر غسل کیا اور مہمانوں والا لباس پہن کر ہال میں پہنچ گیا۔ رمیا میرا منتظر تھا۔ وہ سیڑھی چڑھا کر مجھے سردار ان حد کے سفید کمرے میں لے گیا۔ سردار پوری طرح تیار موتی جیسی پگڑی کسے داڑھی چڑھائے۔ سفید ریشمی ہاؤس کوٹ میں کمرے سے نکل کے آیا۔ روایتی پنجابیوں کی طرح جی آیاں نوں کرتا ہوا مجھ سے بغل گیر ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا وہ میرے انتظار میں ایک آدھا پیگ لگا کے بیٹھا ہوگا مگر شاید رمیا نے بتا دیا تھا کہ میں اس کے حساب سے "بے ذوق" ہوں۔ نہیں پیتا' مہاگنی کی بہت زبردست ٹرالی میں ایک طرف شراب سے متعلق چیزیں سجی تھیں اور دوسری طرف پیالی اور تھرموس رکھے تھے۔

ان حد سنگھ نے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا' بولا۔ "اگر آپ بہت دھارمک' مطلب جس قسم کے بھائی ہو تو میں یہ بوتلیں شوتلیں واپس بھیج کے آپ کے ساتھ چائے پی لوں گا اور جو آپ کی اجاجت ہو گئی تو اپنا شغل کر لوں گا۔"

میں نے کہا کہ بھائی تم اپنا شغل کرو' میں اپنا کرتا ہوں۔ تو خوش ہو کے ان حد نے اپنا کاروبار پھیلا دیا۔

پہلا پیگ پیتے ہوئے اس نے مجھے اپنے ان مختلف مسلمان' خاص طور پر پٹھان ملاقاتیوں کا حال بتایا جو یہاں برما اور وہاں یو کے میں اس سے ملے تھے۔ ان حد ایک بار

ہندوستان بھی گیا تھا۔ ہنس کے کہنے لگا۔ ''پٹیالے میں میرے دادا صاحب اور والد صاحب ہوری کے ساتھ جو حالات پیش آئے تھے اس کی ڈی ٹیل سننے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ نہ پٹیالے اور نہ کبھی نیو دلی جاؤں گا۔ سنا ہے ادھر نیو دلی راج دھانی میں بھی بہت پٹیالے والے بس گئے ہیں۔ میں صرف باہبے اور پونے گیا تھا۔ باہبے تو فلم میں کام کرنے کے شوق میں ہم پونے ___ چلو پونے شہر کا نام آگیا ہے تو فیر بتا ہی دیتا ہوں۔ پونے شہر میں وہ اپنی ___ اس ___ مدھوری بائی کا کلب تھا۔''

''کیا کلب؟'' میں نے پوچھ لیا۔

ان حد نے ہاتھ اٹھا کر مجھے صبر کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بڑی مستعدی سے دوسرا پیگ بنانے لگا تھا۔

دوسرا پیگ بنانے اور سپ کرنے میں سردار نے کچھ وقت لیا' پھر جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر پہلے اپنے ہونٹوں پر پھر آنکھوں پر اور چہرے پر پھیرا۔ حالانکہ چہرہ اس کا تروتازہ تھا۔ کوئی پسینہ چکناہٹ کچھ نہیں تھی۔ ہاں لگتا تھا کچھ نروس ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''پاگلوں ورگی بات ہے مگر سناتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی حوصلہ افزائی کی' یعنی مدھوری بائی عورتوں کا باڈی بلڈنگ کلب چلاتی تھی۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''عورتوں کا ___ مطلب باڈی بلڈنگ؟''

میرے میزبان نے چھوٹا سا سپ لیا اور اداسی کے ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

''آہو ___ باڈی بلڈنگ ___ جنانیوں کا۔''

آگے ہم دونوں چپ ہو گئے' مگر بات چیت جاری رکھنے کے لیے کچھ کہنا ضروری تھا۔ مجھے اس وقت کچھ نہیں سوجھا تو میں نے کہا۔ ''چلو ___ کوئی حرج نہیں ___ بعض عورتیں چلاتی ___'' جملہ احمقانہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں نا۔ یہی تو اصل پرابلم تھی شیر کھان! کوئی عورت بھی نہیں چلاتی تھی۔ کم سے کم اس جمانے میں تو کوئی بھی عورت یو کے میں بھی ایسا کلب کوئی نہیں چلاتی تھی۔''

میں نے پھر ہاں میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ان حد سنگھ نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اپنے گلاس

میں بچی شراب ایک ہی گھونٹ میں انڈیل لی۔ لگتا تھا اب اس میں کچھ ہمت آگئی ہے۔ وہ اداسی سے ایک بار ہنسا' کہنے لگا۔ ''ایک فلم کی شوٹنگ کے چکر مین پونے گیا تھا۔ ادھر میرا ایک سکھ دوست تھا۔ سکھوں کو کم ہی دوست بناتا ہوں مگر وہ ترکھان تھا پونے کے مین فرنیچر ایریا میں دکان لیے بیٹھا تھا۔ شوٹنگ نمٹ گئی تھی۔ میرا رول ہی کتنا تھا بس کسی اسسٹنٹ کو پیسے کا آسرا دے کے ایک دو سائلینٹ سینوں میں کیمرے کے آگے سے گجر گیا تھا۔ تو مطلب شوٹنگ پیک اپ کر کے میں اپنے سکھ ترکھان بھائی کی ورک شاپ میں بیٹھا تھا کہ ادھر سے مدھوری بائی آگئی۔''

''اچھا۔''

ان حد نے تقریباً غصے سے کہا۔ ''اچھا نہیں بہت اچھا اور بہت ٹائٹ پتلون پہنے تھی۔''

''کون پہنے تھی؟'' مجھے ان حد کا غصے کا وہ انداز نہ آیا تھا اس لیے میں نے پوچھا کہ کون پہنے تھی۔ میں کوئی بھی بونگاری ایکشن دینا چاہتا تھا۔

اسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا اس لیے چھوٹی سی ڈکار لے کر اس نے سوری کہا اور اب کے بہت نرمی سے کہنے لگا۔ ''تم نے ہجاروں ___ نہیں درجنوں جنانیوں کو پتلون پہنے دیکھا ہو گا۔ میں نے ہجاروں کو دیکھا ہے' مگر وہ پتلون نہیں پہنے تھی۔ ناں' ناں ___ شیر کھان! پتلون اسے پہنے ہوئے تھی۔''

اس نے یہ بات اتنی شدت سے بلکہ تقریباً مذہبی جوش سے کہی تھی کہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

ان حد بے بسی میں میری صورت دیکھنے لگا۔ دھیرے سے بولا۔ ''ہنس لو ___ مہمان ہو میرے' مگر واہگورو کا واسطہ جرا بتاؤ بھیا جی' اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''سوری۔ تمہاری بات پر نہیں ہنسا کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

انحد سنگھ نے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔ وہ اب مے نوشی کے اس مرحلے میں تھا کہ ہر معقول ___ اور نامعقول بات سے اتفاق کر سکتا تھا۔

کہنے لگا۔ ''اس کے نچلے ہونٹ کے پاس ایک چھوٹا جیا تل ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان حد سنگھ کی آواز بھرا رہی تھی۔ میں ڈر رہا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے کہیں رو نہ پڑے۔

میں نے فوراً ہاں میں سر ہلایا یعنی اگر تل ہے تو کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ

تو بہت اچھا ہے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کہاں بیٹھا تھا؟" اب سردار جی بھولتے جا رہے تھے۔

میں نے یاد دلایا کہ وہ پونے شہر میں اپنے سکھ ترکھان دوست کی ورک شاپ میں بیٹھے تھے۔

"ہاں جی۔ تو وہ ورک شاپ میں آئی میں جراری لیک سنگ موڈ میں____"

میں نے بات کاٹی۔ "کون سنگھ؟"

"او' کوئی سنگھ نہیں یار۔ ری لیکسنگ موڈ میں' مطلب آرام نال پگڑی ڈھیلی کر کے' بش شرٹ اتار کے' اشٹول پہ ٹانگ پھیلا کے آرام نال بیٹھا تھا کہ وہ____ مدھوری بائی آئی بولی' سردار جی! آج میں تمہیں لے کے ہی جاؤں گی اور جب تک میرے کلب کا کام اشٹارٹ نہیں نہ کرو گے تمہیں چھوڑوں گی نہیں____ ادھر واپس ہی نہیں آنے دوں گی۔ آپ سمجھے شیر کھان بھائی؟ اصل میں کیا ہوا تھا؟ وہ مجھے دکان والا سکھ سمجھ رہی تھی۔"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کے سمجھ داری سے کہا۔ "جبکہ تم دکان والے سکھ نہیں تھے' مہمان والے سکھ تھے۔"

میں نے سوچا ہاں بھئی ہوتا ہے' ایک سکھ سے دوسرے سکھ کو تمیز کرنا کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔

ان حد نے بھی سر ہلا کے میری بات سے اتفاق کیا اور کہا۔ "سامنے میرے واقف کا او جاروں کا بیگ اور ناپ تول والے پھی تے شی تے پڑے تھے۔ میں نے بھائی صاحب! آؤ دیکھا نہ تاؤ او جاروں کا بیگ اور پھی تے شی تے اٹھائے اور کہا میڈم! ٹھیک ٹائم پہ آئی ہو۔ چلو چلتا ہوں۔ آج کام اشٹارٹ ہی کر کے آنا ہے۔"

میں دلچسپی لیتے ہوئے آگے جھک آیا تھا اور شاید مسکرا رہا تھا۔

میرا میزبان بھی مسکرا کر بولا۔ "او جی' میں نے اس کو جب میڈم کہا نا تو اس نے اپنی مدھوری بائی نے نین گھما کے۔" یہاں سردار نے اپنی آنکھیں چلا کے دکھائیں۔ "سمجھے بھائی جی! نین گھما کے خبر ہے میرے کو کیا کہا؟ کہنے لگی۔ میڈم کیوں بولتے ہو بے بی بولو جو تم ہمیش بولتے ہو' میں تو جی شیر کھان لہرا گیا سمجھو۔ میرا واقف' وہ سورا سکھ ترکھان اس کو' ایڈی سوہنی کڑی کو بے بی بولتا ہے۔ خیر دیکھ لوں گا۔ میں نے اس کو تو فوراً

بے بی بول کے راجی با جی کیا فیر ایک پرچے پہ انگریجی میں دکان والے سکھ کو لکھا کہ میں ایمرجینسی میں ایک جگہ جا رہا ہوں۔ تمہارے او جاروں' پھیتوں کا بیگ لے جا رہا ہوں شام کو واپس کر دوں گا۔ تو بس جی میں اس اپنی' بے بی کے ساتھ ورکشاپ سے نکل آیا۔ وہ میرے کو انگریجی میں پرچا لکھتے دیکھ رہی تھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ تم کو ہدی مراٹھی نہیں آتی جو تم انگریجی میں لکھ رہے تھے؟ میں نے کہا بے بی! سولھے برس کی ایج تک آدھا ٹائم یو کے میں گجارا ہے فیر یہ بھی ہے کہ میرے دادا ہوری نے ہی مجھے پڑھنا' لکھنا سکھایا تھا' اسکول کی شکل تو میں نے دیکھی نہیں دادا ہوری کو دو جبان آتی تھی پنجابی اور انگریجی' بس وہی میرے کو آتی ہے۔ وہ بڑی امپریس ہوئی۔ انگریجی میں کہنے لگے میں نے یہ پہلا ترکھان دیکھا جو بدیسی بھاشا میں پرچی لکھتا ہے۔ میں نے بھی اسی جبان میں کہا کہ بے بی ابھی تو دیکھتی جاؤ میں پرچی لکھنے کے علاوہ بھی بدیسی جبان میں بہت کچھ کرتا ہوں۔ ہنسنے لگی' بولی۔ تم بہت کیوٹ ہو۔ میں نے کہا۔ خیر۔ کیوٹ تو میں نہیں ہوں۔ سولھے برس سے آگے کا کوئی بھی سکھ کیوٹ نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔" وہ خود ہی اپنے فقرے کی داد دیتے ہوئے ہنسنے لگا۔ میں نے بھی ساتھ دیا۔

ہم دونوں ہنس چکے تو انحد سنگھ ایک دم سنجیدہ ہو گیا' بولا۔ "میں نے مردوں کے باڈی بلڈنگ کلب بہت دیکھے ہیں۔ ایک کلب کا ممبر بھی ہوں پر جنانیوں کا باڈی کلب شیر کھان میں نے اس روج پہلی بار پونے شہر میں دیکھا۔ وہ بے بی مدھوری بائی اپنی اسپورٹس کار میں مجھے کلب لے گئی۔ دو گورکھے چوکی دار بندوق شندوق کے ساتھ گیٹ پر جمے ہوئے تھے' خیر جی اس نے ایک کو اشارہ کیا۔ اس گورکھے نے میرا بیگ اٹھا کے اندر کمپاؤنڈ میں پہنچا دیا۔ سامنے برآمدے میں نیکر' جرسی پہنے ایک موٹی اور کالی پہلوان جئی عورت ٹہل رہی تھی۔ بے بی نے اشارہ کیا وہ مجھے گھورتی ہوئی آئی اور زمین پہ رکھا میرا بیگ اٹھا کے چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا تو رک گئی اور گھورتے ہوئے کھسے سے بولی۔ "اے سکھ! تم ادھر ٹھہرو اندر جانے کا نہیں ہے۔" میں نے مدھوری بائی کی طرف دیکھا اس نے کہا۔ "بے بی! یہ تو کاٹتی ہے۔" مدھوری بائی میرے کو آنکھ مار کے بولی۔ "یہ ادھر کی کوارٹر ماسٹر حوالدار ہے۔ یہ اندر کسی مرد کو نہیں چھوڑے گی جب تک میں اس کو آرڈر نہیں دوں گی۔" میں نے کہا۔ "بے بی! آرڈر دو نا۔" وہ بولی۔ "صبر صبر۔ میری کوارٹر ماسٹر حوالدار اندر دیکھ کے آئے گی کہ کوئی جنانی____ مطلب سب جنانیاں جو تمہارے رستے میں آئیں گی وہ ڈی سنٹ حالت میں ہیں کوئی آدھی ڈھکی آدھی کھلی جیسی

تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ویسے تم آرڈر کرو تو میں آنکھ بند کر لیتا ہوں۔ تم بے بی میرا ہاتھ پکڑ کے بلائنڈ مین کی طرح لے چلو جدھر بھی لے جانے کا ہے' وہ بولی۔ ''تم بہت چالاک ہو سردار جی! اور بھائی شیر کھان! اس نے کمپاؤنڈ میں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کے میرا گال توڑ لیا۔ مطلب جتنا گال نجر آرہا تھا' مطلب جتنا داڑھی کے بال سے کور نہیں ہوا تھا' وہ توڑ لیا۔ میں نے بھائی جی' گھبرا کے گور کھا چوکی دار کی طرف دیکھا وہ سورے ادھر نہیں دیکھ رہے تھے' وہ آنکھیں جھپک رہے تھے اور تمبا کو میں چونا ملا کے مسل رہے تھے۔

خیر جی وہ نیکر جرسی والی موٹی پہلوان حوالدار آئی مدھوری بائی کو آنکھ مار کے بولی۔ ''سب ڈھکیلی' سب صئی۔'' مجھے ہنسی آگئی ایک تو اس کے ڈھکیلی بولنے پر دوسرے یہ بھی تھا کہ سبھی ایک دوسرے کو آنکھ مارتے' عورت ہووے۔ ''نہیں ہووے' گور کھا ہووے' سب آنکھ مار رہے تھے۔''

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ سردار ان حد سنگھ ان لوگوں سے کچھ مختلف ہے جو جتنا پیتے جاتے ہیں اتنے ہی جھکی اور خوں خوار ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی باتیں نشہ بڑھنے کے ساتھ مزے دار ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس سے یہ بات کہہ دی تو ہنسنے لگا پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''یار شیر کھان! جبھی میں افسردہ ہونا اشٹارٹ ہوئے گا تو اتنا گم جدہ (غم زدہ) ہو جائے گا کہ تو جنٹریا! میرے ساتھ ہچکی لے لے کے روئے گا۔''

میں نے کہا۔ ''جب کی جب دیکھی جائے گی ابھی تو مزا آرہا ہے۔''

فوراً ہی اس نے پوچھا۔ ''ہاں تو میں کدھر تک پہنچا تھا؟''

میں نے بتایا کہ نیکر جرسی والی حوالدار نے آنکھ مار کے بتایا تھا کہ اندر کلب میں سب عورت کا باڈی ڈھکا ہوا ہے۔

''ہاں' سب ڈھکیلی' سب صئی اور اس نے مدھوری بائی کو آنکھ ماری۔ مدھوری بے بی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایسا پنجے پھنسا کے اور آنکھ جھپک کے انگریجی میں بولی کہ لے سردار جی تیرا ہاتھ پکڑوانے کا شوق بھی پورا کر دیا۔ میں دھیرے سے وہی جبان میں بولا کہ ہور دیکھو میرے کون کون شوق پورے کراؤ گی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' ٹال گئی۔''

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے آنکھ جھپک کے انحد سنگھ سے کہا۔ ''سردار جی! بڑے چنٹ ہو یار!''

وہ اداس ہو کے کہنے لگا۔ ''سنتے جاؤ۔ ابھی کدھر چنٹ ہوا' ہوں۔ چنٹ تو میں نے آگے چل کے ہونا ہے۔ ہاں جی تو مدھوری بے بی ٹال گئی مگر جناب! قسم سچے گرو کی' ہاتھ اس کا ایسا تپ رہا تھا جیسے گرم راکھ میں سے ابھی ابھی وہ نکالی ہو ___ شکر قندی۔''

ایک ضروری بات جو میں نے' اتنے دن ہو گئے' اپنے پڑھنے والوں کو نہیں بتائی یہاں میں بتا دینا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ شکر قندی ___ بھوبھل میں بھونی ہوئی شکر قندی ___ میری کمزوری ہے۔ عام لوگ جنہیں نعمتیں سمجھتے ہیں ایک طرف چیزیں وہ بھی ہوں اور ایک طرف بھوبھل میں بھنی شکر قندی پڑی ہو تو میں نعمتیں چھوڑ دوں گا شکر قندی سے پیٹ بھر لوں گا۔

اب جو بھوک کا ٹائم قریب آتے ہوئے ان حد سنگھ نے شکر قندی کا نام لے دیا تو جیسے میری سٹی گم ہو گئی ___ یا اس موقع پر جو بھی کہا جاتا ہے۔ میرا وہ حال ہو گیا۔ ان حد کچھ اور بھی کہے جا رہا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ شکر قندی سننے کے بعد میری توجہ کہیں بھی نہیں ٹک رہی اور میں بے چین ہو گیا ہوں تو وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''ایسا لگتا ہے میری بات میں اب مجا نہیں رہا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں سردار جی' تیری بات بہت گرما گرم چل رہی ہے بس' ایک گڑبڑ ہو گئی۔''

''تو نے گرم راکھ میں بھنی شکر قندی کا نام لے دیا۔ یوں سمجھ لے مجھے پاگل کر دیا۔''

''اوئے!'' سردار گلاس رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا اور ہلکا سا لڑکھڑاتا میری طرف چلا۔ ''اوے شیر! ___ توں شکر قندی کا رسیا ہے؟''

''بس پاگل ہو جاتا ہوں' خوشبو پا لوں کہیں دیکھ لوں' نام ہی سن لوں تو بس ___''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ لڑکھڑاتے ہوئے کمرے کے فرش کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ ''رمے! اوئے رمیا!''

میں نے پوچھا کہ اسے کیوں بلاتے ہو؟

بولا۔ ''یار تیرے واسطے شکر قندی جو منگانی ہوئی۔''

''کہاں سے منگانی ہوئی؟''

کہنے لگا۔ ''کہیں سے بھی۔ بھلے ہی رنگون جائے گڈی لے کے ___ گرم راکھ

کی شکر قندی تو اب آنی ہی آنی ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں تو کھانا لگوا دے سردار! جو بھی ہے بس میرا کام چل جائے گا۔ یہ رنگون اور شکر قندی اور بھو بھل سب رہنے دے۔"

وہ اکڑ کے بولا۔ "اسیں مہمان کی بے اج تی نہیں کرتے ہوتے۔ اصل نسل ترکھان ہیں۔ قسم پیدا کرن والے کی۔"

میں نے کہا۔ "مہمان کی بہت عزت بڑھے گی اگر تو فٹا فٹ کھانا لگوا دے گا تو۔"

پوچھنے لگا۔ "اچھا؟ ایمر جینسی ہے؟"

میں نے ہاں میں سر ہلایا اس نے دروازے پر کھڑے رمیا کو کھانا لگانے کا کہہ دیا۔ میرا جی چاہا اب جبکہ کھانا لگنے ہی والا ہے تو جو بے ہودگی قصہ سناتے ہوئے سردار کو ٹوک کے مجھ سے ہوئی ہے اس کا ازالہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ ہاں سردار جی! آگے سناؤ۔ تو تم پہلی بار زنانیوں کے باڈی بلڈنگ کلب میں گھس رہے تھے اور بے بی مدھوری تمہارے پنجے میں پنجا پھنسائے ہوئے تھی، پھر؟ آگے کیا ہوا؟

انحد سنگھ بولا۔ "اسٹاپ! ابھی سب کچھ ادھر ہی رکے گا ہم دو وئیں بندے کھانا کھائیں گے پھر میں آگے کی آگے سناواں گا مگر یار آگے تو سمجھو غضب ہی ہو گیا۔ ایسا بم بلاسٹ ہوا ہے____ چل بھئی شیر! تو ڈائننگ ایریا میں چل ادھر اپنے منہ پر کلون کا گیلا تاول لگا کے جرا فریش ہو لے آ میرے نال آ۔"

ان حد سنگھ کے والد کی ہر چیز کی طرح اس کا ڈائننگ ہال اور متعلقہ کمرے وغیرہ بھی حیران کر دینے والے تھے۔ کوئی پینتالیس پچاس آدمیوں کی ضیافت کی میز اور اس کے متعلقات دیکھ کر تو میں سمجھو چندھیا گیا۔ کیسی چکا چوند والی جگہ تھی۔ تین بہت زبردست فانوس اس ٹیبل پر جھکے آتے تھے۔ ہم دو ہی کھانے والے تھے اور ہمیں کھانا کھلانے کے لیے رمیا کے علاوہ چار اور بندے لیوری یعنی گھریلو خادموں کی اجلی جگمگاتی وردیوں میں موجود تھے۔ ان حد میزبان کی کرسی پر تھا اور میں چیف مہمان کی سیٹ سنبھالے تھا۔ دو مرتبہ ان حد سنگھ نے افسوس کے لہجے میں کہا کہ یار! اگر جرا پہلے بھی معلوم ہو جاتا کہ شیر کھان کو شکر قندی چیے تو میں ادھر ادھر بندے دوڑا کے کوئی بندوبست کر دیتا۔

میں نے اس کی مہمان نوازی پر اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ جس کے جواب میں

وہ اسی طرح معذرت کرتا رہا۔ کھانے میں جتنی چیزیں تھیں میرے ٹیسٹ کے مطابق تھیں۔ میز پر آنے، کرسیاں سنبھالنے سے پہلے انحد نے اپنے چیف خانساماں سے میرا تعارف کرایا تھا۔ یہ شرعی حلئے اور پیشانی پر سجدے کے نشان والے بنگالی، مونجور میاں تھے۔ منظور میاں نہ صرف ہیڈ کک تھے بلکہ ولا میں آنیوالے سو فیصد حلال گوشت کے پوری طرح ذمہ دار بھی وہی تھے جو مہمان جھٹکے کا گوشت کھانا چاہتے تھے ان حد سنگھ نے ولا کے عقبی لان سے ملا ان کے لیے "جھٹکا گرل ہاؤس" الگ بنا رکھا تھا۔ جھٹکا گوشت کھانے والے برتن اسی ایریا میں رکھے جاتے تھے۔ اس طرح مے نوشی کے برتن بھی ڈائننگ ہال میں نہیں آ سکتے تھے۔ ایکبار کسی نئے ملازم کی غلطی سے شراب کے تین استعمال شدہ گلاس منظور میاں کے علاقے پینٹری میں دیکھ لیے گئے۔ منظور میاں نے تینوں گلاس چمٹے سے پکڑ کر ولا کے پچھواڑے کوڑے دان میں پھینک دیے۔ ان حد سنگھ نے بتایا کہ او یار! اس روز مونجور میاں کا غصہ دیکھ کے میرے کو بھی مجا آ گیا بار بار لاحول پڑھتا تھا اور میرے کو دھمکی دے رہا تھا کہ اگر کبھی دوبارہ یہ "کفر" ہوا تو میں واپس چاٹو گرام چلا جائے گا۔

خیر تو کھانا شروع ہوتے اور ختم ہوتے پتا بھی نہ چلا میرے میزبان نے اپنی مزے دار باتوں میں مجھے الجھائے رکھا۔ میں نے حلال و حرام کے احتیاط پر اس کے انتظام کی تعریف کی تو بولا۔ "شیر کھان! میں البیلے شاہ ہوری کا مرید ہوں۔ صوفی ہوں۔ کسی کا بھی دل نہیں توڑ سکتا، ایک پنڈت بھی اسٹاف میں رکھ چھوڑا ہے کوئی برہمن مہمان آ جاتا ہے تو پنڈت جی اس کے مطلب کا شدھ کھانا بنا کے اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے کو تیار رہتا ہے۔"

کھانا ختم کر کے ہم اپنی اپنی کافی کی پیالیوں سے کھیل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے، میں گفتگو کو دھیرے دھیرے بے بی مدھوری کے باڈی کلب کی طرف لانے کی کوشش میں تھا کہ باہر کے ملازموں میں سے ایک خاموشی سے آیا، اس نے کھانے کھلانے والے ایک وردی پوش کے کان میں کچھ کہا۔ وردی پوش نے آہستہ آہستہ میز کی طرف آ کر اور پھر موقع نکال کر اپنے مالک کے کان میں کچھ کہا مالک نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو میرا تجسس بڑھا میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کوئی مجھے سنانے لائق بات ہے؟"

میزبان نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہیں، وہ تمہاری____ مطلب تمہارے دوست والی جیپ کا کوئی قصہ ہے۔"

دیکھنے والے کے لیے میرا رنگ فق ہو چکا ہوگا۔ میں نے چوری کی جیپ ولا میں لا کے کھڑی کر دی اور یہاں مزے سے مہمانیاں کر رہا ہوں اتنا بے پرواہ اور احمق تو میں کبھی بھی نہ رہا تھا۔ میں نے ہکلا کر کہا۔ ”اصل میں وہ جیپ کے بارے میں سردار جی! آپ سے بات بھی کرنی تھی۔“

وہ بولا۔ ”پہلے کھانا تو کھالیں پھر ہو گی سب باتیں کہیں گے، سنیں گے سرکار۔“

”جیسی مرجی جناب!“ کہتا ہوا وہ اٹھا۔ ہم دونوں ولا سے نکل کر لان پر، پھر فوارے کے قریب پہنچ گئے۔ جیپ اسی بے ڈھب طریقے سے ڈرائیو ولا پر کھڑی تھی جیسی میں نے روکی اور چابی لگی چھوڑ دی تھی۔ دور دور تک سناٹا تھا، کوئی ملازم، چوکیدار کہیں نہیں تھا۔

چوری کی ہری جیپ کے پاس پہنچ کے میں نے اپنے میزبان کا سامنا کیا اور سیدھے سبھاؤ کہہ دیا کہ۔ ”سرکار جی! میں نے آتے ہی وہ بات غلط کہی تھی کہ یہ جیپ میرے کسی دوست کی ہے۔ یہ دوست کی نہیں چوری کی ہے۔ میں سرکس کے پارکنگ ایریا سے لے کے بھاگا ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ دشمن میرے پیچھے تھے اور اتنا وقت نہیں تھا کہ مالک سے اجازت لیتا یا لفٹ مانگتا۔“

وہ پوری تقریر سن کے توقع کے مطابق منہ اٹھا کے ہاہاہا کر کے ہنسا۔ ”او یار شیر کھان! تیرے جیسا چلاک نالے بے پرواوی کوئی نہیں۔ یار حد ہی کر دی۔ مجھے بتا دیتا کہ چوری کی ہے تے میں اسی ویلے کوئی بندوبست کر دیتا۔ چلو خیر کوئی گل نہیں۔ ابھی بھی بندوبست کر دیاں گے۔ یار نے چوری کی ہے، سمجھو ہم نے آپی چوری کی ہے۔ بول فیر کیا صلاح ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ادھر ادھر کر دو۔ یہاں سے تو غائب کرواسے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑا ٹھہر کے بولا۔ ”کسے ہور کے علاقے میں رکھوا نہیں سکتے۔ پلس برآمد کر لے گی۔ فیر وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ پڑوسی ہیں۔ ان حد سنگھ کا نام کالا پڑ جائے گا ہاں دوست؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تو ہے۔ سن یار ایسا نہ کریں۔ ہائی وے پر چھوڑ آئیں؟“

ان حد نے گھڑی دیکھی کہنے لگا۔ ”ہم لوگ کی ٹمبر اسٹیٹ والوں کی الگ پرائیویٹ سیکورٹی ہے۔ وہ اب سائڈ کی روڈوں پہ نکل آئے ہوں گے۔ ہائی وے تک

پہنچتے پہنچتے سمجھو چار پانچ پٹرولنگ پارٹیاں ہمیں ملیں گی۔ میری اچھی سلام دعا ہے وہ ٹائم نوٹ کریں گے اس جیپ کو دیکھ لیں گے اور میرے یار شیر کھان تجھے بھی یاد رکھیں گے۔“

میں واقعی الجھن میں پڑ گیا۔ اسے رکھ نہیں سکتے، کہیں چھوڑ نہیں سکتے، حد یہ ہے ہائی وے تک جانا ممکن نہیں ہے۔ وہ جن کی جیپ ہے انہوں نے ٹمبر اسٹیٹوں کی سیکورٹی والوں کو اور بری ہائی وے پولیس کو ظاہر ہے اب تک رپورٹ کر دی ہو گی۔

میں نے پریشان ہو کر آخری انتظام سوچا، پوچھا۔ ”پیچھے ادھر کہیں تمہارے ایریا میں کوئی کھڈ، غار وغیرہ کچھ ہیں؟“

ان حد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”بڑے کھڈ ہیں ان میں ایک کھڈ تو سمجھو پوری ایک ویلی ہے۔“ پھر ہنس کے کہنے لگا۔ ”یہ پنجابی کی ویلی نہیں ہے۔ انگریجی کی ہے۔ ویسے یار شیر! وہ بھی صحیح ہے۔ ہاں نا؟ خالی ویلی؟“

وہ ہاہاہا کر کے اسٹارٹ لینے والا تھا کہ میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سن تو سردار! اسے، جیپ کو لے جا کے کھڈ میں نہ گرا دیں؟“

سردار نے جیپ کی چمک دار پالش پہ ہاتھ پھسلایا۔ ”یار! انی سوہنی گڈی کو اینج برباد کر دیے؟ دل نہیں کردا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ نہیں برباد کی تو دوست سمجھو میں برباد ہو جاؤں گا۔“

”او ناں، او ناں۔ ایہو جی بات سوچنی وی نہیں چائیدی۔ سمجھاوئی شیر کھان! ابھی آپاں بندہ (زندہ) ہیں۔ بربادی کی بات جبان پے وی نہیں لانی چائیدی۔ سمجھا بھائی شیر کھان؟ چل آ!“ یہ کہتا ہوا وہ جیپ کی ڈرائیور سیٹ کی طرف چلا۔ ”آفیر! لا چابی دے۔“

میں نے کہا۔ ”اسی میں لگی ہو گی، پر جانا کدھر ہے؟“

ان حد سنگھ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ”او خوئی یار پچھواڑے کھڈ میں سٹ کے آتے ہیں سوری کو۔“

میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور وہ جیپ کو گھما کے ولا کی گراؤنڈز میں ایک طرف لے چلا۔ ظاہر ہے ولا کا مالک تھا اسے معلوم تھا کہ کہاں سے کدھر نکلنے کا راستہ ہے۔ پانچ سات منٹ میں ہم گراؤنڈ سے نکلنے والے ایک کھلے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ پھاٹک کھلا تھا مگر پائپ کی سرے پر وزن لگا کر کہ بنائی گئی ایک بیریئر راستہ روکے تھی۔ ان حد نے بیریئر

کے پاس جیپ روک دی تو میں نے اتر کر وہ رکاوٹ اٹھادی گاڑی اب ناہموار سطح مرتفع پر نکل آئی۔

اور دس منٹ آہستہ آہستہ جیپ چلاتے ہوئے امیزبان ایسی جگہ لے آیا جو گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے گھبرا کے ان حد سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس نے گاڑی روک دی اور بولا۔ "لو جناب یہ آپ کے ان حد سنگھ کی حد آگئی۔"

جہاں جیپ روکی گئی تھی اس جگہ سے بہ مشکل دس بارہ فٹ دور زمین کی حد تھی۔ آگے خلا نظر آرہا تھا۔ میں نے جاکر دیکھا نیچے ڈیڑھ دو سوفٹ تک اندھیرے میں یا تاروں کی ہلکی روشنی میں اس عظیم الشان کھڈ کی تہ کا شائبہ نظر آتا تھا۔ ان حد سنگھ نے ٹھیک کہا تھا۔ "یہ کھڈ نہیں پوری ایک وادی تھی۔"

میں اس عظیم کھڈ کو محویت سے دیکھ رہا تھا کہ ان حد سنگھ کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔ "پتا ہے شیر کھان! ابھی کیا کرنا ہے؟ یہ دیکھ میں اپناو ہسکی کا پاکٹ فلاسک لے آیا ہوں۔" اس نے پتلون کی پچھلی جیب سے چاندی کی چھوٹی' چپٹی کپی جیسی فلاسک نکال کے دکھائی پھر کہنے لگا۔ "اس کی ساری وہسکی یہ رومال پہ چھڑک کے اپاں سیٹ پہ ڈال دیں گے پھر جیپ کو تھوڑی دور دھکا دے کے وہسکی والے رومال کو آگ دکھا کے بائی جان! گڈی کو آخری دھکا دے دیاں گے۔ ویلی کے تہ تک جاتے جاتے گڈی نے آگ پکڑ لینی ہے۔ سمجھو ڈبل ایکشن ہو جائے گانا۔ نالے ٹٹ جانی ہے' نالے سڑ جانی ہے۔"

وہ یہ سب سمجھاتے ہوئے اپنے سفید بے داغ رومال پہ وہسکی چھڑک رہا تھا۔ اس نے شرارت سے مجھے دیکھتے ہوئے فلاسک سے منہ لگا کے ایک بار چھوٹا سا گھونٹ بھی لیا تھا۔ رومال کو شراب میں تر کر کے وہ میری طرف آیا۔ "لا کوئی ماچس لائٹر کچھ ہے تیرے پاس؟"

"میرے پاس تو نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اوہ یار تو سگریٹ نہیں پیتا اور میں تو ہوں ہی سکھ۔ میرے پاس ماچس کا کیا کام۔ فیر کی کرئے؟ او بھائی! او جرا جلدی آنا۔"

میں نے مڑ کے دیکھا کوئی طاقت ور ٹارچ لائٹ ڈالتا ہوا ادھر ہی آرہا تھا۔

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "ان حد سنگھ جی! یہ سیکورٹی والا تو نہیں ہے؟"

"نہیں یار! شاید اپنا ہی گیٹ مین ہے۔ سیکورٹی والا ادھر کیوں آنے لگا۔"

وہ دو آدمی تھے۔ ایک نے جس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی ان حد سنگھ کو سلام کیا

اور خود اپنے اوپر ٹارچ کی روشنی ڈال کے اپنی پہچان کرائی۔ وہ کسی قسم کی نیلی وردی پہنے ہوئے تھا۔

اس کو دیکھ کر ان حد سنگھ نے اور ساتھ ہی میں نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔

بات ہی ایسی تھی۔ یہ آنے والا بھی سکھ تھا۔

ہنسی رکی تو میرے میزبان نے ٹارچ اٹھاتے ہوئے اپنے گیٹ مین سے ٹھیٹھ سکھوں والی پنجابی میں کہا کہ "اپنے ساتھ والے اس آدمی سے لائٹر یا ماچس لے کے ذرا ادھر آ اور جیپ کو دھکا لگا۔"

گیٹ مین نے شاید عادتاً اپنے ساتھ آنے والے کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اس سے کچھ کہنا شروع کیا مگر میں اب کچھ بھی سننے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

جس چہرے پر ٹارچ ڈالی جا رہی تھی وہ اس ڈرائیور کا چہرہ تھا جسے دہشت زدہ کر کے میں سرکس گراؤنڈ میں بے ہوشی میں پھینک آیا تھا۔ جیپ کا وہ اصل ڈرائیور ٹارچ کی تیز روشنی میں کھڑا بے بسی سے آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں اب تک وہ خوف زدہ تھا۔

میں نے ان حد سنگھ کی بانہہ تھام لی۔ "سردار جی! بات سنو۔ اسی آدمی سے جیپ چھینی تھی۔"

ان حد سنگھ ہنسا۔ "اہو۔ اوتے مینوں پتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" "تمہیں پتا ہے۔ کیسے پتا ہے؟"

سامنے کھڑے خوف زدہ ڈرائیور نے دھیرے سے کہا۔ "یہ صاحب ہی کی تو جیپ ہے۔"

ان حد سنگھ نے بہت غصے سے اسے ڈانٹا۔ "تو چپ کراوئے۔ بھلا توں ادھر کیوں آگیا؟"

سکھ گیٹ مین نے زمین پہ جلتی ہوئی ٹارچ چھوڑ دی اور اپنے ساتھ آئے ڈرائیور کو بازو سے پکڑ کر دور ہٹالے گیا۔

میں نے کچھ شکوے' کچھ کھسیاہٹ میں کہا۔ "تو سردار جی! میرے ساتھ کھیل کر رہے تھے تم؟ پہلے ہی منٹ سے؟ آں؟" وہ ہنسنے لگا۔

میں نے نہ معلوم کیوں شکوے والا لہجہ بر قرار رکھا۔ "یہ جیپ کو آگ لگانے

والا کھیل کرنے بھلا اتنی دور کیوں آئے وہیں کچھ کر لیتے ہاں؟"

یوں لگا جیسے میں نے بات نہ کہی ہو ان حد سنگھ پر ضرب لگائی ہو۔ وہ لرز گیا۔ جذبات سے کانپتی آواز میں بولا۔ "شیر کھان! واہگوروں کی' اس پیدا کرنے والی کی قسم ہے میں کھیل کرنے نہیں آیا۔ اس جیپ کو تو آگ لگانی ہی لگانی ہے۔" پھر اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر طیش میں آواز دی۔ "سن اوئے کتے یا! یہ پچھے پچھے آ کے دوست کے آگے بے اج تی کراتا ہے۔ لاما چس دے مینوں۔"

اسی لمحے مجھے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہو گیا اور میں نے بڑھ کر ادھر آتے ڈرائیور کے ہاتھ سے ماچس چھین لی۔

میرے بہت قریب سے اندھیرے میں سے ان حد کی بے مروتی میں یکسر روکھی آواز آئی۔ "ماچس مجھے دے دو شیر کھان صاحب!"

وہ بہت قریب کھڑا تھا اور وہ بہت ملول تھا میں بڑھ کر ان حد سے بغلگیر ہو گیا۔

"او یار! تجھے مذاق مخول کرنے کا شوق تو بہت ہے پر مذاق سہارنے کی سکت بالکل نہیں۔ ایک فقیرے کا برا مان گیا؟ چل چھوڑ اسے۔ آ ٹہلتے ہوئے واپس چلیں گے۔ بہت مزے کا موسم ہو رہا ہے۔"

مگر وہ سکھ تھا۔ اتنی آسانی سے بات کیوں سمجھتا۔ کہنے لگا۔ "تو نے ابھی ولا کے لان پہ کیا کہا تھا؟"

"وہ خبر نہیں کس بات کا حوالہ دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "تو بتا کیا کہا تھا۔ مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں۔"

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ جیپ کو برباد نہیں کیا تو سردار جی میں برباد ہو جاؤں گا۔"

میں نے دو انگلیوں کے ہک بنا کر اس کی دستار پہ دستک دی۔ "ہیلو' ہیلو کوئی ہے اندر اس کھوپڑی میں۔ یا ٹیک کا برادہ ہی بھرا ہے؟"

وہ ابھی تک آزردہ تھا بولا۔ "مخول ناں کر۔ میری بات کا جواب دے۔"

"اوئے ان حد سنگھ! وہ تو میں نے یہ سمجھ کر کہا تھا کہ جیپ کسی غیر کی ہے۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیری ہے۔ مطلب دوست کی جیپ ہے۔"

"اور کیوں بھلا؟ بھولتا کیوں ہے؟ ولا میں آتے ہی تو نے آپ ہی نہیں کہا تھا کہ یہ دوست کی جیپ ہے میں جواب میں بولا تھا کہ۔ آہو! دوست کی ہے تو خیر ہے۔"

"چل بابا! تو جیت گیا۔ ٹھیک ہے دوست کی ہے یہ جیپ بلکہ میری اپنی ہے۔ بس یہ میری ہے جیپ اور اب میں کہہ رہا ہوں کہ اسے برباد نہیں کرنا ہے۔"

ان حد سنگھ ہنس پڑا۔ "چل تیری ہے اور توں آپی کہہ رہا ہے کہ برباد نہیں کرنا ہے تو پھر نہیں کرنا۔ سن اوئے!" اس نے ڈرائیور کو آواز دی۔ "یہ لے جا گڈی۔ اسی دو وئیں پیدل آ رہے ہیں۔"

آواز ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت نارمل ہے۔ یعنی جس حد تک کوئی سکھ نارمل ہو سکتا ہے۔

میں اور ان حد چل پڑے۔ وردی والا گیٹ مین ٹارچ دکھاتا آگے آگے چل رہا تھا۔

ہم ولا میں آئے تو ان حد کہنے لگا۔ "تیری جیپ کے چکر میں بھرا پیالہ کافی چھوڑ کے جانا پڑا۔ چل کسی کمرے میں بیٹھ کے کافی پئیں گے نالے تجھ سے تیرے دشمنوں کا حال چال پوچھیں گے۔"

میں اپنے دشمنوں کا حال اسے کیا بتاتا' کہاں تک بتاتا بس اس لالچ میں راضی ہو کر چلا آیا کہ سردار جی شروع ہو گیا تو مدھوری بائی کی ادھوری کہانی پوری ہو جائے گی۔

مگر وہ بار بار کوشش کرنے پر بھی قابو میں نہیں آیا۔ وہ مدھوری کے وہ بادی بلڈنگ یا پونے شہر یا اپنی چھاتی کے سوراخ پر بات کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ گھوم پھر کر میرے دشمنوں کی بات کرنے لگتا تھا۔

میں سمجھ گیا وہ اس وقت کافی پی رہا ہے پوری طرح ہوش و حواس میں ہے۔ دوبارہ جب ان حد کی بوتل کھلے گی تو اس کی مدھوری بے بی بھی چھم چھم کرتی آ جائے گی۔

میں نے اسے سانپوں کے بادشاہ ناگی شا کی بیٹی روکسانا اور اپنی دوست رشنا کے اغوا کی پوری کہانی سنائی۔ پوری سے مراد یہ کہ رشنا کے سانپ کی کایا میں ہونے کا حال تو کسی کو بتایا نہیں جا سکتا تھا میں نے یوں کہہ دیا کہ دونوں لڑکیاں اپنے خیمے کی طرف آ رہی تھیں تو میری آنکھوں کے سامنے دو دشمن ہتھیار لے کے آئے' لڑکیوں کو بے بس کر کے اپنی اسٹیشن ویگن میں بھر کے ہائی وے پر نکلے' میں تمہاری ہری جیپ چرا کے ان کا پیچھا کرتا رہا۔ پھر جب تمہارے آدمیوں نے مجھے پکڑنے کو تعاقب شروع کر دیا اور اغوا کرنے والوں کی اسٹیشن ویگن نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں تمہارے آدمیوں سے بچنے

کو بھٹکتا بھٹکاتا ولا میں آ گیا۔

میں نے قبائلی بڈھے بدمعاش جسگے کے بیٹے راحل کی حرامزدگیوں کا حال اور کاکسیز بازار میں میرے والد کے گیسٹ ہاؤس سے شروع ہونے والی پوری سازش ان حد سنگھ کو بتائی کہ کس طرح منافق سلسیل چوہدری اور اس کے گھٹیا بھتیجے بازلر نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا ہے اور اس وقت جب کہ میں برما کے اس خوب صورت ولا میں، ایک محل میں تجھ جیسے دوست کی مہمان نوازی کے لطف اٹھا رہا ہوں میرے والد صاحب میری تلاش میں شاید برما کے یا مشرقی پاکستان کے جنگلوں کی خاک چھانتے پھر رہے ہوں گے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ان حد سنگھ ہنس کر کہنے لگا کہ پچھلے پچیس برسوں میں یہ شاید پہلا موقع ہے جو وہ آدھی رات کے وقت پوری طرح ہوش میں بھی ہے اور جاگا ہوا بھی ہے۔

میں نے کہا۔ "میری کہانی ایسی نیند اڑانے والی تو نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے اپنے لوگ ماں، باپ، بہن اور بھائی کہانی سنے بغیر جاگتے ہوں گے۔ کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے ہوں گے۔"

سردار بولا۔ "سچ لے میں بھائی ہوں اور تیرے لیے جاگتا ہوں۔ ویسے مجھے ان رشتوں کی پوری سمجھ نہیں ہے۔ بس ماتا جی تھوڑی جئی یاد ہے۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں میرے جو بھی تھے دادا ہو رہی تھے۔ پر یار شیر کھان! اندایا (اندازہ) لگا سکتا ہوں کہ تیرے گھر والوں پہ کیا گجر رہی ہو گی۔ پروا نہیں کر جنڑیا! اس کی ادھر برما میں بھی اور کسے ہور جسگے وی طوفان اٹھادیاں گے رب کرے گا تو اب توں سو جا۔ سویرے کی سویرے دیکھی جائے گی۔"

بہت آرام دہ بیڈ روم، بہت نرم بیڈ، دن بھر کی تھکن الگ میں صبح اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے کمرے میں دھوپ گھسی آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کر صبح کاٹ دار ہوا میں سانس لینا چاہا تو بہت مستی میں لہک لہک کر گانے کی آواز سنائی دی۔ دیکھا مغلئی فوارہ چل رہا ہے اور حوض کے مرمریں دائرے پر کچھا پہنے، عورتوں کے نہانے والی ربر کیپ میں اپنے بال چھپائے سردار ان حد سنگھ ترکھان جگنی کی تانیں اڑا رہا ہے کہ ربا خیر کرے جگنی ای، ملوا خیر کرے جگنی ای، مالک خیر کرے۔

میری کھڑکی کا شیشہ چمکا ہو گا تو وہ ادھر متوجہ ہوا۔ فوارے کی پھوار میں ہاتھ

لہرا لہرا کر مجھے صبح کا سلام کیا اور اپنی جگنی میں ایک لائن میرے جاگنے کے بارے میں جوڑ دی۔ "شیرا جاگ پیا جگنی ای، آپ آئی جاگ پیا جگنی ای، مالک خیر کرے۔"

آدھے گھنٹے میں نہا دھو کے، دن کے کپڑے پہن کے ہم ناشتے کی میز پہ آ گئے تھے۔ ان حد نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پنجابی دوستوں کی طرح صبح ہی صبح نمکین لسی پی پھر کچھ اور کھایا میں پٹھان بھائی گوشت کے بغیر مزہ نہیں آتا۔ مونجور میاں چیف کک نے مجھے چکن تکہ بنا دیا ساتھ میں دو انڈوں کا آملیٹ اسے بھوسی ملے گیہوں اور مکئی کے آٹے کی سخت ڈبل روٹی ساتھ میں کافی یہ ناشتہ کرایا۔ ہم دونوں دوست اب صبح کے چیلنج کا سامنا کرنے کو ہر طرح تیار تھے۔

ناشتے سے اٹھ کر آئے تو دیکھا کہ ولا کے مرکزی ہال اور لاؤنج میں جنگی کونسل اکٹھا ہے۔ سردار ان حد سنگھ ترکھان کے سب ملازم، مونجور میاں بنگالی تک پورے کٹ میں حاضر تھے۔

"یا وحشت!" میں نے اپنے میزبان سے پوچھا۔ "یہاں یہ سب کیوں جمع ہیں؟"

کہنے لگا۔ "حاجری لگا کے کام کے بندوں کی چھانٹی کراں گے۔"

"پھر؟"

"فیر آپاں سارے ہی نکلیں گے۔ روکسانے بی بی تے رشنے بی بی کو تلاش کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی! روکسانا بی بی اور رشنائی بی کو کسی ظالم قلعے دار نے اپنے قلعے گڑھ میں بند نہیں کیا ہو گا جو ہم لشکر لے کے اسے چھڑانے جائیں گے۔"

"اویار، سدھی جیسی بات کو تو الجھا کیوں دیتا ہے؟ آپ ای سوچ۔ کیا ہم دو آدمی دشمن کے مقابلے کو کم نہیں پڑیں گے؟ کیا پتا وہ کتنے کی نفری کے ساتھ بیٹھے ہوں۔ ہمیں آدمی تو ساتھ رکھنا ہی پڑے گا نا۔"

میں نے کہا۔ "کتنے کی نفری لے کے بیٹھے ہوں؟ او بھائی تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہیں بیٹھے ہوں گے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے ابھی جاگ رہے ہوں، ملک سے نکل گئے ہوں، ساری رات ملی تھی ان کو اور گاڑی ان کی جیسی ٹینک کی ٹینک۔ رات بھر بھی چلتی رہے تو بھی پروا نہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ہالا" بتا فیر تیری کیا صلاح ہے؟"

"میری صلاح یہ ہے میرے دوست! کہ پہلے تو تو ان سب لوگوں کو اپنی اپنی

ڈیوٹی پہ واپس بھیج۔ بہت ہوا تو اپنے ساتھ ڈرائیونگ کی شفٹ لگانے کو ایک آدمی لے لے‘ وہ موقع پڑنے پر اوپر کے کام کر دے گا ہمیں کھلا پلا دیا کرے گا۔ ہم دو اور وہ ایک مددگار۔ بس یہ تین بندوں کا مشن ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔ ”تو ایسا کرتے ہیں وہی بندہ جس سے تو نے اپنی جیپ حاصل کی تھی اسے ساتھ لے لیتے ہیں۔ آدمی ٹھیک ہے میں نے راتی ایویں بے کار میں اس کو گالیاں نکالی تھیں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اسے روکو۔ باقی سب کو جانے دو اور سنو اس ڈرائیور کی ضرورت بھی گھنٹے بھر بعد پڑے گی۔“

پوچھنے لگا۔ ”گھنٹے بھر تک اسیں کیا کرتے رہیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”سوچیں گے اور سراغ اٹھائیں گے۔“

ہم دونوں نے واقعی بہت سا وقت سراغ اٹھانے اور سوچنے میں لگا دیا۔

ان حد سنگھ کو ایک بار لائن نظر آ جائے پھر وہ اس پر جی جان سے چل پڑنے والا آدمی تھا۔ میں نے سراغ لگانے کی جو بات کہی تو اس نے اپنے ایک برمی دوست کو فون کر کے بلا لیا جو ٹمبر اسٹیٹ والوں کی پرائیویٹ سیکورٹی فرم میں چیف سیکورٹی افسر تھا۔

ہم تینوں آدمی برما کی سڑکوں کا نقشہ لے کے بیٹھے۔ میں نے سیکورٹی والے کو نقشے میں وہ جگہ دکھائی جہاں اغوا کرنے والوں کی اسٹیشن ویگن سرکس گراؤنڈ چھوڑ کر ہائی وے پر آئی تھی پھر جہاں تک وہ گاڑی مجھے نظر آ رہی تھی اس پوائنٹ کی نشاندہی کر کے باقی کام ہم نے سیکورٹی والے پر چھوڑ دیا۔ اس نے اسٹین ویگن کا میک اپ ماڈل رنگ اور دوسرے نشانات نوٹ کیے پھر نقشے میں دیکھ کر اس نے ان مختلف جنگلاتی علاقوں کی فہرست تیار کی جن سے ہو کر فراریوں کی یہ ویگن گزر سکتی تھی۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈا اور پھر دوسرے نمبر پر آنے والے ریلوے اسٹیشن اور ائرڈروم وغیرہ کے نام لکھنے کے بعد اس نے ایک اعتبار سے تفتیش کے لیے کیس اچھا خاصا تیار کر کے ہمارے سپرد کر دیا۔ پھر وہ ولا کے ڈرائیور وے پر کھڑے اپنے ہاف ٹرک گاڑی کے وائرلیس پر اس نے اپنے ماتحت سیکورٹی والوں کی کوئی چونتیس پینتیس چوکیوں سے جو اس بھاگنے والی اسٹیشن ویگن کے راستے میں آتی تھیں رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم ناشتے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ولا سے چل پڑیں گے مگر وائرلیس پر بات

کرتے اور متوقع دونوں راستوں اور ان ٹمبر اسٹیٹوں کے نام اور فون نمبر اکھٹے کرنے میں دوپہر ہو گئی کہ جن اسٹیٹوں کے علاقے سے مفرور اسٹیشن ویگن گزر گئی تھی۔

کسی سیکورٹی پوسٹ سے یہ خبر نہ مل سکی کہ اس حلیے کی اسٹیشن ویگن گزرتی دیکھی گئی ہے۔

ہم نے سیکورٹی ماہر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانا کیا کھایا گیا تمام عرصے مختلف امکانات پر بحث ہوتی رہی۔ فرار ہونے والے ماہر بدمعاش تھے۔ انہوں نے گزرتے ہوئے نہ شہادتیں چھوڑی تھیں نہ کوئی نشان۔ چیف سیکورٹی والے کا خیال تھا کہ وہ چونتیس پینتیس چوکیاں جہاں سے نہیں نہیں کا جواب آیا ہے سادھوؤں‘ ولیوں اور خاصان خدا کی چوکیاں نہیں ہیں کہ بالکل حق بات کہہ رہی ہوں یہ قطعی ممکن ہے کہ اغوا کرنے والے ان چوکیوں میں سے بعض کے علم میں لا کر گزرے ہوں اور پیسے بانٹتے ہوئے گزرے ہوں۔ آخر اسمگلروں کا کاروبار بھی تو اسی طرح چلتا ہے۔

سیکورٹی والا ہمارا کام بہت آسان کر کے چلا گیا مگر آسان ہونے کے بعد بھی اتنا کام تھا کہ ہم دونوں دوست دیوانہ وار جتے رہتے اور کئی دن کام کرتے تب ہی کوئی صورت کامیابی کی نظر آ سکتی تھی۔

روانہ ہونے کے لیے کسی فوجی مہم کی طرح کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ ان حد سنگھ کی لائسنس والی رائفلیں اور پستول‘ کئی دن کا راشن ایک خیمہ‘ کئی جوڑے کپڑے‘ پانی اور شراب حد یہ ہے کہ فرسٹ ایڈ کا سامان تک ہماری دو جیپوں پر لدا ہوا تھا۔

چلنے سے پہلے ہم نے اس برمی سیکورٹی چیف کے تیار کیے ہوئے کیس کے کاغذات کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔

ٹمبر کے جنگلات‘ کارخانوں اور کاروبار کی پانچ بڑی اسٹیٹوں میں ہمیں فراریوں کو تلاش کرنا تھا یعنی انہیں ان سے متعلق کسی خبر کا سرا تھام کر آگے چل پڑنا تھا۔ پانچ اسٹیٹس‘ میلوں کے علاقے میں پھیلی ہوئی جائیدادیں۔ وہ ایک طرح کی پانچ خاصی آزاد ریاستیں تھیں بالکل اسی طرح جیسی سردار ان حد سنگھ ترکھان کی اپنی چھوٹی سی ریاست سمجھئے۔

ٹمبر کی پہلی جنگلاتی جائیداد جس میں جا کر ہمیں سراغ اٹھانا تھا ان حد کے ہمسائے موگنگ صاحب کی اسٹیٹ تھی۔ کوئی نو میل کے شارٹ کٹ سے گزر کر یہ جنگلاتی جائداد آ جاتی تھیں۔ ان حد سنگھ بولا۔ ”یار موگنگ صاحب میرے سے اتنا قریب

ہے کہ سمجھو ہر ویلے ڈھیلے سے ڈھیلا بھڑائے ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے ہیں۔ موتگ صاحب تمبا کو پیتا ہے تو میرا ساہ بند ہونے لگتا ہے اور میں پیاز کھاتا ہوں تو موتگ کی حالت بری ہو جاتی ہے۔ اتنے قریب ہیں ہم لوگ۔"

موتگ کی جائداد کے بعد ایک بنگالی مسلمان زوبر میاں سہلٹ والا کی اسٹیٹ تھی۔ زوبر میاں کبھی عید، بقر عید ان حد کو مٹھائی بھیجتا تھا۔ اور اسے شراب چھوڑنے پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔ اس کوشش میں بھی تھا کہ ان حد کو مسلمان بنا لے۔ آدمی بہت شریف تھا۔

زوبر میاں سے ملی ایک زبردست نامی برٹش آرمی کے کسی ریٹائرڈ میجر چارلس پائن وڈ کا جنگلاتی علاقہ تھا۔ یہ بہت باضابطہ، بہت جھکی بلکہ کریک قسم کا بیوپاری تھا۔ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر پیسا کمانے ادھر آگیا تھا۔ پہلے ہر کرسمس پہ ان احد سنگھ کو بلایا کرتا تھا اور ان حد سنگھ ٹال جاتا تھا آخر ایک کرسمس پہ سردار جی نے اس کی دعوت قبول کر لی اور پی پلا کے وہ کچھ کیا کہ میجر پائن وڈ نے اپنے دو تین درجہ دور اپنے اس ہمسائے ان حد سنگھ کو پھر کبھی دعوت نہ بھیجی ہیلو ہیلو تک بند کر دی۔

ان حد سنگھ نے بڑے ڈھیٹ پن سے ہنستے ہوئے بتایا کہ اس واقعے میں اس سے زیادہ میجر صاحب کی سینتالیس سالہ ہمشیرہ کا قصور تھا۔ یا شاید خود ان حد کا بھی اتنا ہی قصور ہو گا جتنا میم صاحب کا دونوں ہی بری طرح دھت تھے۔ میجر کی ہمشیرہ نے پہلے تو ان حد کو "کڈی" اور "مائی لٹل سکھ" اور "لٹل برادر چالی کا لٹل نے بر" یعنی ننھا ہمسایہ کہنا شروع کیا اور خوب پیے ہوئے ان حد کو اپنے بھائی چارلس پائن کی لڑکپن کی تصویریں دکھانے اوپر کمرے میں لے گئی تو ظاہر ہے ان حد اتنا بدتمیز نہیں تھا کہ جانے سے انکار کر دیتا پھر وہ اپنے بیڈ سائڈ ٹیبل لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں ان حد کو تصویریں دکھانے لگیں۔ اتنی ہلکی روشنی میں ٹھیک سے نظر کچھ نہیں آتا تھا تو دونوں کو قریب ہو کے خوب جھک جھک کر دیکھنا پڑتا تھا پھر البموں کے ورق لڑنے اور البم سنبھالنے کے لیے بھی چارلس کی ہمشیرہ کو تقریباً ان حد کی گود میں لیٹ جانا پڑتا تھا پھر پتا نہیں کیسے البم مکس اپ ہو گئے اور اب جو اگلا البم ان حد نے کھولا تو "لے بھئی حد ہی ہو گئی۔" پتا نہیں کن انگریزوں مردوں، عورتوں کی تصویریں تھیں جنھیں چارلس کی لٹل بگ سسٹر بھی نہیں پہچانتی تھی مگر کیوں کہ تصویریں دلچسپ تھیں اور کئی کئی طرح سے تھیں اور ان میں دکھائے گئے جوڑے نہ معلوم کیا کیا کر رہے تھے جسے سمجھنا بہر حال ضروری تھا اس لیے دونوں دیکھنے

والوں کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔

بہت دیر ہو گئی تھی آخر کار جب محتاط بھائی چارلس نے دونوں کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجنے کی بجائے خود اوپر تک آنا مناسب سمجھا اور آکر اندھیرے گھپ کمرے کی بتی جلائی تو ان حد سنگھ کا نشہ واقعی ہرن ہو گیا۔ جیسے تیسے وہ اپنا سوٹ بوٹ سنبھال کر دیوار پھاند کے بھاگا۔ اس گڑبڑ میں سوٹ یک جا نہ رہ سکا۔ کوٹ میجر چارلس پائن وڈ کی اسٹیٹ میں ہی رہ گیا۔

ان حد سنگھ کو مجھے یہ سب سنانے کے بعد فکر سی ہو گئی تھی کہہ رہا تھا۔ "یار پائن وڈ اسٹیٹ میں گھسنا مشکل ہو گا۔ چرلس پہلے گولی مار دے گا پھر بات کرے گا۔"

پائن وڈ اسٹیٹ کے بعد ہماری سراغ رسانی کی ترتیب میں چوتھی جائیداد بلی صاحب کی تھی۔ یہ بلی صاحب اصل میں ولیم برانٹ تھا۔ آدھا انگیز آدھا برمیز۔ ان حد سنگھ نے بتایا بلی کے اسٹاف میں بعض بین الاقوامی قسم کے جرائم پیشہ لوگ شامل تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بلی صاحب نہ صرف ٹمبر کے بہت بڑے بیوپاری تھے بلکہ رنگون میں ان کا بہت بڑا لائسنس یافتہ جوئے خانہ بھی چل رہا تھا۔ ایک جوئے خانہ ہانگ کانگ میں بھی تھا۔ رنگون کا اسٹاف ہانگ کانگ اور وہاں کا رنگون تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ ان حد بتانے لگا کہ اسٹاف میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں، لڑکیاں بھی۔ ٹمبر کے بڑے حلقوں میں سبھی کو معلوم تھا کہ ولیم برانٹ کی یہ زنانہ فورس اس کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ جوئے خانے کی اندھی آمدنی کے ساتھ ساتھ جیٹ طیاروں سے آنے والے ٹورسٹ بلی برانٹ صاحب کی وردی پوش بلبلوں پر جنھیں میزبانوں کا باعزت نام دیا گیا تھا۔ بھاری رقمیں ڈالر، پاؤنڈ، مارک، فرانک اور ین کرنسیوں کی صورت میں خرچ کرتے تھے۔ برانٹ کے یہ دو مہنگے قحبہ خانے حکومتوں کی مرضی اور لائسنس سے چل رہے تھے۔ برما میں اڑوس پڑوس کی ٹمبر جائدادوں والے اس برانٹ اسٹیٹ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ صرف ان حد سنگھ سے بھائی برانٹ کے بوتلوں کے کریٹوں کے تعلقات تھے۔ وہ ہانگ کانگ سے اعلیٰ درجے کی شرابیں اور بیشتر بیئر وغیرہ ان خد کے لیے منگاتا اور ان حد جسے ٹرکی پالنے کا شوق تھا، زندہ اسے جھٹکا کیے ہوئے، فریز کیے ہوئے ٹرکی برانٹ صاحب کو تحفے میں بھیجتا رہتا تھا۔

وہ ہنس کر مجھے بتانے لگا کہ میں نے اڑا رکھا ہے کہ میں ان ٹرکیوں کو بادام چگاتا ہوں اور یہ کہ ان کا گوشت مردانہ قوت بڑھانے میں بے مثال ہے۔ بتانے لگا کہ ٹرکی تو

پولٹری خاندان میں چکن سے زیادہ بے وقوف برڈ ہوتی ہے اسے ابلے ہوئے کابلی چنے اور بھیگے ہوئے باداموں کا فرق کوئی نہیں معلوم۔ زندہ ٹرکی میری اسٹیٹ سے چنے کھاتی ہوئی جاتی ہیں اور برانٹ کی جوئے اور عورتوں کی کمائی سے خریدی باداموں پہ اسی رغبت سے ٹوٹ پڑتی ہیں۔ برانٹ صاحب ان کا گوشت کھا کھا کے اپنی وردی پوش ملازماؤں بلکہ بے پوشش میزبانوں پہ ٹوٹ پڑتا ہے اور سویرے ہی سویرے فون کھڑکھڑاتا ہے کہ ان حدمین! ٹمارا ٹرکی میجک تھا۔ میجک۔ "اصل میں اس کی میزبانیں جادو میجک میں سورے کو اوپ یم پے لگا رکھا ہے۔"

میں نے سوچا اگر یہ سب کچھ ہے تو ولیم برانٹ کی اسٹیٹ ہماری سراغ رسانی کی خاصی اہم منزل ہو سکتی تھی۔

پانچویں اور آخری اسٹیٹ جہاں سے ہم مفرور اغوا کرنے والوں کا سراغ اٹھا سکتے تھے۔ بریگیڈیئر تھاپا کی اسٹیٹ تھی۔ بریگیڈیئر نیپالی نہیں تھا' بہار کا جھابا تھا۔ پورا نام سریندر ناتھ رگھوویر پرشاد جھابا تھا مگر بعد میں اس نے مناسب تبدیلی کر لی تھی۔ اس نے وکٹوریہ کراس کا بہادری کا سب سے بڑا برطانوی اعزاز پانے والے تھاپا نام کے گورکھے سے اپنا جھوٹا سچا تعلق ظاہر کرنے کو فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد یہ تبدیلی کی تھی۔ اسی لیے پنشن بک وہ ہر کسی کو دکھاتا نہیں تھا۔ اپنے بعض لیٹر ہیڈز پر اور کوٹھی کے گیٹ پیتل کی پلیٹ پر اس نے اپنا نام لکھوایا تھا۔ بریگیڈیئر (ر) سریندر ناتھ رگھوویر سنگھ تھاپا ای آئی او آر ایف ڈی وغیرہ وغیرہ تھاپا صاحب بہت اچھی اردو بھی جانتا تھا اور ان حد کو اپنا پورا نام برگیڈیر سریندر بھاگلپوری بتاتا تھا اگر سردار جی کو گھیر گھار کے اپنی "پاگلوں جیٔ' غزلیں بھی سناتا تھا۔

ان حد کہنے لگا۔ "اس نقلی تھاپے' جعلی سنگھ' جھوٹے تاباں پاگل پوری کی اسٹیٹ میں ہماری بڑی مہمان داریاں ہوں گی۔ بریگیڈیئر خود کچن میں جا کے اپنے ہاتھ سے حلوے شلوے بنا کے لائے گا کھلائے گا مگر ایسے سمجھ لے بھاجی! جیسے ہی اسے پتا لگے گا کہ تو مسلمان بھائی ہے اور پشوری ہے تو فیر روئی اس نے چڑی گانٹھ لینی ہے۔ کلام اپنا سنا سنا کے تیرا ابولوئی رام کر دینا ہے۔"

سیکورٹی والے کی بتائی ہوئی حکمت عملی اور نقشوں' چارٹوں اور یادداشتوں کے ساتھ ہم سہ پہر کے وقت دو جیپوں میں نکلے اور کسی باضابطہ سڑک کی بجائے شارٹ کٹ سے مونگ اسٹیٹ کی طرف چل پڑے۔ سردار نے پھر یاد دلایا کہ مونگ اسٹیٹ

صرف نو میل آگے ہے۔

چلنے سے پہلے میرے میزبان نے مونگ صاحب کو فون کر دیا تھا کہ میرا یو کے سے آیا ہوا دوست خان صاحب' لمبی ہائی کنگ پر میرے ساتھ نکل رہا ہے۔ ہم دونوں آپ کی اسٹیٹ پر کچھ دیر رکیں گے۔ مونگ صاحب روایتی برمی مہمان نوازوں کی طرح پہلے تو خوش ہو کر خوش آمدید اور شکریہ آپ کا' بہت مہربانی کہنے لگا پھر ان حد کے لفظوں پر کچھ دیر پرخلوص میں حجت کرنے لگا کہ مونگ اسٹیٹ تو سنگھ صاحب آپ کا سیکنڈ ہوم ہے۔ یہ دوسرا گھر ہے آپ کا میں ایک رات تو ضرور آپ دونوں کو روکوں گا ہر حال میں پھر جب ان حد نے وقت کم ہونے کا عذر پیش کیا تو مونگ نے کہا۔ "ٹھیک ہے رات کے کھانے کے بعد آپ دونوں کو جانے کی اجازت ملے گی' اس سے پہلے نہیں۔"

ہماری جیپ پہلے ان حد سنگھ چلا رہا تھا اور ڈرائیور دوسری جیپ میں سامان بھرے پیچھے آ رہا تھا مگر شام کے سائے پھیلتے دیکھ کر ان حد سنگھ نے نعرہ لگایا۔ "جو بولے سو نہال" اور کہنے لگا۔ "لو جی کھاں صاحب! اب آپ اسٹیئرنگ سنبھالو اور ڈرائیور والی جیپ کے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔ اسیں تے اپنی کھرافات شروع پئے کرنے آں۔" اس کی یعنی شراب نوشی کا وقت آ گیا تھا۔

یہ خرافات کا لفظ میرا دیا ہوا تھا۔ ان حد کو بہت پسند آیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میری ایک ریگولر رکھیل امبر سر کی رہنے والی ہے۔ اُسے اردو جبان سے اور مجھ سے بڑا پیار ہے۔ اگلے ویک اس نے رنگون سے ادھر آنا ہے' محبتاں کرنے۔ جب وہ آئے گی تو چھا بعد وچ لیاں گے اسی اونوں یہ لفج' کھرافات سناواں گے کہ دیکھ وئی اسی وی اردو اچ چل پئے نیں۔"

میں نے کہا۔ "چل پڑے کیا مطلب' تم اردو میں پہلے سے چالو ہو۔" ان حد یہ سن کر خوب ہنسا۔

مونگ صاحب کا علاقہ چار ساڑھے چار میل رہ گیا تھا۔ یعنی ان حد اور مونگ کی جنگلاتی جائدادیں تقریباً درمیانی فاصلے پر تھیں۔ جب میرے میزبان نے چھوٹے پڑاؤ کا اشارہ کیا۔

اس نے جیپ سے اتر کر برابر کے ٹیلے کی ایک ہموار چٹان پر پانچ منٹ ریسٹ کیا۔ بوتل کھول کر اپنے لیے ایک پیگ بنایا اور پہلا گھونٹ لے کر بولا۔ "چلو بھائی صاحب

اب آپ گاڑی سنبھالو۔"
میں نے کہا۔ "کیا یہ کوئی ٹوٹکا تھا جو بھائی صاحب آپ گاڑی سے اتر کر کچھ دیر یہاں بیٹھے ہیں اور پیگ بنایا اور گھونٹ لیا ہے؟"

کہنے لگا۔ "ٹوٹکا نہیں ہے آج اس چٹان کو یادگار چٹان کا سٹے ٹس۔ وہ کیا بولتے ہیں اردو میں؟ درجہ 'یادگاری درجہ دے دیا ہے۔ آج کے پیچھے جبھی بھی اس جگہ سے گجرنا ہووے گا ان حد سنگھ دو ترے منٹ اس چٹان پہ جرور بیٹھ کے شیر کھان کو یاد کرے گا فیر آگے چلے گا۔"

میں ہنسنے لگا تو ان حد سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ "آپ بھائی صاحب! کیا سمجھ رہے ہو کہ دو گھونٹ میں چڑھ گئی ہے۔ نہیں کھاں صاحب! ہم ترکھان ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے والے بندے دوستی مشکل نال کرتے ہیں پر جب کرتے ہیں تو ایہو جی پاگل دوستی کرتے ہیں۔ آپ دیکھ لینا۔ جندہ رہ گئے ان حد سنگھ جی تو دیکھ لینا اپنے دوست کو اور اس یادگاری چٹان کو یاد رکھاں گے مالک کے فضل سے۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اسے نشے میں نہیں سمجھ رہا۔ وہ تو مذاق میں ایک بات کہی تھی اور یہ کہ مجھے پورا اطمینان اور یقین ہے کہ میرا دوست ان حد سنگھ مجھے یاد رکھے گا۔

"ہا آں۔" ان حد نے خوب لمبا کر کے اور لہرا کے ہاں کہا۔ وہ اب تک بوتل سے براہ راست چار گھونٹ لے چکا تھا۔ "ہا آں میرے یار شیر کھاں! تو دوست پہ بھروسا کرتا ہے۔ بالکل ٹھیک آدمی ہے۔ اس بے بی مدھوری جیسا بے یقینا نہیں ہے۔"

ان حد پر اب چڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے مدھوری بائی پونے والی کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اب سردار جی اپنی سینے کے گھاؤ بلکہ چھاتی کے سوراخ کا ذکر کریں گے۔ خود بہ خود کریں گے اب کچھ پوچھنے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے سامنے جاتی سامان کی جیپ اور رستے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ ان حد سنگھ کے ریمارک پر کچھ نہ کہا۔ وہ آدھے منٹ چپ رہا پھر بولا۔ "توں پچھیں گا۔ "بے یقینا" اور "بے بھروسی" کون ہوتا ہے۔ تو لے سن بے بھروسی ہے بے بی مدھوری جسے ان حد پہ اتنا جرا سا بھی وشواس مطلب بھروسا نہیں تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسے؟"

ان حد نے چیخ کر اتنی زور سے کہا۔ "لو بھائی جی کہتا ہے کیسے۔" اس کی آواز سن کر آگے چلتی جیپ کے ڈرائیور نے مڑ کے دیکھا۔ ان حد آگے بولا۔ "میں بتاؤں کیسے بھروسا نہیں تھا مدھوری بائی کو؟ وہ کیسے بے بھروسی تھی۔"

"میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاں میں سر ہلایا۔

"پہلی بات تو یہ کہ جنانیوں کے باڈی بلڈنگ کلب میں وہ اپنے ان حد کو لے کے جا رہی تھی تو بھائی جی اس نے ان حد کو ورانڈے میں ہی کیوں روک دیا؟ بولو؟ بولو بولو بولو؟"

میں نے کہا۔ "او بھائی وہ خود بھی تو تیرے ساتھ ورانڈے میں رک گئی تھی۔ تو اکیلا نہیں روکا گیا تھا۔"

"ہاں یہ پوائنٹ صئی ہے۔ اچھا جی تو فیر آگے سنو۔" سردار کی رکی ہوئی ریل گاڑی آپ ہی آپ آگے چل رہی تھی۔ "جبی اس جرسی نیکر والی موٹی کو اٹر ماسٹر حوالدار عورت نے مدھوری بائی کو بولا کہ اندر سب جنانی ڈھکیلی ہے 'صئی ہے تو میرے کو کھاں صاحب! بڑی ہنسی آئی مگر اپنی مدھوری بے بی نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی کہ ____"

مجھے مدھوری بائی کا فقرہ یاد تھا۔ میں نے اس کی ریل گاڑی تیز چلانے کے خیال سے لقمہ دیا۔ "ہاں وہ انگریزی میں تجھ سے کہنے لگی کہ سردار جی میں نے تیرا ہاتھ پکڑوانے کا شوق بھی پورا کر دیا۔"

"ہاں۔" ان حد نے خوش ہو کے یاد کیا۔ "میں بولا ہور ویکھو میرے کون کون شوق پورے کراؤ گی جانم۔"

اس دفعہ اس نے جانم کا لفظ بڑھا دیا تھا مگر میں نے ٹوکا نہیں۔

"تو جانم! کون کون شوق پورے کراؤ گی؟ اس نے کھاں صاحب! جواب نہیں دیا۔ میرا ہاتھ دبا دیا۔ یہ کوئی آپسی اشارہ ہی ہوگا۔ خیر جی اس دو ہی بندے برآمدے سے گجر آئے تھے۔ وہ نیکر والی موٹی ساتھ نہیں تھی۔ تیرے کو عجیب بات بتاؤں شیر! مجھے جنانی باڈی بلڈنگ کلب میں آئے پانچ سات منٹ سے جیادہ ہو گئے تھے اور پورے ٹائم میں بھائی صاحب! ہم کو 'ان حد سنگھ جی کو دو سور جیسی شکلوں والے گورکھے اور ایک مج____ مج جانتے ہو بھائی جی۔" میں نے کہا کہ ہاں بھینس کو کہتے ہیں تو بولا۔ "ہاں جی ایک مج نیکر جرسی پہنے نجر آئی تھی بس جنانی کوئی وی نہیں وکھی تھی۔ واہگرو کی قسم جنانی کوئی نہیں دکھی تھی۔"

میں نے کہا۔ ''قسم کیوں کھاتا ہے اور چیختا کیوں ہے؟ مگر صحیح کہہ رہا ہے تو بھائی بات ایسی ہی تھی۔''

''خیر جناب ایک بند درواجے کے سامنے گجر رہے تھے تو ان حد سنگھ جی کو ایک جنانی کے کرلانے کی اواج آئی۔ ایج لگدا تھا کوئی جنانی مشقت میں ہے۔ میں سمجھا کوئی بندہ بے چاری کو ستا تو نہیں رہا۔ مطلب اس کے ساتھ جور جبر دستی کرتا ہو۔''

''کس کے ساتھ؟'' میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

''او بھئی نامعلوم جنانی کے ساتھ۔ جس کی اواج تکلیف کی آرہی تھی۔ خیر میں نے اپنی مدھوری بے بی کا ہاتھ دبایا۔ ہور جور سے دبایا اور پوچھا بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ایک ذرا لمبا گھونٹ لینے کو چپ ہو گیا۔ میں سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتا رہا۔

''میں پچھا جانم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون کتا عورت پہ ____''

میں نے پوچھا۔ ''کتا کہاں سے آگیا۔''

وہ چڑ گیا۔ ''کہیں سے وی نہیں آیا یار۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ کوئی سور کسی جنانی کے اوپر مطلب ____ جلم کرتا ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ درواجے کو کھلوا کے انکوئری کرنا جروری تھا۔''

میں نے قہقہہ مارا۔ ''تم بڑے چنٹ ہو۔ اس بہانے اس اندر والی جنانی کو تاکنا چاہتے تھے۔ بڑے چنٹ ہو۔''

ان حد نے مجھے آنکھ ماری۔ ''سمجھا کرو شیر کھان! پوائنٹ یہی تھا آپ کے ان حد سنگھ چنٹ کا مگروئی میں نے دوسرے زاویہ سے مدھوری کو سمجھایا۔ وہ بولی ڈونٹ بی سلی۔ مطلب کھوتے جی بات مت کرو۔ وہ تو اندر ایکسر سائج ہو رہی ہے۔ لے بیڑا گرک! میں نے کہا تو بھول گیا تھا ادھر ڈنٹر بیٹھک اکسر سائج ہوتی ہے۔ تو اسی میں جنانی کے کرلانے کی اواج آرہی تھی۔ مدھوری بولی تیرے کانوں میں اور کھوپڑی میں بدمعاشی ہے۔ سدھا چلتا رہ۔ کدھر بھی نہ دیکھ، نہیں کج وی نہیں سن۔''

ان حد کے بیان میں نشے کے شروع میں جو بے ربطی آجاتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ وہ مزے لے لے کے اپنا قصہ بیان کر رہا تھا۔

''اچھا جی۔ آگے کی سنو۔ آگے جی اشٹیل کے سفید پینٹ کیے ہوئے درواجے تھے۔ ایک لائن میں کوئی دس بارہ درواجے اور جی ان میں سے بہت سے

درواجوں کے پیچھے سے ایسی اواج آرہی تھی جیسے جی امبر سر ریلوے جنکشن کے یارڈ میں بھائی صاحب اسٹیم انجن آرام کرتے ہوں۔ لو جی اواج بھی وہی آرہی تھی نالے اس کے ساتھ ساتھ اسٹیم کے بادل جیسے پیچھے سے برابر اٹھ رہے تھے۔ گرم بادل اور انجن کی گرم اواجیں۔ ہاں جی میں نے دھیرے سے پوچھا۔ مدھوری بے بی یہ پونے کا ریلوے جنکشن تو نہیں آگیا؟ وہ ہنسی جناب موتیاں ورگے دند نجر آئے ادھر میں نے دل میں واج ماری کہ جو بولے سو نہال! پر بھائی شیر کھان! اسی ٹائم اسی سے ایک ہور بات ہو گئی۔''

یہاں ان حد سنگھ اپنی بات کا ڈراما بڑھانے کو رکا۔ بوتل سے الجھ گیا۔

فارغ ہوا تو بولا۔ ''واتوں شیر کھان صاحب! ایک ہور بات ہو گئی۔ کوئی کالی سی خوشبودار چڑیا جیسی سینٹ میں ہور پسینے میں تربتر پھڑپھڑاتی ہوئی اندر اسٹیم انجنوں کی سائڈ سے اڑتی ہوئی آئی اور جناب باہر اسٹیل کے سفید پینٹ کیے ہوئے درواجے پے گر گئی۔ اوئے! اے کی ہو گیا وئی۔ میں کبرا گیا۔ پر دل کڑا کر کے دیکھا تو جناب اسٹیل کے درواجے پر کوئی چڑیا شڑیا نہیں پڑی تھی جنانیوں کا لیڈیز بریج پر مطلب باڈی باڈی۔ وہ لٹک رہی تھی مدھوری کے سے، نالے ہنسی سے وی بولی۔ ''تم باج نہیں آؤ گے سردار؟ یہ اسٹیم باتھ کا ایریا ہے۔ کوئی انجن شنٹنگ نہیں کر رہے۔ جنانیاں برجشن ایکسر سائج کر کے اشٹیم باتھ لے رہی ہیں۔ توبہ میں نے کہا مدھوری! میں وی کتنا بے وقوف ہوں۔ آخر کو وہ ہوں۔''

میں نے لقمہ دیا۔ ''سکھ؟'' ان حد سنگھ۔ نے خوش مزاجی سے ہاں میں سر ہلا لایا۔

''خیر جناب! اس پونے ریلوائی جنکشن کے شنٹنگ یارڈ سے گجر کے آگے نکلے۔ مدھوری بے بی سختی سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ بے بی مدھوری جو ہاتھ پکڑے ہیں تو اس میں کوئی اپناپن کوئی گرمائش ہے پریم کی مگر جناب والا! وہ تو شاید اس طرح میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جڑے چل رہی تھی جیسے جاٹ اپنے بیل کی ناک میں کڑا ڈال کے چلتا ہے کہ جب کبھی بیل سورے نے اچھل کود کی تو فٹافٹ رسا ڈال کے کھینچ لینا ہے۔

اور میرے بھائی ایک موقع آ وی گیا کڑے۔ میں رسا ڈال کے کھینچنے کا۔ مطلب مدھوری بائی نے اپنے ہاتھ کی پکڑ سے اور کج اپنی باڈی بلڈنگ کی ٹریننگ سے آپ کے اس ڈنگر کو روک لیا نہیں تو بھائی جی کوئی لمبی پسوڑی پے جانی تھی۔''

وہ پھر رک گیا تھا' اپنی بوتل پہ توجہ دینے یا شاید میرا اشتیاق جگائے رکھنے کو۔

دم لے کے اور بوتل کا دم نکال کے ان حد نے سنانا شروع کیا کہ کس طرح پسوڑی ڈلتے ڈلتے رہ گئی تھی۔

بولا۔ "مدھوری بے بی کے ساتھ ورانڈے میں چلتے چلتے ایک موڑ جو مڑیا تو جناب! سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ناگن کی طرح لہرا لہرا کر چلتی ہوئی وہ جو کہتے ہیں نا____ سپ دی ٹور مطلب سانپ کی چال سے چلتی ہوئی پونے شہر کی ڈی سی صاحب کی بیٹی جسم پہ بھوکچھ وی نیں۔ مطلب بہت تھوڑا جیسا پہنے____"

میں نے اسے ٹوکا "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ پونے کی ڈی سی صاحب کی بیٹی تھی؟"

کہنے لگا۔ "بعد وچ پتا چلیا اور جو اگر مدھوری بے بی نے مجھے کھینچ کے نہیں رکھا ہوتا تو اور بھی بعد وچ پتا چلنا تھا جیل میں جا کے سوں رب دی۔ جیل میں پہنچ کے بہت لیٹ خبر ہوتی کہ وہ ڈی سی صاحب کی بیٹی تھی۔ خیر جی پہلے پوری بات تو سن لے بھائی جی! تو جناب ناگن جیسی لہراتی چال دیکھ کے آپ کا یہ دوست جوگی ان حد سنگھ بے حد بے حال ہو گیا اور بولوئی رام کر کے چھال مار کے کود پڑا جی میدان میں۔ سوچ لیا تھا کہ ناگن ورگی چال ولی کو گود میں بھر کے اٹھاواں گا۔ ہور جدھر اس نے جانا ہو گا پہنچا دیاں گا۔ یہ وی کھدمت کا ایک اشٹائل ہے۔ تو جناب شیر کھان صاحب! جیسے میں آگے بڑھا۔ مدھوری بے بی نے ہاتھ کی پکڑ سخت کی۔ میرے ہوش حباس' کب ٹھیک تھے جو میں سوچتا سمجھتا۔ بس جی میرا بدن آگے کو بڑھا اور مدھوری بے بی نے جھکولا دے کے اپنی ایک ٹانگ بڑھا کے میرا رستہ کاٹا۔ میں جی ٹھوکر کھا کے جھکا ہی تھا کہ مدھوری نے ہاتھ پکڑے پکڑے آپ ہی ایک گھٹنا جھکا کے جوڈو کا کوئی داؤ مارا نہیں کہ میں مدھوری کی پیٹھ پر اپنی پیٹھ کے بل آ گیا اور شیر کھان صاحب جی! اس نے اس دھان پان معشوق جیسی لڑکی مدھوری نے مجھے دھوبی پاٹ مار کے ڈی سی صاحب کی بیٹی کے سامنے دے پٹکا۔ فیر جیسے ہی وہ ناگن چال والی سہم کے رکی اور مجھے اس نے ورانڈے کے صاف ستھرے پتھر کے فرش پہ چاروں شانے چت پڑے دیکھا اور کبرا کے اس نے چیخ ماری تو مدھوری نے بھائی جی! حد ہی کر دی اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈی سی کی بیٹی کو تسلی دی بیولی۔ یہ سردار جی ہوں تم جدھر جاتی ہو جاؤ۔ کبرانے کی بات کوئی وی نہیں۔" پھر جی مدھوری

بے بی نے ہاتھ بڑھا کے مجھے فرش سے اٹھایا جیسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "تو یہ ہوتا ہے داؤ نمبر تین۔ جرا سی مشق کرو گے سردار جی تو اور سمجھ جاؤ گے۔" تو میں جناب اپنے کپڑوں کی مٹی جھاڑتا تھا اور ناگن جیسی چال والی مسکراتی اپنے بہت کم کپڑوں میں اگلا موڑ مڑ کے کدھری چلی گئی تھی۔ فیر بھائی جی! مدھوری بے بی نے بتایا کہ ناگن مطلب سپ دی ٹور والی لڑکی کس کی بیٹی تھی اور میں جیل جانے سے بال بال بچ گیا ہوں۔ مجھے مدھوری کا تھینک فل۔ مطلب ممنون ہونا چاہیے۔"

اور اس وقت آگے والی جیپ کے ڈرائیور نے ہارن بجا کے ہمیں توجہ دلائی۔

ہم نے دیکھا ایک بڑی سی پرانی شیورلے گاڑی سامنے سے چلی آ رہی تھی۔

ان حد سنگھ نے پہچان کے کہا۔ "یہ مونگ صاحب کی گاڑی ہے۔ ہم مونگ اسٹیٹ میں داخل ہونے والے ہیں۔"

ان حد کی آواز پوری طرح بیدار اور باہوش تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اب مدھوری بے بی کا زنانہ باڈی بلڈنگ کلب کا قصہ ان حد کی اگلی شراب نوشی تک کے لیے ملتوی ہو گیا ہے۔

مونگ صاحب کی پرانی شیورلے اپنی سائڈ پہ رکی۔ ڈرائیور نے ریس دے کے گاڑی بند کی اور اتر آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب کے بعد کی تھوڑی روشنی میں گاڑی سے اترنے والے کا لباس اور رکھ رکھاؤ دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی معزز برمی بوڑھا تھا جو بار بار کے دھلے ہوئے دیہاتی تراش کے مقامی لباس میں ٹمبر اسٹیٹ کا پرانا ملازم یا مالکوں کا ایسا غریب عزیز دکھائی دیتا تھا جسے کسی لیاقت کی وجہ سے نہیں اس کی غربت سے رشتے داری کا خیال کرتے ہوئے مالکوں نے رکھ لیا ہو گا۔"

میں گاڑی روک کر انجن بند کیے ہوئے بوڑھے برمی کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔

وہ بالکل قریب آ گیا تب ان حد سنگھ نے پہچان کر نعرہ لگایا اور لڑکوں کی طرح اچھل کر جیپ سے کودا۔ "اوئے مونگ انکل! مائی ڈیئر ڈیئر مونگ نے برا! اس وقت فیر مجھے دھوکا ہو گیا۔ میں سمجھا کہ مونگ لی صاحب نہیں ہے مونگ جو صاحب ہے۔ و مائی مائی آپ دونوں کا شکل کتنا ملتا ہے۔ بس جرا ڈریس سے پتا چلتا ہے کہ مالک کون ہے اور نوکر کون ہے۔ مونگ جو صاحب بہت فیشن میں رہتا ہے۔"

مونگ لی بولا۔ "ہاں بھائی وہ رہ سکتا ہے فیشن میں اسے ہر پہلی تاریخ کو پے جو

مل جاتی ہے۔ میں کو پے کون دے گا۔ میں غرب مالک ہے اپنا روٹی آپ ہی کماتا ہے۔ کوئی میں کو کما کے نہیں دیتا۔ جیسا مونگ جو کہ ٹمبر اسٹیٹ کما کے دیتا ہے۔ ہر پہلی تاریخ کو۔"

"چالاک چالاک مونگ لی صاحب اور کنجوس بھی ہے تم۔ چالاک اور کنجوس مکھی چوس۔" ان حد اونچی آواز میں اسے چھیڑ رہا تھا پھر بولا۔ "اچھا انکل نے بر مونگ لی! میرے دوست کھان سے ملو۔ کھان یو کے سے آیا ہے۔ کھان! یہ میرا پڑوسی برما کا سب سے بڑا نمبر ٹریڈر اور دنیا کا سب سے بڑا کنجوس مونگلی صاحب۔ ہم لوگ ادھر اس کو مونگ نے بر بھی بولتے آں جو ابھی بولا ہے۔"

میں نے اتر کے ہاتھ ملایا۔ مونگ لی نے میری خیریت پوچھی اور ہم دونوں کے بازوؤں میں اپنا ایک ایک بازو ڈال کے اپنی گاڑی کی طرف چلنا شروع کیا۔ اسی وقت اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک چینی لڑکی یا عورت یہ کہنا مشکل تھا۔ اتری اور سیدھی میری طرف آئی۔ وہ تنگ چینی روایتی لباس میں تیز تیز چلتی ہوئی آئی۔ میرے سامنے ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "گاڑی کی چابی دے دو۔"

ان حد نے کہا۔ "کھانا! یہ انکل نے بر کی معشوق اور ڈرائیور اور ہاؤس کیپر ہے۔ اسے اپنی گاڑی کی چابی دے دو۔ ہم دونوں انکل مونگ لی کی شیور لے میں چلیں گے۔"

مونگ لی کی معشوق یا ڈرائیور ہاؤس کیپر اس چینی لڑکی یا عورت نے بغیر مسکرائے یا پلک جھپکائے بنا میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لی اور "دینک یو" کہہ کے سیدھی جیپ میں جا بیٹھی پھر وہ مونگ کی کار میں ہمارے بیٹھنے سے پہلے ہی طوفان کی طرح جیپ چلاتی ہوئی یہ جا' وہ جا۔

ان حد نے کہا۔ "بلے او بلے۔ طوفان ہے یہ چینی گڑیا یہ ڈینٹسٹ بھی ہے۔ میں تو مونگ لی صاحب سے کہتا رہتا ہوں اسے بتیس دن کے لیے میری ٹمبر اسٹیٹ کو ادھار دے دو ادھر جتنے داتوں کے مریض ہیں سب کا علاج کر دے گی نالے میرے بتیس کے بتیس دانت نکال کے مجھے بھی فارگ (فارغ) کر دے گی۔"

مونگ لی ڈرائیور سیٹ پہ بیٹھنے سے پہلے کھڑا ہی کھڑا کچھ دیر تک دھیرے دھیرے اپنے سینے کو تھپکتا ہوا ہنستا رہا۔ "تم گندے مغز کے سکھ ہو مسٹر سنگھ! تم جانتے ہو وہ میں کی ہاؤس کیپر ڈرائیور ہے۔ میں کو اپنا کھانے پینے کا 'بستر کا خیال نہیں کرنا پڑتا وہ سب کر لیتی ہے تم اس کو صرف اور صرف۔ اپنے بیڈروم کے لیے لینا مانگتے ہو۔ وہ ادھر

میرے سب رومز کا خیال کرتی ہے' بیڈروم کو ملا کے سب رومز کا اچھی عورت ہے۔"

"اچھی عورت ہے انکل نے اسی لیے تو بار بار ہر سال ونٹر کے آنے سے پہلے آپ کو ری کویسٹ کرتا ہوں کہ ادھار دے دو۔"

"اچھا چپ کرو۔" برمی بڑے میاں ہنستے ہوئے بولے۔ "چپ کرو' چینی عورت کا بات نہیں کرو۔ نہیں تمہارا دوست خیال کرے گا کہ مونگ لی کوئی بہت ڈرٹی آدمی ہے۔"

انحد نے مجھ سے کہا۔ "نا' نا کھان! مونگ لی صاحب بالکل ڈرٹی نہیں ہے صاف ستھرا ہے یہ چینی معشوق ہاؤس کیپر لی صاحب کو روز اسپنج سے ہاتھ دلاتی ہے۔ روج دو وری ایک ٹائم صبح ایک ٹائم رات میں۔ اپنے ہاتھ سے بہت مدد کرتی ہے۔ اس کی!"

مونگ لی صاحب نے ہنستے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔ شی از وری ہیلپ فل____ میں کی بہت مدد کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے۔"

انحد نے ٹھٹھا لگایا۔ "دیکھا کھان! میں کیا کج کہہ رہا تھا۔ یہ مونگ بابا وی بڑا چنٹ ہے۔"

اسی پر ہنستے چھیڑ چھاڑ کرتے دس منٹ میں ہم مونگ لی کی اسٹیٹ ولا میں پہنچ گئے۔ یہ پرانے چینی فن تعمیر کی نقل میں بنائی ہوئی ولا تھی۔ باغ بھی چینی باغوں کی طرز کا تھا۔

مونگ کی گاڑی کے استقبال کے لیے گھریلو اسٹاف پورچ میں جمع تھا۔ چینی ہاؤس کیپر سب سے آگے ہماری پیشوائی کو موجود تھی۔

میرا سکھ دوست ولا میں داخل ہوتے ہوئے ہاؤس کیپر کو دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ ہاؤس کیپر ایک دو لمحے تو روکھا سنجیدہ چہرہ بنائے رہی مگر ان حد سنگھ کی روشن چلبلی آنکھوں نے اس کے چہرے کی سنجیدگی برف کی طرح پگھلا دی۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ ان حد نے دانت نکال دیے۔

پھر ان حد سنگھ مجھے سنانے کو بڑبڑایا۔ "او کھوتے سنگھ جنڑیا! توں اول نمبر دا کھوتا ہے۔ مونگ لی اچھی خاصی رات رکنے کی دعوت دے رہا تھا۔ فون پے بے وکوف تو نے ایک ہور چانس کھو دتا۔"

مونگ لی نے ہڑبڑا کے پوچھا۔ "پارڈن! کچھ میں کو بولتا ہے مسٹر سنگھ؟"

ان حد سنگھ کہنے لگا۔ "نہیں نہیں سر! اپنی کھوتی قسمت کو روتا ہوں۔"

میں ہنسنے لگا تو وہ خود بھی ہنسا' مونگ صاحب نے بھی قہقہہ لگایا۔

مونگ کا اصرار تھا کہ ہم جو صرف نو میل کی مسافت طے کر کے آئے ہیں ذرا واش روم جا کر فریش ہو لیں۔ اگر نہانے کا موڈ نہ ہو تو منہ ہاتھ دھو لیں۔

انحد مجھ سے کہنے لگا۔ ''میرے تے نہان دا سوال ہی نہیں پیدا ہوندا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسے؟''

وہ ہنس کے بولا۔ ''اوئے بھولے بادشا! ٹائم کدھر؟ سکھ پانی میں چلا جاوے تو فیر جلدی نہیں سوکھتا ہوتا۔ یہ کہیں سکھانا کوئی آسان کام ہے؟ چل ڈاڑھی کو تو انگیٹھی کے آگے کر کے خشک وی کیا جاسکدا ہے ہاہاہا۔''

مونگ لی صاحب نے واش روم جانے پر ایک بار اور اصرار کیا تو انحد بولا۔

''پیارے نے بر! واش روم جانے کی دو شرطیں میں پہلے بھی کتنے سال سے پیش کرتا رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ کے والے واش روم میں جاؤں گا۔'' پھر اس نے آنکھیں چلا کر اضافہ کیا۔ ''اور دوسری شرط ہی آپ جانتے ہو اس واش روم میں میری مدد کے لیے ہمیش کے اشتاف کو میرے نال جانا ہووے گا۔ ہاہاہا۔''

مونگ لی شرمندہ سا ہو کر ہنسا' کہنے لگا۔ ''تم تو تا ہے' پیرٹ' پیرٹ ایک ہی بات کتنے سال سے دہراتے ہو۔ یو ڈرٹی مغز والا سکھ! چھوڑو نہیں جاؤ واش روم۔ ادھر آؤ میں تمہارے لیے ڈرنک بناتے ہیں۔''

انحد کا مسخرا پن اب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بہت ہلکی' بہت کم کوئی ڈرنک لی ہو گی۔ باقی وقت وہ مونگ سے ولا کے مستقل ملازموں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ولا کے بعد گوڈاؤن سائٹ پر جہاں مونگ کے ٹمبر ماسٹر اور فور مین مزدوروں کو جمع کر کے حاضری لیتے اور کاموں پر بھیجتے تھے۔ ان حد سنگھ نے اس کے بارے میں بھی سوالات کیے وہ ان لاگنگ سائٹوں کے بارے میں پوچھتا رہا جو تیز رفتار ہائی وے یا ہائی وے سے جوڑنے والی سڑکوں کے قریب تھی۔ کہنے لگا کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو ہم تینوں ایک چکر میں لگا لیں۔ ''ہائی وے یا لنک روڈوں پر کام کرنے والے مزدوروں فور مینوں سے مل ملا کے ہمیشہ میرا جی خوش ہوتا ہے۔''

مونگ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تمہاری کسی سائٹ پے یا ولا مین گاڈ فاربڈ۔ خدا ایسا نہیں کرے۔ کیا کوئی برا ہو گیا ہے؟''

ان حد سنگھ نے کہا۔ ''ہاں ایک اسٹیشن ویگن میں بیٹھے بدمعاش میرے ٹرکی

فارم پر پیٹرول بم پھینک کے بھاگ گئے ہیں۔ ڈھائی سو سے جیادہ ٹرکی برڈ جندہ جل گیا۔''

انحد نے خبر نہیں یہ کہانی کس وقت بنائی ہو گی اس نے کہانی اس دکھ سے بیان کی تھی کہ مونگ بے چارہ بہت دیر تک افسردہ رہا۔ ''پور برڈ۔ پور ٹرکی۔'' کہہ کہہ کے افسوس میں سر ہلاتا رہا۔

ان حد نے بہت جذباتی ہو کے اور جوش میں آ کے پھر یہ کہا کہ اگر وہ اسٹیشن ویگن والے اس کے ہاتھ لگ گئے تو واہگورو کی قسم وہ انہیں زندہ روسٹ کرنے سے کم کوئی ''سجا'' نہیں دے گا۔

مونگ پوچھنے لگا۔ ''ایسا برا کام کون کر سکتا ہے اور کیوں؟''

ان حد نے سوکھا منہ بنا کے کہا کہ اگلے برس امریکا میں ہونے والی ''ٹرکی نمائش'' میں وہ اپنی برڈز بھیجنے والا تھا۔ برما سے اور بھی تین پارٹیاں نمائش میں شریک ہو رہی ہیں۔ انہی میں سے کسی کی حرکت ہے۔ یہ میرے آگے نہیں ٹکتے اسی لیے میں نے ان کو روک لیا۔ انکوائری پوری کر لوں پھر جوابی کارروائی ضرور کروں گا۔ اس نے زندہ روسٹ کرنے والی سزا کا پھر ذکر کیا۔

یہ سب کہہ کر اس نے مونگ صاحب سے تعاون کی درخواست کی کہا کہ میں اتنا چاہتا ہوں کہ اس اس حلیے کی وہ اسٹیشن ویگن اس طرف سے نکلی ہے۔ آپ کے ولا میں کسی نے یا لاگنگ سائٹ پر کسی آدمی نے اس دن' اس وقت لگ بھگ اسٹیشن ویگن دیکھی ہو تو بتائے مجھے ان کا روٹ سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ میں اندایا (اندازہ) لگا لوں گا کہ تین میں کون سی سور پارٹی ہے پھر میں کر لوں گا جو کرنا ہے۔

مونگ لی فوراً مستعد ہو گیا۔

شراب نوشی کے لوازم سب ہٹا دیے گئے۔ مونگ لی صاحب نے اپنی چینی ہاؤس کیپر کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ دو دو چار چار کر کے ولا کے خادموں کو جمع کرتی جائے اور کمرے کے باہر خود اپنی نگرانی میں ایک ایک کو ہمارے پاس چھوڑتی جائے۔ سب سے پہلے سوالات ان حد سنگھ نے خود ہاؤس کیپر سے کیے۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اس سے بات کرتا رہا لگتا تھا شوخی شرارت بالکل جانتا ہی نہیں۔ وہ ہاؤس کیپر کو ''بی بی'' اور ''میڈم'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ اس دن اور اس وقت کے آس پاس کہ جب اغوا کرنے والوں کی اسٹیشن ویگن کے ولا کے سامنے سے گزرنے کا امکان تھا مختلف نوکروں کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں چینی عورت نے خوب تفصیل سے بتایا۔ ان حد نوٹ

کرتا گیا تاکہ نوکروں کے بیانات ملائے اگر کوئی نوکر کچھ چھپا رہا ہو یا جھوٹ بول رہا ہو تو اس کی گرفت ہو سکے۔

خود ہاؤس کیپر نے کچن اور اسٹور میں آتے جاتے باہر نظر ڈالی تھی اور اپنی رو میں، کچن بھی دیکھنے کے لیے، باہر دیکھا تھا تو کبھی کبھی دیکھنے پر اسے کوئی اسٹیشن ویگن دکھائی نہ دی تھی۔

امجد نے پوچھا۔ "دیکھنے کا تو تم نے بتا دیا بی بی اب جرا یہ بتاؤ ___ تم تو خود اچھی ڈرائیور ہو ___ یہ بتاؤ تم نے ولا کے سامنے سے گجرتی کسی گاڑی کی آواج ___ طاقت والے انجن کی مطلب جیسا اسٹیشن ویگن کا ہو سکتا ہے ایسے انجن کی آواج اس ٹائم کے بیچ سنی؟"

چینی ہاؤس کیپر نے بتایا کہ آواز سننے کا کوئی چانس نہیں ہے اس لیے کہ وہ کام کرتے ہوئے اپنی بیلٹ سے ایک چھوٹا ٹرانزسسٹر ریڈیو لٹکا کے گھومتی ہے۔ اس کے ہاتھ اور آنکھیں کام پر اور باہر کی سب چیزوں میں الجھے رہتے ہیں اور کان صرف ریڈیو سن رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو بھی اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یا تو آنکھوں کے سامنے آنا پڑتا ہے یا اگر پیچھے ہے تو اس کے کندھے پر تھپکی دینی پڑتی ہے۔

اس کا مطلب ہے ان حد نے نتیجہ نکالا کہ اگر اس بی بی کے نہ دیکھتے وہ گاڑی گزری بھی ہو گی تو اس نے اس کی آواز نہیں سنی ہو گی۔

امجد سنگھ نے آخری فقرے اپنے مزاج کے مطابق کہے اور پھر اس بی بی کو جانے دیا۔ کہنے لگا کہ اب میں یاد رکھوں گا کہ تمہیں پیچھے سے متوجہ کرنے کے لیے تمہارے کندھے "سہلانا" ضروری ہوتا ہے۔

ہاؤس کیپر ہنس پڑی۔ "سہلانا نہیں مسٹر سنگھ ایک بار ٹچ کرنا کافی ہو گا۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگا۔ "چنگا جی، فیر دو ترے مرتبہ ٹچ ہی کر لوانگے۔"

اس کے بعد ہاؤس کیپر نے ولا کے نوکروں کو ایک ایک کر کے بھیجنا شروع کیا۔ امجد کے پاس ان میں سے ہر ایک کی مصروفیات کی تفصیل موجود تھی۔ وہ دیکھتا گیا چیک کرتا گیا۔ کئی چوکی دار سمیت، کسی نے بھی کسی اسٹیشن ویگن کو ولا کے سامنے والی سڑک سے گزرتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں بعض دوسرے ٹائپ کی گاڑیاں ضرور گزری ہیں۔ لاگرز کے بھاری بھرکم ٹرک، کھانے پینے کی سپلائی لے جانے والی گاڑیاں پکنک

کرنے والے بے فکروں کی قیمتی سیلون کاریں، جیپیں، کوسٹر وغیرہ مگر اسٹیشن ویگن کوئی نہیں۔

امجد کو ولا کے صرف چوکی دار کی بات عجیب لگی تھی اس نے کہا تھا۔ "میں کوئی بیس منٹ کے لیے اپنے کوارٹر میں گیا تھا۔"

سردار جی نے پوچھا تھا۔ "اور یہ بیس منٹ کا ٹائم وہی تھا جب ویگن یہاں سے گزر سکتی تھی؟ مطلب اگر وہ لوگ ادھر آئے ہیں تو ___"

چوکی دار کیا کہتا۔ اس نے وہی بات دہرا دی کہ میں اتنے سے اتنے بجے تک گیٹ پر نہیں تھا۔ میری جگہ کوئی نہیں تھا۔ کسی کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس وقت مونگ جو صاحب۔ مالک مونگ لی کا ہم شکل، جو اس ولا کا چیف سپروائزر تھا، گیٹ کے باہر کھڑا ہوا مونگ نام کی پلیٹ پر نیا پینٹ لگا رہا تھا۔

ان حد نے مونگ جو کو نوکروں کی اس فہرست میں شامل نہیں کیا تھا اس لیے کہ اس کی پوزیشن ہاؤس کیپر سے اوپر کی تھی۔

مونگ لی نے مونگ جو، اپنے ہم شکل کو بلایا۔

قیمتی سینٹ کی خوشبو کے ساتھ شوخ پھولوں کے ڈیزائن والی ایک عیاش قسم کی شرٹ اور بادامی ڈے نم کے خوب تنگ سلا ہوا پتلون سونے کے بریسلٹ والی گھڑی، چاندی کی بیلٹ اور گلے میں لہراتے خالص ریشم کے سفید اسکارف میں جو چیز کمرے میں آئی اسے ہم لاہور، پشاور وغیرہ میں کھسرا، کھدڑا، یا ہیجڑا کہہ سکتے تھے۔ برما میں اس زمانے میں ایسے لہراتے بل کھاتے، چمک دار شوخ کپڑے والوں کو "شی بوائز" کہا جاتا تھا۔ اس شی بوائے کی شکل اسی پچاسی فیصد مالک مونگ لی سے ملتی تھی۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ مونگ لی بوڑھا تھا اور یہ چوبیس سے اٹھائیس برس تک کا ہو گا۔

وہ اپنے اونچی ایڑی والے پنچ رنگے کاؤ بوائے، بوٹ فرش کے ماربل پر کھٹکھٹاتا "ہائے" کہتا ہوا آیا اور مونگ لی کے صوفے کے بالکل سامنے میں قالین پر ٹانگیں پھیلا کے تھکا تھکا پاس بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے لہرانے لگا۔

امجد کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگی تھیں مگر وہ اس وقت کام کے موڈ میں تھا۔ اس نے کوئی فقرہ نہیں لگایا بلکہ نقلی پر اصلی فکر مندی سے کہنے لگا۔ "مجھے پتا ہے مسٹر مونگ جو آپ کی پوری شام بہت بجی ___ مطلب مصروف گجری ہے پر مائی ڈیئر مسٹر مونگ جو جرا سا میرے ساتھ کو آپریٹ کرو گے تو بڑی مہربانی ہو گی۔ یہ بتاؤ مسٹر مونگ

جو کہ ___ اور یہاں انجد نے اس سے پوچھا کہ مونگ صاحب فلاں دن اتنے بجے سے اتنے بجے تک آپ کیا کرتے رہے تھے۔

مونگ جو اپنے بچے کے لیے فکر مند نئی نئی ماں بننے والی لڑکی کی طرح منہ سکیڑے انجد سنگھ کی بات سنا کیا' پھر ہاتھ نچا کے بولا۔ "لت می سی ___ آچ چھا۔ اس تائم؟ اس تائم میں برے پھاتک پہ کھڑا تھا۔ مستر سنگھ سر! چوکی دار کو ___ ہہ ہہا ___ اسے گیت مین کو' واش روم جانے کا تھا۔ وہ مجھے بول کے گیا تھا کی سر! مستر مونگ جو پلیز مجھے ___ اب دی تیل کیا بتاؤں۔ میں مستر سنگھ! اس تائم ولا کی پلیت پر نیا پینت لگا رہا تھا۔ میں آر تست رہ چکا ہوں ___ آئل پینت میری کھائیں ___ اسپیشل فیلد تھی ___ تو میں ایک دم مین گیت پر کھرا تھا ___ کوئی 'لت می سی ___ کوئی چالیس منت سے بھی اوور میں ادھر ہی تھا ___ کیوں؟ کوئی کھاس بات ہے مستر سنگھ؟"

جو خاص بات تھی انجد سنگھ نے بتا دی۔ اپنے فرضی ٹرک ہاؤس پر پیٹرول بم پھینکے جانے اور ٹرک برڈز کے زندہ جلنے کا قصہ مونگ جو کو نہیں سنایا کہنے لگا۔ "کچھ ایسا ہاری بل ___ مطلب خوف ناک ایکسی ڈنٹ کر کے بھاگی ہے وہ اسٹیشن ویگن کہ مسٹر مونگ جو میں آپ کو اس کے ڈی ٹیل نہیں سنا سکتا۔ ناں جی ناں' بالکل وی نہیں آپ نے سن کے بے ہوش جانا ہے ___ اس لیے مہربانی کر کے پتا بتا دیجیے کہ کیا کوئی اسٹیشن ویگن آپ کے ہوتے ادھر سے گجری تھی اور جو گجری تھی تو ___؟"

"نو نو سر مستر سنگھ سر! کوئی استیشن ویگن نہیں یہ تو تھے یکین نو استیشن ___ ہاں ایک اسپورٹس کار گزری تھی ایک اترائی ہوئی بچ مطلب ___ جانے دیجیے مطلب و طلب۔ ایک لرکی ایک دم بد صورت کسی ہینڈسم کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اترا رہی تھی۔ بس وہ اسپورٹس کار اور تین تریکتر ترالی اور بس ___ اور کچھ نہیں۔" ولا کے ایک ایک آدمی سے پوچھ لیا گیا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ مونگ لی صاحب نے وقت دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں جنٹلمین رات ادھر ہی رکو۔ میں فون پے پہلے ہی بول چکا ہے سنگھ تم کو۔"

مگر انجد سنگھ راضی نہ ہوا کہنے لگا کہ مجھے ایک چکر گودام سائٹ پہ لگوا دو۔ اس وقت سارے ہی ورکر ادھر میں اکٹھا ہو رہے ہوں گے۔ لاگنگ سائٹ والے بھی' کارخانے والے بھی' میں ان سے معلوم کر لوں گا پھر واپس ہو کے ہم دونوں اپنے پیارے میزبان کے ساتھ کھانا کھائیں گے اور چلے جائیں گے۔ اگلی ٹمبر جا کہ او کی طرف ___

یعنی زوبر میاں سلہٹی کے پاس۔

لاگنگ سائٹوں پر رات پڑے کون ہوتا ہے۔ سبھی کھانا کھانے اور صبح چار بجے تک لٹھے کی طرح پڑ کے سونے کے لیے گوداموں کے پاس بنی "لما کھولیوں" میں آ گئے ہوں گے۔ اس لیے کام آسان ہو جائے گا۔ یہاں سے معلومات کر کے' اگر آگے جانا پڑا تو زوبر میاں سلہٹی کی ٹمبر اسٹیٹ میں سویرے ڈھائی تین بجے تک پہنچ سکتے تھے۔ وہ ایسا وقت ہو گا کہ وہاں کے ورکر ابھی اپنی "لمبا کھولیوں" میں پڑے سوتے ہوں گے۔ زوبر میاں کی عظیم الشان کوٹھی میں کچھ دیر آرام سے بیٹھنے' چائے پینے کے بعد ہم دونوں زوبر میاں کے بیدار ہوتے کاریگروں مزدوروں کو میں جا پکڑیں گے۔ اگر اس وقت نہیں پکڑا گیا تو پھر ان لوگوں سے رات پڑے ہی ملاقات ہو سکے گی۔

ہم مونگ اسٹیٹ کی گودام سائٹ کی طرف چلے۔ گاڑی شیور لے تھی جسے مونگ لی کی "ڈرائیور" ہاؤس کیپر بہ قول انجد سنگھ کی چینی معشوق چلا رہی تھی۔ ان حد ضد کر کے اکیلا اگلی سیٹ پر جڑا بیٹھا تھا اور بار بار ہاؤس کیپر سے کہہ رہا تھا آہستہ چلو اور اگر ٹائم ہو تو باقی ساری عمر گوڈاؤن سائٹ آ کر پہنچنے میں لگا دو۔ تمہارے پاس بیٹھنے کا جو موقع اب ملا ہے کیا پتا پھر کبھی ملے نہ ملے۔ وہ اسے بنتو کہہ کے بلا رہا تھا اور بار بار لہک لہک کر گا رہا تھا کہ بنتو دا لک چن ور گیا ___ اور بنتو دا۔ یعنی بنتو کی کمر چاند جیسی ہے۔

اگر وہ اس وقت پیے ہوئے ہوتا تو مونگ لی صاحب ہرگز اسے آگے نہیں بیٹھنے دیتا۔ ایک بار وہ نشے میں تھا اور اسی طرح "بنتو" کے برابر جا بیٹھا تھا تو اس نے بہت پریشان کیا تھا۔ ہاؤس کیپر کو بھی اور مونگ لی کو بھی۔ وہ مونگ لی سے شرط لگا رہا تھا کہ بنتو کی کمر نئے چاند کی طرح "گھومی ہوئی وی ہے۔ نالے چٹی سفید چن ور گی چماکدی ہے۔ ویکھ لو۔ بھاویں ہاتھ لا کے ویکھ لو' بھاویں اکھاں نال ویکھ لو۔"

ہم دس بارہ منٹ میں گوڈاؤن سائٹ پہ پہنچ گئے تو چینی ہاؤس کیپر نے گاڑی روک کے دروازے کھولتے ہوئے انگریزی میں دھیرے سے کہا۔ "مالک کا شکر ہے ہم صحیح سلامت پہنچ گئے۔ مسٹر سنگھ کے باوجود پہنچ گئے۔"

انجد ہنسنے لگا۔ انگریزی میں کہنے لگا۔ "ہم پہنچتے کیسے نہیں۔ تم پرفیکٹ لیڈی ہو اور میں پرفیکٹ سکھ ہوں۔"

عمارتی لکڑی کے کھلے گوداموں کے بیچ بند چھپرے اور کاٹیج سے بنے ہوئے تھے۔ ایک بند چھپرے کے آگے بہت سی ٹیوب لائٹوں کی روشنی ہو رہی تھی۔ ہماری

ناکڑی سامنے رکی تو لاگنگ ماسٹر اور سپروائزر اور مستری قسم کے فورمین سرنگ اور جمعے دار اکٹھا ہوگئے۔ ان میں کے تین بڑوں نے گاڑی کے اس طرف کے دروازے کھولے جس طرف مونگ لی اور اس کا مہمان یعنی یہ خاکسار بیٹھا تھا باقی گھیر کے کھڑے ہوگئے۔ ان حد اب پھر ایک مصروف حاضر دماغ تفتیشی افسر تھا۔

مختلف طریقوں سے پوچھتے ہوئے اس نے بہ ہر حال معلوم کر لیا کہ ٹمبر کاٹنے والوں، چوکی داری کرنے والوں، اونچے درختوں پر چڑھ کر چوری چکاری اور آگ دھوئیں پر نظر رکھنے والوں نے اور عام مزدوروں نے ___ غرض کسی نے بھی مونگ اسٹیٹ کے کسی رخ سے کسی لنک روڈ پر، جنگلی رستے یا ہائی وے پر اس دن اتنے بجے تک کوئی اسٹیشن ویگن نہیں دیکھی تھی۔

مونگ لی بوڑھا آدمی، اس کے کھانے اور پھر سونے کا وقت ہو چکا تھا۔

ان حد سنگھ نے جو بہ ظاہر بے پروا ہنسوڑ آدمی لگتا تھا گھڑی دیکھی سب مزدوروں، فورمینوں وغیرہ کا شکریہ ادا کیا اور ہاؤس کیپر خاتون سے لہلوٹ ہو کر کہا کہ "چل چلئے چراگ دے میلے" تو مجھے وطن یاد آ گیا۔ ان حد سنگھ نے یقیناً لاہور کا میلہ چراغاں نہیں دیکھا ہو گا مگر یہ گیت کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ گیا تھا۔ ان حد سنگھ نے، اس ہنسوڑ آدمی نے نادانستگی میں مجھے اداس کر دیا تھا۔

گاڑی میں مونگ اسٹیٹ کی ولا تک آتے ہوئے مجھے شالا مار لاہور اور پشاور کا قصہ خوانی بازار ڈھاکے کی بیت المکرم مسجد اور کراچی کا کلفٹن بیچ یاد آتا رہا۔

ہاؤس کیپر سب کچھ انتظام کر کے گئی تھی۔ گاڑی پورچ میں چھوڑ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اچھل کے کہیں اور جیسے اڑتی ہوئی کچن کے علاقے میں غائب ہو گئی۔

جتنی دیر میں ہم تازہ دم ہو کر کھانے کی میز تک آپاتے اس سے کم وقت میں ہاؤس کیپر نے نکر اور سینٹ میں نہائے ہوئے شی بوائے مونگ جو وغیرہ نے کھانا لگوا دیا تھا۔ ہاؤس کیپر کلف لگے کپڑے پہن کر ہمیشہ تر و تازہ رہنے والے کسی طلسمی پھول کی طرح میز کے برابر کھڑی مہک رہی تھی۔

ان حد نے ایک بار اس سے آہستہ سے کہا۔ "وہ دن کب آئے گا جب تم میرے برابر بیٹھ کے اس میز پہ کھانا کھاؤ گی۔" تو وہ مسکرا دی آہستہ سے بولی۔ "یہاں اس میز پر ہی کیوں۔ وہ دن تمہارے ولا کے ڈائننگ ہال کی میز پر آ سکتا ہے۔ کبھی بلاؤ نا۔" عورت نے یہ بات آدھے مسخرے پن میں آدھی سنجیدگی سے کہی تھی۔

ان حد سنگھ نے چھت کی طرف منہ کر کے نعرہ مارا۔ "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال۔"

عورت ڈر سی گئی پھر منہ چھپا کے ہنسنے لگی۔ مونگ لی نے مسکراتے ہوئے ان کا سر ہلایا اور ہم سب کو کھانا شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت باہر برآمدے سے ٹیپ کیے ہوئے گانے کی آواز آئی۔ "سروتا کہاں بھولیائے پیارے ننادوئیا ___ پیارے ننادوئیا سروتا کہاں بھول ___"

میں جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو وہ گیت ہے جو سرکس میں سانپوں کے بادشاہ کی بیٹی روکسانا بجا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ٹینٹ میں اور دوسری اور آخری بار میں نے ٹیپ اس وقت سنا تھا جب ___ جب اغوا کرنے والوں نے اسے گھیرا تھا۔

میں نے چیخ کے کہا۔ "امجد! یہ روکسانا کا ٹیپ بج رہا ہے۔ امجد سنگھ! ساتھ آ میرے۔" اور میں نے ڈائننگ ہال سے نکل کے دیوانہ وار بجتے ہوئے ٹیپ کی آواز کے رخ دوڑنا شروع کر دیا۔

O

میں مونگ لی ولا کے ڈائننگ ہال سے دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا نیم روشن برآمدے میں نکل آیا تھا۔ سامنے کنجوسی کے ساتھ دور دور جلائی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں نظر آتے سیمنٹ کے بھاری بھرکم گملوں میں اونچے اونچے انوکھے پودے برآمدے کو پراسرار اور غیر قدرتی سا ماحول دے رہے تھے۔

میں نے تیزی سے آواز کی سمت بڑھتے ہوئے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی چاپ سن لی تھی اور مطمئن ہو کر سوچا تھا۔ پیچھے امجد سنگھ آرہا ہے۔ جو بھی ہو ہم دونوں اس ٹیپ والے کو نکلنے نہیں دیں گے۔"

ٹیپ اسی طرح خاصی اونچی آواز میں بجے جارہا تھا۔ "کہاں بھولیائے سروتا' کہاں بھولیائے پیارے ننادوئیا۔"

ہمارے دوڑتے قدموں کی چاپ اس نے جو ٹیپ بجارہا تھا سن لی اور بھاری بھرکم گملے کے پیچھے سے نکل کے وہ بھاگا اور کود کر برآمدے سے اتر گیا۔ میں نے دیکھا جینز اور سرخ جیکٹ میں ملبوس' کھیل کود والے ہلکے جوتے پہنے وہ لان پر دوڑا جا رہا تھا۔ اس نے اچھا اسٹارٹ لیا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے ٹیپ بھی بند کر دیا تھا اور اب اندھیرے لان پر جہاں برآمدے سے جاتی ٹیوب لائٹوں کی چمک سے زیادہ کوئی روشنی نہیں تھی وہ گم ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا وہ آسانی سے کھو جائے گا ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔

امجد اب میرے پیچھے نہیں تھا۔ برآمدے میں اس کے قدموں کی چاپ ختم ہو گئی تھی۔

خاموش تاریک لان پر اس وقت کوئی حرکت' کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ گم ہو گیا تھا۔ روکسانا کا ٹیپ بجانے والا آدمی یا لڑکا جو بھی تھا گم ہو چکا تھا۔ میں نے بے بسی میں چیختے ہوئے برمی' انگریزی' اردو تین زبانوں میں کہا۔ "لائٹ جلاؤ! خدا کے لئے روشنی کرو۔"

مگر مجھے صرف اپنے گہرے گہرے سانس سنائی دے رہے تھے۔ کسی نے میری پکار کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

"روشنی کرو' روشنی!" میں غصے اور بے بسی میں چیخا۔

اندھیرے لان سے آواز آئی۔ "او خیر ہے' سب خیر ہے۔ پکڑ لیا ہے سورے کو۔" امجد سنگھ کی آواز میں فتح مندی اور اطمینان تھا۔

امجد نے یا تو پیش بندی کی تھی یا اس نے اسے برآمدے سے اترتے دیکھ لیا تھا اور فوراً ہی لان پر پہنچ گیا تھا وہ مجھ سے زیادہ جنگلوں کا رہنے والا نہیں تھا وہ مجھ سے زیادہ جنگلوں کا رہنے والا نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں تیز تھیں۔ اسپیڈ بھی زیادہ تھی اندھیرے میں وہ سیدھا اپنے تیز رفتار شکار پر جا گرا ہو گا۔

بہت سے آواز کرتے' ہدایات دیتے' سوالات پوچھتے لوگ برآمدے میں آگئے۔ ایک کے بعد ایک' روشنی پر روشنی جلائی جارہی تھی۔

اب وہ دونوں مجھے نظر آرہے تھے۔ لال جیکٹ اور جینز والا وہ لڑکا بہت ہوا تو اٹھارہ سال کا ہو گا۔ گھاس پر اوندھا پڑا تھا۔ اور سردار امجد سنگھ ترکھان اس کی کمر پہ تھا۔ باقاعدہ کبڈی کا پالا مارنے والے پہلوان کی طرح وہ اسے دبائے بیٹھا تھا۔

برآمدے کی سب بتیاں جل رہی تھیں۔ کسی نے لان کے اس حصے کو روشن کرنے والی سرچ لائٹ بھی جلا دی تھی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا جیسے سامنے لان پر کسی اصل واقعے کے کردار نہیں اداکار موجود ہیں اور یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔

میں نے الجھ کر کہا۔ "بتیاں بند کرو۔ بس بہت ہو گیا۔"

ولا کے مالک مونگ لی نے کہا۔ "سنا نہیں اتنا بتی مت جلاؤ۔"

اس اثناء میں امجد نے لڑکے پر سے اٹھ کے اسے لان سے اٹھایا تھا اور جیکٹ کا کالر گردن کے پیچھے سے اپنی مضبوط گرفت میں لیے کھینچ کر اسے برآمدے میں لے گیا تھا۔

سینٹ کے زبردست بھبکے کے ساتھ مونگ لی کا ہم شکل کھسرا مونگ جو ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ وہ اپنی تالی پھنکارتی آواز میں برہم ہو کے پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہے؟ اسے کس لیے پکڑا ہے؟" کے کے "کو کس لئے پکڑا ہے؟"

امجد نے لڑکے کی بیلٹ میں لگا سیاہ رنگ کا چھوٹا ٹیپ ریکارڈر اس کی بیلٹ سے کھینچ کے کھسرے مونگ جو کو دکھایا پھر میرے حوالے کر دیا۔ اس سے کہا۔ "لے مونگ

جو مائی ڈیئر! لے دیکھ تیرے "کے کے" کو اس لئے پکڑا ہے۔" امجد نے مونگ جو کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

"یہ کیا ہے؟" مونگ جو نے ہاتھ لہرا کے ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ گدڑ سنگھی ہے۔ گدڑ سنگھی۔" ان حد نے برمی میں بات نہیں کی تھی۔

کھسرا کچھ نہیں سمجھا بس وہ اس کا منہ تکے جارہا تھا۔

مگر پھر وہ پہچان گیا کہ لڑکے کے پاس جو چیز نکلی ہے وہ ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اس لئے لہرا کے پوچھنے لگا۔ "اس کا تیب رکاردر کس لیے چھینتے ہو؟ آں؟ "کے کے" بچے یہ تیرا ہے نار کاردر؟ آں؟"

امجد سنگھ ملازموں کے ہجوم میں راستہ بناتا ٹیپ بجانے والے لڑکے کو ڈائننگ ہال کے برابر کے کمرے میں لے گیا۔ مونگ لی اور مونگ جو ہمارے ساتھ کمرے میں آگئے۔ ہاؤس کیپر باہر جمع ہونے والوں کو منتشر کرنے لگی۔

کمرے میں سب آگئے تو میں نے دروازہ بند کردیا۔

ہمارے میزبان مونگ لی نے تشویش سے پوچھا۔ "سنگھ! کیا ہوگیا؟ پوری بات کیا ہے؟ میں کو افسوس ہے تم دونوں کو کھانا چھوڑ کے اٹھنا پڑا۔"

مونگ جو نے پھر برہمی سے کہا۔ "یہ کھانا چھور کے اٹھا اور میرے کزن کو پکر لیا۔ ایسا کیوں کیا؟ آں؟"

مونگ لی نے اس سے پہلی بار غصے کے لہجے میں کہا۔ "جب مالک اور اس کے: آنریبل مہمان بات کریں تو اسٹاف ممبر کو خاموش رہنا چاہئے۔"

مونگ جو چپ رہا مگر اس کے چہرے سے برابر خفگی ظاہر ہو رہی تھی۔

امجد سنگھ نے لڑکے کو دبوچے ہوئے ایک کرسی سنبھال لی تھی میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر امجد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کھان! یہ پوری بات مونگ لی صاحب کو میں نے بتانی ہے۔"

میں ہاں میں سر ہلا کے چپ ہوگیا تو امجد سنگھ نے جس کا ذہن کوئی بھی کہانی بنانے میں اس وقت تیزی سے کام کر رہا ہوگا کہا "مونگ لی انکل! یہ گانا جو ابھی منڈے نے ٹیپ پے بجایا تھا۔ یہ دشمنوں کے خلاف ہماری پہلی کامیابی ہے۔ سمجھے سر؟ اس گانے سے مالک کرے گا تو ہم نے گھنٹے بھر میں ان لوگ کو جا پکڑنا ہے۔"

"خوب۔ اچھا۔" بوڑھے میزبان نے سمجھتے ہوئے کہا۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ

جب امجد سنگھ کام کی بات کر رہا ہوتا ہے تو اسے سکون سے سننا چاہئے۔

امجد بولا۔ "یہ گانا____ سرو تا کہاں____ وگیرہ وگیرہ انڈیا میں پہلے بہت پاپولر تھا۔ بہت پہلے ففٹی سکسٹی برس پہلے۔ ادھر برما میں شاید ہی کسی نے بھی سنا ہو۔ اس کا مطلب ہے یہ ایسا گانا ہے مونگ لی انکل! کہ ایک ویری سن لوتے فیر یاد رہ جاندا ہے۔ آئی سمجھ میں؟"

مونگ لی نے سر ہلا کر اپنے ہمسائے کی بات سے اتفاق کیا۔

امجد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "یہ گانا اس ٹائم وہ لوگ بجا رہے تھے۔ اشٹین وگین والے۔ تسیں سمجھے کنج؟"

"اوووہ!" مونگ لی نے زور زور سے سر ہلانا شروع کردیا۔ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا۔

"ہا آں۔" امجد نے بھی زور زور سے سر ہلا کر اپنا پوائنٹ پکا کیا پھر بولا۔ "اب آپ کی مرجی ہووے تو امجد سنگھ انوسٹی گیٹ کرلے۔ پوری مسٹری صاف کر کے پتا کرلے۔ یا مرجی ہو تو تمہیں آپ ہی پتا کرلو مگر یہ سمجھو سر! ٹائم جیادہ نہیں ہے۔"

مونگ جو نے کہنا شروع کیا۔ "مسٹر سنگھ سر! میرا کزن۔"

مونگ لی نے گہری آواز میں تنبیہ کی۔ "جو بھی بات ہو مونگ جو! ایک بار بولو اور ابی نہیں بولو نہیں میں تمہیں ادھر سے باہر کردیں گے۔" یہ سن کر مونگ جو سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

کھسرے کی طرف سے مطمئن ہو کے امجد اس لڑکے پر توجہ دے رہا تھا۔

"ہاں وئی۔ ناں کی ہے تیرا؟"

"کے کے۔" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

اگلا سوال لڑکے کی بجائے مالک مونگ لی سے تھا۔ "انکل اس کا کام 'ڈیوٹی جوب' کیا ہے یہاں؟"

"میں کے پاس جواب نہیں ہے اس کا۔ یہ مونگ جو کے ساتھ ہے۔ اس کا مساج بوئے ہے۔ مالشیا' مالشیا۔"

"مطلب مونگ جو آپ کا سرونٹ ہے۔ یہ مونگ جو کا سرونٹ ہے۔ تے فیر اس منڈے داوی کوئی سرونٹ ہونا چائی دا ہے۔ آں؟ مونگ جو؟"

مونگ جو گھور کے امجد سنگھ کو دیکھتا رہا پھر مالک سے بولا "رسپیکٹ فلی سر! یہ

میرا مساج بوائے نہیں ہے سر؟ کزن ہے میرا ___ فسٹ کزن۔"

"اچھا۔ فسٹ کزن توں کھاتا پیتا سوتا کدھر ہے؟ مونگ جو کے بیڈ روم میں؟"

"مالک مونگ لی کہنے لگا۔" میں نے مونگ جو کے بولنے پہ اس کو سرونٹ کوارٹرز میں ایک روم دے دیا ہیں۔ یہ ورکرز میس میں اپنا کھانا کرتا ہے۔"

"رسپیکٹ فلی سر!" کھسرا پھر بولا۔ "یہ آپ کی ولاپے کوئی برڈن' کوئی بوجھ نہیں ہے اور سنے مستر سنگھ سر! اس کو اگلے ویک رنگون میں اپنا جوب پہ جانے کو ہے سر!"

"رنگون میں اس کا کیا جوب ہووے گا۔ ہاں وئی؟ بول کیا کرے گا توں ادھر؟"

کزن "کے کے" نے آہستہ سے کہا۔ ہاں وئی؟ بول کیا کرے گا توں ادھر؟"

کزن "کے کے" نے آہستہ سے کہا۔ "ادھر فزیو تھراپی کا کام سیکھنا ہے۔"

انحد سنگھ کھسرے کی طرف مڑا۔ "وہی مطلب مالشیا۔ ہاں؟ مساج بوائے؟"

مونگ جو کھسرا بولنے کو ہوا پھر کچھ سوچ کے منہ بند کر کے بیٹھ گیا۔

انحد کے لہجے میں سختی تھی اور اس نے اچانک سوال کیا تھا۔ "کے کے! یہ ٹیپ ریکارڈر کس کا ہے؟ ہاں بول' بول' بتا جلدی؟ کس کا ریکارڈ ہے یہ؟"

لڑکے نے گھبرا کے پہلے کزن' مونگ جو کو دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔ "میرا۔"

"بک واس کردا ہے ___ بھینی ___" انحد نے کڑک کے کہا۔ اس کی آواز ایک دم ایسے کڑکی تھی کہ لڑکا چونک گیا' وہ ڈر گیا تھا' صاف نظر آ رہا تھا۔

"آنسٹ بی سر ...... ایمانداری کا بات ہے۔" کھسرا شروع ہوا تھا کہ انحد نے پوری طاقت سے چیخ کر کہا۔ "چپ کر اوئے؟" مالک مونگ لی نے ملامت کی نظروں سے اپنے ملازم کو دیکھا جو اب ہنٹر کھائے ہوئے پلے کی طرح سے ہو گیا تھا۔

انحد نے پھر اچانک نرمی سے اس لڑکے "کے کے" سے پوچھا۔ "کس کا کارڈر ہے؟"

"آپ کو بولانا سر! میرا ہے۔" لڑکے نے ہمت کر کے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔

انحد کا ہاتھ اٹھتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ چٹاخ کی ایک زبردست آواز ہوئی تھی اور بس لڑکے کا سر جھٹکے سے بائیں طرف مڑ گیا تھا۔

کھسرے مونگ جو کے منہ سے کوں کی آواز نکلی ہو گی۔ اس کے چہرے پر

تکلیف کسی اخبار کی سرخی طرح دور سے پڑھی جا سکتی تھی۔

انحد نے اپنے پنجے کو چھوٹی فٹ بال جتنے گھیرے کے مکے میں سمیٹا اور اسے لڑکے کے سر کے گرد گردش دے کر کہا۔ "یہ خالصہ مکا ہے۔ سنا اوئے؟ میرے سے سچ نہیں بکے گا تو ایک ہی مکے میں یہ تیرا تربوج کھول کے رکھ دیاں گا۔ سمجھا اوئے؟ بھئی ___"

لڑکے نے مدد کے لئے مالک مونگ لی کی طرف دیکھا ہو گا مگر اس نے جواب میں حقارت اور بے تعلقی کی آواز نکالی تھی۔ "اہمہ!"

"آؤت! آؤت! ممّی کیوں نہیں بولتا "کے کے؟ سر کو بتا دے یہ کدھر سے آیا تیرے پاس۔" یہ کہتے ہوئے کھسرے کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

"یہ مجھے ایک .... ایک لڑکی نے دیا ہے .... "کے کے" نے بسورتے ہوئے کہا وہ انحد سنگھ سے دور ہونے کے لئے فرش پر بچھے قالین پر دھیرے دھیرے پھیلتا جا رہا تھا۔

انحد نے اس کی جینز کی سیٹ پر اپنے بوٹ کی ٹوکر ماری۔ "سدھا بیٹھ اوئے .... ہاں؟ کیہو جی کڑی نے دتا ہے؟ کیسی لڑکی ہے؟ بول کہاں ملی تھی تجھے؟ بول؟ بول بول؟ جلدی!"

"ادھر جنگل میں۔"

"جنگل میں توں کیا کرنے گیا تھا سورے؟"

"میں! میں تو .... ایسے ہی واک کرتا تھا۔"

انحد سنگھ نے آرام سے اپنے بوٹ کی ٹھوکر لڑکے کی پنڈلی پر ماری۔ زور کی چوٹ لگی ہو گی اس کی آنکھوں میں مارے تکلیف کے پانی آ گیا۔ انحد نے نرمی سے پوچھا۔ "تکلیف ہوئی؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ بسورنے لگا۔ مونگ جو اٹھ کے باہر جانے کو ہوا انحد نے مجھے اشارہ کیا کہ روکو اسے۔ میں نے ایک انگلی کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔

"ہاں وئی جنگل میں مطلب جنگل اچ تسیں کی ویں گئے سن جناب؟" انحد نے بہت تمیز سے پوچھا۔

لڑکے نے بے بسی سے اپنے فسٹ کزن کھسرے کو دیکھا۔

اب امجد نے چیخ کر پوچھا۔ "بولتا نہیں ہے اوئے۔"
اس کے بجائے کھسرا جلدی سے بولا۔ "میں بولتا سر .... یہ حرامی ہمارے کک کی بیٹی کے پیچھے جاتا ہوتا۔ وہ کچن کے لئے بانس کا نواں کوپل .... کوپل سر مالوم؟ کوپل توڑنے جنگل میں جاتی یہ باسترد پیچھے جاکے پکڑ لیتا اسے۔ کس وس کرتا تنگ کرتا اسے۔" کھسرے نے پریشان ہوکر اپنے مالک کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ "سوری سر ماستر! میں اس حرامی کو سیرے ہی رنگون بھیجوں گا۔ آنسٹ تو گا آد' سر!"

امجد نے پوچھا۔ "ہاں وئی؟ عاشقا؟ توں جنگل میں چماشا لینے کو گیا تھا۔ فیر؟ لیا؟"

لڑکے نے بسورتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اوئے ہوئے ہوئے ہوئے۔ نہیں لیا چما۔ کیوں؟"

"وہ نہیں آئی تھی۔"

"اچھا لڑکی نہیں آئی تھی .... فیر؟"

"فیر میں واپس آرہا تھا تو ایک گاڑی جنگل میں دیکھی۔"

"گاڑی؟ کہو جی؟ مطلب کیسی گاڑی؟"

"اسٹیشن بے گن۔"

"اسٹیشن ویگن میں کون تھا؟"

"یہ تو نہیں مالوم۔ گاڑی کی اوٹ میں ایک لڑکی جگ لے کر ہاتھ پاؤں واش کرتی تھی۔"

"کیسی لڑکی؟ اس کی شکل بتا۔"

لڑکے نے جو حلیہ' لباس بتایا وہ روکسانا کا تھا۔

"اچھا؟ تو فیر تو نے اس کڑی کا .... مطلب نویں لڑکی کا چما لیا؟"

وہ پریشانی میں تھا مگر لڑکے نے شرما کر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اوئے ہوئے ہوئے ہوئے۔ اے تے بھیڑی گل ہوئی یار! مطلب بہت برا ہوا کوئی نہ ایک لڑکی سے چما ملا نہ دوجی سے۔ چنگا' فیر آگے سنا۔"

"آگے سر! اس نے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ ایسا ہونٹ پر انگلی رکھ کے۔"

"پھر توں گیا؟"

"ہاں جی۔ گیا۔"

"فیر۔"

"لڑکی نے قریب بلا کے۔ میرے کان میں بولا اگر میرا ایک کام کرے گا تو تجھے یہ دوں گی۔ پاکٹ رکارڈر۔ اس نے ادھر اپنے کپڑوں سے رکارڈر نکال کے بھی دکھایا تھا۔"

"اچھا۔ رکارڈر تجھے اچھا لگا۔ ٹھیک۔ پر اس نے کام کیا بتایا' لڑکی نے؟"

"بولی یہ ایک پرچا ہے۔ پولیس کو ہائی وے پٹرول کو' کسی کو بھی پہنچا دینا۔"

"اچھا .... تو نے کیا کہا؟"

"میں نے پرچا اور رکارڈر لے لیا۔"

"رکارڈر بجا کر دیکھا ادھر ہی؟ چیک کیا؟"

"نہیں ادھر وہ بہت ڈرتی تھی۔ مجھے اشارے سے بھاگ جانے کو بولا۔ ایسا ہونٹ پہ انگلی رکھ کے ...."

"فیر .... توں بھاگ آیا؟"

لڑکے نے ہاں میں سر ہلایا۔

"وہ پرچا؟ پرچا تو نے ہائی وے پٹرول والوں کو کسی کو دیا۔"

لڑکے نے پھر ہاں میں سر ہلایا۔ جس پر امجد نے بغیر نوٹس لیے پھر ایک چانٹا رسید کیا۔

"جھوٹ بکتا ہے سور۔ پرچا تو نے کسی کو نہیں دیا۔"

لڑکا پھر بسورنے لگا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا دھیرے سے بولا۔ "نہیں دیا۔"

"کدھر ہے؟"

"پتا نہیں کدھر گر گیا۔ یا .... نہیں' نہیں .... شاید کدھر پڑا ہوگا۔ سامان میں۔"

امجد نے مجھ سے کہا۔ "کھان یارا جرا اس کا تلاشی لو۔"

میں نے لڑکے کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے چیونگم کا پیکٹ' تھوڑے سے پیسے اور عام طرح کی وہی فضول چیزیں نکلیں جو ایک اٹھارہ برس کے لڑکے کی جیبوں میں ہونی چاہئیں۔

امجد نے موتگ لی صاحب سے کہا۔ "ہمیں اس کا کمرہ دیکھنا ہے۔"

بڑے میاں مستعدی سے بولے ...."بالکل ....بالکل........کیا میں بھی آؤں؟"

امجد نے اپنے میزبان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ کھانا کھالو۔ آرام کرو۔ تھکومت........"

برآمدے میں چینی ہاؤس کیپر بند دروازے کے سامنے پہرہ دے رہی تھی۔ امجد نے کھسرے مونگ جو کو مشورہ دیا کہ وہ ولا کے دوسرے کاموں پر توجہ دے اور فوراً اپنے مالک کو کھانا کھلائے اور اس کے آرام کا بندوبست کرے۔ بڑے میاں تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ امجد نے ہاؤس کیپر کو ساتھ آنے کو کہا۔ لڑکے "کے کے" کے ساتھ ہم دونوں اور ہاؤس کیپر ولا کے سرونٹ کوارٹرز میں پہنچے جو ولا کے پیچھے اونچے درختوں سے چھپا بے رنگ سا علاقہ تھا۔

کک کے کوارٹر سے ملا ولا کے الیکٹریشین کا کوارٹر تھا جس میں ایک کمرہ اس لڑکے کے کے کو دے دیا گیا تھا۔ ہمیں لڑکے کے ساتھ آتا دیکھ کر ایک لڑکی' سولہ سترہ برس کی گھر میں جاتے جاتے رک گئی اور اپنے کوارٹر کے سامنے بچھی کرسیوں کو ڈسٹر سے صاف کرنے لگی۔

امجد نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ "بھائی جی! یہ اس منڈے کا معشوق ہے۔ جو کبھی اسے چمادیتا ہے' کبھی نہیں دیتا۔"

لڑکی نے ہمیں الیکٹریشین والے کوارٹر میں جاتے دیکھا اور ڈسٹر اٹھائے گھر میں چلی گئی۔

یہ دو کمرے کا کوارٹر تھا ایک کمرے میں ایک چارپائی' لاکر' چھوٹی میز اور دو کرسیاں تھیں' دوسرے میں ایک بستر چار' پانچ کرسیاں' الماری' لاکر' میز اور دیوار کے ساتھ سجے ہوئے دو سوٹ کیس غرض ٹھیک ٹھاک سامان تھا۔ دیوار پر ایلزبتھ ٹیلر کی فوٹو لگی تھی۔ سامان والا یہ کمرہ کزن کے کے کا تھا۔

کے کے نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ ہاں یہی اس کا کمرہ ہے۔

امجد نے ایلزبتھ ٹیلر کے رنگین فوٹو گراف کی طرف دیکھا۔ "کاکے! یہ تیری بے بے کا فوٹو ہے؟"

"بے بے۔" لفظ لڑکے کی سمجھ میں نہ آیا اس نے پہلے انکار میں سر ہلایا پھر ہاں میں سر ہلانے لگا۔

امجد سنگھ نے بڑھ کے الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندر زیادہ تر کوسمیٹکس کا سامان تھا جس میں سینٹ کا وہی بھپکا تھا۔ جو کھسرے مونگ جو کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ کھیل اور ورزش کی چھوٹی چیزیں اور پرانے فلمی میگزین بھی تھے۔ امجد نے لاکر کھول کے دیکھا اس میں ٹن پیک باسکٹ' پنیر' ایک جالی کے تھیلے میں کوئی درجن بھر سیب' نارنگیاں' آڑو اور خالی مگ' چوکلیٹ اور شوگر کے بڑھیا کیوب بڑی چیزیں تھیں۔

امجد نے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ "کیوں اوئے' سب یہ تیرے فسٹ کزن کھسرے مونگ جو صاحب کا تحفہ ہے؟ ہاں؟ بول۔"

لڑکے نے ہاں میں سر ہلایا پھر انکار میں پھر کہنے لگا۔ "نارنگی' سیب کک کی لڑکی نے دیا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ انکل مونگ لی کا مال کاٹا جا رہا ہے۔ اس کے ماشیے کا ماشیا عیش کر رہا ہے۔ ہاں کھان؟ صحیح بولا نا؟ چے وی لے رہا ہے کڑیوں کے ہور پھروٹ شروٹ وی کھا رہا ہے۔"

ہاؤس کیپر یہ سب دیکھ کر پہلے پنک ہوئی ہوگی' اب دھیرے دھیرے سرخ اور سرخ سے میرون ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی یونیفارم کی جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالی تھی۔ اور وہ چینی زبان میں تیزی سے کچھ لکھتی جا رہی تھی۔

امجد سنگھ نے لڑکے کو اشارہ کیا کہ سوٹ کیس کھول۔ لڑکے نے جیب سے چابی نکال کے ایک سوٹ کیس کھولا جس میں ورزش کے اسپرنگ' باکسنگ کے دستانے اور اسی قسم کا کھیل کا قیمتی سامان تھا۔ یہ سب ایک تولیے میں لپٹا تھا تولیے پر ایک کونے میں چینی زبان میں کچھ چھپا ہوا تھا دوسرے کونے میں اسی گہرے سرخ رنگ سے انگریزی میں چھپا تھا۔ "مونگ لی نمبر اسٹیٹ۔" ہاؤس کیپر نے چٹکی سے پکڑ کر انگریزی میں لکھا مجھے اور امجد کو دکھایا اور بہت غصے میں اپنی نوٹ بک پر پنسل چلانے لگی۔

دوسرے سوٹ کیس میں کزن "کے کے" کے پہننے کے دھلے ہوئے کپڑے تھے۔ سوٹ کیس میں کچھ کارڈ سائز رنگین فوٹو گراف اور کاغذات بھی تھے جو خط یا سرٹیفکیٹس تھے۔ وہ پرچا جسے ہم تلاش کر رہے تھے نہیں ملا۔

امجد نے لڑکے سے کہا کہ کیا دوسرے کمرے کا لاکر کھل سکتا ہے؟ اس نے کہا۔ نہیں الیکٹریشن کے پاس چابی ہے' وہ میس گیا ہوا ہے۔ ویسے اس میں لڑکے کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لڑکا صرف اپنے کمرے تک محدود رہتا ہے یا پھر باتھ روم۔

امجد نے کہا کہ چل باتھ روم دکھا۔

باتھ روم میں ایک میڈیسن باکس دیوار میں نصب تھا اور کھونٹیاں تھیں ایک کھونٹی سے میلی جینز ٹنگی تھی۔ امجد نے پوچھا۔ "یہ تیری جینز ہے؟" لڑکے نے ہاں میں جواب دیا تو سردار نے کہا۔ "اس کی جیبیں الٹ کے دکھا۔"

لڑکے نے جینز کی جیبیں الٹیں۔ اس کی ہپ پاکٹ سے سگریٹ کے نرم پیکٹ سے پھاڑا ہوا مڑا تڑا کاغذ باتھ روم کے فرش پر گرا۔ لڑنے نے کہا۔ "یہی ہے۔"

اس کے اٹھانے سے پہلے امجد نے وہ کاغذ اٹھالیا۔ کاغذ پر چمکیلے سرخ رنگ سے کچھ لکھا تھا۔ روکسانہ نے اپنا پیغام لکھنے کو اپنی لپ اسٹک استعمال کی تھی۔ پیغام مختصر تھا۔

"ہم کو سرکس سے اغوا کیا گیا ہے۔ دونوں ٹھیک ہیں۔ وہ روٹ ۷۳ جانے کی بات کرتے۔" لکھتے ہوئے لپ اسٹک ٹوٹ گئی تھی یا کچھ اور ہوا تھا۔ تاہم پیغام مکمل تھا۔

دونوں کا مطلب ہے میری دوست رشنا بھی ساتھ ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

روٹ ۷۳ یہ ہائی وے کے کسی روٹ کا نمبر ہوگا۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔

میں نے امجد کی طرف دیکھا اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں نے سمجھ لیا ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ اور لڑکے سے تصدیق کی کہ کیا یہ وہی پرچا ہے جو لڑکی نے ٹیپ رکارڈر کے ساتھ اسے دیا تھا۔ لڑکے نے کہا کہ ہاں وہی ہے۔

"پھر ہم دونوں ہاؤس کیپر کے ساتھ الیکٹریشن کے کوارٹر سے نکل آئے۔

کک کے کوارٹر کی ایک کھڑکی کا پٹ اور پردہ کھلا ہوا تھا۔ ہمیں آتے دیکھ کر کسی نے اس کمرے کی بتی بجھا دی۔ کھڑکی تاریک ہوگئی۔ یہ کک کی لڑکی ہوگی جو کھڑکی سے لگی بیٹھی جائزہ لے رہی تھی۔

ولا کے ڈائننگ ہال میں روشنی ہو رہی تھی۔ مالک مونگ لی ابھی میز پر تھا اور پھل تراشنے والے چاقو سے اپنے لیے بہت کنجوسی سے ایک سیب کی قاشیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر پلیٹ چھوڑ کے اٹھنے لگا۔

امجد نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ بولا "انکل مونگ لی! ہم جو تلاش کر رہے تھے مل گیا۔ اب ہم کو روٹ ۷۳ پر جانا ہوگا۔"

"روٹ ۷۳؟ مطلب تم سلہٹ والا کے اسٹیٹ جائے گا پھر آگے، پھر آگے۔

سیدھا تھاپا اسٹیٹ تک جانے کو ہوگا۔ ادھر یہ روٹ ۷۳ ختم ہو کے روٹ ۴۲ مل جاتا ہے۔ ٹھیک بولا نا؟"

امجد نے کہا۔ "ٹھیک۔"

"مگر تم کھانا کھائے بغیر کدھر بھی نہیں جائیں گے۔" مونگ لی نے یہ بات اپنی ہاؤس کیپر کی طرف دیکھ کے کہی تھی۔

ہاؤس کیپر جس کا رنگ اب پھر بحال ہو کر پنک ہو گیا تھا مستعدی سے سر ہلاتی اپنے کچن کی طرف چلی گئی۔

جب تک ہم کھانے کی میز پر رہے انکل مونگ لی بھی بیٹھا رہا۔ ہم زیادہ دیر مونگ اسٹیٹ میں نہ رکے۔ کھانا کھا کے کافی پی کے اپنی جیپوں کی طرف آگئے۔ انکل مونگ لی کو امجد نے ضد کر کے بستر پر بھیج دیا تھا۔ اس کی خصوصی ہدایت پر ہاؤس کیپر ہمیں جیپوں تک چھوڑنے آئی۔

گاڑی ان حد نے سنبھالی۔ وہ اسٹیئرنگ پر جھکا بیٹھا چینی ہاؤس کیپر کو ادھ کھلی آنکھوں سے کچھ دیر دیکھتا رہا۔ ہاؤس کیپر کو جو اپنے باس کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس وقت تک پورچ میں کھڑے رہنا تھا۔ جب تک مہمان کی گاڑی چلنا نہ شروع ہو جائے۔ وہ بے چاری اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے۔ جو اس کے فرائض میں شامل تھا کبھی میری طرف، کبھی امجد سنگھ کی طرف دیکھتی تھی اور بے بسی میں اپنا وزن کبھی ایک کبھی دوسرے پیر پر ڈالتی تھی۔ میں نے الجھ کر کہا۔

"امجد! اب چل نا بھئی۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "کبھی کبھی ادھر ایسٹ میں پیدا ہونے پہ گصہ وی آتا ہے شیر کھان!" میں سمجھ رہا تھا اس کا اصل مخاطب میں نہیں ہوں۔ وہ کوئی چھیڑنے والی بات کہہ رہا ہے۔

میں خاموش رہا تو خود ہی بولا۔ "جے اسیں ایسٹ میں پیدا نہ ہوتے۔ یورپ، امریکے میں پیدا ہوتے تو اج سکھی جیسی کھدا حافج۔ مطلب سوکھی جیسی گڈبائی نہیں ناں کرتے۔ آئی سمج میں؟ تو جناب! پہلے اسی گڈی سے اترتے۔" یہ کہہ کر امجد سنگھ گاڑی سے اتر گیا۔

"گڈی سے اتر کے جناب اسیں اپنے چینی معشوق کی طرف قدم بڑھاتے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بانہیں پھیلا کر ہاؤس کیپر کی طرف دو قدم بڑھا۔

وہ پیچھے ہٹی۔ امجد نے اسی طرح مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "فیر جناب! اسیں اپنے معشوق کے گلے وچ اپنی بانہہ .... ہاہاہا۔" امجد نے ہاؤس کیپر کے گلے کا ہار ہونے کو اپنے بازو پھیلائے ہوں گے کہ وہ اپنے تنگ چینی کپڑوں اور کھونٹیوں جیسے جوتوں کے باوجود اس کے ریچھ جپھے میں آتے آتے نکلی اور ہوا ہو گئی۔ امجد ڈھیٹ پن سے ہاہا کر کے ہنسا اور اسے پکار کر گڈبائی کہتا ہوا اسٹیئرنگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

ہم تیزی سے مونگ ولا سے نکل کر ہائی وے کے روٹ ۳۷ پر آ گئے۔ امجد نے جیپ اتنی تیز چلانی شروع کی تھی کہ میرا جی چاہتا تھا اسے ٹوک دوں۔

مگر وہ تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے گہری سوچ میں تھا۔ سارا چلبلا پن اور شوخی جیسے مونگ ولا میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے سوچا اسے ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

ہم زوبر میاں کی ٹمبر اسٹیٹ کی طرف چل پڑے تھے۔

زوبر میاں سلہٹی کا نام زبیر میاں تھا یا جبار میاں، زوار میاں تھا یا خدا جانے زوبر ہی تھا جس کے کچھ معنی سہلٹ میں ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں۔ بہر حال امجد سنگھ انہیں جو بر کہتا تھا جو سننے والے کو کبھی کسی انگریز کا نام لگتا ہو گا کبھی جاب سنبھالنے والے فورمین کی قسم کے فیکٹری عہدے دار کا عہدہ لگتا ہو گا۔ جو بھی ہو ہماری اگلی منزل زوبر میاں کی ٹمبر اسٹیٹ تھی۔

ہم ہائی وے کے جس ٹکڑے سے اب گزر رہے تھے۔ یہ سرسبز پہاڑی ٹکڑا تھا۔ امجد سنگھ کسی ٹمبر اسٹیٹ سے یہ ہائی وے چار پٹی یا چار لین والی سڑک بن کے چلی تھی۔ مونگ صاحب کے علاقے میں کچھ دور تک چار قطاروں کی ٹریفک کا انتظام رکھا گیا تھا پھر یہ سڑک دو قطاروں یا دو لین والی ہو گئی تھی۔ کوئی بغلی سڑکیں بھی نہیں نکلتی تھیں اس لئے امجد سنگھ کا خیال تھا کہ زوبر میاں سلہٹ والا کی جائداد تک پہنچتے ہوئے ہمیں ایک بات کی بے فکری ہونی چاہئے۔ یعنی مونگ اسٹیٹ سے چلی ہوئی اسٹیشن ویگن کو ہر حال میں اس پہاڑی سڑک پر چلتے رہنا اور مسلسل چلنا پڑا ہو گا۔ کیوں کہ اب یہ تنگ سڑک ایک طرح کی سرنگ بن گئی تھی جس کے ساتھ ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سب کا اگلا پڑاؤ زوبر میاں کی اسٹیٹ پر ہی ہو تا تھا۔

پورے چاند یا تقریباً پورے کی راتیں تھیں۔ پیچھے آنے والے ڈرائیور نے اپنی جیپ کا ٹیپ رکارڈر بجانا شروع کر دیا تو امجد ایک دم بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنی رفتار کم کر کے ڈرائیور کو قریب آنے دیا اور جب وہ اتنے نزدیک آ گیا تو امجد کی پھینکی ہوئی گالی

ٹھیک نشانے پر لگ سکتی تھی تو سردار نے ایک زبردست کپور تھلہ۔ چھاپ گالی پھینکی جس میں اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ کھوتا راگ بند کر دے اور چوتھائی میل کا فاصلہ رکھ کے خاموش چلا آئے۔

میں نے کہا۔ "سردار' تو نے گالی دے کے' شور مچا کے اس کی چاندنی کا مزہ تو کرا کرا کر دیا۔"

امجد بولا۔ "اس سورے کو مجا لینے کا کوئی ادھیکار مطلب حق نہیں ہے وہ ڈیوٹی پر ہے۔"

پہاڑی راستہ پیچ دار تھا مگر خوش حال ٹمبر جائدادوں کا علاقہ تھا اس لئے حکومت اور ٹمبر کے بیوپاریوں نے اسے بنا سنوار کے اور کار آمد بنا کے رکھا تھا۔ قدرتی حسن اپنی جگہ الگ تھا۔

ہم نے تیزی سے رستہ طے کیا پھر بھی کہیں ساڑھے تین بجے کے بعد زوبر میاں سلہٹی کی کوٹھی نظر آئی۔ مجھے اگر پہلے سے پتا نہ ہوتا تو بھی کوٹھی کا چہرہ دیکھ کر اور اس کے لمبے چوڑے احاطے میں بنے ڈاک بنگلوں جیسے گھر دیکھ کر میں سمجھ جاتا کہ کسی نے برما میں یہ بنگال بسانے کی کوشش کی ہے۔ کوٹھی کی کھپریلیں' ڈاک بنگلوں کے گرد اگرد کے ناریل کے جھنڈ' جگہ جگہ بنائے گئے مچھلی تلاب یا پوکھر۔ یہ سب بنگال کی۔ میرے گھر مشرقی پاکستان کی یاد دلاتا تھا۔

توقع کے عین مطابق کوٹھی یا بڑا بھاری سلاخوں والا پھاٹک بند تھا مگر گارڈ کی لمبی اونچی برجی پر پیلے بلب کی روشنی میں کمبل اوڑھے کوئی کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ایک ہی منٹ بعد امجد کو اور مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ جو بھی ہے ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ نماز پڑھ رہا ہے۔ شاید تہجد کی نماز۔

امجد نے اپنے ڈرائیور کو جو گارڈز کو متوجہ کرنے کے لئے ہارن بجا رہا تھا ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ سردار مجھ سے کہنے لگا۔ "یہ جو نماج پڑھتا ہے جو میاں کا ماموں ہے۔ سب گارڈز اس کے مرید ہیں تو اکثر مڈنائٹ کے بعد کی نماج مامو ساحب ادھر ہی پڑھتا ہے۔ اس نے ایک ویری مجھ کو اپنا مرید بنانے کی کوشت (کوشش) لی تھی۔ پر میں نے عرج کیا ماموں صاحب! سب اسے ماموں صاحب بولتے ہیں۔ میں نے بولا۔ ماموں صاحب! سرکار' میں تو آپ کا مرید بن جاؤں گا' حاجر ہوں۔ پر دوجے مریداں پہ چنگا امپریشن نہیں ناں پڑے گا۔ مڈنائٹ کے بعد کی نماج میں تو پڑھ ہی نہیں سکدا۔ اس ٹائم

الٹا پڑا ہوتا ہوں۔ تالے داروں میں نے چھڈنی نہیں ہے' سوری جان کو آئی ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر کیا بولے ماموں صاحب؟"

"ہور انہوں نے کیا بولنا تھا جی۔ اللہ لوگ ہیں۔ بولے۔ پتر امجد سنگھ صاحب! ہر ایک کو صاحب بولتے ہوتے ہیں' صفائی والے کو بھی' جمادار صاحب' بولے امجد صاحب! جس کا کارکھانہ ہے جس نے سنگھ صاحب! آپ کو روشنی دکھائی ہے۔ اسی نے شراب خبیث سے آپ کی جان وی چھڑائی ہے۔ یہ میرا آپ کا برابلم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "فیر ٹھیک ہے ماموں صاحب! سر! ادھر تسیں میرے واسطے دعا فرماؤ کی خبیث سے جان چھوٹے میری۔ ادھر میں مالک کو عرج کرنا کہ گرو! مینوں روشنی دکھا۔"

"اچھا تو یہاں یہ معاملہ رکا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا۔ "ہاں بھائی جی! ابھی تو مالک سے عرج کر رہے ہیں ہم دونوں۔"

اس دوران ماموں سلام پھیر کر کسی گارڈ کو اندر سے جگا لائے تھے۔ گارڈ نے طاقت ور ٹارچ لائٹ ہماری جیپ پر پھینکی نمبر نشان پڑھ کے ماموں صاحب سے کچھ کہا تو انہوں نے برجی کے پیراپٹ کے قریب آواز دی۔ "کیا امجد سنگھ صاحب ہیں؟"

امجد نے جواب میں نعرہ لگایا۔ "ست سری اکال ماموں صاحب۔"

"ارے واوا وا بھائی۔ وعلیکم السلام سنگھ صاحب! ٹھہرو ٹھہرو ابھی پھاٹک کھلواتا ہوں۔"

پھاٹک کھول کر گارڈوں نے دونوں جیپیں اندر لے لیں۔ ہم نے دیکھا ماموں صاحب برجی کی سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اتر کر ہماری طرف آرہے ہیں۔ امجد سنگھ جیپ سے نکل کے ماموں صاحب کی طرف دوڑا۔ "نہیں سرکار' ماموں صاحب! تسیں ادھر نہیں آؤ۔ کھلے علاقے میں سردی بہت ہے۔ آرہا ہوں میں آپی آرہا ہوں۔"

اس نے جھک کر سیڑھیوں پر کھڑے ماموں صاحب کے پیر چھوئے اور انہیں سہارا دے کر واپس برجی کی سیڑھیاں چڑھانے لگا۔ ایک بار مڑ کر اس نے مجھے آواز دی تھی۔ "اوئے شیر کھان! آوئی۔ توں وی آ جا سلام کر لے' مرشد ہوری کی دست بوسی کر لے۔"

برجی یا گارڈ روم میں اندر کم ہی جگہ تھی۔ سب گارڈز باہر سائے میں بچھی ماموں کی نماز کی چوکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ہم اور ماموں صاحب۔ گارڈ روم میں سلام دعا خیر وعافیت کرتے رہے۔

ماموں صاحب کا ذرا گندمی سا چہرہ سلہٹ کے زمین داروں اور اشراف کا نرم چہرہ تھا۔ وہ بیٹھے لہجے میں بات کرنے کے عادی تھے جو کانوں کو بھلا لگا۔ میرا تعارف کا کسیز بازار کے حوالے سے کیا گیا تھا تو مشرقی پاکستان کی نسبت سے ماموں صاحب نے مجھ پر اضافی شفقت کی۔ ایک گارڈ نے اندر کوٹھی کے اسٹاف کو انٹر کام پر ہمارے آنے کی خبر کر دی تھی۔

اور پانچ چھے منٹ رک کر ماموں صاحب کو وظیفہ پڑھتے چھوڑ کر ہم کوٹھی کے لئے چل پڑے۔ ہمارے استقبال میں کوٹھی کی بتیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ نوکر پیادے نکل نکل کے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

سیڑھیوں تک جیپ لے جانے کے بعد امجد نے آواز لگائی۔ "اسیں اتر رہے ہیں وئی' کوئی کتا شتا تو کھلا نہیں وئی؟"

پرانی برجیس جودھپوری کوٹ اور لمبے بوٹ پہنے ریاستی شکاریوں کے سے حلیئے میں مگر ننگے سر ایک کالا بھجنگ آدمی کہیں سے نکل کے آیا اور ہاتھ کے اشاروں سے اطمینان دلانے لگا کہ کتے سب سنبھال لئے گئے ہیں۔ ہم لوگ گاڑی سے اتر سکتے ہیں۔ امجد سنگھ نے بتایا کہ یہ آدمی زوبر میاں کا ڈاگ کیپر ہے۔ نام اس کا کسی کو نہیں معلوم میزو قبائلی ہے۔ کتوں کے ساتھ رہ رہ کے آدھا کتا بن گیا ہے۔ اس سے ہشیار رہنا۔

میں نے پوچھا کہ یہ کیا کرتا ہے جو مین اس سے ہشیار رہوں؟ سردار جی بولے کہ وہ کہتے ہیں نا کہ کوئی آنکھوں کا کاجل چوری کر سکتا ہو تو یہ اتنا ماہر ہے کہ سورا آنکھیں تک چوری کر سکتا ہے اور انکھیاں والے کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ میں نے کہا حیرت ہے تو وہ بولا۔ "ہاں بس حیرت کرتے رہو اور ہشیار رہو۔ زوبر میاں مہینے میں ایک یا دوبار اسے ہنٹر سے پیٹتا ہے۔ تب کنٹرول میں آتا ہے مگر یہ کام کا بہت ہشیار ہے۔" میں نے کہا یہ تو کتوں کا راشن چوری کر لیتا ہوگا تو امجد نے اطمینان دلایا کہ نہیں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ زوبر میاں کے کتے بہت زیادہ کتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کتے پن پہ اتر آتے ہیں۔ میزو چوری کرنے کی سوچنا بھی شروع کر دے تو آنکھیں اور دانت دکھاتے ہیں اور غراغرا کے میزو کا دم نکال دیتے ہیں۔

امجد نے یہ بھی بتایا کہ ماموں صاحب کو اس کی قبائلی زبان تھوڑی بہت آتی ہے تو وہ اکثر اسے سمجھاتے اور نرگ مطلب جہنم کی آگ سے اسے ڈرانے کی کوشش

کرتے ہیں اور چوری سے باز رہنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ تو سورا بد معاشی کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے پوچھا کیسی باتیں تو امجد بولا۔ "او نہیں یار۔ میں وہ ریپیٹ نہیں کر سگدا اجرت الیلیے شاہ دا مرید آں سمجھ لو آدھا مسلم تے میں وی آں۔ سچ لو میجو (میزو) سورا بالکل جنگلی ہے۔ اس کی عقل وچ کوئی چنگی گل آہی نہیں سگدی۔"

ہم جیپ سے اتر کے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ زوبر میاں اوورکوٹ میں بنڈل بنا ہوا کوٹھی کے برآمدے سے ہماری طرف بڑھتا دکھائی دیا۔

زوبر میاں سلہٹی کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ اپنے صوفی ماموں کے برخلاف ایک خشک سے مذہبی آدمی ہوں گے۔ ویسے بھی چگی ڈاڑھی، شوخ رنگ کے اسکارف اور کیمل کلر کے بھاری اوورکوٹ میں ان کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پینتیس اور چالیس کے درمیان کی کسی عمر کے آدمی تھے۔ میں نے سوچا یہ باتیں بہت کرتے ہوں گے کیوں کہ وہ اپنی رو میں بار بار قیمتی امپورٹڈ سگریٹ کا بیس والا پیک اور شاید سونے چڑھا لائٹر اپنے کوٹ کی جیب سے نکالتے اور جب فوراً ہی یاد آجاتا کہ سامنے ایک سردار جی بیٹھا ہوا ہے تو دونوں چیزیں واپس جیب میں ڈال لیتے مگر پانچ منٹ بعد باتوں کی رو میں بھول جاتے اور پھر سگریٹ لائٹر نکال لیتے اور پھر وہی عمل دہراتے۔ ایک بار امجد سنگھ نے اس کے کہہ بھی دیا کہ او بھائی کیوں بار بار دل کو مار رہا ہے۔ سگریٹ پی لے، میں نے کچھ نہیں کہنا ہے اس پر زوبر میاں نے ایک نوکر کو جو کافی کے برتن لگا رہا تھا بلا کر سگریٹ اور لائٹر حوالے کئے اور اشارہ کیا کہ اندر رکھ آئے۔

سگریٹ کی طلب سے اس طرح نمٹنے کے بعد زوبر میاں یکسوئی سے باتیں کرنے لگے۔

امجد نے انہیں اور ہی کہانی سنائی وہ اس طرح تھی کہ میں شیر کھان یو کے سے اپنی بیگم رشا خان کے ساتھ رنگون آیا ہوں۔ ساتھ ہی کھیلی ہوئی سرکس کے کسی مالک کی بیٹی روکسانہ سے ملنے اور ایک شب اپنی سہیلی کے ساتھ ٹھہرنے کی نیت سے رشا بی بی اس اپنے میاں کے ساتھ سرکس کو تلاش کرتی ادھر آئی ہے۔ رات ہی میں سرکس والوں پر کسی دشمن پارٹی نے حملہ کیا اور خان کی نئی اسٹیشن ویگن، جو اس حلئے کی ہے۔ چوری کرلی ساتھ میں دونوں عورتوں رشا اور روکسانہ کو بھی اغوا کرلیا۔ مونگ لی صاحب کی ٹمبر اسٹیٹ تک ان کے آنے کا سراغ ہم نے اٹھالیا ہے۔ سرکس والے کی بیٹی کے ہاتھ کا ایک پرچا ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ اغوا کرنے والے ہمیں ہائی وے کے روٹ ۳۷ پر

لے جا رہے ہیں تو انہیں ہم سے پہلے سمجھو کئی گھنٹے کا اسٹارٹ مل گیا ہے اگر وہ مونگ اسٹیٹ سے واقعی روٹ ۳۷ پر نکلے ہیں۔ واپس رنگون کی طرف نہیں چل پڑے یا کہیں پہاڑیوں میں نہیں غائب ہوگئے۔ تو یقیناً تمہاری اسٹیٹ سے گزرے ہوں گے۔ اپنے آدمیوں سے پوچھو، پتا کرو کہ کل اتنے بجے اور اتنے بجے کے درمیان اس اس طرح کی اسٹیشن ویگن پر تو کسی کی نظر نہیں پڑی؟

اس وقت میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر مونگ لی کو وہ ٹرکی فارم والی کہانی اور زوبر میاں کو یہ سہیلی والی کہانی سنانے میں امجد سنگھ کی مصلحت کیا ہے۔

بعد میں جب زوبر میاں کسی کام سے اٹھا تو میں نے پوچھ لیا۔ امجد بولا کہ دونوں الگ الگ لوگ ہیں۔ موگ لی بودھ مذہب کا پیروکار ہے۔ زندہ لڑکی کو آگ لگانے والی کہانی سنا کے میں نے اسے لرزا دیا یہ ضروری تھا پھر اگر میں پہلے ہی لڑکیوں کے اغوا کا قصہ سنا دیتا تو وہ سمجھتا کہ یہ سردار کی عورت بازیوں کا کوئی چکر ہے اس لئے دلچسپی نہیں لیتا پھر اس نے بتایا کہ زوبر میاں کا آنا جانا میری اسٹیٹ میں بہت ہے اسے معلوم ہے کہ میرا کوئی ٹرکی ورکی فارم نہیں ہے۔ پھر یہ فیملی والا ہے اور مسلمان بھائی ہے شیر خان کی منکوحہ کو بازیاب کرانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

پھر امجد بولا۔ "بھائی جی! ساڈا تے وہ حال جے کی ایک جبر دست شاعر فرماندے نیں۔ میں کسنے داسوار آں کسے دا کوڑا (گھوڑا) تے کسے نوں عبرت دا تا جیانہ مطلب کوڑا (تازیانہ) سمجھ آئی کج؟"

یو کے سے برما تک اور برما میں بھی امجد سنگھ تک پہنچتے پہنچتے شاعر مشرق علامہ اقبال کا مصرعہ کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ۔ اس طرح ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سردار دوست سے کہا کہ جی ہاں میں بالکل سمجھ گیا ہوں۔

ذرا تازہ دم ہو کے ہم زوبر میاں کی ٹمبر اسٹیٹ میں پوچھ گچھ کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ یہاں سے آگے زوبر میاں نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ امجد سنگھ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہمیں لیکر مزدوروں کے میس والے شیڈ میں جانا چاہتے تھے۔ ان کے کارندوں نے متعلقہ فورمینوں کو ٹیلی فون پر ہدایات پہنچوا دی تھیں کہ ہائی وے اور کسی ممکنہ ذیلی راستے کے قریب کام کرنے والے گینگ کو ہم سے بات کرنے کے لئے سب سے پہلے تیار رکھنا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم زوبر اسٹیٹ کی مرکزی میس میں پہنچے۔

زوبر میاں نے ابتدا میں چند لوگوں سے پوچھ گچھ کی پھر وہ برابر کے شیڈ میں نماز کی امامت کرنے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ چلے گئے۔ باقی لوگوں سے الحمد اور میں پوچھتے رہے۔ سلہٹ کے ایک ہندو باپ بیٹے پوچھ گچھ کے لئے پیش ہوئے۔ ان کی یادداشت میں اس رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن تھی جسے ان دونوں نے زوبر میاں کی کوٹھی کے آگے ہائی وے پر چھوڑ کر ایک کچے پہاڑی راستے پر چڑھتے دیکھا تھا۔ کم روشنی میں ویگن میں بیٹھی ہوئی عورتیں انہیں شاید بچے وغیرہ سمجھ میں آئے تو خیال ہوا ہوگا کہ کوئی فیملی تفریح کے لئے اس جنگلی ریسٹ ہاؤس تک جارہی ہے جو ٹمبر جائداد کے چوکی دار کی کیبن سے نظر آتی ہے۔ پکنک کرنے والوں کے لئے موسم سخت ہوتا جارہا تھا لیکن سلہٹی باپ بیٹے نے سوچا۔ دولت مند لوگوں کے مزاج کا کیا ہے۔ کیا خبر انوکھے ٹائم یہ سخت موسم میں سردی اور ہوا کی کاٹ دیکھنے کے لئے ہی گھر سے نکلے ہوں۔ اس لئے انہوں نے اس وقت کوئی خیال نہیں کیا۔ پوری بات بھول گئے۔ ”مگر اب جو مائی باپ آپ لوگ پوچھتے ہو تو یاد آیا ہے۔ جی ہاں اسٹیشن ویگن کا رنگ ڈھنگ اسی طرح کا تھا جیسا آپ بتا رہے ہو۔“

زوبر میاں نماز پڑھ کے اپنے مقتدیوں کے ساتھ لوٹ آئے تو ہم نے سلہٹی باپ بیٹے کی رپورٹ دی اگرچہ دوسرے کسی نے اس طرح جاتی ایسی کوئی گاڑی نہیں دیکھی تھی لیکن زوبر میاں کو یقین تھا کہ باپ بیٹا دونوں ہشیار ہیں۔ نہ تو ان سے دیکھنے میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے نہ ہی یہ غیر ذمے داری سے کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔

ہم ٹھیک رستے پر تھے۔ ہمیں اغوا کرنے والے بدمعاشوں کے قدموں کے نشان ملتے جارہے تھے۔ زوبر میاں شکاریوں کے کٹ میں تھے۔ انہوں نے کوٹھی پر فون کر دیا کہ ڈاگ ٹرینر میزو کو فلاں فلاں دو کتوں کے ساتھ فوراً یہاں بھیج دو۔ وہ تو ویگن دیکھنے والے باپ بیٹے کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے مشورہ دیا کہ ہم گاڑی کے گزرنے کے نشانات اور شہادتیں دیکھنے جارہے ہیں۔ زیادہ بھیڑ بھڑ کا ساتھ رکھیں گے تو فائدے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہے۔

اوپر پہاڑی پر کچھ دور نظر آتی ٹمبر اسٹیٹ کے چوکی وار کی کیبن تھی اور اس سے اوپر بے ضابطہ پہاڑی سڑک یا جیپ کا ٹریک تھا۔ اس طرح کے ٹریک پر جیپ یا زیادہ سے زیادہ مضبوط فور وہیل ڈرائیو قسم کی اسٹیشن ویگن ہی جاسکتی ہے۔ یہ ٹریک اوپر جھاڑیوں‘ چٹانوں میں چھپے جنگلی ریسٹ ہاؤس تک جاتا دکھائی دیتا تھا۔ زوبر میاں نے کہا کہ

جنگلی ریسٹ ہاؤس کے برابر سے ایسا ہی ٹریک آگے نکلتا ہے جس پر جیپ یا اسٹیشن ویگن ہی جاسکتی ہے۔ دوسری کسی گاڑی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

ہمارا اس وقت کا مشن یہ تھا کہ سلہٹی باپ بیٹے کی دیکھی ہوئی ویگن کے اس ٹریک پر چڑھنے اور آگے ریسٹ ہاؤس کے برابر سے گزرنے یا نہ گزرنے کی شہادتیں حاصل کرلیں پھر آگے کی کچھ حکمت عملی تیار کریں گے۔

یہ دراصل ایک شارٹ کٹ تھا۔ دو میل جنگل میں اور پہاڑی ڈھلان پر چلنے کے بعد یہ شارٹ کٹ ہائی وے کے روٹ ۳۷ سے جاملتا تھا اگر ویگن کو اس ٹریک پر چڑھالیا گیا ہے اور ابھی تک اوپر چھپا کر نہیں رکھا گیا تو اغوا کرنے والے بدمعاش اس جیپ ٹریک کا شارٹ کٹ استعمال کر کے آگے روٹ ۳۷ سے جاملے ہوں گے اوپر چل پڑے ہوں گے۔

چلنے سے پہلے زوبر میاں نے اپنے ماہر شکاری کتوں کو روکسانہ کا ٹیپ رکارڈر اور لپ اسٹک سے لکھی ہوئی تحریر والا پرزہ سنگھا دیا۔ خود زوبر میاں طاقت ور ٹارچ کی مدد سے زمین پر ٹائروں کے نشانات کا کھوج لگاتے آگے آگے چلنے لگے اور ہم لوگ پیچھے تھے۔ ابھی پوری طرح روشنی نہیں ہوئی تھی اس لیے جنگلی ٹریک پر ٹائروں کے نشانات دیکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ایک اور بات میں کھوج اٹھانے والے کتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ مجھے تو زوبر میاں کے کتے اور کتوں کا ٹرینر سبھی کام چور لگے۔ کبھی تو دونوں کتے ٹریک پر چمک کر ایسے دوڑتے کہ لگتا اگلی جھاڑی یا چٹان کے پیچھے ہی روکسانہ اور رشنا کھڑی ہیں۔ بس مل جائیں گی اور کبھی کتے اور ساتھ میں ان کا ٹرینر بے سدھ اور بے تعلق ہو کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے۔ ہمارا دونوں کا بس اتنا کام تھا کہ کتوں کے پیچھے بساط بھر کھوج اٹھاتے چلے آئیں۔ جب دونوں کتوں اور میزو ٹرینر کو بے تعلق ایک طرف کھڑے بہت دیر ہو جاتی تو آگے سے زوبر میاں کی آواز آتی۔ ”آرے چالو نا بابا! ادھر آؤ۔ کیا کتا کے ساتھ ادھر ہی کھوڑا کھوڑا مور گیا ہے؟“

ظاہر ہے میزو ادھر ہی کتوں کے ساتھ کھڑا مرتا نہیں تھا صرف اونگھ رہا ہوتا تھا۔ وہ اور کتے اپنے مالک کی آواز سن کے پھر کچھ اور چلتے اور کھڑے ہو جاتے۔

اس جنگلی ٹریک پر پایا تو اتنے جنگلی جانوروں کی بو تھی کہ کتے گھبرا گئے تھے یا ان کی دلچسپی کی کوئی بھی بو نہیں تھی وہ اسی لئے زیادہ کچھ مستعد اور مفید ثابت نہیں ہو رہے

تھے۔

جنگلی ریسٹ ہاؤس میں دو کمروں، کچن، باتھ روم اور سمجھو دو بالشت کے برآمدے سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ موسموں کی سختیاں جھیلی ہوئی چار کرسیاں اور ایک میز برآمدے میں پھنسی رکھی تھیں۔ ہم نے پہلے کتوں اور اس کے ٹرینر کو اندر جانے دیا جب وہ بیزاری سے ادھر ادھر سونگھ کر لوٹ آئے اور باہر کوفت کے عالم میں جا کھڑے ہوئے تو زوبر میاں، امجد سنگھ اور میں جائزہ لینے پہنچے۔ دھول اور برس دو برس پرانا چھوٹا موٹا کچرا یعنی ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں، ٹافی سے اتارا ہوا ریپر، ادھ جلی موم بتی جو سال بھر پہلے سرخ رنگ کے موم سے بنائی گئی ہو گی اب مٹی کے رنگ کی تھی یہاں سب کچھ پرانا تھا۔

مگر نہیں ایک دو چیزیں، ایک دو ثبوت کچن میں ایسے تھے جو بالکل نئے تھے۔

کونے میں پڑی کوئلوں کی انگیٹھی لگتا تھا ایک دو روز نہیں چند گھنٹے پہلے جلائی گئی تھی۔ کچن کے لکڑی کے فرش پر چائے کی پیالی کا چھلے کی شکل کا دھبا بنا تھا۔ دیر سے پہنچنے والی دو چار چیونٹیاں میٹھی چائے کے اس چھلے سے آخری مٹھاس نچوڑنے کے لئے تگ و دو کر رہی تھیں۔ زوبر میاں نے انگیٹھی کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا اور اندر ہاتھ پہنچا دیا۔ بتانے لگے کہ انگیٹھی سرد ہو چکی ہے مگر چیونٹیوں کی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ چند گھنٹے پہلے چائے کی یہ پیالی، یا اور بھی پیالیاں فرش پر رکھی گئی تھیں اور پیالیوں میں چائے تھی۔ اسٹیشن ویگن والے جنگلی ریسٹ ہاؤس میں کچھ دیر ضرور ٹھہرے ہوں گے۔

ہم تینوں اور جنگلی میزو نے ریسٹ ہاؤس کے قریب بھی اور دور بھی ویگن کے ٹائروں کے نشانات ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پتھریلی خشک زمین تھی ٹائروں کے نشانات کیسے ملتے۔ ایک بات سے اور شک سا ہو گیا کہ روکسانہ اور رشنا کو ریسٹ ہاؤس میں نہیں تو اس کے قریب ضرور روکا گیا ہے۔ دونوں کتے کرسیوں اور مسہری کو سونگھ سونگھ کر تو ہٹ جاتے تھے مگر باہر برابر بھونکے جا رہے تھے اور بے چینی ظاہر کر رہے تھے۔

زوبر میاں ریسٹ ہاؤس کے بعد شارٹ کٹ بنانے والے ٹریک پر نشانات ڈھونڈنے اور بھی آگے جانا چاہتے تھے مگر میرا اور امجد کا بھی مشورہ تھا کہ یہ ثبوت اور کتوں کی گواہی بہت کافی ہے۔ ہمیں زوبر میاں کی اسٹیٹ میں زیادہ وقت نہیں لگانا چاہئے۔ آگے چل پڑنا چاہئے۔ کیوں کہ یہاں جو وقت گزر رہا تھا وہ اغوا کرنے والوں کی اسٹیشن ویگن کو ہم سے دور کرتا جا رہا تھا۔

زوبر میاں ہمارے ساتھ ویگن کے تعاقب میں جانے پر تیار تھے مگر مزدوروں کے میس میں زوبر میاں کی گھر والی کے بارے میں پیغام آیا ہوا تھا کہ ان کے ہاں اللہ کے فضل سے ابھی ابھی فجر کے وقت ایک اور بچے کی ولادت ہوئی ہے۔

امجد نے مبارک دی اور پوچھا۔ ”ایے کنے نمبر دی اولاد ہے؟“

زوبر میاں نے ایک لمحے سوچا پھر بولے کہ گیارھواں بچہ ہے اللہ کے فضل و کرم سے اور لڑکوں کے نمبر سے سمجھو تو آٹھواں ہے۔ مولا بے پروا کے فضل سے۔“

امجد سنگھ نے پہلے تو گالوں پر اپنے خوب طمانچے مارے کان کی لویں پکڑ کر توبہ توبہ کی پھر بولا۔ ”بھائی جی زوبر میاں صاحب! مولا سے زیادہ بے پروا تو آپ خود ہیں گیارہ اولادیں ہیں؟ بلے او بلے!“

زوبر میاں مسکرائے بولے۔ ”بھائی! قدرت کے معاملا میں کسی کا کیا دوخل؟“

امجد بولا۔ ”یہ دوخل، شوخل نویں بچے پہ بھی آپ نے فرمایا تھا اور اس کے جواب میں میں نے کج بولا تھا۔ یاد ہے کیا بولا تھا؟“

”معاذ اللہ! وہ گوندی بات پھر نہیں دھراؤ۔ شیر خان صاحب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ استغفر اللہ!“ زوبر میاں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

امجد بولا کہ چلئے آپ نے توبہ کرنا سیکھ لیا ہے تو شاید آگے باز آ جائیں۔ ڈزن پہ نوبت نہ آئے۔

زوبر میاں ساتھ جانے کو بہت کہتے رہے مگر ہم نے منع کر دیا اور ان سے اجازت لے کر شارٹ کٹ سے اگلی ٹمبر اسٹیٹ جانے کے لئے ہم نے اپنی دونوں جیپیں ڈال دیں۔

کچھ دور جنگل میں نکل آئے تب مجھے یاد آیا کہ اگلی ٹمبر اسٹیٹ تو میجر (ریٹائرڈ) چارلس پائن وڈ کی ہے۔ وہ جس کے کنٹری ہاؤس میں سردار امجد سنگھ اپنا کوٹ چھوڑ کے بھاگا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”بھائی جی! میجر پائن وڈ کی اسٹیٹ میں داخل ہونا ہے۔ یہ بتاؤ تمہارے لئے ادھر کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“

وہ سوچنے لگا بولا۔ ”یہی اسکیم بنا کے آ رہے ہیں امجد سنگھ جی۔ اپنا یہ ارادہ ہے کہ میجر کے کنٹری ہاؤس کے بیچ گھسنے کی تو بھائی جی! بالکل جرورت نہیں ہے۔ سچ دی گل ہے۔ وئی جس تھاں، مطلب جس جگہ آپ کی ویلکم کا کوئی چانس نہیں ناں ہو دے۔ الٹی

گولی شولی کا کھطرہ ہووے اس حسگے جانا بے عقلی کی بات ہے۔ تو میں سوچنا گاڑی آپ چلاؤ۔ آگے آگے چلے میرا ڈرائیور۔ روڈ سائڈ پہ میجر کی ایک پرائیویٹ چیک پوسٹ جیسی ہے ادھر چووی (چوبیس) گھنٹے میجر کا شاف رہتا ہے۔ آپ تے ڈرائیور اتر کے پتا کرلینا۔ میں جیپ سے اترانگائی نہیں۔ صحیح ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں تم کمبل لپیٹ کے بیٹھے رہنا۔"

میرے کمبل لپیٹ کے بیٹھنے کے مشورے پر امجد سنگھ چمک کے بولا۔ "بھائی جی اب اسیں اتنے بج دل وی نہیں ہیں کہ کمبل شمبل وچ لک چھپ کے بیٹھاں گے۔"

میں نے تسلی دی کہ بھئی آپ بالکل بزدل نہیں ہیں۔ یہ مشورہ تو آپ کی حفاظت کے خیال سے دیا گیا تھا۔

میجر پائن وڈ کی اسٹیٹ کا پہلا تاثر خوش گوار تھا۔ ہر چیز کسی اصول سے بنائی گئی تھی اور ہر چیز میں انگلستان کی جھلک نظر آتی تھی۔ لمحے بھر کے لئے دھوکا سا ہو جاتا تھا کہ ہم کسی انگلش کاؤنٹی کی جائداد کا دورہ کر رہے ہیں اور سامنے کی اس چیک پوسٹ سے رکاوٹ کی سرخ سفید پینٹ کی ہوئی مضبوط لکڑی کو ہٹا کر ابھی کوئی گوراچوکی دار سامنے آئے گا اور پوچھے گا۔ "ول کاؤن ہے؟ کدر جانا ئے؟"

مگر کہیں۔ ادھر میں جیپ سے اترا اور چیک پوسٹ کے سامنے پہنچا۔ ادھر دوسری جیپ کا ڈرائیور گاڑی سے اتر کے سڑک پار کرتا تھا کہ چیک پوسٹ کے پیچھے سے پے در پے دو فائر ہوئے۔

میں ریوالور کے قریب تھا۔ دوڑ کر اوٹ میں ہو گیا۔ دوسری جیپ کے ڈرائیور نے آدھی سڑک پار کرلی تھی۔ وہ بھاگ کر نہ چیک پوسٹ کی طرف آسکتا تھا نہ واپس جیپ کی اوٹ میں جاسکتا تھا۔ جہاں تھا بے چارہ وہیں ایک گھٹنا ٹیک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر بے بسی میں بیٹھ گیا۔

دو فائر پھر ہوئے۔ میں سمجھا ڈرائیور کو نشانہ بنایا ہے۔ اور وہ گیا بے چارہ۔

مگر جو بھی فائر کر رہا تھا اس جیپ پر کر رہا تھا جس سے اتر کر میں آیا تھا۔ آخری فائرنگ کی آواز کرتا جیپ کی باڈی سے ٹکرا کر کہیں نکل گیا۔ میں نے جیپ کے موٹے فولاد کو دن کے وقت بھی چنگاری بناتے دیکھا۔

ایک فائر پھر اسی جیپ پر ہوا۔

کوئی صرف اس جیپ کو نشانہ بنا رہا تھا۔ کیوں؟

اب ایک فائر کچھ وقفے سے ہوا اور چک پوسٹ کے پیچھے سے فائر کرنے والے نے قہقہہ مارا یہ عجیب سا قہقہہ تھا۔ بناوٹی سا لگتا تھا کوئی صرف ڈرانا چاہتا ہے۔ فائر کر کے بھی اور ایسا بناوٹی، فلمی ٹائپ قہقہہ لگا کے بھی۔

کوئی صرف امجد سنگھ کے پیچھے پڑا ہے۔ ڈرائیور سے، مجھ سے یا جیپوں کے ٹائروں وائروں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

امجد سنگھ بھی اب تک اس نامعلوم فائر کرنے والے کی نیت پہچان گیا تھا۔ اس نے اپنے آٹومیٹک پسٹل سے اندازے سے دو فائر کئے۔ جس طرح اس نے فائر کیے تھے ادھر سے پھر بناوٹی ہنسی کی آواز آئی۔ لگتا تھا فائر کرنے والا بہت نشے میں ہے یا کوئی نوجوان لڑکا شرارت کی آوازیں نکال رہا ہے۔ قہقہے لگا لگا کے فائر کرتا جاتا ہے۔

امجد نے مجھے آواز دی۔ "کھان! ادھر ہی رہنا۔ میں آتا ہوں۔" اور پھر اس نے اپنے آدمی سے ٹیٹھ سکھوں والی پنجابی میں کچھ کہا جو میری اور اس کی تو سمجھ میں آگیا۔ لیکن حملہ آور کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔ جو ہدایت سردار نے اپنے ملازم کو دی تھی وہ اسی کے لئے تھی۔

امجد سنگھ نے اپنی ہدایت اور حکمت عملی کے مطابق پنجابی میں اونچی آواز میں گنتی گننا شروع کی۔ "ہک! دو! ترے۔۔۔۔" اور چار پر وہ چیک پوسٹ کی طرف مسلسل ہوائی فائر کرتا ہوا جیپ سے نکل کے باہر آیا۔ وہ اپنے ڈرائیور کو کور دے رہا تھا۔ ڈرائیور جو گولی کی زد پر بیٹھی ہوئی بطخ کی طرح ایک دم غیر محفوظ تھا۔ سردار کی گنتی پر تیار ہوا اور چار کی گنتی پر دوڑ کر اپنی جیپ کی اوٹ میں چلا گیا۔

امجد کسی فلمی ہیرو کی طرح ہوا میں گولی چلاتا بالکل کھلے میں آگیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو تحفظ دینے کے لئے خود کو فائر کرنے والے کے سامنے لے آیا تھا۔

میں نے اپنی طرف آتے، دیوار کی اوٹ لیتے سردار جی کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔ "آجا۔ آ۔ سردار!"

لمحے بھر کے لئے وہ اوٹ میں بیٹھے اس دشمن کی زد پر تھا۔ بس ایک گولی کا تھا وہ مگر وہی ایک گولی حملہ آور نے نہ چلائی اس نے پھر ایک ٹھٹھا مارا۔ اس اثناء میں امجد سنگھ سڑک پار کر کے میرے پاس دیوار کی اوٹ میں آچکا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیٹھ تھپکی۔ "شاباش! تو نے ڈرائیور کو خطرے سے نکال دیا۔"

کہنے لگا۔ ''او نہیں یار! ڈریور نہیں سی کھطرے وچ۔ بس دہشت میں آگیا سی بچارا۔''

ہم دونوں کے اوٹ میں آچکنے کے بعد جیسے حملہ آور کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اس کی تسلی ہو گئی ہے۔ اب اسے کچھ نہیں کرنا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے؟ پائن وڈ؟''

''شاید۔''

''اگر وہ ہے تو ٹھٹھے کیوں لگا رہا ہے۔''

امجد نے ہنس کے گالی دی۔ بولا۔ ''رامی ہے اس واسطے سمجھتا ہے امجد سنگھ فس (پھنس) گیا۔''

''اچھا تو امجد سنگھ نہیں پھنسا؟''

وہ بولا۔ ''کوئی دی نہیں۔'' امجد سنگھ ترکھان کا حوصلہ بلند تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی مسلح تھا اور اس نے مجھے بھی ایک پسٹل اور میگزین لا دیا تھا۔

کسی نے اس دیوار کو جس کی اوٹ لیے ہم بیٹھے تھے کھٹکھٹایا۔ امجد نے سر ہلا کر گویا مجھے خبردار کیا۔ دشمن فوراً ہی کوئی کارروائی کرنے والا ہے۔

ہم دونوں نے اپنے ہتھیار فائر کے لئے تیار کیے۔

مگر اچانک حملہ کرنے کی بجائے دیوار کے دوسری طرف چیک پوسٹ میں بیٹھے ہوئے دشمن نے بہت خوش ہو کے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں کچھ الجھ گیا۔

یہ ہنسی تو کسی عورت کی ہنسی تھی۔

امجد نے حملے کے لئے اٹھائی ہوئی اپنی رائفل کی سیفٹی خود بھی ہنستے ہوئے چڑھا دی اور پٹے سے پکڑ کر اپنی رائفل میری گود میں لٹاتا ہوا وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر خبر نہیں کیوں اس نے کپور تھلہ چھاپ یا اپنے دادا کے پشتینی وطن پٹیالے میں سیکھی ایک گونجتی ہوئی گالی دی اور انگریزی میں چہک کے کہا۔ ''اچھا تو یہ تم ہو میرے ایک کرسمس کے معشوق اور وہ چیک پوسٹ کی دیوار کو کسی گرمائے ہوئے بلے کی طرح ''ٹپ'' کے مطلب کود کے اندر چیک پوسٹ میں پہنچ گیا۔

ظاہر ہے چیک پوسٹ میں میجر پائن وڈ کی ہمشیرہ سسٹر پائن وڈ تھیں جنہوں نے گولیاں چلا کر اپنے ایک کرسمس کے محبوب کا استقبال کیا تھا۔

اور ظاہر ہے ان حد جیسے آگ انگارہ آدمی بلکہ آگ بگولا سکھ کے استقبال کا

ایک ہی طریقہ تھا اور وہی طریقہ یو کے والی مس پائین وڈ کا بھی تھا۔ صدیوں سے۔ میں دیوار کے اس طرف بیٹھا انہیں اس طرف ایک دوسرے کا استقبال کرتے سنتا رہا۔ اس استقبال میں باتیں نہ ہونے کے برابر اور بقول امجد سنگھ وہ چماشا جیادہ تھا۔

میں نے سوچا میجر (ریٹائرڈ) چارلس پائن وڈ' اگر وہ ابھی تک زندہ ہے' یقیناً پائن وڈ اسٹیٹ میں نہیں ہو گا۔ جبھی یہ سب چاند ماری اور جان ماری ہو رہی ہے۔

کوئی دس منٹ بعد جب امجد شاید بے حد ہوتا جا رہا ہو گا کہ پائن وڈ نے استقبال کی یہ کارروائی کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھی اور سرخ سفید پینٹ کی ہوئی لکڑی اٹھا کر دونوں اک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے باہر میری طرف آنے لگے۔

میں نے اس وقت تک دیکھا ہی کیا تھا مگر کم ہی کسی سینتالیس اڑتالیس سالہ کو اس قدر ترو تازہ اور مستعد دیکھا ہو گا۔ وہ بیس بائیس برس کے کھلنڈرے لڑکوں کی طرح کے لباس' جینز اور ہلکے جیکٹ میں تھی۔ سر سے ننگی تھی۔ اس کے بال بے پروا سائنس دانوں یا فٹ بال کے کھلاڑیوں کی طرح کانوں تک آ رہے تھے۔ پیروں میں ٹریک بوٹس تھے جو اگر ربر سول کے ہوتے تو ہم انہیں جوگرز کہہ سکتے تھے۔ وہ پنجوں کے بل چلنے کی عادی لگتی تھی۔

میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا کہ مس پائن وڈ نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہیلو! دوست۔'' اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''ہیلو۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ گرم تھا ان لوگوں کو سردی نہیں لگتی۔ ظاہر ہے انگلستان کے حساب سے تو برما میں گویا موسم بہار جیسی خوش گوار ٹھنڈک تھی۔

امجد نے میرا تعارف کرایا۔ ''شیر کھان فرام ------ فرام سم پلیس۔''

وہ شیر خان فرام یو کے کہنا چاہتا ہو گا مگر پھر یہ سوچ کر کہ مس پائن وڈ سے یہ جھوٹ نہیں چلے گا اس نے ٹال دیا اور کہہ دیا۔ ''میں کسی جگہ' کا رہنے والا ہوں۔

امجد کے پائن وڈ معشوق نے اسے لفظوں میں الجھا دیا۔ پوچھنے لگی۔ ''کسی جگہ'' تو کوئی بات نہ ہوئی۔ مجھے بتاؤ یہ کہاں کا ہے؟ خان تو اپنی ڈبلیو ایف پی کے ہوتے ہیں جو اب پاکستان ہے۔ تو کیا یہ پاکستان کا ہے؟''

امجد نے کہا۔ ''ہاں پاکستان کا ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے پاکستان سے پیار ہے۔''

انحد نے ہنس کے کہا۔ ”اگر میں چائنا کہتا تو یہ بولتی مجھے چائنا سے پیار ہے۔“

پائن وڈ محبوبہ بولی۔ ”مجھے چائنا سے اور اناڈ سنگھ سے بھی پیار ہے۔“

انحد نے خوش ہو کے اس کے گلے میں بانہہ ڈال دی۔ مس پائن وڈ نے فورا اس کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔

میں نے کھانس کھنکار کر انہیں صورتحال کی سنگینی کی طرف متوجہ کیا۔ ہم پائن وڈ اسٹیٹ کے صدر دروازے، اس کے استقبالیہ چیک پوسٹ پر کھڑے تھے۔ پائن وڈ صاحب اگر اپنی اسٹیٹ میں نہیں ہے تو بھی چیک پوسٹ کا اسٹاف اور اس کے نوکر پیادے جاسوس تو ہوں گے۔ احتیاط ضروری ہے۔

وہ سنبھل کر میری طرف متوجہ ہوگئے پھر انحد کی محبوبہ نے خوش ہو کر اطلاع دی کہ اس کا بھائی یعنی وہ پائن وڈ خبیث جس سے انحد سنگھ کو اپنی اسٹیٹ سے روانہ ہوتے وقت بھی خطرہ تھا اچانک رنگون چلا گیا ہے اور کچھ وقت گزار کر ہی آئے گا۔

میں گیٹ پر متعین سیکورٹی والوں کی طرف سے تشویش میں تھا تو انحد کی محبوبہ نے بتایا کہ اس نے انہیں گھنٹے بھر پہلے یہاں سے رخصت کر کے دوسری دور دراز چیک پوسٹ پر اچانک جا پہنچنے کا حکم دیا ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر دور دراز چیک پوسٹ کے اسٹاف کو میڈم کا حکم پہنچائیں گے کہ وہ لوگ ہائی وے کے اس رخ پر ڈیوٹی دینے کے لئے فوراً روانہ ہو جائیں۔ اس تمام لوٹ پلٹ میں دو گھنٹے لگتے ہیں تو ابھی ان کے یہاں آنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ اس ایک گھنٹے میں مس پائن وڈ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کو .... ہم تینوں کو .... اور ہماری جیپوں کو آرام سے کہیں ”اسٹور“ کر دے گی اور پھر رات ہو جائے گی۔ مہمان لوگ رات بھر کے لئے محفوظ ہو جائیں گے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ انحد کو یہ اسکیم بہت پسند آئی تھی۔ میں نے شور مچایا کہ ہمیں اسٹیشن ویگن کی تلاش میں آگے بھی تو جانا ہے سردار جی!

کہنے لگا۔ ”آگے بے شک جانا ہے۔ نالے تلاش وی کرنا ہے۔ پر بھائی جی! ہولی ہولی (مطلب ہولے ہولے) تلاش کرنے میں جو مجا ہے وہ بھگدڑ وچ تلاش کرنے میں کوئی نہیں ناں۔“

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ پائن اسٹیٹ میں کیوں پھیل رہا ہے۔ سکھ خون نے بہت سے وحشی امکانات پر اس کے سکھ بدن میں ہنہنانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ڈرلیا کہ اگر چارلس پائن وڈ صاحب سورا، پروگرام مختصر کر کے ہماری

تمہاری توقع سے پہلے آ گیا تو کیا ہو گا۔

چارلی کی لٹل بگ سسٹر نے انگریزی محاورے میں کہا کہ پھر ہم سبھی موسیقی کا سامنا کریں گے مطلب جو ہو گی دیکھی جائے گی۔ میرا اعتراض یہ تھا کہ ہم پائن وڈ اسٹیٹ میں اس لئے گھسے ہیں کہ یہاں کے مزدوروں سے، سیکورٹی والوں سے کسی ویگن کے گزرنے کا پوچھیں۔ وہ کام تو دھرا کا دھرا رہ گیا اور ہم مہمان بن کر اسٹور ہونے اور تم دونوں ایک دوسرے کا ”استقبال“ وغیرہ کرنے میں مصروف ہو گئے روکسانہ اور رشنا کا بتاؤ کیا ہو گا؟

انحد سنگھ نے اپنی محبوبہ کی کمر سے ہاتھ نکال لیا اور فکر مند ہو کر اس سے پوچھا۔ ”ہاں جی بولو۔ ہم وہ دو اغوا ہونے والی لڑکیوں کو تلاش کر رہے ہیں ان کا کیا ہو گا؟“

مس ایلس پائن وڈ (اس کا نام ایلس پی بی تھا۔) میں نے کہا کہ اچھا کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں کوئی غیر ذمہ دار ٹین ایجز (مطلب تیرہ سالہ سے انیس سالہ) کم سمجھ بچی ہوں۔ میری عمر اکیس سال سے زیادہ ہے۔ ووٹر ہوں۔ میں نے کہا۔ تمہارے آنے کا فون سن کر کچھ کر لیا ہے۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کسی نے ہمارے یہاں آنے کے بارے میں کوئی اطلاع دی تھی؟“

ایلس بی بی بولی۔ ”تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اناڈ سنگھ کے آنے کا خواب آیا تھا؟“ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”میں اسے اکثر خواب میں بھی دیکھتی رہتی ہوں۔ خیر، وہ الگ بات ہے۔“

فون کا سن کے ان حد زیادہ حیران نہیں ہوا تھا، کہنے لگا۔ ”میں سمجھ گیا جو بر میاں ہوری نے فون کیا ہو گا۔“

ایلس پائن وڈ نے بتایا کہ ہاں زوبر میاں نے فون کیا تھا جس پر ایلس نے یہ کیا کہ فوراً پہلے سڑک کے رخ کام کرنے والے مزدوروں اور سیکورٹی والوں سے معلومات کی اور پھر سیکورٹی والوں کو دور دراز چیک پوسٹ کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ ادھر کے سیکورٹی اسٹاف کو ادھر بھیجیں اور ایلس بی بی ان سے بھی کسی اسٹیشن ویگن کے بارے میں پوچھ گچھ کر سکے۔

”بلے او بلے!“ انحد سنگھ نے نہ صرف پسندیدگی کا نعرہ لگایا بلکہ شاباش دینے کو اس مستحق بی بی کا چما شاوی لے لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اچھے کام پر ایلس بی بی کی حوصلہ

افزائی کرنی چاہیے۔

مگر یہ حوصلہ افزائی لگتا تھا کسی اور سمت میں ہو رہی تھی۔ میں نے ہاں ہاں کر کے انہیں توجہ دلائی کہ وہ دونوں پھر اصل موضوع سے بھٹکتے جا رہے ہیں تو جیسے تیسے کر کے وہ ایک دوسرے سے بغل گیر وغیرہ ہونا چھوڑ کے اصل موضوع پر واپس آئے اگرچہ اس واپسی پر دونوں ہی کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔

خیر ابھی تقریباً پورا دن پڑا تھا۔ ایلس کے ایک معتمد جمائیکن ملازم نے دونوں جیپوں کو پائن وڈ کے ایسے محفوظ حصے میں ایک نقلی چشمے کے قریب جھاڑیوں میں چھپا دیا کہ ولا والوں کی نظر میں بھی نہ آئیں اور جس وقت بھی ہمیں خاموشی سے نکلنا ہو بس ایک بغلی گیٹ کھولے جانے پر دونوں جیپوں کو بغیر اسٹارٹ کیے بھی چشمے کے ڈیڑھ فٹ گہرے پانی سے دھکا دے کر نکالیں اور ذیلی سڑک پر چلے آئیں جو کچھ ہی دور چل کر ہائی وے مل جاتی تھی۔

جمائی کن ملازم نے جیپوں پر احتیاطاً سبز کاہی ترپال بھی ڈال دی تھی کہ ولا میں چلتے پھرتے ٹہلتے کسی غیر متعلق آدمی کی نظر نہ پڑے۔

ایلس بی بی نے امجد کے ڈرائیور کو جمائی کن کے حوالے کیا کہ وہ اس کی مہمان داری اور دیکھ ریکھ کرے۔ مجھے اور امجد سنگھ کو وہ اوپر لے گئی جہاں اس کا اپنا بیڈ روم، کچن اور لاؤنج تھا۔ لاؤنج میں دو دیوان پڑے تھے۔

ایلس بی بی نے بڑی منافقت سے دونوں دیوان نئی چادروں سے ڈھک کے ایک نرم تکیہ ڈال دیا اور کہا کہ یہ تم دونوں کے آرام کے لئے ہے وہ جانتی تھی کہ سردار کو تو یہاں لیٹنا نہیں۔ میں تو ظاہر ہے اپنے والے دیوان میں جا لیٹا۔ سردار امجد سنگھ ترکھان اور ایلس پائن وڈ مسلسل ایک دوسرے کی جاسوسی میں لگے رہے۔ اگر امجد مجھ سے کوئی بات پوچھنے لاؤنج میں آتا تو ایلس بی بی اس کے پیچھے پیچھے وہاں چلی آتی۔ ایلس کچن میں جاتی تو سردار امجد اسے مشورہ دینے کچن میں چلا جاتا۔ وہ کسی کام سے بیڈ روم میں جاتی تو سردار بھی اس کی جاسوسی کرنے ضرور پیچھے پیچھے جاتا اور بہت دیر وہاں رہتا۔ یہ جاسوسی اور مشورے ذرا اور طویل ہوتے جا رہے تھے کہ جمائی کن ملازم نے ہاؤس فون پر اطلاع دی کہ دور دراز چیک پوسٹ کا سیکورٹی اسٹاف آگیا ہے۔

امجد سنگھ ایلس بی بی کا لپ اسٹک اپنی ناک، پیشانی اور چہرے کے نہ ڈھکے حصے سے پونچھ کر تیار ہوا تو ہم نیچے گئے۔ ایلس اپنے اسٹاف کے سامنے صرف مجھے لے گئی۔

امجد جی کو اس نے ایک کرسی دے کر چینی اسکرین کے پیچھے چھپا دیا تھا کہ وہ سنتے رہیں اور بعد میں کوئی نتیجہ قائم کریں۔ اسٹاف کے سامنے امجد کو یا کسی بھی سکھ کو لایا جاتا، چارلی پائن وڈ کے پاس رپورٹ یہی پہنچتی کہ اس کا ناپسندیدہ پڑوسی امجد سنگھ اس کی غیر موجودگی میں ٹمبر اسٹیٹ میں آیا تھا۔ اس بات سے سردار کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایلس بی بی کے لئے مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔

ایلس میم صاحب نے سرسری طور پر تاکہ اسٹاف کو احساس نہ ہو کہ خاص طور پر بتایا جا رہا ہے۔ یہ تاثر دیا کہ میں اور میرا ڈرائیور کسی اسٹیشن ویگن کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ سیکورٹی والوں کے لئے ہم عام سے رہ گیر یا زیادہ سے زیادہ ٹمبر کے بیوپاری لوگ تھے اور اپنے راہ بھولے ہوئے ساتھیوں کی تلاش میں تھے۔ میم صاحب نے ایک بار پڑوسی ٹمبر اسٹیٹ کے مالک زوبر میاں کا حوالہ دیا جس سے ایک بات یہ طے ہو گئی کہ ہم مالکوں کے دوست لوگوں کے دوست ہیں۔ دور کی چیک پوسٹ سے آنے والوں میں کچھ وفادار گورکھے اور کچھ مقامی برمی تھے۔ برمیوں میں سے ایک نے بتایا کہ اسے اپنی شفٹ میں کچھ شبہ سا ہوا تھا کہ ایک اسٹیشن ویگن اس رستے سے نکلی ہے کسی دوسرے نے اس کے بیان کی تصدیق نہ کی مگر وہ اسٹیشن ویگن کے رنگ اور اس کی تمام حالت کے بارے میں بالکل یقین سے کہہ رہا تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کے بیان پر کسی قسم کا شک شبہ کیا جائے۔

سیکورٹی والوں کی بات سن کے ہم تینوں پھر ایلس کے علاقے میں اوپر کی منزل میں آ گئے مس ایلس پائن وڈ نے علاقے کا نقشہ پھیلا کر ہمیں سمجھایا کہ دور دراز چیک پوسٹ سے جو اطلاع اسٹیشن ویگن کے دیکھے جانے کی ملی ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ فرار ہونے والی گاڑی ہائی وے چھوڑ کے کسی اور طرف نکل گئی۔ نقشے سے پتا چلتا ہے کہ ایک سڑک پائن وڈ جائداد کی دور دراز چیک پوسٹ سے نکل کر برما کے سرکاری محفوظ ذخیرے سے ہوتی ہوئی پھر ہائی وے سے آملتی ہے۔

میرا اعتراض یہ تھا کہ فرار ہوتی ہوئی کوئی بھی گاڑی سیدھا راستہ چھوڑ کے کیوں کوئی لمبا راستہ پکڑے گی۔ ایلس بی بی نے کہا ہاں یہ اعتراض درست ہے جسے علاقے سے جلد از جلد نکل بھاگنا ہے وہ اتنے فالتو کے میل کیوں طے کرے گا؟ مگر امجد کا ذہن اس وقت خوب کام کر رہا تھا۔ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کے پوچھا۔ بی بی یہ لال رنگ کا گرتے ہوئے آنسو کی شکل کا اشارہ سرکاری ذخیرے کے بیچ کس بات کا بنا ہے۔ یہ

کیا جگہ ہے؟ کیا کوئی بلڈ بینک ہے؟

ایلس پائن وڈ بولی۔ "یہ کیروسین ڈیزل پیٹرول کا سرکاری پمپ ہے۔"

انحد سنگھ نے نقشے پر انگلی بجائی' بولا۔ "یہ ایک امپارٹنٹ وجہ ہو سکتی ہے۔ سدھا راستہ چھڈ کے ذخیرے وچ وڑن دی' مطلب گھسنے کی۔"

"ہاں۔ ان کا پیٹرول ختم ہو گیا ہو گا اور ہائی وے کا پیٹرول پمپ وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ان کے لئے اب ایک ہی صورت رہ گئی ہو گی کہ وہ اندر کی سڑک پکڑ کے سرکاری ڈپو سے پیٹرول حاصل کریں۔"

پھر ایلس پائن وڈ کو اچانک "اناڈ ڈارلنگ" کی قابل رشک ذہانت پر اسے داد دینے کا خیال آیا وہ سنگھ کی پگڑی کے پیچھے ایک ہاتھ پہنچا کر مستعدی سے اسے دانا چگانے لگی جیسے پرندے اپنے گھونسلے میں بیٹھے بہت چھوٹے چوروں کو براہ راست دانا چگاتے ہیں۔

میں دو منٹ' تین منٹ ان کی صورتوں کے سامنے بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ کب یہ ایک دوسرے کو داد دینا بند کرتے ہیں' مگر جب یہ دورانیہ طویل ہوتا گیا تو میں نے میز پر دستک دی۔ وہ ہانپتے تازہ ہوا میں سانسیں لیتے میری طرف متوجہ ہوئے۔

ایلس بی بی نے کہا۔ "میرا اناڈ کتنا انٹیلی جنٹ یعنی (ذہین) ہے۔"

انحد بولا کہ کوئی بھی نہیں یہ ایلس بی بی تیری محبت ہے جو انیا سمجھتی ہے ورنہ میں تو ایک "عام جیسا سکھ آں۔"

خیر تو ایک بات سمجھ میں آگئی کہ پائن وڈ اسٹیٹ سے ان کی اسٹیشن ویگن گزری ہے اور وہ دونوں لڑکیوں کے ساتھ ہائی وے کے روٹ ۳۷ پر ہی نکل گئے ہیں۔ مجھے اب یاد آیا کہ میجر پائن وڈ کی ٹمبر جائداد کے بعد آدھے برمی آدھے انگریز بلی صاحب یعنی ولیم برانٹ کی جائداد تھی۔ وہی بلی برانٹ جس کے لائسنس یافتہ جوئے خانے ہانگ کانگ اور رنگون میں چل رہے تھے' جسے انحد سنگھ بوتلوں کے کریٹ کے بدلے مردانہ قوت دینے والے میجک لڑکیوں کا گوشت بھیجا کرتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "انحد! کیا ہمیں اب بلی برانٹ کی اسٹیٹ جانا ہوگا؟"

انحد بڑی مستعدی سے بولا۔ "آہو جی' ادھر تے جرور جانا ہے .... وہ ساڈے پڑوسی بلی صاحب کی اسٹیٹ ہے ادھر بڑیاں رونقاں لگیاں نیں۔ مطلب بڑی رونق دل پشوری چل رئی ہے ادھر تے جرور جانا ہے۔"

ایلس بی بی پوری بات تو نہ سمجھ پائی مگر بلی برانٹ کا نام سن کے اور ادھر جانے کے سلسلے میں انحد کا بے حد اشتیاق دیکھ کے منہ بنا کے بولی۔ "بلی برانٹ دنیا کے اس حصے کا سب سے بلند مرتبہ پمپ (یعنی دلال) ہے۔ اس کی بلیوں چمگادڑوں جیسی سفاک میزبان لڑکیاں دنیا کے اس حصے میں قدرت کی طرف سے گندی بیماریاں پھیلانے پہ مقرر ہیں۔"

انحد ہنسنے لگا' بولا کہ ایلس ڈارلنگ ہم دونوں کو .... خان کو اور مجھے .... اس کی میزبان لڑکیوں سے کیا لینا دینا۔ میں تو اپنے پرانے دوست بلی سے خان کی اسٹیشن ویگن اور اس کی عزیز دوست لڑکیوں کا پتا اٹھانے جاؤں گا۔ بہت ہوا تو بلی برانٹ کے ساتھ بیٹھ کے ایک چھوٹا پیگ لے لوں گا۔ کان نے تو وہ چھوٹا پیگ بھی نہیں لینا۔ یہ پاکستانی ہے۔ پاکستان میں تو بعض اقلیتوں فرقوں اور ہزار دو ہزار ہشیار ڈاکٹروں کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں کہ شراب کیا چیز ہوتی ہے۔ اس خان کو بھی پتا نہیں ہووے گا کہ شراب وراب کیا ہوتی ہے۔ دیکھو ہنس رہا ہے۔ اسے کچھ پتا ہی نہیں۔

ایلس بہت سنجیدہ تھی۔ انحد سنگھ کی مسخرے پن کی باتیں سن کر ایک دم غصے میں اٹھی اور جانے لگی۔ انحد نے جھٹ سے اس کا بازو تھام لیا اور خود سے قریب کر کے منانے کے لئے پھر اس کا چماشا لینا شروع کیا۔ وہ ذرا سی دیر میں من گئی اور انحد پر یہ ظاہر کرنے کو کہ وہ من گئی ہے اور بھی تن دہی سے انحد کے ساتھ تعاون کرنے لگی۔

کھڑکی کا پردہ اس طرح لگا تھا کہ کبھی ہوا کے جھونکے سے ہٹ جاتا تو باہر کا منظر دکھائی دے جاتا ورنہ تو اندر والا باہر کا اور باہر والا اندر کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک بار ہوا سے ہلکا گاز جیسا پردہ ہلا تو میں نے دیکھا کوئی شخص درختوں کے تنوں کی آڑ لیتا ادھر بڑھ رہا تھا جدھر ہماری جیپیں پارک کر کے سبز رنگ کی ترپال سے چھپا دی گئی تھیں۔

کوئی شخص .... پائن وڈ اسٹیٹ سے ہی متعلق کوئی آدمی ہماری ٹوہ لینے کے لئے جیپوں کی تلاشی لینا چاہتا ہے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے آہستہ سے پکارا۔ "ان حد .... ذرا جلدی آ۔"

پیچھے سے انحد کی گھٹی ہوئی آواز ہوئی۔ "اون؟ وچ!"

میں نے کہا۔ "او ادھر آ' نا .... جلدی۔"

وہ ایلس بی بی کے سینٹ میں مہکتا ہوا میرے برابر آ کھڑا ہوا اور باہر دیکھنے لگا۔

وہ جوش میں آکر شاید او کون اے اوئے کہہ کر چیخنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے سمجھایا ہمیں جاکر اسے پکڑنا اور پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ اسے دوڑا دینے سے کوئی کام نہیں بنے گا۔

انحد کی سمجھ میں فوراً یہ بات آگئی اور ایلس کو مختصر لفظوں میں بتاتے ہوئے ہم دونوں نیچے ڈپٹے۔ ایلس پیچھے آرہی تھی اس نے انحد کو مشورہ دیا تھا کہ یہ جو بھی جاسوسی کررہا ہے اسے خاموشی سے اوپر لے آنا یعنی وہاں رولا ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیچے اترنے کا یہ راستہ انحد کا تو دیکھا بھالا تھا۔ وہ ایک بار اپنا کوٹ چھوڑ کر یہیں سے بھاگا تھا۔ ہم دونوں بے آواز بڑی تیزی سے نیچے آئے۔ جمائی کن نوکر کے کچن میں مصروفیت کا وقت تھا تو وہ ادھر مصروف ہوگا۔ ہم کوٹھی کے پچھلے صحن میں آگئے۔ اب ولا کے اس حصے میں پہنچنے کا مرحلہ تھا کہ جہاں نقلی چشمہ اور استوائی درختوں سے بھرا مصنوعی جنگل تھا۔ یہ علاقہ نہ انحد کا دیکھا ہوا تھا نہ میرا۔ پہلے تو میں نے سوچا اس اعتماد والے جمائی کن ملازم کو کچن میں جا پکڑوں اور اسے لے کے جیپوں کی طرف جاؤں مگر پھر خیال ہوا کہ کچن میں دوسرے نوکر بھی ہوں گے۔ ہمارا اس طرح ولا میں دوڑے بھاگے پھرنا انہیں عجیب لگے گا۔ میں نے یہ خیال ترک کر دیا اور انحد کے ساتھ میں بھی ولا کی خاموش غلام گردشوں میں اس مصنوعی جنگل کا راستہ تلاش کرتا رہا جہاں ہماری جیپیں تھیں اور جہاں مجھے ٹوہ لینے والا وہ سایہ نظر آرہا تھا۔

ہم دونوں پائن وڈ کی بنائی ہوئی بھول بھلیاں میں گم ہوگئے تھے۔

میں بے زار ہوکر بلند آواز سے انحد سے لوٹنے کا کہنے کے لئے منہ کھول ہی رہا تھا کہ پھر اس نے بھی سختی سے میرا بازو دبایا اور اشارہ کیا کہ خاموش رہو۔ وہ ایک تنگ دریچے سے نیچے کچھ دیکھے جارہا تھا۔ میں بے آواز اپنے ساتھی کے برابر جاکھڑا ہوا معلق تھا

۔اس دریچے میں بھی پردہ پڑا تھا۔ پردے کی جھری سے میں نے دیکھا کہ ہم چوڑے پتوں والے استوائی درختوں کے اسی جنگل میں جھانک رہے تھے۔ سامنے ہماری دونوں جیپیں ہرے رنگ کے ترپال سے ڈھکی کھڑی تھیں۔

ایلس تیز تیز قدم لیتی ہوئی مگر رازدارانہ ترپال ڈھکی جیپوں کے آس پاس چکر لگارہی تھی۔ وہ کبھی ترپال کا کونا اٹھاتی کبھی جھکتی، بیٹھ کے جیپوں کے نیچے نظر ڈالتی کسی

بھی چھپے ہوئے جاسوس کو تلاش کرنے کے لئے اس سے زیادہ ہوشیاری اور تیزی دوسرا کوئی دکھا نہیں سکتا تھا مگر ایلس کی تیزی طراری سے زیادہ دلچسپ منظر ہم دونوں نے ایک اور دیکھا۔ جس تنگ دریچے سے ہم نیچے مصنوعی جنگل میں جھانک رہے تھے اس سے نیچے کی کھڑکی کا پتھر کا چھجا کوئی چار فٹ آگے جنگل پر معلق تھا اور اس چھجے پر عین ہماری ناکوں کے نیچے ہرے رنگ کے تنگ پتلون اور جرسی میں مگرمچھ کی کھال کا قیمتی بیلٹ لگائے سیاہ کڑے کے ربر سول جوتوں میں ایک سایہ یہاں دبکا ہوا تھا۔ میں نے انحد کو اشارے سے بتایا کہ یہی ہے جسے میں نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔

وہ سایہ کالے بھونرا سے بالوں والی ایک کورین لڑکی تھی۔ لڑکی اپنے سے چند فٹ کے فاصلے پر ہماری موجودگی سے بے خبر نیچے کی آہٹوں میں کان لگائے پتھر کے فراخ چھجے پر کسی خوف زدہ جانور کی طرح دبکی ہوئی تھی۔ وہ سرد پتھر پر پڑی ہوئی اپنا رخسار پتھر پر ٹکا کے نیچے سے ایلس کی آہٹیں سن رہی تھی۔ کبھی تیزی سے سر بڑھا کر نیچے جھانک لیتی تھی پھر ہٹ جاتی تھی۔

اس نے ایلس کو مصنوعی جنگل کی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور کسی ماہر سرکس آرٹسٹ کی طرح (جو بعد میں پتا چلا کہ وہ واقعی تھی) وہ چھجا پکڑ کے ایلس کی نظروں سے اور خطرے سے اچھل کر اوپر آگئی تھی۔ اب انتظار کررہی تھی کہ میم جائے تو وہ چھجے سے کود کے سلامتی اور عافیت میں چلی جائے۔

وہ ہم سے اتنے قریب تھی کہ ذرا جھک کر اور ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا جاسکتا تھا۔

میں نے انحد سے اشارے سے پوچھا کہ اس جاسوس کو کون پکڑے گا؟ وہ یا میں؟

انحد نے اشارہ کیا کہ میں اوٹ میں چلا جاؤں یہ اسی کا کیس ہے۔

میں اس کے برابر سے جھانک رہا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب چھجے کے نیچے کھڑی ایلس پائن ووڈ ’’ہے لو! کوا وہے لو‘‘ کی آواز نکالی جس سے وہ اپنے بھٹکے ہوئے اناڑ سنگھ کو متوجہ کررہی تھی۔ چھجے پر سمٹی ہوئی کورین لڑکی نے سر اٹھا کر ہمارے دریچے پر دیکھا اور خوف زدہ ہوکر دونوں ہاتھوں سے منہ دبا لیا۔ اس کی بڑی بڑی ڈری ہوئی آنکھیں انحد سنگھ کو دریچے میں کھڑا دیکھ رہی تھیں۔ بعد میں انحد نے بتایا کہ اس نے دانت کھول کر مسکراتے ہوئے اس کورین گڑیا کو دیکھ کر اپنی ایک آنکھ دبا دی تھی۔

نیچے مس ایلس پھر کوئل کی طرح کوکی۔ "کوؤ! ہیلو! ہیلو! آئی سے۔"

انحد سنگھ نے دریچے سے اپنا سر ہٹالیا اور جیسے ہی مس ایلس کوکتی ہوئی جیپوں کے دوسری طرف گئی۔ انحد نے دریچے سے جھانک کر اپنے ہاتھ بڑھائے اور آسانی سے لڑکی کو چھجے پر سے اٹھایا اور دریچے میں سے گزار کر میرے برابر لا کھڑا کیا۔

مجھے دیکھ کے وہ اور گھبرا گئی۔ اسے ایک ہی آدمی انحد سنگھ نظر آیا تھا۔ یہاں تو ہم دو تھے۔

وہ ایک طرف چلنے کو ہوئی کہ انحد نے بڑھ کر اس کی مگرمچھ کی کھال والی بیلٹ پیچھے سے کھینچ کر اسے روک لیا پھر اس نے کورین بی بی کو خود سے بھڑا لیا اور مجھ سے بولا۔

"کھان یہ میڈم اصل میں چارلی پائن وڈ کی آفیشل رکھیل ہیں۔ ویسے چیف کک مشہور ہیں۔ یہ اپنے یار کے لئے جسوسی بھی کرتی ہیں۔ مطلب دن کے ٹائم' ابھی میں ان کا تعارف ایلس سے کراتا ہوں۔ دیکھو وہ کیسے کوک کوک کہہ کے ان کو بلا رہی ہے۔"

میں نے دیکھا چارلی پائن وڈ کا ٹیسٹ بہت ستھرا تھا۔ بے حساب خوب صورت اور خوش بدن عورت تھی۔

انحد نے یہ سب باتیں انگریزی میں کہی تھیں تو وہ سن کے ایک بار خوف سے لرزی تھی پھر سنبھل کے رازدارانہ انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ پھر انحد کے سینے سے لگے لگے اس نے اپنے ہونٹوں کو ہاتھ کی اوٹ میں لے کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔

انحد کی باچھیں جیسے ایک دم کسی کھٹکے سے کھل اٹھیں۔ اس نے میری طرف دیکھ کے آنکھ ماری اور کہا۔ "کھان! پائن وڈ کا یہ معشوق کوئی ریجن ایبل مطلب عقل میں آنے والی بات کہہ رہا ہے تو اگر کوئی حرج نہ ہووے تو میں اس کے نال جا کے وہ بات سن لیواں؟ کھان صاحب! تسیں ادھری میرا انتجار کرنا .... ہاں؟"

یہ کہہ کر وہ اس کورین کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسی کے کھولے ہوئے کسی دروازے میں غائب ہو گیا۔

میں احمقوں کی طرح ایک اجنبی گھر میں جس کا نقشہ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہاں کھڑا ایلس پائن وڈ کی کوؤ۔ ہے لو۔ ہیلو سنتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایلس اپنی کوؤ کوؤ لپیٹ کے چلی گئی۔ ان حد ابھی تک نہیں آیا تھا۔

مجھے الجھن ہونے لگی۔

آخر کار وہ کسی اور سمت سے بچھیرے کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا اور پوری بتیسی دکھاتا ہوا نکل کر آیا تو میرا جی چاہا اسے زناٹے کا ایک ہاتھ رسید کروں مگر وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا اور گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوا ہنسنے لگا۔

"او یار کھان! میں معافی چاہناں اصل وچ۔ او گل ایہو جی پیچیدہ نالے انٹریسٹنگ سی کہ آپ کا اے خادم چھڈ کے آ نہیں سکدا سی۔"

میں نے کہا کہ بہر حال تم نے اگر طے کر لیا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مرواؤ گے تو ٹھیک ہے۔ دوست کہہ دیا ہے تو بھگتیں گے۔ بھائی ہم بھی بھگتیں گے۔

وہ پھر بغل گیر ہو گیا اور معافی مانگنے لگا۔ میں نے دیکھا اس سردی میں بھی وہ شاید بھاگا بھاگا آیا تھا۔ تو پسینے پسینے ہو رہا تھا اور میں نے دیکھا اس کے ہاتھ سے مگرمچھ کی کھال کی وہی بیلٹ لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے توجہ دلائی تو نقلی حیرت اور افسوس میں اس نے سر پیٹ لیا۔ "او یار! کیسی بھیڑی بات ہو گئی۔ چارلی کی معشوق کی بیلٹ میرے ساتھ آ گئی۔ چلو خیر۔ کوئی گل نہیں۔ اس کا کمرہ دیکھ لیا ہے۔ رات وچ جے کدھرے فرصت ملی تے واپس کر آواں گے۔"

میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "ہم رات یہاں بالکل نہیں رکیں گے۔ ابھی گھنٹے دو گھنٹے میں چل پڑیں گے۔"

آرام سے کہنے لگا۔ چنگا فیر کسیلئے دو کسیلئے پیچھے دے آواں گے بیلٹ۔ معشوق ہوری نے کدھر جانا ہے۔ سوں رہی ہے تھک کے .... بے چاری۔"

اس نے بے فکری سے میرا ہاتھ تھاما اور بولا کہ چل یار میزبان لیڈی حیران پریشان ہو رہی ہو گی۔

واپسی کا راستہ کچھ انکل سے' کچھ ان حد کے تجربے کو کام میں لا کر طے کیا گیا۔

ہم ولا کے ایلس والے حصے میں پہنچے تو وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ بولی۔ "کہاں رہ گئے تھے تم دونوں؟"

انحد اس پر برس پڑا کہ ایک تو یہ گھر اتنے الجھے ہوئے نقشے پر بنایا گیا ہے۔ دوسرے تم ہمیں بھٹکتا چھوڑ کے ایسے کسی کونے میں جا چھپی تھیں کہ ملی ہی نہیں۔ ارے کچھ کہہ کے آواز ہی دے لی ہوتی۔ ہمیں رستہ تو مل جاتا۔ کیسی کیسی غلام گردشوں صحنوں بغلی کمروں مین گھستے نکلتے رہے ہیں ہم۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے دیکھا نہیں۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔

ایلس کو ولا کے الجھے ہوئے نقشے پر شرمندگی تھی مگر اس نے حیرت ظاہر کی کہ وہ تو کتنی دیر کوؤ کوؤ کر کے پکارتی رہی۔ ایسے کسی کونے کھدرے میں جا پھنسے تھے۔ کہ ہم دونوں نے اس کی آواز نہیں سنی۔

امجد بولا۔ "آفٹر آل۔ نقصان تے ہو گیا وہ جو بھی ہماری ٹوہ لے رہا تھا۔ نکل بھاگا۔ کوئی بہت ہی اس کاؤنڈرل مطلب بدمعاش شخص ہوگا جو اتنی دیدہ دلیری سے جیبوں کی تلاشی لیتا رہا۔ تے ہم اس کو ڈھونڈ وی نہ سکے۔"

کھانے تیار ہوگئے تھے۔ ایلس بی بی نے کہا کھالو کچھ دیر آرام کر لو پھر تم دونوں کو ٹمبر اسٹیٹ کی سیر کرائیں گے۔ میں نے شور مچادیا کہ بس کھانا کھا کے روانہ ہو جانا ہے۔ بہت رکے تو ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے رکیں گے۔ کیا یاد نہیں ہم مفرور اغوا کنندگان کی گاڑی کے تعاقب میں ہیں۔ سیر کا وقت پھر کبھی آئے تو آئے ابھی تو فوراً چل پڑنا ہے۔

"ایلس نے اداسی سے کہا۔ "ہاں ایسے میں روک بھی نہیں سکتی تمہاری دوست لڑکیوں کے اغوا کا معاملہ ہے۔"

شکر ہے یہاں امجد نے رشنا کو رشنا خان، میری بیوی کہہ کر متعارف نہیں کرایا تھا۔ رشنا اور ناگی شا کی بیٹی روکسانہ دونوں میری دوست بتائی تھیں۔

ہم دونوں نے اوپر ہی کھانا کھایا۔ ایلس پائن وڈ نے ہمارے لئے پائن ایپل کیک بنوایا تھا۔ کچھ کھلایا باقی ساتھ کر دیا۔ پھر وہ امجد سے بولی کہ پچھلی بار تم کچھ جلدی میں رخصت ہوئے تھے۔ اور اپنا کوٹ بھول گئے تھے۔ آؤ دکھاتی ہوں۔ میں نے اپنے وارڈ روب میں کس طرح سنبھال کے رکھا ہوا ہے تمہارا وہ کوٹ۔

امجد بولا۔ "ضرور۔" پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "کھان ایک ویری ہور انتجار کر لے دوست۔ جے میں نال نہیں ناں گیا تے اس نے نراج ہو جانا ہے۔ سمجھ آئی؟ دل دکھن دا معاملا ہے۔ سمجھ آئی؟"

میں نے کہا کہ ہاں سمجھ رہا ہوں جاؤ دفعان ہو۔ وہ مس پائن وڈ کے ساتھ اس کا وارڈروب، مطلب کپڑوں کی الماری دیکھنے چلا گیا۔

اگر میں اس وقت سختی سے کام لیتا اس پیٹ بھرے سانڈ کو سیدھا جیپ میں لے جا کے ڈال دیتا اور ہم دونوں پائن وڈ اسٹیٹ ہی سے دفعان ہو جاتے تو بہت مناسب تھا پھر مجھے اور امجد سنگھ کو بھرے پیٹ پر اتنی دوڑ نہیں لگانی پڑتی جتنی ہم نے لگائی۔

مگر مجھے پوری بات بتانی چاہئے اور جس طرح بعد میں معلوم ہوا کہ واقعات

کس ترتیب سے ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اسی ترتیب سے سنانا چاہئے۔

کھانے سے پہلے ہم نے ڈرائیور کو خبر کر دی تھی کہ وہ اپنی والی جیپ لے کے ٹمبر اسٹیٹ کے مین پھاٹک پر ہمارا انتظار کرے۔ ہم فارغ ہو کر، خدا حافظ کہہ کر بغلی سڑک سے نکلتے ہیں۔ اسے ہارن دے دیں گے تو وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلا آئے۔

ڈرائیور کو ہدایات دے کے ہم نے کھانے اور پائن ایپل وغیرہ سے خوب سیر ہو کر نکل جانے کا قصد کیا تھا تو مس پائن وڈ کو امجد کا وہ کوٹ یاد آ گیا تھا جو اس نے مدتوں سے اپنے وارڈ روب میں ٹانگ رکھا تھا۔ وہ اور امجد وارڈ روب میں ٹنگا وہ کوٹ دیکھنے چلے گئے۔ میں بیٹھا دانتوں میں خلال کرتا رہا کہ اچانک سنگاپور کی طرف سے میجر چارلس پائن وڈ اپنی گاڑی میں سنسناتا ہوا ناوقت اپنی اسٹیٹ میں آ گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہمارے ڈرائیور نے دور سے پائن وڈ کی چمچماتی ہوئی انوکھے ہارن والی جیپ کو دیکھ اور سن لیا۔ اس نے فوراً امجد اسٹیٹ والی سبز رنگ کی جیپ بڑھا کر جھاڑیوں کی اوٹ میں کر لی۔ تاہم میجر چارلی پائن وڈ کے ریٹائرڈ فوجی ذہن میں ایک دھندلی سبز چیز کی یاد رہ گئی تھی جو اسے آتا دیکھ کے جھاڑیوں میں ہو گئی تھی مگر وہ بہت مگن تھا اور کیونکہ کئی دن سے اپنی کورین محبوبہ مطلب آفیشل رکھیل سے دور رنگون میں کاموں میں مشغول رہا تھا اس نے دھندلی سبز چیزوں کا کوئی خیال نہ کیا جو اسے آتا دیکھ کے جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہیں اور اپنے شوق وصل میں مطلب کورین سے ملنے کے اشتیاق میں جیپ سے اتر کے گنگناتا اور چلتے چلتے رک کر ڈانس کے ایک دو قدم لیتا ہوا سیدھا اپنی آفیشل رکھیل کے کمرے کی طرف چلا۔

وہ اس کے لئے رنگون سے چھوٹے موٹے دلچسپ تحائف لے کر آیا تھا وہ اس کے کمرے میں گنگناتا ناچتا داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کورین ناوقت سو رہی ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ وہ اس مسکراہٹ کو اپنے لئے نیک شگون سمجھا اور بے تکلف اور آسودہ حال ہو کر بیڈ پر پہنچا تو ایک بہت عجیب چیز۔ بہت ہی عجیب چیز اس نے کورین بی بی کے بستر پر دیکھی جسے کسی صورت میں وہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ اعلا درجے کے چمڑے کی بیلٹ اور نیام میں رکھی سکھوں کی کرپان تھی۔ پہلے تو چارلی پائین وڈ کا نشہ ہرن ہو گیا پھر وہ غصے میں زرد اور زرد سے لال ہوا۔ غصے میں لال ہو کے اس نے بہت بے چینی میں کپڑے پہنے ہوں گے۔ اور کورین بی بی کو بیدار کیا ہو گا اور اسے کرپان دکھا کر پوچھا ہو گا کہ یہ کیا ہے۔

خیر یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ جواب میں اس بی بی نے کیا کہا اور میجر

پائن وڈ نے کیا کہا یہ تو کہا نہیں جاسکتا صرف دوسرے ملازموں کی شہادتوں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ شور شرابا سنا تھا اور یہاں سے میرا اپنا بیان آسانی سے شروع ہو سکتا ہے کیونکہ میں نے بھی بہت زیادہ شور شرابا سنا تھا۔

میجر پائن وڈ کا اصل نسل انگریز لہجہ ایسا تو نہیں تھا کہ کسی کو کوئی مغالطہ ہوتا۔ وہ ''اناڑ سنگھ'' کو بڑے بھیانک بھیانک ناموں سے پکار رہا تھا اور اس نے فائر آمرس بھی نکال لیے تھے۔ میں نے ریوالور کے دو شاٹ بھی سنے جو یقیناً کھلے دریچے سے نظر آتے آسمان کی طرف چلائے گئے تھے۔

فائرسن کے انحد سنگھ اور اس کے پیچھے ایلس پائن وڈ بیڈ روم سے گھبرا کے نکلے۔ مس پائن وڈ اب اپنے زنولو ڈیزائن والے گاؤن میں تھیں جو ٹھوڑی سے ٹخنوں تک کا تھا اور کمر پر ریشمی ڈوری سے بندھا تھا۔ انحد شاید ہمیشہ کا بے پروا آدمی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کپڑوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتا تھا تو اس وقت وہ عجیب طرح کے لباس میں تھا۔ مطلب ہاتھ میں تو اس نے وہ کوٹ اٹھایا ہوا تھا جسے دیکھنے کو وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر بیڈ روم میں گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اہم چیز اہم ہوتی ہے تو وہ کوٹ انحد کے ہاتھ میں تھا اور قمیص بھی وہ پہنے ہوئے تھے مگر ایسی کچھ گڑبڑ اور شور شرابے کی پریشانی تھی کہ موزے بوٹ وغیرہ اور پتلون وہیں کہیں وارڈ روب میں رہ گئے تھے۔ کچھا ایک ایسی چیز ہے (مطلب سکھ دوستوں کی پانچ بنیادی چیزوں میں کچھا بھی ہوتا ہے) تو وہ کچھا بے شک اس نے پہنا ہوا تھا کرپان جیسا کہ بعد کو معلوم ہوا اس ''بے پروا'' آدمی نے کورین بی بی کے کمرے میں پہلے ہی چھوڑ دی تھی تو ظاہر ہے سکھوں کی پانچ بنیادی چیزوں میں سے چار تو اس وقت باضابطہ اس کے پاس موجود تھیں۔ غنیمت تھا۔

وہ دونوں بیٹ روم سے نکلے اور انحد نے چیخ کر کہا۔ ''کھان دوڑنا شروع کر۔'' مجھے دوسری بار کہنے اور صورت حال پر توجہ دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں مس پائن وڈ کے فوراً بعد سیڑھیوں پر اڑا چلا گیا۔ یہ کوئی شارٹ کٹ ہوگا اس مصنوعی جنگل میں پہنچنے کا۔

آگے آگے پائن وڈ بی بی پیچھے میں اور میرے پیچھے کوٹ اٹھائے کچھے کے سوا نیچے سے آزاد برہنہ پا پھد پھد دوڑتا ہوا سوار ان حد سنگھ ترکھان۔ ہم سیکنڈوں میں اس استوائی جنگل میں پہنچ گئے جہاں اب ہماری ایک جیپ ترپال سے ڈھکی کھڑی تھی۔

پائن وڈ بی بی نے ایک ہاتھ بڑھا کر ترپال کا کونا تھاما اور خدا معلوم کیسی لپیٹ کے

ساتھ ترپال کھینچی کہ ایک ہی بار میں ترپال جیپ سے پھسل کے ایک طرف جا گری اور ایلس بی بی نے ہاتھ پکڑ کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر انحد کو بٹھا دیا۔ انحد اپنے کاندھے پر اسی طرح کوٹ ڈالے ہوئے تھا۔ اسے سیٹ پر بٹھا کر وہ بیلوں کتاؤں سے ڈھکے اس چور دروازے کی طرف گئی جو ایک بغلی سڑک پر کھلتا تھا۔

ہم نے پھر ایک فائر کی آواز سنی لگتا تھا فائر ہمارے سر پر ہوا ہے۔

میں نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی دعا کی تھی کہ یہ ان حد مستحق ہو نہ ہو میں تو اس وقت تھوڑے رحم کا مستحق ضرور ہوں۔ اگرچہ میری سوسائٹی بری تھی پھر بھی گاڑی ایک بار میں اسٹارٹ ہو گئی اور دور سے اناڑ باسٹرڈ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نعرہ سنتا ہوا میں 'ٹہلتی بیلوں' بہتے پانی اور کھلتے پھاٹکوں کے بیچ سے انحد کی جیپ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ آگے بغلی سڑک کی عافیت اور اچھے ٹیون کیے ہوئے انجن کا معاملہ تھا جو بہت خوش اسلوبی سے طے ہوا۔

کھانا کھانے کے بعد اس طرح بے تحاشا دوڑنے یا پیٹھ میں برٹش آرمی کے سروس ریوالور کی گولی کھانے کے خوف سے میرا پیٹ بری طرح درد کر رہا تھا۔

انحد سنگھ نچلے بدن پر کمبل ڈالے اپنے باریک بازیاب کیے گئے کوٹ کا گھونگٹ کاڑھے ڈھیٹ پن سے ہنسے جا رہا تھا۔

میں نے غصے سے کہا۔ ''ہم کسی سیفٹی (حفاظت) کی جگہ پہنچ جائیں پھر میں تمہیں خدا حافظ کہوں گا اور اپنی شکل گم کر جاؤں گا۔ مسٹر تم اور کچھ دیر گھوڑے کی طرح ہنس لو۔''

انحد کی ہنسی نہیں رک رہی تھی مگر اس نے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ گویا وہ معافی مانگ رہا تھا۔ مگر ڈھیٹ اتنا تھا کہ برابر ہنسائے جا رہا تھا۔

میں ایکسو پچیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے جیپ اڑائے لیے جا رہا تھا کہ سڑک کنارے کے درختوں کا جھنڈ چھوڑ کر ایک اور جیپ غراتی ہوئی میرے ساتھ ہو لی۔ پہلے تو میں اپنی دماغی الجھن میں پہچان نہ سکا اور سمجھا کہ یہ دشمنوں کی گاڑی ہے مگر پھر پہچان گیا۔ یہ ہم سے پہلے فرار ہو جانے والا ہمارا اپنا ڈرائیور تھا۔ جو اب ساتھ ساتھ اڑا آرہا تھا۔

آٹھ نو میل نکل آنے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا جا رہا

ہے تو میں نے ذرا رفتار ہلکی کی بلکہ گاڑی روک کے ایک درخت کے سائے میں جا کھڑا ہوا
اور خود کو ہلکا کیا۔

اس وقت تک انحد کا ہنسی ٹھٹھے کا موڈ اپنا ایک دورہ پورا کر چکا تھا۔ وہ خود بھی
جیپ سے اتر آیا اور بڑی سپرونگ باندھ کر اپنی تہمد یا دھوتی جیسی ہوتی ہے اوپر اپنا کئی
دنوں کا بچھڑا ہوا کوٹ پہن کر میرے انتظار میں جیپ کے برابر ٹہلنے لگا۔ میں پہنچا تو بولا۔
"دوست یہ ماننا پڑے گا کہ کھانا کھانے کے بعد اتنا فاسٹ دوڑ لگاؤ فاسٹ ڈرائیونگ کرو تو
کھانا ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ تیری ہیلتھ مجھے پہلے سے چنگی لگ رہی ہے۔"

پہلے تو میں نے سوچا کوئی سخت بات کہوں' غصہ دکھاؤں مگر پھر خیال ہوا کہ یہ
ڈھیٹ آدمی میرا پھلکا اڑانا چاہتا تھا اس لیے چھیڑ رہا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ بولا۔ "جس تھاں مطلب جس جگے دو دو کیس اٹینڈ کرنا ہووے ادھر ایک
بچارے سکھ پر ساریاں ذمہ داریاں ڈال دینا۔

مزے دی گل نہیں ناں ہوئی۔ دنیا وچوں انصاف تے ۔۔۔"

میں نے کہا۔ "ان حد سنگھ! انصاف کے ساتھ کہیں تم بھی نہ اٹھ جانا خیال
کرو۔ میں پٹھان بھائی زیادہ بات نہیں کروں گا۔ خرچ کر دوں گا تمہیں۔"

کہنے لگا۔ "چل بولا تو۔ میں تو سمجھ رہا تھا میرا یار میرے کولوں نراج ہو گیا ای۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "انحد! تم خوش مزاج آدمی ہو۔ خوش مزاجی اچھی
صفت ہے۔ تم اپنا چونچال موڈ بہت دیر تک قائم رکھ سکتے ہو۔ یہ تمہاری دوسری خوبی
ہے۔ میرا یہ ہے کہ ایک تو میرا زندگی کا اسٹائل تم سے مختلف ہے۔ دوسرے اس وقت
میں بڑی پریشانی کے دور سے گزر رہا ہوں۔ اگر میں چڑچڑے پن سے یا کڑوے سبھاؤ سے
کوئی بات کہوں تو خیال مت کرنا۔ میں خود بھی ہنسنا ہنسانا چاہتا ہوں۔ بور نہیں ہوں۔ بس
یہ ہے کہ آج کل پریشان ہوں۔"

وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا بولا۔ "مجھے سب پتا ہے تو کیہو جیا بندہ ہے کھان! تیرا
جی بہلانے کھش رکھنے کو ہی تو سب کچھ کر رہا ہوں۔ یار ____ اب میں ایسا سانڈ اور بری
نجر کا آدمی بھی نہیں ہوں جیسا تیرے کو دکھتا ہوں .... عام جیا سکھ آں۔ کھش مجاز
نالے تھوڑا جیا دل فینک۔"

میں نے کہا کہ تو دل پھینک نہیں کچھ اور پھینک ہے تو وہ اس پر بھی بہت ہنسا
پھر بولا۔ "چل برابر آ کے بیٹھ آگے گاڑی میں نے چلانی ہے۔"

وہ ڈرائیو کرنے لگا' میں اس کے برابر تھک تھکا کے بیٹھا اونگھتا رہا۔

شام ہوتے ہوتے ہمیں کچھ ایسے آثار نظر آنے لگے جن سے برانٹ ٹمبر
اسٹیٹ یعنی انحد کے دوست بلی برانٹ کا علاقہ قریب آتا معلوم ہوا۔

ایک خوب صورت سرسبز پھلوں سے لدے ٹیلے کا موڑ کاٹتے ہی ہم نے دیکھا
کہ ڈھلان پر ہرے ہرے ہموار لان بنائے گئے ہیں اور پھولوں بھرے ٹیلوں اور قطعوں
کے بیچ جگہ جگہ مختلف کورٹس بنے ہیں۔ لان ٹینس کے کورٹ' والی بال کے کورٹس اور
جہازوں کے عرشے پر کھیلے جانے والے رنگ بال کے کورٹس۔

انحد نے ایک ٹینس کورٹ کی روش پر گاڑی ڈال دی۔ اسٹیل کی جالی کے بہت
بڑے اسکرین کے پیچھے ایک چونچال پارٹی بہت زور و شور سے لان ٹینس کھیل رہی تھی۔
پارٹی میں ایک طرف ایک مرد ایک عورت اور دوسری طرف دونوں عورتیں تھیں۔ مرد
پچاس سے اوپر کا مگر خوب تن درست اور گروم کیا ہوا مطلب مردانہ سنگھار وغیرہ کیا ہوا
دکھتا تھا۔ خود وہ کوئی اچھا شاٹ کھیلتا تو اپنے ساتھ کی عورت اور مخالف عورتوں سے داد
طلب کرنے کے لئے کھیل روک کے کھڑا ہو جاتا۔ اس کے ساتھ کی عورت اچھا کھیل
دکھاتی تو ہاتھ پھیلا کے اسے اپنے پاس بلاتا اور گلے لگاتا۔ غلط کھیلتی تو بھی پاس بلاتا مگر اس
کے کولھوں پر سزا کی طور پر ریکٹ مارتا یا وہیں ایک دھول رسید کرتا۔ انحد نے اشارے
سے بتایا کہ یہ بلی برانٹ ہے اور یہ تین "جنانیاں" جن کے ساتھ وہ کھیل رہا ہے اس کی وہ
میزبانیں ہیں جو آج کل برانٹ کی "منجور نجر" بنی ہوئی ہیں مہینے دو مہینے تک یہ اس کی
سہیلیاں رہیں گی۔ اسی کے ساتھ کھائیں گی' پئیں گی' سوئیں گی' جاگیں گی اور جب
برانٹ ان سے اوبھ جائے گا تو ہانگ کانگ یا رنگون کے جوئے خانے پر ان کی پوسٹنگ
کر دی جائے گی۔ برانٹ انہیں ہمیشہ کے لئے بھول جائے گا۔ ایک بار جو برانٹ اسٹیٹ
سے ہو کر چلی جائے دوبارہ اسے یہاں تکلیف نہیں دی جاتی۔

ہماری جیپ اسٹیل کے اسکرین کے سامنے جا رکی۔ آدھے منٹ بھی نہ کھڑی
ہوئی تھی کہ برانٹ کی نظر پڑی اور وہ ریکٹ پھینک کر اپنی پارٹنر کا ہاتھ پکڑے دوڑتا ہوا
سیدھا ہمارے سامنے اسکرین کے پاس آ گیا اور اس سے بھڑ کر ہمیں پرجوش طریقے پر
خوش آمدید کہنے لگا۔ "ان ہیڈ! میرے دوست اور آپ مسٹر کھان! میرے معزز مہمان!
برانٹ اسٹیٹ میں آپ کی آمد ہمارے لئے مبارک ہے۔ آپ نے عزت بڑھائی
ہماری۔"

حیرانی ہوئی وہ میرا نام کیسے جانتا ہے پھر وہ اپنی منظور نظر کی طرف متوجہ ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ پکے ہوئے زیتون کی رنگت والی عورت یہودن تھی جو بیروت سے پچھلے چند مہینوں میں امپورٹ کی گئی تھی۔ یہ اردو سمیت بہت سی زبانیں جانتی تھی۔

بلی برانٹ نے اپنی فی الوقت محبوبہ کے تمتماتے ہوئے پسینہ پسینہ رخسار اپنی ہتھیلیوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیے اور بولا۔ ”رے بے کا! ڈارلنگ‘ یہ وہی معزز مہمان ہیں جن کے بارے میں انگلش لیڈی نے فون کیا تھا اور جن کے انتظار میں ہم ٹینس کھیل کے وقت گزار رہے تھے۔ رے بے کا! انہیں خوش آمدید کہو میری یہودی چڑیا۔“

چڑیا اس نے ٹھیک کہا تھا اس لڑکی نے چہچہاتی ہوئی آواز میں ہمیں خوش آمدید کہا اور وہ بلی برانٹ کا ہاتھ پکڑ کر ہماری طرف آنے کے لئے اسکرین پار کرنے کو ایک طرف دوڑنے لگی۔

اچھا تو ہماری آمد کی خبر ایلس پائن وڈ کی ہے۔

امجد نے دھیرے دھیرے مجھے سمجھایا کہ برانٹ کی تواضع کا خاص انداز یہ ہے کہ وہ اپنے سب سے معزز مہمان کو جو اس وقت شیر کھان تم ہو۔ اپنی سب سے اہم منظور نظر کی ذمہ داری میں دے دے گا۔ دوسرے نمبر کے مہمان کو۔ جو اس وقت میں ہوں منظور نظر نمبر دو جو وہ کالے چیتے جیسی امریکن نیگرو ہے اس کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اس پر برا منانے کی جرورت نہیں ہے۔ تم چاہے اس بیروت والی سے مڈل ایسٹ کی پالیٹکس پہ بات کرتے رہنا مگر اسے واپس مت کرنا۔ بلی برانٹ میرا بہت اچھا دوست ہے اس کا دل ٹوٹ جائے گا پھر ہو سکتا ہے وہ ”نراج“ ہو جائے اس کے ”نراج“ ہونے پر میری شراب کی سپلائی متاثر ہو سکتی ہے۔ اس لیے پٹھان بھائی! میرا خیال کرنا۔ رے بے کا بی بی کو اپنے ساتھ انیکسی کی طور پر۔ جیسے گدھا گاڑھی میں گدھے کے ساتھ ایک پخ ہوتی ہے۔ رہنے دینا۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔

گدھے اور پخ کی مثال پر میں ہنس دیا اور امجد سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔

بلی برانٹ اس کی تینوں منظور نظر میزبانیں اس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ ہم اتر کے کھڑے ہو گئے۔ یہ چھوٹا سا گروپ ابھی ہمیں گھیرے کھڑا تھا کہ بیٹریوں سے چلنے والی گولف گراؤنڈ کی تین کھلی ٹرالیاں ریل کی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہمارے برابر آ کے رک گئیں۔ خادم جو گولف ٹرالیاں لائے تھے ہماری جیپوں اور ڈرائیور کو لے کر چلے گئے۔ سب سے آگے کی ٹرالی میں بلی برانٹ نے مجھے اور رے بے کا یہودن کو

بٹھایا۔ دوسری میں امجد سنگھ اور امریکن چیتے کو اور آخری ٹرالی میں وہ اپنی ہندوستانی میزبان کے ساتھ خود بیٹھا جس کا تعارف اس نے پرنس کنتی کہہ کر کرایا تھا۔

بلی کا دعوی تھا کہ پرنس کنتی دراصل کوئم بٹور کے مہاراجا کی پڑنواسی ہے۔ حالات بگڑ جانے کی وجہ سے عارضی طور پر برانٹ کے اسٹیبلشمنٹ میں خصوصی میزبان کی نوکری کر رہی ہے۔ یہ ایک درمیانے سے ذرا چھوٹے قد کی مٹلو میزبان تھی جس کی ناک کا سرا کسی انگلش کاؤنٹی کے مویشی پالنے والے کسانوں کی طرح ذرا سا اوپر کو اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ نیگرو لڑکی سے کچھ ہی کم دبیز ہوں گے۔ تاہم اس کی جلد اصل نسل اینگلو انڈین تھی۔ کسی کوئم بٹوری شہزادی سے زیادہ نقلی انگلش سرکس میں کام کرنے والی لگتی تھی۔

ہندوستان میں ایک زمانے میں ایسے ”انگلش“ سرکسوں کا بہت چرچا تھا جو دنیا کے ٹور پر نکلے ہوتے تھے اور بیس تیس سال سے اپنے وطن انگلستان نہیں گئے تھے۔ اس لئے ان کے آرٹسٹ سب دیسی زبانیں اچھی طرح جانتے تھے مگر تھے وہ ”انگلش“ ہی۔

یہ پرنس کوئی بہت ہی چنٹ لڑکی تھی۔ امید تھی کہ بلی صاحب کو یہ کوئی لمبا چکر دے گی۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ مجھ سے تعارف کے دوران ہاتھ ملاتے ہوئے پرنس کنتی نے اپنی ایک لمبی مخروطی انگلی سے میری ہتھیلی کھجائی تھی اور جب میں نے گھبرا کر اس کی صورت دیکھی تو بہت ماہرانہ انداز میں اس نے آنکھ سے ایک اہم اشارہ کیا تھا۔

رے بے کا بی بی میری ٹرالی چلا رہی تھی اور ٹرالی کی کشادہ بنچ جیسی سیٹ پر اس نے اس طرح قبضہ کیا ہوا تھا کہ لگتا تھا ہم دو کے علاوہ بھی دو اور آدمی اس سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ اس کے پاس سے برانٹ کے خریدے ہوئے مہنگے سینٹ اور ٹینس میں بہائے ہوئے پسینے کی ملی جلی مہک آ رہی تھی۔

اس نے بیٹھتے ہی اردو کا اچھا خاصا ایک معقول شعر پڑھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا کہ کہاں میں ذرہ اور کہاں وہ آفتاب پھر بھی قریب بیٹھنے کا یہ موقع ملا ہے۔ تو مجھ خاک پر بیٹھنے والے کا دماغ اب عرش پر ہے۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ ”بی بی! بالکل صحیح جا رہی ہو۔“ جو اس نے نہیں سنا۔ پوچھنے لگی۔ ”کیا فرمایا؟“ میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ایسا رہبری کر رہا ہو تو قافلہ بہت جلد کسی اچھی جگہ پہنچ جائے گا۔“

اس نے پھر ایک شعر پڑھ دیا کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ کہیں نہیں جہاں پہنچنا تھا پہنچ گئے یعنی تیرے پہلو میں۔

میں نے کہا۔ "ماشاءاللہ! اچھے اچھے شعر یاد کر رکھے ہیں تم نے۔"

بولی۔ "بیروت تو میں نے گیارہ بارہ برس کی عمر میں دیکھا اس سے پہلے ہم لوگ بامبے میں رہتے تھے۔ میرے باپ فلم انڈسٹری سے متعلق تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا کرتے تھے؟ کیا فلموں میں گانے لکھتے تھے؟"

وہ ہنس کر کہنے لگی۔ "نہیں گانے تو زخمی جبل پوری ہمارا پڑوسی لکھتا تھا میرے پپا ساؤنڈ رکارڈسٹ تھے۔"

میں نے کہا۔ "جبھی۔"

میری میزبان ٹرالی چلاتے ہوئے میری طرف کھسکتی آ رہی تھی۔ اس کا اسٹیئرنگ وہیل چلانے والا ہاتھ کبھی میرے پیٹ سے آلگتا کبھی اس کی کہنی میرے گال کو چھو لیتی۔ وہ جیسے اپنے ہی انہماک میں ٹرالی چلا رہی تھی اور باتیں کر رہی تھی اور کبھی اچھے کبھی لچر شعر سنا رہی تھی باتیں زیادہ تر بامبے کی تھیں اور ان دنوں کی جب وہ گیارہ بارہ سال کی تھی اور اس زخمی جبل پوری فلمی گانے لکھنے والے کی شاگرد تھی یہ اس کا پہلا استاد تھا اور پڑوسی تھا اور اردو شاعری یا سمجھو اردو کے برے بھلے اونچے اور بازاری سب طرح کے شعر سکھایا کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ "عجیب بے تکا استاد تھا۔ ارے اردو شاعری سے شروع کر رہا تھا تو گیارہ بارہ برس کی بچی کو پہلے "رب کا شکر ادا کر بھائی' جس نے ہماری گائے بنائی" یا اقبال کی "پہاڑ اور گلہری" جیسی نظموں سے شروع کراتا۔ یہ کیا سکھا رہا تھا۔ کہ "لذت وصل کی راتوں میں کبھی ہجر کے دن" ایک تو یہ کوئی بات ہی نہیں بنی۔ مصرع ہی نہیں ہے یہ دوسرے اتنی سی لڑکی کو یہ ساری فضولیات کیوں رٹا رہا تھا جاہل؟"

وہ میری طرف جھک آئی۔ آواز میں جیسے نشہ سا ڈال کے بولی۔ "ارے آپ سمجھے ہی نہیں زخمی بڑا حرامی تھا۔ مصرع نہیں سکھا رہا تھا لائن پر لگا رہا تھا۔ وہ تو پپا کو بیروت کا آفر آ گیا اور ہم بامبے سے اچانک چل پڑے نہیں تو جبل پوری زخمی نے ہرٹ کر دیا ہوتا۔" وہ یہ سب باتیں بامبے کے فلمی انداز میں کہہ کے ہنسی۔

امجد سنگھ نے پچھلی ٹرالی سے آواز لگائی۔ "مجے کی ڈرائیور ملی ہے ہاں کہاں! لطیفے' مطلب جوکس سناتی ہے۔ ہاں؟"

میں نے مڑ کر کہا۔ "لطیفے نہیں بڑی بھیانک بات بتا رہی ہے' ایک زخمی کی۔"

امجد نے آواز میں جھرجھری ڈال کر کہا۔ "او گاڈ! یار ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایکسی ڈینٹ کے اور جکھمی ہونے کے اور ڈیتھ کے قصے تو نہیں ناں سنانے چاہئیں۔"

یہودن نے مردوں کی طرح ٹھٹھا لگا کے میرے زانو پر ہاتھ مارا جس طرح بے تکلف مرد ایک دوسرے کے ہاتھ مارتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "رے بے کا! یہ ٹھٹھے لگانا اور جوکس سن کے' سنا کے رانوں پر ہاتھ مارنا بھی کیا تم نے بامبے میں سیکھا ہے؟"

وہ جھینپ گئی۔ دھیرے سے بولی۔ "سوری سر۔"

ہم برانٹ اسٹیٹ کی ولاز میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک جیسی تین ولاز تھیں۔ تینوں پہ بڑا پیسا خرچ کیا گیا تھا۔ باہر ہی سے نظر آ رہا تھا مگر کیونکہ عمارتیں ظاہری طور پر تجارتی مقصد سے بنائی گئی تھیں اس لئے ایک خاص طرح کا محتاط بازاری پن اور چمک دمک زیادہ تھی۔ خود امجد کی ولا یا مونگ لی صاحب کی رہائشی یونٹوں جیسا وقار نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

بلی برانٹ کے حصے میں نہ تو انگریز قوم کا سنجیدہ مزاج آیا تھا نہ برمیوں کی باوقار بہادری۔ ظاہر ہے وہ جوئے کھلانے اور کروڑ پتی اوباشوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے کے لئے بین الاقوامی مزاج کی عورتیں فراہم کرنے کا کاروبار کرتا تھا۔

ہمارے ولا کے سامنے ٹرالی ریل سے اترنے پر فومانچو قسم کے گلاتراشنے والے چینی' کورین' ویت نامی یا تھائی قسم کے گٹھے ہوئے بدن کے غلافی آنکھوں والے خادم چمچماتے سوٹ یا کمر تک کی کٹ جیکٹیں پہنے تیزی سے ولا کے کونوں کھدروں سے جھپٹتے ہوئے نکلے اور کچھ نے اپنے مالک اور اس کی ساتھن کو' کچھ مجھے اور کچھ نے امجد اور س کی چیتا گرل کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

تین نوکروں نے تینوں الیکٹرک ٹرالیاں سنبھالیں اور سیکنڈوں میں ولا کی (میرے لیے) نامانوس بھول بھلیوں میں غائب ہونا شروع کر دیا۔ پہلے بلی برانٹ پھر امجد پنی اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ غائب ہو رہے تھے تو میں نے پکار کر کہا۔ "رکو امجد! ہاں جا رہے ہو؟ یہاں زیادہ وقت مت لگانا کہہ دو بس کھڑے کھڑے آئے ہیں۔ ہمیں گے جانا ہے۔"

کہنے لگا کہ آدھے گھنٹے کی بات ہے دیر نہیں لگے گی۔

میں نے پوچھا۔ "مگر تم الگ ہی الگ کہاں جارہے ہو؟ اور یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

وہ ہنسا اور انگریزی میں کہنے لگا۔ "اگر سب ایک ساتھ ایک ہی جگہ چلیں تو اور بھی اچھا رہے گا۔ بلی برانٹ کو تو خود بھی اس قسم کے کھیل بہت پسند ہیں۔ آئیڈیا برا نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر نیگرو ہنسی۔

میں کچھ نہیں سمجھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیسا آئیڈیا؟ اور کھیل کس بات کا؟"

کہنے لگا۔ "او بھائی جی! نہان دھون واسطے لے جارئے نیں۔"

میں اب بھی نہ سمجھا میں نے کہا۔ "او بندے خدا کے۔ یہ جلوس کی شکل میں نہانے دھونے کا کیا سلسلہ ہے؟ مجھے اگر فریش ہونا ہوگا تو میں خود ہی جا کر منہ ہاتھ دھولوں گا یا نہالوں گا۔"

امجد اور اس کی بلیک چیتا گرل اور انہیں لے جانے والے سوٹ پہنے فومانچو لوگ ہال میں رکے کھڑے تھے۔ چیتا گرل کو کسی قسم کی بے چینی تھی وہ ہم دونوں کو اپنی دیسی زبان میں باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔ سمجھتی کچھ نہیں تو شاید یہی اس کی بے چینی کی وجہ ہوگی۔

امجد سنگھ نے اب کے انگریزی میں کہا تو امریکن چیتا گرل سمجھی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے بے آواز ہنسا اور وہیں کھڑے کھڑے لہرانا شروع کر دیا۔

ان حد نے بات ہی اتنی بے ڈھب کہی تھی۔ بولا "برانٹ ٹوورز کو سیاحوں کے حلقوں میں اپ سائڈ ڈاؤن ٹورسٹ سروس کہا جاتا ہے۔ یعنی اوندھی ٹورسٹ سروس۔ اگر آپ مرد ہیں تو اپنی میزبانوں کو جو آپ کے ساتھ کورٹس میں کوئی گیم کھیل رہی ہوتی ہیں اور اب شام گہری ہونے پر تھک چکی ہوتی ہیں برانٹ ٹوورز کی روایت کے مطابق پرسنل سروس یعنی ذاتی خدمت دینی ہوتی ہے۔ آپ کو ان کی مشاطگی کرنی ہوتی ہے۔ یعنی مالش اور غسل وغیرہ سب۔ اس سلسلے میں آپ کو لیڈی یا جینٹ مددگار مہیا کیا جاتا ہے تو آپ تینوں کو ایک الگ تھلگ تمام اریا میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ آدھے گھنٹے کا سیشن ہوتا ہے اور اگر آپ عورت ہیں تو ...."

میں نے چڑ کر کہا۔ "بکواس بند کرو اور اس چیتے کی کمر سے ہاتھ نکال کر فوراً بلی برانٹ کے پاس چلو۔"

وہ بولا۔ "بلی سے اب آدھے گھنٹے بعد ہی ملاقات ہوگی۔ وہ شہزادی کنتی کو یم ہنور اور وہ مددگار مشاطاؤں کے ساتھ ذاتی خدمت کے حمام میں داخل ہو چکا ہوگا۔"

میں طرارے میں آ گیا۔ امجد سے چیخ کر کہا۔ "اس سالے بلی برانٹ کی ایسی تیسی پہ تم مجھے کس دلال خانے میں لے آئے ہو؟ کہاں ہے وہ؟ اور اگر وہ کہیں غارت ہو چکا تو تم ابھی اسی وقت جیپیں منگاؤ اور نکلو یہاں سے۔"

میں یہودن سے ہاتھ چھڑا کر اندر جھپٹنا چاہتا تھا مگر امجد کی میزبان امریکن حبشن اور میری والی یہودن نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بتایا کہ سردار تمہاری ٹانگ کھینچ رہا ہے نہ کوئی مشاطگی سیشن ہے نہ حمام ہے سب ہربل ٹی یعنی جوشاندے جیسی کوئی مفید خوش بودار چائے قہوہ وغیرہ پینے جارہے ہیں۔ یہ چائے بلی خود بناتا ہے اس لئے تیزی سے آگے آگے نکل گیا ہے۔

امریکی چیتے نے بتایا کہ تمہیں ماننے کو "ان ہیڈ سنگھ" نے خود میرا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ ہم بھاگ رہے تھے تو ہمارے اور پھر تمہارے خدمت گاروں نے رش کیا تھا وہ سمجھے خبر نہیں امجد صاحب کو کس بات کی جلدی ہے۔

امجد سنگھ اس تمام وضاحت کے دوران گھٹنوں پر ہاتھ مار مار کے ہنستا رہا اور اٹھک بیٹھک جیسی لگاتا رہا۔

یہ بچوں کی سطح کا کھیل تماشا کرتے ہوئے وہ اتنا خوش تھا ایسے ہنس رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔ چیتے نے میرے پاس آکر میری پیٹھ تھپکی۔ "کھان! مجھے یقین ہے تمہارا دوست تم سے پیار کرتا ہے اور تمہیں ہر وقت ہنستے دیکھنا چاہتا ہے اس لئے ...."

اس چونچال آدمی کی شرارتیں ایسی تھیں کہ تھوڑی دیر کو تو خفا ہوا جاسکتا تھا لیکن زیادہ دیر تک کسی کا بھی خفا رہنا ممکن نہیں تھا۔

ہم بلی برانٹ کے جوشاندہ روم میں پہنچے تو وہاں ہربل ٹی یا جو بھی اس کا تماشا تھا وہ اس کی تیاری کر چکا تھا اور ہم دونوں کا منتظر تھا۔

میں نے کسی تمہید کے بغیر اپنی بات شروع کر دی اور مختصر طور پر اغوا شدہ لڑکیوں پر رشنا اور روکسانہ کا غائبانہ تعارف کرانے کے بعد جسگے کے بیٹے راحل سے اپنی آخری کشمکش کا حوالہ دے کر (مگر بڑے میاں کے مائنگ یان کالج یا رنگون کی جیل کا کوئی تذکرہ کیے بغیر) بلی برانٹ سے درخواست کی کہ وہ اپنے آدمیوں سے بس اتنا معلوم کرا

لے کہ اس اس حلئے نشان کی اسٹیشن ویگن کیا برانٹ علاقے سے نکلی ہے؟

فون پر سرسری ساذکر کرتے ہوئے ایلس پائن وڈ نے برانٹ کو اشارہ دیا تھا کہ ہم دونوں آرہے ہیں کیونکہ ہماری دو دوستوں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔

برانٹ نے سب کچھ سن کے کہا کہ کھان تم نے اس علاقے کے سب سے دلیر اور لائق آدمی ان حد سنگھ کو ساتھ لے کر یہ مہم سر کرنیکا ارادہ کیا ہے اور یہی سب سے بڑی عقل مندی کی ہے۔ دوسری عقل مندی میرے دوست انحد نے یہ کی ہے کہ جو بہرحال اسے کرنی تھی کہ وہ تمہیں لے کر یہاں آگیا ہے۔ میں ایک لطف اور مشکل کاروبار یعنی جوئے بازی میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوں اور یہ کاروبار مہارت کے ساتھ چلانے کی لیاقت اور ورک فورس یعنی کارندوں کی فوج رکھتا ہوں۔ اس طرح کے کتنے ہی کھیل میرے ساتھ کھیلے گئے ہیں اور میں نے وقت پڑنے پر دوسروں کے ساتھ ایسے بے شمار کھیل کھیلے ہیں۔

اپنی اس لمبی تقریر کے بعد وہ بولا کہ میں تین نہایت ماہر آدمیوں کو چائے پیتے ہی اس کیس پر لگا دیتا ہوں۔ وہ تینوں کام کی تفصیل جان کر اسے سرانجام دینے نکل پڑیں گے اور ہر چند گھنٹے بعد وائرلیس سے یہاں ولا میں میرے منیجر کو مطلع کرتے رہیں گے۔ میرا منیجر تینوں کی رپورٹوں سے ایک تصویر کے اجزا جوڑتا رہے گا۔ جب کچھ صاف نظر آنے لگا یا مجموعی صورت حال بن کر سامنے آجائے گی تو ایک منٹ ضائع کیے بغیر وہ مجھے اطلاع کر دے گا۔ میرے سارے کام اسی طرح ہوتے ہیں۔

اس تمام عرصے میں کہ میرے کارندے ٹکڑے جمع کر کے تصویر بنا رہے ہوں گے ہم ایک اچھے "عیاش" گروپ کی طرح (یا اگر عیاش لفظ تمہیں برا لگتا ہے تو ایک زندگی سے فیض اٹھانے والے گروپ کی طرح) ہم تینوں اپنی "ساتھنوں" کی رفاقت میں نفیس خوراک' اعلیٰ مشروب' بہترین استراحتوں کے مزے لوٹتے رہیں گے۔

"اراب ؟" وہ کہنے لگا۔ "اب میرے معزز مہمانو اور دوستو! میں آپ کی پیالیوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی ہربل چائے نکال رہا ہوں فکر سے آزاد ہو کر چائے پیجئے اور مجھے اچھے ناموں سے یاد کیجئے۔"

یہ آدمی بلی برانٹ چاہے کیسا بھی عیاش' مے خوار اور دلال قسم کا ہو مجھے اس وقت اس کا بہت لیاقت کے ساتھ تمام چیزوں کو سمجھنا اور تسلی دینا اچھا لگا۔ یہ ہمدرد آدمی لگتا تھا۔

برے سے برے آدمی سے بھی قدرت کوئی نہ کوئی اچھا کام لے لیتی ہے۔

میں نے سوچا۔ میں اس کی ذاتی زندگی یا اس کے ذرائع آمدنی پر فیصلے دینے کا کیا حق رکھتا ہوں۔ مجھ سے تو میرے اپنے اعمال کی پوچھ گچھ ہوگی تو اس کی ایسی تواضع کو مجھے قبول کرلینا چاہئے جو میرے زندگی کے خاص طرز سے نہ ٹکرا رہی ہو اور حرام اور حلال کی صاف حد بندی کو نہ توڑے۔ انحد سنگھ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ تمہارے آنے کا سن کے بلی برانٹ نے بھی مسلمانوں کے لئے ناپسندیدہ غذاؤں اور حرام چیزوں سے احتیاط شروع کردی ہوگی جس طرح وہ میری موجودگی میں خود تمباکو نہیں پیئے گا اور اپنے تمباکو پیتے مہمانوں سے مجھے دور رکھے گا اس طرح نامناسب غذاؤں اور مشروبات کو ہمارے تمہارے کھانے کی چیزوں سے دور رکھے گا۔

انحد بولا۔ "بس یہ ہے کہ ہم دوویں بندے تے ہماری چڑیاں اپنے گلاس شلاس لے کے تمہارے سامنے بیٹھے رہن گے .... تمہاری مرجی ہے ایک آدھ گھٹ (گھونٹ) ہمارے گلاسوں سے لے لو .... مرجی ہے بھاویں ناں لو۔"

انحد اپنی شرارتوں اور فقرے بازیوں سے باز نہیں آسکتا تھا۔

بلی برانٹ کی جڑی بوٹیوں والی چائے واقعی بہت لطیف خوش بودار اور فرحت بخش تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ چائے پیتا پلاتا ہوا اس کے ان اوصاف پر زیادہ تقریر کر رہا تھا جو اوصاف انحد سنگھ کو اور خود بلی برانٹ کو لبھاتے ہوں گے۔ مطلب اسے یقین تھا کہ ایک خاص طرح کی قوت اور جوش و خروش میں اضافہ کرنے میں اس کی یہ جڑی بوٹیوں والی چائے بے مثال ہے۔

مجھے ان حد سنگھ کی وہ ٹرکی پولٹری یاد آگئی جسے وہ بادام چگنے والی قوت بخش ٹرکی بنا کر بلی کو تحفے میں بھیجتا رہا تھا۔ دونوں ہی ایک استاد تھے۔

چائے کے کمرے سے ہم تینوں مرد نکل کر بلی کے آفس میں پہنچے۔ لڑکیاں اپنا میک اپ سنبھالنے لباس تبدیل کرنے چلی گئیں۔

بلی کے تین کارندے اور چوتھا منیجر آفس میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بلی برانٹ نے مختصراً اغوا کی واردات کے بارے میں بتایا۔ اغوا ہونے والی لڑکیوں کا حلیہ نام وغیرہ اور اسٹیشن ویگن کی تفصیل بتا کر برانٹ نے اس روٹ کی تفصیل بیان کر دی کہ جس پر فراریوں کے نکل آنے کا امکان تھا اور شہادتیں ملتی آرہی تھیں۔ برانٹ نے وہ شہادتیں اور اشارے' ثبوت اور نشان بھی بیان کر دیے جو انحد کی ٹمبر اسٹیٹ کے بعد سے

ہمیں ملتے آئے تھے اور جن کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔

مینجر ایک پیڈ پنسل سنبھالے شارٹ ہینڈ میں نوٹس لیتا گیا۔ تینوں تھائی' ویت نامی یا برمی چینی کارندے جو بھی تھے اپنی غلافی آنکھیں جیسے غنودگی کے عالم میں کھولے خاموشی سے پوری باتیں سنتے اور کبھی کبھی اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ انہوں نے آخر میں کھڑے ہو کر تعظیم میں سر جھکائے اور ایڑیاں بجا کر مالک کو سلام کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ وہ تینوں ہی اتنے پراسرار اور خطرناک دکھائی دیتے کارندے تھے کہ میں یا کوئی امن پسند آدمی دن کے وقت بھی تنہا گلی میں ان جیسے استرے سے گلا کاٹ دینے والے گرگوں کے ساتھ بے خوف ہو کر نہیں نکل سکتا تھا۔ مینجر ذرا مہذب دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے دو تین سوالات کیے جو میرے دشمنوں قبائلی راول جسکھے اور مشرقی پاکستان کے سلسیل چوہدری اور اس کے خبیث بھتیجے بازلر کے بارے میں تھے۔

کارندوں اور مینجر کے جانے کے بعد بلی برانٹ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور ایک ایک ہاتھ پکڑ کر مجھے اور امجد سنگھ کو اپنے آفس سے تقریبا کھینچتا ہوا اپنے "وہسکی لاؤنج" میں لے آیا۔

اس کی تینوں میزبانیں کھیل کا لباس بدل کر مشروب کے لباس میں آ گئی تھیں جو ٹینس کی ٹی شرٹس اور شارٹس (مطلب نیکروں) سے کہیں زیادہ ہلکا اور کھلا تھا۔ "وہسکی لاؤنج" اگر موسم سے بچاؤ کے لئے ائرکنڈیشننگ سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو تینوں بے بیاں اتنی ڈھکی کھلی تھیں کہ چند ہی منٹ میں نمونیے کا شکار ہو سکتی تھیں مگر "وہسکی لاؤنج" اپنے نام کی طرح گرم تھا اور تینوں لڑکیوں کے ہاتھوں میں لیکوڈ فائر یعنی سیال آگ کے گلاس تھے۔ امجد اور بلی برانٹ کے گلاس اور میرے لئے پھلوں کے جوس کے ٹن نلکیاں لگے میز پر ایک قطار سے رکھے تھے۔

میری میزبان رے بے کا یہودن بیروت والی نے میرے لئے پھلوں کا رس گلاس میں انڈیلتے ہوئے کچھ اس طرح کا شعر پڑھا کہ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔ میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں نیک بخت! میں نے نہیں پی۔" تو امجد سنگھ نے اسے آنکھیں دکھائیں کہنے لگا۔ "او بی بی بیروت والی۔ میرا یار کھان صاحب اپنی مرجی کا مالک ہے۔ اسے برغلانے کی کوئی جرورت نہیں ہے۔ اور میم صاحب! تسیں گلاں وی نہیں کڈو میرے یار کو کم بخت بولنے دی وی کوئی جرورت نہیں ہے۔"

امجد سنگھ نے پہلے دو تین گھونٹوں کے بعد ہی سے خود کو نشے میں ظاہر کرنا

شروع کر دیا تھا۔

بلی برانٹ کا یہ "وہسکی لاؤنج" کچھ اس طرح فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا اور جابجا ایسے طریقے سے اخروٹ کی لکڑی کے کشمیری کام کے نقشین اسکرین کھڑے کیے گئے تھے کہ جب تک مہمانوں کا جی چاہے مرکزی بار اور میزوں پر جمے بیٹھے رہیں اور دوسرے دوستوں اور جوڑوں کی طاقت کا لطف اٹھائیں اور جب جی چاہے اپنے پارٹنر کے ساتھ راز و نیاز کریں۔ اسکرین کی سہولت اور بغلی صوفوں کا انتظام اسی غرض سے کیا گیا تھا۔

ہمارا میزبان کچھ دیر تک مرکزی ایریا میں بیٹھا پیتا پلاتا رہا اور شراب سے امجد سنگھ اور پھلوں کے تازہ رس سے میری تواضع کرتا رہا پھر اس کی پارٹنر شہزادی کنتی آف کوئم بٹور کی ذات میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی تو وہ ایک بوتل' دو گلاس اور کنتی جی کو لے کے کشمیری کام کے ایک اسکرین کے پیچھے صوفوں پر چلا گیا اور وہیں سے آواز دے دے کے امجد کو اور مجھے اپنے اپنے مشروب پر توجہ کرنے کی تائید بھی کرتا رہا اور مصروف بھی رہا۔

میری ساتھی عورت امجد سنگھ کے بے ضرر فقرے کا جس میں اس نے مجھے ورغلانے سے اسے روکا تھا کچھ برا مان گئی تھی۔ اور اپنا گلاس لیے گم صم سی بیٹھی تھی۔

امجد سنگھ پر ابھی چڑھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اسے یہودن رے بے کا اداس اور الگ تھلگ ہونا فوراً سمجھ میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ "بی بی بیروت والی! اگر میری بات کا برا منایا ہے تو نے تو میں معافی چاہتا۔ جے اگر برا نہیں منایا تے فیر میرے دوست کھان صاحب کو کلا (اکیلا) نہیں چھڈ۔ کھان ہوری سے باتیں کر کٹ کٹ کے۔"

رے بے کا نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ میں اپنے کسی معزز مہمان کی کسی بھی بات کا کیوں برا مناؤں گی۔ میں ٹھیک ہوں اور لیجئے ایک شعر سناتی ہوں جو سردار جی! آپ کو بھی پسند آئے گا۔"

امجد سنگھ بولا۔ "بی بی تو شعر نہیں سنا۔ مجھے تو ایکوئی شیر پسند ہے اور سمجھ آتا ہے 'اپنا شیر کھان اور تو ادھر میرے اور کھان صاحب کے بیچ آ کے بیٹھ۔"

رے بے کا میرے اس رخ سے اٹھی اور دوسرے رخ آ بیٹھی جہاں وہ امجد کے بھی قریب تھی۔

امجد نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "بڑی مہربانی تیری بی بی جو تو

نے برا نہیں منایا اور میرے دوست کو برغلانے سے بھی ہاتھ اٹھالیا۔ مجھے یاد ہے ایک تیرے جیسے معشوق نے مجھے برغلانے کی کوشت (کوشش) کی تھی۔ مدھوری نام تھا کافر کا اور یہ بات شیر پونے کی ہے۔ تو کبھی پونے گئی ہے۔ آں بیروت بی بی؟ پونے شہر بامبے کے نیڑھے مطلب نجدیک ہی ہے۔ میرا کافر معشوق ادھر جنانیوں کا باڈی بلڈنگ کلب کھولے بیٹھی تھی۔ تو خیر جی اب آگے کی سنو.........."

انحد ابھی اپنی مدھوری بے بی کے لیڈیز باڈی بلڈنگ کلب کے تجربے کو بیان کرنے کے لئے اسٹارٹ ہی لے رہا تھا کہ اس کی ساتھن نیگرو بلیک چیتے نے بڑھ کر خود کو اس کے منہ پر رکھ دیا۔ مطلب ایسا کچھ کر دیا کہ انحد سنگھ اپنی بات بڑھانے کے لئے اپنے ہونٹ بھی نہیں کھول سکتا تھا۔

رے بے کانے دھیرے سے کہا۔ "بہت اچھا کیا کیرن نے (یہ امریکی سیاہ چیتے کا نام تھا۔) بہت اچھا کیا۔ کیونکہ یہ لیڈیز باڈی بلڈنگ کلب ہم لڑکیوں کے لئے کوئی خاص دلچسپ موضوع نہیں ہے۔ ہمیں کیا .... اگر پونے میں تھا تو .... کہیں اور تھا تو ہمیں کیا۔"

انحد کی بات بیچ سے کاٹ دی گئی تھی مگر اسے بات کے ادھورے رہ جانے کی اب کوئی فکر نہیں تھی۔ اسے امریکی بلیک چیتے نے ایک دم مصروف کر دیا تھا۔ رے بے کا بیروت والی نے میری وابستگی کے لئے نزدیک آنا چاہا تو میں نے کہا کہ بی بی تم اپنی ڈیوٹی پر رہو، مگر مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میزبانی کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

عورت سمجھ دار تھی۔ میرے اور انحد کے بیچ بیٹھی رہی۔ وہ اب شعر بھی نہیں سنا رہی تھی۔ بات بھی کم کم کر رہی تھی۔ کبھی جب کشمیری کام کے اسکرین کے پیچھے سے بلی برانٹ یاد دلاتا کہ بھئی میرے مہمانوں کا خیال رکھنا تو رے بے کا بی بی ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیتی یا انگلیوں سے کھیلنے لگتی۔

میں اپنی ہی الجھنوں میں تھا۔ ابھی ہم نے لاؤنج میں آدھے پون گھنٹے ہی وقت گزارا تھا کہ لاؤنج کا خادم اپنے مالک کی طرف ٹیلی فون لے کر پہنچا کیونکہ منیجر ہمارے "کیس" کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتا تھا۔

پانچ ہی منٹ کے بعد بلی اور اس کی پرنس کنتی اسکرین کی سیٹ چھوڑ کر ہمارے پاس آ بیٹھے۔ منیجر نے خبر دی تھی کہ کوئی اسٹیشن ویگن بلی برانٹ اسٹیٹ کے

سامنے ہائی وے سے یا بغلی راستوں سے نہیں گزری۔

میں نے کہا۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ برانٹ اسٹیٹ اور میجر چارلس پائن وڈ کی ٹمبر جائدادوں کے درمیان سرکاری جنگل میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ ویسے تو یہ سینکڑوں مربع میل کا علاقہ تھا اور ہم جیسے لوگ اپنے وسائل سے تلاش کرتے تو اسٹیشن ویگن کے لئے قابل گزر راستوں پر ڈھونڈتے ڈھونڈتے دو دن بھی لگ سکتے تھے۔

بلی نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں میرے تینوں آدمی ہشیار ہیں وہ جنگل میں گاڑی کو تلاش کرنے کے بجائے گاڑی کے اس طرف نکلنے کی شہادتوں یعنی ان اطلاعات کو چیک کریں گے جو سیکورٹی والے سے ملی ہیں۔ یہ کام رات میں بہ خوبی ہو سکتا ہے پھر اگر جنگل میں تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی تو کل دن کا وقت مناسب رہے گا۔"

ہم تینوں کے مشورے کے بعد وہیں وہسکی لاؤنج سے منیجر کو ہدایات مل گئیں اور اس نے وائرلیس پر تینوں کارندوں سے اطلاعات چیک کرنے کو کہہ دیا۔

تینوں آدمی "وہسکی لاؤنج" سے اٹھ کر کھانے کی میز تک آئے تو ہم میں سے ہر ایک مفرور گاڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ برانٹ تک جس نے وہسکی لاؤنج میں اور یہی مصروفیت میں وقت گزارا تھا۔ فکر مند تھا۔ پرنس کنتی نے اس نشے اور مستی میں لہراتے ہوئے اپنے باس کے بازو پر جھول جانا چاہا تو اس نے اسے اشارے سے اپنے قدموں پر چلنے کو کہا۔ وہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر کھانے کی میز پر آنے سے پہلے اس نے ایک جیکٹ پر کچھ لکھ کر ملازم کے ہاتھ منیجر کو ایک ہدایت بھیجی۔ لگتا تھا انتظامات کی طرف سے اب وہ کچھ مطمئن ہو گیا ہے۔

کھانا بہت پر تکلف اور مچھلی جھینگے کے سوا سارا کا سارا ویجی ٹیرین یعنی سبزیوں اور دودھ پنیر وغیرہ سے تیار کیا ہوا تھا۔ بلی اسٹیٹ کا چکن اور مٹن بیف وغیرہ حلال نہیں تھا اس لئے برانٹ نے ہمارے آنے کی خبر سنتے ہی خاص اہتمام کر لیا تھا۔ کسی وناسپتی گھی کی جگہ خالص مکھن یا سادہ تیل استعمال کیا گیا تھا۔ پھل اور کچی ابلی ہوئی تلی ہوئی بعض سبزیوں سے ہمارے برمی ہمسایوں نے اعلیٰ درجے کی ڈشیں تیار کی تھیں۔

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے اور پستہ کاجو کتر رہے تھے کہ بلی کے منیجر نے خود آنے کی اجازت طلب کی۔ اسے بلا لیا گیا تو معذرت کرتا ہوا کہنے لگا کہ میں نے کھانے میں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اطلاع دس منٹ پہلے مل گئی تھی کہ ہمارے ایجنٹوں نے ابھی ابھی پائن وڈ جائداد کے اس برمی ملازم سے جو دور دراز پوسٹ پر

سیکورٹی ڈیوٹی دے رہا تھا رابطہ کیا ہے۔ اس نے پہلے کہا تھا کہ پائن وڈ اسٹیٹ سے ایسی ایسی اسٹیشن ویگن کے گزرنے کا اسے شبہ ہوا تھا۔ اب اسے یہ پکا یقین ہو گیا ہے کہ گزرنے والی گاڑی اسٹیشن ویگن نہیں تھی اور اگر ویگن ہی تھی تو اس کا حلیہ قطعاً وہ نہیں تھا جو مفرور گاڑی کا بتایا گیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں نا تو گیند اب زوبر میاں سلہٹی کے کورٹ میں تھی۔

ہربل ٹی یعنی جڑی بوٹیوں کی چائے پینے سے لے کر اب تک برانٹ کے تیز رفتار لائق کارندوں نے ہماری تحقیقات کو میلوں پیچھے جنگل میں بنے زوبر میاں کے جنگل ریسٹ ہاؤس میں واپس پہنچا دیا تھا۔

مجھے پائن وڈ کے اس ایک آدمی کی وجہ سے اتنے گھنٹے ضائع ہونے کا قلق ہو رہا تھا مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہم نے اس آدمی کے شک پر اتنا یقین کیوں کیا تھا۔ غلطی ہماری تھی۔

کھانا کھا کر اٹھے تو ہمارے میزبان کا موڈ پھر کچھ ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ پوچھنے لگا تین چار تفریحی پروگرام چل رہے ہیں۔ برابر کی برانٹ ولا میں میزبان جوا کھیل رہے ہیں تو اگر امجد اور کھان کا جی چاہے تو چل کر جوا کھیلتے ہیں۔ مالکوں کے خاص مہمانوں کو دوسرے گاہکوں سے (جو عام مہمان کہلاتے تھے۔) ممتاز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ خاص مہمانوں کو بھی جوا کھیلنے کے لئے پلاسٹک کے چپس مطلب ٹکلیاں دی جاتی تھیں اور وہ ہال میں سب کے ساتھ ہارتے جیتتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ خاص مہمانوں کو یہ ٹکلیاں مالک کے اکاؤنٹ میں دی جاتی تھیں یعنی انہیں ان کے بدلے میں نقد رقم نہیں دینی ہوتی تھی پھر ہار گئے تو ہار گئے۔ جیتی ہوئی ٹکلیوں کے بدلے بھی رقم کا لین دین نہیں ہوتا تھا۔ ہار کی طرح وہ جیت بھی مالک کے حساب میں ہوتی تھی۔

میں نے امجد اور بلی سے معذرت کر لی کہ میں ان کے ساتھ اس تفریح میں شریک نہیں ہو سکتا۔

امجد کو جوئے سے بڑی دلچسپی تھی وہ اور برانٹ کھیلنے جانے لگے تو میزبان برانٹ نے کہا تم چاہو تو رے بے کا کے ساتھ جا کر کیبرے دیکھو یا اسپیشل فلم شو ہو رہے ہیں تو یہ تمہیں وہاں لے جائے گی۔

میں نے پوچھا کیسی فلمیں، تو بلی برانٹ نے بولا۔ "جرمن زبان کی بعض بہت اچھی اور تیز فلمیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے جرمن زبان نہیں آتی۔"

رے بے کا ہنسی، بولی۔ "اس میں مکالمے سننے سمجھنے کا کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے آنکھوں سے دیکھنے کا ہے، تو آؤ ہم تم دیکھتے رہیں گے۔"

میں سمجھ گیا وہ کس طرح کی فلموں کی بات کر رہا تھا۔ میں نے معذرت کر لی، کہا۔ "میں جلد سونا چاہتا ہوں۔"

رے بے کا بیروت والی نے خوش ہو کر کہا۔ "تو آؤ۔"

میں نے بلی برانٹ سے کہا۔ "اس تمام تواضع کا شکریہ مگر میں فوری طور پر تنہا ایک دم تنہا اس کمرے میں چلا جانا پسند کروں گا جو میرے متواضع میزبان نے میرے آرام کے لئے پسند کیا ہے۔"

بلی نے رے بے کا کو آنکھ کا اشارہ کیا وہ بڑھی اور نہ معلوم کیوں میری پیشانی چوم کر مجھے شب بہ خیر کہتی رخصت ہو گئی۔ بلی نے ایک تجربے کار خادم کو اشارہ کیا وہ مجھے بہت احترام سے میرا کمرہ دکھانے چل پڑا۔

امجد نے شرافت سے چیتے کی کمر تھپتھپا کر کہا۔ "کھان! توں سو جا آرام طلب تے ناقدرا بندہ ہے توں۔ اسی شکر گزار بندے نیں۔ کج ٹائم ریاضت وچ گزاراں گے۔ نعمتاں دی ناقدری نہیں ناں کرنی چاہئے دی اے۔"

بلی برانٹ کی پرائیویٹ ولا کے یہ مہمان داری والے کمرے کسی بھی پانچ ستارہ ہوٹل کی طرح آرام دہ اور پر آسائش سامان اور سہولتوں سے لیس تھے۔

مگر میں کوئی دو گھنٹے تک پڑا جاگتا رہا اور کاکسیز بازار سے شروع ہونے والی اس سازش کے تانے بانے پر غور کرتا رہا جو بہ ظاہر سادہ اور یک رخی سے لگتی تھی مگر جس کے جال کسی ہزار پا عفریت کی طرح پھیلے ہوئے لگ رہے تھے۔ بنگالی بدمعاش بازلر کے ساتھ جیگے قبائلی کا بیٹا راحل روز اول سے شریک تھا اور اب اس راحل کے واسطے سے یہاں برما میں نہ معلوم کتنے اور کیسے کیسے، جرائم پیشہ لوگ شامل ہو گئے تھے۔ اگر اس شخص بلی برانٹ کے کارندوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ بھروسا نہ کیا جائے، تو ہم جو تیز قدم اور بے عقل بن کر چل پڑے تھے اب زوبر میاں کے آس پاس پہیلی نمبر جائدادوں یا سرکاری ذخیروں میں اس رشنا کو ڈھونڈنے نکلیں گے جس کی وجہ سے بے چاری روکسانہ بھی پھنسی ہوئی ہے۔

میں رشنا کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔ میں نے خواب میں اسے دیکھا۔ کبھی سانپ کی جون میں کبھی انسان کی، وہ میرے ساتھ، کبھی جنگل کے شیر کے ساتھ، کبھی

شیر علی بنگش کے ساتھ، جنگلی راستے طے کرتی دکھائی دی۔

ایک بار میں نے یہ خواب دیکھا کہ وہ فائیو اسٹار ہوٹل جیسے کمرے میں میرے بیڈ پر بیٹھی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور رشنا فون اٹھاتی ہے مگر سن رہی ہے اور گھنٹی بجے جا رہی ہے۔ وہ بات بھی کر رہی ہے اور گھنٹی بج رہی ہے۔

میں چونک کے اٹھ بیٹھا۔ بستر کے برابر رکھا فون بجے جا رہا تھا۔

کسی نے امریکی لہجے میں کہا کہ لیجئے یہ آپ کا دوست آپ سے بات کرے گا پھر وہی لڑکی، کسی اور کو زور زور سے پکارتے ہوئے فون کے پاس آنے کو کہنے لگی۔ زور دار آواز سے دروازہ کھلا اور تیز فوارے سے پانی برسنے کی آوازیں آنی لگیں۔ کوئی بہت پرجوش انداز میں گنگنا رہا تھا۔ بٹو دا۔ بٹو دا لک چن ورگا .... او بٹو دا ....

"ظاہر ہے یہ انحد سنگھ تھا۔ ابھی شاور لے رہا تھا۔

اس کی ساتھی امریکی چیتے نے "کپے۔ ہے کھم آآآن!" کر کے اسے پھر بلایا، تو شاور بند ہوا اور سوں سوں سوں کرتا انحد فون کے پاس آتا سنائی دیا۔ امریکی چیتے نے اسے سرزنش کی کہ وہ کچھ اوپر لے کے کیوں نہیں آیا۔ سردی کھا جائے گا۔ انحد نے چیتے کی مدد سے کوئی علاج کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک فضول سی بات کہی اور گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوا بولا۔ "ہے لو۔ شیر کھان! اٹھ میرے یار شاور لے لے تو بھی۔ اسیں دس منٹ وچ بریک فاسٹ کرن والے آں۔"

مجھے حیرت ہوئی صبح کے تین بجے ہیں اس وقت کیسا ناشتا؟

کہنے لگا کہ کوئی خبر سنانے والا ہے بلی برانٹ۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی فون کر کے انحد سنگھ کو اٹھایا ہے۔

انحد نے فون رکھا تو میں نیند میں بھرا لڑکھڑاتا ہوا شاور میں داخل ہو گیا۔

حیرت کی بات تھی جو دونوں بندے رات میں دیر تک مے نوشی اور دوسرے مشاغل میں رہے وہ تو پوری طرح بیدار تھے اور میں نیند میں ایسا دھت ہو رہا تھا کہ کیا کوئی مے خوار ہو گا۔

دس منٹ بعد ہم کھانے کی میز پر تھے۔ بلی برانٹ اور انحد، برانٹ کا منیجر اور میں۔

زبردست کافی اور ہلکے ناشتے پر برانٹ کے منیجر نے بتایا کہ ہمارے تینوں ایجنٹ اس وقت زوبر میاں سہلٹی کے مزدوروں کی میس میں ہیں۔ اس شیڈ میں ان کے ساتھ وہ

دو ہندو باپ بیٹے ہیں جنہوں نے زوبر کے جنگلی ریسٹ ہاؤس کی طرف جانے والے کچے پہاڑی راستے پر فرار ہوتی اسٹیشن ویگن دیکھی تھی اور یہ کہا تھا کہ ویگن میں کوئی فیملی تھی۔

مجھے فوراً وہ مضبوط اور واضح شہادت یاد آ گئی جس سے طے ہو گیا تھا کہ اغوا کرنے والے زوبر اسٹیٹ سے آگے پائن وڈ والوں کی طرف گئے ہیں۔

مجھے جنگلی ریسٹ ہاؤس میں کسی کے رکنے اور چائے بنا کر پینے کی کافی شہادتیں بھی یاد آئیں۔

بلی کے منیجر نے کہا۔ "سر! وہ دونوں بدمعاش باپ بیٹا ایک دم جھوٹے سو فیصد فراڈ ہیں۔ ہمارے ایجنٹوں نے تھوڑی دیر میں ان سے سب کچھ اگلوا لیا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں آگ جلا کے خود انہوں نے ہی چائے بنائی تھی اور جھوٹے اشارے چھوڑے تھے۔"

بلی برانٹ نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ "آپ کو مونگ لی اسٹیٹ سے آگے اور آگے بھیجنے، بھٹکانے کے لئے ان فراڈ باپ بیٹوں کو تیار کیا گیا تھا، جتنی دیر میں ہم ناشتا کر کے زوبر میاں کی اسٹیٹ میں جا کر باپ بیٹے کو شرف ملاقات بخشیں گے اتنی دیر میں میرے تینوں کارندے اپنی مشقت اور ترکیبوں سے انہیں اور بھی تیار اور نرم کر چکے ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آج کا سورج نکلنے سے پہلے اس راز پر سے پردہ اٹھ جائے گا کہ وہ لوگ جنہوں نے تمہیں غلط راستے پر ڈالنے کے لئے اتنی محنت کی اور پیسہ خرچ کیا۔ آخر خود کہاں ہیں۔"

بلی برانٹ کا اپنے کارندوں کی لیاقت پر فخر اور اعتماد غلط نہیں تھا۔ وہ واقعی بڑے ٹف اور بلاشبہ تیز کام کرنے والے ایجنٹ تھے۔

آدھے گھنٹے میں ناشتے سے فارغ ہو کے ہم بلی برانٹ کی تین ولاؤں کے پیچھے بنے ہیلی پیڈ پر آ گئے۔ امریکی سیاہ چیتے کے سوا بلی کی میزبانیں نیند اور شراب کے ٹوٹتے خمار میں ہلکے پھلکے لہرا سی رہی تھیں۔

بیروت والی بی بی رے بے کا انحد سنگھ کو اتنا باہوش اور مستعد دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ کہنے لگی کہ میں نے مسٹر سنگھ کو رات میں جس طرح پیتے دیکھا تھا تو اس کے بعد تو سمجھ رہی تھی کہ یہ دن نکلنے کے بھی پانچ سات گھنٹے بعد تک خمار میں رہیں گے مگر ابھی ساڑھے تین بجے ہیں اور بقول کسے یہ منصف کی طرح باہوش اور مستعد ہیں۔

انحد نے کہا کہ بی بی ہم ترکھان لوگ ہیں "پچی" لکڑی کو اور اوکھے ٹائم کو دیکھ

کے کھیل جاتے ہیں اور فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وقت شرابیں پی کے الٹنے پڑے رہنے کا ہے کہ نہیں ہے تو بس اسی لیے چوکسی کے ساتھ حاضر ہو گئے ہیں۔

امریکی چیتے نے مجھے رخسار پر اور بی بیروت نے اسی طرح پیشانی پر پیار کیا۔

چلتے ہوئے پرنسس کنتی نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اس طرح اپنی لمبی مخروطی انگلی سے میری ہتھیلی کھجائی اور آنکھ دبا کر ایک اہم بازاری اشارہ کیا' دھیرے سے بولی۔

”کبھی کسی اچھے موسم میں کھان! تجھ سے ملاقات ہو گی۔ میرا دل اندر سے بول رہا ہے۔“

میں نے رخصت ہوتے ہوئے اس سے پوچھا کہ بی بی کنتی جی دل ہے تمہارے پاس یا بس یہ کوئم بنوری بدن ہی بدن ہے ؟ اور یہ کہتے ہوئے بھی امجد اور بلی برانٹ کے ساتھ برانٹ اسٹیٹ کے ہیلی کاپڑ پر سوار ہو گیا۔

زوبر میاں کے علاقے میں ہم لوگ کم و بیش اس وقت پہنچے جس وقت سیکورٹی پوسٹ پر زوبر میاں کے ماموں صاحب کو تہجد کی نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ ہم مزدوروں کے میس والے شیڈ سے کچھ فاصلے پر درختوں سے صاف کیے ہوئے ایک قطعے میں اترے۔ میں نے ہیلی کاپڑ اترنے سے پہلے دیکھا شب برات میں جلتے چراغوں کی طرح ایک دائرہ چراغوں کا جنگل کے اندھیرے میں نظر آ رہا تھا۔ پاس ہی ایک تیز ٹارچ لائٹ خاص ترتیب سے جلائی اور بجھائی جا رہی تھی۔

مشتاق پائلٹ نے چراغوں کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے کاپٹر اتارا تو پنکھے سے پیدا ہونے والے زبردست جھونکوں نے سب چراغ بجھا دیے مگر جگہ سمجھ میں آ چکی تھی پھر ہیلی کاپڑ کی سرچ لائٹ نے وہ دائرہ بھی روشن کر دیا تھا۔ ہم آرام سے اتر گئے۔

ہیلی کاپڑ سے اترے تو ہم نے اندھیرے سے نکل کر آتے بلی برانٹ کے کٹ تھروٹ تینوں کارندوں کو دیکھا وہ اسی طرح سوٹ پہنے تر و تازہ اور مستعد ٹارچیں چمکاتے ہوئے اپنے باس اور باس کے مہمانوں کے استقبال میں جھک کر اور ایڑی بجا بجا کر سلام کرتے آئے تھے۔

بلی نے ان کے سلام کے جواب میں ایک مختصر سا جملہ کہا۔ ”گڈ ورک!“ مطلب خوب کام کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس شاباش کا مطلب تینوں کے لئے بھاری نقد انعام بھی تھا۔ وہ اپنے باس سے اپنی تعریف سنکر اندھیرے میں مسکرائے بھی ہوں گے مگر یہ فوما نچو مسکراہٹ ہو گی۔ اکیلی سڑک پر اس طرح مسکراتے ہوئے ایک آدمی کو بھی اپنے مقابل دیکھ کر کسی بھی سمجھدار آدمی کو پوری طرح چوکنا ہو جانا چاہئے۔ وہاں تو تین

آدمی تھے جو مسکرا رہے ہوں گے۔

برانٹ کے یہ ایجنٹ اپنے باس اور مہمانوں کو جنگل کے عارضی ہیلی پیڈ سے مزدوروں کی میس تک پہنچانے کے لئے زوبر ٹمبر اسٹیٹ کا ایک ٹرک پکڑ لائے تھے۔ انہوں نے یہ ٹرک شیڈ کے پاس میکانیکل شاپ سے چرایا تھا۔ وہ اسے چابی کے بغیر کسی طرح اسٹارٹ کر لائے تھے۔ ہم ٹرک پر سوار ہوئے اس وقت بھی وہ اسٹارٹ ہی تھا۔

کوئی پندرہ منٹ میں ہم ورکرز میس کے شیڈ کے سامنے پہنچ گئے۔ شیڈ کے سامنے ٹیوب لائٹوں کی سفید روشنی میں وولی بال کورٹ کے ایک کھمبے کی جڑ میں ٹاٹ کی بوریوں کا ڈھیر سا پڑا تھا۔ ہمارے ٹرک کی آواز سن کے یہ ڈھیر ہلا تو ہم سمجھ گئے کہ برانٹ کے کارندوں نے یہاں اپنے قیدی ”اسٹور“ کیے ہیں۔

ویت نامی' تھائی کارندوں نے ٹاٹ ہٹائے تو نیچے سے کھمبے سے بندھے منہ پر چپکنے والی پٹیاں لگا کے غوں غوں کرتے اور تھر تھراتے وہ دونوں باپ بیٹے نکلے۔ ہمیں دیکھ کے وہ اور بے تاب ہوئے اور غوں غوں کرنے لگے تو کٹ تھروٹ کارندوں نے بھاری ٹارچوں سے دونوں کی پنڈلیوں پر دو دو ضربیں لگائیں اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ تکلیف سے دونوں لہرا کے رہ گئے لیکن ایک بات ان کے سمجھ میں آ گئی کہ شور مچانے میں اور جان ضائع ہو گی۔

بلی برانٹ نے اپنے کارندوں سے معلوم کیا کہ کیا زوبر میاں سلہٹی والا کو اطلاع دے دی گئی ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے اور یہاں برانٹ صاحب امجد سنگھ صاحب شیر خان صاحب آنے والے ہیں ؟ کارندوں نے نہ صرف یہ کہ اطلاع نہیں کی تھی بلکہ اس ایریا کے سب ذمہ دار لوگوں کو ایک کمرے میں تالے میں بند کر دیا تھا۔ تمام ٹیلی فون لائنیں ڈس کنکٹ کر دی تھیں۔

برانٹ نے انہیں ایک بار گھور کر دیکھا اور کہا۔ ”یہ برا کیا۔“

میں نے دیکھا اپنے باس کے اس ریمارک پر تینوں فوما نچو ایک بار لرزے تھے۔ بعد میں بتایا گیا کہ اس ایک حماقت پر انہیں سزا .... جسمانی سزا .... دی جائے گی۔ تاہم اس بے ضابطہ حرکت سے ان کے نقد انعام پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہم میس والے شیڈ میں کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ برانٹ کے اشارے پر اس کے کارندوں نے زوبر میاں کے ان بہت سے فورمینوں' چارج مینوں' سپروائزروں اور طرح طرح کے چھوٹے بڑے گینگ لیڈروں کو کھول دیا۔ سب کو میس میں جمع کیا۔ پہلے تو وہ

بے چارے سمجھے کہ ڈاکا پڑ رہا ہے مگر جب انہوں نے دو پڑوسی اسٹیٹ کے مالکوں کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ بلی برانٹ نے اپنی کام چلاؤ برمی زبان میں انہیں بتایا کہ ادھر ڈاکا ڈالنے والے' اغوا کرنے والے ایک جتھے کو پکڑنے کے لیے یہ کارروائی کی گئی ہے۔ تمہارے اسٹیشن پر یہ دو باپ بیٹے ڈاکوؤں کے مخبر موجود تھے۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ ان کی گرفتاری کے لئے آنے والے ایجنٹوں اور ڈاکوؤں یا ان کے حامیوں کا مقابلہ ہوگا تو گولیاں چلیں گی۔ ہم نے عام مزدوروں کو اپنے شیڈوں میں سونے دیا آپ ذمہ دار لوگوں کو آپ ہی کی اپنی حفاظت کے خیال سے محفوظ جگہ پر اکٹھا کر دیا۔ اب ہم آپ کو خوشی سے یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ڈاکوؤں کے گرگے گولی چلائے بغیر آگئے ہیں۔ اب ہم اپنے دوست اور آپ کے ٹمبر اسٹیٹ کے مالک زوبر کو فون کر کے بلاتے ہیں۔ آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا اس کا شکریہ۔

برانٹ کے گردن تراش ماہروں نے ٹیلی فون لائنیں پھر جوڑ دیں تو پہلے امجد سنگھ نے زوبر میاں سے بات کی۔ پوری بات اسی طرح بتائی جیسی بلی برانٹ نے زوبر اسٹیٹ کے فورمین گروپ کو بتائی تھی۔ زوبر میاں اور دوسرے ہمسائے برانٹ سے کوئی زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتے تھے مگر کیونکہ اس وقت وہ زوبر میاں کی جائداد پر اپنے ہیلی کاپٹر اور فومانچوؤں کے ساتھ موجود تھا اس لئے خود اس نے بھی معذرت' مداخلت اور اسی طرح کی باتیں کیں اور زوبر میاں نے بھی حسب توقع اس اچانک عزت افزائی کو بہت مبارک گردانا اور برانٹ صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے زوبر ٹمبر اسٹیٹ کو اپنا گھر سمجھا اور چلے آئے۔ اس ہمسائیگی اور اپنائیت سے زوبر میاں بہت متاثر ہوا ہے اور وہ خوش آمدید کہنے خود آرہا ہے۔

زوبر میاں کے آنے سے پہلے برانٹ کے کٹ تھروٹ کارکن ہم تینوں "باس لوگوں" کو اور آغاز کرنے والوں کے دونوں مخبروں کو ایک بند کمرے میں لے گئے۔ وہاں برانٹ کے ان فومانچوؤں نے دونوں باپ بیٹوں کو پہلے تو احتیاطاً چار چوٹ کی مار لگائی پھر ان کو ہدایت کی کہ اب جو ہم پوچھتے جائیں کچھ چھپائے اور جھوٹ بکے بغیر وہ بتاتے جاؤ ورنہ زوبر میاں کے آتے آتے ہم تمہاری وہ حالت کر دیں گے کہ تم کھال کے بنے تھیلوں کی طرح سو جاؤ گے۔ جن میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں اور کچلا ہوا گوشت بھرا ہوگا۔

میں نے سوالات پوچھنا شروع کیے اور باپ یا بیٹا یا دونوں جواب دینے لگے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم اسے پہچانتے ہو جس نے تم سے ہمیں بھٹکانے کو کہا

تھا۔"

وہ بولے۔ "نہیں۔ وہ ادھر پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔"

"تم کو تو وہ پہچانتا ہوگا ورنہ کیوں آتا؟"

"ہاں اس نے آتے ہی میرا اور بابا کا نام لیا تھا۔" یہ بیٹے نے بتایا۔ "برابر پہچانتا ہوگا۔"

"شروع سے بتاؤ۔ وہ کس طرح آیا اس نے کیا کہا۔"

بیٹے نے بتایا کہ فلاں دن (یہ وہ تاریخ تھی جب میں اور امجد سنگھ' اس کی ٹمبر اسٹیٹ سے جیپوں میں روانہ ہوئے تھے اور امجد نے پڑوسی مونگ لی صاحب کو فون کیا تھا کہ ہم آرہے ہیں۔) تو بیٹا کہنے لگا کہ فلاں روز رات میں جب وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا اور بابا اونگھ چکا تھا تو کسی نے اس کا نام لے کر پکارا شیڈ سے باہر بلایا کہا کہ کوئی ضروری کام ہے۔ باہر آکے اس نے دیکھا کہ کوئی نیا ہی آدمی تھا۔ نئے آدمی نے جو اچھا خاصا کھایا پیا دکھائی دیتا تھا۔ اپنا نام جگدیش بتایا۔ اس جگدیش نے ان لوگوں سے کہا کہ ایک چھوٹا سا کام ہے جس کے ہزاروں روپے مل سکتے ہیں۔ اگر اپنے بابا کو بھی شامل کرے گا تو رقم ڈیوڑھی ہو جائے گی۔ وہ ڈر گیا مگر پیسے کس کو برے لگتے ہیں پھر یہ بھی تھا کہ وہ کسی جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا تو خوف محسوس کر رہا تھا۔ جگدیش نے کہا۔ خطرہ کوئی نہیں تو ڈرتا کس بات سے ہے؟ بڈھے نے ہمت کی' پوچھا کہ پہلے کام بتاؤ پھر آگے بات ہوگی۔ کام انہوں نے یہ بتایا کہ اگر کوئی ادھر آئے اور یہ پوچھے کہ کیا ایسی ایسی گاڑی ادھر سے گزری ہے تو کہہ دینا کہ ہاں یاد تو پڑتا ہے اور کہنا عورت بچہ بھی کوئی گاڑی میں تھا اور وہ اس رستے پر گئے تھے۔ بڈھے نے کہا یہ کوئی ایسی بات نہیں لاؤ رقم ہم کہہ دیں گے۔ اس پر وہ جگدیش کہنے لگا کہ یہ آدھا ادھورا کام ہے پورا کام یہ ہے کہ جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں تمہیں جا کے رکنا اور چائے بنانا ہوگا اور اس طرح نشان چھوڑنا ہوگا مگر یہ کام ہشیاری سے کرنا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ تو ہوگیا۔ تم نے پیسے بھی لے لیے کام بھی کر دیا۔ یہ بتاؤ کام کے بعد اس جگدیش نے پھر تمہیں اپنی صورت دکھائی؟"

بڈھا بولا۔ "نہیں جی۔ پھر صورت نہیں دکھائی۔"

مگر جس طرح بڈھے نے یہ بات کہی تھی اس سے مجھے شک سا ہوگیا' میں نے پوچھا۔ "اچھا صورت نہیں دکھائی تو کیا آواز سنائی؟ کوئی ٹیلی فون کیا؟ ہاں؟ بول۔"

بڈھے نے انکار میں سر ہلایا لڑکے نے ہاں میں۔

بلی برانٹ کے گرگوں نے دونوں کی پنڈلیوں پر مارنے کو ٹارچ اٹھائی تو دونوں ہی گڑگڑانے لگے۔ لڑکے نے کہا۔ "میرے بابا کو خبر نہیں۔ انہوں نے فون کر کے دھمکی دی تھی۔ بات میں نے کی تھی۔ بابا کو اس لئے نہیں بتایا کہ یہ پریشان ہوتا۔"

مگر بڈھے کو ٹیلی فون کا معلوم تھا۔ اس کے انداز ہی سے پتا چل رہا ہے۔

بڈھے نے روتے بسورتے ہوئے بتایا کہ اصل میں اسے شک تھا کہ جگدیش نے دھمکانے کو فون کیا ہے۔ پکی خبر نہیں تھی۔ ڈر کے مارے اس نے بیٹے سے پوچھا بھی نہیں تھا۔

میں نے سوال کیا۔ "دھمکی کس طرح دی تھی؟"

"جگدیش نے نہیں دی تھی دھمکی۔ ایک لڑکی نے بات کی تھی۔"

لڑکی؟ یہ نئی بات پیدا ہوئی تھی اس پورے قصے میں۔

میں نے پوچھا۔ "کیسی لڑکی؟"

لڑکی نے فون پہ کہا میں جگدیش کا میسج دے رہی ہوں۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔" میں نے اسے روکا۔ "کیا اس نے یہی کہا تھا میسج۔ برمی میں بات یا پیغام کا لفظ نہیں کہا تھا۔ انگریزی لفظ کہا تھا؟"

"ہاں جی یہی کہا تھا .... انگریزی لفظ۔"

"خوب۔ آگے بتاؤ۔ آگے کیا کہا؟"

"بس جی آگے اس نے کہا جگدیش کہتا ہے کوئی لوگ تم سے کچھ پوچھنے آرہے ہیں۔ وہ دشمن ہیں۔ اگر تم نے ذرا سا بھی کچھ بتایا تو جگدیش تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دونوں کو۔"

"بس۔"

"ہاں بس' پھر اس نے فون بند کر دیا۔"

"تم ڈر گئے۔ لڑکی کی بات سے ڈر گئے؟"

"کیا کرتا اور لگتا تھا وہ لڑکی نہیں ہے' جگدیش خود آواز بنا کے بول رہا ہے۔ مجھے اس بات سے ڈر لگا تھا کہ وہ موٹا۔ جگدیش ادھر ہی کہیں قریب میں ہے اور آواز بنا کے دھمکا رہا ہے۔"

"آواز بنا رہا تھا اس کا شک کیسے ہوا؟"

"جیسے .... جیسے وہ آدھے مرد آدھے عورت آواز لہرا کے ہا آآں کرتے ہیں وہ ان کی نقل کرتا تھا۔ کہتا تھا جگدیش زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہا آآں۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہا آآں پھر کہو۔"

اس نے پھر کھسروں کی طرح ہا آآں کہا۔

بہ یک وقت میں نے امجد کی طرف' امجد نے مجھے دیکھا۔ امجد نے کہا۔

"انکل مونگ لی کا مالشیا .... کھسرا مونگ جو۔"

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

بلی برانٹ نے کہا۔ "میں نے مونگ لی کے نوکر اس آدھے مرد آدھے عورت کو دیکھا نہیں ہے۔ ایک بار وائرلیس پر اس کا میسج ریسیو کیا ہے۔ وہ ہاں کو اسی طرح لہرا کے کہتا ہے۔"

"وائرلیس؟"

"ہاں کبھی کبھی سسٹم چیک کرنے کے لئے مونگ لی اسٹیٹ کو کھڑکھڑا دیتا ہوں۔ اس پورے علاقے میں یا تو ایک مونگ لی ہے یا ٹمبر اسٹیٹ والوں کی پرائیویٹ سیکورٹی فرم ہے۔ جس کے پاس وائرلیس کا سسٹم ہے۔"

ذہن میں جیسے بلب روشن ہو گیا۔ امجد کا دوست سیکورٹی فرم کا چیف سیکورٹی افسر جس نے تمام سیکورٹی چوکیوں سے وائرلیس پہ رابطہ کیا تھا اور بھاگنے والی اسٹیشن ویگن کا پتا اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی تفتیش کا رخ کس طرف تھا۔ یہ کسی نے وائرلیس پر اس کے پیغامات کو سن کے جان لیا۔

جبھی پیش بندیاں کر لی تھیں۔ ایک بات' بلی برانٹ نے اپنے کارندوں کو وائرلیس پر ہدایات دی تھیں کہ زوبر میاں کے ملازم باپ بیٹے سے پوچھ گچھ کرو یہ بھی کسی نے اپنے وائرلیس ریسیور پر سن کر جان لیا تھا اور پھر باپ بیٹے کو فون کر کے دھمکی دی تھی کہ کوئی لوگ تم سے کچھ پوچھنے آرہے ہیں وہ دشمن ہیں اگر تم نے کچھ بتایا تو سمجھ لینا .... ہاں آآآں۔ یہ دوسری بات۔

تو یہ جاننے والا کون تھا؟

دونوں باتوں سے ایک ہی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ مونگ جو۔ وہ جس نے جگدیش موٹے کو بھیجا تھا۔ یہ موٹا اس کا کک' دوست ہوگا جس کی بیٹی جنگل میں بانس کی کونپلیں اکٹھی کرنے جاتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے مونگ جو کھسرے کا فرسٹ کزن جاتا

ہے۔ وہی جو رنگون میں فزیو تھراپی سیکھنے والا ہے۔

میں نے انحد سے کہا۔ دوست جو کچھ ہے تیرے ہمسائے مونگ لی کی جائداد پر ہے اور مونگ جو کھسرے کے ارد گرد ہے۔

بلی رانٹ نے اپنی خطرناک تھائی' ویت نامی' چینی برمی گلے تراشوں سے کہا کہ وہ دونوں کو جانے دو اور تیزی کے ساتھ تینوں جاکر ہیلی کاپڑ میں بیٹھو۔ زوبر میاں کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ پانچ سات منٹ بعد زوبر میاں آگیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے کتے اور میز وڈاک کیپر کو لایا تھا۔

بلی برانٹ اور زوبر میاں ایسے بغل گیر ہوئے جیسے ان میں بڑی دوستیاں محبتیں ہیں۔ اندر سے دونوں ہی شرمندہ تھے۔ بلی تو اس بات سے شرمندہ ہوگا کہ اس کے "لائق" گردن تراش گرگوں نے ایک پڑوسی کی جائداد میں گھس کے بہت بے ضابطگی کی ہے۔ لوگوں کو بند کیا ہے' ٹیلی فون کاٹے ہیں' ٹرک چوری کیا ہے' عملاً کئی گھنٹے تک ڈاکوؤں کی طرح ٹمبر اسٹیٹ کے اس حصے پر قبضہ جمائے رکھا ہے۔ زوبر میاں کو یہ شرمندگی تھی کہ آس پاس کی ٹمبر جائدادوں میں سب کو خبر ہو جائے گی کہ بلی برانٹ نے ایک رات ہیلی کاپڑ میں سوار ہو کر زوبر میاں سلہٹی کی میزبانی کا شرف حاصل کیا تھا۔ خدا معلوم لوگ اس وزٹ کو کیا سمجھیں گے۔

ان حد سنگھ اور میں بھی زوبر میاں سے بغلگیر ہوئے۔ ان حد نے فوری طور پر زوبر میاں سے اس بات کی معافی مانگی کہ اسی نے بلی صاحب کو مجبور کیا تھا کہ وہ زوبر اسٹیٹ میں اپنے کارندے بھیجے۔ بلی صاحب تو کہہ رہا تھا کہ پہلے زوبر میاں سے اجازت لے لو مگر ان حد کہنے لگا میں نے "عرج کی کہ جوبر میاں میرا بھائی ہے ہور کدے ایمرجنسی وچ اپنے بھائی کے گھر وچ اسی اجاجت بگیر وی وڑ سکدے آں۔" پھر وہ بولا کہ اب میں ایمرجنسی میں بغیر اجازت آپ کے گھر میں گھسنے کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ کام میں نے اپنی "جمے واری" پہ کرایا ہے۔

زوبر میاں نے ہنس ہنس کے پیٹھ تھپکتے ہوئے انحد کو مجھے اور بلی صاحب کو خوش آمدید کہا اور خوشی کے ساتھ ایک دائمی اجازت نامہ ہم تینوں کو یہ دیا کہ ہم بے کھٹکے جب چاہیں زوبر اسٹیٹ میں دن ہو یا رات آسکتے ہیں۔ "حضرات! یہ آپ تینوں کا گھر ہے۔ اس کے دروازے آپ تینوں پر کھلے ہیں۔"

زوبر میاں روایتی بنگالی شرفا کی طرح کشادہ دلی دکھا رہا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ

اگر وہ بلی کے ان تین ویت نامی تھائی کو ان چینی یا پتا نہیں کون کارندوں کی صورتیں دیکھ لیتا تو ان پر فوراً کتے چھڑوا دیتا۔ ایسے خوفناک تھے وہ تینوں فومانچو۔

بلی □ ب□ انٹ نے زوبر میاں سلہٹی کو ان ہندو باپ بیٹے کے بارے میں بتایا۔ نرمی سے مشورہ دیا کہ انہیں نوکری پر رہنے دو' مگر انہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھو گے تو اچھا ہوگا۔ یہ کچھ لالچی زیادہ ہیں۔

زوبر میاں نے ہماری تواضع کرنا چاہی مگر میں نے اور ان حد نے کہا کہ ہم دونوں کو آگے مونگ لی اسٹیٹ میں بہت کام ہے پھر بلی صاحب بھی اپنے بعض کام ادھورے چھوڑ کر چل پڑا تھا تو ہم اب تینوں ہی آپ سے اجازت چاہیں گے۔

زوبر میاں نے بلی صاحب کو تو جانے دیا۔ ہمیں اجازت نہ دی۔ ہم سب بلی برانٹ کو عارضی ہیلی پیڈ تک چھوڑنے گئے۔

میں نے ان حد نے بغل گیر ہو کر خاص طور پر بلی برانٹ کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے میرے معاملے میں پوری طرح مبتلا ہو کر مدد دی ہے۔ بلی نے کہا۔ "اینی ٹائم! کبھی بھی ہم اسے بلا سکتے ہیں اور اس کے پاس بے تکلفانہ آسکتے ہیں۔"

بلی برانٹ کے جانے کے بعد وہیں ورکروں کے میس میں ہم نے فوری طور پر ایک جنگلی ہلکا ناشتا کیا اور زوبر میاں کو بتایا کہ مونگ لی اسٹیٹ ہی ہمارا ٹارگٹ ہے اور مونگ جو کھسرا ہمارا وہ نامعلوم دشمن ہے جو اغوا کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے یا خود اس نے اغوا کیا ہے۔

زوبر میاں نے کہا۔ "اب جبکہ سب انگلیاں اس ہیجڑے مونگ جو کی طرف اٹھ رہی ہیں تو میں بھی ایک واقعے کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو کوئی پندرہ روز پہلے میرے نوٹس میں آیا تھا۔" زوبر میاں میری طرف مڑا۔ "یہ بتاؤ کیا تم کسی جنکش یا منکش نام سے واقف ہو۔ کوئی ایسٹ پاکستانی شخص ہے صمد جنکش یا منکش۔"

میں منہ پھاڑے زوبر میاں کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ آخر بہ مشکل اتنا کہہ پایا۔ "صمد بنگش صاحب میرے والد ہیں۔ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟"

O

زوبر میاں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں پاکستان والے کسی صمد بنگش کو جانتا ہوں؟ اور میں نے بے تابانہ بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے تھے ”کہاں ہیں وہ؟ کیسے ہیں؟ وہ میرے بابا ہیں۔ خدا کے لیے بتاؤ کیسے ہیں؟“

زوبر میاں اور میرا دوست ان حد سنگھ میری صورت دیکھنے لگے تھے۔

”والد ہیں تمہارے؟“ زوبر میاں نے پوچھا۔

میں نے کہا ”ہاں۔“

”حد ہی ہو گئی وئی!“ ان حد سنگھ بولا۔

”کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟“

زوبر میاں نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔ ”ٹھیک ہوں گے۔ سب خیریت ہو گی۔ حوصلہ رکھو۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ کہاں ہوں گے...... میں نے پندرہ روز پہلے ان کا نام سنا تھا...... صحیح نام تو اب تم سے سنا ہے...... دو ہفتے پہلے میرے معالج ڈاکٹر عدنان الفضل نے جو ادھر چیف میڈیکل افسر بھی لگا ہوا ہے‘ مجھ سے مونگ جو کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا اس کی رشتے داریاں ایسٹ پاکستان میں ہیں......؟“

میں نے زوبر کو بات نہ پوری کرنے دی۔ ”مختصر بتاؤ...... میرے بابا کہاں ہیں؟“

زوبر کہنے لگے۔ ”ہمارے پڑوسی مونگ لی صاحب کی ٹمبر اسٹیٹ سے کسی نے فون کیا تھا کہ مونگ جو کھسرے کا کوئی رشتے دار جو ایسٹ پاکستان سے آیا ہے‘ ٹریکٹر ٹرالی کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے۔ مونگ لی اسٹیٹ میں اس وقت کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس لیے ہم مریض کو بھیج رہے ہیں۔ آپ اپنے ڈاکٹر کو کہہ دو کہ اسے اٹینڈ کر لیں۔“

میں نے پوچھا ”بابا زخمی ہو گئے تھے۔ کیسے؟“ تو کیا وہ مرہم پٹی کے لیے بابا کو ادھر لائے تھے؟“

”نہیں۔ میں نے ڈاکٹر عدنان کو خبر کر دی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی‘ مریض نہیں آیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے مونگ لی اسٹیٹ فون کیا۔ لی صاحب مل گئے۔ کہنے لگے‘ میں معلوم کرتا ہوں کیوں نہیں لے گئے مریض کو۔ تھوڑی دیر بعد ان کا فون آیا‘ کہنے لگے۔ ”میرا آدمی مونگ جو...... وہی کھسرا...... آگیا تھا‘ اس نے مریض کو فرسٹ ایڈ دے دی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے‘ اب ضرورت نہیں اس کا رشتہ دار ٹھیک ہے۔“

میرا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بابا کو اپنا رشتے دار بتا رہا ہے۔ بابا زخمی ہو گئے تھے ...... پندرہ دن پہلے۔ کیا بات تھی؟

زوبر میاں کو اس پورے قصے میں ایسٹ پاکستان کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت یاد کیا مگر اس واقعے کی اور کوئی تفصیل انہیں یاد نہ آئی۔

جو بھی ہو‘ میں نے سوچا۔ بابا مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے ہوں گے۔ اب میں انہیں تلاش کروں گا۔ وہاں مزید رکنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ان حد سے کہا ”میرے بابا صمد بنگش صاحب برما میں ہوں گے۔ اس کا تو مجھے یقین تھا لیکن یہاں مونگ لی اسٹیٹ میں ان کا ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ بات پندرہ روز پرانی ہے مگر پکی ہے...... میں فوراً مونگ لی اسٹیٹ جانا چاہتا ہوں۔“

ان حد بولا۔ ”صرف ”میں“ نہیں دوست......! اسی دو وی ای چلاں گے۔“

زوبر میاں نے کہا ”آپ دونوں ہی کیوں ہم بھی چلیں گے۔“

زوبر میاں نے جس طرح ہماری مدد کی تھی اور جتنے شوق سے وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتے تھے‘ اس کو دیکھتے ہوئے انہیں روکنا کچھ اچھا نہ لگا مگر ہم اچانک اور کم آدمیوں کے ساتھ لی صاحب کی جائیداد میں داخل ہونا چاہتے تھے اور زوبر میاں کا مزاج دیکھتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے کھوج لگانے والے کتوں اور نیر وٹریز کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔ ایک ڈرائیور‘ ایک گن مین تو ساتھ رہتا ہی تھا۔ اتنے آدمیوں کا جلوس لے کر وہاں جانے میں بہت سے کام بگڑ جاتے۔ میں نے ان حد سنگھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ لی اسٹیٹ میں ابھی بس ہم دونوں ہی داخل ہوں گے۔ ان حد کا ڈرائیور اردلی جو شروع سے ہی جیپ لے کر ہمارے ساتھ چلا تھا‘ میں نے اسے بھی روک دیا۔ ان حد نے اسے زوبر میاں کی ولا میں رک کے ہمارے بلاوے یا دوسری کسی ہدایت کا انتظار کرنے کو کہا اور خاموشی اور رازداری سے ان حد اور میں زوبر اسٹیٹ سے نکل گئے۔

بابا کے بارے میں یہ پریشان کرنے والی خبر سن کر میرا دل ڈوبنے سا لگا کہ وہ زخمی ہو گئے تھے۔ کیا وہ مونگ جو بدمعاش کے کسی فریب میں آگئے ہیں' جبھی مونگ لی جائیداد میں دیکھے گئے ہیں۔ میں نے سوچا' یہ بات اب بالکل طے ہو چکی ہے کہ مونگ جو ہی ہمارا وہ نامعلوم دشمن ہے جس نے ہمیں بھٹکایا ہے اور میرے بابا کے بارے میں وہی بتا سکتا ہے اور ظاہر ہے رشنا اور روکسانہ کے بارے میں بھی وہی بتائے گا۔

ان حد نے کہا "یار کھان صاحب! اتنا مطلبی بندہ ہے یہ کھسرا کہ مجھے سمجھ نہیں آرہی' جبھی میں اس کو گردن سے پکڑوں گا تو اسے مار پیٹ کرنے سے خود کو کس طرح روکوں گا۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ نہیں نہیں' اسے ضائع نہیں کرنا ہے۔ سچی سچی باتیں معلوم کرنا ہیں اور جلدی۔

ہم دونوں زوبر اسٹیٹ سے آندھی طوفان کی طرح چلنا چاہتے تھے لیکن یہ آسام کا وہ علاقہ تھا جسے آسانی سے آسامی کو وہ مری کہا جا سکتا تھا۔ فرق اتنا سمجھ لیجیے کہ مری کی پہاڑیاں ایک موسم میں برف پوش ہو جاتی ہیں۔ یہ جنوبی خطہ تھا۔ سردی بے شک ہوتی ہوگی مگر برف باری کا کوئی موسم کبھی نہیں آتا۔ ڈھلان پر ان حد سنگھ بہت مہارت اور ہوش مندی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ان حد کی اسٹیٹ سے نکلتے ہوئے ہم اغوا کی جانے والی لڑکیوں کی تلاش میں چلے تھے۔ ایمرجنسی بے شک تھی مگر ایسی شدت اور تشویش نہیں تھی جیسی اب تھی۔

ان حد نے مجھے گاڑی نہیں چلانے دی' کہنے لگا کہ تم سکون سے رہنے کی کوشش کرو اور سوچ سمجھ کے منصوبہ بناتے رہو کہ کس طرح مونگ جو کھسرے پر اچانک وارد ہو کر پوچھ گچھ کی جائے۔ وہ بزدل اور عیار ہے۔ اگر ہم نے صحیح دباؤ نہیں ڈالا تو بابا کے بارے میں اس سے صحیح معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ یہ راستہ کتنی بے تابی اور پریشانی میں طے کیا۔ کاکسیز بازار سے نکلنا اور ایسٹ پاکستان میں بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آرہا تھا۔ کاکسیز بازار کے بعد سے جو پریشانیاں جھیلی تھیں' اس وقت وہ تو ذہن سے جیسے محو ہو گئی تھیں' بس ایک ہی لو لگی تھی۔

بے تابانہ میں ہر سنگ میل کی طرف دیکھتا تھا کہ مونگ لی اسٹیٹ کا اب اور کتنا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس لمبے راستے میں ان حد نے مجھ سے بس اتنی بات کی کہ زوبر میاں کی

ولا سے ہنگامی طور پر ساتھ لی گئی پکنک باسکٹ سے ایک سیب نکال کے اس نے میری طرف لڑھکا دیا اور دھیرے سے کہا "لے دوستا! سیب کھا۔"

وہ خود بھی راستے بھر سوچتا ہوا آیا تھا۔

دن نکلنے والا تھا۔ سردی میں بہت خفیف سی کمی ہوئی تھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ لی صاحب کی اسٹیٹ پہنچتے پہنچتے روشنی ہو جائے گی اور سردی میں خاصی کمی ہو جائے گی۔ وہ وقت ہوگا۔ جب مونگ لی اسٹیٹ کے کارندے ٹریکٹر ٹرالیوں میں نکلنے اور اپنے علاقوں میں دن کا کام سنبھالنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ اگر اس میں پندرہ منٹ کی بھی دیر ہوگئی تو کھسرا ہمیں ولا میں نہیں ملے گا۔ اسے ٹمبر اسٹیٹ میں تلاش کرنا خوار ہونا تھا۔ ان حد سنگھ مجھ سے پہلے یہ بات جانتا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ سڑک قدرے ہموار اور سیدھی ہوتی جا رہی تھی' اس لیے ہماری تیز رفتاری ہمارے لیے خطرہ نہیں بن سکتی تھی۔

لی اسٹیٹ آرہی تھی۔ ہم نے سڑک کے کنارے ٹرالیوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ ابھی تک مزدوروں' کاریگروں نے ٹرالیوں میں بیٹھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہم ٹھیک وقت پر لی صاحب کی ولا میں داخل ہو رہے تھے۔

قد آور درختوں کے پیچھے سے ولا کی خوبصورتی اور چمن بندی کسی اور وقت میں مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی مگر اس وقت تو جیسے ولا کا پائیں باغ اور تعمیرات شفاف شیشے کی تھیں کہ ان کے پار میری نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ میں نے لان کے آخری سرے پر ہلکی روشنی میں کچھ دیکھا بھی۔ ولا کا مالی جھارا لگا پائپ اٹھائے لان کو سویرے ہی سویرے تر کر رہا تھا۔

ان حد سنگھ نے بھی مالی کو دیکھا ہوگا۔ اس کی تیز نگاہوں نے کچھ اور بھی دیکھ لیا۔

مالی نے انوکھے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سڑک پر ہماری موجودگی محسوس کی تھی اور جب ہم ولا کی طرف مڑنے کی غرض سے ایک پھولوں بھرے لمبے چوڑے ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے تھے تو مالی کے رویئے' اس کے چلنے میں ایک نمایاں تبدیلی ہوگئی تھی جو فوری طور پر نہیں مگر بعد میں سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ اس طرح لان پر جھارا لگے پائپ سے چھڑکاؤ کر رہا تھا مگر ہماری طرف اس نے پیٹھ کر لی تھی اور اس کے انوکھے لباس میں کہیں کوئی ایسی گڑبڑ ہوگئی تھی جسے ان حد نے

نوٹ کر لیا تھا۔

اس نے اپنی گرجتی گونجتی پنجابی میں "گال نکالی" گاڑی آہستہ کر کے نیوٹرل گیئر میں ڈال کر مجھ سے یہ کہتا ہوا کہ "شیر کھان گاڑی سنبھالنا۔" خود چھلانگ مار کر رول کرتی ہوئی گاڑی سے اتر گیا۔ میں نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کے گاڑی کو قابو میں کیا۔ اس وقت تک ان حد غائب ہو چکا تھا۔

میں اپنے ہدف یعنی جھارے پائپ والے مالی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

میرے حساب سے مالی ہماری جیپ کی آمد سے بے خبر لان کو تر کیے جا رہا تھا۔ برابر کی روش پر جیپ جب اس کے بالکل قریب ہو گئی تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ کون ہے۔ وہ مالی نہیں کک کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہی جس کے ساتھ راز و نیاز کرنے موونگ جو کھسرے کا کزن پیچھے پیچھے جنگل میں جاتا تھا۔

کک کی بیٹی مجھے جیپ روکتے دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس نے پائپ میں لگا لیور کھینچ کر پانی بند کیا تھا اور اسے گھاس پر پھینک دیا تھا۔

لڑکی مسکراتی ہوئی میری طرف آئی، بولی "گڈ مارننگ سر!"

وہ آئی اور جیپ سے ٹک کے کھڑی ہو گئی۔

"گڈ مارننگ!" میں نے جواب میں کہا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ لان کو پانی دینا آخر کب سے اس کے فرائض میں شامل ہو گیا ہے۔ ان حد سنگھ کے اس طرح ایک دم دوڑ پڑنے کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ شاید کوئی اور بھی وہاں ہو گا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "تم یہاں ولا میں مالی کی اسسٹنٹ ہو؟"

وہ ہنسی تو میں نے دیکھا، اس کی عمر اتنی کم نہیں تھی جتنی نظر آتی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے خود کو جیپ سے بھڑا دیا۔ وہ اتنے قریب آ گئی کہ کلون کی تیز خوشبو میرے لیے پریشانی کا سبب بنتی جا رہی تھی۔

"قصہ یہ ہے ...... آج میں نے مالی سے ڈیوٹی بدل لی ہے۔ وہ میرے بدلے جنگل سے بانس کی کونپلیں توڑنے گیا تو بس۔ میں نے اس کی جگہ لان کو پانی دینا شروع کر دیا۔ تمہیں مالم ......؟ میں کک کی بیٹی ہوں۔"

مجھے تجسس تھا، میں نے کہا "ہاں مجھے معلوم ہے، تم کون ہو...... یہ بتاؤ کیا ابھی تمہارے ساتھ یہاں لان پہ کوئی کھڑا تھا؟"

وہ ہنس کر بولی "ابھی تو نہیں۔ دس منٹ پہلے یہاں مالی تھا میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "دس منٹ پہلے کی باتیں نہیں کر رہا، ابھی دس سیکنڈ پہلے یہاں کوئی تھا۔ وہ تمہاری طرح نہیں تھا۔ کوئی اور چکر تھا۔ لان کو کوئی پانی دے رہا تھا مگر وہ تم نہیں تھیں۔"

ہنستے ہوئے کہنے لگی "وہ میری اسپرٹ (روح) تھی جو دس منٹ پہلے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے تمہارا کہتے ہوئے آنکھ سے بہت مستی قسم کا اشارہ کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے میرا رخسار چھو لیا تھا۔

"میرا......؟ میرا انتظار کیوں؟ تمہیں کیسے معلوم، میں اس طرف آ رہا ہوں؟"

اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر ہی رہنے دیا۔ "دل کہہ رہا تھا میرا۔ یہ ہارٹ۔"

اگر اب وہ باقاعدہ جھک کر اپنا اوپری بدن...... شاید ہارٹ میرے چہرے سے مس کر رہی تھی۔ اس کے کلون کی مہک جانی پہچانی تھی۔ یہ خوشبو کزن کے نکے نے اسے تحفے میں دی ہو گی۔ میں نے سوچا۔

میرے ذہن میں ابھی تک وہ سوال اسی طرح اہم تھا اور اسی طرح اپنا جواب چاہتا تھا مگر اس کا اتنا قرب میرے لیے پریشانی کا باعث بھی بنتا جا رہا تھا۔ میں نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کیا اس وقت ابھی ابھی وہ نکے تمہارے ساتھ تھا؟"

"نکے؟ وہ سالا کڈی۔ تمہیں پتا ہے کڈی کیسا ہوتا ہے؟ نرم نرم، بچے جیسا اور بے کار......" بے کار کا لفظ کہتے ہوئے اس نے ایک آنکھ سے بازاری سا اشارہ کیا تھا۔

"بے کار کس طرح؟" میں نے اس لفظ کی سنسنی میں خوامخواہ ایک سوال جڑ دیا۔

وہ اور جھک آئی۔ تقریباً میرے کان میں منہ دے کے کہنے لگی "جس طرح اس سالے کا فرینڈ وہ موونگ جو بے کار ہے۔ لیڈی بوائے سالا۔"

وہ بہت بے باک اور تیز و طرار لڑکی تھی، میں نے پوچھا "یہ بتاؤ...... تم اتنی سب باتیں کیسے جانتی ہو؟ میں تو سمجھ رہا تھا، تم بہت ینگ ہو اور شہر سے دور ہو تو......"

اس نے اب دبا ہوا قہقہہ لگایا اور اپنا سر میرے سر سے ٹکرا دیا۔ اسی طرح دھیرے سے بولی "شہر میں جو ہوتا ہے، کیا یہاں نہیں ہوتا؟ بلکی...... بلکی میں کہتی ہوں۔ ادھر ٹمبر اسٹیٹ میں سیزن زیادہ گرم ہے۔ تمہیں پتا ہے......؟ تمہیں نہیں پتا۔ ہاہاہا۔"

وہ کسی طرح کے مسالے والی چوئنگم یا ٹافی چباتی رہی تھی جس کی تیز گرم بھاپ سی میرے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے ہنستے ہوئے پھر سر کی ٹکر ماری۔ اب کے نہیں سر

نہیں اس کا چہرہ...... ہونٹ میرے چہرے سے ٹکرائے تھے۔

میں ہنس پڑا۔ وہ بولی "اگر تم ذرا سی جگہ دو گے تو میں اسٹیئرنگ سنبھال لوں گی' تمہاری جیپ یہاں ہوا میں سے ہٹا کے اس کوزی کنج میں لے جاؤں گی۔ یہاں تیز ہوا ہے اور ہوا نقصان پہنچا سکتی ہے۔" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کچھ مجھے کھسکاتے اور کچھ میری گود میں سوار ہوتے اسٹیئرنگ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

میں نے بریک' کلچ' ایکسی لیریٹر...... سب ہی کنٹرول اس کے بے چین پیروں کے حوالے کر دیئے تھے اور تھوڑا سا برابر کی سیٹ پر کھسک آیا تھا مگر اس نے اپنا بایاں بازو پھیلا کر میرے شانے اپنی گرفت میں لے لیے اور مجھے خود سے بھڑا لیا۔ "بھاگو مت۔ میں تمہاری گاڑی پر پورا قبضہ نہیں کر رہی' ہم آدھی آدھی ڈرائیونگ کریں گے...... ریڈی؟" اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی' پھر آدھی میری مدد سے آدھی خود چلاتی ہوئی وہ قہقہے مارتی مجھے پش کرتی' کرش کرتی گاڑی کو بوگین ویلیا کے ایک کنج میں لے گئی اور یہاں مجھے معلوم ہوا کہ کک کی یہ نوعمر لڑکی کس قیامت کی بے باک...... نہ' نہ جارحیت پسند ہے۔ وہ کئی طرح کی خوشبوؤں میں بس ہوئی پانچوں حواسوں کی مدد سے میرے وجود میں رچنا بسنا چاہ رہی تھی۔ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ ہماری جیپ گاڑی کو دور سے جھاڑی میں دیکھ لینا مشکل ہو گا۔ ہمارے حساب سے ہم تنہا تھے اور تقریباً کسی کمرے کی چہار دیواری میں تھے۔

میں آدمی کا بچہ تھا' نوجوان تھا' کک کی بیٹی اپنی کم عمری میں بھی خوب سمجھتی تھی کہ کس طرح اناڑی نوجوان کو لبھایا جاتا ہے۔ میں اس ولا میں کسی اہم' بہت اہم مقصد سے داخل ہوا تھا اور اب پھولوں کے کنج میں گاڑی کھڑی کیے سب کچھ بھول کر ایک کھلنڈرے غیر ذمہ دار لڑکے کی طرح کھیل میں لگ گیا تھا۔

یہاں جیپ کھڑی کیے دو تین ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھ سے بھڑ کر بیٹھی ہوئی سر سے سر ٹکائے راز و نیاز کرتی وہ بری لڑکی ایک جھٹکے سے مجھ سے دور ہو گئی۔ وہ غصے کی آواز نکال کر پیچھے مڑ کر کچھ دیکھنا چاہ رہی تھی اور مڑ نہیں سکتی تھی۔ اگلے ہی لمحے وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔

ان حد سنگھ کا ریچھوں جیسا بدن ہم دونوں پر جھک آیا تھا اور اس کے ریچھ پنجے میں لڑکی کے گھنے سیاہ بال تھے۔

"میرے بال تو چھوڑ' حرامی!" لڑکی نے بلبلا کے کہا۔

"اپنے یار کو دوڑا دیا گشتی نے...... اب میرے یار کو الجھائے بیٹھی ہے۔" ان حد نے غصے میں ایک زوردار جھٹکا دیا تھا جس پر لڑکی چیخی تھی۔

میں اس طرح دھر لیے جانے پر شرمندہ تھا۔ میں نے ان حد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"جانے دے ان حد سنگھ! غلطی میری تھی۔ میں ہی اس کے چکر میں آ گیا تھا۔"

وہ ہنسا۔ اس نے بال پکڑے پکڑے لڑکی کو جیپ سے اتار دیا' پھر اسے چھوڑ دیا اور کولہے پر ڈھیلے ہاتھ کا دھپ مار کے بولا۔ "دوڑ جا ادھر سے...... رکی تو پچھتائے گی...... گشتی......! تو میرے ٹائپ کی نہیں ہے۔ جے ہوتی میرے ٹائپ کی تو ابھی میں چھوڑنا نہیں تھا۔ مصروف کر لینا تھا تجھے۔"

لڑکی اسے بری زبان میں گالی دیتی کنج سے نکلی اور بھاگتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

میں نے شرمندگی دور کرنے کی کوشش میں پوچھا۔ "کون تھا جسے اس لڑکی نے ہٹا دیا تھا۔ کوئی تھا ضرور جس سے پاپ لے کے یہ کھڑی ہو گئی تھی۔"

"وہی تھا۔ کھدڑا مونگ جو۔ ہماری جیپ آتے دیکھ کے اس نے پاپ اسے پکڑا دیا تھا۔ یہ برابر میں گھاس پر بیٹھی تھی۔ وہ اس لڑکی جیسے رنگین کپڑے پہنے تھا۔ ایک پل میں' میں نے اسے دیکھا' دوسرے ہی پل میں تقریباً ویسے ہی رنگین کپڑے والی یہ آ گئی۔ وہ گھاس پر لوٹ لگا کے جھاڑی میں گھس گیا اور بھاگ لیا۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"میرے قابو میں۔ اب ذرا سرک کے بیٹھو۔ میں گاڑی چلاؤں گا۔" ان حد نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ہم بوگین ویلیا کے کنج سے نکل آئے۔

میرا سکھ ساتھی جیپ دوڑاتے ہوئے بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مجھے شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ یہ مہم تو میری تھی اور میں کھیل میں لگ گیا تھا۔

ہم ولا کے پچھواڑے پہنچ گئے تو ان حد سنگھ نے گاڑی روک دی' پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کے بولا "شیر کھان! یارا پہلی ویری پتا لگیا کہ توں وی مرد کا بچہ ہے۔ لڑکی شڑکی وچ دلچسپی لے سگدا ہے۔"

میں نے کھسیا کے کہا۔ "چھوڑ یار۔"

اس نے کہا کچھ نہیں' شرارت میں ایک بار اور ٹھٹھا مارا۔

گاڑی سے اتر کے ہم ولا کے عقب میں بنے ملازموں کے کوارٹروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ اونچے درختوں سے گھرا بے رنگ سا علاقہ تھا۔ مجھے یاد آیا' یہیں ایک کوارٹر میں جائیداد کے مالک مونگ لی صاحب نے مونگ جو کھسرے کے کزن یا مالشیے اس لڑکے "کے کے" کو رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

"کے کے" والے کوارٹر کے برابر ہی ولا کا کک رہتا تھا۔ پہلی بار جب ہم یہاں آئے تھے اور جس وقت اس مالشیے کے کوارٹر کی تلاشی لینے جا رہے تھے تو کک کی نوجوان لڑکی ہمیں دیکھ کے رک گئی تھی۔ کوارٹر سے لوٹتے ہوئے بھی وہ ہمیں چھپ کے دیکھتی رہی تھی۔ میں نے سوچا' اب جو واقعات ہو رہے ہیں' اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ لڑکی شروع ہی سے اس پورے قصے میں شامل ہے۔

ان حد سنگھ مجھے لے کر سیدھا مالشیے "کے کے" والے کوارٹر کے سامنے جا پہنچا۔ کوارٹر میں تالا پڑا تھا۔ ان حد نے رازدارانہ ایک دبا ہوا قہقہہ لگایا اور جیب سے چابی نکال کے تالا کھول دیا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ پہلی چیز جس نے کوارٹر میں پہنچتے ہی ہمارا استقبال کیا' مونگ جو ہیجڑے کے سینٹ کی تیز خوشبو تھی۔

دوسرا منظر جو میں نے اس کوارٹر میں دیکھا خاصا عبرت دلانے والا تھا مگر دیکھ کے ہنسی بھی آتی تھی۔

شوخ رنگوں کی پھول دار بش شرٹ اور انڈے جیسی سفید چست پتلون پہنے مونگ جو ہاتھ پیر بندھا لوہے کے بھاری پلنگ سے جڑا ہوا فرش پر بے بس پڑا تھا۔ ان حد سنگھ نے مونگ جو کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈھاٹا سا باندھ دیا تھا اور اب ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے بے بسی سے ہلنا جلنا اور حلق سے غوں غوں کی آوازیں نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ان حد نے آتے ہی دو کرسیاں فرش پر پڑے مونگ جو کے پاس کھینچ لیں۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود ایک کرسی سنبھالی اور اس سے بولا۔

"سن بئی کھسرے! میں بندہ ہوں کھڑ پینچ قسم کا۔ ساتھ میں بدمعاش اور ظالم بھی بہت جیادہ ہوں۔ اس وقت ہم تیرے سے بات کرنے آئے ہیں۔ جے سیدھی طرح بات کرے گا تو خیر ہی خیر ہے' تو نے اگر شور مچایا۔ نکھرے باجی (نخرے بازی) کی تو میں تیرے ساتھ یہ سلوک کراں گا۔" یہ کہتے ہوئے ان حد نے اچانک کھسرے کے پیٹ میں لات ماری۔

"غوا!" کی آواز کرتا ہوا مونگ جو کھٹکے کے چاقو کی طرح ایسے بند ہو گیا کہ

حیرت ہوئی۔ لگتا تھا پیٹ میں کوئی سوئچ تھا جسے لات مار کے بند کیا گیا ہے۔

ان حد بولا "جے آرام نال گل بات کرے گا' تے ہم انعام دیاں گے۔ لی صاحب سے کہہ کے تیری تنکھا (تنخواہ) بڑھوا دیاں گے...... بول شور تو نہیں کرے گا؟"

مونگ جو نے تیزی اور مستعدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ان حد نے اس کا ڈھاٹا کھول دیا اور منہ میں ٹھنسا کپڑا نکال لیا۔

وہ گہرے گہرے سانس لیتا' پھر مار کھائے ہوئے پلے کی طرح کوں کوں کر کے رونے لگا۔ ان حد نے مارنے کو پھر پیر اٹھایا۔ کھسرے نے "ناں ناں' ناں ناں۔" کرتے ہوئے اپنی آواز بند کر لی۔ ان حد نے اسے کک نہیں ماری' کہنے لگا۔ "ہاں۔ پر صئی ہے۔" مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "یہ کھسرا اپنی بے بے...... اس کک کی بیٹی کے ساتھ باہر لان پہ کھڑا تھا۔ میری جیپ کو پہچانتا ہے۔ اندھیرے اجالے میں آتی ہوئی جیپ دیکھ کے سمجھ گیا کہ ہم لوگ آرہے ہیں' فوراً ہی گھاس پر بیٹھ گیا اور ادھر بیٹھی ہوئی لڑکی کو پائپ تھما کے کھسک گیا۔ میں نے اسے جھاڑی کی اوٹ کے بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ خاموشی سے پیچھے پیچھے آ کے اسے نوکروں کے کوارٹروں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ اپنے بھائی اس "کے کے" مالشیے کے کمرے میں چھپ گیا۔ ساتھ میں آپ کا کھادم ان حد سنگھ بھی چلا آیا۔ ادھر ہی اس کو باندھ کے ڈال دیا۔ اب ایسا ہے کہ تسی آرام نال پوچھ گچھ کر سکتے ہو۔ کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

میں نے پوچھا "مونگ جو! بتاؤ میرے بابا صمد بنگش صاحب کہاں ہیں؟"

مونگ جو نے فریاد کرتی آواز میں کہا "نہیں مالم۔ تم یہ کیا بولتے ہو۔ میں تمہارا بابا کو نہیں جانتا۔"

ان حد سنگھ نے بہت بے تکلفی سے دوبارہ اس کی پنڈلی پر اپنے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔

کھسرے نے تکلیف کی آواز نکالی تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا کہ آواز نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے پھر پوچھا "صمد بنگش صاحب کہاں ہیں؟"

وہ گھگھیا کے کہنے لگا "مستر کھان! آپ منگیش کا نام صئی نہیں لیتے ہو۔ منگیش موسلمان کدھر ہے؟ وہ میرا ماما ہے۔ بدھسٹ ہے' وہ ادھر ہی ہے۔ آپ بولو گے تو ابی ملا دے گا۔ ہاں؟"

میں نے کہا "میں کسی بدھسٹ کا نہیں...... تیرے ماما کا نہیں پوچھتا ہوں۔ میں اپنے بابا صمد بخش صاحب کا پوچھتا ہوں جو ٹریکٹر ٹرالی کے کسی ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو گئے تھے...... جنہیں زوبر میاں کے ڈاکٹر کے پاس بھیجنے کا ٹیلی فون ہوا تھا۔ وہ زخمی کہاں ہے......؟"

"کہاں صاحب! میرا ماما منگیش کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ ابھی ٹھیک ہے۔"

میں نے ان حد کی طرف دیکھا۔ ان حد نے کرسی سے اٹھ کے اپنی پتلون میں لگی چمڑے کی بھاری بیلٹ کھولنی شروع کر دی۔ اس نے شاید تفصیلی پٹائی کا منصوبہ بنا لیا تھا یا صرف ڈرانا چاہتا تھا۔

مونگ جو نے گھگھیاتے ہوئے "ناں ناں ناں" کہنا شروع کر دیا' بولا "جیسا کسم چاہیے وہ میرے سے لے لو۔ میں سچ بولتا ہوں۔"

وہ جس طرح دہشت زدہ ہو کے کہہ رہا تھا' اس سے اس خیال کو تقویت پہنچی تھی کہ جھوٹ نہیں بول رہا مگر یہ پریشانی والی بات تھی کہ بابا کے بارے میں ایک اطلاع ملتی ہے اور اب وہ خبر مشکوک ہو چکی ہے۔ میں نے ان حد کو مار پیٹ سے منع کر دیا۔ پھر بھی اس مونگ جو کے بیان کی پوری تحقیق ضروری تھی۔ میں نے کہا "وہ جو تیرا ماما منگیش ہے' ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

مونگ جو بولا "میرے کو کھول دو' میں منگیش کو دکھا دیں گا۔"

میں نے ان حد کو اشارہ کیا۔ آپس میں مشورہ کرنے کی غرض سے کوارٹر سے باہر آ گئے۔ ان حد کا خیال تھا کہ یہ "سورا کھدڑا" جھوٹ بک رہا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس کے بیان کی تصدیق کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان حد نے کہا "ٹھیک ہے مگر میں اس کے ہاتھ باندھ کر رکھوں گا۔ سورا بھاگنے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔"

جیسا کہ طے ہوا تھا' ہم نے مونگ جو کو لوہے کے پلنگ سے آزاد کر کے اس کے پیروں کی رسی کھول دی اور اسے کوارٹر سے باہر لائے۔

وہ مسلے مسلائے' مٹی لگے کپڑوں کے ساتھ پشت پر ہاتھ بندھے باہر آیا تو ولا کے اکا دکا نوکروں نے رک کے حیران ہو کے ہمیں اور اسے دیکھا۔ ان حد سنگھ نے ہاتھ کے اشارے کیے کہ وہ جائیں' اپنا کام کریں۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ مونگ جو بڑبڑانے لگا۔ "یہ لوگ کا سامنے میرے کو ڈس آنر (بے عزت) کیا ہے۔ ابی آپ لوگ میرے کو شوت کر دو تو اچھا ہے۔"

ان حد نے آرام سے کہا "جے مارنی پوی تے گولی وی ماراں گے' پروا نہیں کر۔"

وہ ہمیں ولا کے دوسرے رخ بنی بارکوں میں لے گیا۔ وہاں ہمارے پہنچنے کے دو منٹ بعد ہی چینی ہاؤس کیپر اور ٹمبر اسٹیٹ کا مالک بوڑھا مونگ لی صاحب بھی آ گئے۔

لی صاحب پریشانی میں آیا تھا۔ ایک جملے میں وہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا اور دوسرے جملے میں پوچھ رہا تھا کہ ہم دونوں کو کس بات کی پریشانی ہے؟ مطلب یہ کہ ہم نے مونگ جو کو کیوں باندھ کے رکھا ہے؟

بڑے میاں ان حد سنگھ کے تیور پہچانتے تھے' اس لیے جب ان حد نے کہا کہ انکل آپ جائیے' مجھ پر بھروسا کیجئے۔ میں ایک گھنٹے میں آ کے پوری تفصیل بتا دوں گا تو وہ اپنی چینی ہاؤس کیپر کے ساتھ چلے گئے۔ جانے سے پہلے اسٹاف سے یہ ضرور کہہ گئے کہ مسٹر سنگھ صرف ہمسائے نہیں ہیں بلکہ ان کے بیٹے کی طرح ہیں اور وہ جو اتنے ناوقت آئے ہیں اور اس قدر اشتعال میں ہیں تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔

ولا کے اعلیٰ درجے کے ملازموں یعنی خانساموں' پلمبروں' بجلی کا کام کرنے والوں' مکینکوں' بڑھیوں کے بعد جو نچلے درجے کے مزدور اور عام صفائی والے نوکر تھے' وہ ان سادہ بارکوں میں رہتے تھے۔ آٹھ دس آدمیوں کے سوا یہ سبھی نچلے ملازم اپنے کام سے لگے ہوئے تھے۔ ان آٹھ دس لوگوں کو جو بارکوں کی صفائی اور اپنے ساتھیوں کا کھانا پکانے کے کپڑے دھونے میں مصروف تھے' ان حد نے ہدایت کی تھی کہ جو کر رہے ہیں' وہ کرتے رہیں۔ ہماری پروا نہیں کریں۔

مونگ جو ہمیں لیے ہوئے ایک بارک میں گھسا۔ پہلے ہی ہال میں داخل ہو کر ہم نے دیکھا کہ ایک قطار میں لوہے کی چارپائیاں بچھی ہیں۔ کونے والی چارپائی پر ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تولیے سے بنا میلا سا گاؤن پہنے سیدھا ہاتھ سلنگ پٹی میں لٹکائے لوہے کے سرہانے سے ٹیک لگائے' برمی زبان کا اخبار پھیلائے اونگھ رہا تھا۔ ہم پر شور طریقے سے بارک میں داخل ہوئے تھے تو وہ اس آواز سے چونک پڑا تھا اور اب اپنے بائیں ہاتھ سے اخبار تہہ کر کے ایک طرف ڈال رہا تھا۔

مونگ جو نے اسے آواز دی اور برمی میں کہا "ماما! یہ لوگ تیرے سے ملنے آئے ہیں۔"

اس کے ماما نے پہلے نیم خوابیدہ آدمی کی طرح "ہہ؟" کہہ کر آنکھیں

پٹپٹائیں، پھر کہنے لگا "میرے سے...... کیوں؟"

اس کی برمی "خالص" نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان کی سرحد سے ملنے والوں کی زبان تھی۔ ہمیں بنگال کے لہجے کی چمک صاف سنائی دی، وہ بولا۔ "میں ان لوگوں کو نہیں جانتا۔ یہ کیا چاہتے ہیں؟ کون ہیں؟"

ان حد نے کھرے لہجے میں کہا "ہم سرکاری لوگ ہیں۔ بڑی اونچی سرکار سے ہمارا تعلق ہے۔ جو بولے سو نہال! ست سری اکال!"

سلنگ میں ہاتھ لٹکائے آدمی نے پھر آنکھیں پٹپٹائیں، اپنے بھانجے سے پوچھا "یہ لوگ نے تیرے کو باندھا کیوں ہے؟"

ان حد نے درشتی سے کہا "بولا نہیں۔ ہم سرکاری آدمی ہیں جس کو جی کرے باندھ سکتے ہیں۔"

موتگ جو نے فوراً ہی کہا "ماما! یہ دونوں آدمی کو اپنا نام بتا۔"

"منگیش! تیرے ہاتھ پہ پٹی، سلنگ کیوں ہے؟"

کہنے لگا "ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی الٹ گئی تھی۔"

"کب؟" ان حد نے پوچھا تھا۔ وہ اب اس کے دائیں طرف جا کھڑا ہوا تھا۔

ماما نے...... یا وہ جو بھی تھا، جھٹکے سے اپنا سر ان حد سنگھ کی طرف گھمایا، بولا "دو ویک...... پندرہ دن ہو گیا۔"

"کتنا؟" یہ بھی ان حد کا سوال تھا مگر وہ اب مامے کے بائیں ہاتھ کی طرف پہنچ گیا تھا۔

مامے نے جواب دینے کے لیے اب جھٹکے سے بائیں رخ اپنا سر گھما لیا "بولا نا پندرہ دن۔"

"بکواس کرتا ہے بھینی!" ان حد نے کڑک کے کہا اور جوڈو جیسا کھڑا ہاتھ اس کے زخمی ہاتھ پر مارا۔

میں سمجھ رہا تھا، وہ تکلیف سے چیخ پڑے گا مگر ان حد نے چیک کر لیا تھا کہ زخمی نہیں ہے، مکر کرتا ہے۔ اب اس نے منگیش نے یا جو بھی اس کا نام تھا، سلنگ سے اپنا پٹی بندھا ہاتھ نکالا اور بنگلا زبان میں گالی دیتے ہوئے تکیے کے نیچے پہنچا دیا۔

ان حد نے چیخ کے خبردار کیا۔ میں نے جھپٹ کر تکیے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میری چھلانگ سے لمحہ بھر پہلے کسی نے بارک کے باہر سے فائر کر دیا تھا۔ گولی میرے سر

سے ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ مجھے یقین ہے اتنا ہی فاصلہ ہوگا، کیوں کہ تھپڑ میں نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ میں نے دیوار کا پلستر اکھڑتے دیکھا۔ تکیے پر میرا ہاتھ اس طرح جا پڑا تھا کہ "منگیش مامے" کی کلائی کی ہڈی پر میرے کھڑے پنجے کی ضرب پڑی تھی اور اس نے تکلیف سے بے چین ہو کے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ تکیے کے نیچے اعشاریہ تین دو کا ایک کومپیکٹ پسٹل تھا جو اب میری گرفت میں تھا۔ میں نے پستول سنبھالتے ہی کھسرے کے "مامے" کو گریبان سے پکڑ کے اپنے اور فائر کرنے والے کے بیچ کر لیا۔

باہر سے پھر ایک فائر ہوا جس پر پلنگ کے نیچے سے کھسرے کی گھگیاتی ہوئی پرجوش آواز آئی۔ "او حرامی! گولی مت چلا رے، اس نے مجھے ڈھال بنا لیا ہے۔" وہ اپنے باہر والے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

خوب! ان حد سنگھ نے اس بدمعاش کھسرے کو قابو کر کے ڈھال بنایا ہوا ہے۔

میں نے تعریفی نعرہ لگایا۔ "ویل ڈن! ان حد سنگھے! میں نے اس کے ماما کو ڈھال بنایا ہے۔ اس کا پستول بھی قابو کر لیا ہے۔"

شفقت کی آواز کرتے ہوئے ان حد سنگھ نے اس کھسرے کو لاتیں مار مار کے پلنگ سے باہر کر دیا، پھر چیخ کر اپنی سکھوں والی پنجابی میں کہنے لگا کہ خان مجھے کور دینا۔ میں اس باہر والے کو پکڑتا ہوں۔ تم اس کھسرے کو ادھر ہی روک کے رکھو۔

میں نے پے در پے دو فائر باہر کی طرف جھونک دیے۔ ان حد سنگھ میرے فائر کے کور میں باہر کی طرف ڈپٹ گیا۔ موتگ جو کھسرا اپنے سر پر سے گزرتے فائروں سے دہشت زدہ ہو کے رونے لگا تو میں نے اسے خبردار کیا "ہلنا مت موتگ جو! نہیں تو اگلی گولی تیری گردن میں مار دوں گا۔"

اس نے فرش پر جھکے جھکے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "نہیں نہیں کھان صاحب! میں ہلوں گا نہیں۔"

اب وہ ماما کچھ کسمسانے لگا تھا تو میں نے اس نقلی زخمی کے سر پر پسٹل کا اسٹوک مار کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ اس طرح احتیاطاً اسے اصلی زخمی بنا دینے کے بعد باہر ان حد سنگھ کو سپورٹ دینی ضروری تھی۔ میں اس نئے زخمی کے ڈھیلے ڈھالے بدن کو پلنگ پر چھوڑ کر کھسرے کے سر پر چھلانگ مار کر اسے گراتا ہوا فرش پر آیا، پھر میں نے بارک کے دروازے سے نظر آتے آسمان کی طرف ایک فائر اور کر دیا۔

باہر سے ان حد سنگھ کی آواز آئی "ٹھیک ہے شیر کھان! آجاؤ۔"

باہر وہ اپنا پسٹل سیدھا کیے ایک گھٹے ہوئے بدن کے بدمعاش کو ہاتھ اٹھوائے قابو میں لیے کھڑا تھا۔ بدمعاش کے سیدھے ہاتھ میں ابھی تک اس کا ریوالور تھا مگر اس طرح کہ گویا کھونٹی سے لٹک رہا تھا۔ ٹریگر کا کور اس کی انگلی میں پرویا ہوا تھا۔

میں نے بڑھ کے اس کے ریوالور کو قابو کیا اور اسی کی گردن میں پڑے ریشمی مفلر سے ہاتھ باندھ کے اسے ٹھیلتا ہوا پارک میں لے آیا اور مونگ جو کے برابر فرش پر بٹھا دیا۔

ان حد نے کہا "شیر کھان! تم ان دو بدمعاشوں کو ادھر ہی روکو' مجھے باہر ایک اچھی چیز نظر آئی ہے۔ وہ میں اس مونگ جو کو دکھانے لے جا رہا ہوں۔ آؤ مونگ جو! دوست تمہیں کھو کی سیر کرائیں۔ کھو سمجھتے ہو؟ کنواں 'کنواں'۔"

ان حد نے ہاتھ بندھے کھسرے کو اس کی پھول دار قمیص کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور ٹھڈے مارتا ہوا اسے باہر لے چلا۔ کھسرے نے "ناں ناں......ناں ناں' کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا اور جانا نہیں چاہتا تھا مگر بے بس تھا۔

اگلے پندرہ منٹ میرے لیے ایسے تھے جیسے میں ریڈیو کے سامنے بیٹھا کوئی سنسنی خیز ڈراما سن رہا ہوں یعنی سنائی سب کچھ دے رہا تھا' نظر کچھ نہیں آتا تھا۔

باہر کی آوازوں سے واقعات ضرور سمجھ میں آ رہے تھے اور جو واقعہ سمجھ میں آیا' یہ تھا کہ ان حد سنگھ نے اسے ڈول چرخی سے باندھ کے آہستہ آہستہ کنویں میں اتارنا شروع کیا تھا۔ وہ برابر خوشامدیں کر رہا اور گڑگڑا رہا تھا مگر ان حد کا اصرار تھا کہ "کھو کی سیر تو ضرور کرانی ہے۔"

شاید دو تین بار اسے پانی میں ڈبکیاں دے کر اور اپر اٹھا کے ان حد نے اس سے پوچھا ہو گا کہ آخر میں وہ سچی سچی باتیں بتانے کے موڈ میں آ گیا۔ مونگ جو نے ہاں ہاں نہیں نہیں کرنے کے بعد اپنی ماں کی قسمیں کھائی تھیں کہ وہ سب کچھ ٹھیک بتا دے گا۔ "مستر سینگھ!" اسے پانی میں نہیں ڈبوئیں۔

آوازوں سے پتا لگا کہ ان احد نے احتیاطاً اسے رسی ڈھیلی چھوڑ کے آدھے پون منٹ کے لیے ڈوبنے بھی دیا ہے تاکہ اسے یہ موت کا منظر یاد رہے' پھر نکال کر اس بھیگے چوہے کو کالر سے پکڑ کر کھینچتا ہوا واپس پارک میں لے آیا۔

مونگ جو زمین پر گھسٹتا روتا خوشامدیں کرتا آیا تو اس کا نقلی ماما اور وہ ہٹا کٹا گرگا

بہت متاثر ہوئے۔ ان حد نے انہیں دکھا کر ایک بار برمی زبان میں پوچھا "تم ایسے آدھے مرد کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے تھے جسے نہانے سے بھی ڈر لگتا ہے؟ لعنت ہے!"

ان حد نے زخمی ماما کو جس کے سر سے خون بہہ کر جم گیا تھا اور اس دوسرے ہٹے کٹے گرگے کو خوب اچھی طرح رسی سے باندھ کے پارک کے دور کے گوشے میں پھینک دیا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں ادھر ان حد کی تفتیش پر کان لگائے رہوں۔ مونگ جو کے بیان کو بغور سنوں اور گرگے سے چھینے ہوئے طاقت ور ریوالور سے دور کونے میں پڑے بدمعاشوں کو اپنی زد میں بھی رکھوں۔"

ان حد نے کھسرے سے پوچھا "ہاں جی کھدڑے جی! آپ میرے دوست کے والد صمد بنگش صاحب ہوری کو جانتے ہو؟"

بھیگے ہوئے مونگ جو نے کپکپاتے ہوئے کہا "یس سر! جانتا ہوں۔"

"بنگش صاحب کہاں ہیں؟"

"صحیح تو پتا نہیں......مارنا نہیں......مارنا نہیں سر! ہم نے ادھر سے بارہ دن پہلے اس کو......بنگش صاحب کو رنگون بھیج دیا تھا۔"

میرا دل بے تابی سے دھڑکنے لگا۔ "وہ زخمی تھے......اب کیسے ہیں؟"

مونگ جو میری طرف متوجہ ہوا "وہ تمارا بابا اب ٹھیک ہو گا۔ میں نے بینڈیج کر دیا تھا۔"

میں نے پوچھا "چوٹ کیسے لگی تھی؟"

مونگ جو بے بسی سے ان حد کو دیکھنے لگا۔ ان حد نے اپنے ریوالور والے ہاتھ کو گردش دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ڈر کے بغیر اپنی بات کا جواب دیتا رہے۔

مونگ جو نے آہستہ سے کہا "میری مس ٹیک (غلطی) سے بنگش صاحب زخمی ہوا تھا۔"

"کیسی مس ٹیک؟"

مونگ جو نے ان حد کی طرف سر گھمایا اور بولا "آپ اڈگ گسا نہیں ہونا۔ وہ صاحب ہمارا بات نہیں مانتا تھا' بس ہرٹ ہو گیا۔"

ان حد نے اسے کس کے ایک ٹھڈا مارا "کیسے ہرٹ ہو گیا' کھل کے بتاؤ سورے!"

کھسر ارونے لگا۔ ان حد نے پھر ایک لات ماری' پوچھا "تو نے جکھمی کیا بنگش صاحب کو؟"

اپنے بابا پر اس بزدل زنانے کے تشدد کی تفصیل سننا مجھے اچھا نہ لگا' میں نے ان حد سنگھ کو منع کر دیا کہ یہ سب نہ پوچھو' آگے چلو۔ اس نے گالی دیتے ہوئے ایک اور ٹھڈا مارا اور پوچھا "رنگون میں بابا صاحب کس جگہ' کس کے پاس ہیں؟"

وہ بولا "سر! میں چھوتا آدمی ہے' میری پاور کوئی کھاص (خاص) نہیں ہے۔ رنگون میں ایک سنتر ہے' اس کا سارا ستاپ ہے۔ وہ ہر کام کا مجھے پے منت کر دیتا ہے۔ میں ادھر کوشش ترائی کرتا ہے۔ اگر کام ہو گیا تو پے منت مل جاتا ہے۔ منتر صاحب کھش ہو جاتا ہے۔ کام نہیں ہوا تو پیسا نہیں ملتا۔ صاحب الگ گسا ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا "بنگش صاحب کو ادھر کون لایا تھا؟"

مونگ جو بولا 'ایست پاکستان کا ایک بزنس مین ہے مستر سلسیل چودھری۔"

اوہ! مسٹر چودھری! مجھے سن کر حیرت کیوں ہوتی؟ مجھے معلوم تھا وہی بدمعاش سلسیل چودھری اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے بابا کو برما میں لے کر آئے گا۔

"سلسیل چودھری میرے بابا کو تیرے پاس کیوں لایا تھا؟"

"سیف کیپنگ کے لیے...... مطلب میں حفاجت (حفاظت) سے ان صاحب کو ادھر رکھتا' پھر جب چودھری بولتا' چھوڑ دیتا۔"

ان حد نے کہا "اچھا تو ادھر تو نے پرائیویٹ جیل بنا رکھی ہے۔ انکل لی کی ٹمبر اسٹیٹ کا یہ حال کر دیا تم بدمعاشوں نے۔"

ان حد اس کی پٹائی کرنے کو تھا مگر میں نے روک دیا۔

میں اب یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ کیا مونگ جو میرے بابا کو اپنے پاس روکے رکھنے کے لیے سلسیل چودھری سے پیسے لے رہا تھا یا ڈیوٹی اس کے باس برمی منسٹر کی طرف سے لگائی گئی تھی؟

میں نے مونگ جو سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کیس تو اس نے اپنے طور پر ہاتھ میں لیا تھا مگر جب اس کے باس منسٹر نے مجھے یعنی شیر خان کو تلاش کرنے کا کام اس کے سپرد کیا اور ادھر ادھر کی رپورٹوں سے اور سلسیل چودھری سے سوال و جواب کرنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ میں شیر خان صمد بنگش صاحب کا بیٹا ہوں تو مونگ جو نے فوراً اپنے باس منسٹر کو ٹیلی فون کیا۔

تفصیل سناتے ہوئے وہ کہنے لگا "فون پر ہی منتر نے شور کیا تھا کہ بڈھے بنگش صاحب کو ادھر رنگون بھیجو' اس لیے کہ اس کے بیٹے شیر کھان نے برمیز گورمنت سے بہت جیادہ دھوکا کیا ہے۔ وہ بولا "شیر کھان تو برما کی جیل سے بھاگا ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "تیرے اس منسٹر کا نام کیا ہے جس کے پاس میرے بابا کو بھیجا گیا ہے؟"

مونگ جو نے جو نام بتایا' وہ اسی منسٹر کا تھا جس سے کونٹی نینٹل ہوٹل کے منیجر مدن بسولا نے میرا' کوسومی کا اور اس کے دادا جی کا جعلی پاسپورٹ بنوایا تھا اور جو اب سرکاری عتاب میں آ گیا تھا۔ رنگون جیل سے میرے فرار ہونے اور دوبارہ بدھ وہار میں گھیر لیے جانے اور پھر وہاں سے بھی نکل جانے سے ویسے تو پوری سرکاری مشنری ہل کے رہ گئی تھی لیکن جو دھچکا اس جعلی پاسپورٹ والے وزیر نے پہنچایا اور خود اسے پہنچا تھا' اس کی شدت کو تو وزیر بھی خوب سمجھتا تھا۔ دوسرا کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ بابا کو قابو میں کر کے وزیر نے سمجھو' مجھے قابو میں کر لیا تھا۔ انتقام لینے' تباہ کرنے کے لیے۔

کونٹی نینٹل ہوٹل سے فرار ہوتے وقت مجھ پر جو جال پھینکا گیا تھا' اب اس میں میرے بابا آ چکے تھے۔ میں بے بسی اور جھنجھل میں اٹھ کے ٹہلنے لگا۔

قابو میں آئے ہوئے اس دشمن سے زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہو سکا تھا کہ بابا رنگون میں ہیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ آگے یہ ہماری معلومات میں کچھ اور اضافہ کر سکے گا۔

میں ٹہلتے ہوئے سوچتا رہا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ فطری طور پر میں اپنے بابا کی طرف سے پریشان تھا اور کسی نہ کسی طرح رنگون پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

ان حد کا ذہن اس طرح کے دباؤ میں نہیں تھا جیسے دباؤ سے میں گزر رہا تھا۔ وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہا تھا۔ اس نے سب چیزیں ترتیب سے یاد رکھی تھیں۔ اسے دونوں لڑکیاں رشنا اور روکسانہ بھی یاد تھیں۔ انہی کو تو تلاش کرتے ہوئے ہم ٹمبر والوں کے اس علاقے میں آگے تک نکل گئے تھے۔

ان حد نے مونگ جو سے پوچھا کہ ہاں جی اب لڑکیوں کے بارے میں بتاؤ جنہیں اسٹیشن ویگن والے سرکس سے اغوا کر کے اس علاقے میں لائے ہیں اور یہ بات پوچھتے ہوئے اس نے اپنی عادت کے مطابق مونگ جو کو احتیاطاً ایک لات بھی رسید کر

دی تھی تاکہ وہ کسی طرح کی عیاری نہ کرے اور سچ سچ بتادے کہ لڑکیاں کہاں ہیں۔

مونگ جو لات کھا کے دھیرے سے مسکرایا' بولا "سر! لڑکیوں کی سیفٹی اور حفاجت کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور آپ سے سودا کر سکتا ہوں۔"

ان حد نے کہا کہ سورے! خود تیری حفاظت اور سیفٹی کا یقین نہیں دلایا جاسکتا تو کیا کوئی سودا کرے گا؟ پھر بھی ان حد نے کہا "بکو کیا بک رہے ہو؟"

مونگ جو نے سیدھی سی بات کم سے کم لفظوں میں کہہ دی۔ جو یہ تھی کہ میں لڑکیاں صحیح سلامت آپ کے حوالے کر سکتا ہوں' آپ مجھے سلامتی کے ساتھ مونگ لی صاحب کے جائیداد سے نکل جانے دیں۔ کہنے لگا "میرے پاس میری اپنی کار ہے۔ بس کار کی ٹنکی فل کرا کے میں ہائی وے پہ نکل جاؤں گا...... اگر آپ لوگوں کا پرمیشن ہوئی تو۔"

دس پندرہ منٹ اس میں اور ان حد سنگھ میں بحث ہوتی رہی۔ ان حد اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ بدمعاش مونگ جو نے کہا کہ اگر سردار جی اپنا پولیس کچہری کا شوق پورا کریں گے تو لڑکیاں جان سے جائیں گی کیونکہ صرف تین آدمیوں کو ان کے چھپائے جانے کی جگہ معلوم ہے۔ خود مونگ جو' کک کو اور کک کی بیٹی کو۔ کک کی بیٹی اور کک آدھے گھنٹے پہلے نکل چکے ہیں۔ اب صرف مونگ جو کو معلوم ہے کہ دونوں لڑکیوں کو کہاں بند کیا گیا ہے۔ مونگ جو کو کچھ ہو گیا تو لڑکیوں کا پتا اس وقت چلے گا جس وقت اگلے ہفتے ان کی لاشوں سے تعفن اٹھے گا یا ممکن ہے اس وقت بھی پتا نہ چلے کیونکہ جگہ کافی ایئر ٹائٹ ہے۔ کھسرا بولا "ایک سو برس پیچھے کوئی لڑکی لوگ کا پنجر کھود کے نکالے گا' اس وکت بہت دیری ہو جائے گا۔"

ان حد سنگھ اس بلیک میلنگ پر غصہ ہو کے کھسرے کو مار پیٹ کرنا چاہتا تھا مگر میرے منع کرنے پر رک گیا۔ مجبوراً اس عیار غنڈے نے مونگ جو سے سودا کرنا پڑا۔

طے ہوا کہ مونگ جو کی جنگل میں چھپائی ہوئی کار اس کے ساتھ جاکر ادھر ولا میں لائی جائے گی۔ اس کی ٹنکی پٹرول سے فل کی جائے گی اور ٹمبر اسٹیٹ کے مالک مونگ لی صاحب کی ضمانت میں ایک ہاتھ سے لڑکیاں وصول کر کے دوسرے ہاتھ سے کھسرے کو اس کی کار کی چابی دیدی جائے گی۔ مونگ جو کی روانگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی کیونکہ لڑکیاں صحیح سلامت ہیں اور صحیح سلامت میرے یعنی شیر کھان بنگش کی سپردی میں دی جائیں گی۔

ان حد سنگھ نے بہت بک جھک کرنے کے بعد انکل مونگ لی کو بلوایا۔ بوڑھا لی

صاحب اپنی چینی ہاؤس کیپر کے ساتھ آیا۔ ان حد سے پوری بات سن کے سمجھو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ کھسرا اتنا بڑا جرائم پیشہ نکلے گا۔ مونگ لی صاحب کے بڑھاپے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اس بات سے آئیڈیا لے کر کہ ان کا کوئی وارث ٹمبر اسٹیٹ میں موجود نہیں تھا' کھسرے نے یہ سازش تیار کی تھی اور اس عزت دار ٹمبر جائیداد کو اغوا اور دوسرے جرائم کا گڑھ بنادیا تھا۔

بڑے میاں نے غصے میں بس ایک بات کہی کہ اگر وہ بودھ مذہب کے پیرو نہ ہوتے اور جاندار کی جان لے سکتے تو اس کھدڑے مونگ جو کو ابھی شوٹ کر دیتے۔ وہ اپنی ضمانت میں لڑکیوں کی بازیابی اور اپنے سابق ملازم مونگ جو کی جائیداد سے رخصتی کرانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ کہنے لگے "میں کو اس باسٹرڈ مونگ جو سے کوئی انٹریسٹ (مطلب دلچسپی) نہیں ہے۔ یہ کتا ادھر سے چلا جائے تو میں کو سکون ملیں گا۔"

مونگ جو کی چھوٹی کومپیکٹ کار سرکاری ذخیرے میں بجلی کے ایک پرانے سب اسٹیشن میں زنگ آلود ٹرانسفارمر اور کاٹھ کباڑ کے پیچھے پلاسٹک کور میں سیل کی ہوئی رکھی تھی۔ پہلے وہ ٹو چین کر کے لائی گئی۔ مونگ جو کے کمرے سے اس کی طاقت ور بیٹری لائی گئی۔ کار میں لگائی گئی۔ لی اسٹیٹ کے پٹرول کے ذخیرے سے کار میں پٹرول بھرا گیا اور کوئی ایک گھنٹے بعد مونگ جو کی رہائی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس نے اپنے سابق باس لی صاحب سے کہا کہ وہ مہاتما بدھ کی قسم کھا کر پھر ایک بار وعدہ کریں کہ لڑکیاں زندہ اور باہوش مل جائیں گی تو وہ کھسرے کو نکل جانے دیں گے۔ وہ یہ بھی قسم کھائیں کہ دو گھنٹے گزرنے سے پہلے پولیس یا سیکیورٹی سے ہر بات چھپائی جائے گی اور خود ہم لوگ بھی نہ تو کوئی تعاقب پارٹی کھسرے کے پیچھے روانہ کریں گے' نہ خود جائیں گے۔

بوڑھے لی صاحب نے قسم کھائی اور کھسرے نے ان حد سے کہا کہ ٹھیک ہے' میں مطمئن ہوں۔ آپ مجھے لے کر کک کے کوارٹر میں چلیے۔ وہاں لڑکیوں سے ملاقات کراتا ہوں۔ رسیوں سے بندھا ہوا وہ بدمعاش اور ان حد سنگھ آگے آگے تھے۔ پھر میں اور لی صاحب' آخر میں چینی ہاؤس کیپر اپنی نوٹ بک پنسل سنبھالے ہوئے آرہی تھی۔ میں اور ان حد سنگھ مسلح تھے۔ ان حد نے اپنا ہتھیار تیار کر کے کھسرے کی کمر میں گردوں کی جگہ لگا رکھا تھا۔ وہ کک کے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی مادری زبان میں بڑبڑا رہا تھا کہ ان حد سنگھ تو کھوتا مطلب گدھا ہے۔ تجھے پہلے ہی شک تھا کہ لڑکیوں کو کوارٹر کے پاس رکھا گیا ہے تو تو نے اس باسٹرڈ کھدڑے کو چنگی جئی مار لگا کے

اس سے اقبال جرم کیوں نہیں کرالیا؟

کک کا کوارٹر خالی تھا۔ سامان اس طرح بکھرا پڑا تھا کہ صاحب لگتا تھا' گھر والے جلدی میں فرار ہوئے ہیں۔ مونگ جو سب کو لے کر کچن سے ملے ہوئے اسٹور روم میں پہنچا۔ بظاہر عام سا اسٹور تھا' یہاں کپڑوں کی دو الماریاں بھی تھیں۔ برتنوں کے ریک' ٹوٹا ثابت فرنیچر' قالین وغیرہ سب بکھرے پڑے تھے۔ مونگ جو نے فرش پر پڑے قالین کے پہلے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا کہ اسے اٹھایا جائے۔ قالین کے ٹکڑے کو ہٹانے پر فرش میں لوہے کے فریم میں لوہے کا ایک دروازہ جڑا ہوا تھا۔ کھسرے کی بیلٹ میں چمڑے کا ایک وکی پرس لگا تھا جس سے اس نے ایک بھاری سی چابی نکال کے دروازہ کھولا۔ دروازہ بھاری تھا۔ مونگ جو کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' اس لیے مجھے اور ان حد کو مل کر اٹھانا پڑا۔ خوب اچھی طرح تیل دیئے ہوئے دروازے کو اٹھانے سے کوئی شور تو نہ ہوا مگر یہ بھاری بہت تھا۔ مونگ جو ہنس کے بولا کہ کک سانڈ کی طرح مضبوط ہے' وہ تو اکیلا آرام سے دروازہ اٹھالیتا ہے۔ ان حد کو اس کی یہ بات بری لگی' گالی دے کے بولا "تو اپنا گندہ منھ بند ہی رکھے تو اچھا ہے۔ نہیں چھتر مار کے یہ گٹر بند کر دیاں گا سمجھا؟"

دروازہ کھلا تو سیمنٹ کی بدھی سیڑھیاں نظر آئیں اور ہمارے اترنے کی آواز سن کے اندر سے گونجتی ہوئی آواز آنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی شہد کی مکھیاں ابھی ابھی غصے میں اڑی ہیں۔

میں نے پکارا "رشنا!......اے رشنا)"

مکھیوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی۔ اندر سے ایک لڑکی کی آواز آئی "کون؟"۔

میں نے پوچھا تو رشنا ہے؟ میں شیر خان ہوں......رشنا کو بولو' شیر خان آگیا ہے۔ ہم نے سیڑھیاں اترنی شروع کر دی تھیں۔

اندر والی لڑکی نے کسی سے سرگوشی کی۔ پھر جو آواز آئی تو میں پہچان گیا۔ جس لڑکی نے برمی میں گالی دی' وہ رشنا تھی۔ کہنے لگی "جا جا لیڈی بوائے سالا کتا۔"

رشنا نے مجھے مونگ جو سمجھ کے غصہ کیا تھا۔ چیخ کے پھر کہنے لگی "ڈوب مر دھو کے بازا!"

کھسرا ہنسا بولا "میں اس سے جوک کرتا تھا' اسی بات کا گسا کرتی ہے۔" وہ اونچی آواز میں کہنے لگا۔ "ہے لڑکی! تیرا شیر کھان آیا ہے۔"

سامنے اندھیرے میں کھسرے کی بات سن لی گئی۔ رشنا نے خوشی کی چیخ ماری

"ناں رے ناں۔ شیر کھان آگیا۔" اور وہ اندھیرے سے نکل کر لڑکھڑاتی خوشی کی کلکاریاں مارتی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے پوچھا "رشنا! تو ٹھیک ہے؟ ٹھیک ہے تو؟"

"ہاں رے بالکل ٹھیک۔ تو آگیا سردار' اب سب ٹھیک ہے۔"

ان حد سنگھ "لو جی۔ ادھر تو دو دو سردار ہیں۔ ایک ان حد سنگھ تو دوجا سردار شیر سنگھ......مطلب اپنا شیر کھان پٹھان۔"

میں رشنا کا سر تھپتھپاتے اسے شانوں سے پکڑ کے روشنی میں لایا۔ وہ دبلی اور زرد ہو رہی تھی مگر مسکرا رہی تھی۔ "رشنا! روکسانہ کہاں ہے؟"

اندھیرے سے آواز آئی "ادھر۔" روکسانہ خود ہی کسی نوعمر لڑکی کو سہارا دے کر آگے آئی۔

سانپوں کے بادشاہ کی بیٹی روکسانہ ٹھیک تھی۔

میں نے اجنبی نوعمر لڑکی کے بارے میں پوچھا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"رنگون سے لائے ہیں۔ ان کتوں نے اسے کب سے بند کر کے رکھا ہے......دو لڑکیاں اور ہیں۔"

دھیرے سے مونگ لی نے کہا "مائی گاڈ۔"

کھسرا ہنسنے لگا جیسے ابھی ابھی اس کی کوئی شرارت پکڑی گئی ہے۔

ان حد نے خبردار کیا "ابھی تو ہنسنا نہیں او کھسرے! میں نے تیری گچی مروڑ دینی ہے۔" اس نے زوردار ہاتھ بھی گھمایا مگر مونگ جو تیار تھا' اس نے اپنا چہرہ تھپڑ کی زد سے ہٹالیا۔

پانچوں لڑکیوں کو سہارا دے کر سیڑھیوں سے چڑھایا گیا۔ وہ دوسری تین لڑکیاں نہ معلوم کتنے دن سے بند ہوں گی۔ بہت دبلی' کمزور اور زرد ہو رہی تھیں۔ رشنا اور روکسانہ بھی کوئی بہت اچھی حالت میں نہیں تھیں مگر ان بیچاری لڑکیوں کی حالت تو ابتر تھی۔

مونگ جو نے اسٹور روم مین پہنچائے جانے پر کہا "سر! شیر کھان صاحب! ابھی آپ لڑکیوں کو ادھری روکو۔ پہلے باہر جا کے میرے کو رکھمت کرو۔ میں چلا جائے فیر لڑکی لوگ کو کوارٹر سے باہر نکالنا۔ اکیری منت یہی ہے۔ ہاں ماسٹر لی سر!"

لی صاحب نے جواب میں کہا "میں بدھسٹ ہے لیکن ابی بولتا ہوں تو تو جہنم

میں جاؤ' مونگ جو راسکل (مطلب بدمعاش)

میں نے رشنا اور روکسانہ سے کہا کہ وہ لڑکیوں کے ساتھ ابھی وہیں ٹھہریں' چینی ہاؤس کیپر ان غریب قیدی لڑکیوں کے لیے فوری طور پر کچھ کھانے پینے کا سامان لینے دوڑ گئی۔ لی صاحب اور ہم دونوں اس لعنتی مونگ جو کو معاہدے کے مطابق اس کی گاڑی میں بٹھا کر آزاد کرنے کے لیے ولا کے بڑے ہاتھی گیٹ پر پہنچے۔

انتظام اس لیے تھا کہ ولا کے گیٹ سے ہائی وے تک جانے والی ڈرائیو پر سکیورٹی کی ایک چوکی تھی جس پر دو آدمی ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ وہی مہمانوں کے آنے اور جانے کی خبر ولا میں پہنچاتے تھے۔ کھسرے کی نئی گاڑی جو کہ جنگل میں اسٹور کی ہوئی تھی کیونکہ ولا کے پچھلے دروازے سے اندر لائی گئی تھی' اس لیے ہائی وے والے گیٹ کی سکیورٹی کے لیے نئی تھی۔ وہ اسے نہیں نکلنے دیتے۔ اسی لیے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ خود لی صاحب جا کر اس گاڑی کو سکیورٹی چوکی سے نکلوا دیں۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ نئی گاڑی کو (جس کے شیشے گہرے رنگ کے تھے) کون چلا کر لے جا رہا ہے۔ سکیورٹی چوکی والے تو بس اپنے مالک کو دیکھیں گے' ساتھ والی گاڑی پر توجہ نہیں دیں گے۔

ہم نے مونگ جو کے ہاتھ کھول دیئے۔ لی صاحب نے گاڑی کی چابی اس کے حوالے کی اور دونوں گاڑیاں سائیڈ سے سائیڈ ملائے ہوئے ولا کے ہاتھی دروازے سے گزر کر ڈرائیو پر نکل آئیں۔ سامنے کچھ دور پر ہائی وے تھی۔ ہائی وے اور ولا کے بڑے پھاٹک کے درمیان سکیورٹی کی چوکی اور بھری پائپ کی رکاوٹ والا ٹھیا تھا جہاں باریئر کا پائپ گرا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی کی چوکی کی طرف والی کھڑکی سے مونگ لی صاحب نے جھانک کر سکیورٹی والوں کو اپنا چہرہ دکھایا اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ پائپ کی رکاوٹ ہٹا دی جائے۔ گاڑیوں کو نکلنے دیا جائے۔

رکاوٹ اٹھ گئی اور دونوں گاڑیاں گزر کر ہائی وے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس طرح ہم نے اس بدمعاش بلیک میلر کو ایک شریفانہ معاہدے کی اوٹ میں نکل جانے دیا۔ مجھے اس کا بہت دکھ تھا' تاہم ان لڑکیوں کی جان بچانے کے لیے یہ سب کچھ ضروری تھا۔ میں نے خود کو یہ کہہ کے بہلا لیا کہ مجبوری ہے مگر ان حد سنگھ ترکھان غصہ ور آدمی تھا' اسے مونگ جو کھسرے کا نکل جانا اتنا برا لگ رہا تھا کہ اسے بالکل چپ سی لگ گئی تھی۔ بہت کر رہا تھا تو وہ لی صاحب کے سوال کے جواب میں ہوں یا ہاں کہہ دیتا تھا۔ کھسرے نے سکیورٹی بیریئر سے نکلتے ہوئے ان حد کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کا اشارہ کیا تو ان حد نے

بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح ناک سے سانس لے کر دانتوں کے درمیان سے پھنکار کی سی آواز نکالی اور اپنی کپور تھلہ پٹیالہ چھاپ سکھا شاہی میں ایک گونجتی گرجتی ہوئی "گالی" نکالی......ان حد سنگھ کی گالی کے ساتھ ہی ہماری گاڑی پر آندھی کے اولوں کی طرح گولیاں برسنے لگیں۔

گولیوں کی دھات سے ٹکرانے کی ٹنگ اور ان حد کی بھری ہوئی گالیوں کے بیچ میں نے بوڑھے لی صاحب کی کمزور' ہائے کی آواز بھی سنی۔ انہیں گولی لگی تھی۔ ان حد نے اپنی گاڑی کو تیزی سے کاٹتے ہوئے ہائی وے سے اتار کر درختوں کے جھنڈ کی اوٹ میں روک لیا۔ ہم پر خود ہمارے اپنے میزبان کی سکیورٹی چیک پوسٹ سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ ان حد نے جھک کر لی صاحب کو دیکھا اور پھر اس نے اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کم سے کم لفظوں میں مجھے بتایا کہ لی صاحب کے بازو میں گولی لگی ہے۔ خون روکنا ضروری ہے۔ فوری طور پر کچھ کرو' میں تم دونوں کو اتار کر چیک پوسٹ پر جوابی فائرنگ کرنے والا ہوں۔

میں نے کہا "ان حد! کوئی گولی فائرنگ وائرنگ مت کرو' چیک پوسٹ پر شاید کھسرے کے آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ہم کو فی الحال لی صاحب کو دیکھنا چاہیے۔ دشمنوں کو ایک منٹ کے لیے بھول جاؤ۔"

ہماری گاڑی درختوں کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ پھر بھی چیک پوسٹ سے برابر گولیاں چلائی جا رہی تھیں جو یا تو درختوں کے تنوں میں پیوست ہو رہی تھیں یا "ہاں' شاں" کی سی آوازیں پیدا کرتی بے روک نکلی چلی جا رہی تھیں۔

مونگ جو اپنے کالے شیشوں والی کار نکال لے گیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے یہ حملہ یا تو مجھے اور ان حد کو ختم کر دینے کے لیے کیا تھا یا وہ کھسرے کو نکلنے کا موقع دینے اور خود فرار ہونے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

میں نے لی صاحب کی قمیص پھاڑ کے دیکھا کہ زخم کہاں ہے اور کتنا سیریس ہے۔ لی صاحب کے بازو میں گولی لگی تھی۔ یہ فلیش وونڈ یعنی صرف گوشت کو پھاڑ دینے والا زخم تھا' ہڈی سلامت لگتی تھی۔ میں نے زخم سے دل کی طرف جانے والی نسوں پر خوب کس کے کپڑا باندھ دیا۔ خون رک گیا۔ مونگ لی صاحب نے آنکھیں کھول کر کمزور آواز میں پوچھا "کیا ہوا؟"

ان حد نے کہا "انکل آرام سے لیٹے رہو۔ دیکھتے ہیں کیا ہوا ہے؟"

لی صاحب کا ذہن ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ زخم کھانے کے بعد شاک میں تھے۔

ادھر چیک پوسٹ پر قبضہ کرنے والے حملہ آوروں کی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ میں نے ان حد سنگھ سے سرگوشیوں میں کہا کہ وہ اپنے ہمسائے کو کسی طرح ولا میں لے جانے کی کوشش کرے، میں اسے کورنگ فائر دیتا ہوں۔ ان حد سنگھ مجھ سے بحث کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی بات ہی نہ سنی۔ کھسرے کے آدمی سے چھینا ہوا پستول سنبھالا اور چیک پوسٹ کی طرف دو فائر جھونک دیئے۔ آواز سے پتا لگا کہ میرے فائروں میں سے ایک اگر کاری نہیں رہا تو ضائع بھی نہیں گیا۔ ہم نے کسی آدمی کی خوف اور تکلیف کی آواز سنی تھی۔ ایک فائر ادھر سے آیا جو گھبراہٹ میں کیا گیا ہو گا، وہ بالکل ضائع گیا۔

میں نے درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے چیک پوسٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرف بالکل سناٹا تھا۔ کسی کے چلنے پھرنے کی آواز نہیں سنائی دی۔ کوئی حرکت دکھائی نہ دی تو مجھے شک ہوا کہ یا تو وہ لوگ بھاگ چکے ہیں یا بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر میں نے بھاری موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ دیکھا کہ ایک ٹرائمف موٹر بائیک دندناتی ہوئی چیک پوسٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی ہے۔ ٹرائمف موٹر سائیکل پر بیٹھے دونوں آدمی لی صاحب کے ملازموں کی وردی میں تھے مگر مجھے اور ان حد کو اب تک معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سکیورٹی والے نہیں، مونگ جو کے گرگے ہیں۔

طاقتور موٹر سائیکل گھوم کے ہائی وے کی طرف چلی، میں نے دل میں کہا کہ شیر خان! یہی وقت ہے یا تو انہیں ابھی گرا لے یا پھر یہ کبھی ہاتھ نہیں آنے کے۔

میں نے فائر کیا۔ موٹر سائیکل کو ہلکا سا جھٹکا لگا مگر وہ چلتی رہی۔ چلانے والا صحیح سلامت تھا۔ پیچھے بیٹھا گرگا تیورا کر سڑک پر آ گرا۔

میں جھپٹ کر اس کے قریب گیا۔ احتیاطاً میں اس کی طرف اپنا ہتھیار سیدھا کیے کیے ڈپٹ کے برمی میں بار بار کہتا بڑھ رہا تھا کہ ہلنا مت، اگر ہلے تو گولی مار دوں گا۔ ہلنا مت۔

یہ آدمی اپنی سکیورٹی والی وردی کے ساتھ ہوا یا موسم کی شدت سے بچنے کو یا پھر اپنی شکل چھپائے رکھنے کو اس طرح مفلر لپیٹے تھا کہ اس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔

وہ بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے دیکھا، اسے گولی نہیں لگی تھی۔ اس کی وردی بھی صحیح سلامت تھی۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ بھاری ریوالور قبضے میں کیا اور کالر پکڑ کر

اسے اٹھانے کے لیے زور لگایا، وہ صرف دہشت زدہ تھا اور ہوش میں تھا۔ کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اس کے چہرے سے مفلر سرک گیا۔ پورا چہرہ اب میرے سامنے تھا۔ یہ میرا جانا پہچانا دیکھا ہوا آدمی تھا۔ وہی نوجوان لڑکا جسے مونگ جو اپنا فرسٹ کزن کہتا تھا جو دراصل اس کا مالشیا تھا، کھسرے نے جس کا نام "کے کے" بتایا تھا۔

نوعمر "کے کے" نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔

"چپ بے! اگر رویا تو حلق میں ریوالور ڈال کے گولی چلا دوں گا۔" میں نے ڈرانے کو خطرناک لہجے میں یہ بات کہی۔ "کے کے" واقعی ڈر گیا۔ اس کا ساتھی اسے چھوڑ گیا تھا۔ موٹر سائیکل ہائی وے پر اتنی دور پہنچ گئی تھی کہ ہم تک اس کی آواز بہت دھیمی پہنچ رہی تھی۔

ان حد گاڑی کو درختوں کی اوٹ سے نکال کر میرے پاس لایا، اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

میں نے بتا دیا کہ ایک پرندہ اڑ گیا، ایک گرا لیا ہے۔ ڈالو اسے گاڑی میں۔

ان حد نے پوچھا "کیا مر گیا؟" میں نے کہا "نہیں نہیں۔ صحیح سلامت ہے۔"

ان حد اسے پہچان چکا تھا۔ ڈراما کر کے بولا "ویسے بھی نہیں بچے گا، گولی مار کے ادھر ہی سڑک پر پھینک دو۔"

نوجوان لڑکا پھر رونے لگا۔ میں نے ہلکا سا چپت لگایا۔ "چپ رہ، تو جانتا نہیں سردار جی مذاق کر رہا ہے۔"

ہم "کے کے" کو اور لی صاحب کو ان کی ولا میں لے آئے۔ چینی ہاؤس کیپر ایسی باصلاحیت عورت تھی۔ اس نے ڈاکٹر کے آتے آتے زخمی کو سنبھالا۔ ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے میں لی صاحب کے زخم کی بینڈیج کر دی اور کسی قسم کی سکون بخش دوا دے کر انہیں بستر پر پہنچا دیا۔

لی صاحب کے ریذیڈنٹ ڈاکٹر کو اس قسم کے "حادثوں" کا خاصا تجربہ تھا مگر حادثہ اس بار مالک کو پیش آیا تھا۔ اس بات سے ڈاکٹر کچھ پریشان ضرور ہو گیا تھا۔

ہاؤس کیپر اور ڈاکٹر کا خیال تھا کہ پولیس کو خبر کی جائے کیونکہ گولیاں چلی تھیں۔ اغوا کی ہوئی لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں اور تین قیدی ہماری تحویل میں تھے۔ ان حد کو کچھ اندازہ تھا کہ پولیس کو فوری طور پر بلانے میں میرے لیے کیا مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ اس نے کہا کہ پہلے ہم اور شیر خان قیدیوں اور اغوا کی گئی لڑکیوں سے باتیں کر لیں،

پھر جو کرنا ہوگا' کیا جائے گا۔

سب سے پہلے ان اجنبی لڑکیوں سے سوال و جواب ہوئے جنہیں مونگ جو کی تہہ خانہ جیل سے نکالا گیا تھا۔ دو لڑکیاں مشرقی پاکستان سے اغوا کی گئی تھیں اور مچھیروں کی بیٹیاں تھیں۔ ایک میزو قبائلی تھی۔ تینوں نو عمر اور اچھی شکل و صورت کی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ مونگ جو نے انہیں برما سے باہر فروخت کیے جانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ کسی قسم کے گروہ کے لوگ دھوکا دے کر' بہلا پھسلا کر ان معصوم لڑکیوں کو ان کے گھروں سے نکال لاتے تھے۔ مونگ جو نے لی صاحب کی اسٹیٹ کو ایک طرح کا ٹرانزٹ کیمپ بنایا ہوا تھا۔ اس عارضی کیمپ سے لڑکیوں کو بردہ فروشوں کی منڈی تک پہنچانا مونگ جو کی ذمہ داری تھی۔ اس کے بعد انہیں کہاں کہاں اور کس لیے فروخت کیا جائے گا' یہ کھسرے مونگ جو کا دردسر نہیں تھا۔ ایک بات طے تھی کہ بیچاری لڑکیوں کو مختلف چکلوں' عیاشی کے اڈوں کے لیے خریدا جائے گا۔ چینی ہاؤس کیپر ان بدنصیب (یا سمجھو اب نصیبوں والی) لڑکیوں کی حالت دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی تھی کہ روہانسی ہو گئی تھی۔

ان حد سنگھ نے اور میں نے لڑکیوں کو سرکاری تحویل میں دے دینے کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اب قیدی رہ گئے تھے۔ کے کے اور ان دوسرے دو بدمعاشوں سے ایک ایک لفظ اگلوانا ضروری تھا۔ ان حد سنگھ نے اور میں نے پہلے اس نقلی منگیش سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اور اس کے ساتھ گرفتار ہونے والا بدمعاش ہم پر حملہ آور ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ آسانی سے ان سے سچ اگلوانا ممکن نہیں ہوگا۔ میں ان حد سنگھ ترکھان کے طریقوں سے پوری طرح متفق نہیں تھا مگر ایک بات سمجھتا تھا کہ وقت بہت کم ہے۔ میں نے مجبوری میں سردار جی کو وہ کچھ کرنے دیا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔

کے کے اور نقلی ماما کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ تیسرا بدمعاش نہ صرف پیراک تھا بلکہ پیشہ ور غوطہ خور رہ چکا تھا۔

ہم صرف ماما اور کے کے کو کھینچتے ہوئے کنوئیں پر لے گئے۔ ان حد نے احتیاطاً ان کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا تھا تاکہ وہ شور نہ مچائیں اور زیادہ پانی پی لینے کے نتیجے میں مر بھی نہ جائیں۔ پھر اس نے انہیں انگوروں کے گچھے کی طرح رسی سے باندھ کے کنوئیں میں اتارنا شروع کیا۔ ظاہر ہے دونوں بدمعاشوں کے ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے گئے تھے۔

طریقہ وہی پرانا' خاصا سادہ اور وحشیانہ تھا۔ ان حد سنگھ انہیں پانی میں ڈبوتا تھا اور پہلے یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ ناک کے رستے تھوڑا سا پانی ان کے مغز میں پہنچ جائے۔ جب دونوں گرگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ بچتے نہیں' بس اب مرنے والے ہیں تو سردار جی انہیں کھینچ لیتا تھا۔ کنوئیں کے باہر انہیں کیچڑ مٹی میں پھینک دیا جاتا تھا اور ٹیپ کھول کر پوچھا جاتا تھا کہ ہاں بھئی ہم سے بات کرنے کے موڈ میں ہو؟

باہر نکالے جانے پر ماما نے دو مرتبہ تو بہت بکواس کی گالیاں دیتا رہا مگر ایک بار جب اس اکیلے کو ان حد نے ضرورت سے زیادہ دیر پانی میں روکے رکھا تو موت سامنے دیکھ کے گھگیانے لگا۔ بولا کہ ہاں سب کچھ بتا دوں گا۔

اسے نرم کرنے کے بعد "سوکھنے کو" ایک الاؤ سا جلا کے اس کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ اب پھر کے کے کی باری تھی۔ وہ تمام عرصے گھگیاتا رہا تھا۔ اس پر ان حد سنگھ نے اسے خبردار کرنے کو کچھ زیادہ ہی دیر ڈبوئے رکھا جس سے کے کے کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے لرزہ چڑھ گیا تھا۔ میں نے ان حد کے "چنگل" سے اسے بچا لیا۔ کچھ زبانی ہمدردی کی اور لے جا کے الگ کمرے میں کمبل میں لپیٹ دیا اور پھر جو کے کے سے میں نے پوچھ گچھ کی تو بہت مفید نتائج نکلے۔

تیسرے بدمعاش کے لیے کنوئیں کی ٹیکنک کچھ زیادہ موثر نہیں ہوئی' اس لیے اسے آگ کے پاس لے جایا گیا جہاں ماما جی پڑا سوکھ رہا تھا۔

یہ بدمعاش ماما کا پرانا واقف کار تھا۔ مامے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ غوطہ خور ہے۔ پانی سے نہیں ڈرتا مگر آگ سے اس کی روح فنا ہوتی ہے۔ بچپن میں اس کے گھر میں آگ لگی تھی۔ یہ جلتے ہوئے کمرے میں کچھ دیر بند رہا تھا تو آگ کی دہشت اس کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے یہ شخص سگریٹ بیڑی کچھ نہیں پیتا۔ ان حد نے یہ معلوم کر کے خوشی ظاہر کی تھی۔ کہا تھا کہ ایسے بندے مجھے "چنگے" لگتے ہیں جو تمباکو سے دور رہیں۔

مگر اس غوطہ خور بدمعاش کو ان حد نے آگ سے دور نہیں رکھا بلکہ دیکھا جائے تو اسے مامے کے برابر الاؤ میں تقریباً گھسا کے لٹکا دیا۔ لکڑیاں چٹختی اور چنگاریاں اڑتی تھیں تو غوطہ خور بدمعاش کی حالت بری ہو جاتی تھی۔

مختصر یہ کہ ان حد کے حصے میں ماما اور غوطہ خور آئے تھے۔ کے کے' میرے حوالے ہوا تھا۔ میں نے سر سہلا کے اس سے بہت کچھ بلکہ سب کچھ معلوم کر لیا۔ مامے

اور غوطہ خور کو بہت زیادہ تو نہیں معلوم تھا مگر وہ دونوں جتنا کچھ جانتے تھے' انہوں نے اگل دیا۔

کے کے موتگ جو کا رشتے دار تھا۔ وہ اس کی شبانہ مصروفیات کا ساتھی بھی تھا۔ کسی خلاف فطرت سرگرمی میں دونوں ملوث ہو گئے تھے تو یہ بات موتگ جی کو ٹھیک ٹھاک لگتی تھی۔ کے کے' کو برابر الجھن رہتی تھی اور ایک طرح کا احساس جرم موجود رہتا تھا وہ جلد از جلد موتگ جو سے دور رنگون پہنچنا چاہتا تھا مگر کھسرا اسے ٹال مٹول کر کے روک لیتا تھا اور اب وہ' کے کے' سے فائرنگ کرا کے اور بقول کے کے' اسے کیس میں پھنسا کے خود نکل گیا تھا۔ اس بات پر کے کے' کو بہت غصہ تھا۔

میں نے زبانی ہمدردی کر کے اور ان حد سے اس کا پیچھا چھڑا کے نوجوان' کے کے کو گویا رام کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ ہمارے قیدیوں میں سے صرف کے کے ہی کو وہ جگہ معلوم تھی جہاں میرے بابا صمد بنگش صاحب کو لے جایا گیا تھا۔ کے کے نے وعدہ کر لیا اور مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اگر میں اسے پولیس میں نہ دوں اور موتگ جو کے گینگ سے بھی اسے بچا لوں تو وہ مجھے رنگون شہر میں وہاں پہنچا سکتا ہے۔ جہاں لی کی ولا سے لے جا کر میرے بابا کو رکھا گیا تھا۔ یہ سودا میرے لیے بھی فائدہ مند تھا اور کے کے' کے لیے بھی۔ مگر یہ سودا مہنگا پڑ سکتا تھا کیونکہ موتگ جو کے وہ دونوں گرگے کے کے سے شروع ہی سے حسد رکھتے تھے۔ کچھ موتگ جو کی قربت کی وجہ سے کچھ' اس وجہ سے کہ کے کے کو بہت سی وہ اندر کی باتیں معلوم ہوتی تھیں جو ان گرگوں سے پوشیدہ رکھی جاتی تھیں۔ اب ہم نے بھی کے کے سے امتیازی سلوک کیا تھا۔ اسے ان دونوں سے الگ رکھا تھا' اس بات سے وہ اور تپ گئے تھے۔ اسی لیے ان حد سنگھ نے اور میں نے اپنے تینوں قیدیوں کو پھر اکٹھا نہ ہونے دیا۔

طے یہ ہوا کہ ان حد سنگھ دونوں لڑکیوں رشنا اور روکسانہ کو سرکس گراؤنڈ پہنچا دے گا۔ روکسانہ کا باپ سانپوں کا بادشہ مقامی پولیس اور سرکس کی انتظامیہ کو لے کر دور دور ٹمبر جائیدادوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اس کی پریشانی دور کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے طے ہوا تھا کہ ان حد سنگھ پولیس کو مطلع کرے اور لڑکیوں کو پہنچائے۔ رشنا کی حالت ذرا بہتر ہوئی تھی تو اس نے میرے ساتھ رنگون جانے کی ضد شروع کر دی تھی مگر ان حد نے اور میں نے اسے راضی کر لیا تھا کہ جب تک میں اپنے بابا کا پتا لگا کے ان سے مل کے رنگون سے نہیں لوٹتا ہوں' وہ روکسانہ کے ساتھ سرکس ہی

میں رہے گی۔ پھر میں آ کر اسے جہاں بھی کہے گی' لے جاؤں گا۔

کیونکہ میں پولیس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا' اس لیے میں نے خود کو اور موتگ جو کے مالشیے کزن کے کے کو اس پوری داستان سے نکلوا دیا تھا۔ کوئی بھی اب ہمارا ذکر نہیں کرے گا۔ ان حد سنگھ نے اپنی جیپ راشن پانی کے ساتھ میرے حوالے کر دی تھی۔ پولیس کو وائرلیس کر دیا گیا تھا کہ لڑکیاں مل گئی ہیں اور موتگ لی صاحب کی ٹمبر جائیداد میں ایک جرائم پیشہ گروہ پکڑا گیا ہے۔ ان حد سنگھ موتگ جو کھسرے کے دونوں ساتھیوں کو لی صاحب کی سکیورٹی کی تحویل میں گیٹ آفس کے برابر کمرے میں بند کر کے میرے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ کہنے لگا "آج توں بعد فیر رنگون اچ ساڈی ملاقات ہونی ہے......رب کرے گا تو۔"

ان حد اس وقت اچھے موڈ میں تھا کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق اس کی دلدار چینی ہاؤس کیپر پہلی وِیری' اس کی دلداریاں کر رہی تھی۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں کھانے کی چیزیں نکال نکال کے دے رہی تھی۔ وہ شاید اس لیے زیادہ مہمان نوازیاں کر رہی تھی کہ میز پر اس کے باس لی صاحب کی کمی کوئی تو پوری کرتا۔

میں نے کھاتے اور پیتے ہوئے ان حد کو اتنا مگن کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن نہیں...... پیتے ہوئے تو وہ کہیں زیادہ مگن ہو جاتا تھا۔

ایک بار ہاؤس کیپر نے میری اور ان حد کی کرسیوں کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر چاندی کے بڑے چمچے پر لایا گیا پنیر کا گرما گرم پکوڑا ان حد کی پلیٹ میں رکھا تو بظاہر پکوڑے کی تلن کی خوشبو سے مست ہو کے مگر اصل میں ہاؤس کیپر کو ستانے کے ارادے سے ان حد نے لمبی سی آ آ آہ کی اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے آیا ہوا ہاؤس کیپر کا بازو تھام لیا۔ لگا تعریفوں کے پل باندھنے کہ آہاہا' یہی وہ ہاتھ ہے جو ایسی لذیذ نعمتیں تیار کرتا ہے۔ واہ کیا ہاتھ ہے اور دھیرے دھیرے گنگنانے بھی لگا کہ "تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔"

ہاؤس کیپر پہلے تو مسکراتی رہی' پھر بولی "میرا ماسٹر میز پر نہیں ہے' اس لیے میں مہمان کو زیادہ توجہ دے رہی ہوں۔ یہ میری ڈیوٹی ہے مگر شاید یہ بات مہمان کے نوٹس میں نہیں آئی ہے۔"

ان حد بولا "میرے نوٹس میں تو بس ایک ہی بات آئی ہے کہ انکل لی سامنے ہوتا تو میرا معشوق مجھ پر زیادہ توجہ نہیں کرتا۔"

چینی ہاؤس کیپر اسی طرح رکی کھڑی تھی' ہنس کے بولی "اچھی ہاؤس کیپر زیادہ توجہ اپنے مال کو دیتی ہے۔"

ان حد کہنے لگا "تمہارا مالک تو میں کبھی نہیں بن سکتا' ناں ناں اس جنم میں تو ممکن نہیں ہے۔ ہاں تم میری مالک بن سکتی ہو تو بن جاؤ......"

وہ کیا کہتی' خوش مزاجی سے ہنستی رہی۔

ان حد بولا "کیا کہتی ہو؟ میرا یار شیر کھان بھی سامنے بیٹھا ہے۔ اس کی گواہی میں ہو جائے جو شادی کا نٹریکٹ وی ہونا ہے۔"

ہاؤس کیپر نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان حد کے قابو سے نکال لیا۔ اداسی سے بولی "مسٹر سنگھ! اتنی سیریس اور برکت والی بات کو آپ اس طرح سرسری مذاق میں کہہ دیتے ہو...... میں الجھ جاتی ہوں کہ سچ کیا ہے اور مذاق کہاں سے شروع ہوتا ہے۔"

میں نے دیکھا سنجیدگی سے کہی گئی اس بات کا ان حد پر اثر ہوا ہے۔ اس کا کھلنڈرا پن جیسے ایک دم ختم ہو گیا۔ وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا اور برابر میں کھڑی ہاؤس کیپر کے چمکیلے سیاہ اور سیدھے بالوں پر ہاتھ رکھ کے بولا "یہ آخری بات جو میں نے کہی' واہگرو کی قسم مخول میں نہیں تھی۔ میں اکیلے رہتے رہتے اور 'غیر ذمہ داری' کے ساتھ رہتے رہتے بیزار ہو گیا ہوں۔ تیری قسم ہے! اگر کبھی تیرے پلان میں شادی بھی شامل ہو جائے تو بی بی! میری درخواست پر غور کرنا۔"

ہاؤس کیپر ان حد کے سنجیدہ لہجے کی سچائی پہچان کر مسکرائی۔ اس نے چاندی کا چمچہ میز پر رکھ دیا اور ہاتھ بڑھا کر ان حد سنگھ کا شانہ چھوا۔ یہ کوئی بہت اپنائیت کا اشارہ ہو گا جس سے چین کے اس علاقے کے لوگ مخاطب تک اپنی بات پہنچاتے ہوں گے۔ وہ اس کا شانہ چھوتے ہوئے دھیرے سے بولی "میں تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں مسٹر سنگھ!"

ان حد نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پنجابی میں سوال کیا "ہالا؟"

ہاؤس کیپر لہجے سے سمجھ گئی کہ ان حد نے کیا کہا ہے' اس نے مسکرا کے ہاں میں سر ہلایا۔

ان حد نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھینک کے نعرہ لگایا "جو بولے سو نہال!" پھر خود ہی اپنے نعرے کے جواب میں نعرہ لگایا "ست سری اکال!"

ہاؤس کیپر مسکراتی ہوئی جانے کو مڑی ہو گی کہ ان حد سنگھ ترکھان نے اس کی

کلائی تھام لی' بولا "ایسے نہیں جانے دوں گا' ہاں کر کے جاؤ اور شادی کی ڈیٹ دیو۔ کم آن! میرے یار کے سامنے تاریخ دو۔"

ہاؤس کیپر مسکراتے ہوئے ہاتھ چھڑا رہی تھی۔ وہ مجھ سے بھی شکایت کرنے لگی کہ دیکھئے مسٹر کھان یہ پھر نان سیریس (مطلب غیر سنجیدہ) ہو رہا ہے۔" ابھی میں نے اپنے دوست کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا کہ مین گیٹ کی سمت سے تڑتڑ گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ان حد اور میں کھانے کے کمرے سے دیوانہ وار باہر کی طرف دوڑے۔

لان پر نکلے تو ہم نے دیکھا برمی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی دو گاڑیاں گیٹ کے عین سامنے کھڑی ہیں اور چھ سات پولیس والے اپنی گاڑیوں کی اوٹ لیے سڑک پر کسی موونگ ٹارگٹ (مطلب حرکت کرتے ہدف) پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا ابھی تو وائرلیس کیا تھا' یہ پولیس والے اتنی جلدی کیسے آ گئے؟

ہمیں آتا دیکھ کے ایک پولیس والے نے ہاتھ ہلائے اور پکار کر کہا "تمہارے دونوں قیدی بھاگ رہے ہیں' اندر جاؤ اندر' تم لوگ اندر جاؤ۔"

ان حد سنگھ نے مجھے واپس ولا کی عمارت میں دھکا دیا' وہ بولا "پولیس والوں کے سامنے مت آؤ شیر کھان' اندر رہو اور ابھی نکلنے کی بھی کوشش مت کرنا' انہیں بلاوجہ شک ہو جائے گا۔ پھر یہ نکلنے نہیں دیں گے۔"

ٹھیک تو ہے' مجھے ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔

میں ولا میں آ گیا۔ ہاؤس کیپر کو بلا کے پھر یاددہانی کرنا' سمجھانا ضروری تھا۔ کہیں وہ بے دھیانی میں پولیس والوں کے سامنے میرا ذکر نہ کر بیٹھے۔ میں نے نوجوان کے کے کو اپنے ساتھ لیا اور بالکنی میں ایک اسکرین کی اوٹ لے کر ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ انتظار کرنے لگے کہ کب پولیس والے ٹلتے ہیں اور میرے رنگون کی طرف نکلنے کی راہ کب کھلتی ہے۔

پہلی بار کے بعد گولیاں نہیں چلیں۔ پولیس والوں نے فراریوں کو پکڑ لیا ہو گا۔ کم سے کم آدھے گھنٹے تو ولا میں ضرور رکیں گے۔ ابتدائی بیانات لیں گے اور تفصیلی بیانات کے لیے یہاں کے لوگوں کو پابند کریں گے کہ وہ فلاں اسٹیشن پر آکر تفتیش میں مدد کریں اور جب تک اجازت نہ ملے' کہیں نہ جائیں وغیرہ وغیرہ۔

کوئی ایک گھنٹہ ہم بالکنی کے اسکرین کی اوٹ میں بیٹھے رہے' کے کے اونگنے

لگا۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی' ہم دونوں اگر یہاں سے جلدی روانہ نہ ہو پائے تو رنگون جانے والے راستے ہمارے لیے مخدوش ہو جائیں گے۔

پورا سوا گھنٹے بعد نیچے ہال میں لوگوں کی تیزی سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ میں نے بالکنی کی ریلنگ پر سے ذرا سا سر نکال کر جھانکا' چار پانچ پولیس والے زیادہ تر افسر لوگ' کھسرے کے منہ بولے ماما اور دوسرے بد معاش کو رسیوں میں جکڑے ہال میں لے آئے تھے اور لی صاحب کے قیمتی قالینوں اور صوفوں کی ایسی تیسی کرتے ہوئے خود بھی آ کے جم گئے تھے اور انہوں نے اپنے دونوں قیدیوں کو بھی بٹھا لیا تھا۔ ان حد سنگھ اور ہاؤس کیپر قیدیوں' پولیس والوں کے پیچھے پیچھے آئے اور بیٹھ گئے۔ ایک ہی جھلک کافی تھی' مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ان حد اور چینی ہاؤس کیپر پولیس والوں سے خفا ہیں اور انہیں اور ان قیدیوں کو کہیں اور بٹھانے میں کامیاب نہ ہونے پر جھنجھلا رہے ہیں۔ بمشکل دو منٹ اور یہ جھک جھک چلی ہو گی' پھر دنیا بھر کے پولیس والوں کی طرح ان برمی پولیس افسروں نے بھی دھونس اور ہٹ دھرمی سے کام لیا' جم کے وہیں بیٹھے رہے اور ہاؤس کیپر کو یاد دلانے لگے کہ لی صاحب کی جائیداد میں آنے والوں کی ہمیشہ تواضع کی جاتی ہے۔ جاؤ ہمارے کھانے پینے کو کچھ لاؤ۔

ہاؤس کیپر کو میں اب جھانک کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ چلی گئی تھی مگر اس کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ غصے میں بھری ہوئی گئی ہے۔ ان حد کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اور کے کے بالکنی کے اسکرین کی اوٹ میں بیٹھے ہیں۔ اس نے اونچی آواز میں پولیس والوں سے کہا کہ اگر وہ قیدیوں کو اپنے پولیس اسٹیشن لے جا کر جلد از جلد لاک اپ میں "جمع" کرا دیں گے تو یہ سب کے لیے بہتر ہو گا۔ لی صاحب کے لیے خاص طور پر کیوں کہ وہ بیمار آدمی ہیں اور پولیس والے جہاں آن جمے ہیں' اس جگہ سے لی صاحب کا بیڈ روم اتنی دور ہے کہ ان کے کھانسنے کی آواز یہاں سنائی دیتی ہے۔

ایک پولیس والے نے بہت اطمینان سے جواب دیا کہ سنگھ صاحب فکر نہ کریں' لی صاحب کی کھانسی کی آواز سے ہمارے سرکاری کام میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔

ان حد کو طرارہ آ گیا' اس کی تیکھی آواز سنائی دی۔ "مجھے جناب کے سرکاری کام کے حرج کی کوئی فکر نہیں' مجھے اپنے دوست کے آرام کی فکر ہے۔ اگر آپ لوگ کو اسی جگہ بیٹھ کر میٹنگ کرنا اچھا لگتا ہے تو پھر اس میٹنگ کو شارٹ (مطلب مختصر) کیجیے..... سمجھے جناب؟"

دوسرے افسر نے جو آواز سے سب کا سینئر اور کچھ سمجھدار لگتا تھا' کہا "سنگھ صاحب! سوری سر ان دو قیدیوں سے ابتدائی پوچھ گچھ کرتے ہوئے ہمیں ایسی ضروری معلومات حاصل ہوئی ہیں جو ہم لی صاحب کے اسٹاف کے سامنے دہرا نہیں سکتے تھے...... یہ جگہ الگ تھلگ ہے' اس لیے ہم قیدیوں کو یہاں لائے ہیں۔ آپ میرے اسسٹنٹ کی بات کا برا نہ منائیں۔ ہم لی صاحب کو بے آرام نہیں کریں گے۔"

ان حد بولا "قیدیوں سے آپ کو کیسی معلومات حاصل ہوئی ہیں؟"

"عرض کرتے ہیں..... پہلی بات سنگھ صاحب! آپ سے یہ پوچھنی ہے کہ کیا اس وقت یہاں مونگ لی ولا میں آپ کا کوئی پاکستانی دوست شیر خان موجود ہے؟"

"شیر خان؟" انحد نے بہت معصومیت سے سوال کیا "شیر خان گجر کو تو نہیں پوچھتے ہو؟ وہ پچھلے سال سردیوں میں میرے پاس رہنے آیا تھا۔"

افسر ہنسا "شیر سنگھ نہیں' سنگھ صاحب! میں شیر خان پاکستانی کو پوچھتا ہوں جو دوست ہے آپ کا۔"

"دیکھیں جی۔" سردار جی نے بے مروتی سے کہا۔ "پاکستانی مجھے اچھے لگتے ہیں جی..... بہت سے میرے دوست وی ہیں۔ ادھر یو کے میں' لندن کے ساؤتھال محلے میں پاکستانیوں سے بڑی دوستیاں محبتاں ہیں میریاں..... پر شیر خان گجر کوئی دوست نہیں میرا۔"

افسر بولا "سوچ لیجیے..... ویسے نام آپ نے درست نہیں لیا ہے۔ آپ کے دوست کو شیر خان بنگش کہتے ہیں' گجر نہیں ہے وہ۔"

"بھاویں گجر ہو جی بھاویں بنگش ہو' آپ کو میں نے بتا دیا کہ شیر کھان نام کا کوئی دوست نہیں میرا۔"

"جھوٹ بولتا ہے سالا۔" کسی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی زبردست طمانچے کی آواز آئی۔

پولیس والے نے برمی زبان میں گالی دے کر شاید بولنے والے کو طمانچہ مارا تھا۔

ان حد سنگھ نے خوش دلی سے کہا "تھینک یو جی! یہ چنگا کیا جو آپ نے اس سالے مامے کو چماٹ ماری۔ ذرا وی دیری ہو جاتی تو میں نے اسے چماٹ مار دینی تھی۔ پر میری چماٹ کوئی بہت ہی ہیوی ویٹ ہونی سی کیونکہ جی یہ کتا بہت گندے منہ کا ہے۔"

افسر بولا "یہی تو کہہ رہا ہے کہ آپ نے اور آپ کے اس دوست شیر خان نے اسے ٹارچر کیا تھا۔ مطلب کنوئیں میں رسی سے باندھ کے ڈالتے نکالتے رہے تھے۔"

"ہاں جی۔" سردار بولا "بے شک جی کنوئیں میں ڈال ڈال کے اس سے پوچھ گچھ بے شک کی ہے میں نے اور یہ ضروری تھی۔"

"آپ کے دوست نے بھی پوچھ گچھ کی ہے؟"

ان حد بولا "میرا دوست ادھر ہوتا تو ضرور میرا ساتھ دیتا۔ میں شیروں سے دوستیاں یاریاں کرتا ہوں جناب۔ جے شیر سنگھ ادھر ہوتا تو فیر اس نے وی ٹارچر کرنی تھی۔ انگلینڈ کی تعلیم شعلیم اپنی جگہ پر' اس نے مار مار کے دنبہ بنا دینا تھا اسے مگر میرا یار شیر سنگھ گجر ادھر نہیں تھا۔ اکیلے میں نے مار پیٹ کے پوچھ لیا جو پوچھنا تھا۔"

اب ایک دوسرے پولیس والے نے کہا "سنگھ صاحب! آپ یہاں کے پرانے معززین میں سے ہو......"

ان حد سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہمارے پنجاب میں معتبر کہتے ہیں۔ پنڈ کے لوگ جلدی میں موتبر بھی کہہ دیتے ہیں' پر بات ایک ہی ہے۔"

ایک دوسرے پولیسیے نے چڑ کے کہا' آپ بات کو گھمائیں مت۔"

یقیناً ان حد نے اس چڑچڑے کو گھور کے دیکھا ہوگا۔

مگر پھر لگا کہ سینئر پولیس والے نے جلدی سے حالات سنبھال لیے' بولا "سنگھ صاحب! یہ مونگ جو گینگسٹر کا آدمی کہہ رہا ہے' آپ نے ایک بدمعاش کو اور قابو کیا ہے۔ بتائیے مونگ جو کا وہ منظور نظر لڑکا "کے کے" کہاں ہے؟ ہم چاہتے ہیں آپ برمیز پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تعاون کریں جیسا کہ آپ جیسا معزز شہری ہمیشہ کرتا ہے۔ پلیز سر سنگھ صاحب!" کے کے" شیر خان مجھے ہر حال میں چاہئیں۔"

"یہ پریشانی کی بات ہے پلس افسر صاحب! آپ ابھی تک کسی شیر کھان کا کہتے رہے اور اب آپ کو وہ منجور نجر" کے کے وی درکار ہے۔ "کے کے" نام کا ایک ماشیا بے شک ادھر اسٹاف میں شامل تھا' وہ کدھر گیا' کدھر نہیں گیا' یہ آپ اسٹاف سے معلوم کرو۔ میں تو جی ادھر مہمان ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے۔"

پولیس والے کے لہجے میں اب دھمکی شامل ہو گئی تھی۔ "سنگھ صاحب! بات مختصر کریں جی۔ یہ آدمی ہمیں سب کچھ بتا چکا ہے۔ ادھر آپ کی قید میں وہ لڑکا "کے کے" بھی ہے اور آپ کے ساتھ جو ولا میں سویرے سویرے ادھر آیا تھا شیر خان' اسے

بھی آپ نے یہاں رکھا ہوا ہے۔ ہم آپ کو ساتھ لے کے ولا کی تلاشی کریں گے۔ دونوں آدمی ہمیں ملنا چاہئیں' یہ ایک طرح سے آپ کی ذمہ داری ہے۔"

ان حد نے انگریزی میں گالی دی اور غصے میں کہا "میں فون کر کے اپنے وکیل کو یہاں بلا رہا ہوں۔ آپ کی جاہلانہ باتوں اور دھمکیوں کا میرے پاس یہی جواب ہے کہ مجھ سے اب جو بھی بات ہوگی' میرے وکیل کے تھرو ہوگی۔ کچن میں جا رہا ہوں' ضرورت ہو تو وکیل کے آنے پر وہیں آ جانا۔"

پھر کسی طرح کی ہاتھا پائی کی آواز آئی۔ پولیس والے نے تکلیف کی آواز نکالی اور اس کے کسی ساتھی نے ایک دم چیخ کر کہا "ہینڈز اپ......!" اس نے شاید ان حد کو ہتھیار کی زد پر لے لیا تھا۔ میرا خیال ہے' اس دوسرے نے سردار جی کو روکنے کی کوشش کی ہوگی تو وہ چوٹ کھا گیا ہوگا۔

حالات ہمارے......بلکہ میرے خلاف جا رہے تھے۔ ان بدمعاش قیدیوں نے نہ صرف یہ کہ سب کچھ بک دیا تھا بلکہ پولیس والوں کو قائل کر لیا تھا کہ میں اور لڑکا "کے کے" ولا ہی میں موجود ہیں۔

میں "کے کے" کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا اسکرین سے ہٹا اور دبے قدموں بالکنی سے نکل آیا۔ آخری آواز جو نیچے ہال سے آ رہی تھی' پولیس افسروں کی آواز تھی۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا تھا کہ پوری جمعیت کو لے کر ولا میں پھیل جائیں اور شیر کھان اور کے کے کو تلاش کریں۔

کے کے کی سمجھ میں ابھی پوری طرح نہیں آیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ وہ نیند میں تھا۔ میں نے بالکنی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سن بھئی ہمارے لیے ولا کے پچھواڑے ایک جیپ تیار کھڑی ہے۔ اس میں پٹرول' راشن' کمبل سب کچھ ہے۔ چل پولیس پہنچنے سے پہلے پچھلے گیٹ سے نکل چلیں گے۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ پوچھنے لگا "کس کے حکم پر کس نے جیپ پیچھے والے گیٹ پر نکالی ہے؟"

میں نے کہا "سنگھ صاحب نے' میرے دوست سردار جی نے ولا کے ڈرائیور بنسی سے کہا تھا' اس نے اور ہاؤس کیپر نے سب تیاری کر کے جیپ پہنچا کے گیٹ کی اور گاڑی کی چابیاں مجھے لا دی ہیں۔ کیا بات ہے......؟ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے بھئی؟"

لڑکے کے چہرے پر پریشانی گہری ہو گئی۔ "بنسی ڈرائیور مونگ جو کا خاص آدمی ہے۔ یہ جو آدمی پکڑے ہوئے ہیں ناں...... ماما اور وہ دوسرا یہ دونوں تو کچھ بھی نہیں بنسی' ان کا باس ہے۔ اس کو مونگ جو کا آرڈر ہے کہ ادھر جبھی سب گڑبڑ ہو جائے تو آخر میں ولا کو آگ لگا کے نکل جانا۔"

لڑکا عجیب بات کہہ رہا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کا اعتبار کروں نہ کروں۔ وہ میرا تذبذب دیکھ کے بولا۔ آپ کو بعد میں سمجھا دوں گا۔ ابھی تو جو بتا رہا ہوں' اس کا یقین کرو۔ بنسی ایک حساب سے مونگ جو کا پارٹنر ہے۔ اسے مونگ جو روپے میں چار آنے منافع دیتا ہے۔ باقی ہم سب لوگ تنخواہ دار ہیں۔"

"کے کے" نے جس سیدھے لہجے میں یہ بات کہی تھی' اس سے تو یقین سا آ گیا' پھر بھی میں نے اطمینان کرنے کو پوچھ لیا۔ "تم نے پہلے بنسی ڈرائیور کا نام کیوں نہیں لیا تھا؟"

لڑکا سر کھجانے لگا۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ "بتاؤ' میری بات کا جواب دو۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ میرے ساتھ تم کوئی کھیل کھیلو۔ میں دھر لیا گیا تو تم بھی نہیں بچ سکو گے۔"

کے کے نے آہستہ سے کہا "یہ بنسی...... موسی کا بیٹا' میرا بھائی ہے۔ مونگ جو میرا کچھ نہیں' بنسی مجھے ادھر لایا تھا۔"

اوہو! یہ تو عجیب بات معلوم ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا "اب کیا ہو گا؟ تم کیوں اس کے خلاف ہو گئے؟"

"اس نے میرے ساتھ غداری کی ہے۔ مجھے مونگ جو کے پاس بیچ دیا ہے۔"

"ہاں۔" وہ شرما رہا تھا' بولا "مونگ جو جیسا دکھائی دیتا ہے' ویسا ہی ہے۔ وہ سارے ہی برے کاموں میں پھنسا ہے۔ اسی لیے تو مجھے خریدا ہوا ہے اس نے...... میں بیزار ہو گیا ہوں۔ اس کے ساتھ بدمعاشی کر کر کے تھک گیا۔ اس لیے نکل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ اگر رنگون چلنا ہے تو میری بات مان لو' پچھلے گیٹ پہ اس بنسی نے تمہارے مارنے کو بارود لگا دی ہو گی۔"

"بارود......"

"ہاں بنسی کو بم بنانا' آگ لگانا یہی سب کام آتا ہے۔ اس لیے مونگ جو اسے چھوڑ کے گیا ہے۔"

"واہ! یعنی جب سب کچھ ہاتھ سے جانے والا ہو گا تو یہ ولا کو آگ لگا دے گا؟"

کے کے نے زور زور سے ہاں میں سر ہلایا' بولا "سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ولا اب ان لوگوں کے کام کی نہیں رہی' آگ برابر لگانے کا ہے۔"

"اچھا تو بتاؤ۔ کیا کریں؟"

"نکلنے کا ایک راستہ ہے مگر وہاں پولیس پہنچ گئی ہو گی۔"

"نکلنے کی بات مت کرو۔ جب تک بنسی یہاں ولا میں ہے' ہم بھی یہیں ہیں۔"

"کیوں؟" لڑکا روہانسا ہو گیا۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں اب یہاں ایک سیکنڈ نہیں رک سکتا۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں پر جھپٹا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے اس کا کالر تھام لیا۔ "نہیں کے کے بیٹے! جب تک بنسی کا قصہ تمام نہیں کر لیتے' ہم دونوں کہیں نہیں جائیں گے......"

وہ بہت ڈرا ہوا تھا' ہکلانے لگا "مگر پولیس۔ پولیس تو ہم دونوں کو تلاش کر رہی ہے۔ چھوڑے گی نہیں۔"

میں نے اسے زوردار جھٹکا دیا۔ "ہم پولیس سے بچتے بچاتے اس بنسی کے پاس جائیں گے...... اب ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"مگر کیوں......؟" میں نے دیکھا' وہ کانپنے لگا تھا۔

"اس لیے کہ یہاں بہت سے لوگ ہیں جنہیں میں بنسی کے اور آگ کے حوالے کر کے نہیں جا سکتا۔"

"کک کون؟ کون لوگ ہیں...... تم کیوں بے کار کی باتیں کر رہے ہو۔ چلو نا یہاں سے۔"

میں نے اس کے سر پر ایک ہلکی سی دھول رسید کی۔ "میں نہیں جا سکتا' یہاں میرا دوست ہے ان حد سنگھ' میرے ساتھ آنے والی وہ لڑکیاں ہیں جنہیں تو نے چارے کی طرح استعمال کیا تھا اور ہمیں لمبے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ یہاں لی صاحب ہیں اور بہت سے بے قصور لوگ ہیں جنہیں ولا کے ساتھ جلنے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

کے کے بچے کی طرح ٹھنکنے لگا۔ وہ ڈر کے مارے اب باقاعدہ لرز بھی رہا تھا۔ میں نے جما کے اسے دو ہاتھ مارے اور پیچھے سے اس کی بیلٹ میں پنجا پھنسا کے اسے آگے کر لیا۔

"چلو بیٹا۔ اب اس سالے بنسی کو تلاش کرو اور آواز بالکل مت نکالنا' نہیں تو

میں مار ڈالوں گا۔"

ہم ولا کے گراؤنڈ فلور پر تھے۔ میں نے یہاں بہت کم وقت گزارا تھا۔ کے کے یہاں مہینوں سے رہ رہا تھا۔ یقیناً پوری طرح واقف ہو گا۔

میں نے کہا "کے کے! پہلے ہمیں بنسی کے کوارٹر میں لے کے چلو۔"

کہنے لگا "وہ کوارٹر میں نہیں' اس وقت گیراج میں ہو گا۔"

"گیراج چلو۔"

"گیراج میں پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوں گی۔ وہ جب بھی آتے ہیں' وہیں کھڑی کرتے ہیں۔ مفت میں آئل چینج کراتے ہیں اور سروسنگ کے چکر میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "پولیس والے سب جگہ ہیں۔ گاڑیوں کے پاس ہوئے بھی تو ڈرائیور ہی ہوں گے۔ ان سے میں نمٹ لوں گا۔"

"چلو۔" اس نے مری ہوئی آواز کہا "لیکن سمجھ لو' پولیس والے تو جو کریں گے سو کریں گے۔ بنسی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو وہ بس مجھے گولی مار دے گا۔"

میں نے کہا "تو نہیں چلا تو بس میں بھی تجھے گولی ہی ماروں گا اور کیا کرنا ہے......اس لیے چلتا رہ۔"

گیراج کی طرف جانے کے لیے برآمدے میں نکلنا ضروری تھا اور برآمدے کا مجھے یاد تھا کہ وہاں پتھر کے بھاری گملوں میں قطار سے انوکھے استوائی درخت سجے تھے۔ وقت ضرورت جن کی اوٹ لی جا سکتی تھی۔ برآمدے کی طرف ہال کے برابر سے ایک تنگ راستہ گزرتا تھا۔ میں کے کے کو بیلٹ سے پکڑے ہوئے ہال میں لایا جو اس وقت خالی تھا۔ اس تنگ راستے میں ہم تیزی سے گھوم رہے تھے کہ دھڑ سے کوئی سامنے آیا اور کے کے سے ٹکرا گیا۔ کے کے نے اور ٹکرانے والے نے ایک ساتھ خوف کی آواز نکالی تھی۔

مارے گئے' میں نے سوچا...... مگر وہ کوئی عورت تھی۔

اوہ! وہ چینی ہاؤس کیپر تھی' کہنے لگی۔ "تمہارے پاس ہی آ رہی تھی۔ چلو مسٹر سنگھ کچن میں ہے۔"

"ہم کام سے جا رہے ہیں۔ سنگھ سے کہو کچن سے پولیس کو دور رکھنا' ہم ایک کام کے آدمی کو پکڑ کے باندھ کے وہاں لا رہے ہیں۔"

"باندھ کے؟"

"ہاں۔"

"برآمدے کی طرف مت جاؤ' ادھر پولیس ہے۔"

"کتنے؟ کیا زیادہ آدمی ہیں؟"

"دو' تین۔"

"تم انہیں برآمدے سے ہٹا سکتی ہو؟"

ہاؤس کیپر نے پوچھا "کیسے ہٹاؤں؟"

"کچھ کرو...... ہم سامنے کے گملوں کی اوٹ لے کے انتظار کر لیتے ہیں' دو منٹ میں کچھ کر لینا' ٹائم نہیں ہے۔"

"اچھا۔" کہہ کے وہ ہمارے برابر سے نکلتی ہال میں پہنچ گئی۔ ہم برآمد کے سب سے پھیلے ہوئے جھاڑ کی اوٹ میں آ گئے۔ ہم نے دیکھا۔ تین پولیس والے کچھ دور برآمدے سے اتر کر لان پر آ رہے ہیں۔

میں کے کے کی بیلٹ تھامے دم سادھے گملے کی اوٹ میں جھکا ہوا تھا۔ کے کے سمجھو گملے کے گرد کنڈلی مار کے لیٹ گیا تھا۔ ہم نے ہاؤس کیپر کو دو منٹ دیئے تھے۔

پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ دو منٹ کتنے طویل ہوتے ہیں۔ دل دھڑک کے جا رہا تھا۔ اگر وہ تینوں پولیس والے لان کی طرف سے ٹہلتے ہوئے پھر برآمدے میں چڑھ آئیں تو ہم مارے جائیں گے۔ خبر نہیں ہاؤس کیپر نے کیا ترکیب سوچی ہے۔ بس سانس روک کے دعا پڑھتے ہوئے انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔

دو منٹ کب کے پورے ہو چکے تھے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کوئی فائدہ نہیں اور اس وقت جبکہ میں مایوسی میں گملے کی اوٹ چھوڑنے ہی والا تھا کہ اندر کسی بھاری برتن کے گرنے اور جھنجھناتے رہنے کی آواز کے ساتھ عورت کی چیخ سنائی دی۔ عورت نے برمی زبان میں فریاد بھی کی تھی کہ بچاؤ۔

لان کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آنے لگی۔

میں نے کے کے کی بیلٹ کو جھٹکا دیا۔ اب پولیس کے سپاہی لان کی طرف سے برآمدے میں آ رہے تھے۔ ہمیں ان کے اور اپنے بیچ گملے کی اوٹ رکھنے کے لیے حرکت میں رہنا ضروری تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے برآمدہ چڑھے۔ ہم گملے سے لپٹے لپٹے لان کی طرف کھسک گئے اور جیسے ہی تینوں ہال میں جانے کے لیے تنگ رستے کی طرف جھپٹے' ہم

دونوں بے آواز لان کے رخ کود گئے۔ "گیراج کی طرف چلو۔" میں نے کے کے کو پھر جھٹکا دیا۔

گیراج تک پہنچنے میں ایک منٹ لگا ہوگا۔ ہمارا یہ ایک منٹ سمجھو' گھاس پر نہیں برچھیوں پر دوڑتے صرف ہوا۔ بارہ چودہ برس کے ایک لڑکے نے مجھے اور کے کے کو بھاگتے دیکھا۔ وہ شاید گھاس پر سے پتے سمیٹ رہا تھا۔ کے کے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے نے سمجھداری سے اثبات میں سر ہلایا۔

"مالی کا اسسٹنٹ ہے۔ یہ کسی سے نہیں کہے گا۔"

گیراج میں گھستے ہی ہمیں ایک پولیس والا نظر آیا۔ وہ اپنی سرکاری گاڑی کا بونٹ اٹھائے نئے ٹن سے دھار باندھ کر انجن میں تیل ڈال رہا تھا۔ اتنے انہماک سے وہ اپنے کام میں لگا تھا کہ ہم تقریباً اس کی ناک کے نیچے سے گزر کر گیراج میں پہنچ گئے۔

میں نے اپنا ہتھیار فائر کے لیے تیار کر لیا۔

اندر شاپ سے ہتھوڑا چلانے کی آواز آ رہی تھی۔

کے کے نے اشارہ کیا یعنی اس طرف بنسی ہوگا۔ میں کے کے کی بیلٹ میں ہاتھ پھنسائے سکون سے شاپ میں داخل ہو گیا۔

دوسرا پولیس والا یہاں اندر مصروف تھا۔ وہ ایک چپٹا دھات کا ٹکڑا بلاک پر رکھے ہوئے تھے اور اوور آل پہنے ایک مستری سا آدمی جس کا بعد میں پتہ چلا کہ یہی بنسی ہے' دھات کے اس ٹکڑے کو ہتھوڑے سے کوٹ کوٹ کے سیدھا کر رہا تھا۔

ہمارے داخل ہونے پر پولیس والے نے سر اٹھا کے دیکھا اور کوئی خاص توجہ دیئے بغیر پھر سر جھکا لیا۔ بنسی نے سر اٹھا کے دیکھا' اس کا ہتھوڑے والا ہاتھ میکانیکی انداز میں چلتا رہا۔ اس نے کے کے کو اور مجھے دیکھا اور ہمیں وہاں دیکھ کے حیرت اور خوف میں اس کا ہاتھ بہک گیا۔ ہتھوڑے کی پوری ضرب پولیس ڈرائیور کے ہاتھ پر پڑی اور اس نے ڈکراتے ہوئے تکلیف کی آواز نکالی بلکہ ٹھیک ٹھاک چیخ ماری۔

باہر سے آئل ڈالنے والے پولیسیے کی آواز آئی "ارے کیا ہاتھ توڑ لیا تو نے؟"

میں نے جواب میں کہا "ہاں۔ ذرا ادھر آنا۔" میں نے اپنے ہتھیار کا رخ بنسی اور ہاتھ کی چوٹ کھائے آدمی کی طرف رکھا تھا۔ وہ بھی اب تک سمجھ چکا تھا کہ ہم کون ہیں۔

آئل کا ڈبا اٹھائے پہلا پولیس والا آیا تو میں نے اسے بھی اپنی ہینڈ گن کے

اشارے سے بنسی کے اور دوسرے کے پاس کھڑا کر لیا۔

بنسی نے ایک بار اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ ہم وہی دونوں ہیں جنہیں وہ لوگ تلاش کر رہے ہیں مگر جب میں نے اس کی پنڈلی پر اپنے جوتے کی ٹو سے ایک بھرپور ضرب لگائی اور اسے چپ رہنے کا مشورہ دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔

کے کے اپنے رشتے کے بھائی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ بنسی بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کی اصلیت مجھ پر کھل چکی ہے۔ ضائع کرنے کو وقت نہیں تھا۔ سب سے پہلے میں نے قریب کھڑے بنسی کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے کی ضرب لگائی' ساتھ ہی اس آئل چور پولیس والے کے سر پر اپنی ہینڈ گن کی نال سے چوٹ دی۔ دوسرا پولیس والا اب تک ہاتھ کی تکلیف میں باؤلا ہو رہا تھا۔

اس اچانک حملے کے مطلوبہ نتائج نکلے۔ بنسی تکلیف میں دہرا ہو گیا۔ اس کا سر میرے سامنے اس طرح جھک آیا کہ جیسے کوئی خوشامدی درباری بادشاہ کو سلامی پیش کر رہا ہو۔ میں نے سیدھے کھڑے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب بنسی کی گردن پر لگائی' وہ سکون سے لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب کچھ دیر کے لیے وہ خطرے کا باعث نہیں رہے گا۔ میں نے گن کی چوٹ سے چکراتے ہوئے پولیس والے کے پیچھے جا کر دیسی پہلوانی داؤ لگاتے ہوئے ہتھولے چڑھا دیئے یعنی اس کی بغلوں سے ہاتھ نکال کر اپنے پنجوں کو اس کی گردن پر جمایا اور الجھا لیا۔ وہ گالی بک بک کے ہتھوڑے کی چوٹ والے سے کہہ رہا تھا کہ "مار اس کو......اس کو پکڑ لے۔ مارنا سالے کھڑا کیا ہے؟"

تکلیف کے باوجود پولیس والے نے میرے گھٹنے پر ٹھوکر ماری جو خاصی کارآمد رہی مگر میں جھیل گیا۔

بنسی اور ایک پولیسیے کے خلاف میری کارروائی کا کے کے نے اچھا اثر قبول کیا تھا۔ میں نے جب کہا کہ "ہتھوڑے کی چوٹ والے کو سنبھال" تو کے کے نے میری ترکیب پر بے ڈھنگے پن سے سہی مگر فوری عمل کیا اور پولیس والے کے پیٹ کے نیچے گھٹنا مار کر اسے لٹا دیا۔

اب صورتحال سو فیصد ہمارے حق میں تھی۔ بنسی بے ہوش تھا۔ دونوں پولیس والے تھے تو اپنے پیروں پر کھڑے مگر ایک تکلیف میں تھا اور دوسرا میرے داؤ کے پھندے میں فی الحال بے بس تھا۔

میں نے کے کے سے کہا' ہتھوڑے کی چوٹ والے کو خالی مت چھوڑ' اس کو

بے بس کر دے۔ لڑکے کی سمجھ میں کچھ آیا' کچھ نہیں آیا۔ تاہم اس نے تکلیف میں جھکے ہوئے زخمی پولیس والے کو اس کے چہرے پر گھٹنے کی ایک اور چوٹ لگا کر گرا دیا اور اس پر سوار ہو گیا۔

میرے بالکل سامنے پرانے ٹائروں کا کیبن یا سمجھو مرغی ڈربہ سا تھا۔ میں نے اپنے بے بس کیے ہوئے سرکاری آدمی سے جان چھڑالی۔ اسے پوری طاقت سے اس کیبن میں پھینک دیا۔ دیسی داؤ کھلتے ہی میرا مخالف بپھرے ہوئے آزاد بیل کی طرح مجھ پر حملہ کرنے کو اٹھا مگر ٹائروں کے اسٹور میں وہ اس زور سے گرا تھا کہ توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا اور لڑھکتے ٹائروں پر پھسل کر لمحے بھر کے لیے بے بس ہو گیا تھا۔ میں نے اسٹور کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ بند کیا اور تالے کی چابی گھما دی۔ جب تک پولیس والا خود کو ٹائروں سے آزاد کرتا' چابی میری جیب میں تھی۔

پولیس والے نے اپنی دیہاتی برمی زبان میں بکتے جھکتے ہوئے جیسے پورا ولا سر پر اٹھالیا۔ وہ اپنے افسروں' ساتھیوں کو نام لے لے کے پکار رہا تھا۔

میں نے سوچا' اگر ایک منٹ اور یہ اسی طرح چیختا رہا تو سب پولیس والے ادھر ہی دوڑ آئیں گے۔

کونے میں چار گیلن والا ایک ڈبہ رکھا تھا۔ میں نے وہ جھپٹ کے اٹھالیا۔ ڈھکن کھول کے سونگھا' پٹرول تھا۔ میں نے سلاخوں کے پار شور مچاتے' بکواس کرتے پولیس والے کو نشانہ بنایا اور ٹن کا آدھا پٹرول اس پر پھینک دیا۔

"کے کے! اپنی جیب سے ماچس تو نکال ذرا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا سگریٹ بیڑی بھی پیتا ہے۔

پٹرول کی بو سونگھتے ہی ماچس کا نام سنتے ہی اندر ٹائروں پر پڑے شور مچاتے پولیس والے نے دم سادھ لیا۔ ایسا لگتا تھا اس کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔

کے کے نے زخمی پولیس والے پر بیٹھے بیٹھے اپنی جیب سے ماچس نکال کر بجائی تو میں نے اس کی طرف توجہ کی۔

"لو سر! ماچس لو۔" یہ کہتے ہوئے کے کے کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

میں نے ماچس کی ایک تیلی نکالی۔ ٹائروں پر بیٹھے پٹرول میں بھیگے پولیس والے کو ماچس اور تیلی دکھا کر ایسا اشارہ کیا جیسے کہ میں ماچس بس جلانے ہی والا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑے تھا اور مردہ پولیس والے کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ میری طرف دیکھ کے

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو وہ زور زور سے ہاں میں سر ہلانے لگا۔ اس کے ہاتھ اسی طرح خوشامد میں بندھے ہوئے تھے۔

اب تک ایک اسکیم میرے ذہن میں پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

بنسی بے ہوش تھا۔ وہ کروٹ بدلتے ہوئے ایک بار کراہا بھی تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ تین چار منٹ وہ اور اسی طرح پڑا رہے گا۔ سامنے کے کے پولیس والے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ میں نے جیب سے اپنی ہینڈ گن پھر نکالی۔ "کے کے! بچے اس گدھے پر سے اب اٹھ جاؤ' مجھے اس سے بہت کام لینا ہے۔"

کے کے اٹھا تو الجھے دماغ کے پولیس والے نے سر جھٹک کے اپنے پٹرول میں بھیگے ساتھی کو دیکھا' پھر ہمیں دیکھا' بولا "تم دونوں بچ نہیں سکتے حرامی۔"

وہ ابھی تک فرش پر بیٹھا تھا۔

میں نے ہینڈ گن اس کی صورت کی طرف سیدھی کر لی اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

کے کے' اپنے کزن بنسی کو کسمساتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ ابھی دو منٹ اور سوئے گا۔ اس کی فکر مت کرو......اس پولیس والے دوست کو کھڑا کرو' مجھے کچھ دیر کے لیے اس کی وردی چاہیے۔"

"وردی؟" کے کے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میں نے کہا "ہاں اس کی کینچلی......کچھ دیر کے لیے۔ مجھے اس کے یہ گندے کپڑے ادھار لینا ہیں۔"

کے کے سمجھ کے مسکرانے لگا۔ پولیس والے نے سمجھ کے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ میں اتنی دیر اس کی طرف اپنی ہینڈ گن سیدھی کیے رہا جتنی دیر کے کے اسے اس کی وردی سے آزاد کرتا رہا۔ وردی زیادہ میلی نہیں تھی۔ اندر پہنا ہوا بنیان اور انڈر ویئر بہت میلا تھا۔

کے کے اس سے وردی لے کے ہٹا تو پھر وہ بک بک کرنے لگا۔ میں نے ٹن کا باقی پٹرول اچانک اس پر انڈیل دیا۔ برمی پولیس والے کے سر کے بال تک بھیگ گئے تھے۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالیں جو فریاد جیسی سنائی دیتی تھیں۔ گالیاں بہرحال نہیں تھیں۔

میں نے کہا "لانس نائیک! تو اندر سے بہت گندہ ہے۔ چل یہ پٹرول سے صفائی تو ہو جائے گی۔"

پولیس والے کی وردی پہننے سے پہلے میں نے اس ادھ ننگے کو اس کے ساتھی کے پاس ٹائروں کے منی گودام میں بند کر دیا۔ وہ دونوں پٹرول میں بھیگے مجھے برا بھلا کہنے کی بجائے اب ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

میں جب تک پولیس کی وردی پہن کر تیار ہوا۔ اس وقت تک بنسی کو ہوش آگیا تھا۔ میں نے کے کے کو بھیج کے پولیس وین سے ہتھکڑی کی ایک جوڑی منگوالی' اسے بنسی کے ہاتھ میں ڈال کر ایک ذمہ دار پولیس مین کی طرح میں اب بے کھٹکے ولا کے کچن تک جانے کی حالت میں آگیا تھا۔

کے کے کی ماچس اسے واپس کرتے ہوئے میں نے پولیس والوں سے کہا "یہ یہیں بیٹھے گا۔ تمہاری خبر لیتا رہے گا۔ اگر شور مچایا تم نے تو میرا آرڈر ہے یہ ایک تیلی جلا کے تمہارے اوپر پھینک دے گا اور چلا جائے گا سمجھے؟"

کے کے' کے لیے فوری بھیس بدلنے کا سامان کہاں سے آتا۔ میں نے ایک طرف پڑی پلنگ کی پھول دار چادر اسے اوڑھنے کو دی۔ اپنے اتارے ہوئے سویلین کپڑے بھی کے کے کو سنبھال کر رکھنے کے لیے دے کر ہم تین آدمی اس ایریا سے باہر آگئے...... ہم یعنی ایک نقلی پولیس والا' ایک نقلی قیدی اور ایک جعلی عورت یا لڑکی چادر کے پیچھے سے اپنے جینز اور ٹینس شوز دکھاتی ہوئی......

برآمدے کے گملوں کے پاس ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ اس نے مختصر جلوس کو ادھر سے نکلتے اور لان پر دو قدم چل کر سیدھے ہاتھ گھومتے دیکھ لیا۔ پکار کے پوچھنے لگا

"کیا بھائی؟ کس کو پکڑا؟"

میں نے مڑتے ہوئے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ جھلسے ہوئے لہجے میں کہا "ساہوکار کو۔"

"ہاہا۔' وہ میرے فوری جواب سے خوش ہوا' بولا "یہ جنانی کون ہے؟"

یعنی کے کے کا عارضی بھیس قابل قبول تھا' دور سے اسے عورت سمجھا جا رہا تھا۔

میں نے کہا "اس کی رکھیل ہے اور کون ہو گی۔"

"کیا کر رہے تھے؟" اب کے برآمد والے پولیس مین کے لہجے میں شرارت

بہت واضح تھی۔ "کیا کریں گے؟ تو ہی بتا بھولے ناتھ ......! سیٹھ لوگ ساہوکار لوگ کیا کرتے ہیں۔"

میں بنسی کو تھامے تھامے گھوم گیا۔ دور تک پولیس مین کی احمقانہ ہنسی کی آواز سنائی دیتی رہی۔ آگے ایک کمرے کا کھلا دروازہ تھا۔ بری سیر ونگ میں ملبوس ایک ملازمہ کمرے میں فرش پر گیلے بھاری تولیے سے پونچھا دے رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا' لو گڑبڑ ہو گئی مگر ساتھ کا لڑکا اب ہشیار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے میرا خوف' میرے چہرے پر پڑھ لیا اور دھیرے سے کہا "یہ نئی عورت ہے' کسی کو نہیں جانتی۔"

ہم تینوں کو آتے دیکھ کر عورت کپڑا چھوڑ ادب سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں گیراج سے چلا تھا تو بنسی کی کمر میں اپنی ہینڈ گن ٹکا کے چلا تھا۔ اب وہ عورت کے برابر سے گزرتا ہوا کچھ بے چین ہونے لگا تو میں نے اس کے گردن پر گن کی نال اور چھو دی۔ کمرے سے نکلتے تو ایک اندرونی صحن ساد کھائی دیا۔ صحن میں آنے سے پہلے میں نے کے کے کو اشارہ کیا تھا کہ آہٹ لے دیکھے کہ ادھر کوئی آتو نہیں رہا۔ کے کے نے دائیں بائیں چہرہ گھما کر سننے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے وہ اس گھر کو خوب اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے کہیں کوئی انوکھی آواز سنائی دی ہو گی تو مجھے صبر کرنے کا اشارہ کرتا ہوا وہ دروازے کا پٹ تھام کے رکا رہا۔ پھر میں نے بھی وہ آواز سن لی۔ کچھ لوگ تین یا چار یا چھ آدمی اپنے جوتوں سے آوازیں کرتے اسی طرف آرہے تھے۔ کے کے نے مجھے بازو سے تھاما اور ہم کمرے میں واپس ہو لیے۔ ہم نے دیکھا لوہے کا ایک گھماؤ دار زینہ اوپر کسی اسٹور یا دو چھتی کی طرف چلا گیا تھا۔

کے کے بلی کی طرح نرمی سے پیر رکھتا زینے پر چڑھ گیا اور تنگ نظر آتے دروازے سے غائب ہو گیا۔

میں نے بنسی کی کمر میں گن کا ٹھوکا دیا۔ سرگوشی میں کہا "آواز نہیں ہونی چاہیے۔ بلی کی طرح تو بھی چڑھ جا اور سانس روک لے۔"

ہم زینہ چڑھ کے دو چھتی کے دروازے پر گھسے ہی تھے کہ نیچے آدھے منٹ پہلے چھوڑے ہوئے کمرے میں وہ دھڑ دھڑاتے ہوئے گھس آئے اور تیز تیز باتیں کرنے لگے۔ آوازوں ہی سے پولیس والے لگ رہے تھے۔ کوئی افسر ہی بک بک کیے جا رہا تھا۔ وہ ماتحتوں کو بے رکے ہدایات دے رہا تھا کہ خاموشی سے ہر جگہ داخل ہونا ضروری ہے ورنہ تمہاری آہٹ سے وہ لوگ ہوشیار ہو سکتے ہیں۔ کہنے لگا "مزا تو جب ہے کہ ان لوگ کے

سر پر اچانک جا کھڑے ہو...... سمجھا؟"

میں نے دل میں کہا "واہ بیٹا! سب سے زیادہ شور تو تو ہی کر رہا ہے ماہر کہیں کا۔"

مگر جو اگلی بات اس ماہر نے کہی' اس سے میرا خون جیسے خشک ہو گیا۔ کسی پولیس والے کو مخاطب کر کے وہ کہنے لگا۔ "اے سمہا! جا بیٹا تو سیڑھی چڑھ کے دیکھ 'اوپر کیا ہے؟"

"اوپر؟" سمہا کی کاہلوں جیسی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اوپر کیا ہونا ہے سر! وہی کاٹھ کباڑ کا اسٹور ہوتا ہے۔"

افسر نے غصے میں پوچھا "ارے تو نے دیکھ لیا ہے جو ایسا بولتا ہے۔"

سمہا خوشامد کرنے لگا "نہیں سر! دیکھا تو نہیں ہے 'بس ایسا ہی کہتا ہوں۔"

"جا اوپر جا گدھا۔"

افسر ناراض ہو گیا' بولا "ہاں میں ادھر ہی کھڑا ہوں۔ تجھ سے رپورٹ لے کے آگے جاؤں گا۔"

"ہاں سر۔ ایک دم سر۔" اس کی کاہلی ڈر کے مارے ہوا ہو گئی تھی۔

ادھر دو چھتی میں جسے خالی سمجھ کے ہم بنسی کو لے کے گھسے تھے' ہمیں عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا تھا۔ ایک نوجوان بہت نوجوان جوڑا' ولا کے نوکر لڑکا لڑکی...... کاٹھ کباڑ سے بھرے اس اسٹور میں ایک دوسرے کو بانہوں میں لیے راز و نیاز میں الجھے ہوئے تھے اور کوئی وقت ہوتا تو بنسی انہیں پکڑ کے ہاؤس کیپر یا مالک کے سامنے لا کھڑا کرتا کہ دیکھیے سالوں کی عمریں دیکھیں اور ان کی حرکتیں دیکھیے مگر اس وقت وہ انہیں اپنا مسیحا سمجھ کے خوشامد سے دیکھنے لگا تھا کہ شاید اسے بچالیں گے۔

مسیحا تو میں بھی انہیں سمجھا تھا کہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے انہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کے کے کو اشارہ کیا کہ وہ ٹوٹی سنگھار میز کے پیچھے چھپ جائے۔ بنسی کو گلے سے پکڑے ہوئے میں اس عاشق معشوق پارٹی کی طرف بڑھا۔ میرا پستول دیکھ کے وہ سمجھ گئے تھے کہ آواز بالکل نہیں نکالنی۔ رومان تو ان کا کبھی کا ہوا ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ خوف نے لے لی تھی مگر وہ ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈالے گرد آلود دیوان پر اس طرح سمٹے بیٹھے تھے' چہرے سے چہرہ بھڑائے۔ ڈر کے مارے دور کھسکنا تک بھول گئے تھے۔ میں نے دونوں کے قریب اپنا چہرہ پہنچا کر صاف سادہ برمی میں

کہا "پولیس ہمارے پیچھے سیڑھی چڑھتی آ رہی ہے۔ ہم ٹوٹے فرنیچر کے پیچھے چھپتے ہیں۔ آواز مت نکالنا' مار دیں گے۔ تم اسی طرح چماشا کرتے رہو' رکو مت۔ سمجھے؟"

لڑکے نے ڈر کے مارے جلدی جلدی ہاں میں سر ہلایا۔ میں بنسی کو گلے سے پکڑے پکڑے کاٹھ کباڑ کے پیچھے رینگ گیا۔ گھومے ہوئے زینے پر سمہا نامی پولیس والے کے ہانپ ہانپ کر چڑھنے کی آواز بالکل قریب آ گئی تھی۔

پھر ہم نے اس کے اوہ ئے کہنے کی آواز سنی۔ وہ ڈر بھی گیا تھا اور شاید نوجوانوں کو دھمکا کر بد معاشی سے باز رکھنا بھی چاہتا تھا۔ ہمیں لڑکا لڑکی کی خوف کی سسکی بھی سنائی دی۔ نیچے سے افسر نے پوچھا "کیا بات ہے' اوپر کوئی ہے؟"

کاہل پولیس والے نے کہا "بچے ہیں۔ لڑکا لڑکی۔ بد معاشی کر رہے ہیں۔"

"اچھا اور کیا ہے اوپر؟"

"کاٹھ کباڑ ہے...... پر یہ ادھر چھپے بیٹھے ہیں۔ کیسی بے شرمی کی بات ہے۔ بھلا دیکھیے کون سی جگہ ڈھونڈی ہے سالوں نے...... بے حیا۔"

"چل چل۔ اتر آ' بکواس کر رہا ہے۔"

"مگر سر! یہ بھی کوئی بات ہے ان لڑکا لڑکی کو......"

"چل سالا گدھا! لڑکا لڑکی کیے جا رہا ہے' نیچے آ...... مت ستا بچوں کو۔"

"بچے نہیں سر! خیر جیسا آپ کا حکم۔" کہتا ہوا وہ بڑبڑاتا ہوا اترنے لگا۔ "ہمیں کیا جی...... بھگتیں گے ان کے ماں باپ۔ بتاؤ چھوڑ رکھا ہے۔ سالے یہاں گھسے ہوئے گھپلا کر رہے ہیں۔ صاحب بولتا ہے مت ستا بچوں کو۔ ارے یہ بچے ہیں بد معاش...... سالے عیاش نہیں تو۔"

ایک بار اور افسر نے اسے ڈانٹا اور یہ پارٹی کمرے سے نکل گئی۔

میں بنسی کو کاٹھ کباڑ کے پیچھے سے گھسیٹتا ہوا نکلا تو دیوان پر دونوں عاشق معشوق لونڈا لپاڑی ایک دوسرے سے دور ایک ایک کنارہ پکڑے سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے سامنے آ کر کہا "شاباش۔ اب آؤ ہمارے ساتھ چلو۔"

"نہیں۔" لڑکی بولی۔

"کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

لڑکے نے کہا "تم ہمیں لی صاحب کے سامنے لے جا کے کھڑا کر دو گے۔"

میں نے ہنس کے اطمینان دلایا۔ "نہیں لی صاحب کے سامنے نہیں کھڑا کروں

گا' انعام دوں گا۔ تم دونوں نے ہمیں بچایا ہے۔"

"اسے ڈرائیور بنسی کو کہاں لے جا رہے ہو؟" لڑکی نے ہمت کر کے پوچھا۔

"ہم اس بنسی کو بجائیں گے۔ بجانا سمجھتی ہو؟" لڑکی نے انکار میں سر ہلایا۔

لڑکے نے کہا "تم اسے مارو گے؟"

"شاباش۔ بالکل ٹھیک سمجھے۔ ہم بنسی ڈرائیور کو مار لگائیں گے۔ تمہیں اور سب کو یہ تماشا دکھائیں گے۔"

"اس نے کیا کیا ہے جو مارو گے؟"

"یہ حرامی سب کو...... تمہیں' تمہارے مالک لی صاحب کو' ولا کے سب آدمی کو بم سے اڑانے والا تھا۔"

"نہیں' نہیں۔" بنسی نے کے کے کو گھورتے ہوئے احتجاج کیا۔ گیراج کے بعد سے اس نے یہ پہلی آواز نکالی تھی۔

میں نے مڑے بغیر گن والا ہاتھ چلا کر اسے بیچ میں بول پڑنے کی سزا دی۔ فولاد کی ضرب سے بنسی کا ہونٹ سوجنے لگا۔

لڑکی نے نفرت سے بنسی کی طرف دیکھا' بولی "یہ سالا بدمعاش بھی ہے۔ صفائی کو جاتی تھی تو مجھے گیراج میں پکڑ لیتا تھا۔"

لڑکا جذباتی ہو گیا' اس نے اپنے دونوں پنجوں کو الجھا کر بغدہ سا بنا لیا اور بنسی کی گدی پر اس بغدے کا بھرپور وار کیا۔ اس ضرب سے بنسی لڑکھڑا گیا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ابھی ہم اسے خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ اس سالے نے جگہ جگہ ولا میں بارود بچھائی ہوئی ہے۔ پہلے اس سے سب جگہیں معلوم کرنا ہے' پھر کہیں جا کے......"

"اسے مار دو گے تم لوگ؟ یہ کے کے تو سنا ہے' اس کا بھائی ہے۔" لڑکی پریشان ہو گئی تھی۔

"تم غلط سمجھیں۔ ہم اسے ماریں گے نہیں' سب کو لے کے نکل جائیں گے۔ اسے ولا کے پچھلے گیٹ سے باندھ کے چلے جائیں گے۔ جب بہت دور پہنچ جائیں گے تو رائفل سے نشانہ لے کے اس کا اپنا لگایا ہوا بم ہم دور سے اڑا دیں گے۔ بس یہ اپنے ہی بم کے دھماکے سے اڑ جائے گا۔ ایک پنتھ دو کاج۔"

بنسی نے اب باقاعدہ رونا گڑگڑانا شروع کر دیا۔

میں نے گدی میں ہاتھ دے کر اسے آگے کر دیا۔ اتنی چھوٹی سی جگہ میں وہ خوشامد کر رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا تو اس سے آواز بہت گونجتی تھی۔

ہم اسے ان حد سنگھ کے پاس لے جانا چاہتے تھے تاکہ جو پوچھنا ہے' مار پیٹ کے پوچھ لے۔

"رکو۔" لڑکی بولی۔ "مجھے پتا ہے اس کا بارود اور بم کہاں رکھا ہے۔"

"خوب۔" لڑکی یہ بہت اچھی بات کہہ رہی تھی۔

بنسی نے منہ سے کسی قسم کی آواز نکالے بنا انکار میں زور و شور سے سر ہلانا شروع کر دیا۔

میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا لی۔ لڑکی نے اپنے عاشق کی طرف شرما کے دیکھا۔ بولی "وہ جو مالی کا سامان رکھا جاتا ہے نا پمپ ہاؤس کے برابر...... کوٹھی میں؟"

لڑکے نے بھی مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا۔ "اچھا اچھا...... وہ۔"

میں نے بھی مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ "اچھا وہ۔ تم لوگوں کی ملاقات کی کوٹھری؟"

لڑکے نے جلدی میں کہہ دیا "ہاں۔" لڑکی گڑبڑا گئی "ناں رے۔ نہیں۔"

"اچھا آگے بتاؤ' کیا وہاں اس نے بارود بم چھپائے ہوئے ہیں؟"

"ناں جی ناں...... وہاں پہ بھی...... مطلب یہ کک کی بیٹی کو لے کے جاتا تھا۔"

کک کی بیٹی؟ میں نے پریشان ہو کے اپنے ساتھی کے کے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ رش کرتے ہوئے خون کی وجہ سے سرخ بلکہ براؤن ہو گیا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ بنسی کی طرف دیکھ کر ایک لفظ "اچھا؟" کہا اور جھپٹ کر بنسی کے پیٹ کے نچلے حصے میں گھٹنے کی بھرپور چوٹ لگائی۔

"ہہ۔" یا "ہائے" جیسی کوئی آواز بنسی ڈرائیور نے اپنے منہ سے نکالی اور وہ چکرا کے اسٹور کے فرش پر گر گیا۔ وہ یقینی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس کمینے آدمی کی دل پھینک بدکرداریاں اتنی زیادہ تھیں کہ لگتا تھا' یہ اپنے رقیبوں کے ہاتھوں ہی ختم ہو جائے گا کہ بموں اور بارود کے بارے میں مفید اطلاعات ہمیں نہیں مل سکیں گی۔

میں نے کے کے کو سمجھایا کہ بھئی اتنا زیادہ طیش نہ کھاؤ۔ آخر کو تمہارا خالہ زاد بھائی ہے۔ اس کی بدکرداریوں کی وجہ سے وقت سے پہلے تو اسے ناکارہ مت کرو اور ابھی

کچھ دیر زندہ بھی رہنے دو۔ یہ ضروری ہے۔

نوعمر لڑکی اس مار پیٹ سے ڈر گئی تھی‘ کہنے لگی ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ کک کی لڑکی کی بات سن کے یہ لڑکا اتنا برا منائے گا۔ میں کہتی بھی نہیں۔“

’میں نے کہا ”جو ہو گیا‘ جانے دو۔ یہ بتاؤ ! بارود والی جگہ کا کیا کہہ رہی تھیں؟“

وہ بولی ”اس کوٹھری میں کک کی لڑکی اس کے لیے کچن سے کھانے کو اچھی اچھی چیزیں لایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پہلے بیٹھ کے وہ سب کھاتے پیتے تھے پھر......“

لڑکے نے جواب ایک ذمہ دار آدمی کی طرح لگ رہا تھا‘ اپنی محبوبہ کو ہوں کہہ کے روک دیا کہ وہ غیر ضروری باتوں کا ذکر نہ کرے۔

لڑکی پھر شرما گئی تھی۔ بولی ”اس کوٹھری میں کک کی بیٹی اپنے اور اس کے لیے کھانے کی چیزیں چھپا کے بھی رکھتی تھی۔ جب یہ دونوں وہاں سے ہو کے چلے جاتے تھے تو میں جا کے تلاشی لیتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی اچھی چیزیں مل جاتی تھیں۔“

کے کے اپنی سابقہ محبوبہ کی بے وفائی کا سن کے بجھ سا گیا تھا مگر لڑکی کا محبوب اپنی محبوبہ کی چالاکیاں سن سن کے مسکرا رہا تھا۔

لڑکی کہنے لگی ”ایک روز ان کے چلے جانے کے بعد میں گئی تو میں نے دیکھا‘ ایک عجیب سی چمکدار چابی کوٹھری میں کہیں کونے میں پڑی رہ گئی ہے۔ میں نے وہ اٹھالی۔ رات میں‘ میں نے دیکھا۔ یہ بنسی ادھر ٹارچ لے کے گیا اور کتنی دیر کوٹھری میں رہا۔ یہ بہت پریشان تھا تو میں سمجھ گئی کہ چابی دیکھ رہا ہے اور چابی کسی خاص جگہ کی ہے۔ میں نے سوچا‘ ہو نہ ہو‘ اس نے کہیں پیسے‘ زیور‘ کوئی قیمتی چیز چھپائی ہوئی ہے۔ مجھے فکر ہو گئی کہ وہ جگہ تو دیکھوں جہاں اس نے چمکدار چابی کا تالا ڈالا ہوا ہے۔ دو دن یہ ایک دم پریشان رہا۔ دو دن تک میں چھپ کے اس کا پیچھا کرتی رہی۔ یہ اپنی پریشانی میں کبھی کبھی برف خانے کی طرف چلا جاتا تھا۔ کتنی کتنی دیر وہیں رہتا تھا۔ یہ جیسا پریشان جاتا‘ اتنا ہی پریشان واپس آتا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی لی صاحب اپنا برف خانہ صرف گرمی برسات میں چار ساڑھے چار مہینے چلواتے ہیں۔ سردی کے موسم میں یہ بنسی بند برف خانے میں کیا کرنے جاتا ہے؟

ایک دن میں گئی تو میں نے خوب تلاش کیا‘ خوب تلاش کیا۔ میں نے دیکھا ٹھنڈی جگہ کاٹھ کباڑ کے نیچے گڑھے میں اس نے لکڑی کا ایک صندوق چھپایا ہوا ہے اور

صندوق میں نیا چمکدار تالا پڑا ہے۔ میں نے اس چابی سے کوشش کی تو کھٹ سے وہ تالا کھل گیا۔ صندوق کا ڈھکنا جو اٹھایا تو باپ رے باپ‘ اس میں وہ بارود والی لکڑیاں کیا بولتے ہیں‘ ڈائنامائٹ اور کارتوسوں جیسے ڈبے جن میں ڈائنامائٹ چھوڑنے والے فیوز ہوتے ہوں گے‘ یہ سب اور بجلی جیسے تار اور کیا کیا پڑا تھا۔ میں ڈر کے مارے تالا ڈال کے بھاگ آئی۔ آگ سے گولہ بارود سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آتش بازی تک بری لگتی ہے مجھے۔ بس میں نے کیا کیا‘ ایک روز اس کے گیراج میں گئی۔ وہاں اس سالے کی میلی کچیلی پتلون ٹنگی تھی۔ میں نے وہ چمکدار چابی پتلون کی جیب میں ڈال دی اور نکل آئی تو ایسے مجھے پتا ہو گیا کہ یہ سالا گولہ بارود کدھر رکھتا ہے۔“

لڑکی اپنی عمر سے زیادہ چالاک تھی۔ مجھے اس نے بہت قیمتی راز کی بہت قیمتی چابی دے دی تھی۔ میں نے پوچھا ”تو مجھے برف خانے لے جا سکتی ہے؟“

وہ بولی ”کیوں نہیں...... چلو۔“

اس کا محبوب غصے میں اس سے کہنے لگا۔ ”بات سن۔ تو رہنے دے‘ برف خانے میں لے جاتا ہوں۔“

میں نے کہا ”دوست تم لے جاؤ یا یہ لے جائے‘ ہمارے لیے ایک ہی بات ہے۔ پر یہ سمجھ لو‘ بنسی کو اکیلے اس کے کے‘ کے حوالے کر کے چلے جانا اچھا نہیں ہو گا۔ نہ تم لوگوں کے لیے نہ ہمارے لیے۔“

وہ سمجھ گیا کے کے کو ترچھی نظروں سے دیکھ کے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہی لے جائے گی تمہیں۔“ پھر لڑکی کی طرف دیکھ کے کہنے لگا ”تو ٹیم نہیں لگانا ری۔“

میں نے ہنس کے کہا ”تیری محبوبہ خیر سے جائے گی‘ خیر سے آئے گی۔ میں بنسی جیسا حرامی نہیں ہوں۔“

لڑکی اور میں کے کے اور لڑکے کو بنسی کے پاس چھوڑ کے لوہے کا گھماؤ دار زینہ اترنے لگے۔

کے کے اور لڑکا غیر مسلح تھے۔ بنسی کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ پیٹ کے نیچے کے کے کا ٹھڈا کھانے کے بعد بے سدھ بے ہوش پڑا تھا۔ پھر بھی میں نے لڑکے اور کے کے کو ایک ایک سونٹی تھما دی کہ یہ بنسی بدمعاشی کرے تو مار لگانا۔

دو چھتی والے اس کمرے سے نکلے تو لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس طرف کچن اور اس طرف برف خانہ ہے۔ چلتے چلتے مجھے خیال سا ہوا کہ کچن میں جا کر ان حد سنگھ کو بتا

دوں کہ بنسی ڈرائیور کا کیا قصہ ہے مگر ادھر ایک پولیس والا بندوق پکڑے جیسے پہرہ دیتا نظر آیا۔ میں نے سوچا' پہلے بارود کا اسٹاک دیکھ لوں' پھر نکلتے ہوئے ان حد کو کسی طرح خبر کر دوں گا۔

کمرے سے نکل کے ہم ایک دالان میں آئے۔ میں نے لڑکی کو سمجھا دیا تھا کہ میں ولا کے مالک لی صاحب کا دوست ہوں اور یہ پولیس مین کی وردی میں نے ضرورت سے پہنی ہوئی ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے پولیس والے مجھے دیکھ کے پریشان کریں۔ ان سے دور دور رہنے کی ضرورت ہے۔

لڑکی کچھ دیر دالان کے ستون کی اوٹ میں کھڑی سب طرف دیکھتی اور آہٹیں سنتی رہی۔ پھر آؤ کہہ کے اس نے میرے پنجے میں اپنا پنجا پھنسایا اور دالان سے اتر کے کورٹ یارڈ کے پھولوں کے قطعے پھلانگتی' درختوں کی اوٹ لیتی' گھاس پر دوڑتی' فواروں حوضوں کی آڑ میں رکتی شکاری سے بھاگتے کسی ہرن کی طرح دو تین منٹ میں ولا کے سائے سے دور پہلے پتھروں اور بھاری شہتیروں سے بنائی گئی ایک عمارت کے پاس جا رکی۔ آہستہ سے کہنے لگی "یہی ہے برف خانہ۔"

ہم دونوں نے برف خانے کی دیوار کے سائے میں کچھ دیر اپنا سانس درست کیا۔

لڑکی نے بڑی اپنائیت سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مرے ہاتھ کو گرفت میں لے کر بولی "آؤ ہشیاری سے آنا۔" پھر وہ دھیرے سے ہنسی' کہنے لگی "تمہارا ہاتھ پکڑا ہے' یہ نہیں سمجھنا کوئی دوستی میں پکڑا ہے۔ ادھر برف خانے میں سانپ بہت ہیں۔ تم نئے لگتے ہو تو رستہ سمجھاتی ہوئی چلوں گی۔"

میں نے شکریے کے اظہار میں ہلکے سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ "مہربانی ہے تمہاری......ویسے جب تک تم کچھ نہیں سمجھاؤ گی' میں کچھ نہیں سمجھوں گا۔"

وہ ہولے سے قہقہہ مار کے ہنسی' بولی "سمجھدار آدمی ہو۔"

اس نے سانپوں کا کہہ کے جیسے میری جان نکال دی تھی۔ اس برما میں' میں نے سنا تھا بڑے خطرناک سانپ ہوتے ہیں۔ خیر کسی سانپ' بچھو کا سامنا نہ ہوا اور ہم برف خانے کی دھول میں اٹی مشینوں' ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں کا ہی چڑھی سیڑھیوں سے اتر کے اس ٹھنڈے گڑھے کے پاس جا کھڑے ہوئے جہاں کاٹھ کباڑ اور نئے پرانے ملبے تلے لکڑی کا ایک صندوق رکھا تھا۔ میں نے صندوق کا کنڈا اکھاڑنے کے لیے کباڑ میں

سے لوہے کی ایک راڈ اٹھالی تھی۔ صندوق میں تالا پڑا تھا۔ ویسا ہی چمکدار جیسا لڑکی نے بتایا تھا۔ میں ڈائنامائٹ کے بارے میں خوب جانتا تھا کہ اس کے ڈبے وغیرہ پر خاص طور پر کسی دھات کی چیز سے چوٹ لگانا یا ویسے ہی ڈائنامائٹ کی اسٹک کو زیادہ بڑا دھچکا پہنچانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ دھات کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی چنگاری سے دھماکہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح بڑا دھچکا اسے ایکٹی ویٹ کر سکتا تھا۔

احتیاط سے راڈ استعمال کرتے ہوئے میں نے کنڈا تالا سب اکھیڑ لیا۔ لڑکی نے' میں نے صندوق میں جھانک کے دیکھا' بہت تھوڑا کچھ سامان اندر پڑا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "کیا اتنا ہی تھا؟"

لڑکی بولی "کوئی بھی نہیں' صندوق اوپر تک بھرا تھا۔"

بنسی نے ڈائنامائٹ اور بارود کی بڑی مقدار وہاں سے ہٹا دی تھی۔ کے کے ٹھیک کہتا تھا' ولا میں کئی جگہ بارود لگا دی گئی ہے۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ بتاؤ صندوق میں کیا کیا تھا۔ جو چیزیں وہ پہچانتی ہے' ان کے نام لے کر باقی تفصیل بتا کر لڑکی نے ایک اور اہم بات مجھے سمجھا دی کہ بنسی ڈائنامائٹ کو کس طرح ٹائم سیٹ کر کے انہیں اڑا سکتا تھا بلکہ اس کے پاس ڈائنامائٹ کے ساتھ تار جوڑ کے اور تار کو بیٹری سے اسپارک دے کر اڑانے کا پرانا نظام تھا۔

کہنے لگی "ایک کالا ڈبہ تھا۔ ڈبے کے اوپر سائیکل میں ہوا بھرنے والے پمپ کا جیسا ہینڈل لگا تھا۔"

بیٹری اور تار اور بہت سی ڈائنامائٹ اسٹکیں صندوق سے ہٹا لی گئی تھیں۔ اب بنسی کو مار پیٹ کر کے ہی پوچھا جا سکتا تھا کہ یہ سب چیزیں کہاں کہاں لگی ہیں۔

میں نے لڑکی سے کہا "چلو دو چھتی والے کمرے میں واپس چلو۔"

ستارے موافق تھے' ہمیں کام کی ایک چیز اور مل گئی تھی۔ میں نے صندوق میں بڑی اسٹکیں احتیاط سے لپیٹ کے کمر سے باندھ لیں اور بچتے بچاتے پولیس والوں سے چھپ چھپا کے ہم دونوں دو چھتی والے کمرے میں آ گئے۔

حیرت بلکہ دہشت اس کمرے میں ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ لوہے کی نچلی سیڑھیوں پر سر پکڑے کے کے بیٹھا تھا۔ کے کے کے پیروں کے پاس ہتھکڑی کی جوڑی چمکدار زنجیر سے جڑی کھلی پڑی تھی۔ کے کے کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی اور خون رس رس کے اس کی آنکھوں میں آ رہا تھا۔

لڑکی ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہے۔ وہ بے تابانہ اپنے محبوب کو پکارتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی اور دو چھتی میں داخل ہو گئی۔ پھر اگلے ہی پل سیڑھیوں پر سے جیسے آبشار کی طرح گرتی پھسلتی سب سے نچلی سیڑھی پر میرے اور کے کے کے پاس آگئی۔ پوچھنے لگی 'کیا ہوا۔ تجھے کیا ہوا؟ وہ کیسا ہے؟ ٹھیک تو ہے؟"

کے کے جسے میں نے پیٹھ تھپک کے گال تھپتھپا کے ذرا حواسوں میں لانے کی کوشش کی تھی' اب ہمیں پہچان رہا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا کے کے؟ بنسی کہاں گیا؟"

"بھاگ گیا۔"

"ہاں وہ تو پتا ہے۔ وہ کدھر گیا؟ میرا والا لڑکا' وہ ٹھیک تو ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے۔" کے کے نے کراہتے ہوئے اپنی پیشانی کا گومڑ چھوا۔ "وہ اس کے بنسی حرامی کے پیچھے گیا ہے۔"

"مگر بنسی کہاں ہے؟"

"کہہ رہا تھا...... کہہ رہا تھا' تمہارا سکھ دوست اور وہ چینی عورت کچن میں ہے۔ وہ بنسی کچن کو بارود سے اڑانے گیا ہے۔"

"ہے بدھیشور۔" لڑکی نے جیسے رو کے فریاد کی۔ "اے میری میا! وہ کتے کا جنا مار دے گا میرے والے کو۔"

میں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ "نہیں' نہیں کسی کو نہیں مارے گا۔ نہ تیرے دوست کو' نہ میرے دوست کو۔ پروا مت کر' چل ہم چلتے ہیں۔"

لڑکی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے میری ہمدردی کا جیسے شکریہ ادا کیا۔ بولی "بڑا جی دار ہے وہ۔ بنسی جیسے کو پورا پڑ جائے گا۔ پر وہ ہے کہاں؟" کے کے نے جھنجلا کے کہا "بتایا ناں' وہ بھی کچن کی طرف گیا ہے۔ سردار کو اسے چینی عورت کو ہشیار کرنے۔ کیا وہ دونوں تم لوگوں کو رستے میں نہیں ملے؟"

ابھی لڑکی جواب میں کچھ کہنے کو ہی تھی کہ لگا وہ کمرہ جس میں ہم بیٹھے تھے۔ ایک بار دھڑک گیا۔ دور کے ایک زبردست دھماکے سے ہم تینوں اچھل پڑے۔ لڑکی نے چیخ ماری اور کے کے کی گردن جھول گئی۔ "مار دیا رے۔ اڑا دیا سب کو ہتیارے نے۔ مار دیا حرامی نے۔" وہ برابر رو رو کے چیخ چیخ کے کہے جا رہی تھی۔

میں نے کہا "ٹھیر! بات سن۔ ہمارے ساتھ آ۔ کچن کی طرف لے جا ہمیں۔

اسے کے کے کو سنبھال تو اور حوصلہ رکھ۔ آ چل کے دیکھتے ہیں سب ٹھیک ملے گا۔"

لڑکی نے ہمت سے کام لیا۔ کے کے کی گردن میں بانہہ ڈال کے اسے اٹھایا اور آگے چل پڑی۔

ولا کے سبھی لوگ جیسے کچن کی طرف دوڑے جا رہے تھے مگر میں نے دیکھا پولیس والے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک نے وردی کی جھلک دیکھ کے مجھے اپنا ساتھی سمجھا اور گیٹ کی طرف بھاگتے بھاگتے ذرا رک کے پکار کے کہا "اورے' ادھر کدھر جاتا ہے۔ گیٹ پر آ...... وائرلیس بھیج کے امدادی پارٹی بلانے کا ہے۔ ادھر بم پھٹا ہے۔ ادھر مت جا۔"

اس بہادر پولیس والے کو میں نے ہاتھ ہلا کے دفع ہو جانے کا مشورہ دیا۔ آگے اس کا ایک دلیر افسر بھی درخت کے تنے کی اوٹ میں کھڑا خوفزدگی کے عالم میں لوگوں الٹا آگ کی طرف بھاگتے دیکھ رہا تھا۔ اپنی چیختی آواز میں وہ سب سے کہہ رہا تھا "کم بیک کم بیک۔" مطلب واپس آجاؤ۔ ایک بار اس نے ہماری پارٹی سے بھی "کم بیک" کہا۔ دور سے شاید وردی نہیں پہچانا ہو گا ورنہ مجھ پولیس مین سے بھی یہی کہتا بلکہ آرڈر کرتا کہ کم بیک۔

کچن کے ایک حصے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے آگ بجھانے کا جھاگ پھینکنے والا لال کنستر اٹھائے ولا کے آدمیوں کو آگ پر قابو پاتے دیکھا۔ کچن کی پچھلی دیوار کا بڑا حصہ اڑ گیا تھا۔

میں ان حد سنگھ اور ہاؤس کیپر کی سلامتی کی طرف سے پریشان ہو کر پہلے ولا کے آدمیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ زخمی وہاں بیٹھے تھے۔ کچھ لیٹے ہوئے تھے۔ پھر ہجوم میں گھری ہوئی مجھے ہاؤس کیپر نظر آگئی۔ وہ زخمیوں کو طبی امداد دے رہی تھی۔

"ان حد کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟"

ہاؤس کیپر نے وردی کے باوجود مجھے پہچان کے کہا "وہ تمہیں ڈھونڈنے گیا ہے۔"

مجھے اطمینان ہوا' چلو ٹھیک تو ہے میرا دوست۔ میں نے پوچھا "کس طرف ڈھونڈ رہا ہے مجھے؟"

ہاؤس کیپر بولی "ولا کے پچھلے گیٹ پر۔"

"او خدا! کیوں پچھلے گیٹ پر کیوں گیا ہے؟"

"ڈرائیور کے ساتھ گیا ہے۔ بنسی ڈرائیور کہہ رہا تھا' تم ادھر ہو پچھلے گیٹ پر۔"

جیسے میرے پاؤں تلے زمین نہ رہی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "بنسی دشمن ہے۔ یہ دھماکہ اسی نے کیا ہے۔ اس نے پچھلے گیٹ پر بھی ڈائنامائٹ لگایا ہوا ہے۔"

کیا معلوم وقت کتنا تھا۔ تھا بھی کہ نہیں۔ میں نے پچھلے گیٹ کی طرف دوڑتے ہوئے بس یہ دیکھا کہ ہاؤس کیپر اٹھ کے کھڑی ہو گئی ہے۔ کے کے اپنے کو پیچھے آنے کا کہتے ہوئے میں دیوانہ وار دوڑنے لگا۔

اب جو غور کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ قدرت کے نظام میں بہتری کی کوئی صورت اس طرح بھی نکل آتی ہے کہ بظاہر جو مصیبت دکھائی دے' اس میں ایک رحمت یا سہولت پوشیدہ ہوتی ہے۔

اگر یہ دھماکہ نہ ہوا ہوتا تو میں جس علاقے سے دندناتا ہوا گزر رہا ہوں' یہاں سمجھو چپے چپے پر پولیس والے ہوتے۔ اس دھماکے اور اپنی بزدلی کے طفیل وہ سب ولا کے بڑے گیٹ پر اکٹھا ہو گئے تھے اور ولا کا اندرون اور پچھواڑا ہمارے لیے کھلا چھوڑ گئے تھے۔

میں دوڑتا ہوا اور ولا کے پچھلے گیٹ کی دوری پر لعنت بھیجتا کچھ ہی آگے گیا تھا۔ مجھے ابھی بہت سا فاصلہ طے کرنا تھا کہ پیچھے سے اسکوٹر کی آواز آئی۔ مڑ کے دیکھا۔ ولا کی بجری بچھی روشوں اور گھاس سے قطعوں بلکہ پھولوں کے تختوں کو روندتی ہوئی طوفان کی طرح وہ اسکوٹر میری طرف چلی آرہی تھی۔

اسکوٹر پر چینی ہاؤس کیپر سوار تھی۔

ہاؤس کیپر نے اسکوٹر میرے برابر لا روکی۔ کہا کچھ نہیں۔ میں پلک جھپکتے میں پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے ماہرانہ انداز میں اسکوٹر کو ہوا کر دیا۔

میں جو راستہ پانچ منٹ یا زیادہ دیر میں طے کرتا' شاید آدھے منٹ میں طے ہو گیا۔

میں نے دیکھا' شاندار آہنی جالی اور پھول پتی کے ڈیزائن والے گیٹ کے پار ان حد سنگھ کی وہی جیپ کھڑی تھی جسے میرے رنگون بائی روڈ سفر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔
میں اور ہاؤس کیپر اسکوٹر سے جیسے پھسل کے اتر گئے۔

میں جیپ کو دیکھ رہا تھا' پھر میں نے کوئی اور چیز بھی دیکھ لی۔ ولا کی خوبصورت چہار دیواری پر جھکے برگد کے چھتنار درخت کی جڑوں میں تازہ گھاس سے ڈھکا مگر صاف دکھائی دیتا ایک سیاہ رنگ کا ڈبہ رکھا تھا۔ گھاس ہٹ گئی یا آوارہ گھومتی بکریوں نے ہٹادی تھی تو میں نے تار کا ایک ٹکڑا بھی دیکھ لیا۔ برگد کی جو جڑوں پر سے لہراتا ہوا آگے گھاس میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

یہ کالا ڈبہ بیٹری تھی جس سے ایک تار نکل کر مٹی میں دبائی۔ بارودی اسٹکوں تک گیا تھا۔ کالے ڈبے پر لگے ہینڈل کو دباتے ہی بارودی اسٹکیں یا ڈائنامائٹ دھماکے سے پھٹ جائیں گے اور گیٹ کے باہر کھڑی جیپ کے چیتھڑے اڑادیں گے۔

ہاؤس کیپر نے میری نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے سیاہ ڈبہ دیکھ لیا۔
مگر اس نے کچھ اور بھی سن اور دیکھ لیا تھا۔ میں نے اور ہاؤس کیپر نے ان حد سنگھ کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ "شیر کھاں! اویار اکدھر غائب ہو گیا؟ او بھئی ڈرائیور ادھر جیپ میں، تو کوئی وی نہیں ہے لے اب یہ ڈرائیور کدھر گیا بھئی؟"

میں جہاں بیٹھا تھا' وہاں سے بیٹری کا باکس نزدیک تھا۔ میں نے سوچا دوڑ کر باکس سے تار الگ کر دوں مگر ہاؤس کیپر نے جھاڑیوں میں رینگتے اس سائے کو دیکھ لیا تھا جو بہت چوکنا تھا۔ جسے شاید ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ہاؤس کیپر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے بھی سائے کو دیکھ لیا۔ جس تیزی سے وہ بیٹری کی طرف بڑھ رہا تھا' اس کے بعد میرا اپنی جگہ چھوڑنا باکس تک پہنچنا بے کار ہوتا۔ سائے نے جو ظاہر ہے' ڈرائیور بنسی تھا' ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنی بیلٹ تک ہاتھ پہنچا کر اپنی ہینڈ گن نکالی۔

ادھر سائے نے ہاتھ بڑھایا' ادھر میں نے نشانہ لیے بغیر اس پر فائر کیا۔
وہ چیختا ہوا پہلو کے بل گرا مگر باکس کی طرف رینگ رینگ کے برابر بڑھتا رہا۔
دو چھلانگوں میں' میں اس کے سر پر تھا۔ پھر میں نے اپنے شکاری بوٹ کی پوری طاقت ور ٹھوکر اس کے سر پر ماری اور وہ کالے باکس سے دور جا گرا۔
میں نے پکار کر ان حد سنگھ کو آواز دی۔ "یارا! ان حد سنگھ! جیپ کے پاس سے ہٹ جا۔ دور ہٹ جا۔ بم ہے بم۔ ادھر بڑے درخت کے پاس آ۔ ادھر اندر باؤنڈری میں۔ اوان حد سنگھ!"

ان حد سنگھ گولی چلنے کے ساتھ ہی "اوئے تیرا بیڑا اتر جائے۔" کا نعرہ مار کے خود ہی جیپ سے دور چلا گیا تھا۔ اس نے میری آواز سنی اور اپنا ریوالور ہاتھ میں لیے

تھوڑی تھوڑی دیر بعد پکار کے مجھے متوجہ کرتا۔ مجھ سے ہدایات لیتا برگد کی چھاؤں میں ہمارے پاس آگیا۔

بنسی چت پڑا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے بائیں پنجے کو جس سے وہ اپنا زخم دبائے ہوئے تھا' خون سے تر ہوتے دیکھا۔ میری گولی اس کے دائیں بازو کے پر گوشت حصے پر لگی تھی۔

ان حد نے پہلے بنسی کو پھر ہاؤس کیپر کو دیکھا۔ مسکرا کے بولا "بنسی کو کس نے گھائل کیا؟ میرے یار نے یا میرے دلدار نے؟"

ہاؤس کیپر پہلے تو نہیں سمجھی' پھر سمجھ کے ہلکے سے مسکرائی "ان حد! تم بم کے اوپر بیٹھ کے بھی جوک (مذاق) کر سکتے ہو۔"

ان حد نے مسکراتے ہوئے خاموشی سے زخمی بنسی کی جامہ تلاشی لی۔ فرار ہونے کے بعد کے مختصر عرصے میں اس نے کہیں چھپایا ہوا ایک پستول حاصل کر لیا تھا۔ ان حد نے وہ پستول چیک کر کے میرے حوالے کیا۔ اس دوران میں نے بیٹری سے تار الگ کر دیا تھا اور تار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا جیپ کے نزدیک دفن کیے ڈائنامائٹ کو اسی طرح دبا رہنے دیا۔

ان نرم اور مضبوط تاروں کو ان حد نے بہت مہارت سے بنسی کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال کیا۔ بنسی کو برگد کے چھتنار پیڑ کے نیچے بنڈل بنا چھوڑ کر اور مجھے اس کی نگرانی پر بٹھا کے وہ ہاؤس کیپر لیڈی کو اپنے ساتھ جیپ تک لے گیا۔ وہ کہتا گیا تھا کہ دلدار جی مجھے چیک کراؤ۔ میرے یار شیر کھان کے لیے تم نے کھانے پینے کا کیا سامان کس طرح رکھا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ کے آیا تو پسے ہوئے نمک کی چھوٹی شیشی اور ٹماٹو کیچپ کا چھوٹا سا جار اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بنسی کے سرہانے آ بیٹھا اور اپنی دوست ہاؤس کیپر سے کہنے لگا۔ "جانم! تم کچن کی طرف واپس جاؤ۔ جا کے زخمیوں کو دیکھو۔ میں ادھر کا کوئی بندوبست کر کے جلدی آتا ہوں۔"

ہاؤس کیپر نے الجھن کے ساتھ اسے دیکھا "ادھر کا کیا بندوبست ہوگا؟ شیر خان روانہ ہو جائیں تو پولیس کو بلا کے اس بدمعاش بنسی کو ان کے حوالے کرو۔"

"نہیں جانم!" ان حد نے نمک اور کیچپ دکھا کے کہا۔ "ان مزیدار چیزوں سے ڈرائیور بنسی کا تعارف کرانا باقی ہے تاکہ جلدی سے جلدی یہ ہمیں ڈائنامائٹ کی سب

اسٹکوں کا حساب دے دے کیونکہ پولیس نے تو اتنی تفصیل سے کچھ پوچھنا نہیں' سمجھیں تم۔ ہم نمک اور کیچپ کی مدد سے یہ کام پانچ منٹ میں کر لیں گے۔ تم جاؤ۔ ہاں شیر کھان! میں اس کے بازو کا زخم دیکھنا چاہتا ہوں...... بیچارہ تکلیف میں ہے' چچ چچ چچ۔"

ہاؤس کیپر نے احتجاج کیا۔ "نہیں ان حد تم اسے ٹارچر (ایذا رسانی) نہیں کرو گے۔"

میں نے اپنے سکھ دوست سے کہا "یار! بہت ہو گیا۔ چھوڑو اسے پولیس کے حوالے کرو۔"

بنسی ہماری باتیں سن اور سمجھ رہا تھا۔ وہ مچلنے اور گڑگڑانے لگا۔ "واسطہ ہے مسٹر سنگھ! میں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ سالٹ' یہ کیچپ ہٹالو۔"

ان حد اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور بازو پر جما ہوا اس کا خون آلودہ پنجا طاقت سے کھینچ کر اس کے زخم بغور دیکھتے ہوئے جیسے خود سے کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا پہلے کیچپ کا لیپ کروں یا اسے نمک کی ڈسٹنگ سے آرام آجائے گا۔ میرا خیال ہے ضرورت نہیں پڑے گی نمک کی مگر کیچپ کا یہ ہے کہ ادھر برما والے اس میں کچھ جیادہ ہی مرچی ڈال دیتے ہیں۔ مجاوہ نہیں رہتا جو اپنے انگلش لوگ چاہتے ہیں۔ خیر جو مالک کی مرجی۔"

بنسی خوف سے اچھلنے لگا تو ان حد نے کیچپ کی شیشی سے اس کا سر کھٹکھٹا کے کہا۔ "اچھلو مت! نہیں میں تمہیں تنور کا دہنہ بنا دوں گا۔ سمجھے؟"

جب بنسی خوشامد میں طرح طرح سے گڑگڑانے لگا تو ان حد نے خوفناک انداز میں آنکھیں دکھا کے کہا کہ بنسی ڈرائیور پتر اس لیڈی کی وجہ سے اور اپنے اس پاکستانی دوست کی وجہ سے ہر کام ڈیسنٹ طریقے مطلب شرافت نال کرنا چاہتا ہوں مگر اصل وچ میں بڑا ظالم آدمی ہوں۔ میں نے تین چار منٹ تجھ پر خراب کر دیے۔ بس یہ حد ہے ان حد سنگھ کی' اب اگر تو نے اے ٹو زیڈ سچ سچ نہیں بکا تو بھلے ہی لیڈی ناراض ہو جائے' بھلے ہی دوست خفا ہو کے چلا جائے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"

ان حد سنگھ کی اداکاری اتنی قابل یقین اور اس کی دہشت اتنی مکمل تھی کہ بنسی ڈرائیور نے شروع سے آخر تک ساری کتھا سنا دی کہ کس کس طرح مونگ جو کھسرے نے اسے ہدایات دے کر چھوڑا ہے اور لی صاحب کی ٹمبر جائیداد کو کس طرح برباد کر کے اسے روانہ ہو جانا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے یعنی مونگ جو کے کالے کرتوتوں کی کوئی شہادت باقی نہ رہے۔ کھسرے نے بنسی سے کہا تھا کہ پروا نہیں بارہ پندرہ بندے "زندہ

روسٹ" بھی ہو جائیں تو ہونے دو۔ اگر لی صاحب زندہ بچتا ہے تو اور زندہ نہیں بھی بچتا ہے تو اس کی جگہ کی ہمیں اب ضرورت نہیں ہے۔ جتنے دن یہاں بزنس کرنا تھا کر چکے۔

بنسی نے یہ سب کچھ بتایا' پھر اپنا کہنے لگا کہ اسے یہ بربادی کر کے مشرقی پاکستان میں سلہٹ چلے جانا تھا جہاں اس کے کچھ رشتہ دار ہیں۔ مونگ جو کو بعد میں وہیں رابطہ کرنا تھا۔ خود مونگ جو یورپ کے کسی ملک میں چھٹیاں گزارنے چلا جائے گا۔ پاکستانی بڑے صاحب یعنی میرے بابا صمد بنگش صاحب کے بارے میں اس نے وہی بتایا جو ہمیں پہلے سے معلوم تھا یعنی یہ کہ وہ رنگون لے جائے گئے ہیں۔ وہاں اس نام کا کوئی وزیر ہے جو شیر خان بنگش کو گھیرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے پاکستانی بڑے صاحب کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔

اور بنسی ڈرائیور نے ہمیں ایک ایک ڈائنامائٹ اسٹک کا حساب دے دیا۔ اس نے ان حد اور ہاؤس کیپر کو ہلاک کرنے کے لیے کچن میں مجھے یعنی شیر خان کو مارنے کے لیے پچھلے گیٹ پر جیپ کے پار کرنے کی جگہ اور بیچارے لی صاحب کو مارنے کے لیے ان کے بیڈ روم سے ملنے والی اسٹور کی دیوار میں ڈائنامائٹ سیٹ کر دیا تھا۔ کچن اور جیپ کو اڑانے کے بعد بنسی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ لی صاحب سے پستول کے بل پر ولا میں موجود مال و دولت ہتھیانے اور انہیں اڑانے کے بعد ان کی سب سے قیمتی کرائس لر گاڑی لے کر سیدھا برما مشرقی پاکستانی سرحد پر پہنچتا اور وہاں مناسب لوگوں کو مناسب یا نامناسب رقمیں دے کر گاڑی سمیت سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان پہنچ جاتا۔

جاتے ہوئے ان حد سنگھ نے نمک دان اور کیچپ کا جار میری طرف بڑھا دیا تھا کہ لو جی اب یہ ہمارے کام نہیں ہے۔ تمہیں رنگون کے رستے میں کام آئے گا۔ ہاؤس کیپر نے نمک دان اور جار لے کے دور پھینک دیئے۔ بولی "مسٹر خان کے ساتھ لے جانے کے لیے ایسے بد قسمت نمک اور ایسے منحوس کیچپ کے سوا بھی مونگ لی ولا میں بہت کچھ موجود ہے۔ شیر خان جب بھی یہ نمک یا کیچپ استعمال کرتے ایک بدنصیب زخمی مجرم کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔"

ان حد ڈھیٹ پن سے ہنسنے لگا' بولا "اب جب بھی میرا یار نمک یا کیچپ استعمال کرے گا' اسے سردار ان حد سنگھ ترکھان کی کامیاب اداکاری یاد آئے گی۔ او بی بی سنو! ہم بابا اصغر علی شاہ البیلے کی سرکار کے سکھ ہیں۔ کیڑی (مطلب چیونٹی) کو بھی ٹارچر نہیں کر سکتے' یہ سورا بنسی تو پھر بھی ڈرائیور ہے۔ مطلب انسان کا پتر ہے۔ حضرت البیلے شاہ

ہوری فرماتے تھے کہ مالک نے انسان کو اپنی امیج مطلب اپنی مثال پر بنایا ہے۔ سوہناتے بیبا' اسے ٹارچر نہیں ناں کر سکدے۔ جو بولے سو نہال۔"

اس کے بعد ان حد سنگھ بندھے ہوئے بنسی کو اسکوٹر پر ڈال کے سیدھا لی صاحب کے بیڈ روم سے ملحق اسٹور کی طرف لے گیا تا کہ وہاں سے ڈائنامائٹ کا فیوز بے کار کر دیا جائے۔ ہاؤس کیپر دوڑتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

میں نے دیکھا' سامنے سے لڑکا کے کے لڑکھڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کی پیشانی پر کسی نے رستے میں روک کے پٹی کروی تھی۔ میں نے دو چھتی میں ملنے والے لڑکے لڑکی کا پوچھا تو کے کے نے بتایا کہ وہ زخمی تھا اور بنسی کے آزاد ہو جانے کے بعد گرتا پڑتا کچن کی طرف بڑھ رہا تھا بلکہ وہاں پہنچ ہی گیا تھا کہ دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے میں لڑکا زخمی ہو گیا ہے مگر ابھی ابھی ولا کے لوگوں نے جو سب کی مرہم پٹی کر رہے ہیں' بتایا ہے کہ لڑکی اس کے ساتھ ہے اور پولیس کی مدد سے وہ اسے اور دوسرے زخمیوں کو اسپتال بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ساتھ ہی کے کے نے یہ تشویشناک مگر اہم اطلاع بھی دی کہ جی دار پولیس والوں کی وہ ٹکڑی واپس آ گئی ہے جو دھماکے کے بعد سامنے بڑے گیٹ کی طرف بہانہ بناتی ہوئی نکل گئی تھی کہ امداد بلانے کو وائرلیس کرنا ہے۔

ہم اب رک نہیں سکتے تھے۔

میں نے کے کے سے کہا کہ چلو سامنے وہ اپنی جیپ کھڑی ہے۔ میرے اشارے پر کے کے نے گیٹ سے باہر جیپ کی طرف دیکھا۔ میری بھی نظر پڑی جیپ وہاں بے شک کھڑی تھی مگر اب اس دل بڑھانے والے منظر کو ایک بڑی سیاہ وین چھپاتی جا رہی تھی۔ کوئی تحقیق کرنے آیا تھا۔ کسی کو وہاں جیپ کی موجودگی کی خبر مل گئی تھی۔

ہم دونوں جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

جیپ کو دریافت کرنے والی بڑی سیاہ وین رک گئی۔

بڑی سیاہ وین پر برمی زبان میں اسٹیٹ پولیس لکھا تھا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور کی سیٹ سے چھلانگ مار کے دو آدمی اترے تھے۔ ایک ایسا ڈرائیور اترا تھا جس کے بدن پر میلا بنیان اور میلا ہی کچھایا انڈر ویئر تھا۔ اس ادھ ننگے ڈرائیور کے ہاتھ میں آٹومیٹک اسالٹ رائفل تھی۔ دوسرا وردی میں تھا اور عام پولیس والی رائفل اٹھائے تھا۔

یہ وہی بدمعاش تھے جنہیں میں گیراج کے ٹائر اسٹور میں بند کر کے پٹرول میں

تر کر کے مقفل کر آیا تھا۔ ٹائر اسٹور کی چابی ابھی تک میری جیب میں پڑی تھی۔

میں نے منہ ہی منہ میں دعا مانگی "خدایا" پھنس گئے ہیں۔ پہلے بھی تو نے نکالا تھا' اب بھی تو ہی نکالے گا مگر ہم نے ایسی کون سی نیکی کی تھی کہ اللہ میاں ہم پر کرم کرتے ہوئے اس بپھرے ہوئے ادھ ننگے پولیس مین وغیرہ سے ہمیں بچاتے۔"

اسے شک سا ہو گیا جبھی پولیس ڈرائیور نے ہماری سمت میں اپنی آٹومیٹک سے اسپرے فائر کیا۔ دو درجن گولیاں طاقت ور مچھر مار اسپرے سے دس بیس گنا زیادہ رفتار سے ہمارے سروں پر سے گزر گئیں۔ باپ رے باپ! بہت غصے میں تھا ننگا بھائی۔"

میرے پاس دو ہینڈ گنیں تھیں مگر ایسی طاقت ور رائفل کے مقابلے میں ہینڈ گنیں کیا کر سکتی تھیں۔ میں نے کے کو بھی دم سادھے رہنے کا مشورہ دیا۔ ہمارا خیال ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہ فائروں سے ڈرا دھمکا کے گالیوں سے ذلیل کر کے چلے جائیں گے۔ ہرگز نہیں' انہیں معلوم تھا کہ ہم یہاں ہیں۔ معلوم تھا کہ یہاں فرار ہونے کو آئے ہیں۔ وہ نہ ہمیں فرار ہونے دیں گے' نہ ولا میں آزاد پھرنے دیں گے بلکہ انہیں موقع ملا تو مار دیں گے۔ مجھے تو مار ہی دیں گے۔

دو تین بار اس پولیس مین نے اپنی اسالٹ رائفل سے اسپرے فائر کیا تو اس کے ساتھی نے ڈانٹ کے کہا "کنجر کی اولاد فائر حرام کر رہا ہے۔ افسر لوگ کو جواب تو مجھے دینا پڑے گا۔ دیکھ کے فائر کر۔"

اس ننگے کانسٹیبل ڈرائیور نے کچھ کہا ہو گا جو سنائی نہ دیا مگر وہ بات اتنی مشتعل کرنے والی ضرور تھی کہ ڈانٹنے والے نے اور بھی غصے میں کہا "یہ لے اپنی رفل پکڑ۔ میری اسالٹ گن مجھے واپس کر دے۔ تیرے باپ کا کنجر ماروں۔" اور آوازوں سے یوں لگا جیسے وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ہوں۔ بس یہی موقع تھا جواب دینے کا۔

میں نے جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر ان کی طرف دو فائر کیے اور جگہ بدل کے درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔

فائروں سے ان کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوا لیکن وہ جس بے خوفی سے آکر مجھے دہشت زدہ کر دینا چاہتے تھے' وہ بات ختم ہو گئی مگر میرے حملے نے ان میں اتحاد اور اتفاق بھی پیدا کر دیا تھا۔ یہ پسندیدہ بات نہیں تھی۔

ان کا ایک فائر آیا' پھر دوسرا۔ پھر سرگوشیاں سنائی دیں' پھر ان میں سے ایک...... وردی والا وین کی اوٹ سے نکل کے بھاگا۔ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد وہ شاید

کمک لینے جا رہا تھا۔ یہ پرانی ترکیب تھی یعنی ایک آدمی اکا دکا فائر کر کے میرے کارتوس خرچ کرتا رہے گا' دوسرا کمک لے کے آجائے گا اور وہ آرام سے مجھے گرفتار کر لیں گے۔

میں نے مولا کا نام لے کے بھاگتے پولیس مین کی ٹانگوں پر فائر کیا۔ ہائے کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

ادھ ننگے نے پکار کے پوچھا "کیا ہوا رے؟"

"انگوٹھا۔" وردی والے نے رو کے کہا۔

ادھ ننگے نے طیش میں آ کے اس درخت پر اسپرے فائر کیا جس کی اوٹ میں لیے ہوئے تھا۔ زخمی انگوٹھے والے نے تکلیف اور جھنجھل میں کہا "اے فائر بچا۔"

میں نے درخت کے پیچھے سے آواز لگائی "ہاں فائر بچا...... کنجر کی اولاد۔"

اسالٹ رائفل والے کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فائر کیا مگر سولو فائر۔ بس ایک ڈز۔

میں نے پکار کے کہا "ہاں یہ مٹی ہے' تیرے باپ کا کنجر ماروں۔"

کے کے کو اس گالی گلوچ میں مزہ آرہا ہوگا۔ وہ ہنس دیا۔ وردی والے کو کے کے کی پوزیشن معلوم ہو گئی' اس نے فائر کیا جو کے کے کو ہٹ کر گیا۔ کے کے نے چیخ ماری' میں دور تھا۔ کے کے اوٹ میں تھا۔ میں نے چیخ کے پوچھا "کیا ہوا؟"

کے کے کی طرف سے خاموشی تھی۔

میں نے آواز لگائی "کے کے! تو ٹھیک تو ہے؟"

جھاڑی میں سے بہت کمزور سی آواز آئی۔ "گولی لگی ہے۔"

اوہ۔ یہ لڑکا جو اب میرا ساتھی تھا' اسے چوٹ نہیں کھانی چاہیے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ بابا کے بارے میں اسی کو تو ساری معلومات ہیں یہ زندہ نہ رہا تو میں بابا تک کس طرح پہنچوں گا۔ میں نے کہا "ٹھہر میں آتا ہوں۔" یہ جملہ میں نے کسی جنگی حکمت عملی میں کہا۔ پھر میں نے ایک پتھر اٹھا کر بالکل ہی غیر متعلق سمت میں پھینک دیا۔

توقع کے عین مطابق جھاڑیوں کو ہلاتے اس پتھر پر اسالٹ رائفل والے نے دو فائر کیے۔ ایک فائر اتفاقاً نشانے پر لگ گیا' پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

دوبارہ میں نے پتھر پھینکا۔ وہ دم سادھے بیٹھا رہا۔

اگلی بار میں رش کرتا ہوا درخت سے نکلا اور کے کے والی جھاڑی کے اور درخت کے آدھے راستے پر سجاوٹ کے لیے چنی ہوئی سرخ چٹانوں کی اوٹ میں جا کے

لیٹ گیا۔

میری اس آہٹ کو وہ میرے پھینکے ہوئے پتھر کا کھڑکا سمجھا تھا۔ دھوکہ کھا گیا ورنہ میں اتنا صاف اور سیدھا نکلا تھا کہ اگر وہ پہلے سے فائر روکنے کا فیصلہ نہ کیے ہوتا تو مجھے آرام سے گرا سکتا تھا۔

اس نے خود کو گالی دی۔ "دھت تیرے کی۔" اور یہاں میں نے اپنی اچانک سوجھ جانے والی حکمت عملی کھیل دی۔

میں نے اپنی قمیص میں ہاتھ ڈال کے ڈائنامائٹ کی ایک اسٹک نکالی تھی۔ اب جیسے ہی پولیس والے کی جھنجلاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے دونوں پولیس والوں کے فاصلے کا حساب رکھ کر ان کی طرف ڈائنامائٹ کی اسٹک پھینکی' خود زمین سے بالکل چپک گیا۔ ساتھ ہی میں نے آواز بھی لگائی تھی "کے کے چھپ جانا۔"

وہ اسالٹ والا باؤلا ہو رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی میری طرف سے کوئی چیز بلند ہوتے دیکھی' اپنی رائفل کا برسٹ کھول دیا۔ "ڈڈاڈڈاڈاابوم۔" سات آٹھ راؤنڈ بے کار ہوا میں تیر گئے مگر ایک راؤنڈ ڈائنامائٹ کو چھو گیا اور جیسے عین میرے سر کے اوپر ایک بوم کے ساتھ دوسرا سورج نکل آیا۔ پھٹے ڈائنامائٹ کی آواز اور روشنی اتنی پاگل بنانے اور خیرہ کرنے والی تھی کہ اگلے چار چھ سیکنڈ کے لیے میں پوری طرح معطل ہو گیا مگر یہ وقت فوری کارروائی کا تھا۔ میں چٹانوں کی اوٹ سے اٹھا اور کالی وین کے رخ بڑھا۔

اسالٹ رائفل والا چت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ شاک میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین کر اپنے کندھے سے لٹکا لی۔ دوسرا وردی والا پیر کا انگوٹھا زخمی ہونے اور دھماکے اور چمک کا اچانک سامنا کرنے کے باوجود رینگتا ہوا اس طرف بڑھا جدھر اس کی پولیس رائفل پڑی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہینڈ گن سے وردی والے کے سر کے پچھلے حصے پہ جما کے ہٹ کیا۔ وہ ڈھیلا ہو کے گر گیا۔ ٹھیک! اب مجھے ان کی جامہ تلاشی لینی چاہیے۔ ایک خالی تھا۔ اسالٹ رائفل والے کے پاس ہینڈ گن تھی جو میں نے اپنے قبضے میں کی۔ پولیس رائفل ضائع کرنی تھی تو وہ میں نے نال کی طرف سے پکڑی اور کالی وین کے اسٹیئرنگ وہیل پر پوری طاقت سے مار دی۔ اسٹیئرنگ وہیل اور رائفل دونوں ناکارہ ہو گئے۔

اس پولیس جوڑی کی طرف سے بے فکر ہو کر اب میں اپنے ساتھی کے کے کی طرف پہنچا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ میں نے دیکھا' اس کا ہاتھ گولی پڑنے سے ایسا ٹوٹا تھا کہ

دو انگلیاں اور آدھی ہتھیلی صاف اڑ گئے تھے۔ بے چارہ ماشیا نو عمری میں اپاہج ہو گیا تھا۔

جیب سے رومال نکال کے بالشت بھر لکڑی کے ٹکڑے سے رومال کو بل دے کے کستے ہوئے میں نے اس کا خون بہنا بند کر دیا۔ پھر اس بے ہوش کو کندھے پر ڈال میں سیدھا جیپ کی طرف چلا۔ میں نے دور سے آتی موٹر کے انجن کی آواز سن لی تھی یا تو وہ پولیس والے کسی کو بلاتے ہوئے آئے تھے یا اب جو ولا کے عقب میں دھوں دھوں ہوئی ہے' اس کی تحقیق کرنے ان کا کوئی ساتھی خود ہی ادھر آ رہا ہے یعنی وقت بالکل نہیں ہے۔

میں نے برابر کی سیٹ پر تہہ کیے ہوئے کمبلوں کے سہارے کے کو لٹا دیا اور جیپ کو پچھواڑے کی ذیلی سڑک پر دوڑانے لگا۔

میرا ذہن آگے کی سوچ رہا تھا اور کان پیچھے کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ بلاشبہ کوئی میرے پیچھے آ رہا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا' دوست نہیں تھا کیونکہ اس نے مجھے روکنے کے لیے ایک وارننگ شاٹ اپنی ہینڈ گن سے کیا تھا۔

ایکسی لیریٹر پر میرے پیر کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا اچھے ٹیون کیے ہوئے انجن اور پورا بھرے فیول ٹینک کے ساتھ اس کا تعاقب کرنے والے کو میلوں تک خاک چٹاتا جاؤں۔

میرے اور تعاقب کرنے والے کا درمیانی فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی اور جنجال میں الجھے بغیر اگر میں ولا سے مناسب فاصلے تک پہنچ جاتا ہوں تو زخمی کے کے کی مرہم پٹی ہو سکتی ہے۔ اگر اس کو صحیح طبی امداد نہ ملی تو کوئی بھی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے اور پیچیدگی کا مطلب ہے یہ شخص جو مجھے میرے بابا تک پہنچا سکتا ہے' میری رہنمائی نہ کر سکے گا۔

سڑک سیدھی جاتے جاتے خبر نہیں کس پل میں لہراتی ہوئی گھوم گئی۔ سورج جو میرے چہرے پر چمک رہا تھا' اب میرے دائیں ہاتھ ہو گیا۔ وہ اکا دکا سواریاں جو راہ میں ملتی آ رہی تھیں' کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئیں۔ میں نے گھبرا کے نوٹ کیا کہ سورج جو کبھی سامنے کبھی دائیں ہاتھ پر چمک رہا تھا' اس وقت میرے عقب میں ہے۔

میں نے گاڑی کنارے لگا کر روک دی۔ "میں کہاں ہوں' کیا بھٹک گیا ہوں تو اب وہ کون ہو گا جو مجھے سیدھے رستے لگائے گا۔"

میں نے کے کے کو پانی پلایا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا' اسے بخار ہو گیا تھا۔ کلائی پر

کسی ہوئی پٹی ڈھیلی کر کے ہاتھ کا دوران خون بحال کیا۔ خون بہہ کر ضائع بے شک ہوا لیکن مستقل پٹی باندھ کے نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ کلائی سے آگے کا ہاتھ یعنی جو انگلیاں باقی بچی تھیں' وہ خون نہ پہنچنے سے مردہ ہو جاتیں۔ اس طرح گینگرین کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ پھر ہاتھ کاٹنا ہی واحد علاج رہ جاتا۔

میں نے سامان میں دیکھا۔ اسپرٹ' ٹنکچر اور اس طرح کی چیزیں موجود تھیں جو معمولی چوٹ یا کٹ وغیرہ پر لگائی جا سکتی تھیں مگر یہ تو سرجری کا کیس تھا۔ ٹانکے لگنا تھے۔ کے کے ہوش میں آتا جا رہا تھا اور ظاہر ہے اب بہت تکلیف میں تھا۔ میں نے اسے دو اسپرین کی ٹکیاں دیں' پھر پانی پلایا اور اسے آرام کا مشورہ دیا۔ آرام کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ آرام اور کام کر کے آگے چلا تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ مجھے رات سے خوف آ رہا تھا۔

یہ میرا وہم تھا یا اس جیپ میں کوئی کھڑبڑی ہو رہی تھی یا واقعی بہت سی شور مچاتی گاڑیاں پیچھے سے اوور ٹیک کرتی تھیں اور میرے برابر سے نکلنے والی تھیں

اچانک عجیب طرح کے شور میں انتہائی بے ڈھنگی' بے ہنگم گاڑیوں نے مجھے گھیر لیا۔ پہلے مجھے وہم ہوا مگر میں نے سوچا' یہ میرا تعاقب کرنے والی سرکاری گاڑیاں نہیں ہو سکتیں۔ انہیں تو میں نہ معلوم کس سمت میں کتنی دور چھوڑ آیا ہوں۔ ہر گاڑی بے رنگ و روغن تھی یا کسی کسی پر رنگ چڑھانے کا تکلف کیا گیا تھا تو صرف کہیں کہیں آف وہائٹ استر چڑھا کر ٹکڑوں اور تھگلوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ باقی دھات پر زنگ آ گیا تھا اور لگتا تھا یہی ان گاڑیوں کا مستقل رنگ ہے۔

بہت ہی پرانی فورڈ اور شیورلے اور بیوک گاڑیوں کا یہ کھڑکھڑاتا پھٹپھٹاتا قافلہ یا تو بہت تیزی سے آ رہا تھا یا اب میرے پاس پہنچ کے کم رفتار ہو گیا۔ ہر ڈرائیور میرے برابر سے گزرتا مجھے تجسس سے دیکھتا نکل جاتا تھا۔ پھر رفتار ہلکی کر کے دوبارہ میرے برابر آتا اور اسی طرح مشاہدہ کرتا۔

کئی بار انہوں نے ایسا کیا۔ وہ یہ کھیل کرتے راستہ طے کرتے رہے۔

یہ عجیب گاڑیوں والے خود حیرت سے دیکھے جانے لائق تھے مگر کیا تماشا تھا کہ سب کے سب مجھے عجیب الخلقت سمجھ کر گھور رہے تھے اور بار بار گھوم گھوم کے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کا رویہ اگر دوستانہ نہیں تھا معاندانہ بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنی رفتار ہلکی کرتے ہوئے انہیں متوجہ کرنے کو خوب ہارن بجائے' پھر پکار کر کہا کہ دوستو! خدا کے لیے کچھ کرو۔

کئی کئی بار جب میں نے یہ بات کہی تو انہوں نے اشارہ دیا کہ گاڑی روک لو۔ وہ بھی اپنی اپنی گاڑیاں سڑک کے ایک رخ لگا رہے تھے۔

میں نے جیپ روک دی اور اتر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی گاڑیاں سائیڈ سے لگا کے ٹہلتے ہوئے آئے۔ جیپ میں پڑے کے کے کو دیکھ کر اسے ہاتھ لگاتے۔ دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلاتے اور ہٹ جاتے۔ کوئی بارہ پندرہ مردوں عورتوں نے جو بوسیدہ برمی شہری لباس میں تھے' کے کے کا اس طرح معائنہ کیا اور سر ہلا کر بغیر کچھ کہے رستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ آخر کار ایک بوڑھا کاؤ بوائے جیسا آدمی ہیٹ اور اونچے جوتے' تنگ پتلون' تنگ جیکٹ پہنے ایسے ہی پرانے گرد آلود لباس میں ادھیڑ عمر کی ایک پرکشش عورت کے ساتھ آیا۔ اس نے کے کے کی پٹی کھول کے اس کا زخم دیکھا۔ پپوٹے اٹھا کر آنکھوں کی پتلیوں کا مشاہدہ کیا اور سب کی طرح اثبات میں سر ہلا کر اس پرکشش عورت سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ ہاں میں سر ہلاتی چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں بید کی بنی ٹوکری اٹھا لائی۔

ٹوکری لے کر بوڑھا میرے پاس آیا' برمی اور اردو ملی انگریزی میں کہنے لگا کہ اس کی انگلیاں اور آدھی ہتھیلی تو اب گئی' وہ نہیں ملتی۔ اچھا ہوا ہم تمہیں مل گئے ہیں۔ معالج ہیں' علاج کر دیں گے۔ جان بچ جائے گی۔

میں نے کہا "تو پھر علاج کرو' انتظار کس بات کا ہے؟"

بوڑھا بولا "پہلے پیسے طے کر لو۔"

عجیب خبیث آدمی تھا۔ میں نے کہا "جو مانگو گے' دے دوں گا۔"

بوڑھا اپنے ساتھ کی ادھیڑ پرکشش عورت کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ "اسے گاڑی سے اتار کے یہاں سڑک کے کنارے لٹا دو اور پرے ہٹ جاؤ۔"

میں نے دو نوجوانوں کی مدد سے کے کے کو سڑک کے کنارے لٹا دیا اور ہٹ گیا۔

اس بوڑھے نے جو کھٹارا موٹر گاڑیوں کے جلوس کا سردار لگتا تھا' اپنی زبان میں اپنے ساتھی مختلف نوجوانوں کو ہدایات دینی شروع کیں۔ وہ سب جو سکون سے سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے تھے' اب جیسے بجلی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح زمین پر پڑے

ککے اور اپنی گاڑیوں کے درمیان گردش کرنے لگے۔ وہ عجیب شکل و صورت کے برتن ٹوکریاں چادریں اور بانسوں کے ٹکڑے اکٹھا کر رہے تھے اور ککے کے گرد ایک خاص ترتیب سے یہ چیزیں جماتے جا رہے تھے۔ اس تمام عرصے میں بوڑھا سرخیل اپنے کاؤ بوائے کپڑوں میں سب سے نمایاں نظر آتا۔ سکون سے کھڑا کبھی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیتا' کبھی ہاتھ نکال کے اشاروں میں اپنے نوجوان ساتھیوں کو ہدایات دینے لگتا۔

ادھیڑ عمر والی پرکشش عورت ایک تپائی سی بے ہوش ککے کے سرہانے بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے جوتے موزے اتارنا شروع کر دیئے۔

نوجوان لڑکوں لڑکیوں نے ککے اور اس پرکشش عورت کو درمیان رکھتے ہوئے اپنی لائی ہوئی چادروں' بانسوں سے ایک بے ترتیب قنات سی تان دی۔ میں نے دیکھا پرکشش ادھیڑ عورت نے تپائی پر بیٹھے بیٹھے جوتوں موزوں کے بعد اپنا زیریں اور بالائی لباس بھی اتار دیا تھا۔ وہ اب جیسے غسل آفتابی کے لباس میں تھی۔ لڑکوں لڑکیوں نے بے ہوش ککے' کے پیروں کے پاس لکڑیوں کے ٹکڑے خشک پتلی شاخیں اکٹھا کر کے آگ جلا دی تھی اور آگ پر خوشبودار مسالہ ڈال کر دھواں کر دیا تھا۔

نیچی بے ترتیب قنات میں اس گروپ کا سربراہ سرخیل اور وہ عورت رہ گئے تھے۔

دھوئیں کے بلند ہوتے ہوتے عورت نے غسل آفتابی کا لباس بھی الگ کر دیا اور اپنے بال ایک بن کی شکل میں سر کی ٹاپ پر باندھ کر اس نے قنات کے گرد اکٹھا ہوتے اور ہوں اوں کی گونجتی آوازیں پیدا کرتے نوجوان کی دھیمی تالیوں اور پیروں کی دھمک پر ہاتھ بلند کر کے چکراتا یا اپنے حسابوں رقص کرنا شروع کر دیا۔

شوخ کاؤ بوائے کپڑوں' جوتوں اور ہیٹ والے بڑے میاں نے بے ترتیب نیچی قنات کے دائرے میں ایک پھیرا لگایا اور خود بھی "ہووں اور اوں اوں ہووں" کی گونجتی آواز پیدا کرتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گردش کی۔ کوئی ایک ڈیڑھ منٹ یہ دونوں مرد عورت دائرے میں کھڑے گردش کرتے رہے۔ ایک ککے کے سرہانے گردش کرتا رہا اور دوسرا اس کے پائینتی۔

ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد وہ ککے کے سرہانے اور پائینتی بیٹھ گئے اور بید کی ٹوکری کو کھولتے بند کرتے' کچھ نکالتے رکھتے رہے جو مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جتنی دیر وہ دونوں ککے کو ٹریٹ منٹ دیتے رہے یعنی اپنے حساب سے اس

کا علاج کرتے رہے' اتنی دیر قنات کے گرد کھڑے کھٹارا گاڑیوں والے نوجوان ہوں اوں' اوں ہوں کی آوازیں پیدا کرتے وہاں موجود رہے۔ آخر کار پہلے عورت ککے کے سرہانے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اسی ترتیب کے ساتھ لباس' موزے جوتے پہنے جس ترتیب سے اتارے تھے اور وہ اپنے رخ سے قنات گراتی ہوئی پھر اس کا ساتھی بوڑھا کاؤ بوائے اپنے رخ سے قنات گراتا نکل آیا اور دونوں ایک طرف کھڑے ہو کر نوجوان لڑکے لڑکیوں کو سامان اٹھا اٹھا کر لے جاتے اور گاڑیوں میں رکھتے بیزار تماش بینوں کی طرح دیکھتے رہے۔

پانچ سات منٹ میں کھٹارا گاڑیوں میں سے نکال کر لائی ہوئی ایک ایک چیز واپس گاڑیوں میں پہنچ گئی۔ بس سڑک کے کنارے زمین پر پڑا ککے رہ گیا۔ وہ سر سے پیر تک پیلے رنگ کی ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور بالکل ساکت تھا۔

لڑکے لڑکیوں کے اپنی اپنی گاڑیوں میں جانے کے بعد بوڑھے سرخیل نے ہنستی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا "اب کھڑے کیا ہو' اپنے ساتھی کو اٹھالو اور ایک طرف لے جا کے بٹھا دو۔ یہ کاہل کب تک پڑا یہاں سوتا رہے گا۔"

عورت ہنسی' وہ ہنسی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ "اٹھاؤ اسے سڑک کے کنارے سونا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

میں نے بڑھ کر زرد کپڑے کی چادر ککے پر سے ہٹا لی۔ وہ واقعی سکون سے سو رہا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے چہرے پر وہ سکون تھا جو ساری رات کے جاگے ہوئے بیمار کے چہرے پر بڑے انتظار کے بعد ملنے والی نیند کا ہوتا ہے۔

میں نے آواز دی۔ "ککے۔"

اس نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔ "ہوں۔"

"ککے اٹھ جاؤ"

"اچھا۔" کہہ کے اس نے خود پر سے چادر ہٹائی اور اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چادر اس نے اسی ہاتھ سے ہٹائی تھی جس میں گولی لگی تھی۔

وہ لمحے بھر بیٹھا رہا' پھر اس نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیر کر نیند سے پیچھا چھڑانے کو "آاہ" کی سی آواز نکالی۔

اس کے گولی کے زخم والے ہاتھ پر میری نظر تھی۔ وہ ہاتھ دو انگلیوں کے بغیر تھا اور آدھی ہتھیلی غائب تھی مگر ہاتھ کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ بس ایک سرخی سی رہ گئی

تھی جو زخم بھرنے کے مہینوں بعد تک رہتی ہے۔ چند گھنٹے پہلے کھایا ہوا زخم بھر گیا تھا۔ کے کے کا ہاتھ بالکل صحت مند ہاتھ تھا...... سوائے اس کے کہ اس کی دو انگلیاں کم تھیں اور آدھی ہتھیلی نہیں تھی۔

میں نے کہا "کے کے! تم...... تمہیں کچھ محسوس ہوا؟ کوئی نئی بات؟"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں ملے۔ بولا "ہاں میرا ہاتھ ٹھیک ہو گیا ہے۔" اس نے یہ بات بالکل نارمل لہجے میں کہی تھی جیسے مجھے عام سی خبر سنا رہا ہو۔

بوڑھے نے کہا "علاج ہو گیا۔ اجرت دو۔"

"ایں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "ضرور ضرور۔ بولو کتنا دوں؟"

"تمہاری یہ جیپ چاہیے۔"

"ایں؟" میں نے اس کی طرف ہنس کے دیکھا۔

وہ سنجیدہ تھا۔ "ہاں جیپ چاہیے...... تم نے خود کہا تھا' جو مانگو گے دوں گا۔" میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

O

کے کے کے ہاتھ پر گولی لگی تھی تو علاج کرنے کے بعد اس بوڑھے نے اجرت مانگی تھی۔ اس کاؤ بوائے کے لباس والے بوڑھے سے میں نے کہا تھا۔ ضرور لو اجرت۔ بولو کیا دوں؟ جواب میں اس نے ہم سے ہماری جیپ مانگ لی' پہلے میں سمجھا مذاق کر رہا ہے مگر جب اس نے کہا کہ تم وعدہ کر چکے ہو کہ جو مانگو گے' دوں گا تو میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

اس کے برابر کھڑی پرکشش عورت بولی "صورت کیا دیکھ رہے ہو' اپنا سامان نکالو جیپ میں سے اور چابی ہمارے حوالے کر دو۔"

"یہ کیا مذاق ہے بھئی' کوئی عقل میں آنے والی بات کرو۔" مجھے اس پاگل پن پر حیرت اور غصہ تھا۔

بڑے میاں بولے "عقل میں آنے والی بات؟ کیا تم نے کہا' عقل میں آنے والی بات؟"

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

بوڑھے نے ہنستے ہوئے سبھاؤ سے کے کے کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ جو تم نے ابھی دیکھا' یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان عورت مرد نے خدا معلوم کس طرح لوبان کے دھوئیں میں ہوں اوں کر کے اور ناچ کے' گا کے کوئی عمل کیا تھا...... سفلی یا علوی...... شیطانی یا رحمانی اور گولی سے چیتھڑے ہوا "کے کے" کا ہاتھ ایسا ہو گیا تھا جیسے کبھی مہینوں پہلے یہ زخم آئے ہوں گے۔ تکلیف بھی نہیں رہی تھی اور زخم مندمل ہو گیا تھا۔

میں نے گڑبڑا کے کہا "وہ ٹھیک ہے۔ تمہارا عمل بہت انوکھا' بہت کارگر ہے۔ میرا ساتھی ٹھیک ہو چکا ہے' مہربانی تمہاری۔"

عورت بات کاٹ کے بولی "یہ شکریہ اور مہربانی خالی بے کار کی باتیں ہوتی ہیں.....روکھڑا' کیش یا کیش لانے والا سامان' سمجھے؟ پراپرٹی۔ ٹھوس اور سالڈ چیز ہوتی ہے' اس لیے اپنے ٹھوس اور سالڈ کام کی اجرت میں ہم ٹھوس سالڈ پیسے یا مال مانگ رہے ہیں۔ جیپ نہیں دیتے ڈھائی لاکھ کیش نکال دو' ہم اپنے رستے چلے جائیں گے' تم اپنی جیپ دوڑاتے نکل جانا۔"

"ڈھائی لاکھ......!" میں چیخ پڑا۔ "ایسی بات کہو جو ہمارے بس میں ہو۔"

اب کے بوڑھے نے جملہ اچک لیا۔ "یہی تو کہہ رہے ہیں ہم۔ ڈھائی لاکھ کیش تمہارے بس کا نہیں ہے.....کم از کم اس وقت نہیں ہے۔ جیپ لگ بھگ اتنے ہی کی ہو گی۔ 10`12 ہزار زیادہ سمجھ لو۔ خیر' وہ کوئی بات نہیں۔ ہم نے تمہارے لیے آسانی کر دی ہے۔ جیپ لے کے ہم نکل جائیں گے۔"

"مگر ہم سفر میں ہیں' ہماری گاڑی......"

"سب سفر میں ہیں۔ دیکھا نہیں ہم کتنے لوگ ہیں۔ یہ سب خوبصورت بچے' ان کی گاڑیوں کا ڈیزل' پٹرول' انجن آئل' ان کا کھانا پینا' دارو کہاں سے آئے گی اور کپڑے' چلو کپڑے ہمارے زیادہ تر سادہ ہیں' وہ کوئی نہیں۔ یہ سارا انتظام مجھے اور اسے......میری عورت کو کرنا پڑتا ہے۔ اگر نہ کریں تو یہ لڑکا لڑکی سب اپنے اپنے گھروں کا رستہ لیں' ہم اکیلے رہ جائیں۔ تو یہ سب خرچا ہے۔ پھر پولیس اور روڈویز کا ڈیپارٹمنٹ بھی ہم سے کچھ ہتھیانے کے چکر میں رہتا ہے۔ چلو تمہارے پاس ابھی کم ہیں تو ہم کم لے لیں گے۔ ڈھائی لاکھ نہ سہی' دو لاکھ چالیس ہزار دے دو۔ دس ہزار کا رقعہ لکھ دینا کہ تم ہمارے مقروض ہو' ادائیگی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "سردار! ہمارے پاس دو لاکھ تو کیا' اس وقت دو ہزار بھی نہیں ہیں اور جیپ ہم دے نہیں سکتے۔ ہمارے پاس ابھی بارہ چودہ سو ہوں گے ٹوٹل۔ وہ لے لو' بات ختم کرو۔"

بوڑھے کے تیور پہلی بار مجھے بگڑے دکھائی دیئے' وہ بولا "بات ختم کرنے کی کہہ رہے ہو؟ آں' سوچ لو......"

مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے جو لفظ معاملہ حل کرنے کے معنی میں کہا تھا' یہ اسے اور ہی معنی پہنا دے گا۔

میں نے کہا "ہاں ختم کرو۔"

بوڑھے نے اپنی عورت کو دیکھا اور کہا "چل ختم کر دیتے ہیں۔" عورت نے اور اس نے ایک ساتھ تالی بجائی "تھاتھا" اور میرے عقب سے جہاں کے کے کھڑا تھا' ایک بھیانک چیخ کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کے دیکھا اور خوف کے مارے سمجھو پتھر بن گیا۔

کے کے کے تازہ زخمی ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی ابھی گولی لگی ہے۔ وہ گھبرا گیا اور جھکا ہوا اپنے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے تھامے خون روکنے کی کوشش میں کلائی کی موٹی ورید کو دبائے ہوئے تھا مگر خون روکنے میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

تکلیف میں ڈکراتے ہوئے اس نے کہا "شیر خان! بچالو' میں مر رہا ہوں......یہ زخم' زخم پھر کیوں ہو گیا؟ شیر خان!"

ارے! میں بھی پریشان ہو گیا۔ انہوں نے' مرد عورت نے یہ کیا کر دیا؟ اسے پھر ویسا ہی کر دیا جیسا علاج سے پہلے تھا۔

میں نے بڑے میاں سے گڑبڑا کے کہا "یہ......یہ مت کرو۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اس کو کیوں تکلیف دیتے ہو؟ آگے کیسے جائیں گے؟ مجھ سے ابھی کچھ پیسے لے لو' باقی کا رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ ہماری جیپ مت لو......تکلیف مت دو۔ ہاتھ اس کا ٹھیک کر دو' سمجھے؟ ہم جھگڑا نہیں کرتے۔ اب نہیں جھگڑیں گے۔ جان چھوڑو لڑکے کی۔"

"مشکل ہے۔" بڈھے کاؤبوائے کی عورت بولی۔ "اب تو بہت مشکل ہے۔"

"میں تمہاری ڈھائی لاکھ کی شرط پوری کروں گا۔ رنگون میں میرا پیسا ہے۔ وہاں تک چلو' پورے ڈھائی لاکھ دے دوں گا۔"

کے کے تیورا کے سڑک پر گر گیا۔ میں نے ہاتھ لگا کے دیکھا' اس کا بدن ٹھنڈا ہوتا جارہا تھا۔ نبض کمزور تھی۔

عورت اطمینان سے بولی "مر جائے گا' بچے گا نہیں۔"

خدایا! یہ ہم کس قسم کے شیطانی جال میں پھنس گئے ہیں؟ یہ لڑکا اگر مر گیا تو پھر میرا رنگون جانا بے مقصد ہے۔ کیسی جیپ اور کس کی جیپ۔ رنگون تک تو پہنچنا ہے' جیپ کے بغیر بھی پہنچ ہی جائیں گے۔

میں نے بوڑھے سے کہا "میں جیپ دینے کو تیار ہوں۔"

عورت بولی "میں نہیں تیار۔ اب نہیں لیتی۔"

بوڑھے نے عورت کو سمجھایا "چل مان لے، جب کہہ رہا ہے، خود خوشی سے کہہ رہا ہے تو مان لے۔"

"نہیں۔"

"اری سن تو وہ۔" وہ دونوں روٹھنے منّنے کا کھیل کھیل رہے تھے اور کے کے مر رہا تھا۔

اس کی نبض تقریباً غائب ہو گئی۔

میں نے کہا "خدا کے لیے۔"

عورت بولی "یہ دہائی مت دو سمجھے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اچھا، اگر دونوں کمبل اور ایک دو چیزیں اور تم جیپ ہی میں چھوڑ دو تو ہم جیپ لے لیں گے۔ جی تو نہیں کرتا مگر تم اتنا کہہ رہے ہو، اس لیے۔"

میں نے کہا "کمبل بھی اور جو بھی تم کہو۔ یہ میری گاڑی بھی اور جو مانگو سب تمہارا۔"

عورت نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

کے کے نے ایک گہری سانس لی، یوں لگا جیسے مرنے سے پہلے وہ پھیپھڑے بھر کے سانس لینا چاہتا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "لے لو ہماری جیپ۔"

عورت نے مرد کی طرف دونوں ہتھیلیاں پھیلا دیں اور اپنے ہی کسی اشارے میں کہا "ہوں۔"

مرد نے اس کی ہتھیلیوں پر اپنی ہتھیلیاں ماریں، پھر اس نے بھی ہونکارا ابھرا۔

کے کے نے تسکین کی سانس لی۔ وہ اٹھ کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لگتا تھا جیسے ایک دم ٹھیک ہو گیا ہے۔ پھر وہ سڑک پر اپنا بے انگلیوں، آدھی ہتھیلی والا ہاتھ ٹکا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے نہ صرف خون بہنا بند ہو چکا تھا بلکہ پہلے کی طرح زخم ایسا نظر آنے لگا تھا جیسے اندمال ہو چکا ہے۔ مہینوں پہلے خشک بھی ہو چکا۔

میں نے فکرمندی سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ "کے کے......اب کیا حال ہے؟"

وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ قدم بڑھا کے میری طرف آیا، بولا "ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔"

میں نے پوچھا "ابھی کیا ہوا تھا، کچھ یاد ہے؟"

اس کے لہجے میں شکوہ تھا "چھوڑو! مت یاد دلاؤ۔ آؤ یہاں سے چلیں۔" وہ پیدل چل پڑا۔

میں نے بوڑھے سے کہا "اگر کچھ دور ہمیں گاڑی میں بیٹھنے دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جیپ کی چابی بوڑھے کی طرف اچھا دی مگر دل میں کہا "لعنت ہے ان دونوں کی صورتوں پر۔"

بوڑھے نے اپنی طرف آتی چابی ہاتھ بڑھا کر جھیل لی۔ پھر مسکراتے ہوئے اپنی عورت کو تھما دی۔ اس نے چابی کو چوم کے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ میری طرف مسکرا کے دیکھنے لگی۔ اس کے گالوں میں بہت دل آویز گڑھے پڑ رہے تھے۔ مجھ سے بولی "شکریہ۔" پھر اپنے مرد سے کہنے لگی۔ "یہ دونوں اگر رنگون جا رہے ہیں تو بٹھا لو...... میں جیپ چلا لوں گی، یہ تمہارے پاس بیٹھ جائیں گے۔"

کے کے چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اس نے عورت کی بات سن لی۔ بولا "جیپ میں ہمارے کھانے کی چیزیں اور ان کے کپڑے ہیں۔ وہ دے دو۔ یہ کب تک مانگی ہوئی وردی پہنے پھریں گے۔"

عورت اپنی گاڑی سے اتر آئی، کے کے سے بولی "تم آ جاؤ میرے ساتھ۔ کمبل ومبل جیپ میں چھوڑ دینا اور جو سامان نکالنا ہو، نکال لینا۔" پھر وہ جاتے جاتے رک گئی، بولی "دیکھا؟ میں سمجھ رہی تھی، یہ وردی اس کی اپنی نہیں ہے۔ اگر یہ اصلی پولیس والا ہوتا تو ہم اس سے اتنے پیسے نہیں لیتے، کچھ رعایت کر دیتے۔" وہ ہنسی "مجھے پولیس والے پسند ہیں، سچی......ہی ہی ہی۔"

میں نے دل ہی دل میں پھر اس پر لعنت بھیجی۔

کے کے کھانے کا سامان، میرے کپڑے اور دو چار فضول سی چیزیں جیپ سے نکال لایا۔ کمبل عورت نے نہیں دیئے۔ جیسا کہ اندازہ تھا کہ وہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ پرانی برساتیاں یا برف باری میں پہننے کے لمبے کوٹ نہ معلوم کیسے جیپ میں آ گئے تھے، وہ اس نے چلتے چلتے کے کے کی طرف اچھال دیئے۔ بولی "سردی لگے تو پہن لینا۔"

ہم دونوں بوڑھے کی پونٹیاک کار میں جو دوسری گاڑیوں سے قدرے بہتر تھی، سوار ہو گئے۔ بوڑھے نے تین بار عجیب آواز کا ہارن بجایا اور اپنی گاڑی سب سے آگے نکال کر تیز رفتار سے چلانے لگا۔ پیچھے آنے والی دوسری گاڑی ہماری جیپ تھی جسے اس کی عورت چلا رہی تھی۔

میں نے چلتی گاڑی میں پولیس کی وردی اتار کے اپنے کپڑے پہن لیے تھے۔ بڑے میاں کی پونٹیاک کار شیشے ٹوٹی اور سب طرف سے کھلی تھی۔ ہوا کی کاٹ سے بچنے کو بڈھے کے مشورے پر ہم دونوں نے برف باری والے لمبے کوٹ پہن لیے۔ ذیلی سڑکوں سے نکل کے گھومتا پھرتا ان کا گروہ پھر رنگون جانے والی سڑک پر آ گیا تھا۔ سورج اب ہمارے پیچھے تھا۔

ہم دو گھنٹے بھی اس سڑک پر نہ چلیں ہوں گے کہ سامنے سے سیاہ رنگ کی تیز رفتار گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ یہ شاید پولیس تھی۔ بوڑھا اپنی پونٹیاک کو ایک خستہ حال بورڈ اسٹیشن ویگن کے برابر لے آیا جسے ایک داڑھی والا لڑکا چلا رہا تھا۔ دو دبلی پتلی لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ بوڑھے نے اپنی زبان میں لڑکیوں سے کہا "وہ دونوں سرکس میں کام کرنے والوں کی طرح اس چلتی گاڑی سے لٹک گئیں اور جست لگا کے ہماری والی پونٹیاک میں آ گئیں۔ ہمارے ساتھ دوسری گاڑیاں اس بری طرح دھول اڑا رہی تھیں کہ مجھے یقین تھا سامنے سے آتی پولیس گاڑی والوں نے یہ کارروائی نہیں دیکھی ہو گی۔

بوڑھے نے جواب تک آگے آگے چل رہا تھا' دوسری گاڑیوں کو آگے نکل جانے دیا۔ ہم شور کرتے چھپتے چھپاتے اس کباڑی قافلے کے تقریباً وسط میں آ گئے تھے۔ دوسرے اور ہی لوگ اب رہنمائی کر رہے تھے۔

زیادہ دیر نہ ہوئی ہو گی کہ سامنے سے آنے والوں نے ہمیں روک لیا۔

گاڑیوں کے رکتے ہی دونوں لڑکیاں کھسک کے میرے اور کے کے کے قریب آ گئیں۔ انہوں نے عجیب ڈھب کی ٹوپیاں اپنی جینز کی جیبوں سے نکالیں اور میرے اور کے کے کے سر پر منڈھ دیں۔ پھر پولیس والوں کے آنے سے پہلے کے کے سے اور مجھ سے جڑ کے وہ اس طرح بیٹھ گئیں جیسے ہم پر فدا ہو رہی ہوں اور ہمیں سردی اور ہوا سے بچانے کے لیے یہ سب کر رہی ہوں۔

موٹروں کے قافلے میں پولیس والے گھس آئے تھے اور قافلے کے لڑکا لڑکی شہد کی ناراض مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ وہ انہیں گالیاں دے رہے تھے۔ ان پر طنز بھی کر رہے تھے۔ ایک نے پکار کے کہا "اچھے بھلے جا رہے تھے ہم' رک کیوں گئے؟"

دوسرے نے جواب دیا "سامنے سے گدھ آ کے ٹکرا گئے ہیں' مجبوری ہے۔"

"کچھ دے دلا کے پیچھا چھڑاؤ۔" کسی لڑکی نے مشورہ دیا۔

"ہاں لیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔"

پہلی لڑکی بولی "ان کا جو بھی انچارج ہے' اسے اپنے پاس بلا کے ایک چما دے دے...... کھیل ختم۔"

ایک لڑکا ہنسا۔ "ختم کیسے پھر تو ایک اور ہی کھیل شروع ہو جائے گا۔"

"ہاں' یہ سالے پھر نہیں رکنے کے۔ انہیں دور ہی رکھو۔"

"خاموش! یہ کسی پولیس والے کی آواز تھی۔"

لڑکا لڑکی ایسے خاموش ہو گئے جیسے واقعی ڈر گئے ہوں۔ دو تین کھی کھی کر کے رازداری سے ہنسنے لگے۔

پولیس والے نے اپنے روکھے دیہاتی لہجے میں تقریر سی شروع کر دی۔

"سنو! دو مفرور ملزمان ایک جیپ لے کے فرار ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کو رستے میں کوئی مشکوک فرد یا افراد تو نظر نہیں آئے؟"

"آپ کے سوا ہمیں کہیں مشکوک افراد نہیں ملے۔" ایک کمزور مگر شریر آواز نے کہا

"یہ کون تھا۔ ذرا سامنے آئے بھئی!" پولیس والے کو طرارہ آ گیا۔

تین چار آوازوں نے مل کے گانا شروع کر دیا "ذرا سامنے تو آؤ چھلیے۔"

وہی پولیس والا جیسے غصے میں دیوانہ ہو کے ڈکرایا "چوپ!"

ایک اور نے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے لڑکے لڑکیوں کو دھمکی دی کہ اگر وہ لوگ اسی طرح بدمعاشی کرتے رہے اور انہوں نے سرکاری لوگوں کی مدد نہ کی تو بہت برا انجام ہو گا۔ پولیس والے قافلے کو آگے نہیں جانے دیں گے۔

ایک لڑکے نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا "آخر آپ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

پولیس نے کہا "ہم سے تعاون کریں۔ ہم مفروروں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری مدد کرو۔"

سنجیدہ آواز نے کہا "ہم مدد کرنے کو ہر طرح تیار ہیں۔ آپ تلاشی لینا چاہتے ہو' تلاشی لو۔ ہمیں اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے ہو' ہم ساتھ چلتے ہیں۔"

اس پر بہت سی آوازوں نے "آاں" کر کے احتجاج کی آواز نکالی۔ سنجیدہ لڑکے نے ڈانٹ دیا "خاموش رہو! سرکاری کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنا ہے۔ اگر یہ لوگ سرچ کرتے ہیں' سرچ کرنے دو۔"

ایک لڑکا پکارا "ان کے پاس کیا سرچ وارنٹ ہے؟" ایک لڑکی بولی "ارے ان

کے پاس تو اپنا شناختی کارڈ نہیں ہوتا۔" دو تین لڑکے لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنس پڑیں۔

مگر ان سب پر جیسے پولیس والوں کا رعب پڑ گیا تھا۔ قافلے کے لڑکوں اور لڑکیوں نے کبھی کھی کھی کر کے، کبھی مصنوعی سنجیدگی سے انہیں بہر حال تلاشی لے لینے دی۔

وہ تعداد میں آٹھ نو تھے۔ دو پولیس والے بوڑھے کی گاڑی کی طرف بھی آئے۔ بوڑھے نے کامیاب اداکاری کرتے ہوئے اونگھنا شروع کر دیا۔ ایک اس سے دیوانے پن کے الجھے ہوئے سوالات کرنے لگا یا شاید بڑے میاں نے ہی اسے الجھا دیا تھا۔ دوسرا ہماری طرف آیا۔ لڑکیاں ہماری گردن میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں۔ ایک جو میرے حصے میں آئی تھی' بے حد تیز و طرار تھی۔ وہ سر سے سر بھڑائے میرا منہ چوم رہی تھی اور پولیس والے کو دیکھ کر اور میرے نزدیک چلی آئی تھی۔

پولیس والا یہ سب دیکھ کے گڑبڑا گیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے مجھ سے کہا

"اے' اے...... بات سنو جی۔"

میری طرف سے لڑکی نے اوں اوں کر کے اسی طرح مصروفیت میں پوچھا کہ کیا بات ہے؟

پولیس والے کو شک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کے لڑکی کو مجھ سے الگ کرنا چاہا۔ لڑکی نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ چلایا جو اس کے کان پر لگا۔ میں نے لڑکی کی اوٹ سے چہرہ نکال کر اس کی طرف نہ معلوم کیوں دیکھا اور بس یہی غضب ہو گیا۔ میری اور پولیس والے کی نظریں ملیں۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جسے وردی سمیت ٹائر اسٹور میں پھینک کے میں نے پٹرول میں تر کر دیا تھا۔ میں اسے اور وہ مجھے پہچان گیا تھا۔

اس نے خبر دار کرنے کے لیے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تھپڑ چلانے والی لڑکی نے اس کے منہ پر منہ رکھ کے اس کی سانس روک دی۔ "اوں اوں اوں" اس نے ہاتھ پیر چلائے اور لڑکی کے مجنونانہ شکنجے سے نکلنا چاہا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر قابو میں کر لیے۔

اس کا ساتھی بوڑھے کاؤ بوائے سے سوال جواب کر کے آگے کسی گاڑی کی طرف جا چکا تھا۔ بڑے میاں کو گاڑی کے اس حصے میں ہونے والے واقعے کا علم اب ہوا۔ وہ مجھے اور لڑکی کو پولیس والے سے لپٹا دیکھ کر سکون سے اٹھا اور گاڑی میں کہیں ہاتھ ڈال کر اس نے اسٹیل کی ایک راڈ نکالی اور "دھت!" کر کے پولیس والے کی گدی پر ماری۔

وہ خاموش اور ڈھیلا ہو کر جھول گیا۔ بوڑھے نے لڑکی کی مدد سے پولیس والے کو سیٹ سے گرا کر اس پر ربڑ کے میٹ جمال دیے اور ہم کو اشارہ کیا کہ ہم سیٹ پر پاؤں جما کے بیٹھ جائیں۔

اس تمام عرصے میں کے کے سے چمٹی ہوئی لڑکی اسی طرح چمٹی رہی۔ بس یہ ہوا کہ پولیس والے پر میٹ بچھنے کے بعد کے کے نے اور اس کی ساتھی لڑکی نے سہولت سے سیٹ پر اپنے پاؤں جما لیے تھے۔ ہم نارمل ہو کے مطلب دونوں ے ایک دوسرے سے گھلے ملے اور بڑے میاں ڈرائیونگ سیٹ پر اونگھتے ہوئے بیٹھے ہی تھے کہ وہ پولیس والا جو بڑے میاں سے متھا ماری کر کے چلا گیا تھا' اپنے ساتھی کی تلاش میں لوٹ کے ہماری گاڑی کی طرف آیا۔ یہاں حالات ویسے ہی نارمل تھے۔ ہم دو نوجوان جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے چہرے سے چہرے بھڑائے گھلے ملے بیٹھے تھے اور کسی بھی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ بڑے میاں تو ظاہر ہے اونگھتے تھے۔

پولیس والا اپنے غائب ہو جانے والے ساتھی کو آواز دیتا۔ ہمیں گھورتا مگر ہماری طرف سے مطمئن ہو کے چلا گیا۔

دو تین منٹ بعد پولیس کی گاڑیاں جس تیزی اور ہڑبونگ میں آئی تھیں' اسی طرح چلی گئیں۔

عجیب قصہ تھا۔ ان کا ایک آدمی کم تھا اور پھر بھی انہیں اس کمی کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ مفروروں کے تعاقب میں اس طرف روانہ ہو چکے تھے جدھر سے ہم چلے آ رہے تھے۔

قافلہ آگے بڑھ گیا۔

بوڑھے کاؤ بوائے نے گاڑی روک کے اسٹیئرنگ اس لڑکی کے حوالے کر دیا جو مجھ سے الجھی بیٹھی تھی۔

خود وہ گاڑی کے گلو کمپارٹمنٹ میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ اسے اپنے کام کی چیزیں مل گئیں تو وہ سیٹ پھلانگ کے پیچھے ہماری طرف آ گیا۔ پیچھے بیٹھے ہوؤں کو اس نے اشارہ کیا۔ وہ اور لڑکی میٹ اٹھا کر چکرائے ہوئے پولیس والے کو تھام کر بیٹھ گئے۔ پھر بوڑھے نے گلو کمپارٹمنٹ سے لائی ہوئی شیشی کا ڈھکنا کھولا اور پولیس والے کو تھوڑا تھوڑا کر کے شیشی کی چیز پلانے لگا۔ مجھے بو آ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پولیس والے کو شراب پلا رہا ہے۔ بے ہوش آدمی نے حلق سے بہت آوازیں نکالیں مگر وہ پلاتا رہا۔ پوری ایک

شیشی پلا دینے کے بعد اس نے گاڑی چلانے والی لڑکی سے کچھ کہا۔ اس نے ایک طرف گاڑی روک دی۔ میری اور کے کے کی مدد سے بوڑھے نے پولیس والے کو سمجھو ڈنڈا ڈولی کر کے اتارا اور سڑک کے کنارے اگے ایک درخت کی چھاؤں میں لٹا دیا۔ وہ بے ہوش اور اب چڑھتے نشے میں کروٹ بدل کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے کچھ بکنے بھی لگا تھا۔ بوڑھے کے کہنے پر ہمارے ساتھ آئی ہوئی لڑکی نے آرام سے اپنی مردانہ قمیض اتاری۔ اتار کر اس نے قمیض دوبارہ پہن لی اور اتارا ہوا ریشمی کپڑا پولیس والے کی وردی کی جیب میں ٹھونس کر اس کے سرہانے شراب کی خالی بوتل پھینک کر چل پڑی۔

بوڑھے نے ہمیں بھی اشارہ کیا کہ چلو۔ ہم واپس پونٹیاک میں آبیٹھے اور جلوس میں شامل ہو گئے۔

اب جب بھی پولیس والی گاڑی کو آدمی کی کمی کا اندازہ ہو گا' وہ لوٹیں گے تو ان کا ساتھی انہیں درخت کے نیچے آرام کرتا مل جائے گا۔ پھر وہ موٹروں کے جلوس کا پیچھا نہیں کریں گے۔

ہم بوڑھے کی فراست کی داد دیتے ہوئے راستہ طے کرتے رہے۔

درخت کے نیچے پڑا شراب میں دھت پولیس والا جس کی جیب سے مختصر سا زنانہ ریشمی کپڑا برآمد ہو گا' جتنی بھی دلیلیں دے' خود کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکے گا۔ اپنے افسروں' ساتھیوں کی نظر میں اب وہ طے شدہ "بدمعاش پولیس والا" تھا۔

رات ہوتے ہوتے ہم ایک قصبے کے بازار میں تھے۔ بوڑھے کے سب ساتھی جس کا جہاں سینگ سمایا ادھر چل پڑا۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی چلی گئیں' خود بڑے میاں سکون سے ایک پٹرول پمپ کے پاس ہم دونوں کو لیے بیٹھے رہے۔ لگتا تھا انہیں کسی بات کا انتظار ہے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جیپ چلاتی ہوئی اس کی عورت آئی اور ہمیں پٹرول پمپ کے پاس کھڑا دیکھ کے رک گئی۔

میرا غصہ کم ہو گیا تھا۔ انہوں نے جیپ بے شک چھین لی تھی مگر کے کے کا ہاتھ ٹھیک کر دیا تھا اور ہمیں پولیس والوں سے بچا لیا تھا۔

عورت میرے پاس آئی' دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر ٹکا کر بولی "اب تم جاؤ۔"

"جاؤ کیا مطلب؟ ان لوگوں نے تو ہمیں رنگون تک لفٹ دینے کا وعدہ کیا تھا؟"

میں نے اس سے کہا تو ہنس کے بولی "ہم ادھر مڑ جائیں گے اور رنگون شہر ادھر ہے۔ ہمارا تمہارا ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ کچھ غصہ بھی آیا۔ مایوسی بھی ہوئی مگر شکایت کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے خالہ ہم جاتے ہیں۔"

میں نے تقریباً جھلسن میں یہ بات کہی تھی تو بوڑھے کی عورت نے ہنستے ہوئے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میری پیشانی چوم لی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز میری قمیض کی جیب میں ڈال دی۔ ہنستے ہوئے اور میرا گال تھپتھپاتے ہوئے وہ مڑی اور اپنے مرد کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت بہت دلکش لگ رہی تھی' دونوں گالوں کے گڑھے اسے اور بھی حسین بنا رہے تھے۔

میں نے بے خیالی میں جیب سے وہ چیز نکالی جو بوڑھے کی عورت نے ڈالی تھی۔ یہ ہماری جیپ کی چابی تھی۔ میں نے حیران ہو کر اسے' اس کے مرد کو دیکھا۔

"جاؤ۔ یہ رستہ رنگون کو جاتا ہے۔"

بڑے میاں نے بھی ہنستے ہوئے آنکھ ماری۔ "تم سے جیپ ہتھیا کے میری عورت ویرانے میں نہ نکل جاتی تو بیٹا! تم پکڑے گئے تھے۔ اب ان بدمعاشوں کا کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ وہ پیچھے آئے بھی تو ہمارے پیچھے آئیں گے۔"

میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس ہمدرد جوڑے کا شکریہ ادا کروں۔ انہوں نے ہم پر یہ کتنا بڑا احسان کیا تھا۔

میں بڑھ کر پہلے بڑے میاں سے' پھر ان کی عورت سے بغل گیر ہوا۔ کے کے تو دوڑ کر ان دونوں کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

بڑے میاں نے دوستوں کی طرح میری گردن میں بانہیں ڈال دیں' بولے "اب دیر مت کرو بیٹا! اسپیڈ اچھی رکھنا تاکہ تم پانچ چھ گھنٹے میں رنگون پہنچ جاؤ اور ایک بات کا خیال کرنا۔ رنگون پہنچ کے سب سے پہلے وہاں کے سول اسپتال چلے جانا۔ ایک سرجن دوبے صاحب ہیں وہاں' دوبے کے حوالے اپنے ساتھی کو کر دینا۔ دیر مت لگانا اور بھولنا مت۔ دوبے سے کہنا زورا صاحب نے عارضی علاج کر دیا تھا' اب آپ سنبھالو...... زورا میرا نام ہے۔ اچھا جاؤ۔"

کے کے نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا' پھر ہاں میں سر ہلاتا کہنے لگا "پروا مت کرو۔ شیر خان بھول بھی گیا تو میں نہیں بھولوں گا۔ سرجن دوبے؟ ہاں؟ سول ہسپتال؟"
بوڑھے نے خوش مزاجی سے سر ہلایا اور کے کے کو اور مجھے آنکھ مار کے خدا حافظ کہا۔

وہ دونوں مرد عورت اپنی پونٹیاک میں بیٹھے اور ہماری طرف دیکھے بغیر تیزی سے اپنی گاڑی بڑی سڑک پر نکال کر اپنا عجیب و غریب ہارن بجاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔
ہم نے بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جیپ سنبھالی اور رنگون والے رستے پر اڑے چلے گئے۔

میں نے بوڑھے کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے رفتار تیز بلکہ بہت تیز رکھی۔ روانہ ہونے کے پانچ گھنٹے اور دس منٹ بعد ہم رنگون شہر میں داخل ہو رہے تھے۔
رات کے وقت بھی سول اسپتال کا رستہ بتانے والے ہمیں مل ہی گئے۔ ساڑھے پانچ گھنٹے بعد جب میں جیپ کو اسپتال کے پارکنگ ایریا میں لگا رہا تھا' دن نکلنے والا تھا۔ میں نے ری سپشن ڈیسک پر پوچھا کہ سرجن دوبے سے کہاں اور کب ملاقات ہو سکتی ہے تو ڈیوٹی پر بیٹھے مرد نرس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی آئے ہیں اور فلاں نمبر کے کمرے میں ہیں۔

میں کے کے کو لیتے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کے کے تھکن سے یا کسی اور وجہ سے کھڑے کھڑے لہرانے لگا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے منہ سے کچھ نہ کہا' اپنے ہاتھ کی طرف اشارہ کر دیا جسے وہ دوسرے ہاتھ سے تھامے ہوا تھا۔ شاید تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو کسی نے درشتی سے "ہوں" کہا جیسے ہمیں دوڑا دینا چاہتا ہو یا کہہ رہا ہو کہ "ڈسٹرب مت کرو۔" یا "رکو۔" کے کے نے دروازے پر ہاتھ بھی مارا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھا۔
"ڈاکٹر دوبے مریض کو دیکھ لیجیے پلیز!"
انگریزی میں کسی نے ڈانٹا۔ "مریضوں کو صبح آٹھ بجے دیکھتا ہوں' جاؤ۔"
میں کچھ کہنے والا تھا کہ کے کے نے تکلیف سے تقریباً روتے ہوئے کہا "میں زورا صاحب کا مریض ہوں۔ تکلیف میں ہوں۔ پلیز ابھی دیکھ لیں۔"
تیزی سے دروازہ کھلا۔ زورا صاحب کا نام جیسے کوئی طلسمی نام تھا کہ اندر بیٹھے

سرجن نے بات بھی پوری نہ سنی' وہ صرف ایک آستین میں بازو ڈالے ہوئے تھا۔ اپنے سفید کوٹ کو لٹکتا گھسیٹتا چھوڑ کے سرجن دوبے باہر آ گیا۔ اس نے باری باری مجھے اور کے کے کو دیکھا۔ لمحے بھر میں سمجھ گیا کہ مریض کون ہے اور زخمی ہاتھ کون سا ہے۔ اس نے بڑھ کر کے کے کا ہاتھ پکڑا' اسے اوپر اٹھائے ہوئے کے کے کو لیے وہ دو دروازے چھوڑ کر تیزی سے تیسرے دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کے کے کا زخم پھر تازہ ہو گیا ہے۔
کہنی تک اس کا ہاتھ خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔
"خدا رحم کرے۔" میں نے دل میں کہا۔ "اب انتظار کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔" اور میں دروازے کے باہر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔
میں اور میرا ساتھی ٹھیک وقت پر صحیح جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
ڈیڑھ دو گھنٹہ تک اس کرسی پر بیٹھا نرسوں' ڈاکٹروں اور عملے کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ آخر کار کوٹ کے بٹن کھولتا رومال سے چہرہ پونچھتا سرجن دوبے باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کے بولا "آؤ۔"
میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے بٹھا کے وہ خاموشی سے بجلی کے پرکولیٹر پر کافی بنانے لگا۔ دو پیالیاں کافی بنا کے اپنی سیٹ پر آیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ بولا "میں نے تم سے دودھ یا کریم کا نہیں پوچھا۔ یہاں اس وقت نہ دودھ ملتا ہے' نہ کریم۔ اس لیے یہ کافی پیو۔ میٹھا کم لگے تو بتا دو۔ کیا تمہارا نام شیر خان ہے؟" اس نے عجیب طرح سے باتوں کی روانی میں مجھ سے میرا نام پوچھا تھا۔
میں نے کہا "ہاں...... شیر خان۔"
میں نے شکریہ ادا کیا اور کافی اٹھا لی۔ کے کے' کے بارے میں کچھ سوال نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا' وہ خود ہی بتا دے گا۔
اچانک بولا "اس لڑکے کا نام کیا ہے؟"
"کے کے"
"اچھا اس کے کے کو گولی کس طرح لگی تھی؟"
وہ ماہر سرجن تھا۔ اس سے یہ بات کیسے چھپی رہتی کہ زخم گولی کا ہے۔ میں نے کہا "ہمارے دوست مونگ لی کی ٹمبر جائیداد پر ڈاکوؤں کا حملہ ہوا تھا' اسی میں زخمی ہوا ہے۔"

"اور پولیس کا کیا چکر ہے؟"

"پولیس؟" سرجن کو کتنا بتایا جا سکتا تھا' کتنا نہیں۔ میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔

وہ بولا "مریض نے بے ہوشی میں کچھ اس طرح کی باتیں کی ہیں جن سے لگتا ہے کہ پولیس نے گولی چلائی تھی یا پولیس کے کے کا پیچھا کر رہی تھی۔ ویسے شیر خان! تم اگر نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی اصرار نہیں ہے۔"

میں نے دھیرے سے پوچھا "سرجن دوبے! میرا ساتھی اب کیسا ہے؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا "شکریہ۔ آپ نے توجہ دی۔ ویسے ہمیں کچھ چھپانا بھی نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کو سرکاری ریکارڈ کے لیے یہ معلومات درکار ہیں تو میری ایک درخواست ہے۔"

وہ بولا "نہ نہ۔ سرکاری ورکاری کچھ نہیں۔ تم اگر نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ یا اگر چاہتے ہو کہ میں مریض کا نام' پتا اور زخموں کی نوعیت کچھ بھی لکھ دوں تو میں آسانی سے یہ سب کر دوں گا۔ زورا میرا دوست ہے۔ تم دونوں اس کا نام لے کر آئے ہو تو تم بھی دوست جیسے ہو گئے۔"

میں نے کہا "آپ سرکاری رپورٹ میں کچھ بھی لکھ دو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم دونوں کالی ٹمبر جائیداد کا زورا صاحب کا یا پولیس کا کوئی بھی ذکر آپ کی رپورٹ میں آئے۔ اصل قصہ یہی ہے کہ میرے ساتھی کو پولیس کی گولی لگی ہے۔ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ اگر زورا صاحب' اس کا موٹر جلوس ہمیں نہ ملتا تو میرا ساتھی اب تک خون بہہ جانے سے مر چکا ہوتا اور میں قید میں ہوتا۔"

ڈاکٹر دوبے نے سمجھداری سے سر ہلایا' بولا "میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا زورا صاحب بیچ میں ہے تو لازماً' دوسری پارٹی برمی پولیس ہو گی۔ وہ اور اس کی عورت پولیس سے باقاعدہ نفرت کرتے ہیں۔"

میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ برمی پولیس کا ایک وزیر میرے پیچھے ہے۔ اس نے میرے باپ کو قید کیا ہوا ہے۔ کے کے کو وہ جگہ معلوم ہے جہاں میرے باپ کو رکھا گیا ہے۔ زورا صاحب نے اور آپ نے میرے اس ساتھی کو بچا کر مجھ پر بھی احسان کیا ہے۔"

سرجن دوبے اپنی کافی پی چکا تو بولا "اب آؤ......اپنے ساتھی کو دیکھ لو۔ وہ خطرے سے باہر ہے۔ ابھی تو سو رہا ہے یا سمجھو بے ہوش ہے۔ اس سے بات نہیں ہو سکتی

مگر تم دیکھ لو۔"

اسے اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ ہاتھ میں بھاری بھرکم پٹی بندھی تھی۔ کے کے کا چہرہ پیلا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ سکون سے سانس لے رہا تھا۔

کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہ کر میں سرجن دوبے کے ساتھ باہر آ گیا۔

وہ کہنے لگا۔ "آؤ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے' آٹھ بجے میں مریض دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تمہارے بارے میں اب فکر ہو گئی ہے۔"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا تو میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں اپنا کچھ انتظام کر لوں گا' وہ میرے بارے میں فکرمند نہ ہو۔

سرجن دوبے ہنسا۔ کہنے لگا "میرا دوست زورا صاحب تمہاری فکر کرتا تھا۔ ابھی بھی اس کو تمہاری فکر ہو گی۔ بھلا میں تمہیں کیسے بے حفاظت چھوڑ دوں۔ آج نہیں تو کل ضرور پولیس والے تمہاری اور کے کے کی تلاش میں ادھر پہنچ جائیں گے۔"

سرجن ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا اور اس سے پوچھا کہ پولیس سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ ویسے تو مجھے اس سے بہت سی چیزیں سمجھنی تھیں۔ زورا صاحب کا یہ عجیب و غریب "علاج" ان میں سے ایک تھا مگر پہلی چیز پہلے۔ ہمیں پولیس سے خود کو بچانا تھا۔

ڈاکٹر دوبے کہنے لگا "تمہارے دوست کو پورے چار دن اسپتال میں آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے ہاتھ میں سولہ ٹانکے آئے ہیں۔ خون بھی کافی بہہ گیا ہے۔ میں چار دن اسے یہیں رکھوں گا۔ اس دوران پولیس والے آئے تو انہیں ٹال دوں گا۔ یوں سمجھو کے کے تک انہیں نہیں پہنچنے دوں گا۔"

زخم کی کیفیت کے بارے میں ڈاکٹر نے بتایا تو مجھے تجسس ہوا۔ میں نے کہا "ہم نے رستے میں زورا صاحب کے علاج کے بعد ہاتھ کے زخم کو پوری طرح مندمل ہوا دیکھا تھا۔ وہ کیا تھا؟"

ڈاکٹر بولا "نظربندی۔ سمجھو مسمریزم۔ ایک طرح کا شعبدہ۔ زورا نظربندی کا نمبر ون ہے۔ اس نے اور اس کی عورت نے خون روکنے اور تکلیف رفع کرنے کی بھی کچھ جڑی بوٹیاں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں۔ اس علاج کے ساتھ ساتھ وہ لوگ ایسی نظربندی

کر دیتے ہیں کہ خود مریض اور اس کے متعلقین سمجھتے ہیں کہ کسی طرح کا جادو ہوا ہے اور ان کے "عمل" سے مریض کے زخم بالکل بھر گئے ہیں مگر اصل میں ایسا نہیں ہوتا۔ نظر بندی ہٹاتے ہی مریض کو سرجری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرجری ہو گئی ہے' اب تمہارا ساتھی فطری انداز میں صحت یاب ہوتا چلا جائے گا۔"

میں نے پوچھا' کیا پولیس کی پوچھ گچھ ہوئی تو اسپتال کا عملہ سرجن کی مدد کرے گا اور کیا کے کے کو ضرورت پڑنے پر کہیں ادھر ادھر کر دیا جائے گا؟

وہ ہنسا۔ بولا "مریض کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ پولیس والوں ہی کو ادھر ادھر کر دیں گے۔ چلو تمہیں بتا دیتا ہوں۔ میرا اسٹاف وفادار ہے۔ جیسا کہتا ہوں' ویسا کرتا ہے۔ مثلاً اب میں اسپتال کے ریکارڈ میں تمہارے ساتھی کو لڑکا نہیں' لڑکی لکھوا دوں گا۔ پولیس والے آئے بھی تو کسی زخمی لڑکے کو ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے۔ ایک زخمی لڑکی کو جو سخت طبی حفاظتی ماحول میں ہو گی' وہ مریضوں کی فہرست میں نظر انداز کرتے ہوئے چلے جائیں گے۔ چار دن بعد ہم اسے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیں گے۔"

میں اس مہربان آدمی کی ہمدردی اور ذہانت کا قائل ہو گیا۔

اس نے مجھ سے جیپ کی چابی مانگی۔ کہنے لگا "ایک کباڑ خانہ ہے جہاں پرانے لوہے ٹین' کاٹھ کباڑ میں تمہاری جیپ چھپا کے رکھ دیں گے۔ کباڑی اس کی صفائی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ دوبارہ جب بھی ضرورت ہو' اپنی جیپ وہاں سے لے کے نکل جانا۔"

سرجن دوبے نے انٹرکوم پر دو جگہ رابطہ کیا تھا۔ دو آدمی آئے۔ اس نے ایک کو میری چابی حوالے کی' اسے میرا نام بتا کر ہدایت کی کہ وہ مجھے پہچان لے۔ معلوم ہوا چابی کے لیے مجھے اسی کے پاس جانا ہوگا۔ چابی لے کے اس شخص نے ایک کارڈ مجھے دیا جس پر کوئی ٹیلی فون نمبر لکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ جیپ لینے کے لیے پہلے اس فون پر رابطہ کرنا ہوگا۔

دوسرا آدمی اسپتال کے ملازموں کا اوور آل' ٹوپی' جوتے' دستانے اور منہ پر باندھنے والا ماسک لایا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کی موجودگی میں یہ سب چیزیں پہن لیں اور اس کے ساتھ ٹرالی دھکیلتا سرجن دوبے کو خدا حافظ کہتا ہوا روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے لگی قطار بڑھتی جا رہی تھی۔ مریضوں کو دیکھنے کا وقت ہو گیا تھا۔

ہم اسپتال کی اصل عمارت سے ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے ایک چھت پڑے راستے

پر آئے۔ میں نے جگہ کو سمجھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پھولوں کے قطعوں اور رنگین پتوں والی آرائشی جھاڑیوں کے پار اسپتال کے پورچ میں برمی پولیس کی دو گاڑیاں رکتی دیکھیں۔

میرا ساتھی اپنی ماسک کے نیچے سے بڑبڑایا۔ "لو دیکھو آ گئے۔ یہ بدمعاش دیر نہیں کرتے۔"

ہم وارڈوں کے پیچھے جونیئر اسٹاف کے کوارٹروں والے علاقے میں آ گئے۔

میرے ساتھی نے جو میری طرح اوور آل' ٹوپی' دستانے اور ماسک میں چھپا ہوا تھا اور ویسے ہی گھٹنوں تک آئے ہوئے ربر کے بوٹ پہنے تھا' ٹرالی روک کے ایک کوارٹر دکھایا جس کا نمبر تیرہ تھا۔ کہنے لگا "یہ میرا کوارٹر ہے' اب ہم دونوں کا ہے۔"

میں نے پوچھا "تم اکیلے رہتے ہو؟"

کہنے لگا "نہیں۔ میں رہتا ہوں' میری بیوی پدما رہتی ہے۔"

میں بولا "اچھا۔"

"معلوم نہیں ہماری زبان میں پدما کسے کہتے ہیں؟"

میں خوب جانتا تھا "ہاں۔ کنول کے پھول کو۔"

وہ ہنسا۔ کہنے لگا "دو کمرے ہیں' اس کوارٹر میں ایک میرا اور پدما کا ہے' دوسرا اب تمہارا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "میری وجہ سے تم لوگوں کو تکلیف تو نہیں ہو گی؟"

"کاہے کی تکلیف۔ تم صورت سے اچھے آدمی لگتے ہو۔ پدما کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"ہوں۔" میں اور کیا کہتا۔

وہ بولا "گھر کا تو ایسا ہی ہے۔ گھر والی کا مزاج دیکھ کے چلنا پڑتا ہے۔ تین مہینے پہلے بھی ایک مسلمان بھائی کو میرے کوارٹر میں ٹھہرایا دوبے جی نے۔ پر وہ عجیب آدمی تھا۔ ٹیں گھر میں نہیں ہوتا تھا تو پدما سے الٹی الٹی باتیں کرتا تھا۔"

مجھے ضرورت نہیں تھی جو اس سے پوچھتا کہ وہ شخص کیسی الٹی الٹی باتیں کرتا تھا۔ میں چپ رہا۔

مگر وہ خود ہی خاصا بکی آدمی تھا۔ بولا "کبھی وہ کہتا تھا اسپتالوں میں بھوت ہوتے ہیں۔ دن ڈوبنے اور دن نکلنے کے بیچ کھلے پھرتے ہیں۔ جس کسی کو نظر آ جائیں' بس اس کی

جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ سالا ڈراتا تھا پدما کو۔"

میں نے بات ختم کرنے کو کہہ دیا کہ ہاں بعض لوگوں کو ایسی ہی بے کار باتوں کا شوق ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ بیکار باتیں نہیں تھیں۔ بڑا ہشیار تھا۔ کہتا تھا مجھے بھوت اتارنا آتا ہے اور خبر نہیں کیا کیا آتا تھا اس کو۔ لالچی نہیں تو۔"

میں نے سوچا کوئی عیار آدمی ہو گا۔ ان میاں بیوی سے پیسے کھینچنا چاہتا ہو گا۔ میں نے یہی بات کہہ دی تو وہ رازداری سے ہنسا۔ بولا "عیار جیسا عیار تھا! باتوں میں چلا کے کام نکالنا جانتا تھا۔"

مجھے رستے میں رکے رکے الجھن ہونے لگی تھی۔ میں نے بات ختم کرنے کو کہا "ہاں بڑے بڑے نوسرباز ہوتے ہیں۔ ہر ایک سے رقمیں کھینچنے کے چکر میں رہتے ہیں۔"

وہ ہنسا "رقموں کے چکر میں نہیں۔ وہ کسی اور ہی چکر میں تھا۔ معلوم ہے؟ ایک دفعہ میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے ہمارے کمرے کا دروازہ تھپتھپایا۔ دو بجے ہوں گے رات کے۔ پدما اکیلی تھی۔ پوچھنے لگی' کیا بات ہے؟ بولا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ابھی بوت نظر آیا تھا۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے اپنے کمرے میں آ جانے دو۔ ایک طرف پڑا رہوں گا اور بولا آدمی دو ہوں تو بھوت کچھ نہیں کہتا۔ کچھ سمجھے تم؟ وہ کس چکر میں تھا؟"

اس آدمی کی باتیں سن کے مجھے خفت سی ہونے لگی۔ کس قسم کا آدمی ہے' مجھے یہ سب کیوں سنا رہا ہے؟ میں "ہوں" کہہ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ اپنے بیان کے جوش میں کہتا چلا گیا۔ بولا "ہم نے کچھ رقم چھپا کے رکھی تھی۔ وہ ہمارے ہی کمرے میں تھی۔ پوری کی پوری۔ رقم کوئی چار ہزار کے نوٹ ہوں گے۔ پدما نے سوچا' یہ مسلمان بھائی پیسے ہتھیانے کے چکر میں بھوت ووت سے ڈرنے کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ کمرے میں آنا چاہتا ہے۔ خبر ہے اس نے کیا کیا؟"

میں پھر کچھ نہ بولا تو اس نے دوبارہ اسی لہجے میں سوال کیا۔ "خبر ہے کیا کیا پدما نے؟"

میں نے بیزاری سے کہا "اس نے دروازہ نہیں کھولا ہو گا؟"

"ناں' ناں۔ وہ بہت ہشیار ہے بھئی۔ بولی "تم جاؤ اپنے کمرے میں' میں ادھر ہی آتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کیسا بھوت ہے اور جب وہ ٹل گیا تو جھٹ اپنے کمرے میں تالا ڈال پدما اس دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ کہنے لگی کہ لو ہو گئے دو آدمی۔ اب تو بھوت کچھ

نہیں کہے گا۔ آ جاؤ ادھر لیٹ جاؤ۔ یہ لو اپنا تکیہ۔ ہاہاہا۔ دیکھا اس کی سالے کی کوئی بھی چالاکی نہیں چلنے دی پدما نے۔"

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا یا تو یہ بالکل ہی گیا گزرا بے عقل آدمی ہے یا اپنی پدما کی طرح بہت "ہشیار" ہے اور یہ سب کچھ سنا کے مجھے کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔ سالا گرا ہوا آدمی مگر میں چپ ہی رہا۔

کچھ دیر وہ اپنی گھر والی کی فراست پر سر ہلا ہلا کے ہنستا رہا' پھر بولا "یہ کوارٹروں کے آگے مردہ خانہ ہے۔"

"مردہ خانہ؟" مجھے دھچکا سا لگا تھا مگر دھچکا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اسپتالوں میں مردہ خانے ہوتے ہیں۔

وہ میرا ردعمل دیکھ کے ایک دم خوش ہو گیا۔ ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ بولا "مردہ خانے کا سن کے چونکے کیوں؟"

میں نے کہا "بس......ایسے ہی۔ چونکنے والی کیا بات ہے؟ مردہ خانہ تو ہو گا ہی۔"

بولا "ہاں مردہ خانہ بھی ہے اور اس کا اسٹاف بھی۔"

میں نے بے دھیانی سے کہا "اچھا۔"

کہنے لگا "یہاں اسٹاف میں ایک آدمی تھا' اب دو ہو گئے ہیں۔"

"اچھا۔" مگر میں نے سوچا' مجھے یہ سب سنانے کی کیا ضرورت ہے؟

"سمجھے دو کس طرح ہو گئے ہیں؟" اور پوچھنے لگا "خبر بھی ہے اور کون دو ہو گئے ہیں؟"

میں اس کی صورت تکنے لگا۔

وہ بولا "کیا اب بھی نہیں سمجھے؟ ہم دو ہیں نا۔ تم اور میں۔ پہلے مردے کو سیٹ کرنے کا ادھر ادھر پہنچانے کا کام میں اکیلا کرتا تھا' اب تم میرے اسسٹنٹ ہو کے آ گئے ہو۔ دونوں مل کے سنبھال لیں گے ان سالوں مردوں کو۔" وہ چلتے چلتے یہ سب کہہ رہا تھا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔

حد ہو گئی! مجھے نہ صرف ایک مردہ گھر کے اٹنڈنٹ کے ساتھ ٹھہرایا جا رہا تھا بلکہ اس کا مددگار بنا دیا گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر دوبے کو کیا سوجھی ہے؟

اس نے۔ پدما کے میاں نے۔ ٹرالی دھکیلنا بند کر دی اور مڑ کے میری طرف

دیکھنے لگا۔ بولا "کیا بات ہے؟"

بات کیا ہوگی۔ مجھے اب طرارہ آچلا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا واقعی میں تمہارا اسسٹنٹ ہوں؟"

وہ بولا "ہاں۔ کوئی تو ہوتا میرا اسسٹنٹ۔ کام کر کر کے میری کمر رہ گئی ہے۔ مردوں کو سلیب پر سے ٹرالی اسٹریچر پے اور ٹرالی سے سلیب پے چڑھانے اتارنے میں سمجھو آدمی کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔"

میں غصے کے اس اسٹیج پر تھا کہ ڈاکٹر دوبے کے کمرے میں گھس کے اسے بے رکے بہت کچھ سنا سکتا تھا مگر مڑ کے میں نے ایک نظر اسپتال کی مین بلڈنگ پر ڈالی۔ یاد آگیا کہ وہاں پورچ میں اس وقت بھی برمی پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں اور اسپیشل وارڈ میں لڑکا کے کے لیٹا ہے جسے وہ جگہ معلوم ہے جہاں میرے بابا صمد بنگش صاحب کو برمی وزیر نے روک رکھا ہے۔

غصہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میں خاموشی سے مڑا اور اپنے مردہ گھر کے انچارج پدما کے اس میاں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ ٹرالی دھکیلتا ہوا سیدھا مردہ خانے تک پہنچا۔ ٹرالی چھوڑ جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا اور قطاروں میں بنے چبوتروں پر رکھی بارہ پندرہ لاشوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔

"یہ مرڈر کا کیس ہے۔ اسے برف ورف دے کے ابھی ادھر ہی روکنا ہے۔"

"روکنا ہے۔" ایسا کہہ رہا تھا کہ جیسے نہیں روکا تو مرڈر کیس والی لاش اٹھ کے چل دے گی اور "برف ورف دے کے" کے بھی خوب تھا۔ برف دے کے روکنا ہے۔ رشوت دے کے روکنا ہے۔

پھر کہنے لگا۔ یہ بڑی بی رات میں پہنچائی گئی ہیں۔ لکھ پتی لوگوں کا مردہ ہے۔ اسے لے جائیں گے تو دان پن کرتے ہوئے، نوٹ بانٹتے ہوئے لے جائیں گے۔ تمہارے میرے حصے میں بھی ٹھیک ٹھاک کچھ ٹپ آجائے گا اور ادھر والا یہ بڈھا۔ یہ کنگلا ہے۔ اس کی بھلی چلائی ہے مگر اسے بھی لکھ پتی بڑی بی کی طرح زیادہ برف ٹکانا ہے۔ تم پوچھو گے یہ کنگلا اور لاوارث ہے تو اسے زیادہ برف کائے کو ٹکائی جائے گی۔ ہاں پوچھو گے نا؟"

میں نے کہا "ہوں۔"

وہ ہنسا "تم پوچھو گے تو میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ ابھی نہیں دوں گا۔ بعد میں تو تمہاری سمجھ میں سب کچھ آہی جائے گا۔"

میں چپ رہا۔ مردہ گھر کے سب پنکھے گھوں گھوں کر چلتے رہے۔

اسی طرح ایک ایک مردے کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا، وہ اس ٹھنڈی اور دواؤں کی بو سے بوجھل ہوا میں مجھے لیے لیے گھومتا پھرا۔ جیسے خود سیر کر رہا ہو اور مجھے سیر کرا رہا ہو۔

ایک مردے کو دکھا کے بولا "یہ جیب کترا تھا۔ پولیس کی ٹارچر سے مرا ہے مگر دیکھو اس کے پیر کے انگوٹھے سے بندھے کارڈ پر لکھا ہے کہ نمونیے میں چل بسا۔ سالے جھوٹے کہیں کے اور ہاں اسے دیکھو موٹے کو، یہ جب زندہ تھا تو بڑا دھرماتما بنتا تھا۔ ان کے سینکڑوں شش مطلب چیلے اور پیار کرنے والے بس آتے ہی ہوں گے، اسے لے جانے۔ ہمیں ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑے گا۔ اس کے شش شاگرد یہ موٹے موٹے تگڑے لڑکے۔ "جے جے رام، جے سیارام۔" کرتے گھس آئیں گے اور اسے ایسے اٹھالے جائیں گے جیسے چیونٹیاں نکتی دانے کو اٹھالے جاتی ہیں۔ نکتی دانہ سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مٹھائی ہوتی ہے۔"

وہ ہنسا۔ کہنے لگا "اس سالے موٹے دھرماتما کے چیلے چانٹے منوں مٹھائی اپنے ساتھ لاتے ہوں گے۔ لاش کو لے جاتے وقت سے یہ مٹھائی بانٹنا شروع کر دیں گے۔ بس طریقہ ہے، ان کا مٹھائی سب سے پہلے تمہیں اور مجھے دیں گے۔ خیال سے لینا، دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کے۔ جتنی دیں لے لینا اور گرنے مت دینا، ذرا سی بھی گری نہیں تو حرامی مار مار کے تمہارا بھرتا بنا دیں گے۔ بھرتا سمجھتے ہو؟"

وہ اسی طرح بکواس کرتا رہا اور لاشوں کا تعارف کراتا رہا۔ تیرہ میں سے ایک کسی بیچارے مسلمان کی میت تھی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "یہ تمہارا مسلمان بھائی ہے۔ خبر ہے ہمیں کیسے پتا لگا؟"

میں نے ویسے ہی بے خیالی میں پوچھ لیا "کیسے؟"

وہ ہنسا، بولا "کیسے پتا چلتا؟ جب ٹھنڈے پانی کا شاور مارنے کو اس کا کپڑا وپڑا سب اتار کے پھینکا تو دیکھا کہ......"

میں نے جلدی سے کہا "ہاں......ہاں......اچھا اچھا ظاہر ہے۔"

کہنے لگا "یہ ٹرالی ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ آؤ کوارٹر پہ چلیں، کچھ کھا پی لیں۔"

وہ کھانے پینے کا ذکر اس فطری بے تکلفی سے کر رہا تھا جو گھر کے باورچی خانے میں ہی اچھی لگتی ہے۔ میں نے منہ بنا کے ٹال دیا کہ ابھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا۔

وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا' بولا "کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ مردوں کی اٹھاپٹک کر کر کے بھوک تو کھل کے لگنے لگتی ہے۔ پر جب نوالہ توڑو تو حلق سے نہیں اترتا۔ پہلے پہلے سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم تو مسلمان بھائی ہو' تمہاری ساتھ تو اور بھی مشکل ہے۔"

"اور کیسی مشکل؟"

"ارے یہی نا کہ تم لوگ ماس کھاتے ہو۔ ماس سمجھتے ہو کیا ہوتا ہے؟ ارے گوشت' گوشت اور ادھر کا تو تمہیں پتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک گو......"

میں نے پھر بات کاٹ دی۔ "ہاں ہاں سمجھتا ہوں۔ آؤ چلو۔"

وہ ہنسا' چلتے چلتے رکا۔ مڑ کے لاشوں کی طرف مسکرا کے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

"او کے۔ بے بی سی یو! ہاہاہا۔ پتا ہے؟ امریکن فلموں میں بڑی بڑی جوان لڑکیوں کو بے بی بولتے ہیں۔ ادھر آج ایسی جوان لڑکی تو کوئی نہیں ہے۔ ایک سنتھالی عورت ہے' پر وہ کچھ نہیں ہے۔ کالی کلوٹی۔ کبھی کبھی تو ایسی ایسی فل فلوٹیاں آتی ہیں کہ سب دیکھتے ہی رہو۔ ایک ڈچ عورت آئی تھی۔ اسے گولی مار دی تھی کسی دوسری ڈچ عورت نے۔ عورت کیا ابھی لڑکی تھی۔ پہلے میں سمجھتا تھا جیسا آدمی کا سر کا بال ہوتا ہے' ویسا ہی اس کا...... پر یار شیر خان۔"

میں نے کندھے پر ہاتھ مار کے اسے خود سے آگے کر لیا اور کہا "چابی سنبھال لو' میں کنڈا کھینچ کے تالا دبانے والا ہوں۔ پھر بعد میں مت کہنا کہ چابی اندر رہ گئی۔"

وہ ہڑبڑا کے اپنی چابی ٹٹولنے لگا۔ "نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے تم دبا دو تالا۔"

خدا خدا کر کے اس کی بکواس بند ہوئی۔

اس کے کوارٹر پر آئے تو دیکھا' باہر تالا پڑا ہے۔ تالا کھولتے ہوئے بتانے لگا کہ ناشتا بنا کے اس کی پدما سبزی ترکاری لینے بازار چلی جاتی ہے۔ جب تک آئے گی' ہم دونوں ناشتا کر لیں گے۔ کہنے لگا "پر یار تم تو انکار کر رہے ہو۔ اکیلے ناشتا کرنے میں کیا مزہ' پدما آجائے گی' اس کے ساتھ میں کچھ کھا پی لوں گا۔ چل خیر...... تو پکی بات ہے؟ تم نہیں

کھاؤ گے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔

کوارٹر کے بیچوں بیچ مٹی گارے سے اینٹ پتھر جوڑ کے چار ساڑھے چار فٹ کا ایک پیڈسٹل سا بنایا گیا تھا جسے خوب لیپا پوتا کیا گیا تھا۔ پیڈسٹل پر ایک چورس گملا رکھا تھا۔ گملے میں ریحان یا بلا نگا کا ایک پودا لگا تھا۔ جسے شاید مروایا تلسی بھی کہتے ہیں۔ ہاں "تلسی ماں۔"

تلسی ماں کے قدموں میں جنگلی گیندے کے پھولوں سے ابلتی ایک کیاری تھی۔ آنگن کو خوب جی لگا کے جھاڑو بہار دی گئی تھی۔

پدما کے گھر والے نے ایک کمرے کا تالا کھول دیا تھا۔ کہنے لگا "یہ تمہارا کمرہ ہے۔ یہاں بستر ہے۔ ایک کرسی بھی پڑی ہے اور یہ دیکھو فرش پر سیتل پاٹی ڈالی ہوئی ہے۔ چٹائی چٹائی تنکوں کی چٹائی سمجھتے ہو؟ بس تو مرضی ہو' بستر پر لیٹو' مرضی وہ سیتل پاٹی پہ بیٹھو' لیٹو یوگا کرو۔ تم یوگا کرتے ہو؟ نہیں کرتے ہو گے۔ مسلمان بھائیوں میں یوگا کی چرچا نہیں ہے۔ وہ تو ایک ہی کام جانتے ہیں بلکہ دو کام' ماس کھاتے ہیں اور مال۔ ہاہاہا۔ برا مان گئے؟ چلو چھوڑو بھی میری مسخری کی عادت ہے۔ تو میں اب جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔ کوئی چیز کی ضرورت ہو' مجھے یا پدما کو آواز دے لینا۔ وہ تمہارے چھوٹے موٹے کام خوشی سے کر دیا کرے گی۔ برا نہیں مانتی پدما۔ بولتی ہے مجوان کی ٹہل سیوا میں ایسی کون اڑچن ہے۔ اچھا۔"

اور اچھا کہہ کے جیسے ہی وہ سامنے سے ہٹا' کسی نے دروازہ تھپتھپایا۔ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ "ہا! پدما رانی اچھا ہوا' دیر نہیں لگائی تو نے۔ دیکھ دوبے جی نے کسے بھیجا ہے اور دیکھ لے' یہ بھی مسلمان بھائی نکلا۔ ہاہاہا بھوت پریت سے ڈرے گا یہ بھی۔"

وہ بولی "چل چل۔ بکواس نہیں کر۔" اس نے یہ بات غصے میں نہیں' اٹھلا کے کہی تھی۔

پھر وہ سامنے آگئی۔

تنگ مراٹھی کپڑوں میں خوب چمکدار سیاہ بالوں کی کسی ہوئی چوٹی اور انگوٹھے کے ناخن جتنے گھماؤ والا ناک کا دیہاتی زیور پہنے وہ مسکراتی ہوئی دروازے میں آکھڑی

ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا سانولا' ہونٹ دبیز اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ بازار سے آ رہی تھی مگر لگتا تھا کچی نیند سے اٹھ کے آ رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہولے سے ایسے مسکرائی جیسے پرانی جان پہچان ہے۔ بولی "پدما نام ہے۔ میرا۔"

"میں شیر خان۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ شاید یہی طریقہ ہو گا یہاں کا۔

وہ ہنسی۔ دانت اس کے ایک دم سفید اور ہنسی کی آواز بچوں جیسی تھی لیکن صرف آواز۔ دیکھنے میں تو اس کی ہنسی کسی بہت جانکار عورت کی ہنسی تھی۔

وہ کمرے میں آنے کو بڑھی تو اس کا آدمی بولا۔ "چل چھوڑ۔ اسے لیٹنے بیٹھنے دے۔ یہ ابھی کچھ نہیں کھائے گا۔ بولتا ہے بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ کچھ دیر دروازے میں رکی' میری صورت دیکھتی رہی' پھر اثبات میں سر ہلاتی اور رازداری سے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ کن لوگوں میں آ گیا ہوں؟ یہ دونوں بھلا کس چکر میں ہیں؟

رنگون میرے لیے نیا شہر تھا مگر ایسا نیا بھی نہیں تھا۔ وہی پاکستان' ہندوستان کے جیسے کسی بھی بڑے شہر کا ماحول تھا۔ یہ جوڑا اور ان کا سرجن دوبے صاحب ہندوستانی ہوں گے۔ واضح طور پر بمبئی یا بمبئی جیسے کسی بڑے شہر سے آئے لگتے ہیں۔

بڑے شہروں کا یہی ہے۔ سب طرح کی مخلوق آ کے بس جاتی ہے۔ میرا کیا ہے۔

وہ لڑکا کے کے اسپتال سے شفٹ ہونے کے قابل ہوا نہیں کہ ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔ چار پانچ دن یہاں سنبھل کے گزار لوں گا لیکن چار دن مردہ خانے میں ڈیوٹی دینے کے تصور سے مجھے پسینے آ گئے۔ محنت سے جی چرانے والا آدمی نہیں ہوں میں مگر مردے؟ اللہ رحم کرے۔

کچھ دیر کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا' پھر بستر پر جا لیٹا۔

نہ معلوم کتنی دیر سوتا رہا اور کسی کے اٹھائے بغیر آپ ہی آپ بیدار ہو گیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں یاد آیا پورے کپڑوں میں موزے پہنے پہنے سویا تھا مگر اس وقت بھاری چادر سی اوڑھے اٹھا تھا۔ گھبرا کے میں نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو ہاتھ لگایا۔ بدن پر میرے اپنے کپڑے نہیں تھے۔ نہ معلوم کیسے میں نے لمبا اونی انڈرویئر اور پوری آستینوں والی ایک بنیان پہن رکھی تھی۔ موزے بھی اترے ہوئے تھے۔

یہ کیا وحشت ہے؟ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے اپنے کپڑے سلیقے سے تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔

اور میں نے دیکھا۔ فرش پر بچھی سیتل پاٹی پہ چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا۔ ابھی میں پوری طرح کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ سیتل پاٹی پر لیٹے ہوئے کسی نے کسمسا کے کروٹ بدلی۔ چادر سرک گئی اور خوب گندھے ہوئے سیاہ چمکیلے بالوں کی چوٹی جیسے خود اپنی طاقت سے اچھلی اور تنکوں کی ٹھنڈی چٹائی پر جا پڑی۔

"یا اللہ خیر!" میں نے دل میں کہا۔

کانسی کے کنگن بجے اور چادر پھینکتی ہوئی مردہ گھر کے انچارج کی عورت پدما تنکوں والی چٹائی پر اٹھی' آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

مراٹھی لباس اس قابل نہیں ہوتا کہ کوئی بھی صحت مند عورت فرش پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ سکے۔ ویسے زیادتی کی بات الگ ہے' کوئی دھاندلی پر تل ہی جائے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

وہ عورت پدما دھاندلی پر تلی ہوئی تھی۔ اسی جانکار رازدارانہ انداز میں ہنسی اور بولی "ساری دوپہر سو کے نکال دی۔ ہاں۔"

میں نے چادر سے خود کو اور اچھی طرح لپیٹ لیا اور سرہانے تہ کیے ہوئے رکھے اپنے لباس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ یہاں کس نے رکھے؟"

"میں نے اور کون رکھے گا؟" وہ چاندی سے دانتوں کو چمکا کے بولی۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ میں جو زیر جامے پہنے تھا۔ پتا نہیں کہاں سے آئے تھے۔ یہ میں نے اپنے بدن پر نہیں چڑھائے تھے۔ یہ تو میرے تھے ہی نہیں اور سب سے بڑی بات یہ آخر چڑھائے کس نے میرے بدن پہ؟

میں نے پوچھا "جو میں پہنے ہوں۔ یہ کس نے پہنائے ہیں؟"

"سمپورنا نے۔" اس عورت نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی۔

"سمپورنا' کون سمپورنا؟"

"سمپورنا میرا آدمی اور کون؟"

"اس نے؟ اس نے کیوں......"

وہ میری بات کاٹ کر اٹھلا کر بولی "وہ نہیں پہناتا تو کیا میں پہناتی؟ وارے وا۔" اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے لجاتی شرماتی ہوئی ہنسنے لگی۔

"مگر یہ کیوں؟ تیرے آدمی کو آخری ایسی کیا......" مجھے غصہ آ رہا تھا۔

"لو" وہ الٹا برا مان گئی۔ "تیرے کپڑے سوتے میں مسل رہے تھے ناں۔"

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "کس قسم کے لوگ ہو تم! کیا ضرورت تھی بلا؟ اور یہ بنیان کچھا جو پہنایا ہے۔ یہ کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟"

اس پر ڈانٹنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اپنے بھرے بھرے ہونٹوں سے چونچ سی بنا کے بولی "میرے کو کیا خبر' کس کا ہے؟"

"کہاں سے آیا ہے؟"

"آئے گا کہاں سے۔ ارے وہی سمپورنا مردے گھر سے اٹھا لایا ہو گا۔"

"مر......" میں چادر پھینک کے اٹھا، پھر فوراً ہی خود کو چادر میں لپیٹ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھے صرف کچھا پہنے دیکھ کے اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کی اوٹ کر کے گھوم گئی تھی اور بے رکے ہنسے جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ "بے شرم نہیں تو' بے شرم" اور ہنسی سے بے حال ہو رہی تھی۔

لاحول ولا قوۃ۔ اس سالے سمپورنا نے مجھے کسی مردے کا انڈر ویئر' بنیان پہنا دیا تھا۔

میں غصے میں لرزتا کانپتا اپنے کپڑے اٹھا کے باہر بھاگا۔ چھوٹے سے کوارٹر میں غسل خانہ کہاں سے آتا' میں نے دیکھا رسوئی گھر میں ایک طرف سیمنٹ کا چبوترہ بنا تھا۔ بالٹی بھری رکھی تھی۔ میں نے انڈر ویئر' بنیان پھینک کے جلدی جلدی ڈونگے سے میں نے خود پر پانی بہایا اور جیسے تیسے اپنے کپڑے پہن کر سردی میں کانپتا ہوا واپس اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ بستر پر بچھی چادر کی سلوٹیں درست کرنے کے بعد پٹی پر بیٹھی مزے سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

مجھے بھیگا ہوا اور سردی سے کانپتا دیکھ کر بولی "دیکھا؟ کیسا چلایا تجھے۔ ارے بدھو تو نے دیکھا نہیں' بالکل نیا نکور کچھا بنیان ہے۔ سمپورنا کے لیے لائی تھی۔ ابھی پیکن بھی نہیں کھولی تھی اس کی۔ کیسا چلایا تجھے۔" پھر ہنستے ہوئے بولی "سردی کے ٹیم تجھ سے اشنان کرنے کو بولتی تو صاف منے (منع) کر دیتا۔ اب آیا نا۔ کیسے جھٹ پانی ڈال کے۔"

میں نے چادر کھینچ کے خود کو سردی سے بچانے کو لپیٹنا شروع کر دیا تو وہ ہاتھ بڑھا کے میری مدد کرنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو جھوٹ موٹ غصے میں

بڑبڑانے لگی کہ "دیکھو رے کیسا ناقدرا مجوان (مہمان) ہے۔ ہم سیوا کرتے ہیں' یہ سسرا غصہ ہوتا ہے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔

میں ایسا کون سا گلفام ہوں کہ جہاں جاتا ہوں' عورتیں اور لڑکیاں میری جان کو آ جاتی ہیں مگر جو ہو رہا تھا' سامنے تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس سرجن دوبے سے مل کے درخواست کروں کہ میرا پیچھا چھڑاؤ' اس مردہ گھر اسٹاف سے۔ اگر ڈاکٹر چاہتا ہے کہ اپنی رہائش کی اجرت میں یا "کے کے" کے علاج کے بدلے میں مجھ سے اسپتال میں خدمت لے تو میں ہر طرح کی مشقت کر لوں گا۔ اسپتال کے کچن میں برتن دھونے' سبزیاں صاف کرنے' کاٹنے تیار کرنے تک پر راضی ہوں۔ مالی کا کام یا کچھ نہیں تو وارڈ بوائے کے مددگار کی خدمات بھی میرے سپرد کر دی جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

ابھی میں اس بارے میں پوری تقریر بھی نہیں سوچ پایا تھا کہ وہ عورت بڑی سی تھالی میں ناشتے کی چیزیں لے کر آ گئی۔ بولی "کھانے کا ٹیم نکال دیا۔ اب ناشتا کر لو' پھر ہمیں تمہیں بڑا کام کرنا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیسا کام؟"

بولی "کتنے دن کے رکے ہوئے کام ہوں گے۔"

"رکے ہوئے؟" میں نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلا لیا۔ یہ نہ بتایا کہ کس طرح کے رکے ہوئے کام ہیں۔

ناشتے میں سوجی سے بنا ہوا بے شکر کا نمکین حلوہ تھا۔ اسے جنوبی ہندوستان میں "اپ ما" کہا جاتا ہے۔ "اپ ما" کے علاوہ ایک بڑا خوشبودار قلمی آم اور دو مٹھی چیوڑا بھی تھا۔

میں نے خاموشی سے جا کے کلی کی' ہاتھ دھوئے اور شوق سے یہ انوکھا مگر مزیدار ناشتا کیا۔ وہ تھال واپس لے گئی اور دو گلاس بھر کے چائے لے آئی۔ ایک گلاس خود اس کے لیے تھا جسے وہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اور آلتی پالتی مار کے میرے سامنے تنکوں کی چٹائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔

وہ جس طرح بیٹھی تھی' اس سے کوئی بھی الجھن میں مبتلا ہو جاتا۔

چائے اچھی تھی۔ میں نے تعریف کی تو بولی "یہ کچھ نہیں' چائے تو کبھی کسی

وقت میں تجھے پلاؤں گی۔ کیسری کستوری چائے۔"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیسری کستوری چائے کیا ہوتی ہے؟ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

کہنے لگی "زعفران اور جڑی بوٹیاں ملاتے ہیں۔"

میں نے سوچا' ہو گی کچھ۔ مجھے تفصیل کیا پوچھنی۔ وہ ٹکٹکی باندھے میری صورت دیکھتی رہی۔ دیر تک میں کچھ بھی نہ بولا تو کہنے لگی "تو نے پوچھا نہیں کستوری کیسری چائے ابھی کیوں نہیں بنائی میں نے تیرے لیے؟"

میں نے کہا "اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟"

بولی ہے ایک بات مگر میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔ تو سمجھے گا مجھے بالکل بھی خیال نہیں ہے لاج شرم بیچ کھائی ہے میں نے۔

"چائے بنانے نہ بنانے میں لاج شرم کیسی؟"

بولی "جب بتاؤں گی تو تیری سمجھ میں آجائے گی سب بات۔"

وہ بھی اپنے میاں کی طرح بکی لگتی تھی۔

پھر بولی "تو نے کبھی عورت رکھی ہے؟"

یا وحشت۔ یہ کس قسم کا سوال ہے؟ میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ اپنی زبان اپنے رخسار میں ٹکائے چھوٹا سا ایک شریر ٹیلا بنائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تکنے لگی تھی۔

میں نے قدرے الجھن تھوڑی جھوجھل کے ساتھ اسے دیکھا تو خود ہی بولی "نہیں رہے۔ لگتا ہے بالکل ہی کورا ہے۔ چل پھر کیسری کستوری تو تجھے نہیں پچے گی۔ ابھی نہیں پلاؤں گی۔ جب سمپورنا تیرے لیے کوئی جنانی کہیں سے گھیر کے لائے گا' اسی ٹیم کیسری چائے دوں گی تیرے کو......اور کیا دوسری جنانی نہیں ہوئی تو کوئی مجھے اپنے لیے مصیبت بلانی ہے۔ چائے پی کے تو تو نے بے ناتھ کا بیل ہی بن جانا ہے۔ میری شامت آجائے گی۔ میرا سمپورنا بے چارہ اور جو اس نے کوئی بات کہہ دینی تو تم دو ہی جنے سانڈوں کی طرح چل پڑو گے ایک دوسرے پہ۔ ناں رہے ناں۔ ہی ہی ہی۔"

وہ ہنستی رہی' میں نے سوچ لیا کہ آج بلکہ ابھی دوبے سرجن سے مل لینا ہے اور یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ اس طرح تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔

میں ہاتھ دھو کے واپس آیا تو وہ پلاسٹک کی بالٹی میں صابن اور اسپنج کا ٹکڑا

ڈالے صحن میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ صورت سے لگتا تھا کہ اس نے کام کا ذہن بنا لیا ہے۔ وہ اب چھیڑ چھاڑ اور کھلواڑ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

میں نے پوچھا "کیا ہو رہا ہے؟"

بولی "کام۔ یہ ایک بالٹی اسپنج تیرے واسطے اٹھا لیا ہے۔ آ میرے ساتھ۔"

میں نے پوچھا "جانا کہاں ہے؟"

بولی "سب خبر لگ جائے گی' آجا۔"

کوارٹر میں تالا ڈال کے وہ مردہ گھر کی طرف چلی۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ اب کیا وہ مجھے مردہ گھر میں مردے نہلوانے کے لیے لے جا رہی ہے؟ مگر وہ اس کے برابر بنے شیڈ کی طرف مڑ گئی۔ کھلے شیڈ میں اسٹیل کے ریک کھڑے تھے جن میں ایک ہی سائز کے پلاسٹک کے ٹب جیسے اوپر تلے جمع ہوئے تھے۔ ان سے دواؤں کی ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ خاصے موٹے پلاسٹک سے بنے یہ ٹب اتنے بھاری ضرور تھے کہ اکیلی پدما نے ریک سے ایک ٹب اتارنا چاہا تو اس سے اتارا نہ گیا۔ میں نے اس کی مدد کی' تب وہ اسے شیڈ کے نالی دار فرش پر رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ وہ ریکوں کے پیچھے جا کر ایک بالٹی اسپنج اور صابن کا ٹکڑا اٹھا لائی اور نل میں لگا ربڑ پائپ چلا کر ٹب کو پانی کی ہلکی دھار سے تر کرنے لگی۔ پھر اس نے پلاسٹک پر اسپنج سے جھاگ بنا بنا کے خوب سا صابن ملا اور مجھے دکھا دکھا کر بہت دیر تک ٹب کو اندر سے صاف کرتی رہی۔ میں نے اور اس نے ٹب کو الٹا اور پدما نے بتایا کہ اس کی باہر کی سطح کس طرح صاف کی جاتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں ٹب جگمگانے لگا۔ اس کے اشارے پر میں نے وہ صاف کیا ہوا ٹب ایک طرف لگے خالی ریکوں پر رکھ دیا۔

میں اور پدما دو سوا دو گھنٹے اسی طرح مصروف رہے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مجھے ٹب صاف کرنے اور اسٹور کرنے کا طریقہ آ گیا تو وہ اب جائے گی' اسے اور بہت کام ہیں۔ میں نے کہا "ہاں تم جاؤ' میں کام سمجھ گیا ہوں۔"

میں کافی رات تک اسی شیڈ میں ان کو صاف کر کے ریکوں پہ رکھتا رہا۔ رات میں کسی وقت سمپورنا آیا' کہنے لگا چل کوارٹر میں نہا دھو کے کچھ کھا پی لے۔ پھر تیرے ساتھی لڑکے کو اسپیشل وارڈ میں دیکھنے چلیں گے۔ سرجن دوبے بھی وہیں ہوگا۔

کوارٹر میں تھکے تھکائے آ کر نہانے' کھانا کھانے میں آدھی رات سے زیادہ گزر گئی تھی مگر وارڈ کا چکر لگانا ضروری تھا۔ میں کے کے سے بے تعلق تو نہیں ہو سکتا

تھا۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ سرجن دوبے سے ضرور ملنا ہے تاکہ رہائش کا مسئلہ حل کروں۔

سمپورنا اور اس کی عورت کس چکر میں ہیں، یہ تو ابھی کہا نہیں جا سکتا تھا مگر عام سی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی جان سکتا تھا کہ یہ جوڑا کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔ پہلے میاں نے اپنے مہمان کسی مسلمان بھائی کا قصہ سنا کے مجھے یہ بتانا چاہا تھا کہ اس کی پدما کتنی چالاک ہے اور خود پدما نے اپنی اٹھک بٹھک اپنے انداز اور اپنی صاف صاف باتوں سے مجھے مائل کرنے اور اپنے ڈھب پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ ان لوگوں سے دور رہنا ضروری تھا۔

ہم دونوں وارڈ میں پہنچے تو کسی انتظام کے تحت سرجن دوبے اور اس کی نرس اور ایک وارڈ بوائے "کے کے" کے کمرے میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ سرجن دوبے آدھی رات کو کے کے کا حال پوچھنے آیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سمپورنا مجھے لا رہا ہے۔ وارڈ بوائے اور نرس کے کے کو اٹینڈ کر کے اس کا کمرہ صاف کر کے چلے گئے۔

تب سرجن نے مجھے "کے کے" کے پاس ہی اسٹول کھینچ کے بٹھا لیا۔ کہنے لگا "غور سے سنو، پولیس تم دونوں کی تلاش میں کئی گھنٹے یہاں اسپتال میں گشت کرتی رہی تھی۔ شام کو وہ دوبارہ آئے تھے اور نچلے اسٹاف سے مختلف طریقے سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔"

یہ پریشانی کی بات تھی۔ میں نے تشویش ظاہر کی تو سرجن نے تسلی دی۔ کے کے تکیوں سے ٹیک لگائے ہماری باتیں سنتا رہا۔ بولا کچھ نہیں مگر سرجن دوبے نے اسے بھی بات چیت میں شامل کر لیا۔ دراصل وہ ہم دونوں پر احسان جتانا چاہتا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ ہماری وجہ سے خود وہ خطرے میں آ گیا ہے۔

میں نے کہا "مجھے پورا احساس ہے کہ میری وجہ سے آپ کی پوزیشن خراب ہو سکتی ہے۔"

اس نے ہاں میں سر ہلایا، پھر بولا "سمجھدار آدمی ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے دوست کو یہاں رکھ کے پولیس سے بچا لوں گا۔ تمہارے دوست کا علاج کروں گا۔ اس میں خطرہ بھی ہے اور خود میری اپنی جیب سے خرچ بھی بہت ہو رہا ہے تو اب بتاؤ، بدلے میں تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا "جو آپ کہیں۔ میں رقم کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ آپ جو رقم مانگیں یہیں رنگون میں ادا کر دوں گا۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت دیجیے۔"

دوبے بولا "رقم مجھے نہیں چاہیے۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ میں تم سے تھوڑا تعاون مانگتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ جو آفر میں اس وقت دے رہا ہوں، اس پر خوب سوچ سمجھ کے اور اس اپنے دوست سے مشورہ کر کے مجھے جواب دے دو۔"

میں نے کہا "آپ اپنی شرط یا آفر جو بھی ہے بتائیے۔"

کہنے لگا "ایک ساتھ میرے بہت سے آدمی نوکری چھوڑ کے چلے گئے ہیں۔ دبئی میں کوئی اسپتال کھلا ہے، اس کے لیے بھرتی برما، انڈیا اور پاکستان میں کی جا رہی ہے تو بس سب کے سب لمبی تنخواہوں کی لالچ میں چلے گئے۔ یہاں کے کام چور اور بے ڈھنگے ورکر میں بھرتی نہیں کر سکتا۔ سب کچھ برباد کر دیں گے۔ اس لیے چاہتا ہوں جب تک میں تمہاری طرح کے سمجھدار اور مضبوط جسم والے نئے ورکر بھرتی نہ کر لوں، تم میرے اسپتال میں کام کرتے رہو۔ بدلے میں ٹھہرنے کی جگہ اور کھانا بھی ملے گا۔"

معقول بات تھی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں کام کر رہا ہوں، کرتا رہوں گا مگر معلوم تو ہو کہ کتنے دن رہنا اور کام کرنا ہوگا۔

سرجن بولا "ویسے تو پانچ ہفتے لگیں گے تمہارے ساتھی کو بالکل ٹھیک ہونے میں مگر میں چار ہفتے میں چھٹی دے دوں گا کیونکہ تم لوگوں کو جانے کی جلدی ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، پر میری رہائش کا کوئی اور بندوبست کیجیے۔"

بولا "کیوں؟ سمپورنا کے گھر تکلیف ہے؟"

میں نے کہا "میاں بیوی کے بیچ ایک اجنبی آدمی کا رہنا جو نوجوان بھی ہو، کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

سرجن ہنسنے لگا۔ بولا "یہ تمہیں کس نے بتایا کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں؟"

میں نے کہا "کون بتاتا؟ یہی دونوں کہہ رہے تھے، پھر رہتے جو ایک ساتھ ہیں۔" میں نے تصدیق کے لیے سمپورنا کی طرف دیکھا۔ سرجن بولا "ارے دوست دوست ہیں۔ میاں بیوی نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بستر مسہری کی کمی کی وجہ سے بیچارے ایک ساتھ گزارا کر رہے ہیں۔" سرجن نے یہ بات مسخرے پن میں خود سمپورنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔ اس نے دانت نکال دیئے تھے۔

کے کے نے دواؤں کے زیر اثر ہونے کے باوجود سرجن کے فقرے کی داد مسکرا کے دی تھی۔ میں کڑھ کے رہ گیا۔ یہاں عجیب عجیب باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

میں نے کہا "جو بھی ہو، کسی کے ساتھ وہ چاہے میاں بیوی ہوں، چاہے نہ ہوں، میرا رہنا

ٹھیک نہیں ہے بلکہ میں تو چھڑے چھانٹ مردوں کے ساتھ بھی رہنے سے پریشان ہو جاتا ہے۔ آپ کوئی اکیلا کوارٹر' ایک الگ تھلگ کمرہ ہی دے دیجئے۔ میں مہینہ بھر رہ لوں گا مگر اس سمپورنا اور پدما کے ساتھ مجھے بہت مشکل ہو رہی ہے۔ مجھے یہاں سے ہٹا دیجئے۔"

سرجن نے کہا "ٹھیک ہے ایک دو دن گزارا کر لو۔ کوئی بندوبست کر دوں گا۔"

پھر وہ بتانے لگا کہ کام کی تفصیل تمہیں پدما اور سمپورنا ہی بتائیں گے۔ چاہے ان کے ساتھ رہو' چاہے نہ رہو۔

"اور کام۔" سرجن نے بتایا "سبھی طرح کے آتے رہتے ہیں۔ تمہیں سیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔"

ہم رات کے ایک بجے تک سمپورنا کے کوارٹر پر پہنچے۔ آتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا میرے بستر پر' میری چادر اوڑھے پدما لیٹی ہے۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ جاؤ یہاں سے جاؤ اپنے کمرے میں۔"

میں نے شور کیا تو وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے آدمی...... مطلب سمپورنا نے آواز سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ گویا اپنی طرف سے اس نے اس سارے معاملے سے ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مل رہی تھی۔ جیسے رات کی شفٹ سے گھر لوٹنے والے میاں کی آمد پر بیوی کچھ مطمئن کہ آ گیا ہے اور کچھ نیند خراب ہونے پر برہم بیٹھی بستر پر آنکھیں ملتی ہے۔

میں نے دوبارہ اسے بستر خالی کرنے کا اشارہ کیا تو پوچھنے لگی۔ "سرجن سے ملاقات ہو گئی تمہاری؟"

میں چڑا ہوا تھا۔ "تجھے میری ملاقات ہونے نہ ہونے کی کیا فکر ہے؟ جا اپنے کمرے میں۔ مجھے سونے دے۔ تھکا ہوا ہوں۔"

اس نے آدھا کمبل کھینچ کے جیسے میرے لیے فالتو کر دیا اور آدھا بستر پر میرے لیے جگہ بنا دی۔ "جھگڑا کیوں کر رہا ہے' نیند آ رہی ہے تو سو جا۔"

اس طرح کی ڈھٹائی میرے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ میں نے کہا "دیکھو۔ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ مجھے اس کوارٹر میں ایک یا دو دن گزارنا ہیں۔ اگر ایک دو دن مجھے اکیلے

چھوڑ دو گی تو تمہاری مہربانی ہو گی۔"

کہنے لگی 'میں کیا کر رہی ہوں۔ کوئی تجھے کھا تو نہیں جاؤں گی۔ مرا جا رہا ہے ڈر کے مارے۔ ارے ایک طرف آ کے پڑ جا۔ میری طرف سے تو اکیلا ہی ہے۔ چل تو کہے تو تجھ سے بات بھی نہیں کروں گی۔"

مجھے طرارہ آ گیا۔ "ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں' ابھی اس سمپورنا سالے کو دو ہاتھ مار کے اس کمرے سے نکالتا ہوں۔ یہ ہے تو یہی سہی۔"

وہ اٹھی میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔ میرا ہاتھ تھام کے خوشامد کرنے لگی "ناں ناں۔ تو سمپورنا کو مار پیٹ مت کرنا۔ اصل میں میری اس کی لڑائی ہے۔ شام سے بول چال بھی بند ہے تو میں اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ نہ ہی اسے ادھر آنے دوں گی۔ ایک ہی بار کی تو بات ہے۔ مجھے ادھر پڑا رہنے دو۔ سویرے مجھے پتا ہے سمپورنا مجھے منا لے گا۔ چلی جاؤں گی۔"

میں نے فرش پر بچھی سیتل پاٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "بستر خالی کر دے جا۔ سوتی ہے تو ادھر جا کے سو جا۔ تجھے ادھر نہیں ٹکنے دوں گا۔"

وہ جیسے مجبوری میں اٹھی اور کمبل سمیٹتی ہوئی سیتل پاٹی پہ جا کے خوب اوڑھ لپیٹ کے پڑ گئی۔ بستر پر ایک تکیہ اور گدا' چادر رہ گئے۔ پہلے میں سمجھا' یہ اس کی کوئی عیاری ہے۔ مجھے ستانے کو کمبل کھینچ کے چل دی ہے مگر دو تین منٹ میں وہ سکون سے ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی۔

اس کو اٹھانا یا یہ موضوع کو دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے دیکھا گدے کے نیچے دری بچھی تھی۔ تو بستر کی دری پر لیٹ کے میں نے چادر اوڑھی اور اپنے اوپر گدا ڈال لیا۔ کچھ دیر بے چین رہ کے آخر میں گرم اور پرسکون ہوتا گیا اور سو گیا۔ میرے اوپر سے گدا ہٹا کے کمبل اوڑھا دیا تھا۔

رات کی باتوں کا اثر میں نے نہ تو سمپورنا کے نہ پدما کے چہرے پر پایا۔ وہ معمول کے مطابق ناشتے کی اور کام پر جانے کی تیاریاں کرتے ہوئے مجھ سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔

آج پھر اسی شیڈ میں لے جا کر پلاسٹک کے بدبو والے ٹب دھونے سکھانے کی ڈیوٹی ملی۔ پدما کہنے لگی "آج ان کی دھلائی اور پیکنگ ہے۔ دھلائی سے تیری فراغت لنچ کے ٹائم تک ہو جائے گی۔ کوارٹر پہ آ جانا' تجھے اور سمپورنا کو چاول دال بنا دوں گی۔"

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ کوئی زیادہ بات اس سے نہ کی۔ میں نے دیکھ لیا تھا' اس ڈھب کی عورتوں سے زیادہ بات کرنے میں سراسر نقصان ہی ہوتا ہے۔

لنچ تک میں پلاسٹک کے وہ انوکھے ٹب دھوتا' سکھاتا رہا۔ پھر کوارٹر پر آیا تو سمپورنا اور پدما مجھ سے پہلے آئے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ لڑائی کے بعد میل ملاپ ہو گیا ہے کیونکہ دونوں بہت پاس بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ذرا سرک کے الگ ہوئے۔ پدما نے دوپہر کے وقت بھی ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی جو اس سالے سمپورنا کے چہرے پر جگہ جگہ اتر آئی تھی۔

پدما نے ہمیں دال چاول اور آم کا اچار دیا۔ کھانا اچھا بنا تھا اور اچار میں ایک بات تھی جو دوسری جگہ مجھے آج تک نظر نہیں آئی۔ کوئی برمی قسم کے نسخے ہوں گے' مجھے ہینگ کی مہک بھی آئی۔

کھانے کے بعد سمپورنا میرے ساتھ ہولیا۔ کہنے لگا "ٹب پورے دھل گئے' اب آؤ ان کی پیکن کر لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیسی پیکنگ؟"

بولا "چل تو رہے ہیں' دیکھ لینا۔" کوارٹر سے نکل کر ہم سیدھے مردہ خانے کی طرف چلے۔ سمپورنا نے چابی نکالی۔ تالا کھولا' اندر کی لائٹیں جلائیں اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔

"میں نے پوچھا تالا کیوں ڈال رہے ہو؟"

ہنس کے کہنے لگا "اس لیے کہ تم بھاگ نہیں جاؤ۔"

ایسی کوئی ہنسی کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔ وہ بھی سنجیدہ تھا اور اسی لمحے میری نظر سامنے مردے رکھنے والے سیمنٹ کے چھجوں پر پڑی اور چھجوں کے برابر اوپر تلے رکھے ہوئے میں نے دو دن کی مشقت سے دھو سکھا کے چمکا دیا تھا۔

چھجوں پر کوئی دو درجن ننگ دھڑنگ دھلی دھلائی تیار کی ہوئی لاشیں تھیں۔ مردوں' عورتوں' بوڑھوں' جوانوں کی لاشیں جنہیں دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ پیٹ چاک کر کے ہر لاش کی آلائش نکال دی گئی تھی۔ پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈرم ایک قطار سے رکھے تھے جن میں تیز بو والی ہی دوا ہو گی جس کی بو جو میں نے دو روز تک ٹب دھوتے ہوئے محسوس کی تھی۔ یہ کسی طرح کی گوشت محفوظ کرنے والی دوا تھی۔

ابھی میں مردہ گھر میں سجی ان سب چیزوں کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ کسی اندرونی کھٹکے سے مردہ گھر کا بغلی دروازہ کھل گیا اور سفید کوٹ پتلون' سفید بے داغ گاؤن اور ربڑ کے دستانے پہنے ربڑ کے اونچے جوتوں میں فرش پر کھس کھس کرتا ہوا سرجن دوبے آیا اور میرے بالکل سامنے لاشوں سے بھرے چھجوں کے درمیان کھڑا ہو گیا اور بولا "ہیلو! شیر خان۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پریشان ہو کر یہ سوال براہ راست دوبے سے کیا تھا۔ "ہم ان ڈیڈ باڈیز (مطلب لاشوں) کو پیک کریں گے۔"

"کیوں؟" میں لاحول پڑھنا چاہتا تھا مگر نہ معلوم کیوں سوال کیا تھا کہ ہم مردوں کو کیوں پیک کریں گے؟

سرجن دوبے اپنے آدمی سمپورنا کی طرف مڑا۔ "تم نے سمپورنا! شیر خان کو کچھ نہیں بتایا؟" سمپورنا بولا "ڈاک صاحب! میں نے سوچا' پہلے بتانا کیا ضروری ہے۔ ہم جب کام کرنے بیٹھیں گے تو شیر کان کو پتہ چل ہی جائے گا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ برا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ چھپانا جھوٹ بولنا پسند نہیں ہے۔ ارے بھئی جس کسی کو بھی ہمارے لیے کام کرنا ہے' اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ مطلب وہ کیا کام کرے گا ہمارے لیے۔" پھر وہ اپنے ربڑ کے دستانوں سے کھیلتا ہوا بولا "ہم اصل میں لاشیں ایکسپورٹ کرتے ہیں۔"

"ایکسپورٹ؟" ارے باپ رے باپ! یہ کیا بد معاشی ہو رہی ہے' میں نے سوچا۔

ڈاکٹر دوبے بولا "برما میں زیادہ کر کے بودھ' ہندو ہے' کرسچن اور مسلم کم کم ہی ہے۔ ہندو لوگ بودھ لوگ اپنے مردے جلا دیتا ہے۔ مسلم اور کرسچن مٹی میں دفن کرتا ہے یا سمندر پہ ہووے تو پانی کے حوالے کرتا ہے۔ مطلب دونوں صورتوں میں جلاؤ کہ پانی' مٹی کے حوالے کرو' لاش ہم کو نہیں مل پاتی۔"

"ہم کون؟"

"ارے ہم میڈیکل کالج والے۔ دنیا بھر میں یہی پرابلم ہے۔ اگر لاوارث نہیں ہے مرنے والا یا مرنے والی تو ہم اس کے مردے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور تم جانتے ہو' نئے ڈاکٹروں کو سکھانے کے لیے مرد و عورت کی مختلف عمر کی لاشیں چاہیے۔ بہت لاشیں چاہئیں۔ ایک دو نہیں ڈزنز بلکہ سینکڑوں۔ ہماری ایک فرم ہے کیڈے ورز ان

لمیٹڈ تو ہم دنیا بھر کے میڈیکل کالجوں کو لاشیں سپلائی کرتے ہیں۔ ابھی زیادہ کر کے ہم نے ان لاشیوں کے گٹس مطلب آنتیں نکال کے پھینک دیا ہے۔ ان کا جگر' دل' تلی پھیپھڑا وغیرہ نکال کے الگ پیکنگ میں کر دیا ہے۔ اسپرٹ میں ڈال دیا ہے۔ اب جو یہ کھوکھلے ہیں' مطلب خالی لاش لوگ ہے۔ اس کو دوا لگا کے پلاسٹک کے ان تابوتوں میں ایئر ٹائٹ پیک کر کے ہم رنگون ایئر پورٹ بھیج دیں گے۔ وہاں سے مختلف فلائٹس یہ اپنے اپنے ٹھکانوں پہ چلی جائیں گی۔

مجھے متلی آ رہی تھی۔ یہ کس اطمینان سے مزے لے لے کے بیان کر رہا ہے۔ جیسے کہ انسانی باقیات کا ذکر نہ ہو' گٹھلی نکلے ہوئے' شیرے میں پیاس کیے ہوئے آڑوؤں پر بات ہو رہی ہو یا چکن پیک ہو رہے ہوں۔ میں نے برا سا منہ بنایا تو سرجن دوبے مسکرایا۔ بولا "ہم نے یہ ایک ایک لاش بڑی مشکل سے کاغذی ہتھکنڈے اور کیا کیا استعمال کر کے حاصل کی ہے۔ کتنے ہی ان مردوں میں اصلی اور خالص برہموں کی اولادیں ہیں۔ بڑے بڑے شاندار بدھ مت لوگ ہیں۔ یہ سب اور ایک آدھا کرسچن آگ میں جلا دیا جاتا اور ضائع ہوتا۔ اب یہ ہے کہ میڈیکل سائنس کی ترقی میں یہ سب بھائی بند کام آئیں گے۔ چلو شیر خان! شروع ہو جاؤ۔ یہ جو ٹب جیسے ہیں' اصل میں تابوت کے اوپر نیچے کے پارٹ ہیں۔ ایک ٹب دوسرے میں ایسے فٹ ہو جاتا ہے کہ ربڑ کی لائننگ پٹی لگانے کے بعد نہ ہوا اندر جا سکتی ہے' نہ باہر آ سکتی ہے۔

میں نے غوں جیسی کوئی آواز نکالی۔

دوبے بولا "سمپورنا! پہلے ٹب میں دوا اسپرے کرو۔ تم چاہو تو اپنی کیتھولک دعا سے یہ کام شروع کر سکتے ہو۔ شیر خان! تمہیں معلوم ہے یہ سمپورنا کیتھولک مسیحی ہے؟"

مجھے یہ سن کے دکھ ہوا کہ ایک مذہبی آدمی اپنے عقیدے کے خلاف اس بے حرمتی والی تجارت میں دوبے کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ میں نے بلند آواز میں کہا "سمپورنا! تالا کھول دو۔ میں جا رہا ہوں۔ میں مسلم ہوں۔ اس طرح کے کسی کام میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔"

ڈاکٹر دوبے حیرت سے میری صورت تکنے لگا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو خان؟"

"میں اس شیطانی بزنس میں بالکل ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

وہ رسانیت سے بولا "تم سمجھے نہیں۔ یہ جو بھی لاش ہے' جب زندہ تھی تو کسی اصل مرض میں مبتلا تھی۔ میں نے' میرے ڈاکٹر ساتھیوں اور پیرامیڈیکل اسٹاف نے

پوری پیشہ ورانہ دیانتداری سے کام لے کر تگ و دو کی ہے۔ انہیں پھر صحت دینے' کار آمد انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے مگر ہماری تمام کوششوں کے باوجود بعض مریض بہت سے مریض جانبر نہیں ہو پاتے۔ ان بیچاروں کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ مر گئے اور اب ان کو میڈیکل سائنس کے لیے مفید بنانے کا ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔ اس لیے شیر خان جانے کی بات مت کرو۔ سمپورنا اور تم اسپرے کیے ہوئے پلاسٹک کے اس آدھے تابوت میں لاشیں رکھتے جاؤ۔ میں اوپر سے پلاسٹک کی ڈھکنے فٹ کرتا جاتا ہوں......"

O

"تین چار گھنٹے میں یہ شپ منٹ تیار ہوئی جاتی ہے۔"

میں نے دل میں کہا۔ "لعنت ہے تمہاری شپ منٹ پر۔" اور سمپورنا کو اشارہ کیا کہ وہ تالا کھول دے اور مجھے مردہ خانے سے باہر جانے دے۔ سمپورنا ڈاکٹر دوبے کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ میرا ارادہ اٹل ہے اس نے اشارہ کیا کہ کھول دو۔ سمپورنا نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازہ کھول دیا۔ میں ان دونوں آدمیوں پر نظر ڈالتا ہوا باہر نکل آیا۔

اب اس کے سوا مجھے کچھ نہیں کرنا کہ روانہ ہو جاؤں۔ میں سیدھا اسپیشل وارڈ کی طرف جاؤں گا کے کے کو ساتھ لے کر اسپتال سے باہر آؤں گا اور ٹیکسی پکڑ کر اس کاٹھ کباڑ کی تجارت کرنے والے کباڑی کے وہاں پہنچوں گا جس کے پاس ہماری جیپ محفوظ کر دی گئی ہے۔ اسے دوبے کا حوالہ دوں گا اور گاڑی لے کر ہم دونوں نکل جائیں گے۔ رنگون بڑا شہر ہے ہمیں پناہ مل جائے گی۔ اس وقت تک کہ میرے بابا کا سراغ نہیں ملتا ____ مجھے رنگون شہر پناہ دے گا۔

اسپیشل وارڈ کے علاقے میں کوئی زیادہ آون جاون نہیں تھی۔ میں اسٹیل کی شیٹ چڑھے ہوئے بھاری دروازے کو دھکا دے کر اندر پہنچا اور جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

کے کے والے وارڈ کے بند دروازے کے سامنے کرسی بچھائے دو پولیس والے بیٹھے تھے۔ دونوں ایسی کاہلی اور بے فکری سے بیٹھے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھنٹوں سے ڈیوٹی دے رہے ہیں اور دنوں تک اسی طرح رہتے رہیں گے۔ آگے جانے کی کوئی صورت نہیں تھی میں الٹے قدموں چلا ابھی کچھ کرنے، کسی طرف بھی مڑنے کا فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ان دونوں پولیس والوں میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر چیخ کر کہا: "ہے! رکو رکو! اے تم شیر خان رکو!"

"باپ رے باپ! یہ مجھے پہچانتا ہے۔" میں دروازہ کھول کر اسپیشل وارڈوں کے

علاقے سے نکل آیا اور بے سوچے سمجھے ایک طرف دوڑنے لگا۔

فوری طور پر تو کوئی میرا تعاقب نہیں کرے گا۔ مجھے دو تین منٹ کا اسٹارٹ مل گیا ہے کہیں چھپنا ____ فوری طور پر چھپنا ضروری ہے۔

ابھی پانچ منٹ نہیں ہوئے تھے اور میں وارڈ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ "مگر یہ میں کہاں ہوں۔" جگہ جانی پہچانی ہے۔ اوہ! میں سمپورنا اور پدما کے کوارٹر کے سامنے تھا۔ میں بے دھیانی میں دوڑتا ہوا اس طرف نکل آیا تھا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ جہاں مجھے پناہ ملی تھی۔

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں دروازہ کھلواؤں اور اس کوارٹر میں پناہ لوں وقتی طور پر ہی سہی۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا جو کھلا ہوا تھا اور کوارٹر میں داخل ہو گیا۔

صحن کے وسط میں بنے تلسی کے پودے کے سنگھاسن یا "شاہی نشست" یا سمجھو مرکزی جگہ کے پاس وہ عورت کھڑی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے پوری عقیدت سے تلسی کے متبرک پودے کو پانی دے رہی تھی۔ میری آہٹ سنی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور چہک دار آواز میں بولی۔ "دیکھا آ گیا نا' ابھی میں نے دعا مانگنا شروع کی تھی۔"

میں نے کوارٹر میں آ کے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

"پولیس والے نے مجھے دیکھ لیا ہے۔" میں نے پدما کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔

"ارے لے پھر تو آ میرے ساتھ میں تجھے چھپنے کی جگہ بتا دوں۔" پدما نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے کمرے میں کھینچ کر لے گئی۔ اندر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی۔

دن کی روشنی آنی بند ہو گئی تو کمرے میں اندھیرا سا ہو گیا۔ اس اندھیرے میں وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے بستر کی طرف لائی۔ ایسے خوف اور پریشانی کے لمحے میں بھی مجھے وہم ہوا کہ یہ عورت کوئی ہلکی چھچھوری بات سوچ کے تو مجھے نہیں لے جا رہی ہے؟ مگر وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئی۔ تخت یا مسہری یا پلنگ وہ جو بھی تھا کافی چوڑا چکلا اور اونچا تھا۔ میرا ہاتھ چھوڑ کے وہ بیٹھی بیٹھی آگے سرک گئی کچھ دور ہاتھ بڑھا کر اس نے کوئی چیز اپنی گرفت میں لی اور مشقت کی آواز نکالتے ہوئے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی گرفت پر اپنے پنجے کی گرفت جمائی

اور جو کچھ کھینچا جا رہا تھا۔ اسے آسانی سے رول کر لیا۔ وہ ایک بھاری تختہ تھا جسے چھوٹے پن رولروں پر لگایا گیا تھا۔ ہم نے تختہ کھینچ لیا تو اندر کہیں سے آتی بہت ہلکی سی روشنی سے ایک چورس جگہ نمایاں ہو گئی۔

پدما نے پلنگ کے نیچے بیٹھے بیٹھے میرے کان سے منہ لگا کے کہا۔ "یہ تہہ خانے کا رستہ ہے۔ آٹھ قدم کی سیڑھی ہے تو سنبھل سنبھل کر آٹھ قدم گن کر اتر جا۔"

جیسا وہ بتا رہی تھی میں نے ویسا ہی کیا۔ آٹھ قدم اترا تو میں سیمنٹ کے ہموار فرش پر کھڑا تھا۔ اندر کم ہی جگہ تھی میں آٹھ ساڑھے آٹھ فٹ لمبے' پانچ چھے فٹ چوڑے تہہ خانے میں موجود تھا۔ ایک طرف دیوار میں فٹ بھر ڈایا میٹر کا گول سا سوراخ تھا۔ یہ سوراخ کہیں اوپر تک چلا گیا تھا۔ اس سے ہوا اور روشنی اندر آ رہی تھی۔

پدما نے میرے سیڑھی سے اترتے ہی اوپر سے تہہ خانے کا تختہ کھینچ لیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ بہت ہلکی روشنی کے سوا اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں اس مختصر سی جگہ میں بچھے دیوان یا کاؤچ پر لیٹ گیا اور اوپر کے کمرے سے آتی ہلکی آہٹیں سننے لگا۔ پدما اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے نکل گئی تھی۔ بہت دیر تک کچھ نہیں ہوا پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوارٹر کے ٹین کے دروازے پر کوئی بے رکے ہاتھ مار رہا ہو۔ کسی نے کچھ پکار کے کہا بھی تھا۔ پھر پدما کی آواز سنائی دی لفظ سمجھ میں نہ آسکے۔ مگر آواز کے تیوروں سے میں سمجھ گیا کہ اسنے جھنجلا کر کچھ کہا ہے۔ کہیں دروازے کھلے اور عورت اور مردوں کے جھک جھک کرنے کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دیتی رہی۔ شاید کچھ تلخ کلامی سے آخر میں مار پیٹ کی بھی آواز سنائی دی۔ پولیس والے پدما سے بدسلوکی کر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔

مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کیوں کہ وہ جو بھی کمینگی کر رہے تھے' بے چاری عورت کو میری وجہ سے وہ سب کچھ سہنا پڑ رہا ہے۔ جب کہ میں اس کا کچھ بھی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر اور مکھیوں کی بھنبھنانے کی یہ آواز آتی رہی پھر ایک دروازہ زور سے کھلا۔ یہ شاید اس کمرے کا دروازہ تھا جہاں سمپورنا اور پدما نے مجھے مہمان ٹھہرایا تھا۔ اس دوسرے کمرے میں کھڑ بڑ اور جھنجٹ ہوتا رہا۔ پھر اس خاص کمرے میں جس کے تہہ خانے میں بیٹھا میں سب آوازیں سن رہا تھا وہ لوگ گھس آئے۔ یہاں کچھ دیر تک چیزیں ادھر ادھر پھینکی جاتی رہیں۔ پھر گالیاں بکنے اور ہاتھا پائی کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ لوگ پدما کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ پدما گالیاں دیتی رہی مگر آوازوں سے لگ رہا تھا کہ انہوں

نے اس پر قابو پا لیا ہے۔ وہ ایک سے زیادہ ہوں گے۔ کتنی ہی توانا صحت مند سہی پدما آخر کو عورت تھی۔ کچھ دیر تک یہ سب گڑبڑ ہوتی رہی پھر ایسا معلوم ہوا کہ پدما نے مزاحمت ترک کر دی اور وہ من مانی کرنے کو آزاد ہو گئے ہیں۔

دس بارہ منٹ بعد پرشور انداز میں اس کمرے کا دروازہ کھلا' بند ہوا اور صحن سے بھاری قدموں کی چاپ گزر گئی۔ کوارٹر کا ٹین کا دروازہ کھولتے بند کرتے وہ جتنے بھی تھے چلے گئے۔

گھر میں سناٹا ہو گیا اور پانچ دس منٹ سناٹا رہا پھر کسی کے' ظاہر ہے پدما ہی کے' دھیرے دھیرے چلنے پھرنے کی آہٹ سنائی دی۔ باہر کا' کمرے کا دروازہ بند کیا گیا اور آہستہ آہستہ تہہ خانے کا تختہ کھینچا جانے لگا۔ نیم اندھیرے میں آہستہ آہستہ اترتی ہوئی وہ عورت آئی اور تہہ خانے میں بچھے دیوان پر میرے برابر بیٹھ گئی۔ اور دھیرے دھیرے کراہنے لگی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی کتوں کے جنے آئے تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ نہیں رہے تھے بدمعاشی کرنے آئے تھے۔"

میں نے افسوس کی آواز نکالی۔ میری وجہ سے اس عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے واقعی دکھ ہوا تھا۔

وہ بولی۔ "بس ان کا یہی ہے' حرام کے جنوں کا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے گلے لگ گئی۔ کچھ دیر اسی طرح رہی' پھر بولی "وہ کہہ گئے ہیں کہ ہم پوری نفری کے ساتھ ابھی آ رہے ہیں۔ تیرا کوارٹر کھود کے رکھ دیں گے۔"

"یہ بہت تشویش کی بات تھی۔ میں نے کہا "اچھا تو میں جا رہا ہوں۔"

پوچھنے لگی "کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں بھی چلا جاتا ہوں' بس یہاں نہیں ٹکوں گا۔ انہوں نے یہاں سے مجھے پکڑا تو تمہیں اور زیادہ ستائیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی "ابھی تو میں تجھے یہاں سے نکال لیتی ہوں' آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

وہ ہاتھ تھام کے مجھے تہہ خانے سے نکال لائی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تو میں نے دیکھا' اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور مسلا مسلا تھا۔ کمرے کی چیزیں بھی بے ترتیب اور بکھری ہوئی تھیں۔ وہ اگر دو تین تھے تو دونوں تینوں نے بے چاری عورت کو زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے چہرے پر نیل تھے اور دانتوں کے اور نئی خراشوں کے نشان تھے۔

کچھ دیر وہ کمرے کے بکھرے سامان کے درمیان کھڑی رہی۔ پھر کہنے لگی ''یہ لوگ پہلے سے کوشش میں تھے۔ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ اب کوارٹر کی تلاشی کا بہانہ بنا کے آئے' یہ کر گئے۔ تم میری فکر مت کرو۔ یہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔''

میں نے سوچا۔ وہ برما ہو' کوئی جگہ ہو' پولیس والوں کی حرکتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ شاید انہی علاقوں میں ہوتا ہوگا جن پر انگریز کی حکومت رہی ہے۔ انگریز نے اپنی پولیس کو ایسا ہی رکھا ہوگا کہ وقت ضرورت اِن سے عام لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کا کام بھی لیا جاسکے۔

اس عورت پدما نے بستر سے ایک چادر اٹھا کر مجھے اوڑھا دی۔ کہنے لگی ''میرے ساتھ چادر اوڑھ کے باہر نکل آ۔ کوئی سمجھے گا بیمار کو دکھانے لے جا رہی ہوں۔''

میں سر ڈھکے بدن پر اچھی طرح چادر لپیٹے کوارٹر سے نکل کے عورت کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہ جانا پہچانا رستہ لگتا تھا۔ جگہ تو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بیمار کی طرح اپنا سر اور چہرہ ڈھکے راستہ طے کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی محفوظ جگہ پہنچنے سے پہلے پہچان لیا جاؤں اور دس منٹ تک رکتے' چھپتے چھپاتے ہم دونوں چلتے رہے۔ میں نے دیکھا اسپتال کا یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے میں بارہا گزرا ہوں گا۔

پھر ایک موڑ مڑ کے عورت رک گئی۔ اس نے ایک جانے پہچانے دروازے پر دستک دی اور پکار کے کہا کہ کھولو ہم لوگ آ گئے ہیں۔ دروازہ کھول دیا گیا' اندر سمپورنا اور سرجن دوبے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

عورت کسی دور کے راستے سے مجھے دوبارہ مردہ خانے میں لے آئی تھی۔ ''ارے!'' میں نے عورت کی طرف دیکھا۔

دوبے نے کہا ''ارے!''

''کیا کرتی سمجھ رہی تھی اور سب جگہ وہ پہنچ جائیں گے اور تجھے پکڑ لے جائیں گے۔ مردہ خانہ ہی ہے جہاں وہ نہیں گھستے۔ مطلب جب تک زندہ ہیں' ادھر نہیں آتے۔

آخر میں تو آتے ہی ہیں حرامی۔''

وہ مسخرے پن کی باتیں کر کے شاید سمپورنا اور دوبے سے وہ تکلیف دہ بات پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی جس سے کوارٹر میں ابھی ابھی گزری تھی۔

سمپورنا نے ایک بار اس کے چہرے' اس کے لباس پر نظر ڈال کر پوچھا کہ یہ کیسے اور کہاں سے بربادی کر لائی مگر اس نے سمپورنا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

دوبے بظاہر ہمدردی سے میری کہانی سنتا رہا کہ پولیس والوں نے مجھے دیکھ کر اس طرح پیچھا کیا اور اب میں پھر اس کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

کہنے لگا ''تم ضد کر رہے تھے تو میں نے جانے دیا۔ نہیں تو اصل بات یہ ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مطلب دوسرے لفظوں میں سمجھو تو میں نہیں چاہتا کہ تم میرا ساتھ چھوڑو۔''

وہ دونوں اپنے اسی منحوس کام میں لگے ہوئے تھے یعنی مردوں کو پلاسٹک کے ہوابند تابوتوں میں دواؤں کا اسپرے کر کے پیک کر رہے تھے۔ سمپورنا کہنے لگا۔ ''ابھی تو تم کو کچھ دیر رکنا پڑے گا۔ اس لیے کہ پولیس والے اسپتال میں ہر جگہ باؤلے جانور کی طرح تمہاری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔ اس لیے جتنی دیر ہمارے ساتھ یہاں رہو تو ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔ مہربانی ہوگی تمہاری۔''

میں نے کہا ''تمہاری اور سرجن دوبے کی مہربانی ہے جو تم مجھے مردہ خانے میں چھپانے پر رضامند ہو گئے ہو۔'' سرجن ہنسنے لگا۔ بولا ''ہندوستان میں ایک جگہ ہے لکھنؤ وہ بڑی کلچرڈ جگہ ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے بڑے دھیمے سبھاؤ سے بات کرتے ہیں تو اس وقت لگتا ہے۔ اس مردہ گھر میں تم دونوں بھی لکھنؤ کا سا ناٹک کر رہے ہو۔''

باتیں کب تک چلتیں' سمپورنا نے مجھے اپنے ساتھ مددگار لگا لیا۔

وہ مردے کو شانوں سے پکڑتا' میں ٹانگوں میں سنبھالتا اور سرجن دوبے نے اسپرے کر کے جو تابوت تیار کیا ہوتا' ہم دونوں اس میں مردے کو لٹا دیتے۔

سارے ہی مردے بنا کپڑوں کے پیک کیے جا رہے تھے۔ ہاں ایک بار تابوت میں رکھنے کے بعد ہم نرم ٹشو پیپر کی گیندیں سی بنا کر مردے کے ہر طرف رکھتے جاتے اور اس طرح اسے بالکل ڈھک دیتے تو سرجن دوبے جو منہ پر ماسک چڑھائے ہوئے تھا' ہمیں تابوت کے پاس سے ہٹنے کا اشارہ کرتا۔ ہم ہٹ جاتے تو دوبے اپنی اسپرے گن سے ٹشو کی ان گیندوں کو تر کر دیتا اور ہم جھپٹ کے اوپر تابوت کے ڈھکنا رکھ دیتے۔ دوبے

ربڑ کی لائننگ پٹی رکھ کر کھٹ سے تابوت کو پیک کر دیتا۔ اب اندر کی ہوا باہر نہیں آسکتی تھی' نہ باہر کی ہوا اندر جا سکتی تھی۔ ہم دونوں تابوت کو ٹرالی پر رکھتے اور ٹرالی کھینچتے ہوئے لے جا کر ایک طرف قطار میں لگے دوسرے تابوتوں کے ساتھ رکھ دیتے۔

ہم چار گھنٹے اور یہ پیکنگ کرتے رہے۔ پھر ہم سب غسل کرنے گئے اور شاور کے بعد دوبے کی بند گاڑی میں ہمیں اسپتال کے کچن کے علاقے میں لے جایا گیا۔

تینوں نے ایک الگ تھلگ کمرے میں کھانا کھایا۔ جتنی دیر دوبے سگریٹ پیتا رہا' ہم انتظار کرتے رہے۔ جونہی اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی' تینوں کمرے سے نکل آئے۔ بند گاڑی ہمیں پھر مردہ خانے لے آئی۔

اب تک کے پیک کیے ہوئے تابوت لے جائے جا چکے تھے۔ ان کی جگہ ایک نئی قطار خالی تابوتوں کی لگی ہوئی تھی۔ مردہ خانے میں ایکسپورٹ کے لیے تیار کیے ہوئے کچھ اور مردے پہنچا دیئے گئے تھے۔ چار پانچ گھنٹے اور ان مردوں کو ٹھکانے لگانے میں صرف ہوئے۔ آخر بارہ بجتے بجتے مجھے بند گاڑی میں سرجن دوبے کی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ ایک گھنٹہ نہانے دھونے' کھانے پینے میں لگا۔ دوبے کی دھلی ہوئی سفید پتلونیں' قمیصیں اور نرم ربڑ سول جوتے میرے پہننے کے لیے لائے گئے تھے۔ وہ پہن کر میں اسپتال کے وارڈ بوائے کے سے حلیے میں آگیا۔ رات ایک بجے کے بعد دوبے کہنے لگا۔ "آؤ تمہارے دوست کو دیکھنے وارڈ کی طرف چلتے ہیں۔ مجھے ابھی انٹر کوم پر خبر دی گئی ہے کہ پولیس والوں کی جو ٹکڑی تمہیں تلاش کرتی پھر رہی تھی' اس کی شفٹ بدل چکی ہے۔ اب اور ہی کوئی نیا یونٹ آیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں تمہارے ہاتھ میں سوئی والی ٹرے تھما دوں گا۔ تم میرے ساتھ میرے ڈسپنسر بن کے چلے چلو۔ کے کے کو اس ملاقات کے لیے بیدار کیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ واقعی خوش ہوا تھا۔ سرجن اس کے سامنے ایسی خوشامد کی باتیں کرتا رہا کہ کیا کسی کروڑپتی کے خوش کرنے کو کرتا ہوگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے علاج کے لیے بھاری فیس دی گئی ہے اور وہ مریض اور اس کے متعلقین کو خوش کرنے کو خوب لفاظی کر رہا ہے۔

ابھی ہم لوگ ایک دوسرے کا حال چال ہی پوچھ رہے تھے کہ اسپتال میں کہیں دھماکہ ہوا اور وارڈ کی بجلی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے سب طرف پیلی سی روشنی پھیل گئی۔ جنریٹر آپ ہی آپ چل پڑے تھے۔ سرجن دوبے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت وارڈ میں رکھا فون بجنے لگا۔ اسپتال میں کہیں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اسے فوراً وہاں جانا

تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "یہیں رکو' میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" وہ چلا گیا تو کے کے نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور آہستہ سے اتنے آہستہ کہ دروازے پر بیٹھے پولیس والے بھی نہ سن سکیں۔ کہا "تمہیں مردہ گھر میں ڈیوٹی دینی پڑ رہی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ تم نے مردہ گھر میں کام کرنے سے انکار کیا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

"پھر انہوں نے تمہیں تالا کھول کر چلے جانے دیا؟"

"ہاں مگر......؟"

"تم یہاں آئے' پولیس والے بیٹھے تھے جو تمہیں دیکھ کر جھپٹے؟"

"ہاں وہ مجھے پہچان گئے تھے۔"

"کوئی کسی کو نہیں پہچانا تھا۔ انہیں دوبے نے فون کیا تھا کہ تم ادھر آرہے ہو۔"

"اچھا؟" مگر بھائی یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"میں سوتا بن گیا تھا۔ ایک پولیس والے نے فون سنا تھا۔ پھر جو باتیں ہوئی تھیں' دوسرے کو سنائی تھیں۔ بس میں نے بھی سن لیں۔"

"حیرت ہے۔"

"حیرت کیا؟ اچھا یہ بتاؤ یہ لوگ تمہیں گھیرتے ہوئے اس عورت پدما کے کوارٹر تک لے گئے تھے؟"

"ہاں وہاں مجھے تہہ خانے میں چھپنا پڑا۔"

"ہاں تم چھپے رہے اور پولیس والوں نے پدما پر بار بار مجرمانہ حملے کیے؟"

"ارے!" مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ "اچھا تمہیں یہ سب بھی معلوم ہے؟"

وہ بولا "پولیس والوں کو فون کرنے کے بعد سمپورنا اور دوبے کو اس کوارٹر میں پہنچنا تھا اور وہاں اس عورت کو سمپورنا اور دوبے کو آوازیں بنا بنا کے جبری کارروائی اور زیادتی کا ناٹک سنانا تھا۔ یہ سب تمہارے لیے تھا۔ عورت اور سمپورنا آوازوں سے زیادتی کا ماحول بناتے رہے ہوں گے اور ڈاکٹر دوبے سامان ادھر ادھر پھیلاتا رہا ہوگا۔ پھر وہ لوگ

دھپ دھپ کر کے کوارٹر سے چلے گئے ہوں گے۔" میں نے کہا "اوہ..... کیسے عیار لوگ ہیں!"

"پھر پدما تمہیں مردہ خانے لے گئی ہوگی؟"

"ہاں......اور وہاں مجھے چار چار گھنٹے کی دو شفٹوں میں کام کرنا پڑا۔"

"جی ہاں' ان کا کام نکل گیا۔ ان کی شپ منٹ جہازوں پر لوڈ کی جا رہی ہو گی۔"

"او مائی گاڈ!"

میں نے کے کے سے کہا "تمہارے پوری طرح صحت مند ہو جانے تک یہ لوگ مجھے مردہ گھر کا مزدور بنا کے رکھنا چاہتے ہیں۔"

"میں ٹھیک تو ہو رہا ہوں لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی وہ نہ تو تمہیں' نہ ہی مجھے یہاں سے نکلنے دیں گے۔ ہمیں اپنا مردہ گھر کا غلام بنا کے رکھیں گے۔"

کے کے' کے خدشات مجھے بے بنیاد لگے۔ ایسا بھی کیا اندھیر مچا ہوا ہے کہ دو آدمیوں کو ان کی مرضی کے خلاف لمبے عرصے کے لیے غلام بنا کر رکھا جائے گا۔

کے کے بولا "پہلے ان کے پاس آٹھ آدمی تھے۔ وہ آٹھوں کسی طرح اس سرجن دوبے کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ اپنی مرضی سے نہ وہ کہیں جا سکتے تھے' نہ کسی سے مل سکتے تھے۔ ان آٹھوں سے سرجن دوبے مردے دھونے اور صاف کر کے پیک کرنے کا کام لیتا تھا۔ وہ بیمار ہو کے مر گئے۔ ایک پر کام اور قید کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ سارا سارا دن شور کرتا رہتا ہے۔ اسے دماغی امراض کے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ وہاں پچھلے ہفتے وہ بھی مر گیا۔ اچھا بھلا سویا تھا' صبح مرا ہوا پایا گیا۔ سب کو شک ہے کہ اسے زہر کا انجکشن دیا گیا ہے۔ باقی تین کچھ کر کے چوکیداروں کو دے دلا کر نکل گئے۔ اسی لیے مجبور ہو کے دوبے کو مردہ گھر میں رات کی شفٹ لگانی پڑ رہی ہے کیونکہ آٹھ میں سے اس وقت دو مزدور رہ گئے ہیں یا اب تم اور میں پھنسے ہیں۔ چاہے کچھ ہو جائے' دوبے ہم دونوں کو نکلنے نہیں دے گا۔"

"یہ بہت خطرناک باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ تاہم میں نے کے کے سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور نکلے گی کہ ہم اس قید اور غلامی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوں گے۔"

پانچ منٹ کا کہہ کے گیا تھا اور چھٹے ساتویں منٹ میں دوبے لوٹ آیا۔ کہنے لگا

"اسپتال کے بجلی کے ٹرانسفارمر میں دھماکہ ہوا ہے۔ رات کے اسٹاف کا ایک آدمی معمولی جھلس گیا تھا۔ ہم نے اسے علاج کے لیے حادثات کے شعبے میں بھیج دیا ہے۔ آؤ چلیں' اب ہمارے سونے کا وقت ہے۔"

دوبے کی بند گاڑی میں' میں اس کی کوٹھی پر لایا گیا۔ بیس منٹ یعنی تہہ خانے کے وسیع و عریض ہال میں ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں میرے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ دوبے ہی کے استعمال شدہ کپڑے مجھے پہننے کو دیئے گئے۔ میں تھکا ہوا تھا' پریشان دماغی کے باوجود لیٹتے ہی سو گیا۔

سویرے دن نکلنے سے پہلے سپورنا اور پدما آ گئے۔ وہ عورت جس نے شروع میں مجھ پر فریفتہ ہونے کا ناٹک رچایا تھا اور مجھے پھانسنے کو اپنے عاشق سپورنا کے ساتھ مل کے پولیس زیادتی کا ڈراما کھیلا تھا' اس وقت خاموش تھی۔ دوبے نے ان دونوں کو کس دباؤ میں رکھا ہے' ابھی تو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں اندازہ ضرور ہو رہا تھا' کسی قسم کا دباؤ اس مرد اور اس عورت پر ضرور ہے جو وہ سرجن دوبے کا حکم بجا لاتے ہیں' چوں چرا نہیں کرتے۔

ناشتے کے بعد پدما ذرا چہکی' میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ میرا ہاتھ تھام کے دھیرے دھیرے کہتی رہی کہ اگر رنگون آنے سے پہلے میری اس کی ملاقات ہو گئی ہوتی تو ہم دونوں شادی کر لیتے اور برما چھوڑ کے تھائی لینڈ لاؤس یا قریب کے کمبوڈیا میں جا بستے۔ پھر مڑ کے کبھی ادھر نہ آتے۔

میں نے کہا "تم یہاں کیوں ہو۔ جب یہ جگہ رنگون تمہیں اچھی نہیں لگتی تو نکل جاؤ' اپنے آدمی کو لے کے۔ اب بھی ہمسایہ ملکوں میں سے کسی میں جا سکتی ہو۔"

وہ ہنس کے بولی "یہی تو بتا نہیں سکتی کہ یہاں کیوں جمی بیٹھی ہوں۔ شاید اس سپورنا کی وجہ سے۔ شاید اس وجہ سے کہ صحیح وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔ جب تم جیسا کوئی آ جائے گا تو سپورنا کو چھوڑ کے اس آنے والے کا ہاتھ پکڑ کے نکل جاؤں گی۔"

وہ اپنی مجبوری بیان کرنا چاہتی بھی تھی اور صاف لفظوں میں بتا بھی نہیں سکتی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم تینوں کو ایک نئی "ورکشاپ" میں لے جایا گیا جہاں مردوں کے بدن سے نکالے ہوئے اعضائے رئیسہ 'دل' پھیپھڑوں' گردوں وغیرہ کو صاف کر کے الگ الگ پیکنگ میں اسپرٹ میں رکھ کے مہربند کیا جاتا تھا۔ یہ کام بہت تھکا دینے والا تو

نہیں تھا' اس لیے کہ اسٹیل کی بڑی بڑی ٹرے اور گھومنے والی کرسیوں پر دستانے پہن کے کام کرنا ہوتا تھا۔ جتنی دیر ہم "ورکشاپ" میں کام کرتے رہے' پوشیدہ مائیکروفونز سے ہلکی موسیقی نشر ہوتی رہی۔

دو دن اِن دل' جگر' پھیپھڑوں اور مغز وغیرہ کو اسپرٹ پیک کرنے میں لگے۔ تیسرا دن شپ منٹ کے لیے پلاسٹک کے تابوت دھونے اور تیار کرنے میں لگ گیا۔

آٹھ آدمیوں کا کام ہم تین اور کبھی کبھی دوبے کو ملا کے چار آدمی کر رہے تھے۔ دوبے نے اب ایک طرح سے کھل کے کہہ دیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو' جب تک تمہارا ساتھی کے کے "بالکل صحت یاب" نہیں ہو جاتا تمہیں میڈیکل سائنس کو ترقی دینے کے لیے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ میں نے ایک ہفتہ بہت تکلیف کا گزارا۔ کمر توڑ کام اور ایک منٹ کے لیے باہر نہ نکل سکنے کی اجازت پر ایسی حالت تھی کہ زیادہ دن جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ مشقت کے آٹھویں نویں دن مجھے کے کے سے بات کرنے کا پھر موقع مل گیا۔ دوبے اور سمپورنا جاں بہ لب مریض کی پروگریس' مطلب خاتمے کی طرف بڑھنے کی رفتار دیکھنے چلے گئے۔ جس کی جسمانی حالت دوسرے انسانوں سے مختلف تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ مریض کس طرح مختلف تھا لیکن لاشوں کی مارکیٹ میں اس اکیلے کے دس گنا پیسے اٹھائے جا سکتے تھے۔ ممکن ہے اس کے تین ہاتھ ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مریض جنسی ساخت میں بیک وقت مرد بھی ہو اور عورت بھی۔ بہر حال دوبے اور سمپورنا بہت زیادہ جوش میں تھے اور مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ یہ غیر معمولی لاش ہاتھ آگئی تو تمہیں بونس ملے گا۔ بونس کیا ہوگا' یہ مجھے معلوم تھا یعنی دوبے کی گاڑی ہمیں سینما ہال لے جائے گی اور ایک شو دکھا کے بازار کی سیر کرائے گی۔ پھر ضیافتوں جیسے کھانے کھلا کر اور سمپورنا اور پدما کو شراب پلا کر واپس اسپتال لے آیا جائے گا۔

دوبے سمپورنا مریض کو دیکھنے چلے گئے تو کے کے نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا کہ یہاں دواؤں کی سپلائی ایک کرسچین ٹھیکیدار کرتا ہے۔ جوزف نام ہے اس کا۔ جوزف کو دوبے کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ ہے لیکن وہ اُن سرکاری اہلکاروں سے ٹکرانے کے حق میں نہیں جو دوبے کی پشت پر ہیں۔ اس نے کے کے سے وعدہ کیا ہے کہ جیسے ہی اس کا ہاتھ ٹھیک ہوا' جوزف باہر کے ایک رنگونی دادے سے کے کے کی یا میری ملاقات کرا دے گا۔ رنگونی دادا بہت سے ناقابلِ ذکر "رفاہی کاموں" میں ملوث ہے۔ وہ جوا کھلاتا ہے۔ بالا لائسنس شراب بنواتا اور بکواتا ہے۔ ضرورت مندوں کی دل بستگی کے لیے گھروں

پر گانے والیاں پہنچاتا ہے جو ضروری نہیں کہ گاتی بھی ہوں۔ زیادہ تر تو وہ صرف "والیاں" ہی ہوتی ہیں۔ گانے سے محروم مگر دوسرے کسی فن میں یکتا۔ کے کے کو دواؤں کی سپلائی والے نے بتایا کہ رنگونی دادا پیسے تگڑے لے گا مگر تم دونوں کو یہاں سے نکال دے گا۔ میں نے کے کے سے کہا کہ پیسے کی فکر مت کرو' جیسے ہی رنگون میں ہمیں آزادی ملے گی یا ہم بابا (صمد بنگش صاحب) سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے' ویسے ہی سمجھو پیسے فراہم ہونے کی صورتیں نکلتی آئیں گی۔ تم ٹھیکیدار سے پکا کر لو کہ رنگونی دادا جو رقم مانگے گا' ہمیں منظور ہے۔ بس اتنا ہے کہ دادا سے رقم دینے کے لیے کوئی مہلت مانگ لو۔ ہفتہ دس دن کچھ بھی۔ ابھی اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں کہ دوبے اور سمپورنا آگئے۔ دونوں بہت خوش تھے' وہ پارٹی کو فون کرتے ہوئے آئے تھے کہ کل نہیں تو پرسوں ہر حال میں غیر معمولی لاش کی ڈلیوری کر دی جائے گی۔ ہم دونوں روٹین میں کام کرتے رہے۔ تیسرے دن وہ غیر معمولی لاش دوبے کے ہاتھ آگئی۔ یہ ایک ایسے انسان کا جسد تھا جس میں عورت اور مرد دونوں کی جسمی خصوصیات موجود تھیں۔ ہم نے اسے اسپیشل تیاری کے ساتھ پیک کیا۔ اس کے اعضائے رئیسہ بھی ساتھ ہی اسپرٹ پیک کیے گئے اور رات ہونے سے پہلے اسے پارٹی کے حوالے کر کے رسید لے لی گئی۔ دوبے نے شام ہوتے ہی کہہ دیا تھا کہ آج آخری شو دکھانے تم تینوں کو (مطلب سمپورنا' پدما اور مجھے) لے جایا جائے گا۔ شام ہی میں' میں وارڈ کی طرف دواؤں کا اسٹاک اٹھانے گیا اور کے کے کو ایک پرچا پہنچانے میں کامیاب ہو گیا جس میں اس سینما کا نام اور شو کا ٹائم میں نے لکھ دیا تھا۔ کے کے نے اپنی سونے کی زنجیر کے عوض وہ پرچا رنگونی دادے تک پہنچا دیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے بھی اطلاع کرا دی کہ نو بجے تک دونوں طرف کی لائن دادا نے ٹھیک کر دی یعنی اسے اسپتال سے تو کے کے کو اٹھانا تھا اور سینما ہال سے مجھے۔ یہ سب وہ کس طرح کرے گا' ہم نے نہیں پوچھا۔ وقت ہی نہیں تھا اور ویسے بھی ضرورت کیا تھی۔ میرے اور کے کے' کے پاس دادا کا پیغام پہنچ گیا تھا کہ ہم اتنے اتنے بجے کہاں' کس پوزیشن میں رنگونی دادا کی کارروائی کا انتظار کریں گے۔ کے کے' کو خبر نہیں کہاں' کس طرح انتظار کرنا تھا۔ میرے لیے ہدایات یہ تھیں کہ میں نو بجکر دس منٹ پر ہر حال میں سینما ہال کے مردانہ واش روم میں موجود رہوں۔

سینما دیکھنے ہم سرجن دوبے کے ساتھ نکلے مگر وہ راستے میں اتر گیا۔ اس کا ڈرائیور' سمپورنا' پدما اور میں بس یہی لوگ سینما دیکھنے والوں میں رہ گئے۔

پدما پر وہی عاشقی کا بھوت سوار تھا۔ بار بار سمپورنا کو سنا سنا کر کہہ رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ صوفے کی ڈبل سیٹ پر بیٹھے گی۔ میں نے اس کی یہ بک بک خوش مزاجی سے سنتے ہوئے اسے تسلی دی کہ نہ صرف وہ میرے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھ کے فلم دیکھے گی بلکہ ابھی جو میں منہ ہاتھ دھونے فریش ہونے مردانہ غسل خانے میں جاؤں گا تو پدما میرے ساتھ ہو گی۔ اس نے خاصا بلند قہقہہ مارا۔ بولی "یہ صحیح ہے' مزا آئے گا۔" میں نے دیکھا۔ سمپورنا کو ڈرائیور کے سامنے کی گئی یہ بات اچھی نہ لگی۔ اس نے پدما سے کہا "بکواس مت کر۔ تو میرے پاس بیٹھے گی۔"

پدما نے اسے دھیرے سے گالی دی یعنی ان دونوں میں اب یہ طے ہو گیا تھا کہ سمپورنا میرے ساتھ اس وقت نہیں ہو گا جب میں فریش ہونے باتھ روم میں جاؤں گا۔

ڈرائیور نے ان دونوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ آہستہ بات کرو اور لڑو مت' لوگ مڑ مڑ کر تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔

میں نے اوپر سے فقرہ لگایا کہ ڈرائیور صاحب ان دونوں کو لڑنے بھڑنے مت دینا۔ خیال رکھنا' ایسا نہ ہو کہ میں تو واش روم جاؤں اور یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگیں اور میرے آتے آتے سمپورنا کے یہ گنتی کے بال اور بھی کم ہو چکے ہوں۔

اس وقت نو بجکر تین منٹ ہوئے تھے۔

میں باتھ روم جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

پدما نے ہاتھ بڑھا کر میری قمیص کی آستین پکڑ لی۔ سمپورنا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے مجھے آزاد کرا دیا۔ پدما بولی "حرام کا جنا!" سمپورنا نے اسے طمانچہ مارا' پدما نے مٹھی میں اس کے چھدرے بال پکڑ لیے اور سمپورنا برمی زبان میں اس کی ماں پر بڑے بڑے بھیانک الزام لگانے لگا۔

میں خوش مزاجی سے ہنستا ہوا سیٹوں کے درمیان رستہ بنانے لگا۔

ڈرائیور نے غصے سے کہا "کیا ہو رہا ہے یہ؟ اور کہاں جا رہے تم' روکو ناں ان دونوں کو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "اب تم روکو' میں تو نہ معلوم کتنی بار' کس کس حالت میں انہیں لڑنے بھڑنے سے روک چکا ہوں اور چوٹیں کھاتا رہا ہوں۔"

ڈرائیور ان دونوں کے بیچ ٹھنس گیا۔ اس نے مجھ سے پکار کے کہا "اب جاؤ ناں کیوں کھڑے کھڑے دانت نکال رہے ہو۔ جلدی سے آؤ' میں اکیلا ان لوگوں سے نہیں

نمٹوں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی آیا' ابھی آیا۔ بس دو منٹ کی بات ہے۔"

اس وقت نو بجکر آٹھ منٹ ہوئے تھے۔

میں ہال سے نکلا تو نو بجکر نو منٹ ہوئے تھے۔ سامنے لفظ "مردانہ" کے پیچھے جلتا ہوا ایک پیلا بلب تھا۔ میں واش روم میں داخل ہو گیا تو اس وقت ٹھیک نو بجکر دس منٹ ہوئے تھے۔ "دیکھ کے چل بے ہندوستانی! سالا! اندھا ہے!" کسی نے یہ بات اردو میں کہی تھی اور مجھ سے ٹکراتے ہوئے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں جھگڑتے ہو؟" میں نے گھبرا کے سوال کیا۔

"میں رنگونی دادا ہوں۔ تیرے جیسوں کو ایک منٹ میں صفا کر دوں گا۔"

میں نے مسکرا کر رنگونی دادا سے کہا "سب ٹھیک ہے۔ میں اکیلا آیا ہوں۔ آؤ۔" وہ گریبان چھوڑ کر مسکرایا اور مجھے لیے ہوئے باتھ روم سے نکل کر برابر کے برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ سیڑھیوں سے ملی ہوئی ایک بند گاڑی پہلے سے اسٹارٹ تھی۔ رنگونی نے گاڑی کے پچھلے پھاٹک پہ خاص انداز سے ڈرم بجایا۔ پھاٹک کھلا اور کسی نے اندر سے ہاتھ بڑھا کر مجھے گریبان سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ رنگونی نے باہر سے دروازہ بند کیا اور گاڑی چلنا شروع ہو گئی۔ اندر گاڑی کے اندھیرے میں کسی نے آہستہ سے میرا نام لیا۔ "شیر خان!" یہ کے کے کی آواز تھی۔ ہم دوبے کے منحوس اسپتال اور اس کی مردوں کی دنیا سے نکل آئے تھے۔

گاڑی گھنٹے بھر تک کبھی تیز کبھی ہلکی رفتار سے چلتی رہی۔ بازاروں سے گزرتے ہوئے اس کی رفتار ہلکی ہو جاتی تو باہر کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ کے کے غور سے یہ آوازیں سنتا اور آوازوں سے علاقہ پہچان کر بہ آواز بلند علاقے کا نام لیتا۔ ہمارے برابر بیٹھا ہوا رنگونی دادا کا کوئی گرگا خوش مزاجی سے یا تو تعریف کی آواز نکال کر کے کے' کے لیے ہوئے علاقے کے نام کی تصدیق کرتا یا ناں ناں کہہ کے محلے کا صحیح نام لے دیتا۔ قرائن سے لگتا تھا کہ ہمیں شہر سے باہر مضافات کی کسی بستی میں لے جایا جا رہا تھا۔ گاڑی رکی اور ہمارے پاس بیٹھے گرگے نے دھیرے سے کہا "ابھی بیٹھے رہنا' اترو گے تو رنگونی دادا گالیاں دے گا خوامخواہ۔"

ہم بیٹھے رہے۔ پھر بھی اس کی گالیاں دیتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ابے کیا اندر ہی مر گئے اب؟ تمہاری تو......"

گرگے نے ہنستے ہوئے گدی میں ہاتھ دے کے ہمیں گاڑی سے اتار دیا۔

یہ ایک نیم تاریک کمپاؤنڈ تھا اور دالان میں پیلے بلب جل رہے تھے اور اوپر تلے رکھے پرانے ٹائر کاٹھ کباڑ' لکڑی اور ٹین کے فریم جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ گاڑی کے برابر ایک آدمی آرمی کی پرانی تین سو تین بور کی رائفل اٹھائے آکھڑا ہوا تھا۔ وہ جمائیاں لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کی رائفل کے بٹ کو تار اور موچی والی کیلیں ٹھونک کر مرمت کیا گیا تھا۔

ہم گاڑی سے اترے تو رنگونی نے مجھے مخاطب کیا "تم شیر خان ہو نا؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

بولا "تمہاری جیپ اے ون کنڈیشن میں ہے۔"

"جیپ؟" مجھے جیپ کا سن کے حیرانی ہوئی تھی۔

"ہاں نا۔ وہ کھڑی ہے۔ وہ نیم کے جھاڑ کے پاس۔"

میں نے مڑ کے دیکھا' نیم کے درخت سے تار کے ذریعے ایک ننگا بلب لٹک رہا تھا۔ بلب کی مخش روشنی میں وہ جیپ کھڑی تھی جو امجد سنگھ نے ہمیں رنگون پہنچنے کے لیے تیار کرادی تھی۔

میں نے کہا "ہاں......جیپ......اے ون کنڈیشن میں رکھتا ہوں میں اپنی گاڑیاں۔"

رنگونی ہنسا۔ "اچھا ہی ہے نا۔ اگر مجھے اس کی مرمت میں پیسا لگانا پڑتا تو وہ تمہارے پچھائے پہ بید مار مار کے وصول کر لیتا۔ میری سروس میں جو بھی چیز آتی ہے ٹاپ کنڈیشن میں آتی ہے' نہیں میں پچھائے پہ بید مار مار کے ہر جا خرچا وصول کر لیتا ہوں۔ وہ عورت ہے ناں پدما' دوبے کے بعد میرے پاس تھی ٹاپ کنڈیشن میں' اب وہ بات نہیں ہے۔ تمہیں تو بیٹا! وہ تھرڈ ہینڈ پڑی ہے بلکہ فورتھ ہینڈ۔"

اس سالے کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ پھر بھی میں نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "تم ہر وقت مسخری' کامیڈی کے موڈ میں رہتے ہو۔"

"یہ مسخری' کامیڈی نہیں ہے۔ میں تو تم سے جیپ کے پٹرول کے بھی پیسے لوں گا۔ جب تک تم میرے پاس ہو' یہ جیپ میں تمہارے اکاؤنٹ میں چلاؤں گا۔ ہاں جب یہاں سے چلے جاؤ گے' اس کے بعد سمجھو یہ میری ہو جائے گی۔ اس کے بعد سے ہی بیٹے جیپ کا خرچا پانی میرے اکاؤنٹ میں چلے گا۔"

"اچھا تو تمہارا خیال ہے جیپ تمہارے پاس رہ جائے گی؟"

وہ ہنسنے لگا۔ کچھ دیر ہنستا رہا جیسے بچوں کی ناسمجھی کی باتوں پر بڑے ہنستے ہیں۔ پھر منہ سے گالی نکال کے زمین پر تھوکتے ہوئے بولا "خیال ویال پڑھے لکھے لوگوں کا چونچلا ہوتا ہے۔ مطلب وہی لوگ سوچتے خیال کرتے ہیں جنہوں نے ایک دو چوپڑی (کتاب) سے جاستی پڑھا لکھا ہو۔ ہم تو جاہل جٹ آدمی ہیں' خیال ویال نہیں کرتے۔ بس ہاتھ بڑھاتے اور پچھائے میں پہنچا دیتے ہیں۔ خیال ویال کس بات کا؟ خیال کی تو ماں کی عزت کرتا ہوں میں۔ سمجھے بھائی شیر خان؟"

یہ واقعی سخت مزاج آدمی تھا یا پیسہ بڑھانے' ہوا باندھنے کو سختی دکھا رہا ہے۔ خیر وقت آنے پر اس سے نمٹ لیا جائے گا۔ میں چپ رہا۔

اب کے اس نے نرمی سے پوچھا "کچھ کھاؤ گے' پیو گے؟"

میں نے کہا "کے کے میرے ساتھی کو ضرور کچھ دے دو۔ ابھی کمزوری چل رہی ہے اس کی۔"

"ہاں کے کے بیٹے! کچھ کھانا ہے؟"

کے کے نے اس کی بات کے جواب میں کہا "نہیں کھانا پینا تو سویرے ہی پہ رکھو۔ کھا پی کے نکل جائیں گے۔ ابھی تو سونا......"

وہ بات کاٹ کے' کے کے سے پوچھنے لگا۔ آواز میں نرمی تھی۔ "کہیں نکلنے کا ارادہ ہے سویرے؟ ہاں کہاں جاؤ گے؟"

بتایا تھا نہیں تمہیں۔ شیر خان کا باپ......والد صاحب منسٹر کی قید میں ہے۔ ادھر سے انہیں نکالنے کا ہے۔"

"پیکج ڈیل کرو نا ہم سے۔ مطلب اب جو ہم نے تم دونوں کو دوبے کی قید سے نکال لیا ہے تو اس کے باپ کو بھی ادھر سے نکال کے ادھر بٹھا دیں گے سمجھے؟ ایک جگے اکٹھا پے منٹ کا پروگرام بنا لو۔ شیر خان کو بھی سستا پڑے گا۔ ہمیں الگ الگ دو دو پارٹیوں سے ڈیل مطلب سودا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"دو دو پارٹی کون؟"

"ایک پارٹی تم ہو' دوسری پارٹی منسٹر ہے۔"

"منسٹر؟"

"ہاں منسٹر۔"

"اس سے کیا ہے؟"

"ابے اس سے ایک سودا تو یہ ہوگا کہ ہمارے پاس شیر خان۔ بولو کیا دو گے؟"
اس آدمی رنگونی بدمعاش نے یہ بات اتنی سچائی سے کہی تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں جیسے برف کا نیزہ اترتا چلا گیا۔

"اور؟ اور دوسرا؟" میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ ہنسا "دوسرا سودا یہ ہوگا کہ اکیلا بڈھا تمہارے لیے بیکار ہے' یہ ہمیں دے دو۔ بولو کیا لیتے ہو؟"

کے کے بیچ میں بول پڑا۔ "دیکھو استاد! ایسی بات مت کرو۔"

"چوپ!" رنگونی پوری آواز سے دہاڑا۔ "جب دو مردوں میں بات ہو رہی ہو تو لونڈے لپاڑیوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے سالے!"

میں نے جیسے مشورہ دیا "ہاں کے کے! تم خاموش رہو۔ بس سنتے رہو' جو بات ہو رہی ہے۔"

رنگونی پھر نرمی سے مجھے سمجھانے لگا۔ "اب تمہاری سائیڈ پر سمجھو' ایک ڈیل تو پرانی ہے کہ چھ لاکھ میں تم دونوں کو دوبے کی قید سے نکالنے کی بات ہوئی ہے۔"

"چھ لاکھ؟" میں نے پریشانی میں پہلے رنگونی کو پھر کے کے کو دیکھا۔

کے کے نے ہاں میں سر ہلایا۔

"ہاں چھ لاکھ میں سنگل سودا۔ مطلب تم لوگوں کو ادھر سے نکلنے کا......اور ڈبل سودا مطلب پورا پیکج تمہیں نکالنے اور بڑے میاں کو نکالنے' جہاز چڑھانے کا سب کام کا۔ گیارہ لاکھ...... چلو دس لگالو' دس لاکھ ٹوٹل کیش۔ جیپ بھی تو دے دی ہے تم نے۔"

میں نے ویسے ہی رنگونی کو تپانے کو پوچھا "یہ دس لاکھ ہم کہاں سے لائیں گے؟"

"یہ دس لاکھ تم دونوں کو کڑھاؤ میں بٹھا کے دھیمی دھیمی آنچ میں تپا کے نکالے جائیں گے۔ جیسے رواج ملے گوشت سے چربی نکالتے ہیں ناں بیٹا! ویسے۔" پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ "گورے! ارے بیٹا مہمانوں کو چائے وائے پلا کڑک۔ اب کھانا نہیں کھا رہے تو چائے ہی پلا دے اور بیٹا انہیں دونوں کو ہتھکڑی ڈال دے۔ آخر کب تک دونوں کتوں کے لاوارث بچوں کی طرح بے زنجیر کھڑے رہیں گے۔ ہاں رے گورے؟"

کاٹھ کباڑ کے دالان سے "اچھا جی اچھا۔" کہتا ہوا گینڈے کی طرح ایک آدمی قریب آنے پر جس کے پاس سے کچے لہسن کی بو آ رہی تھی' زنجیر اٹھائے آیا اور اس نے

ہم دونوں کو ہتھکڑی ڈال زمین پر گڑے ایک کنڈے سے پیڈ لاک کر دیا اور بولا "بولو جی کس کی چائے میں کتنا میٹھا پڑے گا؟"

چائے لانے والے کو تو میں نے اور کے کے نے منع کر دیا۔ ہم دونوں کھلے کمپاؤنڈ میں جہاں بندھے تھے' وہیں سکڑ سمٹ کے بیٹھ گئے۔

صبح کاذب تک کتنے ہی لوگ دالانوں سے نکل نکل کے باہر کھلے میں یا تو الٹیاں کرنے یا ہماری طرف منہ کر کے فوری ضرورت رفع کرنے آتے جاتے رہے۔ ہم دونوں بے ترتیب ڈھیر کی طرح نیم اندھیرے میں پڑے تھے تو حد سے زیادہ شراب پیئے ہوئے لوگوں کو یا محفل چھوڑ کر تیزی سے خود کو ہلکا کرنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ جو کھلے میں ایک ڈھیر سا پڑا ہے' وہ دو آدمی ہوں گے۔ زنجیروں سے بندھے' ٹھنڈی زمین پر سکڑے سمٹے خود کو قلفی بننے سے اور چھینٹوں سے بچاتے ہوئے۔

کتنی ہی بار قہقہے مارتی عورتیں کبھی پورے کبھی کم کپڑوں میں دالانوں سے چہلیں کرتی اتر آتیں۔ ان کے عاشق لوگ انہیں پکڑنے کو لڑکھڑاتے ہوئے خوشامدیں کرتے' خوش دلی سے گالیاں بکتے کبھی اپنا لباس درست کرتے' کبھی بے احتیاطی میں ویسے ہی جیسے اپنی سرگرمی سے وقتی طور پر محروم کر دیئے جانے پر ہوتے تھے' اتر آتے۔ دوسری عورتیں اور دوسرے مرد انہیں اس غیر سنجیدہ حالت میں سنجیدگی سے لڑکھڑا لڑکھڑا کر ادھر ادھر بھاگتے' خوشامد کرتے دیکھتے تھے اور تالی بجاتے تھے۔

رنگونی دادا کا دربار نحوست ابھی جاری تھا کہ اچانک گاڑیوں میں سوار گولیاں چلاتے ہوئے لوگ کمپاؤنڈ میں گھس آئے۔

میں اور کے کے زمین سے چمٹ گئے۔ دالانوں کے ستونوں' لوہے لکڑ کے انباروں اور دیواروں' دروازوں کی اوٹ لیے لیے رنگونی دادا کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔

اسی دیوانگی میں پندرہ بیس منٹ تک آنے والے لوگوں میں اور رنگونی دادا کے غنڈوں میں گولیاں چلتی رہیں۔ پھر کمپاؤنڈ میں گھس آنے والے جو گاڑیوں کی اوٹ لے کر گولیاں چلا رہے تھے' بھاگم بھاگ گاڑیوں پر سوار ہوئے اور آخری کھسیاہٹ کے طور پر گولیاں چلاتے ہوئے کمپاؤنڈ سے نکل گئے۔

صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے اور کے کے نے خاموشی ہونے کے بعد سر اٹھا کے دیکھا۔ ہمیں تین آدمیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ کمپاؤنڈ میں ایک اور دالانوں میں

دو لاشیں پڑی تھیں۔

کے کے نے دھیرے سے کہا "رنگونی دادا کے دو وکٹ گرے' مہمان ٹیم کا ایک۔"

مجھے حیرت ہوئی یہ لڑکا اس بھیانک طریقے سے یہ بات کہہ رہا ہے۔

پھر صبح کے اس سہانے وقت میں عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا۔ دالانوں اور کمروں سے زخمی اور بے حال' گالیاں بکتے مردوں اور عورتوں نے نکلنا اور کمپاؤنڈ میں اکٹھا ہونا شروع کر دیا تھا۔

میں نے نظروں ہی نظروں میں شمار کیا۔ تیس بتیس لوگ تھے' عورت اور مرد دونوں۔

یہ وہ مہمان تھے جو شراب اور بد معاشی کے لیے یہاں اکٹھا ہوئے تھے۔

ان کی چیخ پکار بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک اندر کسی کمرے سے رنگونی دادا کی غصے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر وہ مہمان عورتوں' مردوں کو گالیاں دیتا کمپاؤنڈ میں آ گیا۔

وہ اور اس کے گرگے بھی بال بکھرائے' بے حال نکلے تھے مگر لگتا تھا ان دو آدمیوں کے سوا کہ جو آنے والوں کی گولیوں سے ڈھیر ہوئے تھے' رنگونی دادا کی جمعیت ٹھیک ٹھاک تھی۔

رنگونی نے ہم دونوں کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی۔ کمپاؤنڈ میں اکٹھا ہو جانے والے مہمان عورتوں مردوں کو گالم گلوچ سے قابو کیا۔ انہیں تسلی دی کہ پانچ منٹ میں گاڑیاں تیار ہو رہی ہیں۔ تمہیں یہاں سے شہر پہنچوا دیا جائے گا اور واقعی پانچ منٹ کے اندر مختلف قسم کی گاڑیوں میں اس پریشان حال ہجوم کو جو ساری رات خرمستیاں کرتا رہا تھا' سوار کر دیا گیا اور کمپاؤنڈ مہمانوں سے خالی ہو گیا۔

مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ ہماری طرف آیا۔

اس گینڈے کی سی شکل والے گرگے نے زنجیر اور ہتھکڑی کھول کر ہمیں آزاد کیا۔ پھر رنگونی دادا نے جسے شاید تقریریں کرنے کا شوق ہو گا' مجھے مخاطب کیا۔ بولا "شیر خان! ہم سمجھ رہے تھے تجھے' تیرے باپ کو حاصل کر لیں گے تو ہمیں تھوڑا کچھ مال مل جائے گا لیکن لگتا ہے تو اور تیرا بڈھا بہت ہی کوئی منحوس لوگ ہو۔ ہم نے ایسا کچھ بندوبست کیا تھا کہ ادھر تو ہاتھ آئے' ادھر وہ بڑے میاں قابو میں آ جائیں اور ہم تجھ سے دونوں کا پیسا وصول کر کے تمہیں برما کے بارڈر سے آگے دھکا دے دیں مگر حساب گڑبڑ

ہو گیا۔ پتا ہے کس طرح؟

مجھے جاننے کی فکر بھی تھی اور وہ خود بتا دینا بھی چاہتا تھا لیکن میں خاموش رہا کیونکہ اگر بے چینی ظاہر کرتا تو رنگونی دادا مجھے باتوں میں الجھا لیتا اور ضرور ستاتا۔ میں اس کے سوال "پتا ہے کس طرح؟" کے جواب میں بس منہ اٹھائے اس کی صورت دیکھتا رہا۔

اسے جب کچھ دیر جواب نہیں ملا تو اس نے خود اپنی بات پوری کی۔ کہنے لگا "ہم رات میں تیرے بڈھے کو منسٹر کی کوٹھی سے نکال لائے تھے۔ بڑی خاموشی سے کام کیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ اسے منسٹر سالے کو جب پتا چلے گا کہ تیرے باپ کو کسی نے نکال لیا ہے تو وہ اپنے طور پر بھی تلاش کرے گا اور ہمیں بھی کہے گا کہ پتا اٹھاؤ کہ وہ صمد بنگش کدھر ہے؟ پھر ہم ادھر ادھر کچھ شور شرابا کر کے ڈھونڈیں گے یا ڈھونڈنے کا ناٹک کریں گے اور آخر میں تیرے بڑے میاں کا سودا کر لیں گے یا تو منسٹر سے یا تجھ سے مگر اب سارا کھیل بگڑ گیا۔"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ لیا "کس طرح؟"

وہ بولا "اس طرح کہ ایک مخبر حرامی نے منسٹر کو بتا دیا کہ صمد بنگش کو ہم ادھر کمپاؤنڈ میں لے آئے ہیں۔ بس اس نے دوسری کسی پارٹی کو ٹھیکہ دے دیا کہ بڈھے کو ہمارے کمپاؤنڈ سے نکال کے اس کے حوالے کر دو گے تو اتنے اتنے پیسے مل جائیں گے۔"

"اچھا۔ تو یہ جو آئے تھے' یہ اسی دوسری پارٹی کے غنڈے تھے؟"

"ہاں۔" رنگونی کے لہجے میں افسوس کی جھلک تھی۔ "ہاں سالوں نے میرے دو بڑے کام کے آدمی مار دیئے۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کروں گا کیا؟" رنگونی مجھے اس طرح سمجھانے لگا جیسے وہ استاد اور میں شاگرد ہوں۔ "ارے یہی کروں گا کہ تجھے' تیرے بڈھے کو اور اپنے آدمیوں کو لے کے ادھر سے نکل جاؤں گا۔ کیونکہ اب منسٹر کسی غنڈا پارٹی سے مدد نہیں لے گا۔ اس کا وار اوچھا پڑا ہے۔ اب تو وہ فوج کے لوگ ہی لے کے آئے گا۔ پولیس بھی نہیں' فوج۔"

رنگونی بک بک کیے جا رہا تھا مگر اس کے فقرے سے یہ بات مجھ پر کھل گئی تھی کہ بابا یہیں ہیں' اسی کے پاس ہیں۔ اسی کمپاؤنڈ میں ہیں۔

"تو کیا میرے بابا اس وقت یہیں ہیں؟"

"ہاں بیٹے! یہی کہنے تو آیا ہوں کہ بڑے میاں ادھر ہی ہیں۔ تم بھی ادھر ہی

ہو۔ اب ذرا جلدی جلدی بتا دو کہ کونٹی نینٹل ہوٹل سے جو کروڑوں کا مال تم نے اڑا لیا تھا' سفری چیک میں بدل لیا تھا' اس دولت کو...... تو وہ اب کہاں ہے؟"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ رنگونی بدمعاش کو اس دولت کی خبر ہے۔ ظاہر ہے اسی وزیر سے یہ خبر اس تک پہنچی ہو گی۔ پھر میں نے کہا "اچھا یہ کہانی کروڑوں کی دولت والی تم نے بھی سن ہی لی؟"

رنگونی اچانک جھپٹا اور اس نے میری پنڈلی پر اپنے فوجی ٹائپ کے بوٹ سے ٹھوکر ماری "حرام زادے! مجھے چلانے کی کوشش کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "رنگونی! یقین کرو۔ اس بات میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ میں نے کہیں کوئی دولت چھپائی ہوئی ہے۔"

اس نے بے چینی سے اپنی ایک ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کا گھونسا مارا۔ "وہ تو شیر خان! ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس بات میں کتنی سچائی ہے۔" پھر اس نے دالان کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ "کڑھاؤ چڑھا کے آگ جلا دو رے۔"

کڑھاؤ چڑھانے کا کہہ کے رنگونی دادا چلا گیا۔ وہی مرمت کی ہوئی رائفل والا گارڈ آ کے ہمارے سر پہ کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھا تھا دادا دھمکی دے کے گیا ہے مگر جب اس کے گینڈے جیسے آدمی اور دوسرے کارندوں نے سڑک بنانے کو ڈامر پگھلانے والا ایک بڑا کڑھاؤ کاٹھ کباڑ سے نکال کر صحن میں ڈال دیا اور لکڑیاں لا لا کے ڈھیر کر دیں اور زمین کھود کے چولہا سا بنانے لگے تو کے کے اور میں سمجھ گئے کہ جو کہہ رہا ہے' کرے گا ضرور۔

آدھے گھنٹے میں نہ صرف کڑھاؤ چڑھا دیا گیا بلکہ اس کے نیچے دھڑا دھڑ جلتی آگ بھی اپنا خروش دکھانے لگی۔

کارندوں میں سے ایک گیا اور کڑھاؤ اور آگ کا انسپکشن کرانے رنگونی دادا کو بلا لایا۔

رنگونی دادا نے بھڑکتی ہوئی آگ دیکھی اور اپنے آدمیوں سے کہا "پہلے شیر خان کو کڑھاؤ میں بٹھا دینا' بعد میں اس لونڈے کو بٹھانا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور جانے لگا۔ کے کے نے دہشت میں رونا' چیخ و پکار کرنا شروع کر دیا تو وہ جاتے جاتے رک گیا۔ اپنے آدمیوں سے کہنے لگا "ابے تم کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ جبھی کسی کو کڑھاؤ میں بٹھاؤ تو اپنے کانوں میں روئی کی بتیاں بنا کے رکھ لیا کرو۔ سالو! تمہیں اچھا لگتا ہے کہ ایک انسان چیخ پکار کر رہا ہے اور تم سب کچھ سنتے جا رہے ہو۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے بدمعاشو! سالو۔"

اس کی بات سن کے گینڈا یہ بڑبڑاتا ہوا گیا کہ پہلے بھی ان لوگوں کو بتایا تھا مگر سب کے سب کام چور ہیں۔ بھول جاتے ہیں حرامی۔ اب دیکھو میں لاتا ہوں کہیں سے روئی تلاش کر کے۔" گینڈا چلا گیا۔ رنگونی دادا پہلے ہی جا چکا تھا۔

کے کے نے رونا دھونا بند کیا اور گھگیا کے بولا "رنگونی دادا کو جو مانگتا ہے' دے دو۔ پیچھا چھڑاؤ اپنا اور میرا۔ بھگوان کے لیے مجھے کیوں مروا رہے ہو؟ میں تو تمہارے ساتھ اس لیے لگا چلا آیا تھا کہ تمہارے باپ کا پتا اٹھانے میں تمہاری مدد کرتا۔ اب تو وہ آ گئے ہیں۔ اس دادا سے کہہ کے میرا پیچھا چھڑواؤ۔ میں تمہارے کسی قصے میں نہیں ہوں۔ کیسی دولت' کس بات کے سفری چیک۔ میرے اوپر رحم کرو شیر خان۔ اس سے میرا تو کہہ دو......"

کے کے نے بہت گڑگڑا کر روتے ہوئے یہ درخواست کی تھی۔ یہ بات درست بھی تھی کہ اس بیچارے کو کیوں مرنے دیا جائے؟

میں نے شور مچا کے آواز دے کے رنگونی بدمعاش کو بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ میرے کسی معاملے میں اس لڑکے کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ تو اللہ واسطے میری مدد کرنے آیا تھا۔ ویسے بھی زخمی ہے' اسے چھوڑ دو۔ میرے خلاف جو کرنا ہے کرو۔ میں نے کہا "رنگونی! مجھ سے بھی بلاوجہ الجھ رہے ہو۔ میرے پاس کوئی دولت' سفری چیک ویک کچھ نہیں ہے۔ ہاں ہفتہ بھر کی مہلت دو گے تو تین چار لاکھ میرے والد کہیں سے قرض مانگ کے کچھ کر کے یہاں رنگون میں ہی اکٹھا کر لیں گے۔ وہ لے کے ہمیں جانے دو۔ مالک تم پر رحم کرے گا۔"

وہ فلمی بدمعاشوں کے انداز میں ہنسا۔ کہنے لگا "مالک میرے معاملے میں نہیں بولتا' اسے پتا ہے میں بڑا حرامی ہوں۔ اس کی بھی نہیں سنوں گا تو پھر وہ کائے کو...... ہاہاہا۔ تو ایسا کر شیر خان اس میرے آدمی سے روئی لے کے خود اپنے کانوں میں بھی ٹھونس لے۔ تجھے تیرے اپنے چیخنے کی آواز بھی نہیں سنائی دے گی۔ اس طرح خود تجھے بھی پتا نہیں چلے گا کہ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے تیرے ساتھ۔ کیا سمجھا؟"

میں نے جاتے ہوئے رنگونی کو آواز دی "او سن تو۔"

وہ مڑا بھی نہیں' ویسے ہی انکار میں سر ہلاتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں گینڈے جیسا آدمی آ گیا۔ وہ واقعی کچھ روئی اٹھا لایا تھا جو اپنے آدمیوں میں بانٹنے لگا۔ انہیں روئی کی بتیاں سی بنا کر کانوں میں ٹھونسنے کی تکنیک سمجھانے

لگا۔

سب کے سب تیسرے درجے کے جلاد لگ رہے تھے۔ اپنے کام میں منہمک اور ان آدمیوں سے بے تعلق جنہیں شاید وہ آگ پر رکھے کڑھاؤ میں بڑی مستعدی سے بٹھادیں گے اور روکے رکھیں گے۔

تین چار منٹ بعد ان چھ سات آدمیوں نے ایک مضبوط لکڑی اٹھائی اور شکار کیے ہوئے ہرن یا نیل گائے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے پہلے مجھے پھر کے کے کو ڈنڈا ڈولی کر کے اس لکڑی میں پرو لیا۔ انہوں نے کیا یہ تھا کہ نائیلون کی ڈوری سے میری دونوں کلائیاں آپس میں باندھ دی تھیں۔ اسی طرح دونوں پیر ایک دوسرے سے باندھ کے مجھے پیٹھ کے بل زمین پر ڈال کے جڑے ہوئے ہاتھوں اور جڑے ہوئے پیروں کے بیچ وہ مضبوط ڈنڈا گزار لیا تھا۔ پھر ایک ایک سرے سے ایک ایک آدمی مجھے کندھے پر اٹھا کے کڑھاؤ کی طرف لے چلا تھا۔

میری اب تک کی ساری دلیری ہوا ہو گئی۔ میں نے چیخ چیخ کے کمپاؤنڈ سر پر اٹھا لیا۔ ”ابے رکو۔ ٹھہرو۔ رنگونی کو بلاؤ۔ میں تیار ہوں۔ میں ہر چیز پے تیار ہوں۔“

وہ نہیں رکے۔ مجھے کڑھاؤ پر ڈالنے کے لیے اسی مستعدی سے بڑھتے رہے۔

وہ رکتے کیوں نہیں ہیں؟ بڑھے کیوں جا رہے ہیں؟ میری بات کیوں نہیں سنتے؟

مجھے ایک جھٹکے سے یاد آگیا کہ ابھی ابھی تو ان سب نے اپنے کانوں میں پلگ لگا کے خود کو ہر قسم کی آواز سننے سے روک لیا ہے۔ چاہے جتنا چیختا شور مچاتا رہوں‘ وہ میری آواز نہیں سن پائیں گے۔

”مارے گئے۔“ میں نے دل میں سوچا۔ میں اس بات کو اتنا ہلکا لے رہا تھا۔ ارے یہ تو کرائے کے قاتل ہیں۔ خالی خولی تو دھمکاتے ہیں‘ گلی محلے کے بدمعاش۔ یہ تو سرکاری مشینری تک سے ٹکرانے والے پختہ کار مجرم ہیں۔

”مارے گئے۔“

میں نے پوری طاقت سے رنگونی کو آواز دی ”رنگونی دادا! بچاؤ! بچاؤ دادا بچاؤ۔“

کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ ڈنڈا ڈولی کیے ہوئے کڑھاؤ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ آگ کی لپٹ مجھے پوری طرح لگنے لگی۔ ایک لمحے بعد اور اگر مجھے اس طرح رکھا گیا تو شاید میرے کپڑے آگ پکڑ لیں گے۔

”رنگونی دادا۔ میں تیار ہوں۔ سب دولت لے لو دادا! بچاؤ۔ میں تیار ہوں۔“

اب میری آواز میں کے کے کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح میری سفارش کر رہا تھا اور رنگونی کو بتا رہا تھا کہ شیر خان ساری دولت تیرے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ ”دادا! یہ تیار ہے۔ اپنے آدمی کو روکو دادا!“

ایک لمحے بعد وہ میری ڈولی کو دھواں دیتے چیختے کڑھاؤ میں رکھنے والے تھے کہ دالان کی طرف سے ایک ساتھ دو ہوائی فائر ہوئے۔ یہ ہوائی فائر ہی تھے اور بند کانوں والے بدمعاشوں کو متوجہ کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔ وہ رک گئے۔

میں نے سر گھما کے دیکھا‘ رنگونی ہاتھ میں پستول لیے دالان میں کھڑا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کے اپنے آدمیوں کو اشارے کر رہا تھا کہ وہ مجھے واپس لے آئیں۔

وہ مڑے اور میری ڈانڈا ڈولی کو دالان کے پاس لا کر رنگونی دادا کے قدموں میں ڈال دیا۔

”ہاں بے؟ کیا بات ہے؟“ دادا نے بیزاری سے سوال کیا۔

”سب لے لو۔ میں تیار ہوں مگر پہلے مجھے میرے بابا سے ملاؤ“

”ہاں!“ دادا نے اب کے انگریزی فلموں کے بدمعاش کی طرح ایک ”ہہ“ یا ”ہاہ“ ماری اور کہنے لگا ”یہ ملاؤ کیا ہوتا ہے بے؟“

میں نے پڑے پڑے کہا ”میں پہلے اپنے بابا کو دیکھوں گا‘ پھر تمہیں اس دولت کے پاس لے کے جاؤں گا۔“

”دیکھے گا؟ ہاں؟ دیکھے گا باپ کو؟ چل ٹھیک ہے۔ دکھا دیں گے۔ ملانے ولانے کی غلط ہے۔ بس دکھا دیں گے۔“

رنگونی نے اپنے اسی گینڈے جیسے نائب کو اشارہ کیا کہ میرے ہاتھ پاؤں کھول کے مجھے اندر دالان میں مذاکرات کی میز پر لایا جائے۔

انہوں نے کھول دیا تو نائیلون کی ڈوری سے دوران خون رکنے کے سبب میری وہ حالت تھی کہ میں اٹھ کے بیٹھنا تو کجا زمین پر بیٹھے بیٹھے پر بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔

رنگونی نے گینڈے جیسے بدمعاش کو اشارہ کیا۔ اس نے مستعدی سے بڑھ کر میرے ٹخنوں اور کلائیوں کی مالش شروع کر دی۔

دو‘ تین منٹ بعد میں اتنا ہو گیا کہ سہارے سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ رنگونی بولا

”کہاں ہیں وہ تیرے سفری چیک؟“

میں نے کہا "بودھ وہار میں۔"

"وہاں کس جگہ؟ کس کے پاس؟"

میں بوڑھے کی پوتی کوسومی کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے کہا "دو بھکشو ہیں۔ مہا موگلان اور ساری پت نام کے میں نے وہار سے فرار ہوتے وقت اپنے سفری چیک اور پتھر......"

رنگونی نے میری بات کاٹی۔ "پتھر؟" اس کی آنکھیں نئے قمقموں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ "پتھر کون کون سے؟"

میں نے کہا "ڈائمنڈ اور روبی۔"

"ہاں ہاں بے ہیرے اور لعل' پر یہ آئے کہاں سے؟"

میں نے بگڑے لہجے میں کہا 'کہاں سے بھی آئے' تجھے کیا۔ ہیرے زیادہ اچھے نہیں ہوتے۔ چھوٹے بھی ہیں مگر روبی ایسے ہیں کہ آدھوں بانٹ کرے گا تو اتنے ہو جائیں گے کہ تیری اگلی سات نسلیں بد معاشی چھوڑ دیں گی۔"

وہ گندے طریقے سے ہنسا۔ بولا "بد معاشی تو خیر کبھی کوئی ناں چھوڑے۔ ہاں یہ ہے کہ میرے بچے اچھی دارو پئیں گے اور عمروں کو پہنچ کے صاف ستھری عورتیں رکھیں گے۔ یہ نہیں کہ جسے گھاگھرے (اسکرٹ) میں دیکھا' ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئے۔ بس اتنا ہو جائے کہ بمبئی سے فلم اسٹاریں ہفتے دس روز کے لیے جہاز کر کے آجایا کریں' بچوں کا جی خوش کرنے۔"

میں نے کہا "ایسے موقعوں پر ہم ماشاء اللہ کہتے ہیں۔"

کہنے لگا "کچھ بھی کہو۔ بات آگے بڑھاؤ۔ روبی میں آدھا بانٹ اور ہیروں میں آدھا بانٹ اور کیونکہ کیش تیرے کسی کام کا نہیں۔ وہ سب میں لے جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"ارے تجھے تیرے باوا کو ادھر رہنا نہیں ہے۔ پھر ادھر کا کیش اپنے پاس رکھ کے تم لوگ کیا کرو گے رے؟"

میں نے کہا "رنگونی دادا! ایک تو تو بالکل جاہل' بے پڑھا لکھا ہے۔ دوسرے بار بار بھولتا بھی جاتا ہے۔ تجھے آدھے گھنٹے پہلے یاد تھا کہ میں نے سب دولت سفری چیکوں میں بدل لی ہے۔ جہاں جاؤں گا وہیں کی رقموں میں سفری چیک بدلا لوں گا۔"

وہ مان گیا۔ "ہاں بے ہاں۔ بھول گیا تھا۔"

"پھر کیا صلاح ہے؟"

بولا "میں بھول گیا تھا تو اس کا جرمانہ پڑے گا تیرے پہ۔ سب سفری چیکوں کے چار برابر حصے کرنا۔ تین حصے میرے' ایک تیرا۔"

"کیوں؟ تیرے کو کیا پریشانی ہے جو چار میں سے تین لے گا۔"

"میں تجھے ابھی کڑھاؤ میں پھنکوا سکتا ہوں' اس لیے چار میں سے تین لوں گا۔"

"ہاں یہ صحیح ہے تو پھنکوا دے' پھر تجھے سفری چیکوں کا پتا اپنی اماں سے جا کے پوچھنا پڑے گا۔"

وہ بولا "میری ماں کا نام نہیں لے شیر خان! وہ ناچ گا کے......اور دوسری طرح گزارا کرتی تھی۔"

میں نے کہا "جو بھی ہے میں اس میں آدھا بانٹ کروں گا۔"

کہنے لگا "اچھا سب کے تین حصے کرو۔ دو میرے ایک تیرا۔ اب تو خوش؟"

میں نے کہا "سن! سب کے پچاس حصے کر۔ ایک تیرا' ایک تیری ماں کا اور ایک اس کے یار گانے سننے والوں کا۔ باقی کے سینتالیس میرے۔ جان ان سالوں کو بلا کے لا مجھے ڈنڈے سے بندھوا اور کڑھاؤ میں ڈال دے...... تیری تو۔"

رنگونی کے منہ سے اب رال بہنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار آستین سے ہونٹ صاف کیے اور کہا "اچھا آدھے تیرے' آدھے میرے۔"

میں نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے اس حرام زادے سے مصافحہ کر لیا۔ "چل پھر بابا سے میری بات کرا دے۔"

میری بات سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ آخر کار بات سمجھ کر اس نے دھیرے دھیرے انکار میں سر ہلایا۔ "بات وات نہیں کراؤں گا۔ تجھے دکھا دوں گا۔ تو دیکھ لینا کہ وہی ہے تیرا باپ' وہی بڈھا ہے۔ کوئی فراڈ نہیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سن او نکیا' چور' حرام زادے! اب اگر تو نے میرے والد کا نام لیتے ہوئے تمیز سے بات نہ کی تو وہ روبی اور ڈائمنڈ اور تیرے حرام کے آدھا بانٹ سفری چیک سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر مار دینا مجھے مگر میں تجھے دولت کے قریب تک نہیں جانے دوں گا۔ میں بنگش ہوں' اپنے بڑے کی عزت کراؤں گا۔ ہر ایک سے تجھ ایسے کیڑے مکوڑے سے بھی عزت کراؤں گا یا پھر جان دے دوں گا۔ سمجھا سالے دادا؟"

اسے اتنی گالیاں' منہ در منہ کبھی نہیں پڑی ہوں گی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتا رہا۔

کہنے لگا "بڑا حرام کا جنا' کتا ہے رے تو۔ چل تیرے بنگش صاحب کو اب کچھ نہیں بولوں گا۔ ویسے ابھی تک میں نے بڑا خیال رکھا ہے اس......ان کا آدمی ٹیڑھا ہوں۔ پر اتنا جانتا ہوں کہ مکھن پہ روٹی کس سائیڈ پہ لگی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو تجھے پتا ہے ہاں مکھن پہ یاد آیا۔ کوئی کہہ رہا تھا تو نے اپنے اصلی باپ کو ٹارچر کر کے مار دیا تھا۔ وہ پیسے نہیں دیتا تھا تجھے جیب خرچی کے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا۔ "دیکھ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب میں تیرے بڑھے...... مطلب والد صاحب کو کچھ نہیں بول رہا تو تو میرے باوا کو کیوں بولتا ہے۔ ویسے بھی وہ ٹارچر سے نہیں مرا تھا' ایکسیڈنٹ میں گزر گیا تھا۔ زیادہ پی لی تھی اور کسی کی نظر نہیں پڑی۔ وہ ایئرپورٹ کی طرف نکل گیا۔ رن وے پر ان سالوں نے اسی ٹیم ایک جہاز چھوڑ دیا۔ ابے کو کیا خبر کیا شک ہوا' وہ سمجھا کہ نہیں سمجھا۔ جہاز کی لائٹ دیکھ کے اپنی ڈانگ (لاٹھی) لہراتا گالیاں نکالتا دوڑا جہاز کی طرف۔ بس آخری آواز جو ایئرپورٹ سکیورٹی کی گاڑی میں بیٹھے اسٹاف نے سنی' وہ ابے کی گالیوں کی آواز تھی۔ ہاہہ! دنیا میں کسی نے ہمیشہ نہیں رہنا شیر خان! سب نے ایک روز چلے جانا ہے۔"

میں نے کہا "میں سفری چیک دکھانے سے پہلے اپنے بابا کو دیکھوں گا۔ ابھی۔"

کہنے لگا۔ "ابھی لو۔ کوئی دیر ہی نہیں لگتی۔" پھر اس نے اپنے گینڈے اسسٹنٹ کو پکارا "سن بے......او۔"

گینڈا مستعدی سے آ کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔ "برابر کے کمرے میں جو بڑے میاں ہیں ناں' وہی جس نے بھیڑ کی کھال کی چمکدار رومی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے کالے رنگ کی۔ ان بڑے میاں کا بڈ اس دیوار کے ساتھ لگا ہے۔ تو بڈ کو اس دیوار کے ساتھ لگا دے۔ ہم لوگ روشن دان میں سے بڑے میاں کو دیکھیں گے۔ سمجھ گیا؟"

گینڈے نے کہا "اچھا مطلب؟ اس کے ساتھ نہیں' اس دیوار کے ساتھ لگانا ہے؟" رنگوٹی نے ہاں میں سر ہلایا۔ گینڈا چلا گیا۔

بابا کے پاس دو قراقلی ٹوپیاں تھیں۔ ایک چوکلیٹی رنگ کی' ایک بالکل سیاہ۔ غنڈے نے سیاہ قراقلی کو رومی ٹوپی کہا تھا۔ قیدی جو برابر کے کمرے میں ہے' بابا ہی ہیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد گینڈے نے آ کے رنگوٹی کی طرف دیکھا۔ "ہاں" میں سر ہلایا۔

رنگوٹی نے مجھے سامنے کی دیوار کے برابر کھڑا کر دیا۔ ایک میز روشن دان کے برابر کھینچ کے مجھے اشارہ کیا کہ جا شیشے میں سے اندر دیکھ۔

میں نائیلون کی رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ جلدی جلدی میز پر چڑھنے کی کوشش میں لڑھک گیا۔ چوٹ بھی کھا گیا مگر لشتم پشتم چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے دیوار تھام کے میں نے بند روشن دان کے شیشے سے چہرہ لگا دیا۔

اندر جھانکا۔ اندر صاف ستھرے بستر پر صاف ستھرے کپڑوں میں میرے بابا صمد بنگش صاحب لیٹے تھے۔ ان کا چہرہ میری طرف تھا۔

ان کا ہمیشہ کی طرح صحت مند' سرخ و سپید چہرہ اگرچہ اس وقت کجلایا ہوا لگا۔ رنگت بھی کچھ زردی مائل ہو رہی تھی مگر میں نے تیزی سے جائزہ لیا' وہ زخمی نہیں تھے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بابا اسی شان سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے جس طرح ہمیشہ اپنی ٹیک کی کارونگ والی مسہری پر لیٹا کرتے تھے۔

میں نہ معلوم کتنی دیر کھڑا ان کا چہرہ تکتا رہتا مگر ادھر انہوں نے کروٹ لی' ادھر رنگوٹی نے میری پنڈلی پر دستک سی دی اور کہا "چل بھئی اب اتر۔ کام کی بات کریں۔"

میں اتر آیا۔ پہلا سوال میں نے اس غنڈے سے کیا' وہ بابا کی صحت کے بارے میں تھا۔"

کہنے لگا "صحیح ہیں۔ کھانا کم کھا رہے ہیں۔ میں نے ان کے غسل' وضو کے لیے گرم پانی کا کہہ دیا ہے۔ ذبح کا گوشت جو تم لوگ کھاتے ہو' وہ تو ملتا نہیں۔ انڈے دودھ پہ اور جو بھی پھل پکڑائی آ جائیں' ان پہ ہم نے تیرے بڑنے...... مطلب بڑے صاحب کو رکھا ہوا ہے۔ چل گاڑی میں بیٹھ۔ ہم فوراً بودھ وہار کی طرف چل پڑیں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے نہیں۔ پہلے مجھے بتاؤ تمہارے پاس کس قسم کی کیسی کیسی گاڑیاں ہیں؟"

وہ بولا "جیپ ہے جو تو نے مجھے تحفے میں دی ہے۔ پی ڈبلیو ڈی کا ایک کھلا ٹرک ہے۔ دودھ لے جانے والی ایک گاڑی ہے جس کی ٹھنڈا کرنے والی مشینری کام نہیں کر رہی۔"

"اور؟"

کہنے لگا "اور کیا؟ تو کہے تو کسی منسٹر سالے کی جھنڈا لگی کار اڑا لائیں؟ ہاہاہا۔"

میں نے کہا "بکومت۔ سنو ایک ایمبولینس چاہیے۔ ایمبولینس میں میرے بابا جائیں گے۔ باہر کی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس ہم دونوں سکڑ سمٹ کے بیٹھ جائیں گے۔"

پہلے تو وہ ناں ناں کرتا رہا۔ مجھ سے کہتا رہا کہ تجھے میں کھلی جگہ میں نہیں بٹھا سکتا۔ سب کی نظر پڑے گی' پھر ہو سکتا ہے تو بھاگنے کی کوشش کرے مگر جب میں نے کہا کہ تو خود میرے برابر بیٹھا ہو گا' بھاگوں گا کیسے؟ اپنے باپ کو چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ رہا نظر پڑنے کا سوال تو میں ویسے ہی اسپتال کے وارڈ بوائے کے کپڑوں میں ہوں تو کہے تو منہ پر گاز کا ڈھاٹا اور باندھ لوں جو آپریشن تھیٹر میں ناک منہ ڈھکنے کے لیے عملہ اور ڈاکٹر باندھتے ہیں۔ وہ راضی ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے کہا' اس لڑکے کے کو چھوڑ دو۔ رنگونی بولا "اسے ہم آزاد کر کے جیپ میں بٹھا لیتے ہیں۔ شہر میں تو نہیں چھوڑیں گے۔ اسے کسی ایسی جگہ اتار دیں گے جہاں یہ ہمارے لیے کوئی گڑبڑ نہیں بنائے۔ حکومت والوں کو جا کے ہماری باتیں نہ بتا دے۔ پھر وہ ہنس کے بولا "تم کہو تو اس کی زبان کاٹ کے ابھی یہیں آزاد کر دیں۔ زبان کاٹنے میں یہ سہولت ہے کہ پھر یہ بلاوجہ کی بکواس نہیں کر سکے گا۔"

میں نے کہا "رنگونی تو جتنی دیر بکواس کرے گا' تیرا آدھوں آدھ حصہ اتنی دیر تجھ سے دور رہے گا۔ اب اپنے لیے بچوں کے لیے نہیں تو صرف مال کی خاطر ہی ذرا سی سنجیدگی اختیار کر لے۔ کیوں ٹائم خراب کرتا ہے؟"

دوپہر ہونے والی تھی۔ جب سائرن بجاتی ہوئی ایک ایمبولینس کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ وہ تو میں نے چیخ پکار کر کے ان بدمعاشوں سے کہہ سن کے سائرن بند کرایا' نہیں تو وہ ساری خلقت کو کمپاؤنڈ میں جمع کر لیتے۔

خیر بابا کو آرام سے ایمبولینس میں پہنچا دیا گیا۔ آگے ڈرائیور کے پاس رنگونی کے ساتھ میں بیٹھا۔ رنگونی اور ڈرائیور دونوں پوری طرح مسلح تھے۔ آگے آگے ان حد سنگھ والی جیپ چل رہی تھی۔ جیپ پہ گینڈا اور دوسرے گرگے سوار تھے۔ ظاہر ہے وہ پوری طرح ہتھیار بند ہوں گے۔ اگرچہ ان کے ہتھیار سرسری طور پر دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ گرگوں اور گینڈے کے بیچ کے کے بیٹھا تھا جو صورت ہی سے خوش مگن دکھائی دیتا تھا۔

ہم دو گھنٹے میں اس جگہ سے نکل کے بڑی سڑک پر آ گئے۔ گرگوں اور گینڈے

وغیرہ نے فوج کی کمانڈو ٹائپ وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ایمبولینس پر بھی کوئی فوجی نشان سا لگا ہوا تھا۔ سرسری دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ فوجی مشقوں کے سلسلے میں دو گاڑیاں ہیں۔ کوئی بندہ زخمی ہو گیا ہے تو اسے لے کے جا رہی ہیں۔

رات ہوتے ہوتے ہماری دونوں گاڑیاں شاہراہ کے اس حصے میں پہنچ گئی تھیں جو ہندوستان کے علاقے امپھال کے قریب سے گزرتا ہے۔ مجھے یاد تھا کہ امپھال میں کوسومی کے دادا جی کا قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہو گا۔ اگر برما سے کسی دوسری جگہ جانے کے لیے کوئی کوشش کرے تو اسے امپھال شہر کو یاد رکھنا چاہیے جو ہندوستانی علاقے میں برمی' سلہٹی اور آسامی نسل کے خانہ بدوشوں کا بہت بڑا تیرتھ ہے۔

میں نے رات کے کھانے میں بکری کے دودھ سے بنا ہوا پنیر اور ایک سیب کھایا تھا۔ بابا کو بھی ان بدمعاشوں نے اندر کچھ پہنچوا دیا تھا۔

انہیں ابھی بالکل اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ میرے بابا کو خبر نہیں تھی کہ ایمبولینس گاڑی میں آگے کون بیٹھا ہے اور گاڑی کہاں جا رہی ہے۔ ایمبولینس کو آوازوں تک سے مقفل کر کے رکھا گیا تھا۔

خیر امپھال کی سرحد بائیں ہاتھ پر کہیں گیارہ بارہ میل دور ہو گی۔ یہی ان ملکوں کا قریب ترین فاصلہ تھا۔ اس وقت میں نے رنگونی دادا سے کہا کہ میں پیشاب کرنے اتروں گا۔ رنگونی شام سے شراب پیتا ہوا آیا تھا۔ اس کا ڈرائیور اور جیپ چلانے والا غنڈا ہوش میں تھے۔ اس کے دوسرے لوگوں کو بھی ایسا ہی کچھ سرسری سا اندازہ تھا کہ وہ کہاں سے گزر رہے ہیں۔

میں نے کہا "میں جھاڑی میں جانا چاہتا ہوں' گاڑی روک لو۔"

دادا بولا "جھاڑی میں کائے کو جائے گا' ارے ادھر ہی سے......"

میں نے کہا "تو اپنے مرے ہوئے باپ کی طرح نشے میں ہے اور بلاوجہ کی باتیں کر رہا ہے۔"

رنگونی نے کہا "میرے باپ سالے کا نام مت لو۔ وہ ایکسیڈنٹ میں......"

ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ میں اپنے لباس کے بٹن ٹٹولتا ہوا اترا اور سڑک کے برابر جھاڑی میں اتر گیا۔

جھاڑی کی اوٹ لے کر میں ہاتھوں کے بل فرش زمین پر جھکا اور میں نے آخری بار اپنے بابا کے لیے ایک آخری مرتبہ۔ قطعی طور پر آخری بار خود کو شیر بن

جانے کا حکم دیا۔ میری نظریں اپنے پنجوں پر تھیں۔ میرے حکم کے ساتھ ہی ہاتھوں کے پنجے چوڑے ہوئے اور وہ سنہری رنگ کے ہو گئے اور سنہری پر سیاہ شیر دھاریاں لہرا گئیں۔ خاص اسٹیل کے چاقوؤں جیسے پانچ اور پانچ دس حربے میری بند مٹھیوں سے نکل کر کچی مٹی میں کتنے ہی انچ اتر گئے۔ میں نے تن کر سر اٹھایا اور بنگشوں کی پوری شان اور شکوہ سے دہاڑ ماری۔

یہ رائل بنگال ٹائیگر کی آواز تھی۔ غصے اور آزادی اور طے شدہ جنگ کے چیلنج کی آواز۔ میں نے دہاڑ ماری اور خود کو دکھاتا' جست کرتا پہلے جیپ پر آیا۔ جیپ کے اگلے پہیوں کو اپنے شیر پنجوں سے ادھیڑتا میں دوبارہ جھاڑیوں میں اتر گیا۔

پہلا فائر رنگونی نے کیا تھا۔ اس کا ڈرائیور اور وہ تیزی سے اپنا (بقول کسے) گولہ بارود۔ پھونک رہے تھے۔ ان کا نشانہ وہ جھاڑیاں تھیں جن میں سے کبھی کبھی میں سر ابھار کر اپنا جلوہ دکھا دیتا تھا اور جن میں مسلسل اپنی آواز کے نشانات چھوڑتا پھر رہا تھا۔ تکنیک وہی پرانی تھی کہ پتھر کی اوٹ سے آواز سن کر میں درختوں کے تنوں' چٹانوں کی آڑ لیتا بالکل ہی نئی جگہ پہنچتا اور وہاں سے دہاڑ مار کر ان بدمعاشوں کے فائر کو اس آواز کی طرف ڈائریکٹ کر دیتا۔ کوئی بتیس منٹ ان کمینوں نے جنگل کے اس حصے کو جو پھیل کر فرلانگ بھر کا قطعہ بن گیا تھا' چھلنی کر ڈالا۔

آخری گولی جیپ سے چلائی گئی۔ پھر انہوں نے گالیاں بکتے ہوئے سب شیشے چڑھا لیے۔ اب وقت تھا کہ جھاڑیوں میں آنکھ مچولی کھیلنے والا رائل بنگال ٹائیگر اندھیرے اور سناٹے میں کھڑی گاڑیوں کی طرف آئے۔

میں نے جیپ والوں کا جائزہ لیا۔ کے کے بے ہوش ہو چکا تھا۔

ایمبولینس کا ڈرائیور اور رنگونی دادا شیشہ بند کیے باہر ٹہلتے شیر کو گھونسا دکھا دکھا کر دھت دھت کہہ رہے تھے۔

میں نے پنجے کی ایک ضرب سے ایمبولینس کی کیبن کے شیشے توڑ دیئے۔ رنگونی کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ سیٹ کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سر کی ٹکر سے اسے کیبن سے نیچے گرا دیا۔ ڈرائیور کے اوسان درست تھے۔ وہ ہو ہو ہو کر کے بھاگا اور جنگل میں دور تک بھاگتا چلا گیا۔

گاڑی سے سڑک پر گرا ہوا رنگونی۔ کیں کیں کیں جیسی آواز نکال رہا تھا جو عام طور پر بہت چھوٹے پلے خوف کے عالم میں نکالا کرتے ہیں۔

میں نے زبردست دھاڑ ماری اور پنجا کھول کے ایک چھچلتا ہوا سا وار اس کے اونی کوٹ کی آستین پر کیا۔ آستین میرے پنجوں میں لگی لگی نکل آئی۔

رنگونی زخمی نہیں ہوا' بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی میں بھی وہ منہ سے کیں کیں کی پلا آواز نکال رہا تھا۔

میں نے مڑ کے جیپ کی طرف دیکھا۔ جیپ بالکل خالی تھی۔

اب وقت ہے' میں نے سوچا اور جھاڑی میں اتر گیا۔ میں نے خود کو شیر علی بنگش بن جانے کا حکم دیا اور آسائش کی سانس لے کر میں زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں قطعی طور پر اور آخری بار شیر سے انسان بن چکا تھا۔ خدا حافظ جانور۔ خدا حافظ دوست۔ میں نے دھیرے دھیرے سے کسی کو مخاطب کیا اور جھاڑی سے باہر آ گیا۔

ایمبولینس کے پاس دو جستوں میں' مگر نہیں میں تو دوڑتا اور اپنے بابا کو پکارتا ہوا گیا تھا۔ میں پہنچا ایمبولینس کی چابیاں بے ہوش رنگونی دادا کی جیب میں پڑی تھیں۔ گاڑی کی چابی اسی طرح لگی تھی جس طرح ڈرائیور چھوڑ کر بھاگا تھا۔ میں نے ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پر پڑے بے ہوش رنگونی کو بچاتا ہوا گاڑی کا رخ امپھال کی طرف کر دیا۔ گیارہ میل دور کوسومی کے قبیلے والے اور شاید خود کوسومی امپھال کے میلے میں موجود ہوں گے۔

میں نے اندر کی آہٹ لی۔ میرے باپ صمد خان بنگش صاحب زور زور سے عربی میں ایک دعا پڑھ رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا' یہ رد بلا کی دعا ہے۔ خدا نے ہماری سن لی تھی۔ ہمیں بہت بڑی بلا سے بچا کر یکجا کر دیا تھا۔

ختم شد